حصول آزادی کے لیے
ہندوستان کی جدوجہد

1857-1947

از

پروفیسر بپن چندر

مردلا مکھرجی، آدتیہ مکھرجی،

کے۔این، پانکر، سوچیتا مہاجن

مترجم

سعید احمد انصاری

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

حصول آزادی کے لیے
ہندوستان کی جدوجہد

1857-1947

از

پروفیسر بپن چندر
مردلا مکھرجی، آدتیہ مکھرجی،
کے۔ این۔ پانکر، سوچیتا مہاجن

مترجم

سعید احمد انصاری

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2014
تعداد : 550
قیمت : -/234 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1185

Husool-e-Azadi Ke Liye Hindustan Ki Jadd-o-Jehad

By: Prof.Bipin Chandara
Mridula Mukherjee, Aditya Mukherjee, K.N. Panikar
Sucheta Mahajan
Translated by: Saeed Ahmed Ansari

ISBN :978-93-5160-034-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر:49539000، ٹیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ، انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔ زبان کا سفر حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے۔ مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ مفروضے سے معروضے کی منزل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں ردوقبول سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔ زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔ نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان نامیاتی حقیقت ہے۔ اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور مجرد، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کر دیتا ہے۔ اردو نے اپنا

ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو نئی روشنائی عطا کر کے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ تاریخ پر مبنی بپن چندر کی یہ شہرہ آفاق کتاب 'حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد' نہ صرف تاریخی واقعات کا بیان ہے بلکہ یہ اس عہد کے دیگر گہرے حوالوں سے بھی وابستہ ہے۔ اس کتاب میں اس عہد کی معاشرتی، بحرانی اور حکومتی رویوں کی تصویر کشی اور ہنگاموں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی جدید ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک تھی۔ 1857 کے بعد ایک نئے عزم کے ساتھ ہندوستان کو اکائی صورت عطا کر کے انگریزی سامراج کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ دنیا کی تاریخ میں جمہوری طور پر آزادی کی جدوجہد کا یہ رنگ بہت کم نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کا مطالعہ مختلف سطحوں اور زاویوں کا حامل ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ عام قارئین کے لیے بھی یہ کتاب دلچسپ ہے اور مطالعے کے لیے نئے زاویے فراہم کرتی ہے۔ امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

(ڈائرکٹر)

فہرست

عرض مترجم	ix
اظہار تشکر	xi
اسلوب تحریر	xiii
تعارف	xv
باب 1 - پہلا بڑا چیلنج ——— 1857 کی بغاوت	1
باب 2 - سول اور قبائلی بغاوتیں	13
باب 3 - 1857 کے بعد کسان تحریکیں اور کسان بغاوتیں	25
باب 4 - کانگریس کا قیام - ایک فرضی داستان	39
باب 5 - انڈین نیشنل کانگریس کا قیام - ایک حقیقت	53
باب 6 - معاشرتی و مذہبی اصلاح اور قومی بیداری	67
باب 7 - کلونیل حکومت کی اقتصادی پالیسی	79
باب 8 - پریس کی آزادی کے لیے جدوجہد	93

باب9۔قانون ساز کونسلوں میں نشرواشاعت	107
باب10۔سودیسی تحریک1908۔1903	121
باب11۔کانگریس میں تفریق اور انقلابی تخویف پسندی کا ظہور	135
باب12۔پہلی جنگ عظیم اور ہندستانی قوم پرستی غدر	149
باب13۔ہوم رول، لیگ تحریک اور اس کی ناکامی	165
باب14۔گاندھی جی کی سیاسی زندگی کی ابتدائی سرگرمیاں	179
باب15۔عدم تعاون تحریک1920-22	195
باب16۔کسان تحریکیں اور 1920 کی دہائی میں نیشنلزم	211
باب17۔ہندوستان کا محنت کش مزدور طبقہ اور قومی تحریک	227
باب18۔گوردوارہ سدھار اور مندر داخلہ تحریک	245
باب19۔ٹھہراؤ کا زمانہ۔۔۔سوراج پریی، تغیر مخالفین (No changers) اور گاندھی جی	259
باب20۔بھگت سنگھ، سوریہ سین اور انقلابی تشدد پسند	275
باب21۔منڈلاتا طوفان	291
باب22۔سول نافرمانی تحریک1930-31	305
باب23۔کراچی سے واردھا تک	323
باب24۔بائیں بازو کا ابھار	339
باب25۔حکمت عملی پر بحث1937 -1934	357
باب26۔کانگریس حکومت کے اٹھائیس مہینے	373
باب27۔1930اور1940 کی دہائیوں میں کسان تحریکیں	399
باب28۔جنگ آزادی اور دیسی ریاستیں	415
باب29۔ہندستانی سرمایہ دار اور قومی تحریک	437
باب30۔نیشنلسٹ خارجہ پالیسی کا ارتقا	449
باب31۔فرقہ واریت کا جنم اور ارتقا	465

باب32۔فرقہ واریت کا معتدل دور	483
باب33۔ جناح، گولوا کر اور انتہا پسند فرقہ واریت	499
باب34۔ترپوری کے بحران سے کرپس مشن تک	515
باب35۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک اور آزاد ہند فوج	531
باب36۔دوسری جنگ عظیم کے بعد قومی لہر	549
باب 37۔آزادی اور ملک کی تقسیم	567
باب38۔قومی تحریک کی طویل المیعاد حکمت عملی	591
باب39۔ ہندستانی قومی تحریک اور اس کی نظریاتی وسعت	607
حواشی	621

عرضِ مترجم

تحریک آزادیٔ ہند پر پروفیسر بپن چندرا اور ان کے رفقا کے ذریعہ لکھی گئی شہرۂ آفاق کتاب ''اسٹرگل فار انڈیاز انڈپنڈینس'' کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ پروفیسر موصوف نے بڑی فراخدلی سے میری معلومات کی کم مائیگی کے باوجود اس کے ترجمہ کی اجازت دی ہے۔ میں ان کا بے حد مشکور ہوں نیز قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا جس نے بڑی فیاضی سے اس کو چھاپنے کا بیڑا اٹھایا ہے، میں تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ اس کاوش کا تمام تر کریڈٹ میرے داماد عزیزم محمد مستقیم انصاری ایڈوکیٹ اور میرے بیٹے عاطف ربانی ریسرچ اسکالر، ایس۔ آر۔ ڈی۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کو جاتا ہے جو اس کے محرک رہے ہیں اور اس کو شائع کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نیز میں شری ستیہ ورت سنگھ ریٹائرڈ بی۔ ایس۔ اے کا، جو ذی علم شخصیت اور میرے مخلص دوست ہیں بہت مشکور ہوں۔ اس کام کی تکمیل میں انھوں نے مسلسل میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

میں نے اپنے ترجمہ میں یہی کوشش کی ہے کہ اصل کتاب کی روح کی پوری ترجمانی ہو اور اس کی اسپرٹ کسی طرح فوت نہ ہو۔ اوریجنل کتاب میں لکھے گئے تاریخی حقائق میں میں نے کوئی ہیر پھیر نہیں کیا ہے۔ واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے میں نے اصل کتاب کے ایک

ایک جملہ اور پیراگراف کو ترجمہ میں لانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ دہلی یونیورسٹی کے ہندی مادھیم کاریانوے نردیشالیہ کے ذریعہ بہت پہلے کیا جا چکا ہے جس میں اصل کتاب کے مختلف ابواب کے مواد کو ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دے کر تحریر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے امتحان کے زاویہ نگاہ سے ایسا اسلوب مفید ہو، مگر مضمون نگاری کا حسن اس سے داغدار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ابواب ایسے ہیں جن کے اصل مواد کو ہی حذف کر دیا گیا ہے۔ مثلاً باب نمبر 28 رمیں راجکوٹ ریاست کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ بہرحال اصل کو سامنے رکھ کر اگر ہندی اور اردو ترجموں کا مطالعہ کیا جائے تو سارا فرق کھل کر سامنے آجائے گا۔

اصل کتاب کے مختلف ابواب کے مضامین کو تیار کرنے میں مصنفوں نے جن تحریروں سے حوالے اخذ کیے ہیں، ان کو نمبروں سے نمایاں کیا گیا ہے۔ میں نے اپنے ترجمہ میں اس کا پورا لحاظ رکھا ہے، البتہ ہندی ترجمہ ان حوالہ جات سے خالی ہے۔

میں اپنے مخلص دوست جناب مولانا صلاح الدین صاحب مظاہری کا بے حد احسان مند ہوں۔ انھوں نے بڑی خوشدلی سے مسودہ کا مطالعہ کیا، اس کے لسانی نوک و پلک کو سدھارنے میں مدد کی ہے اس کتاب کی کمپوزنگ جناب مولانا حیات اللہ صاب قاسمی، مہتمم جامعہ عربیہ مسعودیہ نور العلوم بہرائچ وصدر جمعیۃ علماء اتر پردیس کی کرم فرمائی سے جناب مولانا اخلاق احمد صاحب قاسمی کمپیوٹر استاذ جامعہ ہذا کے ذریعہ کی گئی ہے۔ میں ان سبھی حضرات کا انتہائی شکر گذار ہوں۔

سعید احمد انصاری

قیصر گنج، بہرائچ

یو۔ پی

اظہار تشکر

جزوی طور پر یہ کتاب تحریک آزادی پر ہو رہے تحقیقی منصوبہ (Research Project) کا ماحصل ہے اور یہ کام پروفیسر بپن چندر کی رہنمائی و نگرانی میں ہو رہا ہے۔ اس کو مالی امداد انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ (Indian Council of Social Science Research) سے مل رہی ہے۔ اس پروجیکٹ کی خاص بات یہ ہے کہ عام روایتی ذرائع، مثلاً حکومت کی قدیم تاریخی تحریروں، ذاتی کاغذوں اور مختلف اداروں سے حاصل شدہ دستاویزوں اور اخباروں کے علاوہ قومی تحریک میں شامل بنیادی سطح کے لوگوں کے تجربات اور معلومات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ہم ان مجاہدین آزادی کے بہت مشکور ہیں جنھوں نے گفتگو کرنے کے لیے ہم کو بڑی خندہ پیشانی اور خوش دلی سے اپنا قیمتی وقت دیا، ایسے مجاہدین آزادی کی تعداد پندرہ سو سے زیادہ ہے۔ اس پروجیکٹ میں مردلا مکھرجی، آدتیہ مکھرجی، سُچیتا مہاجن برابر کے شریک ہیں۔ ان سب کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ ہم کے۔ این پانکر کے ان دو مضامین کے لیے بے حد مشکور ہیں۔

ہم نے رومِلا تھاپر (Romila Thapar) اور ایس گوپال کے مفید مشوروں سے

بھی استفادہ کیا ہے۔ وی۔ آر۔ کرشن، ڈی۔ این گپتا، پریم چودھری، موہیندر سنگھ، ششی جوشی، کے۔ گوپال کُٹی، سی۔ ایس۔ کرشنا، گیان قدسیہ، وشالا کشی مینن، اے۔ ٹا کس، ونیتا دامودرن، ہرجوت اوبرائے (Harjot Oberoi) نیرجا سنگھ، سی۔ چندر موہن جیسے ہمارے کئی ساتھیوں اور طالب علموں نے اس پروجیکٹ کے ارتقا میں مدد دی ہے۔ یہ لوگ کئی طرح سے ہمارے معاون ثابت ہوئے ہیں۔

ان لوگوں کے علاوہ ہمارے بہت سارے دوستوں مثلاً پی۔ سی۔ جوشی، لاج پت جگا، بی۔ ڈی طالب، بَرُن ڈے، ایس بھٹا چاریہ، وی۔ این۔ دت، رویندر کمار۔ ہتیش سانیال، رن دھیر سنگھ، موہت سین، کیول ورما، پرمود کمار نے اپنی پُر مغز تنقیدی گفتگو سے ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے اور اس میں خاص گہرائی عطا کی ہے۔

نیشنل اور صوبائی سطح کے مختلف قومی محافظ خانوں، نہرو میموریل میوزیم، اور لائبریری، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی لائبریری، دہلی کے علاوہ ملک کے دوسرے کتب خانوں نیز نیشنل اور صوبائی محافظ خانوں کے ڈائرکٹروں اور ان کے اسٹاف کے بھی ہم بہت مشکور ہیں ان ذرائع کو استعمال کرنے میں ساری سہولتیں ان لوگوں نے ہم کو فراہم کی ہیں۔ نہرو میموریل میوزیم اور لائبریری کے بی۔ آر۔ نندا، وی۔ سی۔ جوشی، ڈی۔ این۔ پانی گرہی، اور ہردیو شرما کی مدد کے لیے ہم خصوصی طور سے احسان مند ہیں۔ حسب معمول اوشا چندر نے اس کتاب کی تکمیل میں مختلف طریقوں سے ہماری مدد فرمائی ہے۔ ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔

پبلشرز خصوصیت سے ڈیوڈ دیویڈر (David Davidar) اور سدا نند کے ہم بہت شکر گذار ہیں جنھوں نے ہر مرحلہ میں اس کتاب کو مرتب کرنے میں ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہم جے۔ ایس بویجا (J.S.Baweja) کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے بڑی خوشی سے اس دستاویز کو ٹائپ کرنے کی زحمت فرما کر اپنا گراں قدر تعاون دیا ہے۔

اسلوب تحریر

اس کتاب میں تحریر کردہ واقعات کے تسلسل کو بنائے رکھنے کے لیے مختلف عنوانات پر لکھے گئے مضامین کے مصنفین کے اسمائے گرامی کا حوالہ صرف یہیں دیا گیا ہے۔ کسی اور جگہ ان کے نام نہیں ملیں گے۔

تعارف اور ابواب 2‘ 3‘ 4‘ 5‘ 7‘ 8‘ 9‘ 11‘ 18‘ 19‘ 20‘ 23‘ 24‘ 25‘ 26‘ 30‘ 31‘ 32‘ 33‘ 34‘ 38‘ اور 39‘ بپن چندر کے، باب 1 اور باب 6 کے۔ این پانکر کے، 10‘ 17‘ اور 29 آدتیہ مکھرجی کے، 12‘ 13‘ 14‘ 15‘ 16‘ 21‘ 22‘ 27‘ 28 اور 35 مردولا مکھرجی کے اور 36 اور 37 سچیتا مہاجن کے تحریر کردہ ہیں۔

تعارف

ہندوستان کی تحریک آزادی درحقیقت زمانۂ حال کی سب سے بڑی عوامی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مختلف مذہب وملت نیز ہر طبقہ کے کروڑوں لوگوں کو سیاست کے میدان میں متحرک کر کے عظیم الشان برطانوی سلطنت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ جو لوگ موجودہ سیاسی اور سماجی ڈھانچوں کو بدلنا چاہتے ہیں ان کے لیے برطانوی، روسی، کیوبیائی اور ویت نامی انقلابات کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

ہندوستان کی قومی تحریک کے مختلف پہلوؤں خاص طور سے گاندھیائی سیاست کی حکمت عملی کو، سماج میں چلائی جارہی ان تحریکوں سے خاص مناسبت ہے جو قانون کے دائرے میں سرگرم عمل ہیں اور بنیادی طور سے جمہوری اور شہری حقوق جن کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اس حقیقت کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ لیچ والیسا (Lech Walesa) نے بڑی ہوشمندی سے پولینڈ کی سالیڈیرٹی (Solidarity) تحریک میں گاندھیائی حکمت عملی کے کچھ اجزا شامل کیے تھے۔

درحقیقت، ہندوستان کی قومی تحریک ایک نیم جمہوری یا جمہوری طرز کے سیاسی ڈھانچے کو کامیابی کے ساتھ ہٹائے جانے یا تبدیل کیے جانے کی واحد اور تاریخی مثال پیش کرتی ہے۔ یہ وہ واحد تحریک ہے جس میں منصب کی لڑائی کے گرامچی کے نظریاتی تناظر کو واضح طور پر اور

بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ یہی تحریک ہے جس میں ریاستی اقتدار پر قبضہ، انقلاب کے کسی ایک تاریخی لمحے میں حاصل نہیں کیا گیا۔ اخلاقی، سیاسی اور نظریاتی سطح پر برسوں کی طویل مدت میں اور بتدریجی مرحلوں میں تیار کیے گئے تسلط واقتدار مخالف دستوں کے ذریعہ کامیابی حاصل کی گئی۔ اس جدوجہد میں فعال مرحلوں کے ساتھ ساتھ غیر فعال اور خاموش مرحلے بھی آتے رہے۔

ہندوستان کی قومی تحریک اس بات کی بھی ایک مثال پیش کرتی ہے کہ موجودہ ڈھانچہ کے ذریعہ فراہم آئینی موقع کا، بغیر اس ڈھانچہ کا حصہ بنے، کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس تحریک نے اس موقع کو پوری طرح مسترد بھی نہیں کیا کیونکہ جمہوری سماج میں اس طرح کی نامنظوری سے سیاسی قیادت کو بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور تحریک بھی الگ تھلگ پڑ جاتی ہے ایسا نہ کر کے ہندستانی تحریک نے اپنی جدوجہد میں غیر آئینی طریقوں کے ساتھ آئینی موقع کا استعمال بھی بے حد مؤثر طریقہ سے کیا۔

ہندوستان کی قومی تحریک شاید اس بات کی سب سے اچھی مثال ہے کہ عام مقصد کے حصول کے لیے ایک بڑی اور ہمہ گیر تحریک کس طرح تشکیل کر کے چلائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس میں مختلف سیاسی اور نظریاتی فکر کے لوگ مل کر کام کرتے ہوئے سیاسی قیادت پر اپنا تسلط اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے آپس میں برسر مقابلہ (Competition) بھی رہتے تھے۔ اس میں جہاں سبھی بنیادی باتوں پر کھل کر بحث کی اجازت تھی، وہیں اندرونی رنگارنگی اور کشمکش کے باوجود آپسی اتحاد اور دشمن پر چوٹ کرنے میں قطعی کوئی کمی نہیں رہتی تھی، بلکہ ایسا آزادانہ ماحول ہی اس کی قوت کا سرچشمہ تھا۔

آزادی ملے چالیس سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے، پھر بھی ہم جنگ آزادی کے اتنے قریب ہیں کہ ٹھنڈے دماغ سے اس کے تجزیہ پر قادر ہیں۔ اس کا پورا پس منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، ماضی کے اس واقعہ کا تجزیہ کر کے ہم کو ضروری فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ ہمارا ماضی، حال اور مستقبل اس سے لاینفک طریقے سے جڑے ہیں۔ ہر زمانہ اور ہر سماج میں لوگ اپنی تاریخ تو بناتے ہیں مگر اس کی تخلیق کسی تاریخی خلا میں نہیں ہوتی۔ اس کی کوششیں چاہے جتنی نئی

ہوں مگر زمانہ حال میں اپنے مسائل کے حل کی تلاش کرنے میں اور اپنے مستقبل کا خاکہ بناتے وقت وراثت میں حاصل اقتصادی، سیاسی اور نظریاتی ڈھانچہ سے وہ ضرور متاثر، متحرک اور منضبط ہوتے ہیں۔ میری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ 1947 کے بعد ہندوستان نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کی جڑیں آزادی کی لڑائی میں بہت گہرائی تک گئی ہوئی ہیں۔ ہماری ترقی پر جن سیاسی اور نظریاتی خصوصیت نے فیصلہ کن اثر ڈالا ہے ان میں زیادہ تر ہم کو وراثتاً جنگ آزادی سے حاصل ہوئی ہیں۔ اور یہ میراث بغیر کسی امتیاز کے ملک کے سارے لوگوں نے چاہے وہ جس پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں، کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس پارٹی نے 1885 سے 1947 تک آزادی کے لیے جنگ کی وہ پارٹی نہیں بلکہ تحریک تھی اور اس میں دائیں اور بائیں بازو کے سبھی لوگ شامل تھے۔

اس جنگ آزادی کے اہم اور غیر معمولی پہلو کیا ہیں؟ اس تحریک کی بنیاد جدید قدروں اور معیاری اصولوں پر رکھی گئی تھی اور اس کے قائدین کی ہمہ گیر معاشرتی، اقتصادی، اور سیاسی فکر (یہ فکر جمہوری و شہری آزادی والے سیکولر بھارت کی تھی جس کی بنیاد خود اعتمادی اور مساوات پر مبنی نظام حکومت اور خود مختار غیر ملکی پالیسی پر تھی) اس تحریک کے نمایاں پہلو تھے۔

اس تحریک نے ہندوستان میں جمہوری نظریات اور جمہوری اداروں کو مقبول عام کیا۔ قوم پرستوں نے عام انتخابات کے ذریعہ ملک میں حکومت بنانے کے لئے زوردار مہم چلائی اور بالغ رائے دہی کا مطالبہ کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کا انعقاد جمہوری بنیادوں پر ہوا تھا اور اس کی شکل پارلیمنٹ کی سی تھی۔ اس میں لوگوں کو اپنے اپنے خیالات کے آزادانہ اظہار کی نہ صرف اجازت تھی بلکہ اس کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس کی اپنی تاریخ میں کچھ بڑے اہم فیصلے تلخ بحث ومباحثہ کے بعد کھلے ووٹ کے ذریعہ کیے گئے تھے۔

شروع ہی سے وطن پرستوں (Nationalists) نے پریس کی آزادی، اظہار کی آزادی اور تنظیم بنانے کی آزادی پر حکومت کے ذریعہ لگائی گئی پابندی کے خلاف جدوجہد کی اور اپنی اس جدوجہد کو قومی تحریک کا لازمی جز بنادیا۔ 39-1937 کے دوران حکومت چلانے کے

مختصر وقفہ میں کانگریس وزارتوں نے حقوق شہریت کی حدوں کو بہت وسیع کیا۔ اس سلسلہ میں کسی طرح کی کوئی تنگ نظری نہیں دکھائی گئی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے صرف ایک پارٹی تک ہی محدود رکھا گیا ہو۔ بلکہ ان تنظیموں کی بھی محافظت کی گئی جو فکر اور سیاسی اعتبار سے مختلف تھیں۔ اعتدال پسندوں نے انتہا پسند انقلابیوں اور کمیونسٹوں کا دوران مقدمہ ایک ہی طرح سے بچاؤ کیا۔

1928 میں پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈ ڈسپیوٹس بل کی مخالفت نہ صرف موتی لعل نہرو کی طرف سے ہوئی بلکہ مدن موہن مالویہ اور ایم۔ آر۔ جے کر (M.R. Jayakar) جیسے قدامت پسند لوگوں کے ذریعہ بھی اس کی مخالفت کی گئی۔ شہری آزادی اور جمہوری روایات ہی قومی تحریک کے مضبوط پہلو تھے جن کا پرتو آزاد بھارت کے دستور میں صاف دکھائی پڑتا ہے۔

آزادی کی جنگ اقتصادی ترقی کے لیے بھی ایک جنگ تھی۔ وقت کے ساتھ اقتصادی ترقی کا نظریہ پروان چڑھا۔ آزاد بھارت کی سوچ پر اسی نظریہ کا تسلط قائم ہوا۔ تحریک کے دوران کثرت رائے سے یہ بات تسلیم کی گئی کہ بھارت کو صنعت کاری (Industrialisation) کی بنیاد پر ترقی دینے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی اس کو غیر ملکی پونجی سے آزاد رکھنے کا بھی خیال پیدا ہوا۔ اس طرح اسے صرف ملکی وسائل والے صنعتی علاقہ پر منحصر رہنا تھا۔ اس معاملہ میں پبلک سیکٹر کو کام کرنے کی فیصلہ کن ذمے داری سونپی گئی اور 1930 کی دہائی میں اقتصادی منصوبہ بندی کو پورا کرنے کا تہیہ کیا گیا۔

بالکل شروع دنوں سے ہی تحریک نے غریبوں کی موافقت کا رویہ اپنایا تھا جو گاندھی جی اور بائیں بازو والوں کے آنے کے بعد اور مضبوط ہوا اور ان لوگوں نے یہ کوشش کی کہ تحریک اشتراکی نظریات کے تحت کام کرے۔ زراعت کے میدان میں مکمل اصلاح و سدھار کے پروگرام میں خاصی پیش قدمی ہوئی، پھر بھی اشتراکیت انڈین نیشنل کانگریس کا کسی بھی سطح پر مطمح نظر نہ بن سکا حالانکہ قومی تحریک میں 1930 اور 1940 کے درمیان اس نکتہ پر بڑی بحثیں ہوئیں۔ اگر چہ قوم پرستوں پر بائیں بازو کے ایک گروپ کے نظریات کا خاصہ اثر تھا، پھر بھی کانگریس اپنے سرمایہ دارانہ طرز زندگی کے نظریہ کو چھوڑ نہ سکی۔

قومی تحریک اپنے قیام کے اول روز سے ہی لامذہبی نظام حکومت (Secularism)

کا پابند تھی۔ اس کے قائدین نے سیکولرزم کی قدروں کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لیے سخت محنت کی اور انھوں نے فرقہ پرستی کی شدید مخالفت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد، فسادات میں ہونے والی خونریزی کے باوجود آزاد بھارت کے آئین نے لا مذہبی نظام کو قائم کرنے کی پوری گارنٹی دی۔

کانگریس کبھی بھی سوچ کی تنگی میں مبتلا نہیں رہی۔ راجہ رام موہن رائے کے وقت سے ہی ہندوستان کے رہنماؤں نے وسیع بین الاقوامی نظریہ اپنایا۔ سالہا سال ان لوگوں نے برطانوی حکومت اور اس کی پالیسی کے خلاف دنیا کے دوسرے ملکوں میں ہو رہی تحریکوں کو متحد کرنے کی حکمت عملی کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے یہ اصول بھی وضع کیا کہ ہندستانی برٹش حکومت سے نفرت کریں، انگریزوں سے نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز مردوں، عورتوں نیز دوسری سیاسی جماعتوں کے بڑے حصے نے ان کی حمایت کی۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام اور برطانوی حکومت کے خلاف دنیا میں چل رہی ترقی یافتہ طاقتور تحریکوں سے قریبی تعلق جوڑا۔ اس طرح غیر نسلی اور سلطنت مخالف نظریہ ہماری جدوجہد کی خصوصیت تھی اور وہی میراث کے طور پر ہماری موجودہ خارجہ پالیسی کا ایک جزاب بھی ہے۔

یہ کتاب مصنفین، ان کے ساتھیوں اور شاگردوں کے ذریعہ وضع کردہ فریم ورک ومنصوبہ کے تحت قومی تحریک پر لکھی گئی ہے۔ جس پر اب بھی تحقیقی مطالعہ کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کتاب کے لکھنے میں ہم نے شائع اور غیر شائع شدہ رسالوں، محافظ خانوں سے حاصل دستاویزوں، ذاتی کاغذوں اور اخباروں کا پورا پورا استعمال کیا ہے۔ ہماری معلومات کی بنیاد ان پندرہ سو سے زائد مجاہدین آزادی سے قلم بند بات چیت ہے جنھوں نے 1918 سے اس تحریک میں حصہ لیا تھا۔ فی الحال قارئین کی سہولت کے لیے اور جگہ کی قلت کی وجہ سے ان سرچشموں کا استعمال محدود دائرہ میں کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے خود کو انھیں حوالوں تک محدود رکھا ہے جو اچھے کتب خانوں میں آسانی سے دستیاب ہیں۔

اسی وجہ سے ہندستانی قومی تحریک کا تاریخ نویسی کے وسیع تناظر میں رکھ کر تجزیہ کیا گیا

ہے، جس میں کنز شہنشاہیت نواز سے لے کر مارکس نواز تک کے لوگ شامل ہیں۔ اگرچہ اس سلسلہ میں طرح طرح کے رسمی اور دقیانوسی خیالات پائے جاتے ہیں مگر ہم نے جگہ کی قلت سے ان باتوں پر بحث کرنے سے پرہیز کیا ہے جو ہمارے نظریہ سے مختلف ہیں، پھر بھی کہیں کہیں صرف حوالوں کے طور پر بھی بحث کرنی پڑی ہے مثلاً کانگریس کے وجود میں آنے کے سلسلہ میں ہم نے باب چار میں اُس پرانے اور دیرینہ مسئلہ پر بحث کی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کانگریس کا جنم سیفٹی وال (Safety Valve) کے طور پر ہوا تھا۔ پڑھنے والوں کے ساتھ پورا انصاف ہو، اس کے لیے ہم نے صرف تاریخ نویسی کے خاص میلانات کو ان کے سارے خدو خال کے ساتھ مختصر تحریر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے متبادل خاکہ بھی پیش کیا ہے جس کی بنیاد پر یہ کتاب تحریر کی گئی ہے۔

تاریخ نویسی کے آمرانہ نظریہ (Imperial approach) سے میرا گہرا اختلاف ہے۔ ہندستانی تاریخ میں یہ نظریہ سب سے پہلے لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin)، لارڈ کرزن اور لارڈ منٹو (Lord Minto) نیز صوبہ کے سکریٹری جارج ہیملٹن (George Hamilton) کے سرکاری اعلانات سے ہمارے سامنے آیا ہے۔ وی۔ چرول (V.Chirol) رولٹ کمیٹی رپورٹ (Rowlatt Committee Report) ورنی لاوٹ (Verney Lavett) اور مانٹگو چیمس فورڈ رپورٹ (Montagu Chelmsford Report) نے اسے اور زیادہ مدلل بنا کر پیش کیا ہے۔ پہلی بار ایک امریکی عالم بروس ٹی میکلی (Bruce T.MeCully) نے 1940 میں اس کو نظریاتی جامہ پہنایا۔ اسی نظریہ کے لبرل پہلو کو ریجنالڈ کوپ لینڈ (Reginald Coupland) اور بعد میں پرسیول اسپیر (Percival Spear) نے تاریخ نویسی میں اپنایا جبکہ اس کے دقیانوسی پہلو کو انل سیل (Anil Seal) اور جے۔ اے۔ گیلا گھر (J.A.Gallaghar) اور اس کے شاگردوں اور پیروؤں نے 1968 کے بعد اور آگے بڑھایا۔ چونکہ تعلیمی حلقہ میں حریت پسندانہ روایت اب نہیں رہ گئی ہے، اس لیے جگہ کی قلت سے ہم اس پر غور نہیں کریں گے۔

قدامت پسند کلونیل حکمراں اور کیمبرج دبستاں کے (Cambridge school) نام سے معروف مؤرخین کا سلطنت نواز حلقہ اس حقیقت سے انکار کرتا ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی، اور تمدنی ترقی میں برطانوی حکومت رکاوٹ تھی۔ اس لیے وہ اس کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے ضروری نہیں مانتے ہیں۔ کلونیل حکومت کو وہ صرف غیر ملکی حکومت مانتے ہیں۔ اس طرح قومی تحریک کے بارے میں ان کا نظریہ ہندستانی عوام اور کلونیل حکومت دونوں کی متضاد دلچسپیوں پر ٹکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کے بھی فکر مند ہیں کہ قومی تحریک کے جنم کے پیچھے یہی وجہ کام کر رہی تھی۔ اس لیے براہ راست یا بالواسطہ وہ اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ قومی تحریک ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مخالفت میں آگے آئی تھی۔ برٹش حکومت کے خلاف ہندستانی عوام کی اس جنگ کو وہ نقلی لڑائی مانتے ہیں گویا دشہرہ میں دو کاغذی پتلوں کی لڑائی، صرف نقلی لڑائی۔ 1 مرکزی تضاد سے انکار کی وجہ سے اہل علم کا نظریہ ہی ماند پڑ گیا ہے، حالانکہ ان کے ذریعہ کی گئی تحقیق سے حاصل شدہ مواد کو اگر دوسرے فریم ورک میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس کے استعمال سے بڑی مدد ملے گی۔

شہنشاہیت نواز مؤرخین اس بات سے مطلق انکار کرتے ہیں کہ بھارت قوم بننے کے مرحلہ میں تھا۔ اس کے برعکس ان کا خیال ہے کہ بھارت مختلف دھرموں، گروہوں، اور دلچسپیوں کا مجموعہ تھا اس طرح ہندستانی قوم یا ملت یا سماجک طبقہ کے اردگرد سیاسی جماعت بندی کے قومی نظریہ کو یہ لوگ نہیں تسلیم کرتے ہیں بجائے اس کے وہ مانتے ہیں کہ ان طبقات کی جگہ یہاں لوگوں کی شناخت ہندو، مسلمان، برہمن، آریہ، شرفا (Bhadra lok) اور اسی طرح دوسرے گروہوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ ان کے مطابق ذات اور مذہب کی بنیاد پر بنے صدیوں سے چلے آرہے یہ گروہ سیاسی تنظیم کے خاص اساس تھے۔ اور اس طرح مذہب کی بنیاد پر قائم سیاست اصل چیز ہے، قومیت (Nationalism) تو ان کا اوپری لبادہ یا خول ہے۔ جیسا کہ سیل کہتا ہے "دور سے دیکھنے میں جو چیز سیاسی جدو جہد معلوم پڑتی ہے وہی قریب سے لگتی ہے کہ وہ اپنے طبقہ کی حالت کو سدھارنے میں محنت کر رہی ہے"2 (وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہی بات ہندستانی قومیت کو چین، جاپان، مسلم ممالک، اور افریقہ کے قومی نظریہ سے مختلف کرتی ہے)3

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر ہماری قومی تحریک شہنشاہیت کے خلاف ہندستانی عوام کے مفاد میں بات نہیں کرتی ہے تو پھر کس کی بھلائی کیلئے کوشاں ہے؟ ایک بار پھر انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی شروعات کے برٹش افسروں اور شہنشاہیت کے مبلغوں نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ شہنشاہی دبستان (Imperial School) کے مؤرخین نے اس بات کو پرزور طریقہ سے کہا کہ ہندوستان کی قومی تحریک عوامی تحریک نہیں تھی بلکہ یہ اہل شرفا (Elite groups) کی ضرورتوں اور مفادکو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی اور اس طرح اہل شرفا کی ضرورتیں اور دلچسپیاں قومی تحریک کی بنائے پیدائش اور اس کی محرک تھیں۔ ان جماعتوں کی تخلیق کبھی مذہب یا ملت کے گرد اپنی شناخت کے طور پر اور کبھی سرپرستی (Patronage) کے گرد بنے سیاسی تعلق کی بنا پر ہوئی تھی۔ دونوں ہی صورتوں میں ان کی اپنی خودغرضی، تنگ نظری اور مفاد پرستی ان کو برٹش حکومت سے یا آپس میں ایک دوسرے سے مخالفت کرنے پر آمادہ کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں بنیادی اعتبار سے قومیت ایک ایسا نظریہ تھا جس کا استعمال اہل شرفا اپنی خودغرضی کو حق بجانب ٹھہرانے اور رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے کرتے تھے۔ اس طرح قومی تحریک ان کا صرف آلہ کار تھا جس کے ذریعہ وہ عوام کی جماعت بندی کرکے ان کے سہارے اپنے مقصد کو پورا کرتے تھے۔

گیلگھر، سیل اور ان کے شاگردوں نے اس نقطۂ نظر میں مزید اضافہ کیا ہے کہ ڈفرن، کرزن، چرول، لاوٹ (Lovett) میکلے (Mecully) اور بی۔ بی۔ مشرا نے یہ کہا کہ متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ مایوس لوگوں نے ''خیرخواہ حکومت (Benevolent Raj) سے لڑنے کے لیے قومیت (Nationalism) کا سہارا لیا۔ سیل نے ایک متوازی نظریہ پیش کیا جو چرول اور رودولٹ کمیٹی رپورٹ میں موجود تھا، وہ یہ کہ انگریزی سرکار کا لطف وکرم حاصل کرنے کی غرض سے قومی تحریک ہندستانی شرفا کی ایک دوسرے کے خلاف جنگ تھی۔ وہ اس طرح لکھتا ہے کہ ''یہ تسلیم کرنا بے حد گمراہی کی بات ثابت ہوگی کہ ملک کے عوام کی یہ جتھہ بندی مل کر حکمراں کے خلاف ہو رہی تھی۔ یوں تو شہنشاہیت اور قوم پرستی کے درمیان ہونے والی اوپری لڑائی پر بڑی توجہ دی گئی ہے، مگر ان کے درمیان حقیقی شرکت داری کا مطالعہ بھی بہت مفید ہوگا'' [4] پھر تو قومی تحریک کے

جنم اور اس کے ارتقا میں برٹش حکومت کی خاص مدد یہ تھی کہ اس نے ہندوستانیوں کے بیچ حسد پیدا کر کے کشاکش کو تیز کیا، رقابت اور دشمنی کے نئے میدان کھولے اور نئی تنظیموں کو جنم دیا۔

سیل، گیلاگھر اور ان کے شاگردوں نے اس مفروضہ کو اور مضبوط کیا جس کی بنیاد پر شرفا کے درمیان جماعتیں قائم ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے برٹش مورخ لیوس نیمیر (Lewis Namier) کے نقطۂ نگاہ کی پیروی کی اور مزید دلیل یہ پیش کی کہ ان جماعتوں کی تخلیق 'مالک اسامی' (Patron-Client) تعلقات کی بنا پر ہوئی تھی۔ اپنی بات کو اصولی جامہ پہناتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جیوں جیوں برٹش سرکار نے انتظامی اور سیاسی حکومت کا دائرہ نچلی سطح یعنی صوبوں اور ضلعوں تک بڑھایا، مقامی راجاؤں نے مالکوں کو مجتمع کرنے کا کام شروع کیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی بہبودی میں ہی کام کرتے تھے۔ ہندستانی سیاست کی شروعات اسی طرح کے 'مالک اسامی' کے تعلق کی بنا پر وجود میں آئی۔ دھیرے دھیرے بڑے نیتا ابھرنے لگے۔ ان نیتاؤں نے مقامی نیتاؤں کی سیاست کو چھوڑ کر، دلالی کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور چونکہ برٹش حکومت پورے ملک پر قابض تھی، اس لیے ملکی سطح کے دلال ابھر آئے۔ قومی تحریک میں اسامیوں کی بھرتی کے لیے صوبائی سطح کے دلالوں کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ نچلی سطح کے ان دلالوں کو نائب ٹھیکیدار (Sub Contractors) بھی پکارا گیا ہے۔ سیل کہتا ہے کہ گاندھی، نہرو و پٹیل خاص سیاسی دلال تھے۔ ان مورخوں کے مطابق جو لوگ ان دلالوں سے متاثر ہوئے وہ سب خود بخود 1918 میں اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ یہی مورخین مزید کہتے ہیں کہ جنتا سے متعلق پریشانیوں جیسے افراط زر، بیماری، قحط، مہنگائی۔ جن کا تعلق کالونیائی حکومت سے مطلق نہیں تھا، کا ذکر بڑی چالاکی سے لوگوں کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لیے کیا گیا تاکہ وہ ان بااثر دلالوں کی لڑائی میں حصہ لے سکیں۔

اس طرح مورخین کے اس دبستان کے مطابق ہندوستان کی قومی تحریک ہندستانی شرفا کے درمیان صرف تسلط حاصل کرنے کا بہانہ تھی۔ ایسی صورت میں شہنشاہیت کو اکھاڑ پھینکنے اور آزاد حکومت کے قیام کے لیے عوامی تحریک کی حیثیت سے، اس کے وجود و جواز سے یہ مورخین انکار کرتے ہیں۔ قومی تحریک کے بارے میں ان کے ذریعہ کیا گیا تجزیہ قطعی ناقص ہے۔ انھوں

نے اپنے تجزیہ میں قوم، طبقہ، رائے عامہ، نظریہ وغیرہ باتوں پر سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے جبکہ عام طور سے مؤرخین ان باتوں کا ذکر یورپ، ایشیا اور افریقہ کی قومی تحریکوں اور انقلابی کاموں کے بارے میں ضرور کرتے ہیں۔ مؤرخین کا یہ نظریہ نہ صرف کالونیائی حکومت کے ذریعہ کیے گئے استحصال، لوگوں کی پسماندگی اور مرکزی تضاد سے انکار کرتا ہے بلکہ ان لوگوں کے معیاری اصول وقربانی کو مسترد کرتا ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں اپنی جانیں دی تھیں۔ ڈاکٹر ایس۔ گوپال نے یوں کہا ہے "نیمیر (Namier) پر یہ الزام تھا کہ اس نے عقل کو سیاست سے باہر نکال دیا مگر یہ دبستاں اس سے کئی قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے نہ صرف عقل کو ہندستانی تحریک سے بے دخل کیا بلکہ شائستگی، اخلاق، ایمانداری، اور بے لوث عہد وپیماں کو بھی اس سے باہر کر دیا۔[5] اس کے علاوہ یہ تجزیہ مزدوروں، کسانوں متوسط طبقہ کے لوگوں اور عورتوں کا جنگ آزادی میں حصہ داری سے انکار کرتا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بچوں اور گونگے بہروں جیسا مانتا ہے جو مطلق اپنی ضرورت اور مفاد کے بارے میں سمجھ نہیں رکھتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ اگر ایسا ہی تھا جیسا یہ کہ مؤرخین کہتے ہیں تو پھر کلونیل حکمراں ان گونگے بہرے لوگوں کو اپنی سیاست کے پیچھے مجتمع کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوئے۔

کچھ مؤرخین میں ایک نیا میلان (Trend) دکھائی پڑا ہے۔ وہ اس کو سبالٹرن (Subaltern) نام سے موسوم کرتے ہیں (یعنی نچلے طبقے کے لوگوں کا مطالعہ) اس میلان کے مؤرخین پہلے کے سارے تاریخی دستاویزوں سے مع مارکسی تناظر میں لکھی تاریخ کو شرفا کی تاریخ نویسی (Elite Historiography) کہہ کر خارج کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ پرانی محدود تاریخ نویسی (Blinded Historiography) کو عوامی تحریک نویسی میں بدلنا چاہیے۔

ان کے نزدیک کلونیل حکومت کے دوران ہندوستان میں بنیادی اختلاف شرفا (Elite) جن میں ہندستانی اور انگریز دونوں شامل تھے اور نچلے طبقے کے لوگوں کے درمیان تھا۔ حکومت سے عوام کی کوئی مخالفت نہیں تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حکومت کے خلاف عوام میں اتحاد

کبھی قائم نہیں ہوا۔ اور یہ کہ ہندستانی قومی تحریک جیسی کوئی چیز وجود میں آئی ہی نہیں اس کے بجائے وہ تحریک کے دو صاف مختلف شاخوں (Streams) کی بات کرتے ہیں۔ ایک نچلہ طبقہ تھا جو برطانوی حکومت کے خلاف حقیقی لڑائی لڑ رہا تھا اور دوسرا اونچا طبقہ (Elite) قومی آزادی کی مصنوعی لڑائی میں مصروف تھا۔ اونچے طبقے والے تحریک کے قائدین انڈین نیشنل کانگریس کے حاکم لیڈران تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی حاکمانہ قیادت میں چلائی جارہی اونچے طبقے کی تحریک حکومت پر قبضہ کرنے کا صرف ایک حیلہ تھا۔

سبالٹرن دبستان کے ذریعہ قومی تحریک کی کردار نگاری میں سلطنت نواز اور جدید سلطنت نواز مؤرخوں کی کردار نگاری میں چونکانے والی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف اس قدر ہے کی جدید سلطنت نواز تحریکی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتا، بلکہ ساری تحریک کو اسی طرح بیان کرتا ہے، اس کے برعکس سبالٹرن فلسفہ، تاریخ کو دو حصوں میں الگ کر کے جدید سلطنت نواز حلقہ تاریخ کو شرفا کی شاخ کے ساتھ چسپا کر دیتا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت وہ غیر تاریخی اور ہر طرح کی مقبول عام من گڑھت جنگجوئیت، عقل و دانش کے قصیدے پڑھتا ہے۔ اہل علم طبقہ کی امارت (Leadership) اور اونچے طبقہ کی ہر پہل اور سرگرمیوں کو غیر تاریخی مان کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ نتیجتاً یہ نظریہ بھی برٹش حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی حقیقی اور تاریخی ہر ایک جدوجہد کو غیر قانونی تصور کرتا ہے۔ اس نئے دبستان نے عوام کی تاریخ کو عنوان بنا کر تاریخ نویسی کا قصد کیا تھا لیکن ابھی تک وہ نیا سرچشمہ تلاش نہیں کر سکا ہے جو عوام کے احساسات کی بہتر عکاسی کر سکے۔ اس نئی تاریخ نویسی کا انحصار اسی پرانے اور مخصوص ڈھروں پر ہے۔

دوسرا مکتبہ فکر قوم پرست مؤرخین کا ہے۔ برطانوی دور میں لالہ لاجپت رائے، اے۔ سی۔ مجومدار (A.C.Majumdar)، آر۔ جی۔ پرھان، پٹابھی سیتارمیا (Pattabhi Sitaramayya)، سریند ناتھ بنرجی، سی۔ایف۔ اینڈریوز (C.F.Andrews) اور گرجا مکرجی جیسے سیاست میں سرگرم لوگ اس مکتبہ کے خاص افراد تھے۔ ان کے بعد ماضی قریب

میں بی۔آر۔آنندا، بشیشور پرشاداور امیلس ترپاٹھی (Amles Tripathi) نے اسی فکر کے تحت تاریخ نویسی میں بہت نمایاں کام انجام دیا۔ان سبھی قوم پرست مؤرخوں خصوصاً حال کے مؤرخین نے برطانوی حکومت کے استحصالی کردار کے تئیں خاص بیداری کا ثبوت دیا ہے مگر مجموعی طور سے ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قومی تحریک لوگوں کی آزادی کے تئیں بیداری وشعور کا ہی نتیجہ ہے۔ان کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہندوستان قوم بننے کے مرحلہ سے گذر رہا تھا۔اس طرح یہ لوگ قومی تحریک کو عوامی تحریک کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

بہرحال ان مؤرخین کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے ہندستانی سماج کے اندر ذات پات اور طبقوں کے درمیان جو تصادم تھا اس کو یا تو نظر انداز کیا ہے یا بہت کم اہمیت دی ہے۔ان کے مطابق قومی تحریک جہاں سارے ہندوستانیوں یا پوری قوم کی نمائندگی کرتی تھی (کالونیائی حکومت کے خلاف سبھی طبقوں کی) وہیں اس نے یہ صرف ایک طبقہ کے نظریہ سے کیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی تحریک پر سیاسی امارت قائم کرنے کے لیے سماج کے مختلف فکروں کے درمیان برابر کشمکش چلتا رہا۔ عام طور سے یہ مؤرخین وہی صورت اختیار کرتے ہیں جو قومی تحریک کے رجعت پسند عناصر نے اپنائی ہے اس کو پوری تحریک کے برابر رکھا ہے۔قومی تحریک کی حکمت عملی اور نظریہ کے بارے میں ان کی یہ تشریح ناکافی ہے۔

مارکسی دبستان کے مؤرخ اصل منظر پر تھوڑی تاخیر سے آئے۔ جہاں تک قومی تحریک کے مطالعہ کا تعلق ہے اس کی بنیاد آر۔ پام۔دت (R.Palm Dutt) اور اے۔آر۔ڈیسائی نے رکھی تھی مگر کئی سالوں میں دوسرے مؤرخین نے اس کو اور مضبوط کیا۔سلطنت نواز مؤرخین کے برعکس، مارکسی مورخین نے خاص تضاد کے ساتھ قوم کے تشکیلی مرحلہ کو بخوبی سمجھا ہے اور برخلاف وطن پرست مورخین کے انھوں نے ہندستانی سماج کے اندرونی تضاد کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔

بہرحال کئی مورخین خاص طور سے رجنی پام دت، برطانیہ مخالف خاص کشمکش اور ہندستانی سماج کے اندر ثانوی اہمیت کی کشمکش کے تجزیہ میں ایک دوسرے کے ساتھ تال میل نہیں بٹھا سکے ہیں اور ان کو ہم وزن کرنے کا رجحان بھی ان میں نہیں دکھائی پڑتا ہے۔اس تحریک کو

اگرچہ وہ بورژوا (Bourgeoisie) تحریک نہیں مانتے ہیں تاہم اس کو بورژوا کے سانچے میں رکھ کر دیکھنے کی طرف ضرور مائل ہیں۔ان کے جائزہ میں تحریک کا ظاہری مقصد اور اس کا جملہ طبقاتی کردار سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ان کے مطابق تحریک میں بورژوا کا رول بہت اہم ہے۔ان کے نزدیک بورژوا اور قومی امارت ایک ہی چیز ہے۔اس کے طبقاتی کردار کی تشریح بھی وہ تحریک کے طریقوں کی بنیاد پر کرتے ہیں (جیسے اس کی اہنسائی شکل) اور اسی حقیقت کی اساس پر تحریک جنگی حکمت عملی کے تحت پیچھے ہٹی بھی اور معاہدے بھی کیے۔کچھ مؤرخین تو اس سے بھی زیادہ تنگ نظر ہیں۔ان کے مطابق مالی وسائل میں سیاست کا راستہ طے کرنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔وہی اس کے سمت کا تعین کرتے ہیں۔مارکسی فکر کے بہت سے مؤرخین بھی قومی تحریک کی حکمت عملی، پروگرام ونظریہ وغیرہ کا تاریخی جائزہ نہیں لیتے ہیں کہ اس نے کس حد تک عوام کو مجتمع کیا اور اس سلسلے میں اس کے تدبیری طریقے کیا تھے؟

موٹے طور پر ہمارا مقصد مارکسی روایارت کے تحت رہ کر مندرجہ ذیل نقطوں کا پتہ لگاتا ہے: کالونیائی بھارت میں تضاد کی شکل، بنیادی اور ثانوی تضاد کا آپسی تعلق، تحریک کا طبقاتی کردار، بورژوا اور دوسرے سماجی طبقوں کے درمیان تعلق اور انڈین نیشنل کانگریس اور اس کی قیادت یعنی قیادت کا طبقہ اور پارٹی سے رشتہ، تحریک کی مختلف شکلیں (اس میں اہنسائی شکل بھی شامل ہے) اور طبقاتی کردار، نظریہ، حکمت عملی اور تحریک کا عوامی کردار وغیرہ وغیرہ کو ایسے ڈھانچہ میں رکھ کر جانچا گیا ہے جو رجنی پامدت اور اے۔آر۔ڈیسائی مع دوسرے موجودہ قدیمی مارکسی نظریہ سے کئی باتوں میں مختلف ہے۔اسی وسیع منصوبے کا خدوخال نیچے درج ہے:

ہمارے خیال سے ہندوستان کی جنگ آزادی بنیادی اعتبار سے یہاں کی عوام اور برطانوی حکومت کی متضاد دلچسپیوں کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھی۔ملک کے قائدین نے شروع سے ہی اس تضاد کو سمجھ لیا تھا۔وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ہندوستان اقتصادی طور سے مستقل پچھڑتا جارہا ہے۔بغیر وقت ضائع کیے انھوں نے کلونیل حکومت کا سائنسی جائزہ لینے کی ایک راہ

نکالی۔ انیسویں صدی میں دراصل وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے حکومت کے اقتصادی پہلو کی تحقیق کی اور اس کے پیچیدہ ڈھانچہ کو واضح کیا۔ ان لوگوں میں حکومت کی اصل پالیسی اور اس کے پیچیدہ ڈھانچہ کی باریکیوں کو سمجھنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ کلونیل حکومت کی رعیت کی حیثیت سے ہندستانی عوام کا تجربہ حاصل کر کے اور اس کی بہبودی کو ذہن میں رکھ کر قومی لیڈروں نے بتدریج حکومت مخالف نظریہ وضع کیا اور اسی کو انھوں نے تحریک کی بنیاد بنایا۔ عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے اسی نظریہ کے تنقیدی جائزہ کی بڑی زوروشور سے تشہیر و تبلیغ کی گئی۔

قومی تحریک نے اس وقت بھی اہم کردار ادا کیا جب ہندستانی عوام قوم بننے کے تاریخی مرحلہ سے گذر رہی تھی۔ دادا بھائی نوروجی، سریندرناتھ بنرجی، اور تلک سے لے کر گاندھی جی اور جواہر لعل تک کے قومی لیڈروں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ ہندستان ابھی پوری طرح منظم قوم نہیں بن پایا ہے، البتہ قوم بننے کے مراحل سے گذر ضرور رہا ہے۔ اس لیے تحریک کا خاص کام اور مقصد یہ ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف ہندستانی عوام کی بڑھتی ہوئی متحدہ جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں قومی تحریک بیک وقت قوم بننے کے مرحلہ کا نتیجہ اور بذات خود اس سرگرمی کا محرک تھی۔ ہندستان کی گوناگوں علاقائی، لسانی اور نسلی شناخت کبھی بھی اس کے قوم بننے کے مرحلہ میں حارج نہیں ہوئی بلکہ قومی شناخت ابھرنے کے ساتھ دوسری اور چھوٹی چھوٹی شناختوں کا وجود ہوا اور ان سب نے ایک دوسرے کو قوت بخشی۔

قومی تحریک سے پہلے کلونیل حکومت کے خلاف جو مزاحمت تھی وہ دونوں ابھرتی قوم اور کلونیل حکومت دونوں کی خصوصیات کو سمجھنے میں ناکام رہی۔ دراصل اس وقت تک ان کی یہ خصوصیات اتنی صاف اور عیاں بھی نہیں تھیں کہ سطح پر ہی نظر آجاتیں۔ گہرے مطالعہ اور تجربہ کے بعد ہی ان کو سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لیے قوم کے دانشوروں نے ان کا تحقیقی جائزہ لیا اور ان کی اصل حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس طرح انھوں نے لوگوں کے اندر پوشیدہ برطانیہ مخالف نئی سوچ کو ابھارنے میں اہم رول ادا کیا۔

باب 38 میں اس بات کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے کہ ہندستانی قومی تحریک منفرد حکمت عملی کی حامل تھی۔ اس کے اندر مختلف روپ خاص طو سے 1918 کے بعد باہم مربوط تو

ہو گئے تھے مگر ان کو اصولی جامہ نہیں پہنایا جا سکا تھا۔ اسی حکمت عملی کے تحت عوام کا دل جیتنے کی غرض سے سیاسی لیڈر شپ (Hegemony) کی مہم چلائی گئی تھی۔ اس کا مقصد کلونیل حکومت کے دو اہم نظریہ کو ختم کرنا تھا جن کے تحت انگریزوں نے حکومت کرنے کے لیے ہندستانی عوام سے خاموش رضا مندی حاصل کر لی تھی۔ یعنی پہلی بات یہ کہ انگریزی حکومت ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے کام کر رہی ہے اور دوسرے یہ کہ حکومت نا قابل فتح اور غیر مغلوب ہے۔ اس کو اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں دوسری بات کے جواب میں جواہر لعل نہرو نے ''بھارت کی کھوج'' (The Discovery of India) میں لکھا تھا ''ان کی (گاندھی جی کی) تعلیم کا نچوڑ تھا بے خوفی..... صرف جسمانی قوت و ہمت نہیں بلکہ بے خوف دل و دماغ (Mind).... برٹش ہندوستان میں خاص طور سے خوف کا ماحول تھا۔ چاروں طرف پھیلا اور گھٹن بھرا (Strangling) خوف، فوج کا خوف، پولیس کا خوف، چاروں طرف پھیلا ہوا جاسوسوں کا خوف، سرکاری حکام کا خوف، قانون اور جیل کا خوف، زمیندار کے گماشتوں کا خوف، بے روزگاری اور فاقہ کشی کا خوف........ یہ سارے خوف لوگوں کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ چاروں طرف چھائے اسی خوف کے خلاف گاندھی جی نے مصمم اور پر سکون لہجہ میں کہا تھا ''خوف مت کرو''[6]

سوال یہ اٹھتا ہے کہ قومی قیادت کی ارتقا کس طرح کی جائے؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص نظریاتی ڈھانچہ کے تحت سامراج مخالف تحریک چلاتے ہوئے کالونیائی حکومت میں بسنے والے سبھی لوگوں، مختلف طبقوں، جماعتوں اور گروہوں کے مفاد اور دلچسپیوں کے درمیان ہم آہنگی قائم کر کے قومی قیادت کی ارتقا کی جاتی ہے۔ قومی تحریک کے اندر نظریاتی قیادت کے لیے جد و جہد تال میل کے سوال پر نہیں ہوتا، بلکہ اس جد و جہد کا تعلق فائدوں کے نسبتی توازن کو تبدیل کرنے سے ہے اور یہ فائدے ایسے ہی تال میل سے ملتے ہیں۔ کالونیائی صورت حال میں، سامراج مخالف جد و جہد کی اہمیت اول اور سماجی جد و جہد (طبقاتی اور نسلی جد و جہد) کی دوئم تھی۔ اس لیے ہندستانی سماج میں مخالف طبقات اور ذاتوں میں کشمکش کا بیج بونا ضروری تھا مگر اس کے بعد اس کشمکش کو بغیر انتہا تک پہنچائے الگ الگ رعایت دے کر ان میں

مصالحت کرانا بھی لازمی امر تھا۔

(چونکہ سیاسی قیادت کا استعمال کالونیائی سماج میں اس کے حکمرانوں کے ذریعہ اور سماج مخالف طاقتوں میں مختلف طریقوں سے ہوتا ہے اور ایسی کیفیت سرمایہ دارانہ سماج میں نہیں ہوتی ہے، اس لیے ہم نے سیاسی قیادت کا تصور، گرامشی (Antonio Gramsci 1891-1937) کو معیار بنا کر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ کیا ہے۔ سیاسی قیادت کا تصور جس طرح ہم نے اپنایا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سیاسی قیادت جو کلی اختیار کے خلاف ہو۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق اس صلاحیت اور حکمت عملی سے ہے جس کے ذریعہ حکمران یا غالب طبقات، محکوم عوام کی اور عوامی تحریک کے قائدین اپنے پیروؤں کی رضا حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان پر اپنی اخلاقی اور نظریاتی قیادت چلاتے ہیں۔ گرامشی کے مطابق سیاسی قیادت والا طبقہ کئی خلاف طبقوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے لائق ہوتا ہے اور اس طرح وہ ان کے کام اور تقاضوں کی علم برداری کر کے پورے سماج کی دلچسپیوں کا نمائندہ بن کر ابھرتا ہے۔ یہ رواج (Institution) سماجی تعلقات اور نظریات کا تانا بانا بن کر ان کے ذریعہ اپنے سبھی حلیفوں کو اپنی قیادت میں متحد کرتا ہے۔ گرامشی کی سیاسی قیادت کا تصور اس معاشرتی نظریہ و تحریک کے خلاف ہے جس کا تعلق سیاسی و فکری اعتبار سے ایک ہی طبقہ کی وقتی دلچسپیوں تک محدود رہتا ہو مگر اس کی منشا تو ان دونوں کے درمیان سیدھا تال میل بٹھا کر طبقاتی دلچسپیوں سے فکری نظریہ بھی پیدا کرنا ہوتا ہے)۔

پھر قومی حکمت عملی کے تحت تحریک کے دو مختلف دور باری باری آتے جاتے رہتے تھے۔ کبھی موجودہ قانون کی خلاف ورزی ہوتی تھی اور کبھی قانون کے دائرہ میں رہ کر زبردست سیاسی تحریکیں چلائی جاتی تھیں۔ اس حکمت عملی میں یہ بات مان کر چلا گیا تھا کہ عوامی تحریکوں کا یہ خاصہ ہے کہ ان میں نشیب و فراز ہو، ترقی و زوال ہو۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ عوام کو قانون کی گرفت سے باہر نکال کر طویل جدوجہد میں لگایا جا سکے۔ اس طرح کی جدوجہد میں بڑی قربانی درکار ہوتی ہے۔ اس حکمت عملی کے مختلف رویوں میں آزادی کی جنگ کو آگے بڑھانا مقصود تھا۔ حالانکہ آخری حد پار کیے بغیر آزادی نہیں حاصل ہوئی تھی۔

کچھ اہم مسائل کے تحت تعمیری کام شروع کیے گئے مثلاً کھادی، قومی تعلیم، ہندو مسلم

اتحاد، غیر ملکی کپڑوں اور شراب سے اجتناب وان کا بائیکاٹ، ہریجنوں اور قبائلی قوموں کی معاشرتی ترقی، چھوا چھوت کے خلاف جدوجہد۔ یہ سارے کام قومی تحریک کے پہلو تھے۔ خاص طور سے ان مسئلوں کو اس وقت اٹھایا جاتا تھا جب قومی تحریک قانون کے دائرہ میں رہ کر چلائی جاتی تھی۔ برٹش حکومت کے قانونی ڈھانچہ میں رہ کر بغیر اپنا وجود کھوئے اور بغیر اس کا شکار بنے تحریک میں شرکت کرنا اس حکمت عملی کا اہم مقصد تھا۔ اور اہنسا کا اس میں کیا کردار تھا؟۔

اہنسا گاندھی جی کا مذہبی عقیدہ نہیں تھا اور نہ سرمایہ دار طبقہ کی بھلائی کو مدنظر رکھ کر اس کا استعمال کیا گیا تھا۔ یہ قومی تحریک کا ایک اہم جز تھا۔ عوامی تحریک کو بنیاد بنا کر، سیاسی قیادت کے لیے جدوجہد کرنا اس کا مقصد تھا۔ اسی لیے اس کے ذریعہ عوام کو حتی الامکان حد درجہ متحرک کر دیا گیا۔

نظریاتی مورچہ بندی اور سیاسی قیادت کے لیے جدوجہد کی قومی حکمت عملی کا تعلق ایک ایسی کلونیل حکومت سے تھا جو نیم مطلق العنان (Semi-hegemonic) یا قانونی طور سے بااختیار (Legal authoritarian) تھی۔ اور جو قانون کے تحت نوکر شاہی اور آزاد عدلیہ کے ذریعہ حکومت چلاتی تھی۔ اس نے بے حد جابرانہ قانون لوگوں پر لاگو کر رکھا تھا، ہاں پرسکون حالت میں لوگوں کو اس نے تھوڑی بہت شہری آزادی دے رکھی تھی لیکن عوامی تحریکوں کے دوران وہ اس میں کٹوتی بھی کرتی تھی۔ وہ لوگوں کو مستقل اقتصادی اور آئینی (Constitutional) رعایتیں بھی دیتی رہتی تھی جبکہ حکومت کے سارے حقیقی اختیارات اس کے پاس محفوظ تھے۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ 1947 میں پرامن اور صلح آشتی سے حکومت کی تبدیلی نہ تو اتفاقی حادثہ اور نہ ہی تھکی ہوئی قیادت کے ذریعہ کیا گیا سمجھوتہ تھا بلکہ یہ ہندستانی تحریک کی حکمت عملی اور کردار کا ماحصل تھا۔ یہ اصولی جنگ کا وہ نقطۂ عروج تھا جہاں پہنچ کر انگریزوں نے یہ مان لیا تھا کہ اب ہندستانی عوام ان کی حکومت میں رہنے کے لیے مطلق تیار نہیں نیز حکومت چلانے کے سارے آلۂ کار یعنی سرکاری مشینری اس کو بنائے رکھنے کے لیے معتبر اور معتمد نہیں رہ گئی ہے کیونکہ ہندستانی عوام سرکار کو بالکل پسند نہیں کرتی ہے۔

انھوں نے یہ بھی تسلیم کرلیا تھا کہ سیاسی قیادت کی جنگ وہ ہار چکے ہیں۔ اس لیے انھوں نے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا، بجائے اس کے کہ وہ اس بڑے ملک پر اس تلوار کے سہارے حکومت کرنے کی کوشش کرتے جوان کے ہاتھ میں پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔

حکمت عملی کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہم کو آر۔ پام دت جیسے مصنفین کے ڈھرّے سے ہٹ کر انگریزی حکومت اور قومی قیادت کے درمیان بات چیت، سمجھوتے، 1922 اور 1943 میں تحریک کے پیچھے ہٹنے کا، گاندھی اروِن سمجھوتہ 1922 اور 1943 کے بعد قانونی اصلاح (Constitutional Reforms) کی کارروائی کا جائزہ لینا ہوگا، ان مسائل پر ہم نے انھیں ابواب میں غور کیا ہے جہاں ان کا خصوصی ذکر ہے۔

ہندوستان کی قومی تحریک مختلف طبقوں کی عوامی تحریک تھی۔ یہ بورژوا طبقہ کی قیادت میں یا زیر کنٹرول چلائی جانے والی تحریک نہیں تھی اور نہ ہی ان سب کا اس پر کوئی اثر تھا بلکہ اس کا روپ کثیر طبقاتی تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ اس کا دروازہ اشتراکی خیالات کے متبادل سیاسی قیادت کے لیے کھلا ہوا تھا۔

درحقیقت قومی تحریک میں نظریاتی تغیر برابر ہوتا رہا۔ 1920 اور 1930 کی آخری دہائیوں میں جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس، کمیونسٹوں، کانگریس سوشلسٹوں اور بائیں بازو کے دوسرے سوشلسٹ خیال خیموں اور لوگوں نے تحریک کے ساتھ ساتھ نیشنل کانگریس کو سوشلسٹ سمت پر لے جانے کی زبردست کوشش کی۔ کسانوں کے لیے ''کسان سبھا'' مزدوروں کے لیے ''ٹریڈ یونین'' نوجوانوں کے لئے ''نوجوان لیگ'' اور طلبا یونینوں کو اسی نقطۂ نگاہ کے تحت بنانے کی پوری کوشش کی گئی۔ پوری قومی تحریک کو سوشلسٹ نظریہ کی طرف مائل کرنا اور آزاد بھارت سے اسی نظریہ کو تسلیم کرانے کی کاوش کرنا ان کا مقصد تھا۔ اس سلسلہ میں تھوڑی کامیابی یہ ملی کہ سوشلسٹ خیال وفکر کی دور دراز علاقوں تک اچھی خاصی تشہیر ہوئی۔ 1930 اور 1940 کی دہائیوں میں اس کا یہ اثر پڑا کہ تقریباً سبھی نوجوان و دانشور طبقہ کسی نہ کسی گلابی یا لال رنگ میں رنگ گیا تھا۔ ٹریڈ یونینوں کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ اس دور کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ گاندھی جی کے خیالات انقلابی سمت میں ترقی کرتے گئے۔ ان ساری باتوں کے باوجود

جب ملک آزاد ہوا تو کئی وجہوں سے قومی تحریک میں سماج وادی نظریہ کا غلبہ قائم کرنے میں بائیں بازو کو کامیابی نہیں ملی اور اس کے اندر سرمایہ دارانہ فکر کا تسلط بنا رہا۔ اس طرح ہمارے خیال سے، تحریک کی خاص کمزوری اس کے نظریاتی ڈھانچہ میں ہی پنہاں تھی۔

چونکہ انڈین نیشنل کانگریس صرف پارٹی نہ ہو کر ایک تحریک تھی، اس لیے اس میں مختلف سیاسی رجحانات اور نظریات والے لوگ شامل تھے۔ اگر اس کے اندر کمیونسٹ، سوشلسٹ، ورائسٹ (Royists) تھے تو ستیہ مورتی اور کے۔ ایم منشی جیسے آئین پسند (Constitutionalists) بھی تھے۔ اتنے تنوع (diversity) کے باوجود قومی تحریک نے حیرت انگیز اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا۔ 1907 میں زبردست تقسیم کے بعد کانگریس نے ایسی نصیحت حاصل کی کہ نازک سے نازک بحران میں بھی آئین پسند اور غیر آئین پسند، دائیں اور بائیں بازو والے کبھی الگ نہیں ہوئے۔

بے شک جنگ آزادی کی بڑی ندی (تحریک) میں بہت سی دوسری ندیاں (تحریکیں) آ کر ملتی تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس خاص ندی (تحریک) تھی مگر اکیلی ندی (تحریک) نہیں تھی۔ اس کتاب میں ہم نے کئی تحریکوں پر چرچا کی ہے مثلاً کانگریس کے وجود کے پہلے کسان اور قبائلی تحریکیں، 1920 کی دہائی میں اکالی اور مندر فارم تحریکیں پریس اور قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعہ چلائی گئی تحریکیں، کسانوں اور مزدوروں کی کاوشیں، کانگریس کے اندر اور باہر بائیں بازو (Leftists) کا ابھار، صوبائی عوام کی تحریکیں، سرمایہ داروں کی سیاست، انڈین نیشنل آرمی (INA) اور رائل انڈین نیوی (RIN) کی بغاوت وغیرہ۔ دراصل ہم نے اس کتاب کے نصف حصہ میں سیاسی تحریکوں کا ہی ذکر کیا ہے جو باقاعدہ کانگریس کے باہر رہ کر چلائی گئی تھیں۔ مگر کئی لوگوں کے خیال کے برعکس ہم نے ان تحریکوں کو کانگریس کے مدمقابل نہیں مانا ہے۔ بلاشبہ یہ تحریکیں کانگریس سے باہر رہ کر چلائی گئی تھیں پھر بھی ان میں سے زیادہ تر کا تعلق کانگریس سے تھا۔ ان کو کانگریس کے خلاف کسی بھی طرح نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ تمام تر خوبیوں اور خامیوں کی حامل کانگریس ہندستانی عوام کی سامراج مخالف تحریک تھی جس میں ملک کے عوام کی وہ تاریخی قوت اور صلاحیت کارفرما تھی جو سچی عوامی تحریک کا خاصہ ہوتا ہے۔

دراصل ان تحریکوں نے کانگریس کی خاص روح و جوہر سے پیچیدہ تعلق بنائے رکھا

تھا۔ یہ تحریکیں کانگریس کا متبادل تو نہ بن سکیں مگر یہ قومی تحریک کا غیر منقسم حصہ ضرور بن سکیں۔ اگر کبھی کوئی سیاسی تحریک متبادل حیثیت سے سامنے آئی تو وہ منافقانہ سرشت کی فرقہ پرست، ذات پات حامی، حکومت اور سامراج نواز خیمہ تھا جس میں قومی جذبات اور سامراج مخالف رجحانات مطلق نہیں تھے۔

وقت کے ساتھ قومی تحریک دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان تحریک کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔ اس کی ساری طاقت کا سرچشمہ اور وہ بھی 1918 کے بعد خاص طور سے عوام کا مجاہدانہ حوصلہ اور سرفروشی کا جذبہ تھا۔ حقیقتاً اس کی شکل میں تحریک کا دارومدار عوام کی فعال شرکت پر تھا اور ان لاکھوں اور کروڑوں ہندوستانیوں کی تائید اور ہمدردی پر تھا جنھوں نے تحریک میں فعال حصہ بھی نہیں لیا تھا۔ عوام کی بڑی بڑی ان گنت سرگرمیوں کے علاوہ ستیہ گرہ کی بہت ساری سرگرمیاں 1919 اور 1942 کے درمیان ہوئیں تھیں۔ بے شمار طریقے سے کروڑوں مردوں اور عورتوں کو اس میں متحرک کیا گیا تھا جنھوں نے اپنے بے پناہ عزم و حوصلے سے اس کو قائم و دائم رکھا۔ نیشنلسٹ دانشوروں کے ذریعہ چلائی گئی یہ تحریک نوجوانوں، عورتوں، شہری آبادی کے متوسط لوگوں، گاؤں و شہر کے غریبوں اور دستکاروں، کسانوں، مزدوروں، تاجروں، کم مایہ سرمایہ داروں اور معمولی زمینداروں جیسے طبقوں کے بے شمار لوگوں کو اپنی آغوش میں لے کر ان کو متحرک کرنے میں کامیاب رہی۔

یہ تحریک اپنی مختلف شکلوں اور حالتوں سے گذرتی ہوئی موجودہ سیاست کو عوام تک لے گئی۔ اس نے فرقہ واریت، ذات پات پرستی، علاقہ نوازی یا روایتی حکمرانوں اور سرمایہ داروں کے تئیں وفاداری کے جدید احساسات کو مطلق ہوا نہیں دی، اس نے ذات پات اور علاقائی بنیاد پر لوگوں کو متحرک نہیں کیا اور نہ کسی خاص طبقہ کے فائدے کے لیے ہی جدو جہد کیا۔ لوگ اس میں برہمن، پٹی دار (Patidars)، مراٹھا یا ہریجن کی حیثیت سے شامل نہیں ہوئے۔ اس لیے ذات پات یا مذہبی شناخت پر لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ ہاں ایک آدھ معاملہ میں صرف ڈسپلن اور ضابطہ بنائے رکھنے کی غرض سے ذات برادری پر قائم تنظیموں سے مدد ضرور لی گئی مگر تحریک کی منشاء و طلب کا ذات پات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

لوگوں کی عام بیداری، تجربے، جبر کا ادراک اور اس کے تدارک کی صورتوں، اچھی حکومت کا تصور یا یوٹوپیا (Utopia) پر انحصار کرنے کے بعد بھی تحریک نے موجودہ بیداری کو صرف منعکس ہی نہیں کیا تھا بلکہ دوران جدوجہد اس میں تغیر لانے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ نتیجتاً جنگ آزادی میں مصروف جن دوسری جدید تحریکوں کے لیے اس نے اپنے اندر جگہ بنائی اور جن کے ساتھ اس نے خود کو جوڑا وہ تحریکیں یہ تھیں!

عورتوں، نوجوانوں، کسانوں، مزدوروں، ہریجنوں اور پست ذاتوں کی تحریکیں مثلاً انیسویں صدی کے دوران ہندوستانی تہذیب وتمدن کو انگریزیت سے بچانے کے لیے جو اصلاحی تنظیمیں ابھری تھیں وہ سب کی سب قومی تحریک میں ضم ہو کر بیسویں صدی میں پہنچ کر اس کے بڑے ستر نگی، جھرمٹ کا حصہ بن گئیں۔ لیکن آخر میں قومی تحریک کو کسی حد تک فرقہ واریت کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑا۔ تھوڑی تفصیل سے ہم نے فرقہ واریت کے جنم اور ابھار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ان وجوہات کا بھی جائزہ لیا ہے جن کے تحت فرقہ واریت کا مقابلہ کرنے میں قومی تحریک جزوا ناکام رہی۔ عورتوں اور پست ذاتوں میں سدھار لانے کے باوجود قومی تحریک کوئی تمدنی انقلاب نہ لا سکی اور اس کے علاوہ یہ تحریک انیسویں صدی کی آخری دور کی انگریزیت مخالف ''تمدن محافظ'' (Cultural Defence) تحریکوں کو اس صدی کی شروع دہائیوں میں اجاگر کرتی ہوئی منطقی، استدلائی اور تنقیدی سوچ کی طرف نہ مائل کر سکی۔ اس سمت میں گاندھی جی کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ تحریک تمدنی جدوجہد کو سیاسی جدوجہد کے ساتھ گڈمڈ نہ کر پائی۔

یہ تحریک ہندستانی عوام کی عقیدۂ جانثاری کی بے پایاں صلاحیت پر ٹکی تھی نیز تحریک اس کی اس خوبی کے حدود سے بھی اچھی طرح واقف تھی کہ وہ کہاں تک قربانی دے سکتی ہے۔ اس لیے تحریک نے عوام کے اس جذبہ سے غیر حقیقی، خیالی وتصوراتی امیدیں نہیں وابستہ کر رکھا تھا۔ بہرحال چونکہ غیر معمولی کارنامے انجام دینے والے عام لوگ ہی ہوتے ہیں، اس لیے ان کی تمام تر خوبیوں اور حامیوں کے باوجود تحریک کو ان پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ جمعیت پر منحصر (Cadre-Based) تحریک غیر معمولی قابلیت والے ان افراد پر انحصار کر سکتی ہے جن میں قربانی دینے کا بے پناہ حوصلہ وجذبہ ہو۔ لیڈر کی حیثیت سے ایسی ہستیوں کی موجودگی کے

باوجودعوام سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے کے۔ ایف۔ نری مین(K.F.Nariman) سے 1934 میں کہا تھا'' قوم کے پاس وہ قوت ہے جس کا اندازہ آپ کو نہیں مگر مجھے ہے'' انھوں نے مزید کہا'' قیادت کو اس پر غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے''[7]

عوامی تحریک کی حیثیت سے ہندستانی قومی تحریک نے بیشمار لوگوں کی مختلف قابلیت، صلاحیت اور قوت کا استعمال کیا۔ اس میں سب کے لیے جگہ تھی۔ ضعیف، نوجوان، امیر وغریب، عورت ومرد، عاقل وجاہل سبھی اس میں شامل تھے۔ لوگوں نے کئی طرح سے اس میں حصہ لیا تھا، مثلاً جیل جانا، ستیہ گرہ کرنا، دھرنا دینا، عوامی جلسوں میں شرکت کرنا، جلوسوں میں حصہ لینا، ہڑتال کرنا، راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہو کر کانگریس رضا کار جتھوں کی حوصلہ افزائی کرنا، کارپوریشن، ضلع کمیٹیوں، صوبائی اور مرکزی انتخابات میں کانگریس امیدوار کو ووٹ دینا، تعمیری کاموں میں حصہ لینا، کانگریس کو ایک چونی (پچیس پیسے) دے کر اس کا ممبر بننا، کھادی اور گاندھی ٹوپی پہننا کانگریس کے فنڈ میں چندہ دینا، کانگریسی تحریک میں حصہ لینے والے لوگوں کو کھانا کھلانا اور پناہ دینا، ینگ انڈیا(Young India) اور ہریجن پرچوں، پمفلٹوں اور میگزینوں کو پڑھنا، حب الوطنی سے بھرے ڈرامے کھیلنا، نظمیں پڑھنا، جلسے کرنا، ناولیں، کہانیاں، اور نظمیں لکھنا اور پڑھنا اور بھارت پھیریوں میں ان کو گانا وغیرہ گوناگوں طریقے تھے۔

تحریک بذات خود اور عوام کو متحرک کرنے کی اس کی کوششیں، ہندوستانیوں کی بے پناہ قوت کا مظہر تھیں۔ اس کے ذریعہ لوگوں نے اپنی جدت پسندی اور پہل کرنے کی صلاحیت کا پوری طرح اظہار کیا۔

تحریک میں بے مثل لیڈروں اور بے نظیر پیروؤں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نے ہزاروں شہدا پیدا کیے، لیکن کتنے جواں مرد تھے وہ لوگ جنھوں نے سالہا سال انتھک محنت کی، اپنے عزم پر صبر وسکون سے جمے رہے، گھربار چھوڑا، روزی روٹی سے بے پرواہ ہو کر کے زمین وجائداد اور کاروبار گنوایا اور جن کے خاندان والوں کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی اور جن کے بچے مناسب تعلیم اور حفظان صحت سے بھی محروم تھے!

پہلا باب

پہلا بڑا چیلنج —— 1857 کی بغاوت

11 مئی 1857 کی صبح تھی۔ دہلی واسی ابھی نیند سے بیدار بھی نہیں ہوئے تھے کہ میرٹھ سے فرار سپاہیوں کا ایک دستہ جمنا ندی پار کر کے شہر میں داخل ہوا۔ ایک دن پہلے اس دستہ کے فوجیوں نے بپھر کر اپنے انگریز افسر کو قتل کر دیا تھا۔ انھوں نے جنگی دفتر میں آگ لگا دی اور وہ لال قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لال قلعہ میں وہ راج گھاٹ گیٹ سے داخل ہوئے، ان کے پیچھے لوگوں کی ایک مشتعل بھیڑ تھی۔ سپاہیوں کا یہ دستہ مغل بادشاہ بہادر شاہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن یافتہ قیدی تھے، سے یہ اپیل کرنے آیا تھا کہ وہ اس کی قیادت کریں اور اس کے حق بجانب ہونے کی تصدیق کر دیں۔ چونکہ وہ سپاہیوں کی منشا سے بے خبر تھے اس لیے اس وقت ان کو گھبراہٹ سی ہوئی، انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اس لڑائی میں ان کی ایسی بساط نہیں کہ کوئی اہم کردار ادا کر سکیں۔ بہر حال سپاہیوں نے ان کو جبر سے نہیں بلکہ خوشامد سے راضی کر لیا اور اعلان کر دیا کہ وہ شہنشاہ ہندوستان ہیں۔ اس کے بعد سپاہیوں نے شاہی دہلی پر قبضہ کرنے کی مہم شروع کر دی۔ کئی دوسرے انگریز افسروں کے علاوہ سائمن فریزر (Simon Fraser) جو کمپنی کا سیاسی

ایجنٹ تھا، کوقتل کر دیا۔ سرکاری دفتروں پر یا تو سپاہیوں نے قبضہ کرلیا یا وہ سب برباد کر دیے گئے۔ 1857 کی یہ بغاوت اگر چہ ناکام رہی پھر بھی بدیسی حکومت کوختم کرنے کی بہادرانہ کوشش کی شروعات اس سے ہوگئی تھی۔ دہلی پر قبضہ کرنے اور بہادر شاہ کوشہنشاہ کی حیثیت سے اعلان کرنے سے سیاسی بغاوت پر مثبت سیاسی اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے لوگوں کے دلوں پر دہلی کے گذرے وقتوں کی شاہانہ عظمت کی یاد تازہ ہوگئی اوران کی اجتماعی قوت میں خاصہ اضافہ ہوا۔

میرٹھ کی بغاوت اور دہلی پر قبضہ تو بس شروعات تھی۔ اس کے بعد پورا شمالی مغربی اور وسط ہندوستان سپاہیوں اورعوام کی بغاوت کے زد میں آ گیا۔ جنوبی ہندوستان بالکل خاموش رہا۔ پنجاب اور بنگال پر اس کا معمولی اثر پڑا۔

کمپنی نے دو لاکھ بتیس ہزار دو سو چوبیس (232224) سپاہیوں میں سے قریب نصف تعداد اپنی اپنی رجیمنٹوں کو چھوڑ دیا اور فوج کی حکم برداری کے اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جس کو سخت ٹریننگ اور ڈسپلن کے ذریعہ ان کو سالوں سکھایا گیا تھا۔

یوں تو میرٹھ بغاوت کے پہلے بھی کئی چھاؤنیوں میں ناراضگی کی آواز اٹھ رہی تھی۔ بہرام پور کی انیسویں پیادہ فوج (Infantry) نے نئی قسم کی انفیلڈ رائفلوں (Enfield rifles) کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی وجہ سے مارچ 1857 میں اس کو برخاست کر دیا گیا۔ چونتیسویں نیٹیو انفینٹری (34Th Native Infantry) کے جوان منگل پانڈے نے تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنے سرجنٹ میجر (Sergent Major) کو گولی مار دی۔ ان کو پکڑ لیا گیا اور پھانسی دے دی گئی۔ اس فوجی ٹکڑی کو بھی برخاست کر دیا گیا۔ ساتویں اودھ رجیمنٹ کے جوانوں نے بھی افسروں کا حکم نہیں مانا۔ دوسری رجیمنٹوں کی طرح اس کا بھی وہی حشر ہوا۔

دہلی پر قبضہ کرنے کے ایک ماہ کے اندر بغاوت کی آگ ملک کے مختلف مقامات۔ کانپور، لکھنو، بنارس، الہ آباد، بریلی، جگدیش پور، اور جھانسی تک پھیل گئی۔ انگریزوں سے لوگ بے حد نفرت کرتے تھے۔ باغیوں نے ہر جگہ انگریزوں کے پیر اکھاڑ دیے اور عام انتظام درہم برہم کر دیا۔ چونکہ باغیوں کے درمیان ان کا کوئی لیڈر نہیں تھا، اس لیے انھوں نے مقامی تعلقداروں، نوابوں اور راجاؤں کو اپنے ساتھ کرلیا اوران کو قیادت کی ذمہ داری سونپ دی۔ یہ

لوگ برٹش حکومت کے ذریعہ کافی ستائے جا چکے تھے، اس لیے وہ باغیوں کے ساتھی بن گئے۔

کانپور میں باغیوں نے آخری پیشوا باجی راؤ ثانی کے گود لیے بیٹے نانا صاحب کو بغاوت کی کمان سونپی۔ انگریزوں نے نانا صاحب کی وراثت تسلیم نہیں کی تھی اور ان کو پونا سے جلا وطن کر دیا تھا۔ اس وقت وہ کانپور کے پاس رہ رہے تھے، لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے قیادت سنبھالی، لکھنؤ میں معزول نواب کے لیے عوام میں بڑی ہمدردی تھی۔ ان کے بیٹے پر جس قدر کی نوابی کا اعلان کیا گیا اور حکومت چلانے کے لیے باقاعدہ بندوبست بھی ہوا۔ اہم عہدوں پر ہندو اور مسلمان برابر تعداد میں تعینات کیے گئے۔

بریلی میں روہیلکھنڈ کے سابق حکمراں کے وارث خان بہادر نے انگریزوں کے خلاف کمان سنبھال لی۔ وہ برٹش حکومت کے پنشن یافتہ تھے۔ اس لیے شروع میں انھوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انگریز کمشنر کو حکومت کے سر پر منڈلانے والے خطرہ سے بھی آگاہ کیا، مگر بغاوت پھیلتے ہی انھوں نے خود انتظام سنبھال لیا اور چالیس ہزار جوانوں کو منظم کر کے ایک مضبوط فوج بنائی اور انگریزوں کے خلاف سختی سے ڈٹ گئے۔

بہار میں جگدیش پور کے زمیندار کنور سنگھ نے بغاوت کی قیادت کی۔ ستر سال کے زمیندار کنور سنگھ کو انگریزوں نے دیوالیہ کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ ان کی ساری جائداد چھین لی گئی تھی۔ بار بار خوشامد کرنے کے باوجود انگریزوں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس لیے اندر ہی اندر وہ انگریزوں کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ اگرچہ انھوں نے بغاوت کرنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا مگر جیوں ہی باغی سپاہیوں کا دستہ دینا پور سے آرا پہنچا، کنور سنگھ اس کے ساتھ ہو گئے۔

بغاوت کی سب سے نمایاں اور عظیم قائد رانی لکشمی بائی تھیں۔ انھوں نے جھانسی میں سپاہیوں کی کمان سنبھالی۔ انگریز گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی (Lord Dalhousie) نے ان کے شوہر کے مرنے کے بعد ان کے گود لیے (منہ بولے) بیٹے کو ان کی ریاست کا وارث بنانے سے انکار کر دیا تھا، اور ریاست ہڑپ پالیسی (Doctrine of Lapse) کے تحت جھانسی ریاست کو انگریزی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ رانی نے اس فیصلہ کو بدلوانے کے لیے ہر چند کوشش کی۔ انھوں نے یہ بھی پیش کش کی کہ اگر وہ ان کی بات تسلیم کر لیں تو جھانسی کی طرف سے

انگریزوں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔مگران کی اپیل نہیں مانی گئی۔مجبوراًانھوں نے سپاہیوں سے ہاتھ ملایااورانگریزوں کی سب سے بھیانک دشمن ثابت ہوئیں۔

بغاوت کی یہ لہر صرف بڑے مرکزوں تک ہی محدود نہیں رہی۔ بنگال کی قریب قریب سبھی چھاؤنیوں اور ممبئی کی کچھ چھاؤنیوں کواس نے اپنی زد میں لے لیا۔صرف مدراس اس سے اچھوتا رہا۔ وہاں فوج وفادار بنی رہی۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ انگریز بہادر کے سپاہیوں نے بغاوت کیوں کی جبکہ فوجی نوکری سے ان کی مالی حالت مضبوط ہوتی تھی اور سماج میں ان کا وقار بڑھتا تھا۔غیر یقینی مستقبل کے لیے انھوں نے اپنے فائدوں کوداؤں پر کیوں لگایا؟اس کا جواب ہم کودہلی میں سپاہیوں کے اس اعلان میں ملتا ہے''ہم سب کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ انگریزوں نے ان دنوں کون سے طریقے اپنا رکھے ہیں۔ایک تو وہ ساری ہندستانی فوج کو بے دھرم کررہے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ لوگوں کو جبراً عیسائی بنارہے ہیں اس لیے ہم سب اپنے تحفظ کے لیے متحد ہوئے ہیں اور ہم نے کسی کافر (Infidel) کو زندہ نہیں چھوڑا ہے۔اور ہم نے دہلی خاندان کی حکومت کوان ہی بنیادوں پر دوبارہ قائم کیا ہے''[1]

یہ بات بھی سچ ہے کہ کمپنی کی فوجی چھاؤنیوں میں نوکری کی کئی ایسی شرطیں تھیں جو خاص طور سے اتر پچھم صوبوں اور اودھ کے اونچی ذات کے ہندوؤں کے مذہبی جذبات اور عقیدوں سے ٹکراتی تھیں۔شروع میں انگریز حاکموں نے سپاہیوں کے ان اعتراضات سے مصالحت کرکے ان کو اپنے مذہب اور ذات برادری کے تقاضوں کے مطابق رہنے کی سہولتیں دی تھیں۔مگر جیوں جیوں فوج کی ذمہ داری بڑھتی گئی، ملک کے دوسرے حصوں کے علاوہ بدیسوں میں بھی ہندستانی سپاہیوں کو بھیجا جانے لگا، پھر تو سہولتیں دینا ناممکن ہوگیا۔اس کے علاوہ ذات پات کی تفریق اور علاحدگی سپاہیوں کے اتحاد میں مخل تھی۔اس لیے حکومت نے اس سے نمٹنے کے لیے آسان طریقہ یہ نکالا کہ فوج میں برہمنوں کی بھرتی میں کمی کی جائے مگر اس کی یہ کوشش بھی بیکار ثابت ہوئی۔انیسویں صدی کے وسط تک بنگال فوج میں برہمنوں ہی کا غلبہ بنا رہا۔

فوج کی ناراضگی سب سے پہلے اگست 1824 میں ظاہر ہوئی جب بیرکپور کی 47ویں رجمنٹ کو برما جانے کا حکم ملا۔اس وقت مذہبی ہندوؤں کا سمندر پار جانا برادری سے

اخراج تھا۔ اس لیے سپاہیوں نے برما جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ رجمنٹ برخاست کر دی گئی اور اس کے لیڈروں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ افغان جنگ کے دوران سپاہیوں کے مذہبی جذبات اور بھی زیادہ مجروح ہوئے۔ ان کو سب کچھ کھانے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ اس لیے جب وہ وطن واپس ہوتے، برادری ان کو قبول نہیں کرتی تھی۔ گاؤں اور گھر کے لوگوں کے دلوں میں یہ بات سما گئی تھی کہ انھوں نے برادری کی قدروں اور اصولوں کو بری طرح پامال کیا ہے۔ سیتارام نام کا سپاہی جب افغانستان سے وطن لوٹا تب اس نے خود کو نہ صرف گاؤں بلکہ اپنی بیرک میں برادری سے خارج پایا۔ اس طرح کمپنی بہادر کی فوج میں نوکر ہونے کی ناموری اس کو سماج میں جگہ نہ دلا سکی اور مذہب و ذات برادی کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔[2]

اور یہ افواہ بھی پھیلی کہ حکومت بڑی خاموشی سے مذہب تبدیلی کو بڑھاوا دے رہی۔ اس سے سپاہی اور بھڑک اٹھے۔ سرکار اور عیسائی مشنری کے گہرے رشتوں سے افواہ کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔ کچھ فوجی چھاؤنیوں میں ان مشنریوں کو عیسائی دھرم کے پرچار اور دوسرے دھرموں کی تنقید کی پوری آزادی تھی۔ سپاہیوں کی ناراضگی کا یہ بھی ایک سبب تھا۔ اس کے علاوہ آٹے میں ہڈی کا چورا ملائے جانے کی خبر اور انفیلڈ رائفلوں کے استعمال نے سپاہیوں کے شبہ کو مزید بڑھا دیا۔ گریس (Grease) لگی کارتوسوں کو استعمال کرنے کرنے کے پہلے دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ اس گریس کے بارے میں یہ خبر گرم تھی کہ یہ سور اور گائے کی چربی سے بنی ہوئی ہے۔ ان افواہوں کو دور کرنے کے لیے فوجی افسروں نے کوئی محنت نہیں کی۔ سپاہیوں نے یہی محسوس کیا کہ ان کا دھرم واقعی خطرہ میں ہے۔

ان کی ایسی بے اطمینانی صرف مذہب تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنی تنخواہ اور دیگر مشاہرے سے بھی مطمئن اور خوش نہیں تھے۔ پیادہ سپاہی کو سات اور گھوڑ سوار کو ستائیس روپے بطور تنخواہ ملتے تھے۔ اسی رقم میں کافی پیسے اس کو اپنی وردی اور خوراک پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح آخر میں اس کے پاس ایک یا دو روپے ہی بچتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ ناگوار بات اس کا یہ احساس تھا کہ اس کو اپنے ہی درجہ کے انگریز عملہ کو دی جانے والی رعایتوں سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس کو ہر سطح پر یہی احساس دلایا جاتا تھا کہ وہ محکوم اور ماتحت ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ ترقی

اور رعایتوں کے سلسلہ میں امتیاز برتا جارہا ہے۔ ٹی۔ آر۔ ہومز (T.R.Holmes) نے لکھا ہے "سپاہی جانتے تھے کہ وہ حیدر جیسی چاہے جتنی سپاہانہ بہادری و ذہانت کا ثبوت دیں، اس کو انگریز سپاہی کے برابر تنخواہ نہیں مل سکتی اور اس کی تیس سالہ وفا شعار فوجی خدمت بھی اس کو نئے انگریز افسر کی گستاخ ماتحتی سے نہیں بچا سکتی ہے"۔3

سپاہیوں کی بے اطمینانی فوج ہی تک محدود نہیں تھی عوام میں بھی بڑا غم وغصہ تھا۔ حقیقت میں سپاہی 'فوجی وردی' میں کسان ہی تو تھا۔ وہ گاؤں کی آبادی اور مٹی سے جڑا تھا۔ ایک فوجی افسر نے ڈلہوزی کو اس کی پالیسی کے ردعمل کے امکانی نتائج سے اس طرح خبردار کیا تھا "آپ کی فوج ملک کے کسان باشندوں سے بنی ہے۔ کسان کے اپنے حقوق ہیں۔ اگر ان میں دست اندازی کی گئی تو آپ بہت دنوں تک فوج کی وفاداری پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ہندوستان کے دستور و رواج میں مداخلت کرتے ہیں تو فوج ان کی ہمدرد ہو جائے گی کیونکہ فوج تو انھیں میں سے بنی ہے اور اس طرح لوگوں کے حقوق کی پامالی کا مطلب ہے فوجیوں کی خود یا ان کے بیٹوں یا ان کے رشتہ داروں کے حقوق کی پامالی"۔4

ان دنوں اودھ کے تقریباً ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد فوج میں بھرتی تھا۔ ایسے فوجیوں کی تعداد پچھتر ہزار (75000) تھی۔ اودھ میں ہونے والا ہر واقعہ ان سپاہیوں کو متاثر کرتا تھا۔ کاشتکاری کے نئے قانون جن کے تحت ضبط شدہ آراضی کو خیراتی اداروں کو دے دیا گیا تھا، سے ان کی خوشحالی بہت متاثر ہوتی تھی۔ ایسے سخت قانون کے خلاف فوجیوں کی طرف سے پندرہ ہزار عرضیاں دی گئیں تھیں۔ دہلی میں باغیوں کا اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ سپاہی انگریزی حکومت کی زیادتی کے خلاف کس قدر چوکنا تھے۔ اس لیے یہ عذر اپنے آپ میں انگریزی حکومت کے خلاف سپاہی بغاوت تھی۔ یہ سب اسی لیے ہوا کہ فوجی کسی نہ کسی طرح عوام سے جڑے تھے۔

سپاہیوں کی بغاوت کے ساتھ غیر فوجی بغاوت، خصوصیت سے شمالی مغربی صوبوں اور اودھ میں شروع ہوگئی۔ صرف مظفر نگر اور سہارنپور اس سے مستثنٰی تھے۔ مغربی صوبے اور اودھ دو ایسے علاقے تھے جہاں سے لوگ بنگال فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے۔ اس طرح سپاہیوں کی بغاوت کے ساتھ ہی عوام کی بغاوت چل پڑی۔ سپاہیوں کی بغاوت سے دیہی آبادی سرکاری

خوف اور انتظامیہ کے اقتدار سے آزاد ہوگئی۔ اپنی دیرینہ پریشانیوں اور مصیبتوں کے اظہار کے لیے اس کی بھیڑ سڑکوں پر نکل پڑی۔ سرکاری عمارتیں برباد کر دی گئیں۔ خزانہ لوٹ لیا گیا، ہتھیاروں کا گودام تباہ کر دیا گیا، بیرک اور عدالتیں جلادی گئیں اور جیل کے پھاٹک کھول دیے گئے'' انگریزوں کے خلاف بغاوت کا اثر سماج کے ہر ایک طبقہ پر پڑا۔ زمیندار، کسان، دستکار، مذہبی پیشوا اور پجاری، نوکر پیشہ لوگ، دکاندار اور ملاح سبھی اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ اس طرح سپاہیوں کی یہ بغاوت عوام کی بغاوت بن گئی۔

اس عوامی بغاوت کا سبب برٹش حکومت کے طور طریقوں میں ڈھونڈھا جا سکتا ہے۔ اس کے جبر وظلم سے سماج کے سبھی لوگ بری طرح متاثر تھے۔ لگان کے بوجھ سے کسان پست تھا۔ وہ قرض پر قرض لے کر برابر تنگ حال ہوتا جا رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا واحد مقصد کم سے کم کوشش سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول کرنا تھا۔ کھیت کی پیداوار کا لحاظ لیے بغیر یہ بندوبست کیا گیا کہ ٹیکس جلدی سے جلدی وصول کر لیا جائے، مثلاً 1812 میں بریلی ضلع میں ٹیکس وصول کرنے کا کام صرف دس ماہ میں پورا کرنے کا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ ٹیکس کی شرح بڑھادی گئی۔ اس کے نتیجہ میں چودہ لاکھ بہتر ہزار ایک سو اٹھاسی روپے زیادہ وصول ہوئے۔ سرکار نے خوش ہو کر ٹیکس محصلین کو ان کی انتھک محنت اور سرگرمی کے لیے شاباشی دی۔ اس نے اس بات پر مطلق غور نہیں کیا کہ اتنی بڑی رقم اتنے کم دنوں میں کیسے وصول کی گئی، اور کسان پر اس کا کتنا برا اثر پڑا۔ اس سے یہ صاف ہے کہ افسروں نے ٹیکس وصول کرنے کی غرض سے لوگوں پر بے حد ظلم ڈھائے تھے۔ ان لوگوں سے بھی ڈنڈوں کے زور سے ٹیکس وصول کیا گیا جن کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ روہیلکھنڈ میں 56-1848 کے دوران دو لاکھ سینتیس ہزار تین سو اٹھاسی (2,37388) روپوں کی رقم لوگوں سے جبراً وصول کی گئی۔ ان کی تنگ دستی کا سرکار کو کچھ بھی خیال نہیں تھا۔ اس کو تو صرف ٹیکس سے دلچسپی تھی۔ بے حد خراب حالات میں کہیں کہیں معافی دی گئی۔ ایک کلکٹر نے اپنے علاقہ کی بنجر زمین کے بارے میں بار ہا یہ رپورٹ حکومت کو دیا کہ گھاس کے علاوہ کوئی فصل وہاں نہیں اگتی ہے۔ اسلئے وہ ٹیکس وصول کرنے میں لاچار ہے۔ اس اطلاع پر اس سے کہا گیا کہ گھاس تو اچھی پیداوار ہوتی ہے، اسی کو فروخت کر کے ٹیکس وصول کیا جائے گا[5]

صرف کسان ہی نہیں پریشان تھے۔ زمیندار بھی انگریزی حکومت سے عاجز تھے۔ انھوں نے کم نقصان نہیں اٹھایا تھا۔ اودھ جو بغاوت کا خاص مرکز تھا، کے تعلقہ داروں کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔ ان کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں بچا تھا۔ وہ بیچارے کام کر نہیں سکتے تھے اور بھیک مانگ نہیں سکتے تھے، پوری طرح کنگال بنا دیے گئے تھے۔ مجبوراً انھوں نے ہندستانی سپاہیوں کی حمایت کی اور بغاوت میں ان کے ساتھ اس امید پر ہو گئے کہ شاید ان کی کھوئی ہوئی جاگیران کو مل جائے۔

دستکار اور کاریگر بھی انگریزی حکومت کی وجہ سے مصیبت اور پریشانی میں تھے۔ اب وہ بے سہارا ہو گئے تھے ان کے پرانے سرپرست تعلقہ دار انھیں کی طرح لاچار و مجبور تھے۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ انگریزی حکومت کی پالیسی دیسی دستکاروں کی پستی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ہی یہاں کی دستکاری کو برباد کر کے انگریزی سامان کو ترقی دینا تھا۔ ملک کے ماہر دستکار اس طرح روزی روٹی سے محروم کر دیے گئے تھے۔ بیچارے دوسرے کام میں روزگار تلاش کرنے لگے، مگر روزگار تھا کہاں۔ جس تیزی سے دستکاری ختم ہوئی تھی، اتنی تیزی سے کارخانوں کا قیام نہیں ہوا تھا۔

افادیت پسندی (Utilitarianism) کے تحت سماج سدھار کے سلسلہ میں حکومت کے ذریعہ کی جا رہی سرگرمی نے ہندستانی عوام کو بری طرح ناراض اور بدظن کر دیا تھا۔ سبھی راسخ العقیدہ ہندو

ؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ ڈر سما گیا تھا کہ حکومت عمرانی قانون (Social Legislature) بنا کر ایک طرف وہ ان کے مذہب اور کلچر کو برباد کرنے پر تلی ہے اور دوسری طرف وہ عیسائی تبلیغی اداروں (Missionaries) کو عیسائیت پھیلانے کے لیے مدد کر رہی ہے۔ اس طرح سبھی کٹر مذہبی لوگ انگریزی حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اس بات کا صاف صاف ذکر ہم کو باغیوں کے اعلانات میں بخوبی ملتا ہے۔

اس طرح عوام اور سپاہیوں کی ساجھا بغاوت 1857 میں جذباتی ابال کا بے مثل مظاہرہ تھا۔ اس سلسلہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ یہ بغاوت اچانک ہوئی یا منصوبہ بند طریقے

سے کی گئی۔ منصوبہ بند اور منظم تو اس لیے نہیں تھی کہ باغیوں نے اس کے بارے میں کوئی پختہ ثبوت نہیں چھوڑا ہے اور ان کے لیڈروں کے کام کرنے کا طریقہ بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ انھوں نے پہلے سے اس کے لیے کوئی منصوبہ یا پروگرام بنایا ہو۔ اگر انھوں نے ایسا سوچا بھی ہو، تو بس وہ ان کے ذہن میں ابتدائی حالت میں ہی رہا ہوگا۔

سپاہی جب میرٹھ سے دہلی پہنچے تو بہادر شاہ ظفر کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی خبر انھوں نے فوراً لیفٹننٹ جنرل کو بھیج دی۔ یہی کام رانی لکشمی بائی نے کیا۔ انھوں نے باغیوں کے ساتھ آنے میں تھوڑا وقت لیا۔ فیض آباد کے نانا صاحب اور مولوی احمد شاہ نے مختلف چھاؤنیوں سے خفیہ تعلقات بنا لیے تھے یا انھوں نے بغاوت کرنے کے لیے سپاہیوں کو اکسایا تھا، ان سب کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل پایا ہے۔ اسی طرح چپاتیوں اور کنول کے پھول کے ذریعہ خبر رسانی کی بات بھی ناقابل اعتبار ہے۔ ہاں یہ بات تو سچ ہے کہ میرٹھ واقعہ کے بعد ایک ماہ کے اندر بغاوت کی چنگاری دور دراز تک پھیل گئی۔

بغاوت سے پہلے چاہے کوئی منصوبہ نہ رہا ہو یا کوئی جماعت نہ بنائی گئی ہو، مگر بغاوت کے شروع ہوتے ہی باغیوں نے جتھہ بندی کی کوشش ضرور شروع کر دی تھی۔ دہلی پر قبضہ ہوتے ہی پاس پڑوس کی سبھی ریاستوں اور راجستھان کے حکمرانوں سے خط وکتابت کے ذریعہ بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے کی اپیل کی گئی۔ دس ممبروں پر مشتمل دہلی میں ایک عدالت انتظامیہ قائم کی گئی۔ ان کے چھ ممبران فوج سے اور چار سول صیغوں سے لیے گئے تھے۔ ان کے فیصلے کثرت رائے سے ہوتے تھے۔ اور سارے کام کاج شہنشاہ کے نام پر کیے جاتے تھے۔ اس کے بارے میں ایک انگریز افسر نے لکھا تھا ''دہلی سرکار کی شکل آئینی فوج شاہی (Constitutional Milorcacy) جیسی تھی۔ بادشاہ تو بادشاہ ہی تھا اور وہ اسی طرح معزز تھا۔ اس کا مرتبہ آئینی شہنشاہ جیسا تھا۔ پارلیمنٹ کے بجائے اس کے پاس فوجیوں کی ایک کونسل تھی جس کو سارے اختیارات حاصل تھے اور بادشاہ کسی بھی طرح فوجی کمانڈر نہیں تھا''۔6 اسی طرح دوسری جگہوں پر بھی انتظامیہ کمیٹی بنانے کی کوشش کی گئی۔

بہادر شاہ کو باغیوں کے سبھی لیڈر اپنا شہنشاہ تسلیم کرتے تھے۔ انھیں کے نام کے سکے

ڈھالے جاتے اوراحکامات جاری کیے جاتے تھے۔ بریلی میں خاں بہادر خاں، مغل شہنشاہ کے نام پر حکومت چلاتے تھے۔ دوسری خاص اور اہم بات یہ تھی کہ باغی چاہے میرٹھ یا کانپور میں ہوں، ان کی پہلی خواہش دہلی جانے کی ہوتی تھی۔ سیاسی ادارہ یا انتظامیہ کی ضرورت سبھی باغی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ جس سے کہ وہ ہاتھ آئی ہوئی کامیابی کو محفوظ کرسکیں، مگر انگریزوں کے جوابی حملہ کے سامنے ان کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ سحاب نما اپنے دھندلے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

باغیوں نے ایک سال سے بھی زیادہ مدت تک، سخت دشواریوں کے باوجود اپنی کوشش مسلسل جاری رکھی۔ ان کے پاس گولہ بارود اور نئے ہتھیار حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ انھوں نے جو ساز وسامان برٹش ہتھیار خانوں سے حاصل کیا تھا وہ بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ وہ ایسے دشمن سے مقابلہ کررہے تھے جو جدید ترین اسلحوں سے لیس تھا اور وہ اس سے صرف معمولی بلم، برچھا اور تلوار سے برسر جنگ تھے۔ ان سب کمیوں کے علاوہ خبر رسانی کا تیز رفتار ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ بروقت اپنے لوگوں سے رابطہ نہیں قائم کرسکتے تھے نیز وہ ان کی طاقت اور کمزوریوں سے بھی ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کے لیے نہیں پہنچ سکے۔ ہرایک کو اپنی لڑائی اکیلے ہی لڑنی پڑی۔

اگر چہ باغیوں کو لوگوں کی کثیر تعداد کی ہمدردی حاصل تھی، پھر بھی پورا ملک ان کے ساتھ نہیں تھا۔ تجارت پیشہ، تعلیم یافتہ اور دیسی حکمراں نہ صرف خاموش اور الگ تھلگ رہے بلکہ بڑی سرگرمی سے انگریزوں کی مدد کی۔ ان کے ذریعہ کلکتہ اور ممبئی میں میٹنگیں کی جاتیں اور ان کی فتح کی دعائیں ہوتی تھیں۔ ریاست ہڑپ پالیسی (Doctrine of Lapse) کے باوجود حکمراں انگریزوں کے ساتھ تھے۔ ان کے ساتھ وہ اپنا مستقبل محفوظ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی فوج اور دیگر ذرائع سے ان کی مکمل کرمدد کی تھی۔ اگر یہی مدد سپاہیوں کو ملی ہوتی تو انھوں نے یقیناً زیادہ اچھا مقابلہ کیا ہوتا۔

سپاہیوں کی تقریباً آدھی تعداد نے نہ صرف بغاوت کی بلکہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف جنگ بھی کی۔ پانچ فوجی دستے جن میں سترہ سو (1700) انگریز اور تین ہزار دو سو

(3200) ہندستانی جوان تھے، کی مدد سے انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ کشمیری گیٹ کو بم سے اڑانے کے کام کو چھ انگریز افسروں اور چوبیس ہندوستانیوں نے انجام دیا۔ ہندوستانیوں میں دس پنجابی اور بقیہ آگرہ واودھ کے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ جھانسی کی رانی یا کنور سنگھ یا احمد اللہ جیسے کچھ معزز لوگوں کو چھوڑ کر سپاہیوں کو کوئی مدد ان کے لیڈروں کے ذریعہ نہیں ملی۔ ان کے زیادہ تر لیڈروں نے بغاوت کی اہمیت کو ہی نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ بہت کچھ کرنے سے باز رہے۔ بہادر شاہ اور زینت محل کو اپنی فوج پر ہی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے انگریزوں سے گفت وشنید کرتے رہے۔ زیادہ تر تعلقداروں کو اپنی غرض سے مطلب تھا اور مان سنگھ جیسے لوگ تو حالات کے مطابق پالہا ہی بدلتے رہے۔

صرف انگریزوں سے نفرت کرنے کی وجہ سے ہی باغیوں میں وقتی اتحاد پیدا ہوا تھا اس کے علاوہ نہ ان کے سامنے کوئی سیاسی نظریہ تھا اور نہ مستقبل کا واضح نقشہ۔ وہ صرف اپنے ماضی کے جاہ وجلال کے تصور میں غرق تھے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنے کے لیے برسر جنگ تھے۔ نیا سیاسی نظم قائم کرنے کی اہلیت ان میں مطلق نہیں تھی۔ ان کے بارے میں جان لارینس (John Lawrence) نے بہت سچ کہا تھا ''اگر ان میں (باغیوں میں) ایک بھی باصلاحیت لیڈر نکل آتا، تو ہم ہمیشہ کے لیے ہار جاتے''۔

ایسا مقدر میں ہی نہیں تھا۔ بہرحال باغیوں نے بے مثل ہمت، بہادری، ایثار وقربانی کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے ہزاروں نے اپنے عزیز ترین مقصد کے حصول کے لیے بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے موت کو گلے لگالیا۔ ان کی اولوالعزمی سے کہیں زیادہ طاقتور برٹش فوج کی جوابی کارروائی تھی۔ سب سے پہلے 20 ستمبر 1857 کو دہلی کا زوال ہوا۔ طویل اور گھمسان لڑائی کے بعد بہادر شاہ نے ہمایوں مقبرہ میں پناہ لی۔ ان کو گرفتار کرکے برما بھیج دیا گیا۔ چونکہ دہلی باغیوں کی مجموعی پناہ گاہ تھی، اس لیے انگریزوں کا اس پر قبضہ ہوتے ہی بغاوت کی کمر ٹوٹ گئی۔ برٹش فوج نے ایک کے بعد ایک مرکز پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ جھانسی کی رانی نے 17 جون 1858 کو لڑتے ہوئے جان قربان کر دی۔ جنرل ہیوگ روز (General Hugh

(Rose) جس نے ان کو ہرایا تھا، نے رانی کی تعریف یوں کی ہے" مردہ پڑی یہ وہی عورت ہے جو باغیوں میں واحد مرد تھی"۔ نانا صاحب نے ہار نہیں مانی اور وہ شروع 1859 میں یہ امید لے کر نیپال چلے گئے کہ وہ دوبارہ جنگ کریں گے۔ کنور سنگھ نے ضعیفی کے باوجود بڑی چستی پھرتی دکھائی اور آخری سانس یعنی اپنی موت 9 مئی 1858 تک انگریزوں کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ وہ کہاں ہیں۔ اپریل 1859 تک تانیتا ٹوپے نے بڑی کامیابی سے انگریز کے ساتھ گریلا لڑائی جاری رکھی مگر ایک زمیندار کی دغابازی سے وہ انگریزوں کے ذریعہ پکڑ کر شہید کر دیے گئے۔

اس طرح ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے سب سے بھیانک چیلنج کا خاتمہ ہوا۔ اب صرف قیاس آرائی ہی باقی ہے کہ انگریزوں کے خلاف اگر ہندوستانیوں کی بغاوت کامیاب ہو جاتی تو تاریخ کی سمت کیا ہوتی؟ اگر بغاوت نے تاریخ کے رخ کو مخالف سمت میں موڑ کر پرانے جاگیردارانہ نظام کو پھر سے قائم کر دیا ہوتا، تو کیا نتائج نکلتے؟ یہاں ان باتوں پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ تمام تر خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بدیسی حکومت سے ملک کو آزاد کرانے کی سپاہیوں کی کوشش حب الوطنی کا واضح ثبوت ہے۔ یہ ترقی پسندی کے تحت کیا گیا اہم کام تھا۔ اگر کسی تاریخی واقعہ کی اہمیت کو اس کی فوری کامیابی تک محدود نہ کیا جائے تو 1857 کی بغاوت صرف تاریخی ٹریجڈی نہیں ہے بلکہ اپنی تمام ناکامیوں کے باوجود اس نے ایک عظیم مقصد کو پورا کیا۔ اس نے ملک کی تحریک آزادی کو وہ حوصلہ دیا جس کے تحت بعد میں وہ کچھ حاصل کر لیا گیا جو بغاوت میں حاصل نہیں ہوا تھا۔

دوسرا باب

سول اور قبائلی بغاوتیں

1857 کی بغاوت بدیسی حکومت کے خلاف چلی آ رہی ملک کی قدیمی جد و جہد کی سب سے زیادہ ڈرامائی شکل تھی۔ یہ بغاوت اچانک ہونے والا واقعہ بھی نہیں تھا، بلکہ برٹش تسلط کے خلاف ہندستانی عوام کی یہ ایک صدی طویل کاوشوں کی انتہا تھی۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کا قیام بھی اچانک ہونے والا حادثہ نہیں تھا، بلکہ اس کا وجود ایک لمبے مرحلہ سے گذر کر ہوا تھا۔ سب سے پہلے انگریزوں نے ہندستانی مالیات پر اپنا تسلط جمایا، سماج میں برٹش کالونیاں بسائیں اور ملک کو ٹکڑے ٹکڑے فتح کر کے اچھی طرح مستحکم کیا۔ انھوں نے سوسائٹی کی ہر ایک سطح پر بے اطمینانی، ناراضگی، اور مخالفت کو جنم دیا۔

موٹے طور سے عوام کی مخالفت کی تین شکلیں تھیں۔ سول بغاوت، قبائلی سورش اور کسان تحریک۔ اس باب میں ہم اول الذکر صرف دو پر ہی بات کریں گے۔

برٹش حکومت کے شروع سو سالوں کے دوران سول بغاوتوں کا سلسلہ متواتر چلتا رہا۔ انگریزوں کے ذریعہ معزول کیے گئے رجواڑے، نوابین یا ان کی اولادیں، مالکان زمین اور

پولیگار (دکن ہندوستان کے وہ زمیندار جو مسلح فوجی دستے رکھتے تھے) اور انگریزوں کے ذریعہ فتح کی گئی ریاستوں کے سابق افسروں نے اکثر ان بغاوتوں کی قیادت کی تھی۔ عام طور سے لگان کی مار سے تنگ دست کسان، بے سہارا و بدحال دستکار اور فوج سے برخاست کیے گئے سپاہی ان بغاوتوں کو قوت بہم پہنچاتے تھے۔

ان بغاوتوں نے مقامی پریشانیوں کی وجہ سے جنم لیا تھا، اس لیے ان کا دائرہ محدود ہوا کرتا تھا، مگر ان میں اکثر سینکڑوں سے لے کر ہزاروں کی تعداد میں مسلح باغی شامل ہوا کرتے تھے۔

سول بغاوتوں کے خاص اسباب انگریزی حکومت کے ذریعہ مال گذاری، لگان اور عام انتظامات میں تیزی سے کیے گئے تغیرات تھے۔ ان تبدیلیوں نے کسان حلقہ میں اتھل پتھل پیدا کر کے ان کو پریشانیوں میں ڈال دیا تھا۔ مالگذاری کی بڑھی ہوئی شرح پر زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی سرکاری پالیسی نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا دیا تھا۔ مثال کے طور پر تیس سال کے اندر ہی لگان کی شرح پہلے سے دوگنی ہوگئی تھی۔ ملک میں جہاں جہاں بھی انگریزی حکومت تھی، لگان کی یہی شرح نافذ تھی۔ لوگ انگریزی سرکار سے اس وجہ سے بھی ناراض تھے کہ ان سے وصول کی ہوئی رقم کا تھوڑا بھی حصہ ان کی بھلائی پر نہیں خرچ کیا جاتا تھا۔

برٹش حکومت کی اسی پالیسی کے تحت ہزاروں زمینداروں اور پالیگاروں کو اپنی زمینوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ حکومت نے ان سے لگان وصول کرنے کا اختیار ہی چھین لیا تھا۔ یہی نہیں مال گذاری کی اونچی شرح پر رقم ادا نہ کر پانے کی وجہ سے ان کو زمین کے متعلق اپنے اختیارات فروخت کرنے پڑتے تھے۔ اس طرح ان مفرور زمینداروں کی زمینوں پر سرکاری افسر، نئے مہاجن، ساہوکار اور دولت مند لوگ قابض ہو گئے۔ اس سے ان کے وقار کو سخت چوٹ لگی۔ اس لیے پولیگار اور زمیندار بھی رجواڑوں اور نوابوں کی طرح انگریزی حکومت سے سخت ناراض تھے۔ وہ بھی اپنی کھوئی ہوئی حیثیت واپس پانا چاہتے تھے۔

اونچے طبقہ (Elite) کے ساتھ مل کر کسانوں اور دستکاروں کے ہتھیار اٹھانے، جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، کے پیچھے ان کے ذاتی معاملات تھے۔ لگان کی اونچی شرح کی وجہ سے یا تو

کسان قرض میں پس گیا تھا یا اس کو اپنی زمین بیچنی پڑی تھی۔ نئے مالکان زمین جو روائتی پدرانہ ہمدردی سے خالی تھے، نے اس کے اوپر تباہ کن مالگذاری تھوپ رکھی تھی۔ نادہندگی کی صورت میں اس کو زمین سے بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ ملک میں 1770 سے 1857 کے دوران بارہ بڑے بڑے اور ان گنت چھوٹے چھوٹے قحط پڑنے کی وجہ سے کسانوں کی مالی حالت بے حد خراب ہوگئی تھی۔

انگریزی عدالتوں اور عدالتی سسٹم نے غریب کسانوں کو زمین سے بے دخل کرنے میں بڑی آسانی پیدا کی۔ امیروں کے لیے غریبوں کو ستانے کا راستہ اور بھی زیادہ ہموار ہوا۔ لگان، بھاڑا یا سود کی وصولیابی کے لیے کسانوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جانے لگے۔ ان کو کوڑے مارنا، غیر انسانی تکلیف دینا اور جیل بھجوانا عام بات ہوگئی تھی۔ پولیس، نوکر شاہی اور نچلی عدالتوں میں پھیلے کرپشن سے لوگ بری طرح تنگ تھے۔ غریبوں کا خون چوس کر چھوٹے افسران بھی دولت مند ہو گئے تھے۔ پولیس اپنی مرضی ومنشا سے لوگوں کی لوٹ کھسوٹ کرتی اور ان پر طرح طرح سے ظلم و زیادتی کرتی تھی۔ 1859 میں ولیم ایڈورڈ (William Edward) نے پولیس کے بارے میں لکھا تھا کہ ''وہ لوگوں کے لیے مصیبت ہے'' اور ''اس کی جبراً پیسوں کی وصولی کرنا اور ان پر ظلم ڈھانا ہماری حکومت کے تئیں ان کی ناراضگی کے خاص اسباب ہیں''۔

ہندوستان میں تجارت کو ٹیکس سے آزاد کرنے اور یہاں کے سامان پر امتیازی ٹیکس لگانے کی وجہ سے ہندوستان کی دستکاری برباد ہوگئی۔ لاکھوں کاریگر اور دستکار کنگال ہو گئے۔ ان کے ذریعہ بننے والے سامان کی کھپت بالکل بند ہوگئی۔ چونکہ دیسی رجواڑوں، نوابوں، تعلقداروں اور زمینداروں کے یہاں ان کے مال کی کھپت ہوتی تھی۔ وہی ان کے سرپرست اور خریدار تھے، مگر وہ خود ہی خستہ حال ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی اس زبوں حالی نے دستکاروں اور کاریگروں کے دھندوں کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ لوگ جو علمی اور مذہبی دنیا سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے عوام کو انگریزی حکومت کے خلاف بھڑکانے اور ان کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے میں فعال کردار ادا کیا تھا۔ ملک کے پرانے رجواڑے، حکمراں اور زمیندار ان ادیب، قلمکاروں، مذہبی

پیشواؤں یعنی مولویوں، پجاریوں اور پنڈتوں کو مالی امداد دے کر نوازتے تھے۔ انگریزی تسلط نے دیسی حکمرانوں کو کنگال اور قلاش کر دیا تھا۔ اب وہ اس لائق نہیں رہ گئے تھے کہ شعرا اور ادیبوں کی سرپرستی کر سکیں۔ اس لیے مالی امداد کے نہ ملنے سے وہ بھی مفلس اور غریب ہو گئے۔ ان لوگوں نے اپنی زبان و قلم سے انگریزوں کے خلاف عوام کو بھڑکانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

بغاوت کی ایک اور بڑی وجہ انگریزی حکومت کا بدیسی ہونا تھا۔ دوسروں کی طرح ہندستانی بھی یہی محسوس کرتے تھے کہ وہ بدیسی حکومت کے ذریعہ کی جا رہی توہین برداشت کر رہے ہیں ان کے اسی مجروح احساس نے ان کو بدیسی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مجبور کیا۔

سول بغاوت کا سلسلہ، بنگال اور بہار میں برٹش حکومت کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا اور جن علاقوں تک یہ حکومت پھیلتی گئی، وہیں بغاوت کے جھنڈے بلند ہوتے گئے۔ شاید ہی کوئی ایسا سال گذرا ہو جب ملک میں انگریزوں کی مخالفت مسلح طریقے سے نہ ہوئی ہو اور شاید ہی کوئی دہائی گذری ہو جب ان کے خلاف بغاوت نہ ہوئی ہو۔ 1763 سے 1856 کے دوران ملک بھر میں ان کے خلاف چالیس سے زیادہ بڑی بڑی بغاوتیں ہوئیں۔ چھوٹے پیمانے پر ہونے والی بغاوتیں تو سینکڑوں کی تعداد میں تھیں۔

بے دخل کیے گئے کسان اور برخاست کیے گئے فوجیوں نے سب سے پہلے بنگال میں معزول زمینداروں اور مذہبی پیشواؤں کی قیادت میں سنیاسی بغاوت (Sanyasi rebellion) کا جھنڈا بلند کیا۔ بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول 'آنند مٹھ' میں اس کو بڑی شہرت دی۔ یہ بغاوت 1763 سے 1800 تک ہوئی۔ اس کے بعد بنگال اور بہار کے پانچ ضلعوں میں، 1766 سے 1772 تک چوار (Chuar) بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت 1795 میں پھر بھڑکی اور 1813 تک جاری رہی۔ اس کے علاوہ مشرقی ہندوستان میں زمینداروں کی بڑی بڑی بغاوتیں 1783 میں رنگ پور اور دناج پور میں، 1799 میں وشنو پور اور ویربھوم میں اور 1827 سے 1840 تک سمبل پور میں، 1804 سے 1817 تک اڑیسہ میں ہوئیں۔

1794 میں دکنی ہندوستان میں ویزیا نگرم (Vizianagram) کے راجہ نے بغاوت کی۔ تمل ناڈو کے پالیگاروں نے 1790 کی دہائی میں، ملابار اور آندھرا کے سمندری

کناروں کے پالیگاروں کی، انیسویں صدی کی شروع دہائی میں پارلیکا مڈی (Parlekamedi) کی 1913 اور 1914 میں بغاوتیں ہوئیں۔ ٹراونکور کے دیوان ویلو تھمپی (Diwan Velu THampi) نے 1805 میں بڑی بہادری سے بغاوت کا پرچم لہرایا۔ میسور کے کسانوں نے بھی 1830 اور 1831 میں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھالیا۔ وشاکھا پٹنم میں بھی 1830 اور 1834 تک گنجم (Ganjam) میں 1833 میں، کرنول (Kurnool) میں 1846 سے 1847 تک بڑی بڑی بغاوتیں ہوئیں۔

مغربی ہندوستان کے سوراسٹر (Saurastra) کے حکمرانوں نے 1816 سے 1832 تک کئی بار اور 1824 سے 1828 تک، پھر 1839 اور 1849 میں گجرات کے کولیوں (Kolis) نے بغاوتیں کیں۔ مہاراشٹر میں پیشوا کی آخری ہار کے بعد بغاوت کا سلسلہ متواتر چلتا رہا۔ ان میں 1818 سے 1831 کے دوران بھیل (Bhil) بغاوت، 1824 میں چناؤا (Chinnava) کی قیادت میں کی گئی کتور (Kittur)، 1841 کی ستارا اور 1844 کی گڈکاری (Gadkaris) بغاوتیں خاص ہیں۔

شمالی ہندوستان میں بھی ہنگامہ کم نہیں تھا۔ موجودہ مغربی یوپی اور ہریانہ میں 1824 میں لوگوں نے برٹش حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھالیا۔ 1805 میں بلاس پور میں بڑی بڑی بغاوتیں ہوئیں۔ 1814 سے 1817 تک علی گڑھ کے تعلقداروں نے، 1842 میں جبل پور کے بندیلوں نے بغاوتیں کیں۔ 1852 میں خاندیش میں بغاوت کی آگ بھڑکی۔ 1842 سے 1848 کے دوران دوسری پنجاب جنگ بھی انگریزوں کے خلاف فوج اور جنتا کی ہی بغات تھی۔

اس طرح ان بغاوتوں کا سلسلہ بڑا اہم اور طویل مگر ان کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس کے علاوہ باغیوں کی کوششیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر کی گئیں۔ چونکہ سب کے مسائل جدا جدا اور وجہیں بھی مختلف تھیں، اس لیے ان کے اثرات کا دائرہ بھی محدود تھا، البتہ ان بغاوتوں کی خاصیت (Character) ایک جیسی تھی۔ ایسا اس لیے نہیں تھا کہ یہ قومی جدوجہد کا مظہر تھیں، بلکہ اس لیے کہ ان سب کا جنم ایک جیسے حالات میں ہوا تھا، جبکہ ان کے کرنے کے اوقات

اور واقع ہونے کے مقامات مختلف تھے۔

ان بغاوتوں کی قیادت جن نیم جاگیرداروں نے کی تھی وہ سماجی، مالی اور سیاسی اعتبار سے غیر ترقی پسند، پچھڑے اور پرانے خیال کے لوگ تھے۔ اب بھی وہ اپنی پرانی دنیا میں رہ رہے تھے اور جدید زمانہ کی اس ہلچل سے بے خبر تھے جس نے سماج کی حفاظتی قلعہ بندیوں کو ڈھا دیا تھا۔ ان کی مخالفت میں سماج کے نئے روپ کا تصور نہیں تھا۔ ان کے سماج کی نظریاتی اور تمدنی شکل صدیوں پرانی تھی اور سیاست اور سماج کے پرانے رشتوں کو بحال کرانا ہی ان کا بنیادی مقصد تھا۔ بھلا اس طرح کے پچھڑے نظریہ والے، منتشر اور غیر متحدہ بغاوتوں میں وہ قوت کہاں تھی کہ وہ بدیسی حکومت سے خود کو بچا پاتیں یا اس کو اکھاڑ پھینکتیں۔ یہی وجہ تھی کہ برٹش حکومت ان بغاوتوں کو ایک ایک کر کے کچلنے میں کامیاب ہوئی۔ اس نے بغاوتوں کو دبانے کے لیے ایک چال یہ بھی کی کہ جن علاقوں میں ان کا زیادہ زور تھا، وہاں کے زمینداروں یا ان کے وارثوں کو ان کی جائدادیں واپس کر دیں اور بغاوت نہ کرنے کی شرط پر لگان میں کچھ رعایت بھی دی گئی۔ جن لوگوں نے اس طرح کے پھینکے گئے ٹکڑوں پر لالچ نہیں کی، ان کا صفایا بڑی بے دردی سے کیا گیا مثلاً ویلو تھمبی کو ان کے مرجانے کے بعد بھی برسرعام پھانسی پر لٹکایا گیا۔

انگریزوں نے ان سول بغاوتوں کو کچلنے میں اتنی بے رحمی دکھائی کہ لوگ اس قدر خوف زدہ ہو گئے کہ دکنی ہندوستان میں 1857 کی بغاوت نہیں پھیل سکی اور مشرقی و مغربی ہندوستان کے زیادہ تر علاقے بغاوت سے دور اور الگ رہے۔ بہر حال ان بغاوتوں کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ لوگوں نے مقامی سطح پر انگریزی حکومت کے خلاف شدید مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں یہی دلیرانہ مزاحمت جنگ آزادی کے دوران ہندوستانیوں کیلئے حوصلہ و ہمت کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔

ہندوستان کے بڑے حصے میں رہنے والے قبائلی لوگوں کے ذریعہ انیسویں صدی میں کئی چھاپا مار لڑائیاں لڑی گئیں۔ انھوں نے آپس میں متحد ہو کر بڑی بہادری سے جدو جہد کیا۔ اور بے پناہ ہمت، ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا۔ دوسری طرف ان کو کچلنے کے لیے انگریزوں کے ذریعہ بربریت کا استعمال کیا گیا۔ ان قبائلی ذاتوں کے بھڑک اٹھنے کے کئی اسباب تھے۔ عام طور سے وہ خود کو سماج سے الگ تھلگ رکھتے تھے۔ لیکن حکومت نے ان کو پوری طرح کلونیل گھیرے میں لے

لیا تھا۔اس نے ان کے سرداروں کوزمینداروں کا درجہ عطا کر کے لگان کا نیا سسٹم لاگو کیا۔ان کے ذریعہ بنائے جانے والے سامان پر نئے ٹیکس لگائے گئے۔اس کے علاوہ قبائلی علاقوں میں عیسائی مشنریوں کی بڑی ریل پیل ہوگئی۔ان کو پھیلنے اور کام کرنے کے لیے خاصی سہولتیں دی گئیں۔ یہی نہیں،ان کے درمیان مہاجنوں،ساہوکاروں اور لگان محصل کسانوں کی مخصوص جماعتیں بنائی گئیں جوحکومت اوران کے درمیان بچولیوں کا کام کرتی تھیں۔انہی دلالوں کے ذریعہ اپنے مالی سسٹم کے گرداب میں پھنسا کر انگریز ان کا استحصال کرتے تھے۔اس طرح یہی لوگ دھیرے دھیرے ان کی زمینوں پر قابض ہوتے گئے۔اس کے علاوہ انھوں نے ان کوقرض کے جال میں اس طرح پھنسایا کہ زمینیں ان کے قبضے سے نکل گئیں۔ایسے حالات میں وہ زمینیں جوانھوں نے قبائلی ہونے کی وجہ سے حاصل کی تھیں،انہی کے وہ کھیتہر مزدور،بٹائی داراورایسے اسامی بنادیے گئے جولگان کے بھاری بوجھ تلے دب گئے۔

جنگلات سے ان قبائلی لوگوں کا بہت پرانا ،گہرا اور اٹوٹ رشتہ تھا۔اس رشتہ کو انگریزوں نے بدل دیا تھا۔ان کی زندگی کا پورا انحصار جنگلوں پر تھا۔کھیتی کرنے کےان کے اپنے طریقے تھے۔ جگہ بدل بدل کر وہ کھیتی کرتے تھے۔ اس طریقے کو''جھم'' و''پڈو'' (Jhum,Padu)وغیرہ کہا جاتا تھا۔اس طریقے کے تحت جب ان کولگتا تھا کہ اب ان کے کھیت زرخیز نہیں رہ گئے ہیں،تو وہ جنگل صاف کر کے نئی زمینیں کاشت کے لیے تیار کر لیتے تھے۔ مگر انگریزوں نے یہ سب بدل دیا۔انھوں نے جنگلات کی زمین،ان کی پیداوار، نیز گاؤں کی زمینوں کے استعمال پرطرح طرح کی پابندی لگادی۔جنگلات کو جبراً سرکاری قبضہ میں لایا گیا۔ جگہ بدل بدل کرکھیتی کرنے پرروک لگادی گئی۔پولیس اور دوسرے چھوٹے افسروں کے ذریعہ کی جانے والی زیادتی اور جبریہ وصولی نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔لگان محصل کسان اور سرکاری کارندےان سے طرح طرح کے بے گار لے کران کا رہنا مشکل کئے ہوئے تھے۔

انہی دشواریوں اور پریشانیوں کی وجہ سے قبائلی لوگوں کی بےاطمینانی روز بروز بڑھتی گئی۔یوں ان کی پریشانیوں کی شکل ہر جگہ ایک جیسی نہیں تھی،مگران کی بغاوت کی واحد وجہ یہی تھی کہ حکومت نے کھیتی کرنے کےان کے پرانے طریقے کو درہم برہم کر دیا تھا۔اسی لیے ہزاروں

کی تعداد میں قبائلی اور اکثر ان کی پوری آبادی متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی۔

انگریزوں، ساہوکاروں، مہاجنوں اور لگان وصول کرنے والے کسانوں کی بے جا مداخلت سے قبائلی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ان کی قبائلی شناخت کم و بیش ختم سی ہو گئی تھی۔ دراصل ان کی بغاوت کی بنیادی وجہ قبائلی دلچسپیوں اور تقاضوں کی محافظت تھی۔ انھوں نے خود کو علاحدہ طبقہ کی شکل میں نہیں بلکہ قبائلی شناخت کی بنیاد پر متحد کیا تھا۔ ان کے اتحاد کا معیار اتنا اعلیٰ تھا کہ وہ اس وقت تک دوسرے قبیلہ پر حملہ آور نہیں ہوتے تھے جب تک وہ ان کے دشمن سے مل کر مشترکہ محاذ نہیں قائم کر لیتا تھا۔

ان قبائلی لوگوں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ باہر کے سبھی لوگوں کو اپنا دشمن نہیں مانتے تھے۔ ان کے علاقوں میں باہر سے آکر آباد غریب عوام جو ان کی روزمرہ کی زندگی میں کام آتی تھی کے خلاف وہ قطعی متشدد نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کے ساتھ گہرے سماجی رشتے بنائے تھے۔ ایسے لوگوں میں پیشہ ور ذاتیں آتی تھیں جیسے تیلی، گوالے، لوہار، بڑھئی، بنکر، دھوبی، نائی ڈھولچی، بندھوا مزدور وغیرہ۔ یہ لوگ نہ صرف قبائلی حملوں سے محفوظ رہے بلکہ انگریزوں کے خلاف ہو رہی بغاوت میں انھوں نے گروہ بند ہو کر ان کا ساتھ دیا۔

عموماً قبائلی لوگوں نے بغاوت کا سہارا بھی اسی وقت لیا جب وہ مجبور ہوئے اور یہ سمجھا کہ بغاوت کے علاوہ اب کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ وہ باہری لوگوں پر یکبارگی حملہ کرتے تھے۔ وہ ان کا لوٹ پاٹ کرتے اور ان کو گاؤں کے باہر نکال کر ہی دم لیتے۔ جب کبھی ان کا ٹکراؤ انگریز افسروں سے ہوتا تب وہ مسلح گروہ بندی کر کے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔

ایسے موقعوں پر اکثر انھیں میں کچھ کراماتی مسیحی بھی ابھر آئے جو ان کو یقین دلاتے کہ خدا ان کی مصیبت دور کرے گا۔ اس لیے ان کو بدیسی حکومت کے خلاف متحد ہو کر جنگ کرنا چاہیے۔ ان مذہبی پیشواؤں میں زیادہ تر لوگ یہاں تک دعویٰ کرتے تھے کہ ان کو کرشماتی طاقت حاصل ہے اور خدا ہی ان کی قوت کا منبع ہے۔ اسی طاقت کے ذریعہ وہ دشمنوں کی بندوق کی گولیاں بے اثر کر دیں گے۔ یہ باتیں قبائلی عوام کو اس قدر بھروسہ دیقین دلا دیتیں کہ وہ اپنی آخری سانس تک ان کے ساتھ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

انگریزوں اور قبائلی لوگوں کے درمیان جنگ کرنے کے طور طریقوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک طرف جدید اسلحوں سے لیس فوج تھی اور دوسری طرف ایسے نہتھے لوگ تھے جن کے پاس ہتھیار کی شکل میں صرف پتھر، کلہاڑی، بھالا، تیر و دھنش تھے اور جن کا عقیدہ تھا کہ ان کے پیشواؤں کو کرشاتی طاقت حاصل ہے نتیجہ ظاہر تھا۔ اس طرح کے نابرابری کے ٹکراؤ میں لاکھوں قبائلی مارے ہو گئے۔

قبائلی بغاوتوں میں سنتھال بغاوت سب سے زیادہ زوردار تھی۔ بھاگل پور سے راج محل کا علاقہ جس میں سنتھال رہتے تھے، 'دامن کوہ' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ سنتھال اکثریتی علاقہ تھا۔ انھوں نے باہری لوگوں کو جن کو وہ دکوس (Dikus) پکارتے تھے کو بھگانے کی زبردستی کوشش کی اور بدیسی حکومت کو پوری طرح برباد کرنے کا اعلان کیا۔ سماج کے وہ حالات جن کے تحت سنتھانوں نے بغاوت کا علم بلند کیا، اس کی تفصیل ہم کو اس وقت کے کلکتہ ریویو (Calcutta Review) میں ملتی ہے جو اس طرح ہے: ''زمیندار، پولیس، مال افسر، اور عدلیہ نے مل کر سنتھالوں پر بے انتہا مظالم ڈھار کھے ہیں۔ ان سے جبریہ وصولی کی جاتی ہے اور ان کو ان کی زمین و جائداد سے جبریہ بے دخل کیا جار ہا ہے۔ قدم قدم پر وہ ذلیل کیے جا رہے ہیں۔ بھولے بھالے اطاعت گذار و بزدل سنتھالوں کے ساتھ مختلف قسم کی ذلیل حرکتیں کی جا رہی ہیں۔ ان کو مارا پیٹا جا رہا ہے، قرض دے کر ان سے 50 سے 500 فیصد سود کی وصولی کی جا رہی ہے۔ ہاٹ و بازار میں ان کے ہاتھ خرید فروخت کرنے کے نقلی پیمانے ہیں۔ ان غریبوں کی کھڑی فصل پر کھلے مویشی، ٹٹو، خچر، ہاتھی دوڑا کر امراان کے حقوق کو بری طرح پامال کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی دوسری بے جا حرکتیں ان کے ساتھ عام طور سے کی جا رہی ہیں''[1]۔

سنتھالوں کے نزدیک غیر سنتھال (Dikus) اور سرکاری عملہ اخلاقی اعتبار سے ناقص و کرپٹ تھا اور چوری کرنا، جھوٹ بولنا اور شراب پینا جن کی عادت میں داخل تھا۔

1854 کی آمد تک ان قبائلی لوگوں کے پیشوا جو 'ماجھی' (Majhi) اور پرگنائٹ (Parganite) نام سے مشہور تھے۔ آپس میں بغاوت کے لیے بات چیت کرنے لگے اور اس کے لیے ممکن طریقوں کی تلاش شروع ہوئی۔ زمینداروں اور سود خوروں کو لوٹنے کے اکا دکا

کی تعداد میں قبائلی اور اکثر ان کی پوری آبادی متحد ہوکر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی۔

انگریزوں، ساہوکاروں، مہاجنوں اور لگان وصول کرنے والے کسانوں کی بے جا مداخلت سے قبائلی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ان کی قبائلی شناخت کم وبیش ختم سی ہوگئی تھی۔ دراصل ان کی بغاوت کی بنیادی وجہ قبائلی دلچسپیوں اور تقاضوں کی محافظت تھی۔ انھوں نے خود کو علاحدہ طبقہ کی شکل میں نہیں بلکہ قبائلی شناخت کی بنیاد پر متحد کیا تھا۔ ان کے اتحاد کا معیار اتنا اعلیٰ تھا کہ وہ اس وقت تک دوسرے قبیلہ پر حملہ آور نہیں ہوتے تھے جب تک وہ ان کے دشمن سے مل کر مشترکہ محاذ نہیں قائم کر لیتا تھا۔

ان قبائلی لوگوں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ باہر کے سبھی لوگوں کو اپنا دشمن نہیں مانتے تھے۔ ان کے علاقوں میں باہر سے آکر آباد غریب عوام جو ان کی روزمرہ کی زندگی میں کام آتی تھی کے خلاف وہ قطعی متشدد نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کے ساتھ گہرے سماجی رشتے بنائے تھے۔ ایسے لوگوں میں پیشہ ور ذاتیں آتی تھیں جیسے تیلی، گوالے، لوہار، بڑھئی، بنکر، دھوبی، نائی ڈھوپچی، بندھوا مزدور وغیرہ۔ یہ لوگ نہ صرف قبائلی حملوں سے محفوظ رہے بلکہ انگریزوں کے خلاف ہورہی بغاوت میں انھوں نے گروہ بند ہوکر ان کا ساتھ دیا۔

عموماً قبائلی لوگوں نے بغاوت کا سہارا بھی اسی وقت لیا جب وہ مجبور ہوئے اور یہ سمجھا کہ بغاوت کے علاوہ اب کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ وہ باہری لوگوں پر یکبارگی حملہ کرتے تھے۔ وہ ان کا لوٹ پاٹ کرتے اور ان کو گاؤں کے باہر نکال کر ہی دم لیتے۔ جب کبھی ان کا ٹکراؤ انگریز افسروں سے ہوتا تب وہ مسلح گروہ بندی کر کے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔

ایسے موقعوں پر اکثر انھیں میں کچھ کراماتی مسیحی بھی ابھر آئے جو ان کو یقین دلاتے کہ خدا ان کی مصیبت دور کرے گا۔ اس لیے ان کو بدیسی حکومت کے خلاف متحد ہوکر جنگ کرنا چاہیے۔ ان مذہبی پیشواؤں میں زیادہ تر لوگ یہاں تک دعویٰ کرتے تھے کہ ان کو کرشماتی طاقت حاصل ہے اور خدا ہی ان کی قوت کا منبع ہے۔ اسی طاقت کے ذریعہ وہ دشمنوں کی بندوق کی گولیاں بے اثر کر دیں گے۔ یہ باتیں قبائلی عوام کو اس قدر بھروسہ و یقین دلا دیتیں کہ وہ اپنی آخری سانس تک ان کے ساتھ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

انگریزوں اور قبائلی لوگوں کے درمیان جنگ کرنے کے طور طریقوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک طرف جدید اسلحوں سے لیس فوج تھی اور دوسری طرف ایسے نہتھے لوگ تھے جن کے پاس ہتھیار کی شکل میں صرف پتھر، کلہاڑی، بھالا، تیر و دھنش تھے اور جن کا عقیدہ تھا کہ ان کے پیشواؤں کو کرشماتی طاقت حاصل ہے نتیجہ ظاہر تھا۔ اس طرح کے نابرابری کے ٹکراؤ میں لاکھوں قبائلی مارے ہو گئے۔

قبائلی بغاوتوں میں سنتھال بغاوت سب سے زیادہ زوردار تھی۔ بھاگل پور سے راج محل کا علاقہ جس میں سنتھال رہتے تھے، 'دامن کوہ' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ سنتھال اکثریتی علاقہ تھا۔ انھوں نے باہری لوگوں کو جن کو وہ دکوس (Dikus) پکارتے تھے کو بھگانے کی زبردستی کوشش کی اور بدیسی حکومت کو پوری طرح برباد کرنے کا اعلان کیا۔ سماج کے وہ حالات جن کے تحت سنتھانوں نے بغاوت کا علم بلند کیا، اس کی تفصیل ہم کو اس وقت کے کلکتہ ریویو (Calcutta Review) میں ملتی ہے جو اس طرح ہے: ''زمیندار، پولیس، مال افسر، اور عدلیہ نے مل کر سنتھالوں پر بے انتہا مظالم ڈھا رکھے ہیں۔ ان سے جبریہ وصولی کی جاتی ہے اور ان کو ان کی زمین و جائداد سے جبریہ بے دخل کیا جا رہا ہے۔ قدم قدم پر وہ ذلیل کیے جا رہے ہیں۔ بھولے بھالے اطاعت گذار و بزدل سنتھالوں کے ساتھ مختلف قسم کی ذلیل حرکتیں کی جا رہی ہیں۔ ان کو مارا پیٹا جا رہا ہے، قرض دے کر ان سے 50 سے 500 فیصد سود کی وصولی کی جا رہی ہے۔ ہاٹ و بازار میں ان کے ہاتھ خرید فروخت کرنے کے نقلی پیمانے ہیں۔ ان غریبوں کی کھڑی فصل پر کھلے مویشی، ٹٹو، خچر، ہاتھی دوڑا کر امرا ان کے حقوق کو بری طرح پامال کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی دوسری بے جا حرکتیں ان کے ساتھ عام طور سے کی جا رہی ہیں''[1]

سنتھالوں کے نزدیک غیر سنتھال (Dikus) اور سرکاری عملہ اخلاقی اعتبار سے ناقص و کرپٹ تھا اور چوری کرنا، جھوٹ بولنا اور شراب پینا جن کی عادت میں داخل تھا۔

1854 کی آمد تک ان قبائلی لوگوں کے پیشوا جو 'ماجھی' (Majhi) اور پرگنائٹ (Parganite) نام سے مشہور تھے۔ آپس میں بغاوت کے لیے بات چیت کرنے لگے اور اس کے لیے ممکن طریقوں کی تلاش شروع ہوئی۔ زمینداروں اور سود خوروں کو لوٹنے کے اکا دکا

واقعات ہونے لگے۔ 30 / جون 1855 کو قبائلی لیڈروں نے چھ ہزار سنتھالوں کی ایک میٹنگ بھگنی ڈیہہ گاؤں میں بلائی جس میں چار سو گاؤں کے سنتھال نمائندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ باہری لوگوں اور انگریزی سرکار سے مستقل نجات پانے کے لیے بغاوت کی جائے اور سچائی کی حکومت (The Reign of Truth) اور حقیقی انصاف (True Justice) کے ست یگ کا قیام ہو۔

سنتھالوں کا یہ عقیدہ کہ خدا ان کے ساتھ ہے، ان کے دو لیڈر سیدو (Sidu) اور کانہو (Kanhu) نے اعلان کیا کہ بھگوان سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا ہے اور انھوں نے حکم دیا ہے کہ جنگ کر کے آزادی حاصل کی جائے۔ اپنے اعلان میں سیدو نے افسروں سے یہ کہا کہ ''ٹھاکر جی (بھگوان) نے یہ کہہ کر حکم دیا ہے کہ یہ ملک صاحبوں کا نہیں ہے۔ ٹھاکر جی بذات خود لڑیں گے اس طرح آپ صاحب لوگ اور آپ کے سپاہی خود ٹھاکر جی سے لڑیں گے''۔[2]

سنتھال لیڈروں نے اپنی قوم کے لوگوں کو بغاوت کے لیے متحرک کرنے کی غرض سے گانے باجے کے ساتھ جلوس نکالا۔ انھوں نے گھوڑوں، ہاتھیوں، اور پالکیوں پر سوار ہو کر آگے آگے جلوس کی رہبری کی۔ اس طرح بہت جلد انھوں نے ساٹھ ہزار سنتھالوں کو بغاوت کے لیے گروہ بند کر لیا۔ پندرہ سو سے دو ہزار لوگوں کی ٹولیاں بنائی گئیں۔ اس کے علاوہ کئی ہزار لوگوں کو اہم موقعوں پر دشمن سے نمٹنے کے لیے الگ جمع کیا گیا تا کہ نگاڑہ بجتے ہی وہ ہتھیار اٹھا لیں۔ اس طرح کی مکمل تیاری کر کے ان مجاہدین نے زمینداروں اور مہاجنوں کے گھروں، پولیس تھانوں، ریلوے اسٹیشنوں اور ڈاک ڈھونے والی گاڑیوں پر حملے کیے۔ وہ ہر اس چیز پر حملہ آور ہوئے جس کے ذریعہ سنتھالوں کا استحصال کیا جاتا تھا یا جو انگریزی حکومت کی علامت تھی۔

غیر سنتھال مثلاً گوالے اور ان کی طرح کے دوسرے لوگ سنتھالوں کو مدد پہنچاتے تھے۔ وہ ان کی مدد کھانا وغیرہ فراہم کر کے کرتے تھے۔ ان کے ہتھیاروں کو درست کرنے کے لیے لوہار ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

سنتھالوں کی بغاوت سے نمٹنے کے لیے سرکار کو فوج کی مدد لینی پڑی۔ باغیوں کو کچلنے کے لیے ایک میجر جنرل کی قیادت میں دس فوجی دستے بھیجے گئے۔ بغاوت سے متاثر علاقوں میں

مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور ان کے لیڈروں کو پکڑنے کے لیے دس ہزار روپیوں تک کے انعام کا بھی اعلان کیا گیا۔

اس طرح حکومت نے سنتھالوں کی بغاوت کو بڑی بے رحمی سے کچل ڈالا۔ پندرہ ہزار سے زیادہ سنتھال مار ڈالے گئے۔ ان کے گاؤں کے گاؤں اجاڑ دیے گئے۔ سیدو کے ساتھ دھوکا کیا گیا اور اس کو اگست 1855 میں پکڑ کر مار ڈالا گیا۔ کانہو کو فروری 1886 میں بغاوت کے آخری مرحلہ میں اچانک پکڑ لیا گیا۔ راج محل کی پہاڑیاں سنتھال کسانوں کے خون سے لال ہوگئیں۔ ان کی انوکھی جوانمردی کا ذکر ایل۔ ایس۔ ایس۔ او میلے (L.S.S.O Malley) نے اس طرح کیا ہے۔ ''سنتھالوں نے بے پناہ بہادری دکھائی، بے حد ظلم پر اُف تک نہیں کیا اور نہ اطاعت قبول کی۔ اس موقع پر پینتالیس (45) سنتھالوں نے ایک جھوپڑی میں پناہ لے رکھی تھی۔ سپاہیوں نے ان کو گھیر لیا تھا۔ لگاتار گولیاں چل رہی تھیں، اور سنتھال ان کے جواب میں تیر برسا رہے تھے۔ آخر میں جب ان کے سارے تیر ختم ہو گئے تو سپاہی جھوپڑی میں داخل ہوئے۔ انھوں نے صرف ایک بڈھے سنتھال کو زندہ پایا۔ ایک سپاہی نے اس سے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا مگر بڈھا سنتھال اس پر ٹوٹ پڑا اور اپنی کلہاڑی سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے[3]

میں یہاں تین دوسری خاص بغاوتوں کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹا ناگپور کے کول قبیلہ نے 1820 سے 1837 تک مسلسل بغاوت کی۔ ہزاروں کولوں کے قتل کرنے کے بعد ہی یہاں پھر سے برٹش حکومت قائم ہو سکی۔ آندھرا کے سمندری علاقہ رمپا (Rampa) کے پہاڑی لوگوں نے مارچ / 1879 میں جنگل کے نئے قانون اور منصب داروں جن کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی، کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ اس کو کچلنے کے لیے حکومت نے فوجی طاقت کا استعمال کیا۔ گھوڑ سوار اور پیادہ فوج کے دستے ہزاروں کولوں پر ٹوٹ پڑے اور 1880 کے آخر تک ہی وہ ان کو پست کر پائے۔

منڈا (Munda) قبیلہ کی بغاوت 1899 سے 1900 کے درمیان ہوئی۔ اس کی قیادت برسا منڈا نے کی۔ برسا منڈا برادری میں مشترکہ کھیتی کا رواج تھا مگر جاگیرداروں، ٹھیکیداروں (لگان وصول کرنے والوں) بنیوں اور سود خوروں نے کھیتی کے مشترکہ رواج کو ختم کر

دیا تھا۔ منڈا سردار تیس سال تک مستقل مشترکہ کھیتی کی بحالی کے لیے لڑتے رہے۔

برسا 1874 میں بٹائی کھیتی کرنے والے ایک خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ 1895 میں برسا نے خدا کے دید کا اعلان کیا۔ اس نے خود کو بھگوان بتایا اور دعویٰ کیا کہ بھگوان نے اس کو مرض اچھا کرنے کی کرشماتی طاقت عطا کی ہے۔ ہزاروں لوگ اس نئے مسیحی اور پیمبر کے گرد جمع ہونے لگے۔ منڈا لیڈروں کے زیر اثر یہ مذہبی تحریک جلد ہی کھیت مزدوروں کی سیاسی تحریک میں بدل گئی۔ برسا نیتا بن گیا۔ اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مذہبی اور سیاسی بنیاد پر منڈاؤں کی ریلیاں منظم کیں۔ 1899 کی کرسمس کے قبل شام کو برسا نے منڈاؤں کی حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور اس نے ان کو ٹھیکیداروں، زمینداروں، راجاؤں، حاکموں، اور عیسائیوں کو قتل کرنے کے لیے للکارا۔ اس نے پرزور لہجہ میں کہا کہ ''ہم کلجگ کی جگہ ستجگ لانے کے لیے لڑتے رہیں گے اور دکوس (Dikus) کے خون سے زمین سرخ جھنڈے کی طرح لال ہو جائے گی'' [4] اس نے منڈاؤں کو سختی سے منع کیا کہ وہ غیر قبائلی غریبوں پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔

آزادی کے قیام کے لیے چھ ہزار منڈے تیر کمان، تلوار، بھالے، اور کلہاڑی سے لیس ہو کر برسا کے ساتھ ہو گئے مگر وہ فروری 1900 کے شروع ہی میں گرفتار کر لیا گیا اور جیل میں ہی جون میں مر گیا۔ بغاوت تو ناکام رہی مگر برسا داستان بن کر امر ہو گیا۔

تیسرا باب

1857 کے بعد کسان تحریکیں اور کسان بغاوتیں

انگریزوں کے ذریعہ کیے گئے استحصال کے کاموں کے جو اثرات کسانوں کی زندگی پر پڑے ان پر غور کرنا مناسب ہوگا۔ انگریزوں کی اقتصادی پالیسی، نئے مالی سسٹم، طرز حکومت اور عدلیہ کے نئے طور طریقوں نیز گھریلو دھندوں کی تباہی نے کھیتی کے ڈھانچہ کو پوری طرح بدل دیا تھا۔ لوگ کاشت کاری کی طرف لوٹنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ اس طرح کاشت لائق زمین پر آبادی کا دباؤ کافی بڑھا اور غربت میں اضافہ ہوا۔ زمینداری کے بڑے علاقوں میں کسانوں پر زمینداروں کا جبر وظلم بڑھنے لگا۔ زمیندار اُن سے من مانی لگان وصول کرتے اور بے گار کراتے تھے۔ رعیت واڑی علاقوں میں لگان کی شرح میں بے تحاشہ اضافہ کر کے سرکار نے بھی ویسا ہی ظلم ڈھا رکھا تھا۔ مجبوراً کسان مہاجنوں سے قرض لیتے گئے اور اس طرح دھیرے دھیرے وہ ان کے چنگل میں پھنستے گئے۔ ان کی زمینیں، فصلیں، اور مویشی ان کے ہاتھ سے نکل کر زمینداروں، ساہوکاروں، امیر کسانوں اور مہاجنوں کے قبضہ میں آتے گئے۔ چھوٹے کسانوں کی حیثیت اب صرف کاشتکاروں، بٹائی داروں اور کھیتھر مزدوروں کی ہو گئی۔

جب ان کی زبوں حالی ناقابل برداشت ہوگئی، تب وہ بغاوت کرنے پر مجبور ہوئے۔
ان کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی تھی کہ ان کا استحصال کرنے والے بدیسی ہوں یا دیسی، دیسی لوگوں کے ہٹنے پر انگریزی حکومت ہی ان کی اصل دشمن رہ جائے گی۔

کسانوں نے اس طرح کے مظالم کے خلاف اکا دکا نا کام کوششیں کیں۔ مقامی سطح پر جب ان کی مجموعی جدوجہد ناکام ہونے لگی اور وہ یہ سمجھ گئے کہ وہ انگریزی حکومت کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے اور نہ ان کے جبر و جور کے رکنے کے کوئی آثار نظر آتے ہیں تو مجبوراً انھوں نے جرائم پیشہ کا سہارا لیا۔ زمین سے بے دخل بہت سارے کسان فاقہ کشی سے بچنے کے لیے ڈاکہ زنی اور راہ زنی کرنے لگے۔

1859-60 میں ہونے والی نیل بغاوت کسانوں کی سب سے بڑی اور عسکری تحریک تھی۔ اس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ نیل پلانٹر تقریباً سبھی یورپی تھے۔ وہ اپنے اسامیوں کو نیل کی کھیتی کرنے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ انھوں نے دیہی علاقوں (مفصل) میں نیل کی صفائی کے لیے کارخانے لگا رکھے تھے۔ شروع سے ہی کسانوں کو جبراً نیل اگانا پڑتا تھا۔ اس کام میں وہ بڑا خسارہ اٹھاتے تھے۔ پلانٹر ان کو تھوڑی رقم دے کر ان سے اقرار نامہ لکھا لیتے تھے۔ اس میں دھوکہ سے نیل کی ایسی قیمت درج کر لی جاتی تھی جو بازار کی شرح سے بہت کم ہوتی تھی۔ بنگال کے لفٹنٹ جنرل جی۔ بی۔ گرانٹ (G.B.Grant) نے خود اس معاملہ میں تبصرہ کیا ہے ''سارے جھگڑوں کی بنا یہ ہے کہ نیل پلانٹر بغیر پیسے دیے رعیت کو نیل کی کھیتی کرنے پر مجبور کرتے ہیں''[1] اس کے علاوہ کسانوں سے جبراً ان کی سب سے اچھی اور زرخیز زمین پر نیل کی کھیتی کرائی جاتی تھی، جبکہ وہ اپنی انھی زمینوں پر چاول پیدا کر کے اچھا منافع کماتے تھے۔ نیل کی خریداری کے وقت کم قیمت دے کر ان کو ٹھگا جاتا تھا۔ اور بھگتان پانے کے لیے ان کو پلانٹروں کے کارندوں کو رشوت دینی پڑتی تھی۔ نیل اگانے کے لیے ان کو پیشگی رقم جبراً دی جاتی تھی جس کی واپسی لائق وہ رہ ہی نہیں جاتے تھے اور وہ اگر واپس کرنا بھی چاہتے تو ان کو ایسا کرنے کی مطلق اجازت نہیں تھی کیونکہ اسی پیشگی رقم لینے کی وجہ سے ان کو نیل کی کھیتی جاری رکھنی پڑتی تھی۔
چونکہ دھوکہ دھڑی کے اقرار ناموں سے بہت دنوں تک کام نہیں چل سکتا تھا کیونکہ اس

طرح کے کاموں میں عدالتی دشواریاں آڑے آتی تھیں، اس لیے پلانٹروں نے ذرا دھمکا کر کام کرانے کا راستہ اختیار کیا۔ کسانوں کا اغوا کرنا، ناجائز طریقوں سے ان کو گوداموں میں بند کرنا، ان کی فصلوں اور پھلوں کو برباد کرنا وغیرہ ظالمانہ طریقے ان سے کام کرانے کے لیے اپنا رکھے گئے تھے۔ ایسا کرنے کے لیے انھوں نے لٹھ بند لوگوں کا گروہ تیار کر رکھا تھا۔

یہ پلانٹر عملاً قانون سے بالاتر تھے۔ ان کو قانون کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ زیادہ تر مجسٹریٹ یورپی ہوا کرتے تھے، اس لیے ان کے فیصلے پلانٹروں کے موافق ہوتے تھے۔ یہ مجسٹریٹ پلانٹروں کے یہاں دعوتیں اڑاتے اور شکار بازی کرتے تھے۔ اگر کوئی انصاف کرنے کی جرائت بھی کرتا تو اس کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ 1857 میں انتیس 29 پلانٹروں اور ایک ہندستانی کو آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا تھا۔ ان کی تعداد کو مدنظر رکھ کر یہ کہاوت عام تھی کہ ''جے راکھک سے بھا کھک'' یعنی ہمارے محافظ ہی ہمیں چباتے ہیں۔

1859 کے موسم خزاں میں نیل کسانوں کی بے اطمینانی میں اس وقت ابال سا آ گیا جب ان کو معلوم پڑا کہ شاید حکومت اس معاملہ میں ان کا ساتھ دینے والی ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ کلا روا (Kalaroa) کے ڈپٹی مجسٹریٹ ہیم چندر کار (Hem Chandra Kar) کو ایک سرکاری حکم نامہ کے پڑھنے میں ذرا سی چوک ہو گئی اور اپنے حد اختیار سے تجاوز کر کے انھوں نے ایک فرمان جاری کر دیا کہ ''نیل کسانوں کے معاملہ میں زمین پر رعیت کا قبضہ برقرار رہے گا اور وہ اپنی چاہت کی فصل اس میں اگا سکیں گے نیز پولیس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ نیل پلانٹر یا کوئی دوسرا شخص رعیت کے معاملہ میں مداخلت نہ کرنے پائے''[2]

کار کا یہ اعلان سارے بنگال میں پھیل گیا۔ کسانوں نے سوچا کہ نیل کاشت کے برے سسٹم کو ختم کرنے کا وقت اب آن پہنچا ہے۔ شروع میں کسانوں نے اپنی شکایتوں کو دور کرانے کے لیے پرامن راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے افسروں کو درخواستیں دیں اور پُرامن مظاہرے کیے، مگر ان کی ساری اپیلیں بے اثر ہو گئیں۔ آخر کار ستمبر 1859 میں وہ بھڑک اٹھے۔ لاٹھی، ڈنڈوں کی مار اور پولیس و عدالت کی سختی کی پرواہ کیے بغیر انھوں نے جبراً کھیتی کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرح کی شروعات سب سے پہلے نائڈا (Naida) ضلع کے گووند پور گاؤں سے ہوئی۔ دو پلانٹر ملازم دگمبر بسواس اور بشنو بسواس کی قیادت میں نیل کاشتکاروں نے نیل کی کھیتی کرنا چھوڑ دیا۔ 13 ستمبر 1859 کو ان پر ظلم ڈھانے کے لیے جب پلانٹر کے لوگوں کا ایک گروہ جس میں سولہ بند شامل تھے حملہ آور ہوا، تو گاؤں والوں نے بھی منظم ہو کر لاٹھی بھالوں سے جم کر اس کا مقابلہ کیا اور اس کو ناکام کر دیا۔

کسانوں کے ذریعہ کیا گیا یہ ہنگامہ دوسرے علاقوں میں بھی تیزی سے پھیل گیا اور نیل ہڑتالیں ہوئیں۔ کسانوں نے پیشگی رقم لینے، قول وقرار کرنے اور نیل کی کاشت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پلانٹروں کے حملوں کا جواب وہ بلم، بھالوں، اینٹ پتھر، لاٹھی ڈنڈوں اور تیر دکمان سے دیتے تھے۔ عورتیں بھی مٹی کے برتن ان کے اوپر برساتی تھیں۔

اسی طرح کا ایک اور ہنگامہ 1860 کے موسم بسنت میں بھڑک اٹھا۔ اس نے بنگال کے نیل پیدا کرنے والے سبھی ضلعوں کو اپنے لپیٹ میں لے لیا۔ کسانوں نے ایک ایک کر کے سبھی کارخانوں پر حملے کیے اور ہر ایک گاؤں نے اپنی حفاظت خود کی۔ جہاں کہیں پولیس نے کسان لیڈروں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، کسان پولیس چوکیوں پر بھی حملہ آور ہوئے۔

اب پلانٹروں نے بھی زمیندارانہ اختیارات کو استعمال کر کے کسانوں کے ہنگاموں سے نمٹنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ان کو بے دخل کرنے اور لگان بڑھانے کی دھمکی دی۔ ان سب کے جواب میں رعیت نے بڑی سینہ زوری دکھائی۔ اس نے لگان دینا ہی بند کر دیا۔ کسانوں میں دھیرے دھیرے قانونی مدد لینے کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے چندہ اکٹھا کر کے اپنے خلاف چل رہے مقدموں کی پیروی شروع کر دی اور پلانٹروں کے خلاف بھی ان کے ذریعہ مقدمے دائر کیے گئے۔ پلانٹروں کا سوشل بائیکاٹ (Social Boycott) کیا گیا۔ ان کے یہاں کام کرنے والے نوکروں کو کام بند کرنے پر مجبور کیا گیا۔ آخر کار پلانٹر رعیت کی مجموعی مزاحمت کو نہ روک سکے۔ اور دھیرے دھیرے انھوں نے اپنے کارخانوں کو بند کرنا شروع کر دیا۔ 1860 کے آخر تک بنگال میں نیل کی کھیتی تقریباً ختم ہو گئی۔

نیل تحریک کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ رعیت میں بے حد نظم وضبط اور اتحاد تھا۔ اس

میں پہل کرنے کی بے پناہ ہمت تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان میں مکمل اتحاد تھا رعیت کے خوش حال لوگوں نے ہی تحریک کی قیادت کی تھی۔ کچھ معاملوں میں تو معمولی حیثیت کے زمیندار، مہاجنوں اور پلانٹروں کے سابق اہلکاروں نے رہبری کی ذمہ داری نبھایا تھا۔

نیل بغاوت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس وقت کے دانشور طبقہ نے رعیت کی حمایت وتائید میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اخباروں میں مضامین لکھ کر، عوامی جلسے کر کے اور عرضداشتیں دے کر اس سے کسانوں کی جائز مانگوں کو منوانے کی پر زور سفارش کی تھی۔ ہندو پیٹریاٹ (Hindu Patriot) کے پبلشر ہریش چندر مکھر جی کا رول اس معاملہ میں بہت ممتاز تھا۔ کسانوں پر ہو رہے ظلم، سرکاری افسروں کے متعصبانہ رویہ اور جگہ جگہ ہو رہی کسانوں کی مزاحمت کے بارے میں وہ مسلسل خبریں شائع کرتے تھے۔ ان کو کسانوں کے مسائل کے بارے میں گہری معلومات تھی۔ انھوں نے بذات خود جوشیلے اور ٹھوس مضامین لکھ کر ان مسائل کو سیاسی بلندی تک پہنچایا تھا۔

نیل تحریک کی تاریخی اور سیاسی اہمیت کے باریک باتوں کو اجاگر کرتے ہوئے انھوں نے مئی 1860 میں لکھا تھا کہ ''بنگال کو اپنے کسانوں پر فخر ہونا چاہیے، دولت، طاقت، سیاسی جانکاری اور یہاں تک کہ قیادت کی کمی کے باوجود بنگال کے کسانوں نے جو تحریک چلا رکھی ہے، وہ اب تک دنیا کی تاریخ میں کسی بھی تحریک سے کمتر نہیں ہے۔ سرکار کسانوں کے خلاف ہے؛ قانون ان کے خلاف ہے؛ پریس ان کے خلاف ہے؛ ٹربیونل ان کے خلاف ہے؛ پھر بھی انھوں نے وہ کامیابی حاصل کی ہے جس کا فائدہ ملک میں مستقبل بعید کی نسلوں کو ہر سطح پر ملے گا'' 3

دین بندھو متر (Din Bandhu Mitra) کے ڈرامہ 'نیل درپن' نے دھوم مچا رکھی تھی۔ اس میں نیل کسانوں پر ہو رہے مظالم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔

اس تحریک میں بنگال کے دانشور طبقہ نے جو کردار ادا کیا اس کا اثر اس وقت ابھر رہے علم داں لوگوں پر پڑنا لازمی اور فطری بات تھی۔ سیاسی مکتب کے ان نئے لوگوں نے بدیسی حکومت کے خلاف کسانوں کی مدد کر کے ایسی روایت کی شروعات کی جو آگے چل کر قومی تحریک کے ڈھانچہ کا جز بن گئی۔

اس کے علاوہ مشنریوں نے نیل تحریک کی حمایت میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ حکومت کا نظریہ بھی اس مسئلہ میں بہت حد تک معتدل تھا۔ اس کے ذریعہ اس میں وہ سختی نہیں کی گئی جو اس نے سول اور قبائلی بغاوتوں میں کی تھی۔ شاید حکومت 1857 کی سنتھال بغاوت کے تجربات نہیں بھولی تھی۔ اس نے بروقت کسانوں کے بدلے ہوئے تیور کو بھانپ لیا تھا اور وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ ان کو مشنریوں اور دانشور طبقہ کی پوری حمایت حاصل ہے۔ اس لیے اس نے نیل مسئلہ کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن کا تقرر کیا۔ کمیشن کی فائنل رپورٹ میں یہ بات واضح ہوگئی کہ نیل کھیتی کے پورے سسٹم میں ظلم، زیادتی اور استحصال کا جال پھیلا ہوا ہے۔ اب پلانٹر کچھ ڈھیلے پڑے۔ زیادتیاں کچھ کم ہوئیں۔ بہر حال نومبر 1860 میں حکومت نے ایک نوٹس کے ذریعہ پلانٹروں کو آگاہ کیا کہ رعیت کو نیل کی کھیتی کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ سارے معاملات کا نمٹارہ قانون کے مطابق کیا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ پلانٹروں کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی، وہ خود ہی اپنے کارخانوں کو سمیٹنے لگے۔ ان کو اب پورا یقین ہوگیا تھا کہ دھوکہ دھڑی کے بغیر پہلے کی طرح بے تحاشہ کمائی وہ نہیں کرسکیں گے۔

1870 اور 1880 کی دہائیوں میں مشرقی بنگال کے کسان بے حد پریشان تھے۔ زمینداروں نے لگان کی شرح قانونی حد سے زیادہ بڑھادی تھی۔ اور 1859 کے قانون کی دفعہ دس کے تحت دیے گئے زمین پر قبضہ کے اختیارات سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے زمینداران کو جبراً بے دخل کرنے، ان کی فصل اور مویشی پر قبضہ کرنے اور خرچیلے مقدموں میں پھنسانے کی جگت کررہے تھے۔

جب اس طرح کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو کسانوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاریاں شروع کردیں۔ مئی 1873 میں پابنا (Pabna) ضلع کے یوسف شاہی پرگنہ میں زمینداروں کے خلاف کسان لیگ کا قیام ہوا۔ لیگ نے کسانوں کے عام جلسے کیے۔ زمینداروں کو خوفزدہ کرنے کے لیے گاؤں گاؤں جلوس نکالے گئے اور کسانوں کو اس میں شامل ہونے کی پرزور اپیل کی گئی۔ لیگ نے لگان ہڑتال کرائی اور اس کے تحت رعیت نے اضافہ شدہ لگان دینے سے انکار کردیا اور زمینداروں کے خلاف عدالت میں مقدمے دائر کیے۔ اس کے لیے رعیت سے

چندے بھی لیے گئے۔ دھیرے دھیرے یہی تحریک پورے پرگنہ اور مشرقی بنگال کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ ہر جگہ کسان لیگ کا قیام ہوگیا۔لگان کا بھگتان روک دیا گیا اور زمینداروں سے عدالتی لڑائیاں لڑی گئیں۔ چونکہ کسانوں کی یہ جنگ عدالتی چارہ جوئی تک محدود رہی اس لیے تشدد کے واقعات کبھی کبھار ہی ہوئے۔ایسے واقعات تبھی ہوئے جب زمینداروں نے رعیت کو اپنی شرطیں ماننے پر مجبور کیا۔ زمینداروں کے گھروں میں لوٹ مار کی وارداتیں بھی بہت کم ہوئیں۔ پولیس تھانوں پر حملے کے واقعات بھی کچھ ہی ہوئے۔ کسانوں نے تشدد کا سہارا تبھی لیا جب عدالتی فیصلوں کی تعمیل میں مداخلت کی گئی۔ بہر حال ایسے واقعات نہیں کے برابر تھے۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ کوئی زمیندار یا اسکا کارندہ قتل یا سنگین طریقے سے گھائل کیا گیا ہو۔اس تحریک کے دوران رعیت میں قانون اور قانونی حقوق کے بارے میں بڑی بیداری پیدا ہوگئی تھی۔ کسان قانونی لڑائی لڑنا اچھی طرح سیکھ گئے تھے۔متحد ہوکر،تنظیم بناکر اور پرامن طریقے سے اپنے حقوق کی بحالی کے لیے جہاد کرنا ان کو اب معلوم ہوگیا تھا۔

اگر چہ کسان بے چینی کا دور تقریباً 1885 تک چلتا رہا مگر بہت سے معاملے اس کے پہلے ہی سلجھائے گئے تھے۔ان میں کئی ایک کا حل سرکاری دباؤ اور لالچ میں کیا گیا۔اور کئی معاملوں میں تو زمینداروں نے اس ڈر سے ان سے مصالحت کر لی کہ کسان ان کو طویل اور خرچیلی مقدمہ بازی میں الجھائے رکھیں گے۔اس طرح بہت سارے کسانوں کو پرانے لگان پر زمینوں پر قبضہ مل گیا۔

جب بھی کسانوں نے تشدد کا سہارا لیا،حکومت نے زمینداروں کی موافقت کی اور کسانوں کی گرفتاریاں بڑے پیمانے پر کی گئیں،لیکن جب بھی تحریک کے ذریعہ پرامن لڑائی لڑی گئی،حکومت نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا۔کسانوں کو زمینداروں کے ظلم سے بچانے کے لیے قانون بنانے کا وعدہ کیا گیا۔البتہ حکومت نے اپنے وعدے کو ادھورے پن سے ہی نبھایا اور 1885 میں ''بنگال کاشتکاری قانون'' بنا کر ایک طرح سے صرف خانہ پوری کر دی۔

چونکہ یہ تحریک صرف کسانوں کے وقتی مسائل اور پریشانیوں تک ہی محدود تھی اس لیے زمینداروں اور سرکار نے مصالحت کا رویہ اپنایا۔تحریک نہ تو زمینداری سسٹم کے خلاف تھی اور نہ

سیاسی اعتبار سے کسی بھی طرح انگریزی حکومت کے خلاف تھی۔ کسان لیگ نے اپنی ساری کارگذاری صرف قانونی دائرہ تک محدود رکھا۔ اور اس لیے زمینداوں کے خلاف جدو جہد میں صرف قانونی وسائل سے ہی مدد لی گئی اور حکومت کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی۔ تحریک کے لیڈروں نے اکثر یہی تاثر دیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف نہیں۔ صرف زمینداروں کے خلاف ہیں۔ ان لیڈروں کا یہی نعرہ تھا کہ ''ہم عالی جاہ مہارانی اور صرف مہارانی کی رعیت بنے رہنا چاہتے ہیں۔'' یہی وجہ تھی کہ ان تحریکوں کے خلاف ساری کارروائی حکومت کے ذریعہ تعزیرات ہند کی دفعات کے تحت ہی کی گئی۔ حکومت نے ہتھیار اور تشدد کا سہارا نہیں لیا جیسا کہ اس نے سنتھال اور منڈا بغاوت کو کچلنے میں لیا تھا۔

ایک بار پھر بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپسی اتحاد کا پورا ثبوت دیا، جبکہ رعیت اکثریت میں مسلم اور زمیندار زیادہ تر ہندو تھے۔ ان کو ذات یا مذہب کی بنیاد پر متحد کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔

اس بار بھی بنگال کے نوجوان دانشوروں نے کسان تحریک کی پوری تائید اور حمایت کی۔ ان میں بنکم چندر چٹوپادھائے اور آر۔ سی۔ دت بھی شامل تھے۔ بعد میں جب 1880 کی شروع دہائی میں بنگال کاشتکاری قانون پر بحث چل رہی تھی، تب سریندر ناتھ بنرجی، آنند موہن بوس، اور دوارکا ناتھ گانگولی نے انڈین ایسوسی ایشن (Indian Association) کے ذریعہ کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مہم چلائی، رعیت نے یونینوں کو بنانے میں مدد کی اور لگان قانون کی تائید میں بڑے بڑے جلسوں کا نظم کیا۔ ان میں بیس بیس ہزار تک کی تعداد میں کاشتکار شامل ہوتے تھے۔ انڈین ایسوسی ایشن کے ساتھ کچھ وطن پرست اخباروں نے اس بات پر زور دیا کہ لگان کا تعین مستقل طریقے سے کیا جائے۔ ان سب نے حکومت سے اصرار کیا کہ چونکہ مجوزہ قانون سے ان لوگوں کو بھی زمین کا مالکانہ حق مل جائے گا جو خود زمین نہیں جوتتے ہیں، اس لیے اس قانون کے تحت جوت دار (Jotedar) کی شکل میں دلالوں کا ایک نیا طبقہ تیار ہو جائے گا جو زمینداروں کی طرح کاشتکاروں پر ظلم کرے گا۔ اسی وجہ سے ان سب نے یہ مانگ کی کہ زمین پر مالکانہ حق ان لوگوں کو ہی دیا جائے جو حقیقت میں اس کو جوتتے ہیں۔

مہاراشٹر کے پونا اور احمد نگر کے ضلعوں میں 1875 میں کسانوں کی بڑی بڑی بغاوتیں ہوئیں۔ یہاں رعیت واڑی سسٹم کے تحت لگان کسان سے سیدھے طے کیا جاتا تھا اور اس کو اس کی زمین کا مالک تسلیم کرلیا گیا تھا۔ دوسری رعیت واڑی علاقوں کی طرح یہاں بھی کسان بغیر مہاجنوں کے چنگل میں پھنسے لگان نہیں ادا کر پاتے تھے۔ اس طرح ان کی زمینیں مسلسل ان کے قبضے سے نکلتی جارہی تھیں۔ یہ مہاجن زیادہ تر باہر کے مارواڑی یا گجراتی ہوتے تھے۔ کسان اور مہاجن کے درمیان پیدا ہوئی دشمنی کی خاص وجہ یہی تھی۔

انھیں دنوں 1860 کی شروع دہائی میں امریکی جنگ کی وجہ سے کپاس کی برآمدگی میں بڑا اضافہ ہوا۔ جس کے تحت کپاس کے دام بے تحاشہ بڑھ گئے۔ مگر 1864 میں جنگ کے ختم ہوتے ہی اس کی قیمت یکبارگی گرگئی۔ کسانوں کی حالت خراب ہوگئی اور تبھی سرکار نے لگان کی شرح میں پچاس فیصد کا اضافہ بھی کردیا۔ اس کے علاوہ لگاتار کئی سالوں سے کم پیداوار کی وجہ سے کسان کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی۔ انھیں حالات میں کسانوں کو مہاجنوں کی پناہ میں جانا پڑا۔ اور اس کا ان سب نے پورا فائدہ اٹھایا۔ کسان اور اس کی زمین پر ان کی گرفت اور بھی مضبوط ہوگئی۔ اب کسانوں کو اپنی مصیبت کی اصل وجہ سمجھ میں آگئی۔ وہ مہاجنوں سے بری طرح بدظن ہو گئے۔ ایسی صورت حال میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کے لیے اب صرف ایک چنگاری کی ضرورت رہ گئی۔

تبھی ستمبر 1874 میں سرور (Sirur) تعلقہ کے کرڈاہ (Kardah) گاؤں کے کسان ایک مقامی مہاجن کالورام کے خلاف بلا ارادہ بھڑک اٹھے۔ اس کو ایک قرضدار کسان کے خلاف عدالت سے گھر گرانے کا حکم مل گیا تھا۔ گاؤں کے کسانوں کی تمام منت وسماجت کے باوجود کالورام قبضہ چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں گاؤں والوں نے باہری مہاجنوں کا سوشل بائیکاٹ کردیا تاکہ وہ اپنی مانگیں پرامن طریقے سے ان سے منوا سکیں۔ ان کی دکانوں سے سامان خریدنا بند کردیا گیا۔ ان کے کھیتوں کی جوتائی بند کردی گئی۔ گاؤں کے بلوٹی داروں (Bullotedars) یعنی رعایا جیسے دھوبی، نائی، بڑھئی، لوہار اور موچی وغیرہ پر مہاجنوں کے یہاں کام کرنے پر پابندی لگادی گئی۔ ان کے گھریلو نوکروں کو بھی کام کرنے سے روک دیا

گیا۔اس طرح کے سخت بائیکاٹ سے تنگ ہو کر مہاجن تعلقہ صدر مقام (Head Quarters) بھاگ جانے کے لیے مجبور ہو گئے مگر کوئی بھی آدمی ان کی بیل گاڑی ہانک لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔مہاجنوں کے ساتھ اُن بلوتیداروں کا بھی بائیکاٹ کیا گیا جو مہاجنوں کے خلاف بائیکاٹ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔اس طرح کے سوشل بائیکاٹ کی کارروائی صرف ایک جگہ تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ پونا،احمد نگر،شولہ پور،اور ستارا ضلعوں کے گاؤں بھی تیزی سے اس کی زد میں آ گئے۔

بہرحال سوشل بائیکاٹ کی کارروائی جب بہت مؤثر نہیں ثابت ہوئی تو اس نے بلوہ کی شکل اختیار کر لی۔12 مئی 1857 کو بھیم تھری(Bhim Thari) تعلقہ کے سوپا(Supa) علاقہ میں بازار کے دن اڑوس پڑوس کے کسان وہاں جمع ہوئے اور مہاجنوں کے گھروں اور دکانوں پر دھاوا بول دیا۔انھوں نے سارے دستاویز، پرنوٹ، اقرار نامے، عدالتی حکم نامے، اور قرض سے متعلق دوسرے کاغذات مع وہ قرض نامے اور تمسک جو کسانوں سے جبراً اَلاعلمی اور دھوکا دھڑی میں لکھائے گئے تھے، مہاجنوں سے چھین کر برسرِعام جلا دیے۔کچھ ہی دنوں میں یہ ہنگامہ احمد نگر اور پونا کے دوسرے گاؤں میں بھی پھیل گیا۔

مہاجنوں سے معاملہ کرنے میں تشدد سے بہت کم مدد لی گئی۔انھوں نے سارے اقرار نامے دراصل جو ظلم و زیادتی کرنے کے ان کے اسلحے تھے، بڑی آسانی سے بلوائیوں کو سونپ دیئے تھے۔صرف سوپا میں مہاجنوں کے مکان جلائے گئے اور ان کی دکانیں نذرِ آتش کی گئیں۔ باقی دوسری جگہوں پر کسانوں نے ایسی کارروائی صرف اپنے اتحاد کو دکھانے کے لیے ہی کی تھی۔

حکومت بہت جلد حرکت میں آ گئی اور تحریک کو کچلنے میں بہت جلد کامیاب ہو گئی۔یہ تحریک مشکل سے تین ہفتوں تک ہی چل سکی۔اس کے بعد اکا دکا واقعات کہیں کہیں بس دو ایک ماہ تک ہوتے رہے۔پابنا بغاوت کی طرح دکن بغاوت کا مقصد بھی بہت محدود تھا۔اس میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف بیداری لوگوں میں نہیں پیدا ہوئی تھی۔اس کا اس نے فائدہ اٹھایا۔ اس نے دکن کسان راحت قانون (Deccan Agriculturist Relief Act of 1879) بنا کر مہاجنوں کے خلاف کسانوں کو کچھ راحت دی۔

ایک بار پھر مہاراشٹر کے وطن نواز علم داں طبقہ کے ذریعہ کسانوں کے حقوق کی حمایت کی گئی۔ اس سے پہلے 1873اور 1874 کے دوران جسٹس راناڈے کی قیادت میں پونا ساروجنک سبھانے لینڈ رینیوسٹلمنٹ قانون (Land Revenue Settlement Act of 1867) کے خلاف پونا، ممبئی میں بہت کامیاب مہمیں چلائی تھیں۔ اسی کے زیر اثر کسانوں کی بڑی تعداد نے اضافہ شدہ لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان مہموں نے کسانوں کو ذہنی اعتبار سے 1875 کی پرزور مزاحمت کے لیے تیار کر دیا۔ پونا ساروجنک سبھا کے ساتھ ساتھ کئی قومی اخباروں نے دکن راحت قانون کی حمایت کی۔

کسان سورشیں ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلیں۔ ملابار میں موپلا (Moppila) بغاوت ہوئی۔ واسدیو بلونت پھڑکے (Vasudev Balwant Phadke) نام کے ایک تعلیم یافتہ کلرک نے 1879 میں مہاراشٹر کے پچاس رموسی (Ramosi) کسانوں کو متحد کر کے ایک فوج تیار کی۔ یہ فوج بڑے پیمانہ پر لوٹ مار کرتی تھی۔ بابارام سنگھ نے پنجاب میں کوکا(Kuka)بغاوت کی مسیحائی قیادت کی۔

1872 میں ان کے انچاس باغی کسانوں کو توپ سے بھون کر بغاوت کو کچل دیا گیا آسام میں 94-1893 کے دوران کسانوں نے لگان کی اونچی شرح کے خلاف بغاوت کی توپ کے گولے برسا کر بیسوں کسانوں کو بڑی بربریت سے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اس طرح یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔

1857 کے بعد کسان تحریکوں کے رجحان میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس وقت تک دیسی راجاؤں، نوابوں، تعلقداروں اور زمینداروں کو یا تو انگریزی حکومت کے ذریعہ پست کر دیا گیا تھا یا پھر وہ اس کے شریک دار بنا دیے گئے تھے۔ اسی لیے کسان تحریکوں میں کسان خاص طاقت بن کر ابھرے تھے۔ انھوں نے اپنی مانگوں کو لے کر سیدھے لڑنا شروع کیا تھا۔ ان کی زیادہ تر مانگیں مالی تھیں۔ اور ان کی وقتی دشمنی غیر ملکی پلانٹروں، دیسی زمینداروں اور مہاجنوں سے تھی۔ ان کی کوششوں کا دائرہ محدود تھا۔ کہیں کہیں تو ان کی کوششیں زیادتی کے خلاف محض انتقامی کارروائی تک ہی سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ انھوں نے غیر ملکی حکومت کو سیدھے اپنا نشانہ نہیں بنایا تھا۔

ان کا مقصد بھی اُس ڈھانچہ کو بدلنا بھی نہیں تھا جس کے تحت ان کا استحصال کیا جاتا تھا۔ پرانے نظم کو بدلنا ان کا قطعی مقصد نہیں تھا۔

اس کے علاوہ ان تحریکوں کا دائرہ خاص علاقہ تک ہی محدود تھا۔ اس وقت رسل و رسائل کی سہولتیں نہیں تھیں۔ مستقل اور پائیدار تنظیموں کا بے حد فقدان تھا۔ جب کسی تنظیم کا مقصد پورا ہو جاتا تو وہ ختم سی ہو جاتی، مثلاً نیل بغاوت، پابنا کسان لیگ، دکن رعیت کے ذریعہ کیا گیا سوشل بائیکاٹ وغیرہ اس طرح ختم ہوئیں کہ ان کو چلانے کے لیے جانشیں ہی نہیں رہ گئے۔ یہی اسباب تھے کہ ان تحریکوں نے انگریزی حکومت کے خلاف کوئی جہاد نہیں چھیڑا اور نہ اس کے اقتدار کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔

1857 کے بعد کی کسان تحریکیں دراصل کسانوں کے معاشی استحصال کے خلاف ان کا جذباتی ابال تھا۔ ان پر بے حد ظلم ہو رہا تھا۔ زمین جائیداد سے ان کو معزول اور بے دخل کیا جا رہا تھا۔ ان کا پرانا سماجی ڈھانچہ بری طرح درہم برہم ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ بغاوت کرنے پر تیار ہوئے۔

قانونی یا غیر قانونی کاموں کے بارے میں ان کا نظریہ بھی بہت واضح تھا۔ اسی لیے انھوں نے زمین کے مالکانہ حق حاصل کرنے یا زمینداری کے خلاف جنگ نہیں کی تھی۔ ان کی ساری جدوجہد بے دخلی اور غیر واجب اضافہ شدہ لگان کے خلاف تھی۔ سودخوری کے خلاف کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ انھوں نے تو مہاجنوں کے ذریعہ کی جارہی جعل سازی اور دھوکہ دھڑی کے خلاف آواز اس وقت بلند کی جب ان کو یہ معلوم پڑا کہ قرض دے کر مہاجن ان کی زمینوں کو ہڑپ لینے پر تلے ہیں۔ اس کے علاوہ کسانوں نے حکومت کے لگان وصول کرنے کے اختیارات کو بھی چیلنج نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں وہ تبھی معترض ہوئے جب لگان کی شرح سارے حدود کو پار کر کے بے تحاشہ بڑھادی گئی۔ ان کو اپنے بدیسی پلانٹروں سے بھی کوئی عذر نہیں تھا۔ وہ ان سے اس وقت ناراض ہوئے جب انھوں نے ان کی فصل کی قیمت گھٹادی اور اپنی مرضی کی فصل بونے کی ان کی آزادی چھین لی۔

کسان اب تک اپنے قانونی حقوق کے متعلق کافی بیدار ہو چکا تھا۔ عدالت کے اندر

اور باہر وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کا پرزور دعویٰ کرتا تھا۔ اس لیے جب کبھی قانونی یا غیر قانونی طریقہ سے اس کے حقوق کو پامال کرنے کی سازش کی گئی، تبھی اس نے قانون کو نظر انداز کر کے اپنے ذاتی وسائل کی مدد سے اپنے حقوق کے بچاؤ کی کوشش کی۔ عموماً وہ یہ یقین کرتا تھا کہ قانون کے محافظ اعلیٰ افسران اس کی دلچسپیوں کی حفاظت، اس کے حقوق کی تائید اور اس کے ساتھ انصاف کریں گے۔ اسی لیے اس نے اپنی تینوں تحریکوں میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، سرکار بہادر کی ہی دُہائی دی۔

ان تحریکوں میں کسانوں نے اپنے عظیم حوصلہ، ایثار و قربانی کے جذبہ، بے پناہ تنظیمی صلاحیت اور بلا تفریق مذہب و ملت اور نسل ٹھوس اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے کچھ مراعات بھی حاصل کیں۔ چونکہ کسانوں نے سیدھے حکومت کو چیلنج نہیں کیا تھا، اس لیے وہ ان سے مصالحت کرنے کی بھی خواہشمند تھی اور اسی خواہش کے تحت، سیاسی اور مالی ڈھانچہ کے حدود میں رہ کر، نئی زرعی پالیسی کی وجہ سے کسانوں پر ہو رہی سختی میں کچھ نرمی لانا چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے 1857 کے بعد کسان تحریکوں کے تئیں حکومت کا رویہ پہلے ہوئی سول بغاوتوں کے مقابلہ قدرے مختلف تھا۔ 1857 کی بغاوت اور قبائلی بغاوتوں میں لوگوں نے حکومت سے سیدھے ٹکر لی تھی۔

انیسویں صدی میں ہوئی کسان تحریکوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کسانوں کو بدیسی حکومت کے مالی اور سیاسی ڈھانچہ کی کوئی جانکاری نہیں تھی۔ وہ خود اپنی تحریکوں کے فریم ورک سے ہی ناواقف تھے۔ ان کے پاس نہ نئی فکر تھی اور نہ ہی معاشی، مالی اور سیاسی پروگرام ان کے سامنے تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسان بڑے جنگجو اور بہادر تھے مگر ان کی ساری کوشش سماج کے روایتی قدروں اور فریم ورک میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ کسی ایسے سماج کا تصور نہ کر سکے جو سبھی کو متحد کر کے مفاد عامہ کے لیے کاوش کرتا اور لمبی مدت تک چلنے والی سیاسی تحریکوں کو جنم دیتا۔ وہ قومی سطح کی ایسی قیادت سے بھی خالی تھے جو نئے سماج کی تعمیر کا خاکہ پیش کرتا، اور جو اپنی حکمت کے بل بوتے ملک کی عوام کو متحد اور متحرک کر کے قومی سطح پر جہاد چھیڑتا۔ اس لیے کسی بھی ایسی تحریک جس کے پاس نہ نئی سوچ ہو، نہ پروگرام، نہ قیادت اور نہ تحریکی

حکمت عملی تو حکومت اس کو آسانی سے پھسلا سکتی ہے۔ انگریزی حکومت نے بھی یہی کیا۔ جب اس نے ضرورت محسوس کی، بہلا پھسلا کر تھوڑی رعایت دے کر ان سے مصالحت کر لی اور کبھی طاقت کے بل پر پست کیا، مگر کسانوں کی یہ کمزوری تحریک کے کیریکٹر پر بدنما داغ مطلق نہیں ہے۔ دراصل ایسا کسانوں کی ناسمجھی اور لاعلمی سے ہوتا تھا۔ وہ بدیسی حکومت کے شکنجہ کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ اس وقت دانشوروں کے ایک ایسے طبقے کی ضرورت تھی جو ان کے اندر سیاسی شعور پیدا کرتا، مگر اس وقت کسی ایسے طبقہ کا وجود نہیں تھا، البتہ ایسا طبقہ ابھر ضرور رہا تھا۔

بیسویں صدی میں کسانوں کی بے اطمینانی، سلطنت مخالف عام تحریک میں ضم ہو گئی۔ تب ان کی زیادہ تر خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پا لیا گیا۔ قومی سطح کی اس بڑی تحریک میں کسانوں کی شمولیت نے بدیسیوں کے خلاف ہو رہی جنگ کو قوت ہی نہیں دیا بلکہ بیک وقت وہ اپنی بھلائی کے لیے جہاد چھیڑنے لائق بھی ہوئے اور آج کی کسان تنظیموں کو جنم بھی دیا۔

چوتھا باب

کانگریس کا قیام ——— ایک فرضی داستان

نیشنل انڈین کانگریس کا قیام 1885 میں ہوا تھا۔ اس کی بنیاد بہتر سیاسی کارکنوں نے رکھی تھی۔ اے۔ او ہیوم(A.O.Hume) نامی ایک ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس انگریز افسر نے اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان بہتر لوگوں نے کانگریس کی بنا کیوں رکھی اور یہی وقت اس کے لیے کیوں معین کیا؟

اس سوال کے ساتھ سیفٹی وال کی ایک زور دار داستان لمبے عرصے سے چلی آرہی ہے۔ سیفٹی وال(Safety Valve) کی یہ داستان گذشتہ کئی پشتوں سے طالب علموں اور سیاستداں لوگوں کی گھٹی میں پلائی جارہی ہے، لیکن اگر ہم تاریخ کی سچائی کو کھنگھالیں، تو پتہ چلے گا کہ اس فرضی داستان میں استادم نہیں ہے جتنا عام طور سے مانا جاتا ہے۔

وہ قصہ اس طرح ہے کہ اے۔او۔ ہیوم اور ان کے ساتھوں نے انگریزی سرکار کے اشارہ پر انڈین نیشنل کانگریس کو قائم کیا تھا۔ وہ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا بلکہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن ہی(Lord Dufferin) تھے جن کے اشارہ اور مشورہ پر اس کا جنم

ہوا تھا کہ ہندوستانیوں میں اس وقت پنپتی اور بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کے بخارات کو بغیر کسی خطرہ کے باہر نکلنے کے لیے ہلکا، پرامن، بے ضرر، اور آئینی اخراج کا سیفٹی وال فراہم کیا جا سکے، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان کی بے اطمینانی ان کو متشدد انقلاب بپا کرنے کے لیے اکسا سکتی تھی۔ اس طرح کانگریس کو قائم کر کے یعنی سیفٹی وال فراہم کر کے ہندستانی عوام کی جوش مارتی ہوئی انقلابی توانائی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس قصہ کی اصل جڑ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تشدد آمیز انقلاب دستک دے رہا تھا جو کانگریس کے قیام کی وجہ سے ٹل گیا۔ زیادہ تر مورخین اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں۔ حریت پسند (Liberals) کانگریس کے قیام کو صحیح قدم بتاتے ہیں جبکہ رجعت پسند (Radicals) یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر چہ کانگریس شہنشاہیت نواز تو نہیں رہی مگر مصالحت پسند تو تھی ہی اور دائیں بازو والے انتہا پسند یہ ثابت کرتے ہیں کہ کانگریس شروع سے ہی غیر قوم پرست رہی ہے۔ بہر حال سبھی مکتبہ فکر کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ کانگریس کا جنم جس طریقے سے ہوا اس نے اس کے بنیادی کردار اور مستقبل میں اس کے ذریعہ کیے جانیوالے کاموں پر فیصلہ کن اثرات ڈالے ہیں۔

1916 میں شائع ہوئے ینگ انڈیا (Young India) کے ایک مضمون میں انتہا پسند لیڈر لالہ لاجپت رائے نے سیفٹی وال کے اس تخیل کا استعمال اعتدال پسند کانگریس گروپ پر حملہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس عنوان پر لمبی بحث کرتے ہوئے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ''کانگریس کے قیام کا مقصد ہندوستان کو سیاسی آزادی دلانے سے کہیں زیادہ برٹش حکومت کو خطرہ سے بچانا تھا۔ کانگریس کے نزدیک برٹش سلطنت کی بھلائی اول نمبر پر اور ہندوستان کی خیر خواہی دوسرے نمبر پر تھی'' انھوں نے مزید کہا تھا کہ ''کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کانگریس اپنے نظریہ (انگریزی سلطنت کے تئیں وفاداری) کے تئیں ایماندار نہیں رہی ہے''۔ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''کانگریس کا جنم اسی طرح ہوا ہے اور صرف یہی بات اس کو وطن پرست لوگوں کی نگاہ میں مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی ہے''[1] ایک چوتھائی صدی سے کچھ زیادہ مدت کے بعد آر۔ پام دت کی مستند تحریر ''انڈیا ٹوڈے'' (India Today) نے سیفٹی وال کی داستان کو بائیں بازو کا کچا مال بتایا۔ بڑے ہی زوردار انداز میں پام دت نے لکھا کہ حکومت کی سیدھی پہل اور رہنمائی میں

کانگریس وجود میں آئی۔اس کے لیے' وائسرے سے مل کر خفیہ اسکیم بنائی گئی'۔تاکہ اسوقت اٹھ رہی'' برٹش مخالف عام طاقتوں سے انگریزی حکومت کے تحفظ کے لیے اس کا (کانگریس کا) استعمال اسلحہ کے طور پر کیا جائے،'یہ ہونے والے انقلاب کو ناکام کرنے کی کوشش یا اس کو روکنے کی پیش بندی تھی'۔یہ سچ ہے کہ وقت رہتے کانگریس ایک قوم پرست تنظیم میں تبدیل ہوگئی۔''اس کا قومی کیریکٹر اس کی وفادارانہ سیرت پر حاوی ہونے لگا'' اور یہ عوامی تحریکوں کا وہیکل (Vehicle) بھی بن گئی مگر اس کا ''ابتدائی گناہ'' یعنی اس کا پیدائشی روپ اس کی سیاست پر مستقل داغ چھوڑ گیا۔تنظیم کی حیثیت سے ''اس کا دوہرا روپ'' اس کی پوری تاریخ میں نظر آتا ہے ''یعنی اس کو پہلے حکومت نے بنایا پھر بعد میں یہ سلطنت مخالف تحریک کی قائد بن گئی۔اس نے حکومت کے خلاف جنگ بھی کی اور اس کے ساتھ مل کر کام بھی کیا۔اس نے عوامی تحریک کی قیادت کی اور جب عوام نے انقلاب کے راستہ پر بڑھنا شروع کیا تو اس کو دھوکہ دے کر وہ سلطنت کے ساتھ ہوگئی۔اس طرح کانگریس کے دو رخ تھے۔ایک طرف اس نے عوام کی تحریکی دہشت کے خلاف سلطنت کا ساتھ دیا اور دوسری طرف اس نے قومی جدوجہد میں عوام کی قیادت کی۔''گوکھلے سے لے کر گاندھی تک'' کانگریس کی قیادت کا یہی دوہرا پن دراصل ہندوستان کے بورژوا طبقہ کے دوسرے اور ڈھلمل کردار کو ظاہر کرتا ہے۔برٹش بورژوا کے خلاف برسر جنگ رہتے ہوئے اور ہندستانی عوام کی قیادت کی خواہش دل میں سنجوئے ہوئے،وہ اس بات کے لیے فکرمند تھی کہ ''بہت تیزی سے'' آگے بڑھنے سے،سلطنت پرستوں کو مل رہی امتیازی سہولتوں کے خاتمہ کے ساتھ ان کی بھی سہولتیں ختم ہوسکتی ہیں''۔اس طرح کانگریس حقیقی انقلاب یعنی متشدد انقلاب کی مخالفت کا ترجمان بن گئی،مگر کانگریس کا یہ رول گاندھی کے وقت سے نہیں شروع ہوا بلکہ ''یہ چیز تو برٹش حکومت نے اس کے جنم کے وقت ہی کار منصبی نبھانے کے لیے عمداً اس کی گھٹی میں پلائی'' اس کا دوہرا کردار اپنی بلندیوں پر اس وقت پہنچا جب اس نے ماؤنٹ بیٹن کے سمجھوتہ کو تسلیم کرلیا''2

اس سے پہلے 1939 میں آر۔ایس۔ایس کے چیف ایم ایس گولواکر نے بھی کانگریس کو اس کے لامذہبی نظریہ (Secularism) کی وجہ سے،سیفٹی وال کی بنیاد پر وطن مخالف ٹھرایا تھا۔انھوں نے اپنے رسالہ 'وی' (We) میں یہ مان لیا تھا کہ ہندوؤں کے قومی شعور

اور احساس کو ان لوگوں کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا گیا جو وطن پرست ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور انھوں نے جمہوری اصولوں کو تقویت پہنچائی اور اِس گمراہ کن نظریہ کی اشاعت کی کہ "ہمارے قدیمی دشمن حملہ آور مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ باتیں مشترک ہیں" اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "ہم نے دشمنوں کو اپنا دوست مان لیا اور اس طرح ہم نے سچی قوم پرستی کی جڑیں خود اپنے ہاتھوں کھود ڈالیں" سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں چل رہی جنگ صرف ہندوستانیوں اور نگریزوں کے ہی درمیان نہیں ہے بلکہ یہ تکونی جنگ ہے۔ ہندوؤں کو ایک طرف مسلمانوں سے لڑنا پڑ رہا ہے اور دوسری طرف انگریزوں سے۔ ہندوؤں کو قومیت کے راستے سے ہٹانے کے لیے، گولواکر کے مطابق، ہیوم، کاٹن، اور ویڈر برن (Hume,Cotton Wedderburn) کے ذریعہ 1885 میں طے کی گئی پالیسی ہی ذمہ دار ہے۔ "ان لوگوں نے اس وقت ابل رہی قوم پرستی کے جذبات کے خلاف سیفٹی وال کے طور پر کانگریس کو قائم کیا۔ اس وقت جاگ رہے ایک بڑے دیو کو سلا دینے کے لیے یہ ایک کھلونا تھا، قومی شعور کو تباہ کرنے کا ہتھیار تھا۔ اور جہاں تک ان لوگوں کے مقصد کے پورا ہونے کی بات ہے وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہے"[3]

حرت پسند (Liberals) سی۔ ایف۔ اینڈریوز اور گرجا مکھر جی (C.F.Andrews & Girja Mukharji) نے بھی 1938 میں شائع کی گئی اپنی تحریر "رائز اینڈ گروتھ آف کانگریس (The Rise and Growth of the Congress) (کانگریس کی ابتدا اور ارتقا) میں سیفٹی وال والی بات کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ ہاں وہ اس بات پر ضرور خوش ہیں کہ اس سے "بیکار کے خون خرابے" کو ٹالنے میں مدد ملی۔ 1947 سے پہلے اور بعد کے دسیوں ادیبوں اور سینکڑوں مصنفوں نے انھیں نظریات میں سے کسی نہ کسی کو دہرایا ہے۔

سیفٹی وال کے اس نظریہ کو تاریخی ثبوت فراہم کرنے میں سات جلدوں والی رپورٹ "خفیہ رپورٹ" کا رول فیصلہ کن رہا ہے جس کے بارے میں ہیوم نے بتایا کہ انھوں نے 1878 کی گرمیوں میں شملہ میں اس کو پڑھا تھا۔ اس کے مطالعہ کے بعد ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں "بے اطمینانی ابال کھا رہی ہے" اور نچلے طبقے میں تشدد کے ذریعہ برٹش حکومت کو ختم کرنے کی سازش چل رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان سات جلدوں کے راز کی چھان بین کریں جس کے مطالعہ کا دعویٰ ہیوم نے کیا ہے، یہ سمجھ لینا بہتر ہوگا کہ اس خفیہ رپورٹ کی چرچا کیسے شروع ہوئی اور بعد میں وہ آگے کیسے بڑھی۔ اس کا ذکر ہم کو سب سے پہلے وڈربرن کے ذریعہ لکھی گئی ہیوم کی سوانح حیات جو 1913 میں شائع ہوئی تھی میں ملتا ہے۔ وڈربرن آئی۔سی۔ایس تھا۔ اس کو ہیوم کے کاغذات میں بغیر تاریخ کے ایک میمورنڈم ملا۔ اس میں کانگریس کے قیام کے بارے میں ذکر تھا۔ اس نے اس دستاویز کا بڑی تفصیل سے حوالہ دیا ہے۔4 یہ دستاویز کیا تھا اور وڈربرن نے کیا لکھا تھا؟ اس کا راز میں آگے کھولوں گا۔ ابھی میں وڈربرن کے صرف ان حصوں کو ہی دے رہا ہوں جن کا حوالہ ان سے بعد کے کئی مصنفوں نے اپنی تحریروں میں دیا ہے۔ لالہ لاجپت کے مطابق "ہیوم آزادی کے پریمی تھے۔ اور انگریزی تاج کی سرپرستی میں ہندوستانیوں کو سیاسی آزادی دلانا چاہتے تھے، مگر بہرحال "وہ انگریز محب وطن تھے"۔ جب انھوں نے دیکھا کہ برٹش حکومت پر "سنگین مصیبت آنے والی ہے" تو انھوں نے بے اطمینانی کے اخراج کے لیے سیفٹی وال کی تشکیل کا ارادہ کیا۔

اپنی بات کے ثبوت میں لالہ لاجپت رائے نے ہیوم کے میمورنڈم سے ایک لمبا اقتباس نقل کیا ہے جو وڈربرن کی کتاب میں مع اس کے تبصرہ کے چھپا ہے۔5 چونکہ بعد کے سبھی اہل قلم نے اس اقتباس کا حوالہ دیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہاں پھر اس کو تفصیل سے تحریر کردیں۔

ہیوم نے لکھا تھا کہ "مجھے کئی موٹی موٹی جلدیں دکھائی گئیں جن میں بے شمار خبریں اور رپورٹیں درج تھیں......انگریزی اقتباسات یا ترجمے......طرح طرح کی خبریں، سبھی ضلع وار مرتب (ہماری جیسی نہیں) خبروں کی تعداد بے شمار تھی۔ کہا گیا تھا کہ اس وقت تیس ہزار سے زائد نامہ نگاروں نے اطلاعات دی ہیں"۔ ہیوم کہتا ہے کہ خبروں کے یہ نسخے اس کے پاس صرف ایک ہفتہ ہی رہے۔ ان کی بہت ساری خبریں سب سے نچلے طبقہ کے لوگوں کی بات چیت پر مشتمل تھیں۔ یہ اطلاعات ظاہر کرتی تھیں کہ موجودہ حالات میں یہ غریب لوگ اپنی زندگی سے ناامید ہیں۔ فاقہ کشی سے ان کو مر جانے کا ڈر ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ متحد ہونا چاہتے ہیں، اور اس کا مطلب ہے تشدد، تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک چھوٹا سا مایوس حلقہ ممکن ہے بلا وجہ حکومت کے

خلاف ان کی جد و جہد میں شامل ہو جائے، ان کی قیادت کرے اور اس سورش سے تعلق جوڑ کر ان کو قومی انقلاب کے راستے پر موڑ دے"۔

جلد ہی ان ساتوں جلدوں کے بارے میں قسم قسم کی باتیں کہی جانے لگیں حالانکہ لالہ لاجپت رائے نے اپنے اقتباس میں ان کے آغاز اور اوصاف کے سلسلہ میں کوئی تشریح نہیں کی تھی۔ 1933 میں گرمکھ نہال سنگھ نے ان ساری جلدوں کو سرکاری رپورٹ بتایا[6] اور دوسری طرف اینڈ ریوز اور مکھرجی نے کہا کہ یہ "سی۔ آئی۔ ڈی کے ذریعہ تیار کی گئی خفیہ رپورٹیں تھیں جو ہیوم کو سرکاری حیثیت میں ہونے کی وجہ سے ملی تھیں"[7] سب سے زیادہ ٹھوس اور زوردار بات آر۔ پام دت نے تحریری کی ہے۔ انھوں نے لالہ راجپت رائے کے ذریعہ وڈربرن کے حوالہ سے لیا اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہیوم کو اپنی سرکاری حیثیت کے تحت پولیس کی لمبی لمبی خفیہ رپورٹیں حاصل ہوئی تھیں"[8] بعد کے سورخین جن میں آر۔ سی۔ مجومدار اور تاراچند شامل ہیں، نے ان لوگوں کے اس خیالی ثبوت کو تاریخی حقیقت مان لیا۔

ہیوم کے ذریعہ بیان کردہ ان دستاویزوں کو اتنا پختہ سرکاری ریکارڈ مانا جانے لگا کہ 1950 کی دہائی میں کئی مورخین اور اسکالرز جن میں عہد حاضرہ کے مصنفین بھی شامل ہیں نے ملک کے محافظ خانوں کو کھنگالنے میں اپنی قیمتی صلاحیت، توانائی، اور وقت کو جھونک دیا۔ جب ان کے ہاتھ اس کاوش میں کچھ نہ لگا تو انھوں نے یہ بات مان کر تسلی کر لی کہ 1947 میں ہندوستان چھوڑنے کے پہلے انگریزوں نے ان دستاویزوں کو ضائع کر دیا ہوگا۔ بہر حال اگر انھوں نے ذرہ برابر بھی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا اور اس سلسلہ میں تھوڑا سا بھی سوچتے تو شاید ان کو راہ فرار نہ اختیار کرنا پڑتا، کیونکہ ڈفرن اور رپن (Ripon) کے ذاتی کاغذات کے دستیاب ہونے کے پہلے بھی تین قسم کے تاریخی ثبوت اور دلائل موجود تھے۔

پہلا ثبوت تو اس سسٹم سے متعلق تھا جس کے تحت حکومت 1870 کی دہائی میں کام کرتی تھی۔ 1878 میں ہیوم شعبہ مال، زراعت، اور تجارت کے سکریٹری تھے۔ ان شعبہ جات کے سکریٹری کی رسائی بھلا وزارت داخلہ کی فائلوں اور سی۔ آئی۔ ڈی رپورٹوں تک کیسے ہو سکتی تھی نیز اس وقت ان کا قیام شملہ میں تھا اور وزارت داخلہ کے کاغذات دہلی میں رکھے جاتے تھے۔

اس طرح تیس ہزار روپے ان کے پاس کہاں سے آ گئے۔ اس وقت تو جاسوسی محکمہ میں کچھ ہی سو کا عملہ بھی تھا۔ اور جیسا لالہ لاجپت رائے نے لکھا ہے کہ اگر کانگریس کا قیام بغاوت ہونے کے خوف سے ہوا تھا تو ہیوم اور انگریز افسر شاہی نے فوراً یہ کام کیوں نہیں کیا؟ انھوں نے سات سال کی لمبی مدت تک انتظار کیوں کیا؟

اگر یہ جلدیں سرکاری دستاویزات نہیں تھیں تو پھر یہ جلدیں کیا تھیں؟ اس کا سراغ وڈر برن کی کتاب میں ملتا ہے۔ اگر کوئی مصنف وڈر برن سے لیے اقتباس پر بھروسہ کرنے کے بجائے سیدھے اس کی کتاب جو آسانی سے دستیاب ہے، کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو اس میں فراہم دوسرا تاریخی ثبوت مل جائے گا۔

لالہ لاجپت رائے، آر پام دت اور دوسرے لوگوں نے جن اقتباسات کا حوالہ دیا ہے وہ وڈر برن کی کتاب کے صفحہ 80 اور 81 پر چھپے ہیں۔ ان سے دو صفحے پہلے 78 سے 80 تک اور ایک صفحہ آگے 80/81 پر وڈر برن بتاتا ہے کہ یہ دستاویزات کیا تھے اور انھیں ہیوم کو کس نے دیا تھا؟ یہ اقتباسات کتاب کے جس باب (Heading) میں ملتے ہیں اس کا نام ہے "ہندوستان کے مذہبی پیشوا" (Indian Religious Leaders) اس باب کے شروع میں وڈر برن نے لکھا ہے کہ دھمکی سے بھرے خطرہ کی اطلاع ہیوم کو "خاص ذریعہ سے ملی اور یہ ذریعہ تھا مذہبی پیشواؤں کا جن کی زندگی مذہب کے لیے وقف تھی اور جو ملک میں ہر جگہ پائے جاتے تھے"۔ ہیوم نے اپنے میمورنڈم میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان جماعتوں اور طبقوں کے پیشوا، گرو (پیر) ہیں جو اعلیٰ خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں اور جن کی خواہش روحانی معراج حاصل کرنا ہوتی ہے اور ان کو اپنے مریدوں کے ذریعہ زمین پر ہو رہے سارے واقعات کی خبر ہو جاتی ہے اور رائے عامہ بنانے میں ان کا کردار بڑا اہم ہے۔ وڈر برن لکھتا ہے کہ وائسرائے اور لارڈ لٹن کے آخری دور میں ہیوم ایسے ہی پیروں کی صحبت میں آئے تھے۔ ان پیروں نے ہیوم سے اس لیے تعلق بنایا تھا کیونکہ ہیوم کو پوربی ملکوں کے مذاہب سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان پیروں کو یہ خدشہ تھا کہ پورے ملک میں پھیلی بدامنی کی نحوست ایک دن بھیانک سازش کا روپ دھارن کر لے گی اور ایسے حالات میں حکومت تک پہنچ رکھنے والے ہیوم جیسے لوگ ہی اس

آفت کو ٹالنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہیوم نے لکھا کہ اُس طرح یہ بات میرے سامنے لائی گئی۔ ایسے پس منظر میں اگر صفحہ 81-80 کا مطالعہ کریں تو بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں سات جلدوں والی رپورٹ ہیوم کو ان پیروں سے ملی جس کی اطلاع ان کے ہزاروں چیلوں نے ان کو دی تھی، مگر سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ ہیوم نے ان خبروں کی سچائی پر یقین کیسے کرلیا۔؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مریدین خاص نسل و نطفہ کے تھے اور ان کا تعلق کسی خاص فرقہ یا مذہب سے نہیں تھا۔ بلکہ وہ تمام مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اور ان کے کٹر چیلے ''قول و قرار سے بندھے ہوتے تھے''۔ وہ سب کسی پوشیدہ علم و معرفت کی جستجو میں مصروف رہتے تھے اور وہ سب اس قول و قرار کے بھی پابند ہوتے تھے کہ خود کے علاوہ کسی دوسرے اعلیٰ متلاشی معرفت کے سامنے عملاً اپنے قول و قرار کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ ان پیروں کا تعلق کسی خاص مذہب و فرقہ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ سبھی ملت و مسلک کو مانتے تھے، اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر ایسا ہی معاملہ تھا تو ان ہزاروں پیروں اور چیلوں کو کوئی کیوں نہیں جانتا تھا؟ ہیوم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مکمل رازداری ان کی زندگی کی خصوصیت تھی۔ انھوں نے ہیوم سے صرف اس لیے رابطہ قائم کیا کہ وہ غیبی مصیبت کو ٹالنا چاہتے تھے۔

اور آخر میں ہم تاریخ نویسی کے تیسرے معیار پر غور کرتے ہیں جس کا انحصار پوری طرح وہم و گمان پر ہے۔ پیروں اور مریدوں کی خصلت کو وڈربرن نے پوری طرح اجاگر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دوست سیرت نگاروں کی طرح اس نے اپنے دوست کی عزت و آبرو کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ پیر و مرید عام فانی انسان ہی تھے۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی تھیوصوفی (Theosophy) اور میڈم بلاواتسکی (Madame Blavatsky) کی کچھ کتابوں اور وائسرائے رپن اور ڈفرن (Dufferin) کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ پیر اپنی ''انوکھی مشرقیہ مذہبی سوچ'' اور عمل کی وجہ سے پُراسرار مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تھے۔ یہ ہزاروں میل دور سے رابطہ قائم کر سکتے تھے، خطاب کر سکتے تھے، کسی جگہ داخل ہو سکتے تھے، کہیں جا سکتے تھے، کسی جگہ بغیر دکھائی پڑے بیٹھ سکتے تھے، اور کسی بھی شخص کے خیالات اور عقیدہ کو بغیر اس کے علم کے متاثر کر سکتے تھے۔

1881 میں ہیوم، میڈم بلاوتسکی کے زیر اثر آئے تھے، میڈم کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کا اُن پیروں (گرووَں) سے تعلق ہے۔ انھوں نے ان پیروں کو مہاتما یعنی عظیم روحانی شخصیتیں بتایا ہے۔ ان مہاتماؤں کا دور دراز تبت میں پوشیدہ مسکن تھا، لیکن وہ دنیا کے کسی بھی آدمی سے روحانی طاقت کے بل پر تعلق یا رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ بلاوتسکی نے ہیوم کی ملاقات ایسے ہی مہاتما کوٹ ہومی لال سنگھ (Koot Hoomi Lal Singh سے کرائی۔ نظروں سے اوجھل یہی مہاتما اپنے مریدوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہو رہے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ پائنیر (Pioneer) کے اڈیٹر اے۔ پی۔ سینٹ (A.P.Sinnet) جو بلاوتسکی کے دوسرے چیلہ تھے نے 1880 میں شائع ہوئی کتاب میں کوٹ ہومی لال سنگھ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ان مہاتماؤں نے اپنی کرامات کے ذریعہ 1857 میں ہندستانی عوام کی بغاوت کو ناکام کر کے برٹش حکومت کو گرنے سے بچالیا۔ مستقبل میں بھی یہ مہاتما اسی قسم کے کسی اور موقع پر اپنی کراماتی طاقت کا استعمال کریں گے۔

ہیوم کو اس طرح کی ساری باتوں پر پورا یقین تھا، وہ خود بھی ایسی ہی پر اسرار طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے جس سے حال اور مستقبل ان پر عیاں ہو جائے۔ اسی غرض کے تحت انھوں نے مہاتماؤں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یوں تو ہیوم کی بلاواتسکی سے 1887 تک ان بن ہوگئی مگر ان پیروں اور مہاتماؤں میں ان کی عقیدت کم نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنا سیاسی مقصد، جو ان کو بے حد عزیز تھا، کو پورا کرنے کے لیے مہاتماؤں کے تعلق کو استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کی دلی منشا تھی کہ حکومت کا مزاج بدلے اور وہ ہندوستانیوں کا پاس و لحاظ رکھ کر کام کرے۔

دسمبر 1883 میں انھوں نے رپن کو لکھا کہ ''میرا تعلق ایسے لوگوں سے ہے جن کو عوام دیکھ نہیں سکتی، پھر بھی ان کی عزت و قدر کرتی ہے، ان کو بھگوان مانتی ہے اور یہ روحانی شخصیتیں عوام کے احساسات سے خوب واقف ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ''ایشیا کے کچھ لوگ جو مافوق الفطرت قوت رکھتے ہیں، عوام کے دل کی ہر ایک بات جانتے ہیں، انھوں نے مجھ کو بھی کچھ حد تک عوام کا رازدار بنا دیا ہے''۔ جنوری 1884 میں انھوں نے رپن کو اطلاع دی کہ اس سے پہلے 1848 میں ہی وہ ان ولیوں کی صحبت میں آگئے تھے اور انھیں بزرگوں کی مداخلت سے

1848 کی پوری تحریکیں فیل ہوئیں اور 1857 کا غدر ناکام کیا جا سکا تھا۔ دور دراز تبت سے یہی ولی ان کے (ہیوم کے) اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے رپن کے اصلاحی قانون کو لاگو کرنے اور قومی انقلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہیوم نے یہ بھی کہا کہ وہ رپن کو دوبارہ وائسرائے بنوانے کے لیے مہارانی کو منانے میں اور ''دیسی دباؤ کو ساکت کرنے میں'' انھیں ولیوں کی مدد لے رہے ہیں''۔9

ہیوم نے ڈفرن کے ساتھ تھوڑی جھجک سے ایسا ہی کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ڈفرن کو یہ نہیں بتایا کہ ان کے صلاح کار مافوق الفطرت والے اشخاص ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کئی تاریخ نویسوں نے یہ مان لیا کہ ان کے یہ مشیر کار ہیوم کے دوست کانگریس لیڈر تھے۔ صرف ایک بار انھوں نے اس راز سے پردہ ہٹایا جب 1887 میں ڈفرن نے طیش میں آکر دریافت کیا کہ آخر ان کو (ہیوم کو) وائسرائے کے رازدارانہ خطوط کا علم کیسے ہو گیا۔ یہ سن کر انھوں بتایا کہ ان کے دستوں نے بڑے پراسرار طریقے سے ان خطوں کی فوٹو کاپیاں حاصل کی ہیں، لیکن جب ڈفرن نے ان کو اصلی نسخے دکھا کر یہ ثابت کر دیا کہ ان کی بات سراسر غلط ہے تو وہ لاجواب ہو گئے۔10

اس سے پہلے بھی ایک بار اشارے سے ہیوم نے ڈفرن کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے صلاح کار عام سیاسی لیڈر نہیں تھے۔ بلکہ پہنچی ہوئی ہستیاں اور مہاتما تھے۔ یہ بات انھوں نے بڑے محتاط انداز میں میں کہی تھی۔ نومبر 1986 میں ڈفرن کے نام ایک خط میں انھوں نے کہا کہ وہ کوشش یہی کر رہے ہیں کہ شملہ میں جن لوگوں نے ان کو سات حصوں کی رپورٹ دکھائی تھی وہ ان کو (ڈفرن کو) دکھا دیں تا کہ وہ رپورٹوں کی حقیقت کو جانچ پرکھ سکیں جن کو انھوں نے اپنے ذاتی طریقے سے معلوم کی ہیں۔ لیکن ''اس وقت وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کام ناممکن ہے'' اور نہ وہ سیدھے وائسرائے سے بات ہی کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ آپ نے وہ نہیں کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا اور نہ آگے آپ اس کو کریں گے۔ پھر بھی ممکن ہے ان کے (ہیوم کے) ایک خاص دوست جنھوں نے شملہ میں 1878 میں ان کے ساتھ ایک ماہ گذارا ہے اور جنھوں نے اکثر ہندوستان میں قیام کیا ہے، وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ ہیوم نے مشورہ دیا کہ ''اگر ایسا کوئی پرائیویٹ سکریٹری ان سے ملنے آئے اور کہے کہ ہیوم نے اس کو وائسرائے سے

ملاقات کرنے کے لیے بھیجا ہےتو وہ اس سے ملاقات کرلیں۔دس منٹ کے اندر ہی وہ سمجھ جائیں گے یہ مہمان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے........اللہ ہی جانتا ہے کہ کبھی آپ کو ایسا موقع ملتا ہے کہ نہیں.......وہ پراسرار طریقے سے حیرت انگیز کام کرتے ہیں"11

لیکن ہیوم بذات خود بہت پریشان تھے کیونکہ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی شہادت نہیں تھی۔انھوں نے وائسرائے سے کہا کہ وہ خود اپنے اوپر ناراض ہو رہے ہیں اور حیران ہیں کیونکہ جن باکمال حضرات کی رہنمائی میں وہ کام کر رہے ہیں وہ برسر عام لوگوں کے سامنے آنا نہیں چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مقیم سبھی یوروپی ان کو (ہیوم کو) پاگل اور جھوٹا مانتے ہیں۔اور اس کے لیے انھوں نے وائسرائے کو بتایا کہ وہ سیاسی کام تو کرتے رہیں گے مگر اپنے دوستوں سے سارے تعلقات ختم کرلیں گے12

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سات جلدوں والی وہ رپورٹ جس کو ہیوم نے شملہ میں دیکھا تھا۔اس کو کانگریسیوں نے نہیں بلکہ ان کے دوستوں اور صلاح کاروں نے تیار کی تھی جو مافوق الفطرت مہاتما، ولی، اور پُراسرار حضرات تھے۔

سیفٹی وال کے بارے میں دوسری دلیل ڈبلو۔سی بنرجی کے اس بیان پر مبنی ہے جو انھوں نے 1898 میں انڈین پولٹکس،(Indian Politics) میں دیا تھا کہ کانگریس کس طرح وجود میں آئی اور کس طرح آگے بڑھائی گئی۔ یہ کام دراصل ڈفرن اور آوا(Ava) کے مارقس (Marquis) کا ہے ڈبلو۔سی۔ بنرجی نے بتایا کہ ہیوم نے 1884 میں سوچا کہ سال میں ایک بار ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کا ایک جلسہ کیا جائے جو صرف "سماجی معاملوں پرغور کرے" وہ نہیں چاہتے تھے کہ "سیاست ان کی بات کا موضوع ہو" لیکن ڈفرن نے ان سے ٹھیک اس کے الٹا کرنے کے لیے کہا کہ وہ کوئی ایسی تنظیم بنائیں جس کے ذریعہ حکومت کو ہندستانی عوام کے خیالات کی معلومات ملتی رہے۔اور وہ تنظیم وہی رول ادا کرے جو مہارانی کی مخالف پارٹی نبھاتی ہے13

بنرجی کا بیان اس وقت کے واقعات سے میل نہیں کھاتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ان کا حافظہ کمزور ہوگیا تھا یا وہ انیسویں صدی کے آخری دور کے انگریزی حکومت کے غصہ کے ردعمل

سے کانگریس کو بچانا چاہتے تھے۔اس وقت کے واقعات بنرجی کی باتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ کانگریس کے بارے میں ہیوم کی ہندستانی لیڈروں سے جو باتیں ہوئیں وہ سیاست سے متعلق تھیں۔اس سے پہلے کی تنظیمیں مثلاً پونا سارو جنک سبھا، بامبے پریسیڈنسی ایسوسی ایشن، مدراس مہاجن سبھا، اور انڈین ایسوسی ایشن کے زیادہ تر کام سیاسی ہی تھے۔1882 سے ہی انڈین سول سروس سے سبکدوش ہونے پر ہیوم ہندوستانیوں کو سیاست میں حصہ لینے کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔وہ اپنے دوستوں سے متواتر یہ بھی کہتے رہتے تھے کہ ان کو سماجی مسئلوں کو لے کر آپس میں بٹنا نہیں چاہیے۔

جنوری 1885 میں جب ہیوم کے دوست بی۔ ایم۔ ملاباری (B.M.Malabari) نے انڈین اسپکٹیٹر (Indian Spectator) میں اداریے (Editorials) تحریر کر کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو تلقین کی کہ وہ سماج سدھار کے لیے تحریک شروع کریں۔اس صلاح کی رد میں ہیوم نے انڈین اسپکٹیٹر کو ایک خط لکھ کر ملاباری کے مشورہ کی تنقید کی۔اور خبردار کیا کہ ایسا اقدام پُر خطر ہوگا اور یہ تجویز بھی پیش کی کہ سیاسی اصلاح کو سماجی اصلاح پر ترجیح دی جانی چاہیے۔[14] ڈفرن نے 1888 میں سینٹ اینڈریوز ڈے (St.Andrews`Day) کی دعوت کے موقع پر اپنی تقریر میں کانگریس کی بہت صاف لفظوں میں تنقید کی کہ وہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے سیاسی تحریکیں چلا کر سماج سدھار کام کو نظر انداز کر رہی ہے جس میں کروڑوں کی بھلائی ہوسکتی ہے۔[15] ڈفرن نے انھیں احساسات کا اظہار سکریٹری آف اسٹیٹ کو ایک خط لکھ کر کیا۔

ڈفرن کے ذاتی کاغذات کا جو 1950 کی دہائی کے آخری دنوں سے اہل علم طبقہ کو دستیاب ہیں، اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ کانگریس تشکیل میں ڈفرن نے نہ تو کوئی تعاون کیا اور نہ ہی سرپرستی کی۔یہ بات تو بعد میں پیدا ہوئی جب ہیوم نے انڈین اسپکٹیٹر کو خط کی ایک کاپی روانہ کی جس میں سماج سدھار کے متعلق ملاباری کے خیالات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا اور جس کی تائید ڈفرن نے کی تھی۔انھوں نے ہیوم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ان سے ملاقات کر لیں۔اس معاملہ کی مکمل تصدیق بمبئی کے گورنر لارڈ رے (Lord Reay) کے نام تحریر کردہ ڈفرن کے اس خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ہیوم سے پہلی ملاقات کے بعد مئی

1885 میں لکھا تھا کہ ''ہیوم نے مجھ کو بتایا ہے کہ وہ اوران کے دوست ایک سیاسی میٹنگ کرنے جارہے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ٹھیک اسی طرح کا اجتماع جیسا کیتھولک آزادی کے پہلے اوکونیل (O`Connel) نے کیا تھا''[16]

نہ تو ڈفرن اور بمبئی اور مدراس کے حریت پسند ان کے گورنر ساتھی اور نہ الفرڈ (Alfred) جے۔ بی۔ لائل (J.B.Lyall) ڈی۔ ایم والیس (D.M.Wallace) اے۔ کالون (A.Colvin) اور ایس سی بیلے (S.C.Bayley) جیسے دقیانوس (Conservative) افسروں کو کانگریس سے کوئی ہمدردی تھی۔ ڈفرن نے 1888 میں صرف پہلی بار ہی کانگریس کو برا بھلا کہا ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ انھوں نے رے کو لکھا کہ ''ہم کانگریس کا خاتمہ بالخیر کردیں گے۔'' ''ہم اس کو رہنے نہیں دیں گے''[17] اس سے پہلے مئی 1885 میں وہ رے کو لکھ چکے تھے کہ ''وہ کانگریس سے ہوشیار رہیں اور اصلاح پسندوں (Reformers) اور رجعت پسندوں (Reactionaries) کے نزدیک نہ پھٹکیں''۔ 18 / جون 1885 میں رے نے اس کا جواب تحریر کرکے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ انگلینڈ کے سیاسی منظر پر ابھرے آئرش (Irish) نمائندوں کے مانند ہی ہندوستان میں 'نیشنل پارٹی آف انڈیا' کی شکل میں سیاسی کارکنوں نے بے چینی پیدا کردی ہے۔ اس سے پہلے مئی میں ہی رے نے ڈفرن کو خبردار کیا تھا کہ ''ہیوم ایک ایسی تنظیم کا مرکز بن گئے ہیں جو ہندوستانیوں کے دلوں میں وطن پرستی کا جذبہ اجاگر کررہی ہے''[19]

دراصل مئی 1885 کے بعد ڈفرن کو ہیوم سے سرد مہری ہوگئی۔ وہ ان سے کنارہ کش ہوگئے۔ 1886 کے بعد تو ڈفرن بنگالی بابوؤں اور مراٹھا برہمنوں پر بھی برسنے لگے کہ ''ان لوگوں کے مقاصد مشتبہ ہیں'' اور یہ کہ ہندوستان میں آئرلینڈ جیسی انقلابی سورش کرنا چاہتے ہیں'' 20 مئی۔ جون 1886 میں ڈفرن نے ہیوم کو ادھ پگلا مکار، بے حد مغرور، اور پرلے درجے کا جھوٹا بتایا۔ ہیوم کا صرف یہی قصور تھا کہ وہ 'ہوم رول' (Home Rule) تحریک کے روح رواں ہوگئے تھے۔

مختصر یہ کہ کانگریس کے وجود میں آنے کا سیفٹی وال والا نظریہ حقیقت میں مہاتماؤں کی کارگذاریوں تک ہی محدود ہے اور شاید انھیں سے اس کی ابتدا ہوئی۔

5واں باب

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام — ایک حقیقت

پچھلے باب میں ہم نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی کہانی شروع کی تھی۔ مگر اس کے الجھاؤ کو بغیر صاف کیے سیفٹی وال کی فرضی داستان کو بغیر ساکت کیے، غائب جلدوں کے راز کو بغیر سلجھائے اور ہیوم کے ولیوں کو ان کے مسکن تبت بغیر روانہ کیے، ہم اس کہانی کو اور آگے نہیں بڑھا سکتے ہیں۔ اس لیے ہم اس باب میں سب سے بڑی اس قومی پارٹی کے ظہور کے زیادہ اہم حصہ کی کہانی شروع کر رہے ہیں جس نے حصول آزادی کے قبل تک، قومی تحریک میں تقدیر سازی کا کام انجام دیا تھا۔

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام نہ تو غیر متوقع سانحہ تھا، اور نہ ہی تاریخ کا ناگہانی واقعہ، بلکہ 1860 اور 1870 کی دہائیوں میں شروع ہونے والی ہندستانی عوام کی سیاسی شعور کی یہ معراج تھی۔ 1870 کے آخر اور 1880 کے شروع میں اس سیاسی فہم نے مزید ترقی کی اور 1885 تک اس کی سوجھ بوجھ نقطۂ انقلاب تک پہنچ گئی۔ اور اب ہندوستان کے ماہر

سیاست داں اور جدید دانشور طبقہ، انگریزی حکومت کے مد مقابل، ذاتی فائدوں کے تنگ دائروں میں سوچنے کے بجائے قوم کی بھلائی کے وسیع دائرے میں سوچنے کے لیے بیتاب ہو گئے۔ انکی یہ کاوش کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ انھوں نے ملکی سطح پر ایک ایسی تنظیم کو جنم دیا جس کا ایک ہی منبر، ایک ہی امام ایک ہی صدر مقام تھا اور جس کے لیے سیاسی جذبہ کی ایک ہی علامت تھی۔

برٹش نوکر شاہی نے لوگوں کی سیاسی ہلچل جو کانگریس کو جنم دے رہی تھی، کی منشا کو بھانپنے میں ذرہ برابر غلطی نہیں کی۔ وہ اسے شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور انگریزی حکومت کے حق میں فال بد مان رہی تھی۔ جیوں جیوں لوگوں کی سیاسی سرگرمی تیز ہوتی گئی، حکومت کو آئر لینڈ جیسی غداری، بغاوت اور سورش کا خیال بری طرح ستانے لگا۔

انگریزی حکومت کا یہ شبہ وقتی نہیں تھا۔ اس کے ٹھوس تاریخی ثبوت تھے۔ اس وقت کے خاص خاص مطالبے تھے —— سوتی کپڑوں پر برآمدگی محصول میں کمی نہ کرنا، اسلحہ رکھنے کا اختیار دینا، پریس کی آزادی، برما اور افغانستان تک سلطنت کو وسعت نہ دینا، فوجی اخراجات میں تخفیف، قحط زدہ لوگوں کی مالی امداد میں اضافہ، سول سروسز میں ہندوستانیوں کی بھرتی، نیم فوجی اور رضاکارانہ دستہ میں شامل ہونے کی آزادی، ہندستانی ججوں کو انگریز شہریوں کے فوجداری مقدموں کی سنوائی کا اختیار، انگریز ووٹروں کے درمیان اس طرح کا پرچار کہ وہ اسی پارٹی کو ووٹ دیں جو ہندوستانیوں پر توجہ دے اور ان کی بھلائی کا خیال رکھے۔ ان مانگوں پر اگر الگ الگ غور کیا جائے تو بہت ہلکے لگیں گے، پھر بھی برٹش حکومت آسانی سے ان کو ماننے والی نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اگر یہ مطالبے مان لیے گئے تو ہندستانی عوام پر حکومت کا شکنجہ ڈھیلا ہو جائے گا اور سرکاری مشین کی چولیں ہل جائیں گی۔

1875 سے 1885 تک نوجوان طبقہ میں نیا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ یہ نوجوان کہیں زیادہ بنیاد پسند، قوم پرور دانشور تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ انھیں دس سالوں میں سیاست میں آئے تھے۔ انھوں نے نئی تنظیمیں بنائیں۔ انھوں نے بخوبی محسوس کیا کہ پرانی تنظیمیں اپنے پروگرام اور سیاسی سرگرمی کے سلسلہ میں بہت تنگ نظر ہیں، مثلاً "برٹش ایسوسی ایشن آف بنگال" دھیرے دھیرے زمیندار نواز بن گئی ہے اور اس طرح انگریزوں کے خلاف اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

''بامبے ایسوسی ایشن'' اور ''مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن'' جماعتیں رجعت پسند بن کر قریب الرگ ہوگئیں ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بنگال کے نوجوان وطن پرستوں نے سریندر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس کی قیادت میں 1876 میں ''انڈین ایسوسی ایشن کی تشکیل کی''۔ مدراس کے نوجوان ایم۔ وی۔ راگھو چیریار (M.V. Raghavachariar) جی سبرامنیا ایَر (G.Subramaniya iayer) پی آنند چارلو (P.Anand Charlu) اور دوسروں نے ''مدراس مہاجن سبھا'' 1884 میں قائم کیا۔ کے۔ ٹی۔ ٹیلنگ (K.T.Telang) اور فیروز شاہ مہتا جیسے جنگجوزی علم لوگوں نے اور دوسرے بزرگ لیڈروں جیسے دادا بھائی فرام جی (Dada Bhai Framji) اور دین شاپٹِٹ (Dinshaw Petit) سے سیاسی اختلاف کی بنیاد پر اپنا ناطہ توڑ لیا اور 1885 میں بامبے پریسیڈنسی ایسوسی ایشن (Bombay Presidency Association) بنائی۔ دوسری دیگر تنظیموں میں صرف پونا سارو جنک سبھا (Puna Sarvajanik Sabha) پہلے کی طرح کام کرتی رہی۔ اس وقت تک اس پر مکمل طریقہ سے علم داں قوم پرور طبقہ کا ہی غلبہ تھا۔

انھیں ایام میں ملک میں نئی سیاسی زندگی پیدا ہونے لگی۔ خاص خاص قوم پرست اخبارات 'ہندو'، 'ٹریبون'، 'بنگالی'، 'مراٹھا' اور 'کیسری' جو ہندوستان کے سیاسی افق پر چھائے تھے۔ نیا پیغام دینے لگے۔ صرف امرت بازار پتر کا اس سے مستثنیٰ تھی۔ اس کی اشاعت تو پہلے ہی سے ہو رہی تھی اور 1878 میں یہ انگریزی زبان کا اخبار بن گیا۔ 1885 کے آتے آتے لوگ ایک آل انڈیا سیاسی جماعت کی تشکیل کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ لوگوں کی زندگی کا یہ ضروری مقصد بن گیا۔ 1877 کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے جو بھی کوششیں کی گئیں ان کے بارے میں حال کے بہت سارے مؤرخین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ 1883 کے بعد ان کوششوں میں مزید تیزی آئی۔ اور سیاسی سرگرمیوں نے زور پکڑا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والا ''انڈین مرر'' نے تو اس مسئلہ کو لیکر جہاد سا چھیڑ دیا۔ دسمبر 1883 میں انڈین ایسوسی ایشن نے ایک آل انڈیا کانفرنس کا انعقاد کیا (یہی وجہ تھی کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس سے جڑے سریندر ناتھ بنرجی 1885 میں نیشنل انڈین کانگریس کے قیام کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے)۔

گذشتہ دس سالوں کے دوران، بہت ساری تحریکوں کے چلانے کی وجہ سے

ہندوستانیوں نے خاصہ تجربہ حاصل کرلیا تھااوران میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ 1875 کے بعد سے سوتی کپڑا برآمدگی فیس کو لے کرلگاتار مہم چلتی رہی۔ یہ مہم ہندوستان میں سوتی کپڑا صنعت کے حق میں برآمدگی فیس کو برقرار رکھنے کے لیے چلائی جارہی تھی، 78-1877 میں سرکاری نوکریوں میں ہندوستانیوں کی بھرتی کے لیے زبردست تحریک چلائی گئی۔ ہندوستانیوں نے لارڈ لٹن(Lord Lytton) کے افغانستان مہم کی سخت مخالفت کی اور حکومت کومجبور کیا کہ وہ دوسرے افغان جنگ میں ہوئے نقصان کی بھرپائی کرے۔ حکومت نے جب ورنا کیولر ایکٹ (Vernacular Act) کے ذریعہ پریس پرشکنجہ کسنا چاہاتو انھوں نے اس کے خلاف جنگ چھیڑدی۔اسی طرح آرمس ایکٹ (Arms Act) کے تحت اسلحہ رکھنے پر جب پابندی لگائی گئی تب لوگوں نے سخت مخالفت کی۔ 82-1881 میں پلانٹیشن لیبراوران لینڈ امگریشن ایکٹ کے خلاف منظم احتجاج کیا کیونکہ انکے تحت باغان مزدوروں کوایک طرح غلام سا بنا دیا گیا تھا۔ 1883 میں لبرٹ بل(Libert Bill) کی حمایت میں زبردست مہم چلائی گئی۔اس قانون کے مطابق ہندوستانی جج یوروپی شہریوں کے خلاف فوجداری مقدروں کی سنوائی کر سکتے تھے۔ یورپی شہریوں نے اس قانون کوتو پاس نہیں ہونے دیا مگراس سے ہندوستانیوں نے ایک مفید سبق سیکھا کہ ان کی کوششیں آل انڈیا سطح پرمنظم نہ ہوسکی تھیں، اس لیے ناکام رہیں۔اس کے برخلاف یورپی شہریوں نے متحد ہو کر اس کی مخالفت کی تھی۔ اس لیے وہ کامیاب رہے۔ اس کے بعد 1883 میں ہندوستان اورانگلینڈ میں سیاسی تحریک چلانے کے لیے ملکی سطح پر چندہ وصولنے کا کام شروع ہوا۔ 1885 میں رضا کاردستوں میں شمولیت کے لیے جہادشروع کیا گیااورانگریز ووٹ دہندوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اسی نمائندہ کوووٹ دیں جو ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں۔کئی ایک ہندستانی لیڈروں کوانگلینڈ بھیجا گیا جہاں انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ ہم وطنوں کے حقوق کی وکالت کی۔

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ گذشتہ سالوں میں چلائی جارہی سیاسی کام کی تکمیل کانگریس کے قیام کی شکل میں ہوگئی۔ 1885 تک ملکی سیاست ترقی کر کےایسی منزل پرپہنچ گئی کہ کچھ بنیادی کام اور مقاصد کومدنظر رکھ کران کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا ضروری ہوگیا

تھا۔ بس اس کے لیے ضروری تھا کہ سبھی سیاسی کارکن متحد ہو کر آل انڈیا جماعت کے تحت متحرک ہوں۔ جو لوگ ممبئی میں 28 / جون 1885 کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے ان کو بھی جوش دلایا گیا تھا کہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرمی سے کام کریں۔ کانگریس کی کامیابی یا ناکامی اور اس کے مستقبل کا انحصار اس بات پر مطلق نہیں ہے کہ اس کو کن لوگوں نے قائم کیا تھا بلکہ اس بات پر ہے کہ شروعاتی دور میں یہ اپنے عزم میں کہاں تک کامیاب رہی۔

ہندوستان اب قوم بننے کے مرحلہ میں داخل ہو گیا تھا۔ اور انڈین نیشنل تحریک کے بانیوں کا مقصد ہی اس عمل کو تیز کرنا، ہندوستانیوں کو متحد کر کے ایک قوم بنانا اور اسی حیثیت سے اس کی شناخت قائم کرنا تھا۔ اس کے برعکس انگریز حکمراں اور اس کے پیروز ور شور سے کہا کرتے تھے کہ ہندوستان متحد نہیں ہو سکتا یا آزاد نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ قوم نہیں ہے، بلکہ محض ایک جغرافیائی نام ہے۔ یہ سینکڑوں مذہب وملت اور نسلوں کا مجموعہ ہے۔ ہندوستانیوں نے اس مفروضہ کی رد بالکل نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ ہندوستان قوم بننے کی سمت میں گامزن ہے۔ تلک، سریندر ناتھ بنرجی اور بہت سارے دوسرے حضرات کہا کرتے تھے کہ ہندستان قوم بننے کے مرحلہ میں سرگرم ہے۔ کانگریسی لیڈروں نے سمجھ لیا تھا کہ ملک کے سماجی، سیاسی اور مالی حالات لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگوں کو ان حالات سے باخبر کرنا اور ان میں سیاسی فہم پیدا کرنا ضروری ہے۔ اسی سے ان کے دل میں قومی اتحاد کے جذبات ابھارے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات کہ ہندوستان قوم بننے کے مرحلہ میں ہے یہی مان لینا کافی نہیں تھا۔ اس عمل کو آگے بڑھانا، پختگی اور مضبوطی دینا ضروری تھا۔ کانگریس کا خاص مقصد ہی قومی اتحاد کو فروغ دینا تھا اور بعد میں اس کا حصول ہی اس کی بڑی کامیابی تھی، مثال کے طور سے پی آنند چارلو (P.Anand Charlu) نے 1891 میں کانگریس کے اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں یہ بات کہی تھی کہ ''کانگریس زبردست قوم ساز ہے۔'' انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہی کانگریس کا سب سے شاندار کام ہے[1] کانگریس کے پہلے صدر ڈبلو۔ سی بنرجی (W.C.Bannerji) کے ذریعہ مرتب کانگریس کے بنیادی مقاصد میں ایک یہ تھا کہ قومی اتحاد کے جذبات کو پوری طرح مضبوط اور مکمل کیا جائے[2] روسی سیاح آئی۔ پی۔ منایف (I.P.

(Minayeff) نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ بنرجی کے ساتھ سفر کرتے وقت میں نے دریافت کیا کہ کانگریس لیڈران کانگریس پارٹی سے عملاً کس نتیجہ کی امید کرتے ہیں۔ بنرجی نے جواب دیا کہ ''وہ ہندوستانیوں کے درمیان قومی احساسات اور اتحاد کے پنپنے کی امید کرتے ہیں''[3] اسی طرح کانگریس کے پہلے اجلاس پر رائے زنی کرتے ہوئے بمبئی کے اندو پرکاش نے لکھا تھا کہ یہیں سے نئی زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کے دلوں میں قومی جذبات پیدا کرنے میں اس طرح مددگار ہوگی کہ دور دراز کے لوگ مشترک ہمدردی اور مقاصد کے تحت آپس میں متحد ہو جائیں گے[4]

ہندوستان کا قوم میں بدلنا ایک طویل تاریخی سفر تھا۔ اس کے علاوہ کانگریس کے لیڈروں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں کچھ ایسی تمدنی رنگارنگی ہے کہ کوئی خاص تدبیر قومی اتحاد قائم کرنے کے لیے کی جانی چاہیے جو دنیا کے دوسرے حصوں میں نامعلوم ہے۔ ملک کے سبھی علاقوں میں پہنچنے کے لیے یہ بھی طے پایا کہ کانگریس کا اجلاس باری باری سے سبھی علاقوں میں منعقد ہو۔ اور صدارت کی ذمہ داری وہاں کے کسی شخص کو نہ دے کر دوسرے علاقہ کے آدمی کو دی جائے۔

سبھی مذاہب کے لوگوں تک پہنچنے کے لیے اور اقلیتوں کے دل سے خوف دور کرنے کے لیے 1888 کے اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ اگر کسی قرارداد پر ہندو یا مسلم نمائندوں کے بڑے حصے کو اعتراض ہو تو وہ پاس نہ ہو[5] 1899 میں اقلیتوں سے متعلق ایک قرارداد میں یہ دفعہ بھی شامل کی گئی کہ جہاں پارسی، عیسائی، مسلمان یا ہندو اقلیت میں ہوں وہاں کونسل میں ان کے منتخب نمائندوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے کم نہیں ہونی چاہیے[6] قرارداد پیش کرنے والے نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہندوستان اک رنگا ملک نہیں ہے اس لیے سیاسی طور طریقے یہاں یورپ جیسے نہیں ہیں۔

شروعاتی دور کے قوم لیڈروں کا پکا ارادہ ہندوستان کو سیکولر قوم بنانا تھا اور کانگریس بذاتِ خود مکمل طور سے سیکولر تھی۔

کانگریس کا دوسرا بڑا مقصد ایک ایسا سیاسی اسٹیج یا پروگرام تیار کرنا تھا، جس کے تحت

پورے ملک میں کام کر رہے سیاسی کارکنان آل انڈیا سطح پر جمع ہو کر لوگوں کو تعلیم کے ذریعہ متحرک کر کے سیاسی سرگرمی جاری رکھ سکیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ لوگوں کی عام شکایتیں دور کی جائیں اور ان کے حصول کی لڑائی حکومت سے لڑی جائے۔

اسی وجہ سے کانگریس نے سماجی اصلاح کا کام ہاتھ میں نہیں لیا۔ اس کے دوسرے اجلاس میں دادا بھائی نوروجی نے ایک اصول مرتب کیا اور کہا کہ ''نیشنل کانگریس خود کو صرف ان سوالات تک محدود رکھتی ہے کہ جن میں پوری قوم کا بلا واسطہ اشتراک ہے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ''ہم ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے یہاں جمع ہوئے ہیں جس سے اپنے سیاسی ارادوں سے حکومت کو مطلع کر سکیں''۔ 7

نئی سیاست کی خصوصیات یعنی لوگوں کی مجموعی شرکت اور اجتماعی تحریک جیسی چیزیں ہندوستان کے لیے نئی تھیں اس لیے یہ نظریہ کہ سیاست پر کچھ لوگوں کی اجارہ داری نہیں، بلکہ سب کی دلچسپی کی چیز ہے، ایسی بات عوام کے خیال میں بھی نہیں تھی۔ اور جب تک لوگ اس حقیقت کو نہ سمجھ لیں، کسی بھی طرح کی سیاسی تحریک چلانا ناممکن تھا۔ اسی شعور کی بنیاد پر ہی ایک اور باخبر سیاسی عقیدہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کانگریس کا اہم کام لوگوں کو بیدار کرنا، ٹریننگ دینا، منظم کرنا اور ان میں عام رائے قائم کرنا تھا۔ وطن پرستوں کی شروعاتی سرگرمی اسی مقصد کے ہی حصول کے لیے تھی۔

سیاسی بیداری اور سمجھ پیدا کرنے اور رائے عامہ ہموار کرنے کا کام سب سے پہلے تعلیم یافتہ طبقہ میں شروع کیا گیا۔ بروقت کانگریس کی خواہش لوگوں کی دشواریوں کو دور کرنے کے بجائے اینٹی کورن لا لیگ (Anti Corn Law League) کے نہج پر لگاتار سیاسی سرگرمی چلانا تھا۔ (1838 میں انگلینڈ میں کوبڈین اور برائٹ (Cobden and Bright) کے ذریعہ بنائی گئی انجمن جو غلہ قانون کی اصلاح کی ضامن تھی) قومی لیڈروں کے ساتھ عوام میں بھی خود اعتمادی پیدا کرنا ضروری تھا۔ جس سے وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا استعمال کر کے دنیا کی سب سے بڑی طاقتور حکومت کے خلاف سیاسی مورچہ بندی کرنے کی جگت کر سکیں۔

مگر یہ سب آسان نہیں تھا۔ ایسی بیداری کے لیے ایک طویل مدت درکار تھی۔ بعد

کے بہت سے مورخین اور ناقدین نے شروعاتی دور کے قومی لیڈروں کے سیاسی جد وجہد کے طریقوں، ان کی درخواستوں، عرضداشتوں اور گذارشات پر ہی اپنی توجہ مرکوز کی۔ یہ سچ ہے کہ ان کی یہ کاوش عوام کو مجموعی طور سے متحرک نہ کر سکی، مگر انھوں نے اپنی تحقیق میں ان قائدین کی سرگرمی کے سب سے نمایاں پہلو کو ہی نظر انداز کر دیا۔ جسٹس راناڈے (Ranade) جو سیاسی سنت کی حیثیت سے مشہور تھے، نے 1891 میں ہی اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا۔ چھبیس سال کے بے قرار و بے چین گوکھلے نے، حکومت کے اس جواب کو پڑھ کر جب اپنی مایوسی کا اظہار کیا جو پونا سارو جنک سبھا کے ذریعہ محنت اور توجہ سے مرتب کی گئی عرضداشت پر دیا تھا، تب راناڈے نے ان کو مطمئن کر کے کہا تھا کہ ''تم ملک کی تاریخ میں اپنی اوقات نہیں سمجھتے ہو، یہ عرضداشتیں تو حکومت کو یوں ہی دی گئی ہیں، ان کے مخاطب تو حقیقت میں ملک کے لوگ ہیں تاکہ وہ ان معاملات پر غور کر سکیں۔ یہ کام تو نتیجہ کی امید کیے بغیر سالوں چلنا چاہیے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ سیاست ملک میں بالکل نئی تجربہ ہے'' 8

قومی تحریک چلانے کے لیے پہلی ضرورت ملکی سطح کی ایک طاقتور قیادت تھی۔ اٹلی کے مارکس پرست اینٹونیو گریمشی (Antonio Gramsci) اسے تحریک کا مرکز کہتا ہے۔ یہ بات سچ ہے۔ کوئی بھی قوم اور ملک مؤثر سیاسی سرگرمی نہیں چلا سکتا ہے اگر وہ منظم نہیں ہے۔ لوگ قوم یا ''تاریخی رعیت'' نہیں بن سکتے اگر ان میں ڈسپلن نہیں ہے۔ قومی تحریک کا پہلا زینہ ہی تب شروع ہوتا ہے جب اس کے چلانے والے لوگوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اس کی کامیابی کا انحصار بھی قائدین کے آپسی اتحاد پر ہوتا ہے جب انکی مجموعی شناخت ہو، ایک نظریہ، ایک مقصد اور ایک ہی طرح کے احساسات ہوں۔ مارچ 1885 میں کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لیے جو پرچہ سیاسی کارکنوں میں جاری کیا گیا تھا، اس میں لکھا تھا کہ '' کانگریس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ قومی ترقی میں لگے سارے مستعد کارکنان ایک دوسرے کو ذاتی طریقہ سے اچھی طرح سمجھ لیں'' 9 کانگریس کے پہلے صدر ڈبلو۔سی۔ بنرجی نے اس بات کو پھر دہرایا کہ '' کانگریس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ عاشقان وطن کے دلوں سے مذہبی، نسلی، اور علاقائی نفرت پوری طرح نکل جائے اور ملک کی بھلائی کے لیے سلطنت برطانیہ کے چپہ چپہ میں بسنے والے کارکنان

میں قربت و دوستی اور زیادہ مضبوط ہو''۔

دوسرے لفظوں میں بانیان کانگریس سمجھ گئے تھے کہ قومی تحریک کی پہلی ضرورت اس کی امارت ہے۔ اس وقت خاص مسئلہ ان کے سامنے قومی تحریک کا جنم تھا۔ سماج کے نظریاتی شکل کو متاثر کرنے کا سوال بعد میں اٹھتا تھا۔ سماج کا یہ روپ تو بہت ساری باتوں پر منحصر تھا جیسے سماج کے مختلف طبقات کا کردار اور ان کے نظریاتی کشمکش سے پیدا شدہ نتائج اور ان کے اثرات وغیرہ۔

شروعات کے لیڈروں کا مقصد ہی سیاسی جمہوریت کو قومی اور بین الاقوامی شکل دینا تھا ان کی سیاست عوام کی فرمارواِئی (Sovereignty of People) کے اصول پر منحصر تھی۔ اس سلسلہ میں دادا بھائی نوروجی نے اس طرح لکھا تھا کہ ''نیا سبق یہ ہے کہ راجے مہاراجے لوگوں کے لیے ہیں، لوگ ان کے لیے نہیں ہیں''۔

شروع میں کانگریس کی تشکیل پارلیمنٹ کی طرح ہوئی تھی۔ دراصل لفظ'' کانگریس '' شمالی امریکہ کی تاریخ سے ماخوذ ہے اس کا مطلب ہے لوگوں کی جماعت۔ کانگریس کی اجلاسی کاروائی جمہوری طرز پر چلتی تھی۔ ایک ایک مسئلہ پر فیصلہ سے پہلے خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر ووٹ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کانگریس ہی تھی نہ کہ نوکر شاہی اور انگریزی حکومت، جیسا کچھ مؤرخین نے سمجھنے میں غلطی کی ہے، جس نے پارلیمانی جمہوریت کو دیسی شکل دے کر مقبول عام کیا۔

ٹھیک اسی طرح شروعات کے قومی لیڈروں نے شہری آزادی (Civil Liberty) کے وجود کو قائم رکھنا اور اسکو فروغ دینا قومی تحریک کا لاینفک جز بنا دیا تھا۔ انھوں نے تحریر و تقریر کی آزادی میں دست اندازی اور تخفیف کے خلاف جنگ کی۔ انھوں نے عدالتی اور انتظامی (Judicial & Executive) اختیارات کی علاحدگی کے لیے جہاد چھیڑا اور نسلی امتیاز کے خلاف جم کر لڑائی لڑی۔

برٹش حکومت کے خلاف جد وجہد کے لیے ضروری تھا کہ حکومت کو ٹھیک سے سمجھا جائے، اور اسی سمجھ کی بنیاد پر قومی نظریہ کی نشو ونما کی جائے۔ اس سلسلہ میں شروعات کے قومی لیڈران بیک وقت استاذ اور شاگرد دونوں تھے۔ 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں انگریزی

حکومت کے خلاف کوئی نظریہ پہلے سے موجود نہیں تھا۔ اپنے تجربہ اور موجودہ حالات کے مطالعہ سے حاصل نتائج کی بنیاد پر ہی لیڈروں کو برٹش مخالف نظریہ کو پروان چڑھانا تھا۔

ظاہر ہے کہ بغیر کسی نظریاتی اصول کے کوئی بھی قومی تحریک نہیں چلائی جاسکتی تھی۔ یہ بات ان لیڈروں کو صاف طور سے بتاتی تھی کہ ملک کے لوگ ایک قوم ہیں اور برٹش حکومت ہماری دشمن ہے۔ اور اسی دشمنی کے خلاف ہماری یہ جنگ ہے۔ ان کو کئی سوالات کے جوابات بھی بروقت دینے تھے، مثلاً کیا انگلینڈ ہندوستان کی ہمدردی میں حکومت کر رہا ہے؟ کیا حاکم اور محکوم کی دلچسپیوں میں فرق ہے؟ کیا یہ تضاد ہندستانی عوام اور نوکرشاہی میں ہے یا حکومت اور عوام کے درمیان یا پھر عوام اور طرز حکومت کے درمیان ہے؟ کیا ہندستانی عوام کی یہ جنگ عظیم برطانوی سلطنت کے مقابلہ چل سکے گی اور پھر یہ جنگ لڑی کیسے جائے گی؟

ان اور ان جیسے دوسرے سوالات کے جوابات کو تلاش کرنے میں کئی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں، مثلاً اس دور کے قومی لیڈران کم سے کم بیسویں صدی کے شروع تک برٹش حکومت کے کردار کو سمجھنے میں ہی ناکام رہے۔ مگر اس وقت ایسی غلطیوں کو کسی طرح ٹالا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت حالات سے نمٹنے کے لیے ایسے کوئی تیار شدہ گڑھے گڑھائے مناسب اصول لوگوں کو دستیاب نہیں تھے۔ ہاں، کچھ تھے مگر وہ بھی گھسے پٹے، بے جان اور غیر موثر۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسوقت کے قومی لیڈروں نے برٹش حکومت کے خلاف سیدھے کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی۔ اس کے برعکس انھوں نے حکومت کے خلاف صرف نظریاتی تحریک پر اکتفا کیا۔ یہاں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ قومی یا سلطنت مخالف کوئی جدوجہد، حکومت مخالف بننے کے پہلے، حکومت کے بارے میں مخالفت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے بانیان کانگریس نے حکومت کے بارے میں یہ جہاد واقعی بڑی عقلمندی سے چھیڑا۔

شروع ہی سے کانگریس نے خود کو ایک پارٹی کی شکل میں نہیں بلکہ ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا۔ صرف ان بنیادوں اور وسیع مقاصد پر ایک رائے ہونے کے علاوہ، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، کانگریس میں شامل ہونے کے لیے کسی اور خاص طرح کے سیاسی اور اصولی قول وقرار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں شامل ہونے کے لیے کسی خاص سماجی طبقہ اور گروپ کی پابندی بھی

نہیں تھی۔تحریک کی حیثیت سے اس نے جمہوریت اور سیکولر قومیت کے تئیں پابند بھی مختلف سیاسی نظریات، رجحانات اور طبقات کے لوگوں کو اپنے اندر شمولیت دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ کانگریس نے اپنے آغاز سے ہی قائدین کی اعلیٰ صف میں مختلف سیاسی سوچ و معیار اور مختلف اقتصادی نظریات کے لوگ شامل کر رکھے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس دور کے قومی لیڈران کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے اور انھیں سیاسی اعتبار سے تعلیم دی جائے، تحریک کا ایک صدر مقام بنایا جائے، یعنی آل انڈیا امارتی گروپ ہو اور انگریزی حکومت کے خلاف قومی نظریہ کو ترقی دی جائے اور اس کی خوب اشاعت کی جائے۔

تاریخ، بے بنیاد پیمانہ سے نہیں بلکہ اپنے ٹھوس تاریخی معیار سے جانچ پرکھ کر یہ فیصلہ کرے گی کہ شروعات کی قومی تحریک اپنے اصل مقاصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب یا ناکام رہی۔اس کے معیار سے اس کی کامیابیاں بہت اہم ہیں۔ 1880 کی دہائی میں معمولی شروعات کر کے بیسویں صدی میں ترقی کر کے یہ حیرت انگیز تحریک بن گئی۔ مؤرخین شاید دو لیڈروں کے ذریعہ، اس کے بارے میں کیے گئے اسسمنٹ سے اتفاق کریں گے۔ 1885 اور 1905 کے دوران کانگریس نے تحریک کے لیے جو زمین تیار کرنے کا کام کیا تھا، اس کے بارے میں دادا بھائی نوروجی نے ڈی۔ای۔واچا (D.E.Wacha) کو جنوری 1905 میں لکھا تھا کہ ''بیدار ہوتی ہوئی نسل میں کانگریس کے خلاف جو بے اطمینانی اور بے قراری ہے وہ اس کی دھیمی اور غیر ترقی یافتہ رفتار کی پیدا کردہ ہے۔ یہی اس کا سب سے اچھا ماحصل اور ثمرہ ہے۔ یہی اس کی ارتقا، یہی اس کی ترقی ہے........اصل کام یہ ہے کہ انقلاب کی شروعات ہو..........چاہے یہ پرامن طریقے سے ہو یا تشدد سے، انقلاب کا روپ کیسا ہو یہ برٹش حکومت کی دانائی اور نادانی اور انگریزوں کی کارروائی پر منحصر ہے''۔[11]

اسی طرح بیس سالوں کے دوران کانگریس کے ذریعہ کیے گئے کاموں کا اسسمنٹ (Assessment) کرتے ہوئے گوپال کرشن گوکھلے نے 1907 میں لکھا تھا کہ ''ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ملک کی ترقی کی ایسی منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری کامیابیاں چھوٹی

ہی ہوئی ہیں اور ناامیدیاں بہت اور کٹھن ۔ جہاں تک اس جدو جہد کو لے جانے کی ذمہ داری خدا نے ہم پر ڈالی تھی، وہاں تک ہم پہنچ گئے ہیں ۔اب ہماری ذمہ داری ختم ہوتی ہے ۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اب ہندوستان کی نئی نسل کو یہ ذمہ داری دی جاتی ہے کہ وہ اپنی کامیابیوں کے ذریعہ ملک کی خدمت کرے ۔ہمیں یعنی موجودہ پیڑھی کے لوگوں کو تو اس بات سے مطمئن ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی ناکامیوں کے ذریعہ ہی سکت بھر ملک کی خدمت کی ۔ یہ کام چاہے جتنا مشکل اور کٹھن رہا ہو مگر ناکامیابیوں کے اندر سے ایسی قوت ابھرے گی جو آگے چل کر کارہائے نمایاں انجام دے گی'' 12

اب ایک بار پھر ہم ہیوم کی طرف واپس ہوتے ہیں، آخر کیا تھا ہیوم کا رول؟ اگر کانگریس کے بانیان میں اتنی صلاحیت، قابلیت اور وطن پرستی تھی تو ہیوم کو کانگریس کا خاص ناظم بنانے میں ان کوکون سی ضرورت پڑی تھی ۔ بلاشبہ، بااصول اور مثالی شخص کی حیثیت سے ہیوم نے اپنے ہم عصر سبھی وسیع النظر اور جمہوریت حامی اشخاص جن میں لالہ راجپت رائے شامل تھے، کو اس طرح متاثر کیا تھا کہ ان کو تعاون دینے میں، ان لوگوں کو کسی طرح کی بدنامی کا خدشہ نہیں تھا۔ مگر اس کا صحیح جواب اس وقت کے حالات میں پوشیدہ ہے ۔ ہندوستان کے طول وعرض کے تناسب سے 1880 کی دہائی میں سیاسی سوچ رکھنے والے حضرات بہت کم تھے ۔ اور برٹش حکمرانوں کی کھلی مخالفت کی جڑیں اس وقت تک مظبوطی سے جم نہیں سکی تھیں ۔

دادا بھائی نوروجی، جسٹس راناڈے، فیروز شاہ مہتا اور سبرامنیا ایر (Subramaniya Ayer) اور ایک سال بعد شامل سریندر ناتھ بنرجی جیسے باہمت اور قول وقرار کے پابند لوگوں نے ہیوم سے اس لیے مدد لیا کہ وہ اپنے کام کے آغاز میں ہی حکومت سے دشمنی نہیں لینا چاہتے تھے ۔ان کا خیال تھا کہ اگر کانگریس جیسی حکومت مخالف جماعت کا سربراہ کوئی رٹائرڈ انگریز سول افسر ہو تو اس کے تئیں حکومت کا شک وشبہ کم ہوگا اور اسطرح اس پر سرکاری حملہ کی گنجائش بھی کم ہوگی ۔ گوکھلے نے 1913 میں اپنی نمایاں انکساری اور سیاسی سوجھ بوجھ سے اس بات کو واضح کیا تھا کہ کوئی بھی ہندستانی انڈین نیشنل کانگریس کو قائم نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی ہندستانی پورے ملک میں ایسی کوئی تحریک چلانے کے لیے آگے بڑھتا تو ملک کے حکمراں اس کو جود میں نہ آنے دیتے ۔اگر کانگریس کا

بانی کوئی مشہور اور بڑا ریٹائرڈ انگریز افسر نہ ہوتا تو ان دنوں سیاسی تحریک کے بارے میں ایسی بدگمانیاں پیدا ہوتیں کہ حکومت کو اس کے کچلنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا''۔

دوسرے لفظوں میں اگر ہیوم اور دوسرے وسیع النظر انگریزوں نے کانگریس کا استعمال سیفٹی وال (Safety Valve) کے طور پر کرنا چاہا ہو، تو کانگریسی لیڈروں نے ان کا ساتھ اس امید پر دیا کہ ہیوم کانگریس کے لیے برق کش آلہ کے طور پر کام آئیں گے۔ حکومت کے ذریعہ کانگریس پر گرنے والی ظلم کی بجلی سے وہ اسے بچالیں گے۔ بعد کے حالات نے یہ بات ثابت بھی کردیا کہ کانگریسی لیڈروں کی مرادیں اس طرح بر آئیں۔

چھٹا باب

معاشرتی و مذہبی اصلاح اور قومی بیداری

راجہ رام موہن رائے نے 1880 میں لکھا تھا کہ مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مذہب کے جدید ڈھانچہ نے ہندوؤں کو اپنی گرفت میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ سیاسی میدان میں ان کی بھلائی کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ ذات پات کے امتیاز نے ان کو فرقوں در فرقوں کے سینکڑوں خانوں میں اس طرح تقسیم کر رکھا ہے کہ ان کے اندر دیش پریم کے جذبات پوری طرح ختم ہی ہو گئے ہیں۔ سینکڑوں قسم کے مذہبی رسومات و رواج اور تزکیہ نفس کے اصولوں نے ان کو ایسا گھیر رکھا ہے کہ کسی بھی کار عظیم کے کرنے کی سکت ان میں رہ ہی نہیں گئی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہندو دھرم میں کچھ تبدیلیاں لائی جائیں، جس سے ان کو سیاسی فائدہ اور معاشرتی راحت مل سکے"[1]

راجہ رام موہن رائے نے جس وقت یہ باتیں لکھی تھیں، اس وقت لوگ اپنے ذہنوں میں بپا اضطراب اور تمدن میں ہو رہی ہلچل کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ انیسویں صدی کی معاشرتی زندگی میں زبردست انقلابی لہر اٹھ رہی تھی۔ دراصل ملک میں برٹش سلطنت کے پھیلاؤ

سے مغربی تہذیب وتمدن اور نظریہ کی اشاعت ہوئی جس کے ردعمل میں یہ لہر اٹھنی شروع ہوئی تھی۔ بدیسی تہذیب کے بڑھ رہے اثرات سے ہندوستانیوں کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ اپنے باطن کا جائزہ لیں اور دستور ورواج کی قوت وکمزوری، اچھائی و برائی کو اچھی طرح سمجھیں۔ در اصل مغربی تہذیب کے خلاف یہ ردعمل ہر جگہ اور ہر ایک سوسائٹی میں الگ الگ ہوا مگر ایک ہی بات ہر جگہ محسوس کی گئی کہ ہندوستان کے معاشرتی اور مذہبی زندگی میں اصلاح بے حد ضروری ہے۔ اصلاح کے اس ردعمل کو عام طور سے نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے، حالانکہ اس کو یہ نام دینا پوری طرح مناسب نہیں ہے۔ بہرحال اس کی شروعات تو ہو ہی گئی تھی۔ اس وقت درمیانی طبقہ میں ذی علم حضرات، آزاد پسند لوگ اور مغرب سے تعلیم پائے سمجھدار لوگ اس عمل کے روح رواں تھے۔ اس طرح انیسویں صدی کے ہندستانی سماج میں، تہذیب وتمدن کی جونئی روشنی پھیلی اس کی بنا سیدھے برٹش حکومت تو نہیں تھی، مگر اس کے وجود سے اس کو مدد ضرور ملی تھی۔

راجہ رام موہن رائے نے 1828 میں بنگال میں برہم سماج قائم کرکے اصلاحی کام شروع کیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی لہر پورے ہندوستان میں دوڑ گئی۔ پورا ملک اس کے آغوش میں آگیا۔ برہم سماج نے ملک کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسری تحریکیں اور تنظیمیں اس میدان میں سامنے آئیں۔ ان میں ہندوؤں کی مہاراشٹر پرارتھنا سبھا اور پرم ہنس منڈلی، اور پنجاب اور شمالی ہندوستان میں آریہ سماج خاص خاص ادارے تھے۔ دوسرے مذہب اور ذاتوں میں بھی اسی طرح کی تحریکیں شروع ہوئیں اور ان کی اپنی تنظیمیں وجود میں آئیں، مثلاً اتر ہندوستان میں کایستھ سبھا اور پنجاب میں سرین سبھا (Serin Sabha) کا جنم ہوا۔ پچھڑے طبقے بھی اس لہر سے متاثر ہوئے۔ مہاراشٹر میں ستیہ سودھک سماج اور کیرالا میں شری نرائن دھرم پریپالن سبھا نے اصلاح کا کام شروع کیا۔ احمدیہ اور علی گڑھ تحریک، سنگھ سبھا رہنمائی مزدیاسن سبھا (Rehnumai Mazdeyasan Sabha) علی الترتیب مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں اُبھری اصلاحی تنظیمیں تھیں۔ حالانکہ یہ ساری تنظیمیں اور تحریکیں اپنے اپنے دھرم سے متعلق تھیں۔ اور خاص علاقہ تک ہی محدود تھیں لیکن ان سب میں خاص یکسانیت یہ تھی کہ یہ سب عام طور سے اپنے علاقے میں مذہبی بیداری کا مظہر تھیں۔

اگر چہ ان تحریکوں کا زیادہ زور مذہبی اصلاحات پر ہی تھا مگر ان میں کسی تحریک کی خاصیت پوری طرح مذہبی نہیں تھی۔ انسانیت نوازی اس کا خاص مقصد تھا۔ آخرت اور نجات جیسی باتیں اس کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھیں، بلکہ ان کا سارا زور دنیاوی وجود پر تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے آخرت کے ممکن وجود کو تسلیم کیا تھا، وہ صرف اس لیے کہ ان کی تحریک کے پرچار کے لیے یہ مددگار تھی۔ اکشئے کمار دت اور ایشور چندر ودیا ساگر لاادریا (Agnostics) تھے۔ انھوں نے اس طرح کے سوالات پر چرچا کرنے سے منع کر دیا۔ خدا ہے یا نہیں، یہ پوچھے جانے پر، ودیا ساگر کا جوابی فقرہ تھا ''خدا کے بارے میں سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے، جبکہ اس دھرتی پر ہی بہت کچھ کیا جانا ہے''۔ بنکم چندر چٹرجی اور وویکا نند نے دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے مذہب کے استعمال پر زور دیا اور کہا کہ مذہب کو انسان کے دنیاوی مسائل کا حل پیش کرنا چاہیے۔

مذہبی عقائد اور سماجی دستور کے اندرونی ملاپ کی بنا پر معاشرتی اصلاح کے لیے مذہبی اصلاح ضروری شرط ہوتی ہے۔ اس وقت ہندو زندگی کے ہر گوشہ میں مذہب کا دخل تھا۔ اس کا کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، وغیرہ سارے کام مذہب کے پاک اصولوں کے تحت ہوتے تھے۔ ان سے ذرہ برابر انحراف گناہ اور بے دینی کا باعث تھا۔[2] ٹھیک یہی حالت مسلمانوں کی تھی۔ ان کی زندگی میں بھی مذہب کا پورا دخل تھا۔ مذہب اس وقت کے معاشرہ میں اس قدر حاوی تھا کہ اس کو سمجھے بغیر کسی طرح کی معاشرتی اصلاح ممکن نہیں تھی۔

انیسویں صدی کا ہندستانی سماج پوری طرح مذہبی اوہام پرستی اور جہالت کی خباثت میں پھنسا ہوا تھا۔ میکس ویبر (Max Weber) نے لکھا ہے کہ ہندو دھرم جادو ٹونا، بھوت پریت اور وہم پرستی کا مجموعہ تھا۔ خدا کی بندگی کی جگہ جانوروں کی قربانی اور جسمانی اذیت پہنچانا جیسے بیہودہ کام عبادت بن گئے تھے۔ عام لوگ پجاریوں اور دھرم گروؤں کے زیر اثر تھے۔ انھوں نے ان کے ذہنوں کو بری طرح جکڑ کر رکھا تھا۔ بت پرستی اور کثرت الٰہ کے عقیدے ان کے اقتدار کو مضبوط بنانے میں اور بھی مددگار تھے۔ راجہ رام موہن رائے کے مطابق ان کی مذہبی اجارہ داری اور رسم و رواج کی من مانی تشریح نے مذہب کو دھوکہ دھڑی کا گورکھ دھندہ بنا رکھا تھا۔ مذہبی لوگ خدا کو بغیر دیکھے اس کی اطاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ پجاریوں کی مرضی، خواہش و وہم کے

بھی تابع تھے۔کوئی ایسا کام نہیں تھا جو مذہب کے نام پر لوگوں سے نہ کرایا جا تا رہا ہو۔حالت یہ تھی کہ پجاریوں کی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے عورتیں خود کو خوشی سے پیش کرتی تھیں۔اس وقت معاشرتی زندگی کی حالت بھی بہت افسوسناک تھی۔عورتوں کی حالت تو بے انتہا ناگفتہ بہ تھی۔ لڑکی کی پیدائش عذاب، شادی باراور بیوگی لعنت تھی۔پیدا ہوتے ہی لڑکی کو مار ڈالنا معمولی بات تھی۔جو لڑکیاں اس طرح کی درندگی سے بچ جاتیں تھیں ان کو کم سنی میں ہی شادی کی اذیت کا شکار ہونا پڑتا تھا۔سماج میں بدنامی سے بچنے کے لیے اکثر یہ شادیاں ہوتی تھیں۔یہی آگے چل کر ناخوشگوار زندگی کا باعث بنتی تھیں۔بنگال کے ایک اسی سال کے برہمن کے یہاں بیک وقت دوسو بیویاں تھیں۔ان میں سے سب سے کم عمر بیوی صرف آٹھ سال کی تھی۔بہت ساری عورتوں کی شادی شدہ زندگی نام کی ہوتی تھی، کیونکہ شادی کے بعد مشکل سے انھیں اپنے شوہروں کو دیکھنا میسر آتا تھا۔اس کے باوجود شوہروں کی موت پر ان سے ستی ہونے کی توقع کی جاتی تھی۔راجہ رام موہن رائے نے اس کی سخت مخالفت کی۔انھوں نے کہا کہ ''شاستروں کے مطابق عمل ستی قتل ہے'' بہرحال اگر وہ کسی طرح ایسے جبر وظلم سے بچ جاتی تھیں تو زندگی بھر ان کو ذلالت، بے توجہی اور بیوگی کا عذاب جھیلنا پڑتا تھا۔

ذات پات سماج کی دوسری بڑی خرابی تھی پورا سماج مذہبی ریت کے تحت اونچے نیچے درجوں میں الگ الگ منقسم تھا۔ذات پات کے سخت اصولوں کی وجہ سے سماج میں جمود طاری تھا بکھراؤ تھا اور ذاتی صلاحیت مردہ ہوگئی تھی۔سب سے زیادہ بدنصیبی تو یہ تھی کہ چھوا چھوت نے انسانی عظمت کو تار تار کر رکھا تھا۔

اس کے علاوہ اوہام پرستی، رتبہ واقتدار کا امتیاز، مذہبی تعصب اور عقیدۂ قضاوقدر کی سماج میں جکڑ بندیاں تھیں۔اصلاحی تحریکوں نے ان باتوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ سماج کے زوال کی علامتیں ہیں۔ان تحریکوں نے جدیدیت کے عمل کو شروع کرنے کے لیے پہلے معاشرتی ماحول تیار کرنے کا کام ہاتھ میں لیا۔انھوں نے ماضی کا شاندار نقشہ پیش کیا جس میں اُس طرح کی برائیاں سماج میں نہیں تھیں، اور یہ کہ انیسویں صدی کی حالت دراصل اسی شاندار ماضی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔اس لیے مصلحین نے ماضی کا ذکر تو کیا مگر وہ مستقبل کے سماج کی تشکیل

ماضی کے معیار پر کرنے کی بات نہیں سوچ رہے تھے۔ وہ ماضی کے پرکشش حالت کا ذکر اصلاح کے آلہ کار کے طور پر کر رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ عقائد اور رسم و رواج کی بنیاد پر قائم سماج کو اس وقت چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک ان عقائد کو ہی کٹگھرے میں نہ کھڑا کر دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ راجہ رام موہن رائے نے وضاحت کی کہ عمل ستی کو مذہبی منظوری کبھی بھی حاصل نہیں تھی۔ ودیا ساگر نے بیوہ کی شادی کو دھارمک اصولوں کے تحت جائز ٹھہرایا اور دیانند نے ویدوں کی بنیاد پر ذات پات کو خلاف شرع بتایا۔

اس کا مطلب نہ تو ماضی کی غلامی تھی اور نہ ہی اس کے کریہہ رسم و رواج میں مزید جان ڈالنا تھا۔ مہاراشٹر کے ایک بزرگ مصلح مہادیو گووند رائے نے پرزور طریقہ سے کہا کہ ''ماضی ہمیشہ کے لیے دفن ہو کر خاک میں مل گیا۔ اب اس کو کسی طرح زندہ نہیں کیا جا سکتا سوائے اس کے کہ پرانے وسائل سے نئے سماج کی تعمیر ہو'' 4 اس وقت لوگوں کے گوشۂ خیال میں یہ بات مطلق نہیں تھی کہ ماضی کے رسم و رواج سے مکمل قطع تعلق کیا جائے یا ان کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔

اصلاحی تحریک کے سمجھنے کے دو اہم معیار تھے —— استدلال اور مذہب کی ہمہ گیری۔ استدلال پسند ایک ناقد نے سماج سے ان کی مناسبت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ راجہ رام موہن رائے یا اکشے کمار دت نے جس طرح دلائل کی بنیاد پر فرسودہ قدروں کی کاٹ پیش کی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کسی حادثہ کا تعلق ظاہری دنیا سے نہ جوڑ کر اس کے وقوع کی وجہ کسی مافوق الفطرت قوت کی طرف منسوب کرنا راجہ رام موہن کے نزدیک سراسر غلط ہے۔ ان کے مطابق سچ کی واحد کسوٹی یہ ہے کہ وہ دکھائی دے۔ اکشے کمار نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا کہ ''عقلیت ہمارا واحد معلم ہے'' ان کا خیال تھا کہ سارے قدرتی اور معاشرتی واقعات کو صرف مشینی عمل کے ذریعہ سمجھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ اس تناظر میں مصالح نے نہ صرف رسم و رواج کو عقل کی کسوٹی سے پرکھا، بلکہ اس وقت کے معاشرتی اور مذہبی قدروں کو افادیت کے زاویے سے دیکھا۔ اس طرح انھوں نے عقیدہ کی جگہ عقل کو قائم مقام بنایا۔ اسی نظریہ کے تحت برہم سماج نے ویدوں کی بے خطائی کی تردید کی اور علی گڑھ تحریک نے اس بات پر زور دیا کہ آج ضرورتوں کے مطابق اسلام کی تعلیمات میں ترمیم کی جانی چاہیے۔ سید احمد خاں نے کہا کہ اسلامی تعلیمات میں لچک ہے۔

انھوں نے زور دیا کہ سماج کی ترقی میں مذہب کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ جو مذہب وقت کی ضرورت کو نہیں پورا کرتا ہے، وہ بے جان ہو جائے گا۔ ہندوستان میں اسلام کی یہی حالت ہے۔

اصلاح کی ان کوششوں کو پوری طرح صرف مذہب سے جوڑ کر بھی نہیں رکھا گیا۔ اس وقت کے سماجی رسم و رواج کی جگہ پر مصالح قوم نے جو بدل پیش کیے وہ مدلل اور سیکولر تھے۔ مثلاً بیوہ کی شادی کی وکالت، کثرت ازواج اور کم عمری میں شادی کی مخالفت کرتے ہوئے اکشے کمار نے اپنی بات کے ثبوت میں نہ تو ماضی کا حوالہ دیا اور نہ مذہبی منظوری کی کوئی پرواہ کی۔ اپنی بات کو سمجھانے کے لیے انھوں نے ان کے بُرے اثرات کا ذکر کیا۔ کم سنی میں شادی کو غلط ثابت کرنے کے لیے مذہبی کتابوں سے دلیلیں نہ اخذ کر کے، انھوں نے علم طب اور صحت کے اصول کے تحت نقصانات سامنے رکھا۔ ازدواجی زندگی کے بارے میں ان کے خیالات بہت ترقی پسند تھے۔ انھوں نے کہا کہ شادی کے پہلے لڑکا اور لڑکی کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی اجازت ہونی چاہیے، ازدواجی زندگی کا انحصار شوہر اور بیوی کی برابری اور ساجھے داری پر ہو اور طلاق بھی قانون اور ریت دونوں کے مطابق ہو۔ دوسرے علاقوں کے مقابلہ مہاراشٹر میں سماجی اصلاح کے لیے مذہب کے سہارے پر بہت کم انحصار تھا۔ وہاں کے مصلح گوپال ہری دیش مکھ جو لوک ہت وادی نام سے مشہور تھے، کے مطابق سماج سدھار کے لیے مذہب کی منظوری ہو، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر مذہب اُسے قبول نہیں کرتا ہے تو اس مذہب کو ہی بدل دینا چاہیے، کیونکہ انسان نے اسے بنایا ہے۔ اور جو کچھ مذہبی کتابوں میں درج ہے ضروری نہیں کہ آج کے تناظر میں وہ درست اور مناسب ہی ہو۔

اگر چہ ان اصلاحات کا دائرہ خاص خاص باتوں تک محدود تھا، مگر مذہب کے بارے میں ان کا مقصد بہت وسیع تھا۔ راجہ رام موہن رائے یہ مانتے تھے کہ مختلف مذاہب دراصل ایک ہی ذات خدا کا الگ الگ پرتو ہیں۔ شروع میں وہ برہم سماج کو ایک ہمہ گیر چرچ کی طرح موسوم کرتے تھے۔ وہ سبھی مذاہب کے اخلاقی اصولوں کے حامی تھے۔ ویدوں کے وحدت الوجود اور عیسائی مذہب کی وحدانیت کے قائل تھے۔ اس کے برعکس وہ ہندو دھرم کے کثرت الٰہ اور عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کو رد کرتے تھے۔ سید احمد خاں نے بھی یہی بات کہی کہ سبھی پیغمبروں کا

ایک ہی ''دین'' ہےاور ہر قوم اور ملک کا الگ الگ پیغمبر ہوتا ہے۔کشور چندر سین نے اسی بات کا مزید خلاصہ کیا کہ ''ہم ایسی حالت میں نہیں ہیں کہ سبھی مذاہب کی سچائی تلاش کریں مگر دنیا کے سارے مذاہب برحق ہیں'' انھوں نے اس جامع نظریہ کے سماج پر پڑنے والے اثرات کو بھی ظاہر کیا' 'جو شخص صدق دل سے روزانہ خدا کی عبادت کرتا ہے، اس کی سمجھ میں یہ بات ضرور آ جانی چاہیے کہ سارے ہم وطن اس کے بھائی ہیں۔ایسے سماج میں ذات پات خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اگر میرا ایمان ہے کہ خدا ایک ہے اور اسی نے ہم سب کو بنایا ہے، تو مجھ کو تہہ دل سے یہ بات ماننا چاہیے کہ سبھی میرے بھائی ہیں، چاہے وہ پارسی ہوں، ہندو ہوں، مسلم ہوں یا یوروپی''5

ایسا وسیع نظریہ کلیۂ فلسفیانہ بھی نہیں تھا، بلکہ اس نے انیسویں صدی کے بعد کے نصف دور میں، مخصوص مذہبی شعور ابھرنے کے پہلے سماجک اور سیاسی سوچ کو کافی متاثر کیا، مثلاً راجہ رام موہن رائے جانتے تھے کہ ہندو وکیلوں کے مقابلہ میں مسلم وکلا زیادہ ایماندار ہوتے ہیں۔اسی طرح ودیا ساگر انسانیت نوازی کے کاموں میں ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ بنکم چندر چٹوپادھائے، جن کو ہندو پرست مانا جاتا تھا، نے کہا کہ کسی انسان کی اچھائی کی یہ کسوٹی نہیں ہے کہ وہ فلاں یا فلاں مذہبی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس کے دھارمک اوصاف سے اس کو جانچا جانا چاہیے۔ مذہبی نسبت کے برعکس اخلاقی قدروں کی پیروی کو برتری کی کسوٹی مانا، انگریزوں سے پہلے کی حکومت کو انھوں نے ''مسلم غلامی'' اور ''مسلم ظلم'' کے نام سے یاد کیا۔مگر یہ صورت حال مذہب کی وجہ سے نہیں بلکہ سیاست کے خود مختارانہ نظریہ کے تحت پیدا ہوئی۔اس طرح ان کا زور لفظ مسلم پر نہیں بلکہ ظلم پر تھا۔یہ بات سید احمد کے بیان سے صاف ہو جاتی ہے کہ ''راجاؤں اور نوابوں کی حکومت ہندو مسلم مذہب کے مطابق نہیں چلتی تھی، بلکہ صرف ظلم اور جبر پر قائم تھی، قانون کا نہیں، طاقت کا تسلط تھا، عام آدمی کی تکلیف کوئی نہیں سنتا تھا''۔ان کی حکومت کی کامیابی کو مذہب سے نہیں بلکہ بھلائی کے عام اصولوں سے جانچا جاتا تھا۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی شناخت لوگوں کے معاشرتی نظریہ کو متاثر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مذہبی شناخت کا پورا زور تھا۔مصلحین قوم نے ایسی تنگ نظری سے عوام کو نجات دلانے کے لیے ہی جدوجہد کی۔ پھر بھی یہ لوگ انگریزی تہذیب و تمدن اور نظریات کے مدمقابل، زندگی کی قدروں کو ترقی

کی بنیاد فراہم کرنے کے بجائے مذہب خاص کی طرف لوٹ کر اسے انگریزی تہذیب سے بچانے کی کوشش میں لگ گئے۔

انیسویں صدی میں دو مورچوں پر تمدنی اور نظریاتی جنگ لڑی گئی۔ ایک طرف تو اس کا مقابلہ روایتی تمدن کے پھسڈی عناصر سے اور دوسری طرف تیزی سے پھیلتی ہوئی انگریزی تہذیب اور نظریہ سے تھا۔ شروعاتی دور کی کوششیں تو ہندستانی سماج کے پرانے رسم ورواج کو دور کرنے کے لیے کی گئیں۔ مذہب کے سلسلہ میں اصلاحی تحرک نے 'بت پرستی' عقیدہ کثرت الٰہ اور پجاریوں کی مذہبی اجارہ داری کو ختم کرنے اور مذہبی ارکان کو سہل بنانے کے لیے جدوجہد کیا۔ یہ مسائل مذہبی زاویہ سے ہی نہیں بلکہ سماجی تناظر میں بھی بہت اہم تھے۔ اس نے لوگوں کو مذہب کی اندھی تقلید اور پجاریوں کے ناجائز استحصال سے آزاد کرانے میں پوری مدد کی۔ مذہبی کتابوں کا ہندستانی زبان میں ترجمہ ہونے سے اور عوام کو ان کی تشریح کا اختیار ملنے سے، مذہبی علم پر پجاریوں اور دھرم کے ٹھیکیداروں کی اجارہ داری نہیں رہ گئی۔ عام لوگوں تک جب یہ مذہبی معلومات ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ پہنچی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پجاریوں نے مقدس کتابوں کی غلط تشریح کر کے جو ڈھکوسلے بنا رکھے تھے، ان کی قلعی کھل گئی۔ مذہبی رسومات کو سہل و آسان بن جانے سے، خدا کی عبادت میں درمیانی لوگوں کی ضرورت بھی ختم ہوئی۔ خدا کی عبادت مکمل طور سے ذاتی عمل ہو گیا۔ انسان کو اس طرح ذاتی طریقہ سے مذہب پر چلنے کی آزادی حاصل ہوئی۔

ذات پات سسٹم جس نے پورے سماج کو خانوں میں تقسیم کر کے بری طرح کمزور کر رکھا تھا کے اصلاح کی ضرورت کو فوری طور سے محسوس کیا گیا۔ ذات پات کی تفریق صرف اخلاقی نقطہ نظر سے گھنونی نہیں تھی، بلکہ اس سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں دیس پریم کے جذبات کو سرد کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ جمہوری فکر کی ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ کا سبب تھا۔ راجہ رام موہن رائے کے ذہن میں اس کے خلاف سوچ پیدا ہوئی۔ عملاً اس کے خلاف اس وقت کچھ نہ ہو پایا مگر وقت کے ساتھ اس میں تیزی آئی۔ راناڈے، دیانند اور وویکانند نے اس کی پرزور مخالفت کی۔ اگرچہ عام اصلاحی تحریکیں اس کے خاتمہ کے لیے پوری

طرح کمر بستہ تھیں، مگر دیانند نے ہندوستان کے چاروں ورن یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے وجود کی دلکش تشریح کی۔ انھوں نے اس سسٹم کو انسان کی خوبی کی بنیاد پر بنائے رکھنے کی دلیلیں پیش کیں کہ ''برہمن وہ جو علم و عمل کے حسن سے آراستہ ہو اور جاہل شودر کے درجہ میں رکھنے لائق ہے''7 ذات پات کی سخت مخالفت نچلی ذاتوں میں ابھری تحریکوں نے کیا۔ جوتر با پھولے اور نارائن گرو اس کے سخت مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں نارائن گرو اور گاندھی جی کے درمیان ہوئی گفتگو اہمیت کی حامل ہے۔ چتر ورن کے تحت لوگوں کو نسلاً ملی ہوئے خصلتوں کا حوالہ دیتے ہوئے گاندھی جی نے بتایا کہ ایک درخت کی ساری پتیاں اور ساخت اور بناوٹ میں ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں۔ اس پر گرو نارائن نے کہا کہ ''یہ فرق صرف اوپری ہے، پتیوں کے رس میں تو کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پیڑ کی پتیوں سے نچوڑے گئے رس کا ذائقہ ایک ہی ہوتا ہے''8 انھوں نے زور دے کر کہا کہ ''سارے انسانوں کے لیے ایک مذہب، ایک برادری، اور ایک ہی اللہ ہے'' اسی بات کو ان کے شاگرد سہادرن ایاپن (Sahadaran Ayyapan) نے اس طرح ترمیم کیا ''انسانوں کے لیے کوئی مذہب نہیں، کوئی برادری اور کوئی خدا نہیں''۔

عورتوں کی معاشرتی حالت سدھارنے کی مہم محض انسانیت نوازی کے تحت نہیں چلائی گئی بلکہ اس کے پیچھے پورے سماج کو سدھارنے کا وسیع نظریہ تھا۔ دراصل گھریلو حالات میں اصلاح کے بغیر کوئی سماج سدھار اثر انداز نہیں ہو سکتا، کیونکہ گھر وہ تعلیم گاہ ہے جہاں بچہ انسانیت کا پہلا سبق پڑھتا ہے۔ اس سلسلہ میں عورتوں کا کردار بہت اہم ہے۔ عورت کے سدھرے بغیر نہ مرد سدھرتا ہے نہ گھر۔ ان کے سلسلہ میں یہ نظریہ دراصل ان کی ترقی کی راہوں کو محدود کرتا ہے مگر اس وقت مصلحین کے سامنے پہلا کام ہی یہی تھا کہ گھر کی چہار دیواری کے اندر عورتوں کی حالت میں سدھار ہو۔ اس معاملہ میں وہ تنگ نظر نہیں تھے بلکہ محسوس کرتے تھے کہ ''سماج میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی اگر اس کی عورتیں جہالت میں ڈوبی ہوئی ہوں''۔ یہاں ایک بات اور صاف ہونی چاہیے کہ اصلاحی تحریکوں نے ملکی رسم و رواج کو اگر پوری طرح رد کر دیا ہوتا تو ہندستانی سماج مغربیت کے راستہ پر آسانی سے چل پڑتا۔ لیکن مصلحین قوم کا مقصد مغربیت پرستی کے بجائے جدیدیت نوازی تھا۔ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید ان کی تحریک کا جز کبھی نہیں رہا۔

اس وقت شروع کیے گئے سدھار آج بہت معمولی ہلکے اور محدود معلوم پڑتے ہیں، مگر اس زمانہ میں ان سدھاروں کے لیے پہل کرنا اور انھیں عملی جامہ پہنانا قطعی آسان کام نہیں تھا۔ ان کوششوں کو شروع میں زبردست مخالفت جھیلنا پڑا۔ اس نے گھریلو اور معاشرتی زندگی میں غیر معمولی ہلچل پیدا کی۔ رسم ورواج کی پابندی ٹوٹنے سے جو جذباتی کھلبلی سماج میں پیدا ہوئی اس نے مردوں اور عورتوں کو کچھ مدت کے لیے تذبذب میں ڈال دیا۔ سدھاروں کو لے کر لوگوں کے بڑے ردعمل ہوئے، بنگال میں جب بیوہ کی شادی کا پہلا واقعہ ہوا تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسے دیکھنے کے لیے جمع ہوئے۔ اسی طرح مہاراشٹر میں پہلے ودھوا وواہ پر جمع بھیڑ ایسی بھڑک اٹھی کہ پولیس کو اپنی حفاظت کے لیے لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ جب رکما بائی (Rukmabai) نے ناخواندہ اور ناکارہ شخص سے شادی کرنے سے انکار کیا تب ایک طوفان بپا ہوا۔ اسی طرح جب ایک لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف ایک شخص سے شادی کرنے پر مجبور کیا گیا تو اس کو سوچ کر رانا ڈے کئی رات جگتے رہے۔ لوک ہت وادی تیلنگ (Telang) اور تمام دوسرے لوگوں کا یہی حال تھا۔ وہ سب دوراہے پر کھڑے تھے۔ ان کے ایک طرف رسم ورواج تھے اور دوسری طرف جدید اصلاحی عزم وارادے۔ بہتیرے پرانی روایتوں پر ہی جمے رہے۔ بہر حال اسی جدوجہد سے ہندوستان میں نیا آدمی اور نیا سماج پیدا ہوا۔

ہندستانی سماج پر مغربی تہذیب وتمدن اور نظریہ کا غلبہ روز بروز تیز ہوتا جارہا تھا۔ اس لیے ملکی دستور ورواج کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوششیں بھی انیسویں صدی میں شروع ہوئیں۔ پرانے دستوروں کی توانائی اور طاقت کا احساس کیا گیا اور ان پر پوری توجہ دی گئی۔ چونکہ جن جن اصولوں کی بنیاد پر انگریزی مشینری کام کر رہی تھی وہ اپنے پہلے کے مقابلہ میں کم تنزل تھی۔ اس لیے انگریزی تسلط کے خلاف جدوجہد شروع میں اپنے تمدن کی حفاظت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ چونکہ تہذیب اور تمدن میں دخل اندازی لوگوں کے جذبات کو بری طرح متاثر کرتی تھی۔ اس لیے انگریزی سلطنت کے فتوحات کے بالکل ساتھ ہی دیسی تہذیب وتمدن کی محافظت کی کوششیں بھی تیز ہوئیں۔

مغربیت نے زندگی کے سارے گوشوں کو متاثر کر رکھا تھا۔ زبان، مذہب، آرٹ، فلسفہ سبھی اس سے متاثر ہوئے تھے۔ اس کے ردعمل میں جو کچھ ہوا اس کی دو خصوصیتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک متبادل اور تمدنی نظریاتی سسٹم وجود میں آیا، دوسرے یہ کہ روایتی دستور کو پھر سے زندہ کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ اس کے تحت ہندستانی زبانوں کے ارتقا کی کوشش کی گئی۔ تعلیم کا متبادل سسٹم تلاش کیا گیا۔ ہندستانی آرٹ وادب کے نشوونما کی کوشش ہوئی۔ ہندستانی پوشاک اور کھانے پر زور دیا گیا۔ مذہب کے حفاظت کی اپیل کی گئی اور دیسی طریقہ علاج کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش ہوئی۔ انگریزی دور کے پہلے کی دستکاری، کاری گری، اور صنعت کے نو تعمیر کی جدوجہد ہونے لگی۔ اس طرح کی سرگرمیوں کی جھلک ہم کو راجہ رام موہن رائے اور عیسائی مشنریوں کے درمیان ہوئی بحث میں، تتوبودھنی سبھا (Tattvabodhni Sabha) کے قیام اور اس کی سرگرمی میں اور ستر ہزار مدراسیوں کی لیکس لوسی ایکٹ (Lex Loci Act) کے خلاف عرضداشت میں ملتی ہے۔9

(یہ قانون 1845 میں پیش ہوا اور 1850 میں پاس ہوا۔ اس کے تحت عیسائی مذہب قبول کرنے والے ہندو کو موروثی جائداد کا حقدار تسلیم کیا گیا) بعد کی تحریکوں جنھیں عام طور سے روایت پرست اور احیائے مذہب مانا جاتا تھا، میں ہندستانی تہذیب وتمدن کی حفاظت کی فکر اچھی طرح ہوئی۔ ایسے حالات میں یہ تحریکیں خالص دیسی تھیں جن کا مقصد ہی انگریزی تہذیب وتمدن کے اثرات سے ملکی کلچر اور تہذیب کو محفوظ رکھنا تھا۔ اس طرح یہ تحریکیں قطعی زوال پذیر نہیں تھیں۔ یہ تو صرف اپنے کلچر اور تہذیب کی حفاظت میں ڈٹی تھیں جن کو انگریزی تسلط اگرچہ مٹا تو نہیں سکا تھا مگر بگاڑ ضرور رہا تھا۔ یہ تحریکیں اس لیے بھی اہم تھیں کہ قومی شعور کی ارتقا میں یہ بہت مددگار ثابت ہوئیں۔ ہاں، ان میں سے کچھ کے رجحانات تاریخی ضرورت کی حد کو نہیں پار کر سکے اور اپنی جگہ قائم رہے اور آگے چل کر اسی لیے ان کا نظریہ سدھار مخالف اور متعصبانہ ہو گیا۔ غالباً یہ کیفیت سیاسی سرگرمی اور تمدن کے درمیان تال میل نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس سے سیاسی شعور کی نشوونما ضرور ہوئی، مگر تمدنی پچھڑاپن دامن گیر رہا۔

بہر حال ان سماجی اور مذہبی تحریکوں کے ذریعہ تمدنی اور نظریاتی کوششیں شروع ہوئی۔ اس نے قومی شعور کو جنم دینے اور اُس کی ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ شروعاتی دور میں اس نے ذہنی اور تمدنی ہوش مندی پیدا کی اور اس سے لوگوں کو مستقبل کے بارے میں نئی سوجھ بوجھ حاصل ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ چونکہ یہ کوششیں انگریزیت کے ردعمل میں ہوئی تھیں، اس طرح دو مورچے پر ہوئی اس جدوجہد نے جدید تمدنی حالات، نئے آدمی، نئے گھر اور نئے سماج کو جنم دیا۔

7واں باب

کلونیل حکومت کی اقتصادی پالیسی (Economic Policy) کا تنقیدی جائزہ

برٹش سلطنت کے مختلف ملکوں میں چل رہی تحریکوں میں ہندستانی قومی تحریک برٹش حکومت کے اقتصادی تسلط اور استحصالی کردار، مزاج وطبیعت کے رگ وریشہ سے سب سے زیادہ واقف تھی۔ شروع دور کے قائدین نے جو اعتدال پسند مشہور تھے سب سے پہلے انیسویں صدی میں کالونیائی حکومت کی اقتصادی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیا۔ غالباً قومی تحریک کی نشو ونما میں ان کا یہی جائزہ سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوا۔ قومی تحریک کی تاسیس میں یہی موضوع اور اسی سے جڑے دوسرے موضوعات کی تشہیر بعد میں وسیع پیمانہ پر بڑے زور وشور سے تقریروں، اشتہاروں، اخباروں، گیتوں اور پربھات پھیریوں کے ذریعہ کی گئی۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندستانی دانشوروں نے برٹش حکومت کے بارے میں مثبت نظریہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ انگلینڈ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ

ملک ہے اس لیے ان کو یہ امید تھی کہ وہ ہندوستان کو جدید روپ دینے میں مددگار ثابت ہوگا۔ اسوقت صنعت وحرفت میں انگلینڈ دنیا کا سب سے بڑا ملک بن کر ابھر رہا تھا۔ ان کو یہ بھی امید تھی کہ انگلینڈ جدید سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ داروں کی مالی تنظیموں کا استعمال کر کے ہندوستان کی معاشی پیداوار کو بڑھائے گا۔ یہ بات نہیں کہ اس وقت قائدین بدیسی حکومت کی سیاسی، نفسیاتی، اور معاشی کمزوریوں سے ناواقف تھے۔ بلکہ انھوں نے حکومت کا ساتھ صرف اس امید پر دیا کہ ہندوستان کی نوتعمیر ان کے ذریعہ ٹھیک مغرب کے شہروں کی طرح ہو جائے گی۔

لیکن 1860 کے بعد ان کا یہ بھرم ٹوٹنے لگا۔ سماج کی ترقی کا ان کا خیال شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، اس تلخ سچائی سے انکی آنکھیں اور بھی کھل گئیں کہ نئے سمت میں جو ترقی ہوئی ہے وہ صرف نمائشی ہے کیونکہ یہ دکھاوٹی ترقی جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں رکی رہ گئی جبکہ پورا ملک تنزل پذیر اور پستی مائل ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے انگریزی حکومت کا تاریک پہلوأن کے سامنے ظاہر ہوگیا۔ وہ حقیقت سے واقف ہو گئے اور اس کے برے اثرات کی تحقیق انھوں نے شروع کر دی۔

ہندوستان کی کثیر تعداد میں سے تین ہستیوں کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں جنھوں نے برٹش حکومت کے اقتصادی پہلو کا تجزیہ کیا تھا۔ ان تینوں میں سب سے قدآور دادا بھائی نوروجی تھے جو گاندھی کے پہلے ''بابائے ہندوستان'' (Grand Old Man of India) کہے جاتے تھے۔ 1825 میں پیدا ہوئے دادا نوروجی کامیاب کاروباری تھے، لیکن انھوں نے اپنی ساری زندگی قومی تحریک کے چلانے میں لگا دی۔ ان کے سب سے قریبی ہم عصر جسٹس مہادیو گووند راناڈے نے ہندوستان کی پوری نسل کو جدید صنعت وحرفت کے ارتقا کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ رٹائرڈ آئی۔سی۔ایس افسر رمیش چندر دت نے ہندوستان کی اقتصادی تاریخ (Economic History of India) لکھی اور یہ بیسویں صدی کے آغاز کے دنوں میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے 1857 سے اس وقت تک کے انگریزی حکومت کے پورے معاشیاتی دستاویزات کا باریکی سے بالتفصیل جائزہ لیا۔

ان تینوں ہستیوں کے ساتھ جی۔وی جوشی سبرمنیا ایر، جی۔کے۔گھوسکے، پرتھولیس

چندر رائے اور سینکڑوں دوسرے سیاسی کارکنوں اور صحافیوں نے انگریزی حکومت کی اقتصادیات سے متعلق سارے پہلوؤں اور مسئلوں کا بڑی باریکی سے تجزیہ کیا۔ انھوں نے برٹش حکومت کی منشا اور مقصد سے متعلق سوالات بھی اٹھائے۔ ان کے تجزیہ سے برٹش حکومت کی ساری کارروائی جو اقتصادیات کے سلسلہ میں ہو رہی تھی، ظاہر ہو گئی اور لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان کی اقتصادی ترقی میں سب سے زیادہ روڑا برٹش حکومت ہی ہے۔

اس حقیقت کو وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ برٹش سلطنت کی منشا یہی ہے کہ ہندستانی مالی وسائل برٹش اکونمی کے تابع رہیں۔ یہ خاکہ بھی ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ برٹش حکومت کس طرح اپنا غلبہ صنعت و حرفت اور مالیات کے تینوں شعبوں پر قائم کیے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ ان کو یہ بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ برٹش حکومت اب مختلف قسم کے نذرانوں، لوٹ کھسوٹ اور تاجرانہ ہتھکنڈوں کے ناجائز طریقوں کا استعمال کر رہی ہے بلکہ وہ غیر ملکی سرمایہ کی پر فریب اور پیچیدہ ترکیب سے ہندستانی مالیات کا استحصال بھی کر رہی ہے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچے کہ برٹش سلطنت میں ہندوستان کی حیثیت محض سپلائر کی ہے جو انگلینڈ کی راجدھانی کو کھانے کی چیزیں نیز دوسرے خام مال فراہم کرتا ہے اور خود انگلینڈ میں تیار مال اور پونجی کا بازار بنا ہوا ہے۔

شروع میں ہندوستان کی قومی تحریک کے لیڈران بیک وقت استاد اور شاگرد دونوں ہی تھے۔ مالیات کے متعلق تقریباً سبھی سرکاری پالیسیوں کے خلاف انھوں نے بڑی سمجھداری سے زبردست تحریکیں چلائیں۔ ان کے ذریعہ انھوں نے برٹش حکومت کی مالی پالیسیوں کے جزئیات کو بذات خود سمجھا اور دوسروں کو بھی سمجھایا کہ سرکار کے ذریعہ کس طرح دیسی پونجی کا استحصال ہو رہا ہے۔ انھوں نے ہندستانی مالیات کو برٹش چنگل سے آزاد کرانے کے لیے زور دار اور پر جوش الفاظ میں وکالت کی اور ترقی کا متبادل راستہ اختیار کرنے کی تحریک چلائی۔

قومی لیڈروں نے عوام کی مالی حالت کو سدھارنے کے لیے تحریک اس دعویٰ سے چلائی کہ ہندستانی روز بروز غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہندستانی اور انگریزی عوام کو یہی بات سمجھانے کے لیے دادا بھائی نوروجی نے اپنی ساری زندگی کھپا دی۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستان مسلسل لاغر اور مفلس ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی دل پگھلانے والی مصیبت زدہ حالت کو

دیکھ کر خون کھولتا ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ واضح کیا کہ ''ہندستانی بھوکا مر رہا ہے، غذا کی قلت سے وہ اتنا کمزور ہے کہ معمولی سا ہاتھ لگانے پر اسکی روح فنا ہوسکتی ہے''1

شروع کے ان وطن پرست لیڈروں نے یہ بات بھی واضح کردی کہ غریبی نہ خدا کی دی ہوئی ہے اور نہ یہ ہماری قسمت کی وجہ سے ہے، نہ ہم کو وراثت میں ملی ہے اور نہ ہی ایسی بات ہے کہ اسے دور نہ کیا جاسکے۔ انھوں نے پھر کہا کہ غریبی خود آدمی کی پیدا کردہ مصیبت ہے، اور اسے دور کیا جاسکتا ہے، اور یہ حقیقت لوگوں کو سمجھائی جاسکتی ہے۔ آر۔ سی۔ دت نے لکھا کہ ''اگر ہندوستان آج غریب ہے تو اس کی صرف مالی وجوہات ہیں''2 ہندوستان کی غریبی کی وجوہات تلاش کرنے کے دوران ان لیڈروں نے ان وجوہات اور عناصر کی پہچان کی جن کو کلونیل نظام حکومت نے پیدا کیا تھا اور اپنے مفاد میں سرکار انکا استعمال کر رہی تھی۔

اس کے علاوہ غریبی کے مسئلہ کو لوگوں کی بڑھتی ہوئی بار آور صلاحیت اور توانائی کی شکل میں سمجھا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اسے قومی تحریک کا مسئلہ مانا گیا۔ اسی سوچ نے غریبی کے مسئلہ کو ایک اہم قومی مسئلہ بنا دیا اور ہندستانی سماج کو مختلف علاقوں اور درجوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اس کو متحد کرنے میں یہی سمجھ مددگار ثابت ہوئی۔

اس لیے ملک میں اقتصادی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری کام یہ سمجھا گیا کہ ملک میں صنعتی ترقی تیز کی جائے۔ شروع کے وطن پرست قائدین اس بات کو ایک رائے سے تسلیم کرتے تھے کہ ان کی مالی پالیسیوں کا خاص مقصد ہی یہی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور سرمایہ دار کی صلاحیت کی بنیاد پر ملک کی مالیات کو پوری طرح بدل دیا جائے۔ صنعت کاری کو انھوں نے بہت اہم سمجھا۔ جی۔ وی۔ جوشی کے لفظوں میں ''صنعت کاری بہتر اور اونچے درجہ کی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے''3 اسی طرح راناڈے مانتے تھے کہ ''اسکولوں اور کالجوں کے بجائے کارخانے کہیں زیادہ موثر طریقے سے قومی سرگرمیوں میں نئی روح پھونک سکتے ہیں''4

یہ لوگ یہ مانتے تھے کہ مختلف خانوں میں تقسیم ہندستانی عوام کو ایک کرنے کے لیے جدید صنعت کاری بہت مددگار ہوگی اور اس طرح مشترکہ دلچسپیوں کے حصول کے تحت لوگوں کی ایک قومی پہچان وجود میں آئے گی۔ سریندر ناتھ بنرجی نے اخبار ''بنگالی'' کے 18/جنوری

1902 کے شمارہ میں واضح کیا کہ ''سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے کی گئی تحریک بروقت ہندوستان کے مختلف قوموں کے لوگوں کو متحد تو ضرور کر سکتی ہے مگر جیسوں ہی یہ حقوق انہیں مل جائیں گے تو ان کی اپنی ڈھپلی ہوگی اور اپنا اپنا راگ ہوگا۔ ان قوموں کی مالی دلچسپیوں کو اگر مشترک کر دیا جائے تو یہ اتحاد کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ اس لیے صنعت حرفت کی سرگرمیاں، مضبوط اتحاد اور نتیجتاً عظیم ہندستانی قوم کی تشکیل کی بنیادی چیزیں ہوتی ہیں''۔

صنعت کاری کی ترقی کے واسطے شروع کے قومی لیڈروں نے بدیسی تجارت، ریلوے چنگی، زرمبادلہ، محنت قانون وغیرہ جیسے عنوانات پر غور وفکر کیا اور ان کو اُس کے لیے بے حد ضروری سمجھا۔

شروع کے تقریباً سبھی قومی لیڈروں کی رائے اس معاملہ میں ایک تھی کہ ہندوستان کے لیے صنعت کاری چاہے جتنی ضروری ہو مگر اس کا غیر ملکی سرمایہ پر انحصار نہیں ہونا چاہیے 5 انگریزوں کا خیال اس کے برعکس تھا۔ 1840 کی دہائی سے ہی معاشیات اور سیاست میں ماہر انگریز اور انگریز افسران بری طرح محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے قانونی نظم وضبط کے ساتھ ساتھ غیر ملکی پونجی کی شدید ضرورت ہے۔ جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) اور الفریڈ مارشل (Alfred Marshall) نے اپنے اکونامک رسالوں میں یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ 1899 میں ہندوستان کے وائس رائے لارڈ کرزن نے کہا تھا کہ ''قومی ترقی کے لیے غیر ملکی پونجی ایک ضروری شرط ہے'' 6

لیکن شروع کے قومی لیڈروں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ غیر ملکی پونجی ایک ایسی برائی ہے جو برابر پھیلتی جائے گی۔ اس کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ملک کو ترقی نہیں دیتی بلکہ اس کا استحصال کرتی ہے اور اسے مفلس بناتی ہے۔ یا پھر جس طرح دادا بھائی نوروجی نے خاص زور دے کر کہا کہ ''غیر ملکی پونجی ملکی وسائل کی لوٹ اور استحصال کا ذریعہ ہے'' 7

اسی طرح اخبار ''ہندو ریویو'' اور ''کایستھ سماچار'' نے غیر ملکی پونجی کے استعمال کو ''لوٹ مار کا انٹرنیشنل سنگٹھن بتایا'' 8

انھوں نے غیر ملکی پونجی کی مخالفت میں ٹھوس دلیلیں دیں کہ غیر ملکی پونجی نے ہندستانی

پونجی کو بڑھانے کے بجائے اسے پست کیا ہے۔ اور اس پر پوری طرح قبضہ کرلیا ہے۔ ملک کا سرمایہ نچوڑ کر بدیس لے جایا جارہا ہے۔ اور اس طرح ہندوستان کی مالیاتی نظام پر غیر ملکی پکڑ روز بروز مضبوط ہوتی جارہی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کے ذریعہ مالی ترقی کرنے کا مطلب ہی یہ ہوگا کہ ہم آج کے معمولی فائدے کے لیے اپنا سارا مستقبل فروخت کرڈالیں۔ 1901 میں وپن چندر پال (Bipin Chandra Pal) نے اسی بات کا یوں خلاصہ کیا کہ ''غیر ملکی خصوصاً برٹش پونجی لگاکر ملک کے قدرتی وسائل کا دُہن کیا جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کی مالی حالت سدھرنے کے بجائے یہ ان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث بنا ہے۔ یہ جتنا سیاسی اعتبار سے خطرناک ہے، اتنا ہی مالی نظریہ سے مہلک ہے۔ اور نئے ہندوستان کا مستقبل ہی مکمل طور سے اسی بات پر منحصر ہے کہ کتنی جلدی اس دوہری برائی سے نجات ملتی ہے''[9]

دوسری طرف ان لیڈروں نے اس بات کو مزید کہا کہ حقیقت میں ہندوستان کی مالی ترقی تبھی ممکن ہے جب ہندستانی پونجی سے صنعت کاری کی شروعات کی جائے۔ بدیسی پونجی نہ یہ کام شروع کرسکتی ہے اور نہ انجام کو پہنچاسکتی ہے۔

ان لیڈروں کے مطابق بدیسی پونجی لگانے سے سیاسی خطرے کم مہلک نہیں ہوں گے۔ وجہ یہ ہے کہ بدیسی پونجی کے کسی ملک میں داخل ہونے سے وہ ملک لازمی طور سے غلام بن جاتا ہے۔ بدیسی پونجی ذاتی دلچسپیوں کو جنم دیتی ہے تب اس کی حفاظت ضروری ہوجاتی اور اس طرح بدیسی حکومت کو ہمیشہ کا جیون مل جاتا ہے۔ ''ہندو'' اخبار نے 23/ستمبر 1889 کے شمار میں لکھا تھا کہ ''جس ملک میں بدیسی پونجی اپنی جڑیں جمالیتی ہے، اس ملک کی حکومت فوراً بدیسی سرمایہ داروں کی دلچسپی کا موضوع بن جاتی ہے'' اس نے پھر لکھا کہ ''اگر ملک میں بدیسی سرمایہ داروں کے اثر کو بڑھنے دیا جاتا تو انڈین نیشنل کانگریس کی کامیابی کے سارے امکانات ختم ہوگئے ہوتے اور اس کی آواز ''سلطنت خطرے میں ہے'' کے زبردست شور میں دب کر رہ گئی ہوتی اور یہ آواز بدیسی سرمایہ داروں نے ضرور ہی بلند کیا ہوتا''۔

شروعاتی دور کے وطن پرستوں کے سامنے ہندوستان کی دستکاری اور گھریلو دھندوں کی تیزی سے ہوئی تباہی کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے

دھندوں کی بربادی کسی حادثہ کے تحت اچانک نہیں ہوئی ہے، بلکہ یہ برٹش حکومت کی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ اس نے برٹش صنعت کے مفاد میں ہندستانی دھندوں کو نیست و نابود کرنے کے مقصد سے اپنی مالی پالیسی مرتب کی ہے۔

دوسری طرف برٹش حکمراں بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہندوستان کا بدیسی کاروبار تیزی سے بڑھا ہے اور تیزی سے ریل لائنیں بچھائی گئی ہیں۔ یہ سب ملک کی مادّی ترقی اور خوشحالی کا ثبوت ہے۔ اس کے برعکس وطن پرستوں کا دعویٰ تھا ملکی صنعت پر ان دونوں یعنی بدیسی کاروبار اور ریلوے کا منفی اثر پڑا ہے۔ یہ سب ملک کی مالی ترقی کی نہیں بلکہ برٹش صنعت کی ترقی، اور دوسری طرف ہندوستان کی مالیات کی تنزلی کی علامت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بدیسی تجارت کتنی ہوتی ہے، اس کی اہمیت بے معنیٰ ہے، بلکہ اہمیت تو اس بات کی ہے کہ بدیسی تجارت کس طرح کی ہے اور ہمارے یہاں سے جو چیزیں بدیس جاتی ہیں ان کے عوض میں ہمیں ملتا کیا ہے اور یہ کہ اس بدیسی تجارت کا ہندستانی صنعت اور کاشتکاری پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ بدیسی تجارت کا یہی معیار انیسویں صدی میں بری طرح بدل دیا گیا ہے اور اپنی بدنیتی کے تحت بدیسی تجارت کے نام پر خام مال کی برآمدگی (Export) اور بنے ہوئے مال کی درآمدگی (Import) ہوتی تھی۔

اسی طرح انھوں نے ایک حقیقت کو اوراُجاگر کیا کہ ریلوں کو ہندوستان کی صنعتی ضرورت کے مطابق نہیں چلایا گیا ہے۔ ان کی شروعات نے صنعت میں نہیں بلکہ تجارت کے میدان میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ ان کے ذریعہ بدیسی مال کو ملک کے اندر لاکر یہاں کے گھریلو صنعت کو تباہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہنا کہ ریلوے کے قیام سے اسٹیل مشینی صنعت اور پونجی کھپت کو ترقی ملی ہے (جسے ہم آج ترقی یافتہ اور پسماندہ ملکوں کے بیچ تعلق کہتے ہیں) اس کا بھی فائدہ سیدھے انگلینڈ کو ملا ہے، ہندوستان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں جی۔ وی۔ جوشی نے صاف کہا تھا کہ ''ریلوے پر کیا گیا خرچ دراصل برٹش صنعتوں کو ہندوستان کی طرف سے دی گئی مدد ہے''[10] یا پھر تلک کے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ''یہ کام اپنے پیسے سے دوسرے کی بیوی کو سنوارنے کی طرح ہے''[11]

ان لیڈروں کے مطابق ہندوستان کی صنعتی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ آزاد

تجارت پالیسی ہے جس نے ایک طرف ہندستان کے گھریلو صنعت کو تباہ کر دیا ہے اور دوسری طرف اس نے ملک میں نئی اور غیر ترقی یافتہ صنعت کو مغرب کی صنعت سے کمپٹیشن کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے جو پوری طرح منظم اور ترقی یافتہ ہے۔ ایسا تجارتی مقابلہ دیسی صنعت کے لیے ہر طرح سے تباہ کن ہے۔ اس کے علاوہ برٹش جنگی پالیسی کی منشا کو قومی لیڈران اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ بنیادی طور پر یہ پالیسی برٹش سرمایہ داروں کے مفاد میں ہی بنائی گئی ہے۔

ان لیڈروں نے انگریزوں کی مالی پالیسی کی زوردار تنقید کی۔ انھوں نے اس بات کو اٹھایا کہ ٹیکسوں کو کچھ اس طرح لگایا اور ہٹایا جاتا ہے کہ غریبوں پر اس کا بار بڑھتا رہتا ہے اور بدیسی سرمایہ داروں اور نوکر شاہوں کو راحت ملتی رہتی ہے۔ اس لیے انھوں نے لگان کی شرح میں کمی کرنے، نمک پر ٹیکس ختم کرنے اور آمدنی ٹیکس لگانے نیز امیروں اور متوسط طبقہ کے ذریعہ استعمال کی جانے والی چیزوں پر امپورٹ فیس بڑھانے کی زوردار مانگ کی۔

اسی طرح سرکاری خرچ کا بھی معاملہ درپیش تھا۔ لیڈروں کا کہنا تھا کہ خرچ کے معاملہ میں برٹش سلطنت کی ضرورتوں پر ہی توجہ دی جارہی ہے جبکہ رفاہی اور ترقیاتی کاموں کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ یہ سارے کام پیسے کی قلت میں بے دم ہیں۔ انھوں نے فوج پر بڑھتے ہوئے خرچ کی مذمت کی۔ وجہ یہ تھی کہ برٹش سرکار کو نئے علاقوں کو فتح کرنے اور ایشیا و افریقہ کے زیر سلطنت حصوں پر اپنا تسلط بنائے رکھنے کے لیے مضبوط فوج کی بہر حال ضرورت تھی۔

انگریزی حکومت کا دولت نکاسی اصول (Drain Theory) قومی لیڈروں کی تنقید کا خاص موضوع تھا۔[12] انھوں نے لوگوں کے سامنے یہ بات بڑی وضاحت سے پیش کیا کہ ہندوستان کی کثیر دولت مختلف طریقوں سے انگلینڈ بھیجی جاتی ہے جیسے بھارت میں کام کرنے والے انگلینڈ کے فوجی اور سول سروس افسران کی تنخواہ اور پنشن، ہندوستان کی انگریزی حکومت کے ذریعہ انگلینڈ سے لیے گئے قرض کا سود، انگریز سرمایہ داروں کو ان کے ذریعہ لگائے ہوئے سرمایہ کا منافع اور انگلینڈ میں ہندستانی حکومت کے انتظام پر خرچ وغیرہ مدوں پر موٹی موٹی رقمیں یہاں سے نچوڑ کر انگلینڈ بھیجی جاتی ہیں۔

انگلینڈ کو دولت بھیجنے کی دوسری شکل یہ تھی کہ امپورٹ کے مقابلہ ایکسپورٹ تجارت

بڑھنے لگی تھی۔ مگر اس پورے خرید وفروخت میں ہندوستان کو کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ قومی لیڈروں کے اندازہ کے مطابق ہندستانی حکومت کے ذریعہ وصول کی جانے والی مال گزاری کا نصف جو اس وقت پوری زمین کی مالگذاری سے اور ملک کی کل بجٹ کے ایک تہائی سے بھی زیادہ تھی، انگلینڈ بھیج دی جاتی تھی۔ آج کے حساب سے یہ رقم ہندوستان کی پوری آمدنی کے آٹھ فیصد کے برابر ہے۔

دادا بھائی نوروجی پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزوں کی اس چالاکی کو سمجھا کہ ان کی تجارتی پالیسی کے تحت ہندوستان سے دولت برابر انگلینڈ کو بہتی چلی جارہی ہے۔ انھوں نے مئی 1867 میں یہ آواز اٹھائی کہ انگلینڈ بھارت کا خون چوس رہا ہے۔ اگلی نصف صدی تک انھوں نے اس کے خلاف زوردار تحریک چلائی اور عوام کو اس بارے میں خبردار کرنے کی ہر طرح سے کوشش کی۔

انھوں نے کھلے طور سے کہا کہ ہندستانی دولت اور پونجی کا بدیس جانا ہی ہندوستان کی غریبی کی خاص وجہ ہے اور یہی ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیادی برائی ہے۔ اس طرح انھوں نے 1880 میں یہ دعویٰ کیا کہ ''مالی قانون کے طریقہ عمل کی بے رحمی نہیں بلکہ یہ تو بے درد اور بے رحم برٹش پالیسی کا اثر ہے۔ یہ تو ہندوستان میں ہی ہندوستان کی دولت کو بے رحمی سے کھانا، اڑانا اور انگلینڈ پہنچانا ہے۔ مختصر یہ کہ مالی قانون کے برے اثرات کے تحت بڑی بے دردی سے ہندوستان کا خون چوس کر اسے تباہ کیا جارہا ہے''۔[13]

دوسرے قومی لیڈروں صحافیوں اور پرچارکوں نے داد بھائی نوروجی کے نقش قدم کی پیروی کر کے انگریزوں کی مالی پالیسی کے خلاف آواز اٹھائی آر۔سی۔ دت کی کتاب ''ہندوستان کی مالی تاریخ'' کا خاص موضوع دولت چوسنے کا یہی عمل ہے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں بتایا کہ برٹش شہنشاہ کے ذریعہ ٹیکس وصولی سورج کے ذریعہ نمی چوسنے کے مانند ہے، جو بارش کی شکل میں پھر زمین پر برستی ہے لیکن وہ نمی جو ہندوستان کی سرزمین سے چوسی جاتی ہے وہ ہندوستان پر نہ برس کر دوسرے ملکوں پر برستی ہے۔ ایک ملک سے دولت چوسنے کا یہ عمل دنیا کے سب سے خوشحال ملک کو مفلس کردے گا۔ اس عمل نے ہندستان کو ایسا قحط زدہ، کنگال اور لاچار بنادیا ہے جس کی

مثال دنیااور ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی''[14]

دولت چوسنے کے اس اصول کی سبھی قومی لیڈروں نے تنقید کی۔ انگریزوں کی اسی پالیسی نے صنعت وزراعت کی پیداوار کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ لیڈروں نے اس کے برے اثرات کولوگوں کے سامنے بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ انگریزوں کے استحصالی کردار کا خلاصہ کیا۔ انھوں نے بغیر کسی مصالحت پسندی کے دولت چوسنے کی اس پالیسی پر ہر طرح سے انگلی اٹھائی۔

یہی نہیں، دولت چوسنے کے اس نظریہ نے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ کسانوں کی سمجھ میں بڑی آسانی سے یہ بات آگئی کہ ان کے ملک کا پیسہ کس طرح بدیس بھیجا جارہا ہے۔ وہ روزانہ دیکھتے تھے کہ زمیندار، مہاجن، وکیل اور بیوپاری برابر ان کی جیبیں خالی کررہے ہیں اور دور دراز میں بیٹھے لوگ کس طرح ان کے پیسوں سے عیش کررہے ہیں۔

ایسے حالات میں اس کے خلاف ایک کامیاب تحریک چلانے کے لیے صرف ایک نعرہ کی ضرورت تھی کہ ''دولت بھیجنا بند کرو''۔ اس کے لیے لمبے چوڑے اور پُر پیچ دلائل کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ موضوع سیدھا اور صاف تھا۔ اور ہر شخص ایسے طریقہ استحصال کا شکار تھا۔ انگریزی حکومت لوگوں کو بہلا پھسلا نہیں سکتی تھی کیونکہ دولت چوسنے کی خواہش سے وہ کسی طرح دور نہیں رہ سکتی تھی۔ حکومت اور عوام کے درمیان یہی تضاد تھا اور اس کو اس وقت تک دور نہیں کیا جاسکتا تھا، جب تک انگریزی حکومت کا ملک سے خاتمہ نہ ہوجائے۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی عہد میں یہی مسئلہ قومی تحریک کا خاص موضوع بنا۔

اقتصادی مسائل کے تحت چل رہی تحریک نے عوام پر حاوی بدیسی حکمرانوں کے نظریہ کی جڑیں اکھاڑنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس نے حکومت کی بنیادیں ہلادیں۔ سیاسی اعتبار سے کوئی بھی حکومت تبھی قائم ودائم رہ سکتی تھی جب تک عوام میں اس کا اعتماد بحال رہتا ہے اس کا رویہ ہمدردانہ ہے اور ارادے نیک ہیں اور یہ کہ حکمراں وصولاً اس کی بھلائی کے خواہشمند ہیں۔ اسی خیال کے تحت لوگ حکومت کے حامی اور مددگار بنتے ہیں۔ اور اس کے بنے رہنے میں خیر سمجھتے ہیں۔ یہی اعتماد بدیسی حکومت کو جواز اور بنیادی استحکام فراہم کرتا ہے۔

ہندوستان میں انگریز حکومت کے استحکام کی ایک وجہ جہاں اس کی بے پناہ فوجی

طاقت تھی، وہیں دوسری طرف اس کی اخلاقی قوت بھی تھی۔ اور ایک بات کم وبیش ایک صدی سے عوام کے دلوں میں نقش تھی کہ انگریز حکمراں ان کے ''مائی باپ'' ہیں۔ پرائمری اسکول کی زبان کی کتاب میں پہلا سبق یہی ہوتا تھا ''برٹش حکومت کے فوائد''۔ قوم پرسوں کی اقتصادی تحریک نے دھیرے دھیرے لوگوں کی اس سوچ پر چوٹ کی اور ان کے اس خیال کو جھوٹا ثابت کر دیا کہ برٹش سرکار کریم النفس ہے اور اس کے ارادے نیک اور ہمدردانہ ہیں۔

برٹش حکمراں اور اس کے ڈھنڈھورچی بار بار یہ دہائی دیتے تھے کہ ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے لیے یہاں انگریزی حکومت کا قیام بے حد ضروری ہے، مگر قومی لیڈروں نے اس دلیل کے پرخچے اڑا دیئے اور واضح کیا کہ ہندوستان صرف اس وجہ سے اقتصادیات میں پچھڑا ہے کیونکہ برٹش حکومت یہاں صرف اپنی صنعت وحرفت اور پونجی لگانے کے لیے راج کر رہی ہے، اس طرح ایسی حکومت ہی ملک میں غربت اور افلاس کا باعث ہے۔ مثلاً تلک نے 28/جنوری 1896 کو اپنے اخبار ''کیسری'' میں یوں لکھا تھا کہ ''ہندوستان مکمل طریقہ سے یورپی لوگوں کی چراہ گاہ ہے''۔ اور کانگریس کے سابق صدر پی آنندا چارلو (P.Ananda Charlu) نے لیجسلیٹو کونسل میں یہی کہا کہ ''یوں تو انگریزی فوج باہری حملوں سے ہندوستان کی حفاظت کر رہی ہے، مگر جہاں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی دلچسپیاں باہم ٹکراتی ہیں، ایسے موقعوں پر ہندوستان غیر محفوظ ہو جاتا ہے (تمثیل کہاوت میں) اور حفاظتی باڑہ خود فصل چٹ کرنے لگتا ہے''۔[15]

بہار کے نوجوان دانشور سچدا نند سنہا نے ''انڈین پیوپل'' کے 27/فروری 1903 کے شمارہ میں اس طرح جائزہ لیا تھا کہ ''لارڈ کرزن خود اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انگریزی انتظام حکومت پوری تابعداری سے استحصال کے کام میں لگی ہے۔ بغیر چست و درست انتظام کے تجارت پنپ نہیں سکتی ہے، جبکہ حکومت عدم منافع میں تجارت پر توجہ نہیں دے رہی ہے۔ اس لیے حکومت ہند اکثر و بیشتر چیمبرس آف کامرس کی مرضی اور حکم سے چلائی جا رہی ہے۔ اور یہ لوگوں پر ایک باری بنی ہوئی ہے''۔

سب سے زیادہ دادا بھائی نوروجی نے روزانہ ہی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ برٹش حکومت کے پوشیدہ مقاصد کو نمایاں کیا۔ انھوں نے ان پر سختی سے چوٹ کی نیز انھوں نے یہ

بھی واضح کیا کہ ''انگریزوں کی بھلائی کا روپ تو محض ڈھونگ ہے، دھوکہ ہے۔اس کے پیچھے برٹش حکومت خفیہ طریقے سے بظاہر بغیر جان و مال پر زور وزبردستی کر کے، اس طرح استحصال کر رہی ہے کہ دنیا کو اس کا پتہ نہ چل سکے اور نہ اسے گھبراہٹ ہو''۔انھوں نے مزید کہا کہ ''لطف کی بات تو یہ ہے کہ ہندستانی دولت کا صرفہ اور خراب انتظام حکومت انگریزی سرکار کی کرم فرمائی ہے۔ حقیقت میں وہ خون نچوڑ رہی ہے''16

برٹش حکومت کا یہ دعویٰ کہ اس نے ہندوستانیوں کے جان و مال کی حفاظت کی ہے۔اس کے جواب میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''اس دعویٰ میں بھی لطف کی بات یہ ہے کہ دیسی راجاؤں کے لوٹ کھسوٹ اور آپسی مار پیٹ سے تو ان کو راحت ملی ہے مگر انگلینڈ کی لوٹ مار سے کسی بھی ہندستانی کی جان و مال محفوظ نہیں ہے۔ہاں! اگر کوئی محفوظ ہے، اور اچھی طرح محفوظ ہے تو وہ انگلینڈ...... ہر سال تیس سے چالیس کروڑ پونڈ کی جائداد ہندوستان سے وہاں لے جائی جا رہی ہے...... کروڑوں ہندوستانیوں کی حالت یہ ہے کہ وہ آدھے پیٹ رہ رہے ہیں یا بھوکوں مر رہے ہیں یا پھر قحط اور بیماریاں انکا مقدر ہیں17

جہاں تک لا اور آرڈر کا تعلق ہے دادا بھائی نے کہا کہ ''ہندستانی کہاوت ہے کہ پیٹھ پر مارو مگر پیٹ پر نہیں' دیسی راجاؤں کے دور میں جو کچھ لوگ پیدا کرتے تھے اس کا وہ فائدہ اٹھاتے تھے جب کہ وقتاً فوقتاً ان کی پشت پر مار پڑتی تھی۔انگریزوں کی حکومت میں آدمی سکون سے رہتا ہے، کوئی تشدد نہیں ہے مگر اس کی قوت بڑے اطمینان سے اور پوری خاموشی سے چوسی جا رہی ہے۔وہ پرسکون ماحول میں بھوکا مر رہا ہے، برباد ہو رہا ہے''18 برٹش حکومت کے تئیں پیدا ہوئی یہ بے اعتمادی دھیرے دھیرے سیاسی مخالفت کی شکل لینے لگی۔قومی لیڈروں نے اپنی مالی تحریکوں کے دوران اس کے ہر ایک اہم مسئلہ کو ملک کی سیاسی غلامی سے جوڑا تھا۔اس طرح ایک ایک کر کے سبھی مالی مسائل کو اٹھاتے ہوئے انھوں نے یہ بات ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں پیوست کر دی کہ چونکہ برٹش سرکار کی حکومت ''محض استحصال کا ہتھیار ہے'' اس لیے ہندوستان کے موافق پالیسی اور پروگراموں پر عمل تبھی ممکن ہے جب سیاسی حکومت پوری طرح ہندوستانیوں کے قبضہ اختیار میں ہو۔

یہی وجہ تھی کہ شروعاتی دور کے زیادہ تر قومی لیڈروں کا اپنی سیاست اور سیاسی طریقوں کے استعمال میں نرم رجحان تھا۔ان میں بہت سے انگریزی حکومت کے لیے نرم گوشہ اور وفاداری رکھتے تھے۔لیکن ان کی تحریکوں نے انگریزی حکومت کی جڑوں پر خاصی چوٹ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی عوام میں حکومت کے تئیں بے وفائی اور بے تعلقی بلکہ بغاوت کی ایسی تخم ریزی ہوئی کہ 1875 سے 1905 تک کا دور ہندوستان میں ذہنی بے چینی کا دور تھا، جس میں قومی جذبات کا ابھار ہوا۔اس طرح یہ زمانہ جدید قومی تحریک کی بنیاد کا وقت تھا۔

انیسویں صدی کے آخر تک قومی لیڈروں نے اپنی تحریک کو سیاسی حکومت میں شرکت داری اور سرکاری خزانہ پر کنٹرول کے مسائل تک محدود رکھا۔مگر 1905 کے آتے آتے بھی خاص قومی لیڈروں نے خود اختیاری سرکار (Self Government.) کے لیے آواز لگانی شروع کر دی اس معاملہ میں بھی دادا بھائی نوروجی سب سے آگے تھے۔انٹرنیشنل سوشلسٹ کانگریس میں 1904 میں خطاب کرتے ہوئے انھوں نے ہندستانیوں کو خود مختاری دینے اور دوسرے برٹش کلونیل ملکوں کی طرح کا درجہ دیے جانے کی پرزور مانگ کی[19] ایک سال بعد یعنی 1905 میں انڈین نیشنل کانگریس کے بنارس اجلاس کو بھیجے گئے اپنے پیغام میں انھوں نے کہا کہ ''ہندوستان کے مسائل اور پریشانیوں کا واحد حل خود مختاری ہے''[20] اس کے بعد 1906 میں کلکتہ اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے انگلینڈ یا دوسرے کلونیل ملکوں کے طرز کی خود اختیاری سرکار یا سوراج حاصل کرنا اپنا مقصد طے کیا[21]

اسی مقصد کے حصول کے لیے ذہنی طور سے لوگوں کو تیار کیا جانے لگا۔لیکن سیاسی آزادی کے لیے عوامی جد و جہد ابھی وقت کے بطن میں ہی تھی۔شروعات کے قومی لیڈران دراصل تحریک آزادی کی ٹھوس اور مضبوط بنیاد قائم کرنے میں لگے تھے۔انھوں نے محض جذبات سے کام نہیں لیا اور نہ ہی دقیانوسیوں کی طرح خوبصورت ماضی کا خواب دیکھ کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی، بلکہ کلونیل نظریہ کے پیچیدہ مالی مشنری کا تجزیہ اور ہندستانی عوام و برٹش حکومت کی دلچسپیوں کے درمیان بپا تضاد کو قومیت کا خاص اساس بنایا۔

بیسوں صدی کے قومی لیڈروں نے کلونیل مشنری کے اسی تجربہ کو اپنی تحریک کا مقصد

بنایا۔ گاندھی عہد کے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں نوجوان مجاہدین نے بدیسی استحصال کے اس رجحان سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اٹل تحریک کی اساس قومی لیڈروں نے ایسی مضبوط رکھی کہ چین، مصر، اور دوسرے کلونیل اور نیم کلونیل ملکوں کی کمزور تحریکوں کے برعکس سلطنت مخالف یہ ہندستانی تحریک آزادی اپنے اصلی مقصد سے شمہ برابر نہیں ہٹی۔

8واں باب

پریس کی آزادی کے لیے جدوجہد

انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی سیاسی طور پر باشعور ہندستانی شہری حقوق بالخصوص پریس کی آزادی کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ 1824 میں پریس پر پابندی لگانے والے ایک قانون کے خلاف راجہ رام موہن رائے نے سپریم کورٹ کو ایک درخواست بھیجی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''ہر ایک اچھے حکمراں کو اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں کو ایسے وسائل مہیا کرائے جن کے ذریعہ ان کے معاملات اور مسائل کی خبر اس کو جلد سے جلد مل سکے۔ اس اہم مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ پریس کو پابندیوں سے بالکل آزاد رکھا جائے''[1]

1870 سے 1918 کا دور ایسا تھا جس میں عمومی شرکت والی قومی تحریک پوری طرح نہیں ابھر سکی تھی۔ عوام کو جوڑنے کے لیے اس وقت نہ تو چھوٹے بڑے جلسوں کا سلسلہ ہی شروع ہو سکا تھا اور نہ ایسا کوئی سیاسی پروگرام سامنے آسکا تھا جس میں عام لوگوں کی شرکت داری ہو سکے اور جسے عوامی تحریک کی شکل دی جاسکے۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہی تھا کہ عوام کو سیاست میں رنگا

جائے، ان میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے، اپنے حقوق کے تئیں ان کو آگاہ کیا جائے اور قومی نظریہ کی خوب اشاعت کی جائے۔ چونکہ اس وقت لوگوں کو نہ کوئی سیاسی تنظیم میسر تھی اور نہ ہی منظم سیاسی پروگرام، اس لیے پریس ہی ایک ایسا آلہ تھا جس کے ذریعہ سارے اہم کام کیے جاسکتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس بذات خود اپنی کارگزاری کی اشاعت کے لیے پریس پر منحصر تھی۔ سیاسی کام چلانے کے لیے کانگریس کے پاس اپنی کوئی تنظیم نہیں تھی، اس کی ساری کارروائیاں اور قرار دادیں اخبارات کے توسل سے ہی لوگوں کے سامنے آتی تھیں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ 1885 میں کانگریس کے جنم داتاؤں میں ایک تہائی حضرات صحافی تھے۔ اس طرح اس دور میں ممتاز، بے خوف اور بیباک صحافیوں کی اڈیٹر شپ اور نگرانی میں زوردار اخباروں نے جنم لیا جسکی لسٹ کچھ اس طرح ہے:-

''جی سبرغیاایر'' ہندو اور ''سودیس ستر م''

بی۔جی۔تلک ''کیسری'' اور ''مراٹھا''

سریندر ناتھ بنرجی ''بنگالی''

ششر کمار گھوش اور موتی لال گھوش ''امرت بازار پترکا''

جی کے گوکھلے ''سدھارک''

این۔این۔سین ''انڈین مرر'' (Indian Mirror)

دادا بھائی نوروجی ''وائس آف انڈیا''

جی۔پی۔ورما ''ہندستانی'' اور ''ایڈوکیٹ''

پنجاب سے نکلنے والے ''ٹریبون (Tribune) اور ''آئین عام'' بمبئی سے ''اندر پرکاش'' دھیان پرکاش'' ''کال'' اور گجراتی اور بنگال سے سوم پرکاش، ''بنگا نواسی'' ''سادھاترکی'' اخبارات وجود میں آئے۔ دراصل اس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا بڑا سیاسی لیڈر رہا ہو جو خود اخبار نہ نکالتا رہا ہو اور کسی نہ کسی طرح اخباروں سے جڑا نہ رہا ہو۔

ان اخباروں کا اثر صرف تعلیم یافتہ لوگوں پر ہی نہیں تھا اور نہ ہی وہ قصبوں اور شہروں تک محدود تھا بلکہ اس کی اپیل دور دراز گاؤں تک گئی تھی، حالانکہ گاؤں میں اکا دکا ہی پڑھا لکھا ہوتا

تھا مگر اخبار پڑھ کر وہ دسیوں لوگوں کو سناتا تھا۔ پھر پورے ملک میں دھیرے دھیرے لائبریری اور ریڈنگ روم کے قیام کی لہر چل پڑی۔ اکثر چھوٹی جگہوں پر صرف ایک ہی اخبار لائبریری اور ریڈنگ روم میں آتا تھا۔ ایسی لائبریری میں فرنیچر کے نام پر صرف ایک میز، ایک دو تپائی یا چارپائی ہوتی تھی۔ اخباروں میں لکھے یا چھپے ایک ایک لفظ کو لوگ بہت غور سے پڑھتے تھے۔ یا کسی سے پڑھوا کر سنتے تھے اور اس پر چرچہ کرتے تھے۔ اس طرح اس وقت کے اخبارات لوگوں کے سیاسی معلم ہی نہیں تھے بلکہ ان کو پڑھنا اور چرچہ کرنا ہی ایک طرح کی سیاسی شرکت تھی۔

اس زمانہ میں اخبار رچھاپنا دھندہ بالکل نہیں تھا اور نہ اس میں کسی طرح کے مالی فائدہ کی گنجائش تھی۔ لوگوں کی نیت بھی ایسی نہیں تھی، اخبار نویسی پیشہ بالکل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خالص ملک اور سماج کی خدمت کے لیے اخبارات چھاپے جاتے تھے۔ اور اس کام سے جڑے لوگ ہی اپنی حیثیت کے مطابق چندہ دیتے تھے۔ صحافت میں عام طور سے وہی لوگ آتے تھے جو سیاسی رضا کار ہوتے تھے اور ہر طرح کی قربانی وایثار کے لیے تیار ہوتے تھے۔ اڈیٹر کو عام طور سے مالی دشواریوں اور فاقہ کے دور سے گذرنا پڑتا تھا۔ روزی روٹی کے لیے اس کو دوسرے ذرائع پر منحصر رہنا پڑتا تھا۔ درحقیقت اس وقت اخبار نکالنے کے لیے بہت پونجی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ 1868 میں 'امرت بازار پتر کا' کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس کا ساز وسامان خریدنے کے لیے صرف بتیس روپے ہی خرچ ہوئے۔ اسی طرح 1879 میں سریندر ناتھ بنرجی نے 'بنگالی' اخبار چھاپنے کا اختیار دوبارہ صرف دس روپے میں خریدا تھا اور پریس لگانے پر ایک ہزار چھ سو روپے کی لاگت آئی تھی۔

ان اخباروں میں عام طور سے بھی بڑے سیاسی مسائل اور اختلافات پر اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ یہ اخبار بہت زوردار حزف مخالف کردار کا بھی حق ادا کرتے تھے۔ ان میں حکومت کے سارے قانون اور پالیسی کی جم کر تنقید ہوتی تھی۔ اس وقت ہندستانی پریس کا ایک ہی مقصد تھا۔ یعنی ''مخالفت، مخالفت، مخالفت'' لیکن یہ مخالفت معیاری اور ٹھوس ہوتی تھی۔ بڑی ذمہ داری اور باریکی سے مسائل کا تجزیہ کیا جاتا تھا۔ نیشلسٹ صحافیوں کے بارے میں اس وقت کے وائس رائے لارڈ ڈفرن نے مارچ 1886 میں لکھا تھا کہ ''آئے دن انگریزی حکومت کے خلاف

سینکڑوں تیز طراران بابوؤں کا حملہ بڑھتا جا رہا ہے۔ انگریزوں کے خلاف یہ رویہ روز اپنے غصے کا اظہار بڑے موثر طریقے سے سخت الفاظ میں کر رہے ہیں'' اور مئی میں انھوں نے پھر لکھا کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اخبار پڑھنے والوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھتی جا رہی ہے کہ ہم (انگریز) پوری انسانی برادری خصوصاً ہندوستان کے دشمن ہیں'' 2

لیکن لوگوں میں سیاسی شعور، حب الوطنی، دیس پریم اور وفا شعاری کے جذبات ابھارنا اور انگریزی حکومت کے ظلم و زیادتی کے رویہ سے لوگوں کو آگاہ کرنا اس وقت کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزی حکومت نے 1870 میں تعزیرات ہند (Indian Panel Code) میں دفعہ 124A شامل کر کے یہ بندش لگائی تھی کہ ''جو بھی ہندوستان میں قانون کے ذریعہ قائم برٹش حکومت کے خلاف جذبات بھڑکائے گا اسے تین سال کی قید سے لے کر پوری زندگی جلاوطن کرنے کی سزا دی جائے گی'' بعد میں اس دفعہ میں کئی اور سخت ترین ضمنی دفعات شامل کر دی گئیں۔

لیکن ہندستانی صحافیوں نے بڑی عقلمندی اور چالاکی سے مضمون نگاری کے ایسے طریقے ڈھونڈ نکالے جس سے ان پر قانونی گرفت نہ ہو سکے۔ چونکہ جن لوگوں کی وفاداری برٹش حکومت کے تئیں شبہ سے بالاتر ہوتی تھی، ان پر دفعہ 124A لاگو نہیں ہوتی تھی، اس لیے ہندستانی صحافی جب حکومت کے خلاف اپنی تحریروں میں شعلہ بیانی کرتے تھے تو ساتھ ہی مہارانی اور انگریز بہادر کی تعریف میں قصیدے بھی پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک جگت اور بھی تلاش لی تھی۔ لندن سے چھپنے والے سوشلسٹ نواز اور آئرش اخباروں میں چھپے سلطنت مخالف مواد نکال کر وہ اپنے اخبار میں چھاپ دیتے تھے۔ روشن خیال برٹش شہریوں کے خطوط بغیر انورٹیڈ کاما (Inverted Comma) کے اپنے اخباروں میں شائع کر دیتے تھے۔ برٹش نوکر شاہی جب اس کی چھان بین شروع کرتی تو اسے پتہ چلتا کہ حکومت مخالف یہ تحریر تو کسی انگریزی اخبار سے لیا گیا ہے برٹش نوکر شاہی کڑھ کر رہ جاتی، مثال کے طور سے روس میں زار شاہی کے خلاف روسی دہشت گردوں کی جدوجہد کا ذکر کچھ اس طرح چھاپا جاتا کہ وہ ہندوستانیوں کو بنگال اور مہاراشٹر کے انقلابی دہشت گردوں سے ملتا جلتا لگتا۔ برٹش افسران جب اس کے خلاف

کاروائی شروع کرتے، تو پتہ چلتا کہ یہ حصہ تو ہندستانی اخبار نے لندن ٹائمس (London Times) یا ایسے ہی کسی دوسرے اخبار سے اخذ کیا ہے۔

کبھی کبھی ہندستانی اخبار برٹش سرکار کے خیر خواہ ہونے کا دم بھرتے، اسے وقت رہتے خبر دار ہونے کی صلاح دینے کی آڑ میں افسران کی غلطیاں اجاگر کر کے اسے بچانے کا جھوٹا مظاہرہ کرتے۔ بی۔ جی۔ تلک اور موتی لال گھوش اس طرح لکھنے میں بڑے ماہر تھے۔ کچھ نڈر اور بیباک صحافی تو اپنی تحریروں میں طنز وطعن، ہنسی ٹھٹھولی اور تضحیک کا استعمال کر کے حکومت کی اصلیت سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے۔

ان سبھی معاملات میں نیشنلسٹ صحافیوں خاص طور سے ہندستانی زبان کے صحافیوں کا کام بہت دشوار ہوتا تھا۔ ایک طرف انھیں اس طرح لکھنا ہوتا تھا کہ وہ برٹش قانون کی گرفت سے بچ سکیں، دوسری طرف ان کو ایسی آسان زبان میں لکھنا ہوتا تھا کہ کم تعلیم یافتہ عوام ان کی بات سمجھ سکیں۔ بڑی دانشمندی سے وہ دیسی اور بدیسی دونوں اخباروں میں اسے نبھاتے تھے۔

پریس کی آزادی کو ہندستانی قومی تحریک نے اول روز سے پوری اہمیت دی۔ جب بھی برٹش حکومت اس کی آزادی پر حملہ آور ہوئی یا اس کی آزادی کو کم کرنے کی کوشش کی، قومی تحریک نے اس کے خلاف جنگ کیا۔ پریس کی آزادی کی لڑائی دراصل ملک کی آزادی کی لڑائی کا ایک ضروری حصہ بن گئی۔

ہندستانی پریس نے 1870 کی دہائی میں مضبوطی سے قدم جمانا شروع کر دیا تھا اور اس کے ذریعہ لارڈ لٹن (Lord Lytton) کے انتظام حکومت کی تنقید زور وشور سے شرع ہوئی خاص طور سے 77-1876 کے قحط زدہ لوگوں کے ساتھ حکومت کے غیر ہمدردانہ سلوک کو منظر عام پر لایا گیا۔ اب اخبارات صرف متوسط طبقہ تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ عام لوگوں تک پہنچنے لگے تھے۔ اس لیے حکومت نے اچانک ہندستانی زبان کے اخباروں پر سخت ضرب لگائی۔ ان پر پابندی لگانے کے لیے چپکے چپکے امپیریل کونسل کی ایک ہی اجلاس میں ورنا کیولر ایکٹ پاس کر دیا۔ اس قانون کے تحت حکومت کو یہ اختیار مل گیا کہ اگر وہ سمجھے کہ اس کی تنبیہ کو نظر انداز کر کے اخبار اس کے خلاف بغاوتی لٹریچر شائع کر رہا ہے تو وہ اس اخبار، اس کے پریس، اور اس کے جملہ

سامان کو ضبط کر سکتی ہے۔

ہندوستان کے قومی لیڈروں نے اس قانون کی جم کر مخالفت کی اور اسی مسئلہ کو لے کر کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ایک بڑا اجلاس بلایا گیا۔ کسی عوامی مسئلہ کو لے کر یہ سب سے بڑا احتجاجی مظاہرہ تھا۔ اس قانون کے خلاف ہندستانی پریس اور دوسری تنظیموں نے بھی جہاد چھیڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1881 میں لارڈ رپن (Lord Ripon) نے یہ قانون واپس لے لیا۔

حکومت کے اس قدم کے خلاف ہندستانی پریس نے جس چالاکی سے جنگ کی اس کی کہانی بڑی دلچسپ اور ڈرامائی ہے ورنا کیولر پریس ایکٹ کا نشانہ خاص طور سے ''امرت بازار پترکا'' پر تھا۔ اس وقت یہ اخبار انگریزی اور بنگالی دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس قانون کا مقصد اس اخبار کے خلاف کاروائی تھی۔ مگر اس کے لاگو ہونے کے اگلے دن انگریز افسران جھانسا کھا کر حیرت میں پڑ گئے، کیوں کہ صبح انھیں پتہ چلا کہ اخبار کے اڈیٹروں نے سارے بنگالی اخباروں کو انگریزی زبان میں تبدیل کر دیا ہے۔

اسی طرح کا ایک دوسرا دلچسپ اور سنسنی خیز واقعہ 1905 میں کلکتہ یونیورسٹی کے کنوکیشن کے موقع پر ہوا۔ لارڈ کرزن نے اپنے کنوکیشن خطاب میں کہا کہ دراصل سچائی کا بہترین تصور بہت حد تک مغربی نظریہ ہے۔ بلاشبہ سچائی کو مشرق میں سب سے اونچا مقام ملا ہے، اس سے کہیں پہلے مغرب نے اسے یہی مقام دیا تھا[3] لارڈن کرزن کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ سچائی کا تصور انگریزوں نے ہی ہندوستانیوں کو دیا ہے۔

اگلے دن امرت بازار پترکا نے لارڈن کرزن کی اس تقریر کو اول صفحہ پر چھاپا، مگر اسی کے ساتھ ان کی کتاب ''ڈپرابلمس آف ایسٹ کے ایک جز کو بکس بنا کر یعنی چوکور خانہ میں شائع کیا۔ اس جز میں لارڈ کرزن نے اپنی کوریا کے سفر میں ایک جھوٹی بات بڑے فخر سے بیان کیا تھا۔ انھوں نے کوریائی سفارت خانہ کے صدر کو اپنی عمر چالیس سال بتائی تھی جبکہ اس وقت وہ صرف تینتیس (33) سال کے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو بتایا گیا تھا کہ یورپی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ صورت شکل سے وہ کم عمر کے لگتے ہیں تو انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ کوریائی صحت بخش آب وہوا ہے۔ اسی طرح کوریائی صدر

سے ہوئی بات چیت کے بارے میں کرزن نے لکھا کہ جب صدر نے ان سے دریافت کیا کہ کیا مہارانی وکٹوریہ سے ان کے نزدیکی رشتے ہیں۔ اس پر انھوں نے "نہیں" میں جواب دیا۔ یہ سن کر جب صدر کے چہرہ پر حیرانی کی اثرات دیکھے تو انھوں نے فوراً کہا کہ وہ اب بھی غیر شادی شدہ ہیں اور انھوں نے اپنے اس بے حیائی کے جواب سے صدر کا اعتماد پوری طرح حاصل کر لیا" 4

لارڈ کرزن کی اس سچائی سے پورے بنگال میں ان کی بڑی کرکری ہوئی، قدم قدم پر ہندوستانیوں کو وعظ ونصیحت پلانے والے اور ان کی بے عزتی کرنے کے شوقین لارڈ کرزن کی بڑی بدنامی ہوئی۔ انگلینڈ کے اخبار "ویکلی ٹائمس" نے اس خبر کو چھاپ کر لکھا کہ "معلوم پڑتا ہے کہ سچائی کی قدر کرنا لارڈ کرزن نے شادی کے بعد اپنی بیوی کی رہنمائی میں ہی سیکھا ہے یکی (Yankee) بی بیوں کی یہی خاصیت ہے۔ (کرزن کی بیوی امریکی لیڈی تھی)

قومی تحریک کے بانیوں میں سریندر ناتھ بنرجی پہلے شخص تھے جن کو صحافی کی حیثیت سے سب سے پہلے جیل بھجا گیا۔ یہ سزا ان کو ایک مقدمہ کے فیصلہ کے خلاف لکھنے کے لیے دی گئی۔ واقعہ یوں تھا کہ کلکتہ ہائی کورٹ میں جج نارس (Justice Norris) کے زیر سماعت ایک مقدمہ خاندانی مورت "سالگرام" کی بابت چل رہا تھا۔ مورت کی عمر طے کرنے کے لیے انھوں نے مورت کو عدالت میں پیش کروایا۔ اسے دیکھ کر انھوں نے کہا کہ اس کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی ہے۔ نارس کی اس کارروائی سے بنگالی ہندوؤں کے جذبات شدید مجروح ہوئے۔

بنرجی نے 2 راپریل 1883 کو اپنے "بنگالی" میں بہت سخت لہجہ میں اڈیٹوریل لکھا۔ انھوں نے نارس کا مقابلہ سترہویں صدی کے برٹش جج جیفریز اور سراگس (Jeffreys & Seroggs) سے کیا جو بحیثیت جج اپنے کارناموں کے لیے بدنام زمانہ تھے۔ انھوں نے لکھا کہ نارس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایسے اونچے عہدے کے لائق نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ اس طرح کے کم عقل اور سنکی جج کے لیے کچھ نہ کچھ کیا ہی جانا چاہیے۔

ایسا لکھنے کے لیے ہائی کورٹ نے انکو ہتک عدالت کے تحت مجرم قرار دیا جس کی سماعت پانچ ججوں کے بنچ نے کی، جس میں چار جج یورپی تھے اور ایک ہندستانی تھا۔ عدالت نے

بنر جی کو دو ماہ قید کی سزا دی۔ ہندستانی جج رومیش چندر مترا اس فیصلہ سے متفق نہیں تھے۔ ایسے فیصلہ سے عوام مشتعل ہو گئی۔ کلکتہ میں ہندستانی آبادی کے علاقہ میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ طلبا نے عدالت کے سامنے اشتعال انگیز مظاہرہ کیا۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور پولیس پر پتھراؤ کیا۔ ان دنگائیوں میں ایک نوجوان آسوتوش مکر جی تھے جو بعد میں کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ پورے کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں کے علاوہ لاہور، امرتسر، آگرہ، فیض آباد، پونا وغیرہ شہروں میں حکومت مخالف زبردست مظاہرے ہوئے۔ کلکتہ میں تو پہلی بار کھلے میدان میں بڑی بڑی میٹنگیں ہوئیں۔

پریس کی آزادی کے لیے جنگ آزادی کے دوران بال گنگادھر تلک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ جنگجو قومی لیڈر 1856 میں پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی ملک کی خدمت میں لگا دی۔ جی۔ جی۔ آگرکر (G.G.Agarkar) کے ساتھ انھوں نے 1881 میں مراٹھی زبان میں ''کیسری'' اور انگریزی میں 'مراٹھا' اخباروں کی اشاعت شروع کی۔ 1888 میں ان دونوں کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے ہاتھوں میں لے لی، اور ان کے توسل سے برٹش حکومت کے خلاف بیداری پیدا کر کے قومی تحریک چلانے کے لیے عوام کی بھر پور ہمت افزائی کی۔ تلک نڈر، بیباک، جوشیلے، اور شعلہ بیاں صحافی تھے۔ ان کی عام فہم اور سلیس زبان لوگوں کے دل و دماغ پر سیدھے اثر کرتی تھی۔

1893 میں لوگوں کے دلوں میں قومی جذبات ابھارنے کا ایک بہترین نادر موقع انھوں نے تلاش کر لیا۔ گن پتی تیوہار کے موقع پر انھوں نے اپنی تقریر اور گیتوں سے مہاراشٹر میں لوگوں کو حب الوطنی کا گھر گھر پیغام پہنچایا۔ شیواجی کے یوم پیدائش پر منائی جانے والی تقریب میں نوجوانوں کو آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کیا۔ اسی سال انھوں نے سوتی کپڑوں پر لگے ٹیکس کے خلاف سارے مہاراشٹر میں بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کی مہم چلائی۔ شاید قومی لیڈروں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ کہ قومی تحریک میں متوسط، نچلے طبقے، کسان، دستکار، اور مزدور بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اور اسی لیے انھوں نے ان سب کو کانگریس کے حلقہ میں شامل کرنا بہت ضروری سمجھا۔ 1847 کے شروع زمانہ میں انھوں نے

'کیسری' میں کانگریس کی زبردست تنقید کی۔اس وقت تک کانگریس نے اپنے حلقہ میں کسانوں کی شمولیت کونظر انداز کر رکھا تھا۔انھوں نے لکھا کہ'' ملک کو آزادی تبھی مل سکتی ہے جب کسان اپنے اوپر مسلط سستی اور کانگریس کسانوں کے تئیں اپنی بے توجہی چھوڑ دیں۔کسان ہی ہندوستان کی اصل جان ہیں۔ہم کو ان کی سستی اور کانگریس کی بے توجہی دور کرنا چاہئے۔اور اس کے لیے ہم کو اپنی شناخت پوری طرح ان میں ضم کر دینی چاہیے۔ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ ہمارے ہیں اور ہم ان کے ہیں۔جب ایسا ہوگا تبھی سرکار محسوس کرے گی کہ کانگریس سے نفرت کرنا ہندستانی قوم سے نفرت کرنا ہے۔اور تبھی کانگریس لیڈروں کی محنت کامیابی سے ہمکنار ہوگی'' 5

1897 میں پونا میں طاعون پھیل گیا۔سرکار نے ہر گھر کی تلاشی لی تاکہ طاعون زدہ لوگوں کو باقی لوگوں سے الگ لے جا کر اسپتالوں وغیرہ میں بسایا جا سکے۔طاعون کی وجہ سے کئی لیڈر پونا چھوڑ کر چلے گئے مگر تلک وہیں ڈٹے رہے اور راحت کام شرع کر دیا۔اس مہلک بیماری سے نمٹنے کی سرکاری کوششوں کی حمایت کرتے ہوئے انھوں نے ان سرکاری افسروں کو بخشا بھی نہیں جنھوں نے طاعون زدہ لوگوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا تھا۔ان افسروں کے خلاف عوام کا غصہ اس قدر بھڑکا کہ 27/جون 1898 کو چاپیکر برادران (Chaphekar) نے پونا کی پلیگ کمٹی کے چیرمین (Chairman) رینڈ (Rand) اور لفٹیننٹ آئرسٹ (Lt.Ayerst) کو قتل کر ڈالا۔

صرف طاعون راحت کام کے طریقوں سے ہی عوام حکومت سے ناراض نہیں تھی بلکہ 1894 سے ہی لوگوں میں لیوی، ٹیکس، وزرا اور قحط وغیرہ کی سرکاری پالیسی سے بےاطمینانی بڑھ رہی تھی۔نیشنلسٹ لیڈروں میں بھی لڑاکو رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا۔اور اسی لیے انھوں نے پریس کے ذریعہ حکومت پر تیکھے حملے کیے۔حکومت ایسے رجحانات پر قابو پانا چاہتی تھی۔اور پریس کو سبق سکھانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی۔مہاراشٹر میں تلک ایسی شخصیت تھے جو جنگجو قومی لیڈر کے علاوہ حکومت مخالف موثر صحافی تھے۔اس لیے حکومت کی ان پر نظر تھی۔رینڈ کے قتل سے ان کو بہانہ مل گیا۔سرکاری اخبار اور نوکر شاہی نے تلک کے خلاف طوفان بپا کر دیا اور رینڈ کے قتل کو لے کر یہ الزام لگایا کہ پونا کے برہمنوں نے تلک کی ہی قیادت میں قتل کی سازش رچی ہے۔

حکومت نے پوری کوشش کی کہ تلک کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھرایا جائے مگر ان کے خلاف اسے کوئی ثبوت نہیں ملا۔ یوں تلک نے اپنے اخبار کے ذریعہ اس قتل کی مذمت کر کے اس کو پاگل پن سے تعبیر کیا۔ پریس کی تیئں سرکاری رویہ کی تنقید کی اور کہا کہ پریس کا بنیادی کام یہی ہوتا ہے کہ وہ غلط باتوں کو اجاگر کرے اور لوگوں کو یہ بتائے کہ انھیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کس طرح لڑنا چاہیے۔ اس طرح سرکار نے تعزیرات ہند کی دفعہ 124A کے تحت حکومت کے خلاف باغیانہ تقریر کرنے کے لیے گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس طرح 27/ جولائی 1897 کو تلک گرفتار کر لیے گئے۔ جسٹس اسٹریچری (Justice Strachery) کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ جوری میں چھ یوروپی اور تین ہندستانی ممبران تھے۔ ''کیسری'' کے 15/جون کے شمارہ میں شائع دو خبروں کو بنیاد بنا کر ان پر الزامات عائد کر کے ملزم ٹھرایا گیا تھا۔ ایک تو تلک کی وہ تقریر تھی جس میں انھوں نے شیواجی کو افضل خاں کو قتل کرنے کے لیے حق بجانب ٹھرایا تھا۔ دوسری ایک نظم جس کا عنوان تھا 'شواجی کی بانی' یہ نظم کچھ روز قبل شواجی کے یوم پیدائش کی تقریب کے موقع پر ایک نوجوان کے ذریعہ پڑھ کر سنائی گئی تھی۔ شواجی کی بانی نظم میں اس نوجوان نے لکھا تھا کہ شواجی موجودہ عہد میں پھر پیدا ہو گئے ہیں اور وہ اپنے ہم وطنوں سے کہہ رہے ہیں ''اف! میں اپنی آنکھوں سے وطن کی بربادی دیکھ رہا ہوں .... ہمارے ملک سے لکشمی بدیسی اپنے کروں یعنی ہاتھوں (مراٹھی میں کر کا مطلب ٹیکس بھی ہوتا ہے) سے کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ہو رہے ہیں...... پاپی اکا بایا (بدنصیبی کی تمثیل) قحط پھیلا کر سارے ملک کو برباد کیے ہوئے ہے........ اور یہ سب دیکھتے ہوئے بھی راجے (لیڈران) کیسے زنانے بنے بیٹھے ہیں شطرنج کی مہروں کی طرح لاچار''۔

تلک نے افضل خان کے قتل کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، اسے حکومت نے مشتعل کرنے والی کارروائی تصور کیا اور یہ الزام لگایا کہ ریندٖ کا قتل اسی کا نتیجہ ہے۔ کل ملا کر تلک پر یہ الزام تھا کہ وہ اپنے اخباروں کے ذریعہ اس بات کی اشاعت کرتے رہے ہیں کہ انگریزوں کو ہندوستان میں بنے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بہر صورت ان سے نجات ملنی ہی چاہیے۔ ظاہر ہے تلک پر لگایا گیا یہ الزام غلط نہیں تھا، مگر اس وقت تک گاندھی عہد شروع نہیں ہوا تھا۔ اور یہ پالیسی

نہیں بنی تھی کہ مجاہدین آزادی اپنے اوپر لگے الزامات کی صفائی عدالت میں نہ دیں۔ ایثار وقربانی کی سیاست کا زمانہ بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تلک کو یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ قانون کے دائرہ میں ہی کر رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے حکومت کے ذریعہ لگائے گئے الزامات کی تردید کی اور کہا کہ بدیسی حکومت کے تئیں نفرت پھیلانے کی منشا ان کی بالکل نہیں تھی۔ اپنی پرانی طرز تحریر سے حکومت سے مقابلہ کرنے کی انھوں نے بے مثل جرائت اور بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ایک نئے قسم کی سیاست شروع کر رہے ہیں جس کو عوام کا اعتماد تبھی مل سکتا ہے، جب اس سیاست کو نئے قسم کی امارت دی جائے۔ یعنی جلد بازی سے کام نہ لے کر رفتہ رفتہ بنیاد مضبوط کی جائے۔ مکمل تبدیلی کی بات ابھی سے کہنے کا مطلب ہوگا حکومت کو جبر کرنے کی دعوت دینا۔ اور بغیر کسی منظم مخالفت کے یہ ظلم وستم اتنا شدید ہوگا کہ پورے منصوبہ کا قلع قمع کر کے عوام کو قائدین سے الگ تھلگ کر دے گا۔

کچھ دوستوں نے تلک سے اصرار کیا کہ وہ اپنی تقریر کے قابل اعتراض جملے واپس لے لیں اور معافی مانگ لیں، لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ''لوگوں کے درمیان میرا وجود (لیڈر کی حیثیت سے) اس بات پر منحصر ہے کہ میرا کردار کیا ہے اور کیسا ہے۔ ان کا یعنی حکومت کا یہ ہے کہ پونا کے لیڈروں کو کسی طرح بے عزت کیا جائے، لیکن میرے معاملہ میں کم سے کم وہ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ وہ مجھے سرکنڈہ (Reed) جیسا نازک نہ سمجھیں.....اس کے علاوہ آپ کو اس بات کا لحاظ ہونا چاہیے کہ ہم سب جنتا کے خادم ہیں۔ اگر ہم ایسے نازک وقت پر ہمت سے کام نہیں لیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جنتا کے ساتھ دغا کر رہے ہیں، ان کو مایوس کر رہے ہیں'' [6]

جسٹس اسٹریچری اور جوری کے یورپی ممبران قانونی شرارت کرنے پر تلے تھے۔ اسی کے تحت جسٹس اسٹریچری نے سیاسی بے چینی کی تعریف (Definition) یہ دی کہ ''جس میں پریم کی کمی ہو'' اور جس میں حکومت کے تئیں مجموعی طور سے فطرۃً نفرت، دشمنی، بے وفائی اور اسی طرح کی دوسری برائیاں موجود ہوں۔ اس طرح جوری نے چھ، تین ووٹ سے تلک کو مجرم قرار دیا۔ تینوں ہندستانی جوری کے ممبروں کی رائے میں تلک نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جج نے تلک کو

اٹھارہ ماہ کے لیے قید با مشقت کی سزا سنائی۔ اور یہ سزا ان کو اس وقت دی گئی جب وہ بمبئی لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر تھے۔ اسی طرح بمبئی پریسیڈنسی کے کئی دوسرے اڈیٹروں کو بھی سخت سزائیں دی گئیں۔ تلک کی قید کے خلاف ملک بھر میں زبردست احتجاج ہوا۔ قومی اخبارات، سیاسی تنظیمیں یہاں تک کہ تلک کے اعتدال پسند ناقدین بھی پریس کی آزادی پر ہوئے حملہ کے خلاف حرکت میں آ گئے۔ کئی اخباروں نے اپنے پہلے صفحہ پر چاروں طرف کالی پٹیوں کے باڈر بنا کر چھاپے، کئی دوسروں نے خاص ضمیمے نکال کر پریس کی آزادی کے سلسلہ میں تلک کے ذریعہ کی گئی کارگزاری کی تائید وتعریف کی۔ لندن میں اس وقت مقیم ہندوستانیوں کو خطاب کرتے ہوئے دادا بھائی نوروجی نے کہا کہ ''برٹش سرکار اب روسی ژار شاہی طریقے اپنانے لگی ہے۔ پریس کی آواز بند کرنے کا مطلب اس کی ہلاکت ہے''[7]

اس طرح تلک راتوں رات عوام کے مقبول ترین آل انڈیا لیڈر ہو گئے۔ ان کو لوک مانیہ کے خطاب سے نوازا گیا۔ وہ خودفروشی کی جیتی جاگتی مورت تھے۔ وہ اب ایسے ہیرو تھے جن کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ جب 1897 میں اراوتی کے کانگریس اجلاس میں سریندر ناتھ بنرجی نے تلک کے بارے میں دل پگھلانے والی بات کہی تھی کہ ''آج سارا ملک رو رہا ہے'' تو سارے لوگ باادب کھڑے ہو گئے، اور ان کی تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے سارا ماحول گونج اٹھا[8]

1898 میں برٹش سرکار نے دفعہ 124A کو ترمیم کر کے تعزیرات میں نئی دفعہ 153-A کا اضافہ کیا۔ اس کے تحت اگر کوئی شخص حکومت کی ہتک وتوہین کرتا ہے یا ملک کے مختلف طبقوں یعنی انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلاتا ہے تو وہ مجرم ہوگا۔ اس کارروائی کے خلاف ایک بار پھر ملکی سطح پر احتجاج شروع ہوا۔

سودیسی اور بائیکاٹ تحریک جس پر ہم تفصیل سے دسویں باب میں روشنی ڈالیں گے کو مدنظر رکھ کر انگریزوں نے ظلم وستم کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک بار پھر نوجوان مایوس ہو کر مشتعل ہو اٹھے۔ اسی مایوسی سے انھوں نے دہشت گردی اور ہنسا کا راستہ اختیار کیا۔ اسی کے نتیجہ میں سرکاری افسروں پر بموں سے حملے کی کئی وارداتیں ہوئیں۔ سرکار کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے اخباروں کو پھر اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ پریس پر قابو پانے کے لیے کئی قانون وجود میں آئے۔ بہت سے اخباروں

اور اڈیٹروں کے خلاف مقدمے چلائے گئے۔ پریس کی آزادی تقریباً چھین لی گئی۔ ایسے ماحول میں یہ ناممکن تھا کہ تلک کی سرزنش نہ ہو کیوں کہ بنگال کے باہر وہی تو بائیکاٹ کے روحِ رواں تھے۔

تلک نے بموں کے استعمال یعنی ہندستانی ماحول میں تشدد کے داخلہ کے سلسلہ میں کئی مضامین تحریر کئے۔ انھوں نے تشدد اور انفرادی قتل کی زوردار تردید کی۔ انھوں نے ایسے رجحان کو ''زہریلا درخت'' بتایا۔ مگر اس کے ساتھ انھوں نے اس کے لیے حکومت کو بھی ذمیدار ٹھہرایا، جو لوگوں کی جد و جہدِ آزادی کو بڑی بے رحمی سے کچل رہی ہے۔ ایسے ماحول میں تشدد چاہے جتنا افسوسناک ہو، ضرروری ہو جاتا ہے۔ ایک تحریر میں انھوں نے مزید کہا کہ ''سرکاری افسران جب بغیر کسی وجہ لوگوں کو ڈرانے اور دھمکانے لگیں اور ان میں ناامیدی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگیں، تب بم کی آواز ان کو اور سرکار کو اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ لوگ بے حس و جان بیٹھے رہنے اور جبر و استحصال کو برداشت کرتے رہنے کی حد سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور اب وہ حکومت کی ظالمانہ پالیسی کی قدر کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہیں'' 9

24 / جون 1908 کو ایک بار پھر اُنہی مضامین کی اشاعت کے لیے حکومت کے خلاف غداری کا الزام لگا کر ان کو گرفتار کیا گیا۔ تلک نے ایک بار پھر زبردست ہمت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس گرفتاری کے کچھ روز قبل ان کے ایک پولیس دوست نے ان کو ہونے والے خطرے سے آگاہ کر کے حفاظتی اقدام کرنے کا مشورہ دیا تھا، جسے سنکر تلک نے ہنس کر ان سے کہا تھا کہ ''حکومت نے تو پورے ملک کو ہی جیل بنا رکھا ہے۔ اور ہم سبھی قیدی ہی تو ہیں۔ جیل جانے کا مطلب تو صرف یہ ہوا کہ آدمی بڑی کوٹھری کے بجائے چھوٹی کوٹھری میں بند کر دیا جائے'' 10

انھوں نے عدالت میں ایک بنیادی سوال رکھا تھا کہ ''یہاں سوال تلک اور غیر تلک کا نہیں ہے اصل سوال یہ ہے کہ سرکار واقعی پریس کی آزادی کے تئیں ایماندار ہے، کیا وہ ہندوستان میں بھی پریس کو اتنی آزادی دینے کے لیے تیار ہے جتنی اسے انگلینڈ میں سے حاصل ہے'' 11

جوری کی عدالت نے دو ہندستانی ججوں کی مخالفت کے باوجود تلک کو مجرم ٹھرایا۔ کچھ نے عدالت سے کہا کہ قسمت کو بنانے اور بگاڑنے والی کوئی دوسری ہی اعلیٰ و افضل ذات ہے۔ اس لیے جس نیک کام کے لیے میں جد و جہد کر رہا ہوں وہ کام مجھے قید کیے جانے پر اور زیادہ ترقی

کرے گا'' جسٹس ڈیور (Davar) نے ان کو چھ سالوں کے لیے کالا پانی کی سزا سنائی۔ اور کچھ روز ہی بعد لوک مانیہ تلک کو برما میں مانڈلے (Mandalay) بھیج دیا گیا۔

اس واقعہ کا بہت وسیع پیمانہ میں ردعمل ہوا۔ اخباروں نے اعلان کیا کہ وہ سب تلک کے نقش قدم پر چل کر پریس کی آزادی کے لیے سرگرم رہیں گے۔ 22/جولائی یعنی جس روز تلک کو سزا سنائی گئی تھی، اس روز بمبئی کے سارے بازار بند رہے اور یہ ہڑتال ایک ہفتہ تک چلتی رہی۔ بمبئی کے سبھی 80 کپڑا ملوں اور ان کے مزدوروں نے چھ روز کی ہڑتال کی۔ پولیس نے مزدوروں کو کام پر واپس آنے کے لیے مجبور کیا مزدوروں نے مزاحمت کی ان کے اور پولیس کے درمیان کئی جگہوں پر تصادم ہوئے۔ حکومت کو ان پر قابو پانے کے لیے فوج بلانی پڑی۔ سولہ مزدوروں کی موت اور پچاس مزدوروں کے مجروح ہونے پر اس کشمکش کا خاتمہ ہوا۔ مزدوروں کی اس جدوجہد کا استقبال کرتے ہوئے لینن (Lenin) نے کہا کہ ''ہندوستان کا مزدور طبقہ بھی سیاست میں شرکت کرنے لگا ہے''12

تلک کے مقدمہ کی گونج ان کے سیاسی وارث گاندھی جی کے خلاف چلے غداری کے مقدمہ میں سنائی پڑتی ہے۔ گاندھی جی نے ''ینگ انڈیا''(Young India) میں کچھ مضامین لکھے تھے۔ ان مضامین کے لیے برٹش سرکار نے 1922 میں ان کو دفعہ 124-A کے تحت غداری کا ملزم ٹھہرایا اور اس طرح ان کو بھی تلک کی طرح چھ سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی۔ جب جج نے ان سے کہا کہ ان کا جرم تلک ہی کی طرح کا ہے اس لیے ان کو بھی ویسے ہی سزا دی جاتی ہے۔ تب گاندھی جی نے کہا کہ '' آپ لوگوں نے لوک مانیہ تلک کے خلاف چلے مقدمہ کو دوہرا کر میری عزت افزائی کی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے یہ سب سے زیادہ فخر و عظمت کی بات ہے کہ میرا نام بھی ان کے نام کے ساتھ جڑ گیا ہے''12

دونوں کے مقدموں میں صرف اتنا فرق تھا کہ گاندھی جی نے اپنے خلاف لگے الزامات قبول کر لیے تھے جبکہ تلک نے سرے سے مقدمہ کی ہی تردید کی۔ دراصل یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ 1908 سے 1922 تک کے آتے آتے قومی تحریک کی فطرت اور طریقہ کار میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ سیاست اور صحافت میں ہوئے ایسے تغیرات کے لیے تلک کا تعاون قابل ستائش ہے۔

باب۔9

قانون سازکونسلوں میں نشرواشاعت

1920 تک ہندوستان کی قانون ساز کونسلوں کو حقیقت میں کوئی بھی اختیار حاصل نہیں تھا۔ تاہم ان میں محبان وطن (Nationalists) کے ذریعہ کی گئی کارگزاریوں نے تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔

1861 کے انڈین کونسل ایکٹ نے گورنر جنرل کے انتظامی مجلس شوریٰ (Executive Council) کو قانون سازی کے لیے اس کا دائرہ بڑھادیا۔ اس کے تحت گورنر جنرل اب اپنی انتظامی مجلس شوریٰ میں چھ سے بارہ ممبران اور بڑھا سکتے تھے، جن میں کم سے کم نصف غیر سرکاری اشخاص ہندستانی یا انگریز ہونے چاہیے تھے۔ اس مجلس کو شاہی قانون ساز کونسل (Imperial Lagislative Council) کا نام دیا گیا۔ اس مجلس کو کچھ بھی اختیار حاصل نہیں تھا۔ سرکاری اجازت کے بغیر یہ کسی بجٹ پر نہ بحث کرسکتی تھی، نہ ہی مالی قدم اٹھاسکتی تھی اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی سوال پوچھ سکتی تھی۔ اس لیے اس کا مقابلہ کسی ابتدائی پارلیمنٹ سے بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بس اسے پارلیمنٹ ثابت کرنے کے لیے اس کے اجلاس سال میں

صرف پچیس (25) دن ہی ہوتے تھے اور یہ سلسلہ 1892 تک چلتا رہا۔

1858 سے پہلے کی طرح ہندوستان کی انگریزی حکومت مطلق العنان ہی بنی رہی اور یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا، بلکہ اس کے پیچھے سوچی سمجھی پالیسی کام کر رہی تھی۔ 1861 کا انڈین کونسل بل پیش کرتے ہوئے ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ، چارلس ووڈ (Charles Wood) نے کہا کہ ''سارے تجربات بتاتے ہیں کہ جہاں بھی کوئی طاقتور قوم دوسری قوم پر حکمرانی کرتی ہے تو حکومت کی سب سے ملائم شکل مطلق العنانیت (Despotism) ہوتی ہے''۔ ایک سال بعد اس نے وائسرائے الگن (Elgin) کو لکھا کہ ''ہندوستان میں جو حالات ہیں ان کے تحت یہاں کے لیے موزوں ترین حکومت ملک وطن کے زیر تسلط قائم مطلق العنان حکمرانی ہی ہے''1 اور ملک وطن کی طرف سے ایسی ہی حکومت مطلق العنانیت کی ساری خصوصیات کے ساتھ 1947 کے پہلے تک ہندستان میں قائم رہی۔

اس قانون ساز کونسل میں ہندستانی ممبروں کا کیا کردار تھا؟ حکومت نے ان کو اس کا ممبر صرف اس لیے بنایا تھا کہ ہندستانی رجحانات کا علم اس کو ہو سکے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بہت سے برٹش افسروں اور سیاست داں لوگوں کو یہ گمان تھا کہ 1857 کی بغاوت کے پیچھے ایک وجہ یہ تھی کہ حکمراں طبقہ کے لوگ ہندوستانیوں کے خیالات سے بے خبر تھے۔ عملی اعتبار سے اس کا یہ مقصد بھی پورا نہیں ہو پا رہا تھا کیونکہ ہندستانی ممبروں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی تھی۔ 1862 سے 1892 تک صرف چالیس ہندستانی ہی نامزد ہو پائے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی ممبری کے لیے گھوم پھر کر وہی رجواڑے یا ان کے اہل کاران، زمیندار، ساہوکار یا سبکدوش سرکاری افسران ہی نامزد کیے جاتے رہے۔ تھوڑے سے سیاسی اشخاص اور آزاد خیال دانشوران جیسے سید احمد خاں (82-1878) کرسٹو داس پال (1883) وی۔ این۔ مانڈ لک (V.N.Mandlik) (87-1884) کے ایل فلکر (91-1890) اور راس بہاری گوش (1892) کو ممبری دی گئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ نہ ہندستانی عوام کی نمائندگی کرتے تھے اور نہ اٹھتی ہوئی قومی لہر کی۔ اس لیے بلاشبہ وہ ہر طرح سے سرکار کے ساتھ تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بلرامپور کے راجہ دگ دجے سنگھ کی بابت ہے جن کو دو بار کونسل کا ممبر بنایا گیا تھا

اور جو انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے۔ جب ان کے ایک رشتہ دار نے ان سے دریافت کیا کہ آپ اپنے فیصلے کیسے کرتے ہیں کہ ووٹ کدھر جانا چاہیے، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں وائسرائے کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ جب وہ ہاتھ اٹھاتے ہیں تو میں بھی اٹھا دیتا ہوں، جب وہ گراتے ہیں تو میں بھی گرا دیتا ہوں۔

یوں کونسل کے ہندستانی ممبر بہت کم ووٹ کرتے تھے۔ جب دیسی پریس بل کونسل میں پیش ہوا تو صرف ایک ہی ہندستانی ممبر وہاں حاضر تھا۔ زمینداروں کی اکثریت پر مشتمل برٹش ایسوسی ایشن کے لیڈر مہاراجہ جوتیندر موہن ٹیگور نے بل کی موافقت میں ووٹ دیا۔ 1885 میں زمینداروں کے دو ترجمانوں نے بنگال کاشتکاری بل کی کاشتکار موافق باتیں بھی ختم کردیں، جبکہ سریندر ناتھ بنرجی جیسے قومی لیڈر اسے کاشتکاروں کے حق میں کرنے کے لیے تحریک چلا رہے تھے۔ 1882 میں کلکتہ کے بڑے تاجروں کے دو نمائندوں، جتیندر موہن ٹیگور اور درگا چرن لہا نے نمک ٹیکس میں کمی کی مخالفت کی، وہیں ساہوکاروں اور مختلف پیشوں میں لگے لوگوں پر لائیسنس ٹیکس میں کمی کی انھوں نے سفارش کی[2] جبکہ قومی لیڈروں کی مانگ اس کے بالکل برعکس تھی۔ 1888 میں بڑے زمینداروں کے نمائندہ پیری موہن مکھرجی اور ساہوکاروں کے ترجمان دنشا پٹیٹ (Dinshaw Petit) نے ہندوستان میں برٹش سرکار کی نمائندگی کرنے والے غیر سرکاری برٹش ممبروں کے ساتھ ہوکر نمک پر ٹیکس بڑھانے کی تائید کی[3]

اس وقت تک قومی لیڈران نمک ٹیکس کی مخالفت میں کافی سرگرم ہو چکے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا ردعمل بڑا سخت تھا۔ اخباروں میں اور کانگریس پلیٹ فام سے انھوں نے مکھرجی اور دنشا پٹیٹ کو بگلا بھگت (Gilded sham) اور "صورت حرام" کے نام سے متصف کیا۔ انھوں نے ان کے ووٹ کرنے کے کردار کو اپنے دعویٰ کے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ موجودہ کونسل ہندستانی نظریات کی ترجمانی بالکل نہیں کرتی ہے۔ 1890 کے کانگریس اجلاس میں مدن موہن مالویہ نے کہا کہ "ہم تو یہ چاہیں گے کہ کونسلوں میں غیر سرکاری ممبر مطلق نہ رہیں جن کا کوئی تعلق عوام سے نہیں ہے۔ اور جو اس کے تئیں غیر ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں"۔ مکھرجی اور پٹیٹ کو 'معزز حضرات' کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے بڑے خطیبانہ انداز میں انھوں نے سامعین سے

دریافت کیا کہ ''قابل احترام، حاضرین! آپ لوگوں کی کیا رائے ہے کہ کونسل ممبروں کے چناؤ میں اگر لوگوں کی کچھ بھی آواز ہوتی تو کیا ایسے ممبروں کی تقرری ہوسکتی تھی؟ سامعین فوراً بول اٹھے ''نہیں، نہیں، کبھی نہیں''[4]

حالانکہ شروع دور کے نیشنلسٹوں کا خیال تھا کہ ہندوستان کو خود حکمرانی ملنی چاہیے، لیکن سرکار کی تشکیل اور ڈھانچہ کے بارے میں کوئی بھی سیاسی مشورہ دیتے وقت وہ بہت چوکنا رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کو ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ حکومت ان کی کارگزاری کو غداری قرار دے کر ان پر ظلم توڑنا شروع کردے گی۔ اس کے لیے 1882 تک ان کی مانگ صرف یہی بنی رہی کہ کونسلوں کا دائرہ وسیع کیا جائے اور ان کے طرز عمل کی اصلاح کی جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کونسلوں میں منتخب ہندستانی ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور بجٹ پر غور کرنے، اس پر فیصلہ لینے، روزمرہ کے سرکاری کاموں کے بارے میں سوال پوچھنے اور تنقید کرنے کے اختیارات میں اضافہ ہو۔

نیشنلسٹوں کی جدوجہد نے حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ 1892 کے انڈین کونسل ایکٹ کے ذریعہ قانون سازی کی کارکردگی میں کچھ ترمیم کرے۔ شاہی یعنی مرکزی (Imperial) اور صوبائی (Provincial) قانون ساز کونسلوں میں ممبروں کی تعداد چھ سے دس اور پھر دس سے سولہ کردی گئی۔ ان میں سے کچھ کا انتخاب میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے ذریعہ ہوتا تھا مگر ممبروں کی سرکاری اکثریت وہی رہی۔ ان کو یہ اختیار دیے گئے کہ وہ سالانہ بجٹ پر بحث کرسکیں، مگر ان کو اس معاملہ میں ووٹ دینے یا اس میں ترمیم پیش کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ سوالات تو کرسکتے تھے مگر جوابات آنے پر مزید سوالات اور نہ ہی جوابات پر بحث کرسکتے تھے۔ بہرحال، اس طرح اصلاح شدہ (Reformed) شاہی قانون ساز کونسل کے اجلاس 1909 تک سال میں تیرہ دن کی اوسط سے ہوتے رہے اور غیر سرکاری ہندستانی ممبروں کی تعداد چوبیس میں صرف پانچ ہی رہی۔

نیشنلسٹوں کو 1892 کے ایکٹ سے بڑی مایوسی ہوئی۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی مانگوں کا مذاق سا اڑایا گیا ہے، کیونکہ کونسلیں اب بھی بے بس ولاچار تھیں، ان پر حکومت کا ہی

تسلط تھا۔ بہر حال انھوں نے یہ آواز بلند کی کہ غیر سرکاری ممبروں کی کونسلوں میں اکثریت ہو جس سے بجٹ پر بحث کرنے اور مالیات پر کنٹرول کا ان کو اختیار مل جائے۔ انھوں نے نعرہ دیا کہ ''بغیر نمائندگی کے کوئی ٹیکس نہیں''۔ بہت سے لیڈروں جیسے دادا بھائی نوروجی نے 1904 میں گوپال کرشن گوکھلے نے 1905 میں اور لوک مانیہ تلک نے 1906 میں کناڈا اور آسٹریلیا کے کلونیل ملکوں کے طرز پر ہندوستان کو خود حکمرانی دینے کی مانگ شروع کی۔

1892 ایکٹ کا خاکہ تیار کرنے والے لارڈ ڈفرن، برٹش سیاست داں اور نوکر شاہ یہ سوچتے تھے کہ ہندوستان کے تیز طرار لیڈروں کو کونسل کے سیاسی ڈھانچہ میں شامل کر لینے سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اس میں لکچر بازی سے اپنا سیاسی بخار اتارتے رہیں گے۔ وہ تو حقیقت سے واقف ہی تھے کہ کونسل کے ممبروں کو اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ اس طرح وہ صرف لچھے دار تقریریں تو کر سکتے ہیں مگر نوکر شاہی ان پر کوئی توجہ نہیں دے گی۔

لیکن ایسی حکمت عملی بنانے والے برٹش دانشوروں کو ہندوستان کے لیڈروں کی سیاسی بصیرت و قابلیت کا اندازہ مطلق نہیں تھا۔ بے جان و بے بس کونسلوں کی تشکیل صرف سرکاری فیصلوں اور پالیسیوں کی تائید کرنے والی مشن کی حیثیت سے کی گئی تھی، اور جس کا مقصد ہندستانی لیڈروں کو خوش کرنے کے لیے بہلانے والے کھلونے کی طرح تھا پھر بھی ان میں اپنی بات کہنے کے لیے ان کو ایک ایسا اسٹیج مل گیا جہاں وہ نوکر شاہی کی خامیوں اور کمزوریوں کو بڑی ایمانداری سے اجاگر کرتے، عوام کی پریشانیاں پیش کرتے، قریب قریب ہر ایک سرکاری پالیسی اور پروگرام کی تنقید و مخالفت کرتے، لوگوں کے بنیادی مسائل خاص طور سے پبلک فائنس کو پیش کرتے، سرکار کے کاموں اور پالیسیوں کی بخیہ ادھیڑتے، ان کی منشا ظاہر کرتے، اور ان کے متوقع نتائج بتاتے۔ کونسلوں میں خود کو گم نہ کرنے کے بجائے انھوں نے ان کا استعمال اپنی سیاسی حیثیت بڑھانے اور قومی تحریک کو مستحکم کرنے میں کیا۔ اب ''سیفٹی والو'' (Safety Valve)'' قومیت کی نشر اشاعت کے وسیلہ و ذریعہ کی شکل میں بدل گیا۔ انھوں نے اپنی خالص ہمت، منطقی صلاحیت، بیباک تنقید، باریک علم و دانش سے تفصیلی جزئیات (Datas) کو پیش کر کے کونسلوں میں سرکار کے خلاف ایسا مورچہ کھولا جس کا واحد مقصد اس کی سیاسی و اخلاقی قوت کو ختم کرنا اور

سلطنت مخالف جذبات کو ہوا دیتا تھا۔

ان کی تقریروں کی اشاعت بڑی تفصیل سے اخباروں میں ہونے لگی، جس کے نتیجہ میں لوگوں کی دلچسپیاں کونسلوں کی کارروائی کے بارے میں بڑھنے لگیں۔

ان نئی کونسلوں نے کئی معروف قومی لیڈروں کو موہ لیا۔ کانگریس کے وہ لیڈر جنھوں نے صوبائی اور مرکزی کونسلوں میں 1893 سے 1909 تک خدمات انجام دیا تھا ان کے نام اس طرح ہیں: بنگال میں سریندر ناتھ بنرجی، کالی چرن بنرجی، آنند موہن بوس، لال موہن گھوش، ڈبلو۔ سی۔ بنرجی اور داس بہاری گھوش، مدراس سے پی آنند چارلو، شنکرن ایر اور وجے راگھو چیریار، یو۔ پی۔ سے مدن موہن مالویہ، اجودھیا ناتھ، اور بشمبھر ناتھ، بمبئی سے بی۔ جی۔ تلک، فیروز شاہ مہتا، آر۔ ایم۔ سیانی، چمن لال سیتل واڈ، این۔ جی۔ چندرور کر اور جی۔ کے۔ گوکھلے، اور سینٹرل صوبوں سے جی۔ ایم۔ چِٹنویس۔

جن ہستیوں نے کونسلوں کا کارآمد استعمال کر کے لوگوں میں نئی روح پھونکنے میں نمایاں کردار ادا کیا وہ گوپال کرشن گوکھلے، اور فیروز شاہ مہتا تھے۔ سیاسی اعتبار سے یہ دونوں حضرات اعتدال پسند تھے۔ مگر برٹش نوکر شاہی سے نفرت کے لیے خصوصاً مشہور تھے۔

فیروز شاہ مہتا 1845 میں بمبئی (ممبئی) میں پیدا ہوئے تھے 1860 کی دہائیوں میں لندن میں وکالت پڑھنے کے دوران دوہ داد بھائی نوروجی کے زیر اثر آئے۔ وہ بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن اور انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں سے تھے۔ تقریباً 1890 کی دہائیوں کے وسط سے اپنی موت 1915 تک وہ انڈین نیشنل کانگریس پر چھائے رہے اور اکثر ان پر یہ الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ تنظیم کو اپنے رعب وداب میں رکھتے ہیں۔ وہ غضب کے مقرر تھے۔ ان کی زبان صاف و سلیس، طنز ومزاح سے پر اور ادبی چاشنی و بیباکی سے لبریز اور تیر ونشتر کی طرح دلوں میں چبھتی تھی۔

مرکزی قانون ساز کونسل میں مہتا کی پہلی زوردار تقریر جنوری 1895 میں ہوئی۔ اس وقت 1861 پولیس قانون میں ترمیم بل کونسل میں زیر غور تھا، جس کے ذریعہ کسی علاقہ میں سزا کے طور پر پولیس فورس تعینات کرنے اور اس علاقہ کے ساکنان کے منتخب طبقوں سے اس کا خرچ وصولنے کے لیے مقامی افسران کی طاقت میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔ مہتا نے کہا کہ یہ طریقہ

انتظام بنائے رکھنے کے نام پر عدالتی تحقیقات کے بغیر، لوگوں کو مجرم بنانے اور سزا دینے کی کوشش ہے، لوگوں کے شہری حقوق کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''اس سے گیا گذرا، ہمت شکن، ناجائز اور ناقص کسی دوسرے قانون کا تصور میں نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ سمجھنا بالکل ہی ناممکن نہیں ہے کہ یہ قانون ان گھٹیا پذیر قانونوں کا ایک جز ہے جو انتظامیہ کے ان افسروں کو بے انتہا محبوب ہوتے ہیں جو نہ اس سائنسی تحقیقات کو پہچانتے ہیں اور نہ پہچانیں گے کہ سزا دینے اور جرائم کو دبانے کا کام عدالتی کارروائی کے قبضہ واختیار میں ہونا چاہیے، تبھی بے گناہ ظلم وزیادتی سے محفوظ رہ سکتے ہیں''۔ قانون کے لاگو کرنے کی ذمہ داری جن افسروں کے سپرد کی گئی تھی، ان کی صلاحیت اور غیر جانبداری پر شبہ کرتے ہوئے مہتا نے کہا کہ ''اس بات پر یقین کرنا بے سود ہوگا کہ وہ اپنے طبقہ کی فطری کمزوریوں مثلاً بغض وکینہ اور حسد سے آزاد ہوں گے''۔5 اس طرح کا لب ولہجہ آج سخت نکتہ چینی کرنے والا نہیں مانا جائے گا مگر اس کا اثر ان لوگوں پر بم کی طرح ہوا جو خود کو تنقید سے بالاتر مانتے تھے۔ ایک دیسی آدمی کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ ''افسروں کے نام وعزت پر انگلی اٹھا سکے اور وہ بھی باعظمت ایوان کے اندر۔ فائنس ممبر جیمس ویسٹ لینڈ (James Westland) ایوان میں کھڑے ہوئے اور اس ''نئے خیال'' کی زوردار تردید کی جس کو مہتا نے کونسل میں پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کہا کہ مہتا نے اس افسر شاہی کے خلاف افترا پردازی اور تہمت سازی کی ہے جس نے سلطنت کی نوتعمیر کرنے اور اس کو مستحکم بنانے میں ''سب سے امتیازی خدمت'' انجام دیا ہے۔ اور ایک طبقہ کی حیثیت سے اس کو اس طرح متعصب، جانبدار اور نااہل بتایا ہے جو انصاف کرنے کا معمولی تقاضا بھی پورا نہیں کر سکتا ہے۔ مہتا کی باتیں کونسل کے اُس وقار کو گراتی ہیں جو اس نے بڑے جتن سے حاصل کی ہے''۔6 دوسرے لفظوں میں مہتا پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ کلونیل قانون ساز ایوانوں کے فرائض منصبی میں دخل اندازی اور ان کی کردارکشی کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔

لیکن ہندوستانیوں کا ردعمل اس کے برعکس تھا۔ فیروز شاہ مہتا کو ہندوستان کے سیاسی حلقہ میں بھرپور تائید ملی یہاں تک کہ تلک جیسے ان کے سیاسی رقیب نے اس بات کو بلاجھجک قبول کر لیا کہ ''ایک نیا خیال'' کونسلوں میں داخل ہو گیا ہے۔ لوگ پریس کے پلیٹ فارم سے

ایسی باتیں سننے کے عادی تھے۔ مگر پرعظمت اور باوقار کونسل ہال میں ایسی بیباک اور تیکھی تنقید گونجے گی، ان کے لیے نئی بات تھی۔ لاہور سے نکلنے والے ٹریبون (Tribune) نے لکھا ''عوام کی وہ آواز جو ایوانوں کے باہر طویل مدت سے نہیں آ پا رہی تھی، وہی آواز انتخاب کے کھلے دروازے کے اندر داخل ہو گئی ہے''......... جناب مہتا لوگوں کے نمائندہ کی حیثیت سے بولتے ہیں......... سر جیمس ویسٹ لینڈ کا احتجاج اس نوکر شاہی کی چیخ و پکار ہے جو اپنے ہی اکھاڑے میں چت کر دی گئی ہو''۔7

فیروز شاہ مہتا جب بھی کونسل میں بولتے تھے، تو ان کے کلام کی شوخی اور طنز و طعن سے نوکر شاہی تلملا اٹھتی تھی۔ یہاں ہم ان کی کچھ استادانہ تقریر کی ایسی مثالیں دینا چاہتے ہیں جنھوں نے ہندوستانیوں کے دلوں کو خوشی سے مگن کر دیا تھا۔ لیکن برطانوی سرکار اور اس کی نوکر شاہی جو اس سے بھی زیادہ پاک دامن تھی، کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اس وقت اونچی تعلیم اور تعلیم یافتہ لوگ انگریز نوکر شاہی کے لیے ہوّا کے مانند تھے اور آج بھی وہ لوگ سلطنت نواز رویہ والے مؤرخین کے لیے ہوّا بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ اونچی تعلیم ایسے بابوؤں کو جنم دے رہی تھی جو ''غیر مطمئن'' اور سرکار مخالف ہو جاتے تھے۔ اس لیے حکومت نے اونچی تعلیم پر خرچ ہونے والے بجٹ میں کٹوتی کرنے کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ اس نے یہ تأثر دیا کہ اونچی تعلیم جس کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے، پر خرچہ کرنے سے عوام کی پرائمری تعلیم بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

اونچی تعلیم کی اشاعت کو روکنے کے پیچھے برٹش نوکر شاہی کی کیا منشا تھی؟ اس کا انکشاف کرتے ہوئے مہتا نے کہا کہ ''محکوم کو حاکم کے معیار'' تک اٹھانے کی بات تو بہت اچھی ہے مگر محکوم جب آپ کی ایڑی کو بہت قریب سے دبائے گا تو دولتی مارنے کی چاہت روک پانا آپ کے لیے تقریباً مشکل ہو جائے گا، یہی انسانی فطرت ہے اور تلخ تجربات بھی یہی بتاتے ہیں۔ اسی وجہ سے زیادہ تر نوکر شاہ ہر ایک ہندستانی کالج کو غداروں کی نرسری مانتے تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ''کالج جتنے کم ہوں اتنا ہی بہتر ہے''۔8

ایک دوسری تقریر میں انھوں نے سرکار کی اس منشا کا ذکر کیا کہ وہ اونچی تعلیم کے فنڈ کو پرائمری تعلیم کی اشاعت کے لیے کیوں منتقل کرنا چاہتی ہے؟ اس پر بولتے ہوئے انھوں نے کہا

کہ ''مجھے ایک لمبی فیملی کے اچھے بھلے باپ کی یاد آتی ہے جو اکثر شام کو راستے میں مے خانہ کی طرف نکل جاتا تھا۔ جب بچوں کی ماں نے اس سے بڑے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرنے کو کہا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا کہ آپ کو سوچنا چاہیے کہ گھر میں جب چھوٹے بچوں کے لیے کھانے و کپڑے کی قلت ہے تو بھلا ایسی حالت میں آپ کی یہ بات کیا مناسب ہے؟ وہ بیچاری اس سچائی کو کیسے نظر انداز کر سکتی تھی جب بھوکی نگاہیں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں، لیکن اس کے ساتھ یہ تلخ بات بھی اس کے ذہن میں آئی کہ اگر اس رحم دل باپ کو شراب اور جوا میں تھوڑا کم خرچ کرنے کے لیے راضی کر لیا جائے تو بھوکے بچوں کو نہ صرف کھانا مل سکتا ہے بلکہ ان کو اچھی تعلیم بھی دلائی جاسکتی ہے۔ معزز حاضرین! میں یہ بھی عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ جب ہم کو غریب عوام کے لیے حفظان صحت، علاج، صاف پانی، اور پرائمری تعلیم جیسی ضرورتوں کی یاد دلائی جائے تو ہم بڑے ادب واحترام سے کہتے ہیں کہ ان ساری مدوں مع اونچی تعلیم کے لیے ضروری رقم مہیا ہوسکتی ہے، اگر ملک کے موجودہ وسیع اور تیزی سے بڑھتے ہوئے وسائل کو طرح طرح کی عیش وعشرت کی چیزوں جیسے مہنگے مکانات ٹھاٹھ باٹھ کے دلکش فرنیچر، موسم گرما میں پہاڑوں پر رہائش، سرحدی علاقوں میں سیر وتفریح نیز فوج کی غیر ذمے دارانہ پالیسی اور کبھی آسودہ نہ ہونے والی خواہشات پر بے دریغ دولت نہ اڑائی جاتی اور وہ بھی ان لوگوں کے ذریعہ جو عوام کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے اپنی خواہشات اور دلچسپیوں کو پورا کرنے کے لیے پوری گنجائش نکال لیتے ہیں'' 9

برٹش افسران یہ الزام لگایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے کسان اس لیے غریب اور قرض میں ڈوبے ہیں کیونکہ وہ شادی دواہ اور تیوہاروں پر بے تحاشہ دولت لٹاتے ہیں۔ 1901 میں بمبئی کونسل نے ایک بل زمین پر کسان کے مالکانہ اختیار کو چھین لینے کے لیے پیش کیا تاکہ فضول خرچی کرنے کی وجہ سے وہ اپنی زمین بیچ نہ سکیں۔ مہتا نے کسان پر لگائے گئے الزام کی تردید کی اور بل کی مخالفت اور کسان کے حقوق کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کو بھی اپنی خوشیاں منانے کا حق ہے۔ اوسط ہندستانی مزدور کی زندگی کیا ہے؟ مہتا نے کہا ''مٹی کے کچھ نئے برتن، کچھ جنگلی قسم کے پھول، دیہاتی ٹم ٹم، پیٹ بھر کھانا، گھٹیا قسم کی سپاری، پان اور سستی قسم

—کی تمباکو اور کبھی کبھار سستے بھڑ کیلے گہنے۔ یہی تو چند خوشیاں ہیں جو ایک اوسط گرہست، جس کی زندگی صبح تا شام تھکا دینے والی محنت کی انوٹ کڑی ہے، تیوہار کے موقع پر محسوس کرتا ہے"[10]
اور سرکار اپنی اکثریت کے زور پر اس بل کو پاس کرانے پر تُل گئی تب مہتا نے ہندوستان کی پارلیمانی تاریخ میں بے مثل جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ وہ گوکھلے، جی۔ کے پاریکھ۔ بال چندر کرشن، اور ڈی۔ کے۔ کھرے کے ساتھ پہلی بار کونسل سے نکل گئے۔ ایک بار پھر نوکرشاہی بری طرح ان سے ناراض ہوگئی۔ ''ٹائمس آف انڈیا'' جس کے مالک اس وقت انگریز تھے، نے یہاں تک لکھا کہ ان ممبروں سے استعفیٰ لے لینا چاہیے۔

شراب خوری روکنے کے نام پر اسے بڑھاوا دینے کی سرکار کی اکسائز پالیسی کی نکتہ چینی کرتے ہوئے مہتا نے 1898 میں کہا کہ "اکسائز ڈپارٹمنٹ اچھے ناصح کا کردار ادا کرتا ہوا معلوم پڑتا ہے جس کا مقصد صرف اچھی باتیں بتانا ہے، بذات خود اس پر عمل کرنا نہیں ہے"[11]

فیروز شاہ مہتا صحت کی خرابی کے باعث 1901 میں کونسل سے سبکدوش ہو گئے۔ انھوں نے اپنی جگہ پر پینتیس (35) سالہ گوپال کرشن گوکھلے کو منتخب کرایا جو پونا سارو جنک سبھا کے سکریٹری اور 'سدھارک' کے اڈیٹر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے اور 1897 میں لندن میں رائل کمیشن آن اکسپنڈیچر آف انڈیا (Royal Commission on Expenditure of India) کے رو برو شاہد کی حیثیت سے سریندر ناتھ بنرجی، ڈی۔ ای۔ واچا (D.E.Wacha) جی سبرامنیا ایر اور دادا بھائی نوروجی جیسے تجربہ کار نیتاؤں سے زیادہ ابھر کر چکے تھے۔ گوکھلے مہتا کے لائق وارث سے کچھ زیادہ ہی ثابت ہوئے۔

گوپال کرشن گوکھلے غیر معمولی دانشور تھے۔ جسٹس راناڈے اور جی۔ وی۔ جوشی نے ان کو ہندستانی معاشیات کا ماہر بنا دیا تھا۔ وہ خطیب نہیں تھے۔ وہ تلک، دادا بھائی نوروجی، اور آر سی دت کی طرح زوردار بھاشا کا استعمال بالکل نہیں کرتے تھے۔ اور نہ مہتا کی طرح طنز و مزاح کا سہارا لیتے تھے۔ مقرر کی حیثیت سے ان کا لہجہ واضح، معقول، بھلا اور صاف ستھرا تھا۔ ان کی معلومات گہری، ٹھوس اور وسیع تھی۔ وہ اپنی معلومات (Datas) کو بڑے اطمینان واحتیاط اور مدلل طریقہ سے پیش کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تقریریں نہ تو کسی کی تفریح کا باعث تھیں اور نہ

کسی کے دل کو زخمی کرتی تھیں، مگر دھیرے دھیرے ان کے سامعین ان کی ٹھوس عالمانہ باتوں کی طرف متوجہ ہو ہی جاتے تھے۔

گوکھلے اپنی بجٹ تقریروں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ ان کی یہ تقریریں روزانہ اخباروں میں شائع ہوتی تھیں۔ لوگ بڑی بے صبری سے ان کا انتظار کرتے تھے۔ انھوں نے قانون ساز کونسل کو کھلی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا تھا جہاں سے وہ لوگوں کو سیاست کی تعلیم دیتے تھے۔ 26 / مارچ 1902 کو ان کی پہلی بجٹ تقریر نے ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا پارلیمانی (Parliamentarian) ثابت کر دیا تھا۔ فائنس ممبر یعنی ممبر وزارت خزانہ ایڈ ورڈ لا (Edward Law) نے سات کروڑ روپوں کا زائد بجٹ کونسل میں پیش کیا جس کے لیے ایوان میں ان کی بڑے فخر سے تعریف کی گئی۔ اسی وقت گوکھلے بولنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ '' سچے دل سے میں اس موٹی رقم پر شاباشی میں شامل نہیں ہوسکتا ہوں''۔ یہ بجٹ تو ملک کے حالات اور خزانہ کے درمیان مطلق تال میل قائم نہیں کرتا ہے۔ اس طرح کا زائد بجٹ عوام کے تئیں ناانصافی ہے جو غریبی اور لاچاری میں پس رہی ہے۔ ان کی تقریر عوام کی غریبی پر محمول تھی۔ انھوں نے اس مسئلہ کے سارے پہلوؤں کو جانچا پرکھا تھا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ زیادہ تر لوگوں کی مالی حالت تیزی سے بد سے بدتر ہو رہی ہے اور یہ کہ دنیا کی پوری معاشی تاریخ میں یہ واقعہ سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بجٹ کا تفصیلی جائزہ لینا شروع کیا۔ انھوں نے پورے وثوق سے یہ ثابت کیا کہ قحط اور رسد کی قلت کے وقت کس طرح نمک اور لگان کا ٹیکس برابر بڑھتا گیا ہے۔ انھوں نے ان دنوں ٹیکسوں میں کمی کرنے کی مانگ کی اور کہا کہ ٹیکس لائق آمدنی کی سب سے کم رقم ایک ہزار روپے کر دینا چاہیے جس سے نچلے متوسط طبقہ (Lower Middle Class) کے لوگوں کو پریشانی نہ ہو۔ انھوں نے اس بجٹ کو ناکارہ و ناجائز بتایا جو فوج پر اور ہندوستان سے باہر سلطنت کو اور بڑھانے پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے تعلیم اور صنعت پر بجٹ بڑھانے کی مانگ کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کا مالیاتی نظام یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندستانی مفاد کو برٹش مفاد کے زیر رکھا گیا ہے یعنی برٹش مفاد کے سامنے ہندستانی مفاد کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے ہندستانی مالیات کی کمزور حالت اور لوگوں کی

غریبی کا تعلق ہندستان کے کلونیل نظام کی موجودہ معاشیاتی حالت سے جوڑا اور اس کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے سرکاری رپورٹوں سے ہی حوالے دیے[12]

گوکھلے کی پہلی بجٹ تقریر کا اثر لوگوں پر ''بجلی کی طرح پڑا'' ان کے سوانح نگار بی آر نندانے لکھا ہے کہ'' بائرن (Byron) کی طرح وہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ایک خوشگوار صبح جب وہ سوکر جگے، تو انھوں نے خود کو مشہور پایا''[13] ان کے سخت ترین ناقدین نے فی الفور ان کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔ اور ساری قومی پریس نے ان کو تہہ دل سے شاباشی دی۔ ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے ہندوستان کی عزت کو کئی درجہ بلند کر دیا ہے۔ ''امرت بازار پترکا'' جو ان کی وقعت کو گرانے اور ان کے قد کو کم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا، بڑی کشادہ دلی سے ان لفظوں میں اپنے فخر کا اظہار کیا'' ہماری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ کوئی ہندستانی کھل کر بیباکی سے سرکار کی مالیاتی بیانات کی بخیہ ادھیڑے، مگر ہماری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی، کیونکہ جب ممبروں کے پاس لیاقت تھی تو ضروری ہمت نہیں اور جب ہمت تھی تو لیاقت نہیں تھی۔ ہندوستان کی برٹش تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ جب ہندوستان کے ایک باشندہ نے سرکاری غلط بیانی کو ننگا کر کے دکھانے میں صرف کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ اس نے اس کام کو کھرے کھوٹے انداز میں کرنے کی جرات کی''[14] مگر اس تعریف کے لیے صرف وہی مستحق نہیں تھے۔ پہلے کی طرح وہ اب بھی منکسر المزاج اور سیدھے سادے تھے۔ انھوں نے اپنے استاذ جی۔ وی۔ جوشی جو ماہر معاشیات تھے، کو لکھا'' حقیقت میں میری یہ تقریر میری کم، آپ کی زیادہ ہے، اور اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ اس کا سہرا میرے سر ہے، تو میں لوگوں کے سامنے ہی دغابازی کر رہا ہوں''[15]

اگلے دس سالوں میں گوکھلے نے اپنی بے پناہ ہمت، استقلال اور صلاحیت کا استعمال ہر ایک سالانہ بجٹ اور قانون سازی کے وقت کیا اور ان مراحل میں انھوں نے بہت ساری باتیں اجاگر کیں: کسانوں کی غریبی، ہندستانی دولت کا ڈھن، صنعت کی ترقی کے تئیں سرکار کی بے توجہی، غریبوں پر ٹیکس کا بوجھ، فلاحی کاموں میں کوتاہی جیسے پرائمری تعلیم، حفظان صحت وعلاج، پریس اور شہری آزادی پر پابندی، برٹش کالونیوں میں ہندستانی مزدوروں کی غلامانہ حالت، ہندستان کا

اخلاقی زوال، ہندستانی مالیات کا پچھڑا پن اور ہندستانی مفاد کا حکمرانوں کے ذریعہ نظر انداز کر کے زیر رکھنا۔

وائسرائے سے لے کر نیچے کے افسران تک ان کی تیز و تند تنقید سے بے انتہا گھبراتے تھے۔ 1904 میں فائنس ممبر ایڈورڈ لا تحت طیش سے بول اٹھا ''جب کونسل میں یہ بیٹھتے ہیں، تو غیر دانستہ طور سے ان کا لہجہ ماتمی ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی دردناک کیفیت پیدا کرنا طویل مشق اور تربیت کے بعد ہی ممکن ہے''[16] گوکھلے کی بجٹ تقریریں سرکاری افسروں کو اس طرح خوفزدہ کرتی تھیں کہ 1910 میں وائسرائے لارڈ منٹو (Lord Minto) نے سکریٹری آف اسٹیٹ سے آر۔ ڈبلو۔ کارلائل (R.W.Carlyle) کو ریونیو ممبر (Revenue Member) تقرر کرنے کے لیے کہا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کو رازدارانہ طریقے سے گوکھلے کے ذریعہ غیر متوقع حملہ کی خبر ملی تھی، جس میں وہ ''ہمارے پورے مالیاتی نظام (Revenue System) پر بولیں گے۔ اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار رہیں''[17]

گوکھلے کو ان سب کاموں کا بدلہ، ان کے تئیں لوگوں کی محبت و احترام کی شکل میں مل گیا۔ پارلیمنٹ میں حاصل ان کی کامرانی پر لوگوں کو بڑا فخر تھا۔ اور ان کو ''حزب مخالف لیڈر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ گاندھی جی نے ان کو اپنا سیاسی گرو تسلیم کیا اور تلک جو پوری زندگی میں ان کو اپنا سیاسی رقیب مانتے تھے، نے ان کی موت پر یوں خراج عقیدت پیش کیا۔ ''ہندوستان کا ہیرا، مہاراشٹر کا لعل، کارکنوں کا شہزادہ، اپنی چتا پر ہمیشہ کے لیے سو رہا ہے۔ ان پر نظر ڈالیے اور ان کے جیسا کرنے کی کوشش کیجیے''[18]

باب-10

سودیسی تحریک 1903-1908

نئی صدی کے ساتھ سودیسی تحریک شروع ہوئی اور ہندوستان کی قومی تحریک نے بھی اپنے قدم آگے بڑھائے۔ بنگال اور دوسرے حصوں کے شہری اور دیہی علاقوں کے مرد، عورت اور طلبا کثیر تعداد میں پہلی بار سیاست میں سرگرمی سے شامل ہوئے۔ تحریک کا دائرہ کافی وسیع ہوا۔ اور اگلی نصف دہائی میں سیاست کے سارے رجحانات ہندستانی قومی تحریک میں رونما ہو گئے۔ معتدل قدامت پرستی سے سیاسی انتہا پسندی تک، دہشت پسندی سے سوشلزم کے ابتدائی دور تک، عدالتی لڑائی اور لکچر بازی سے لے کر خاموش احتجاج اور بائیکاٹ تک کی ساری باتوں کی ابتدا اسی تحریک سے ہوئی۔ اس تحریک کے اثرات کا حلقہ صرف، سیاست تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ ہندستانی علوم وفنون، موسیقی وسائنس، صنعت وحرفت وغیرہ کے سارے میدان اس کے زیر اثر آگئے۔ مجموعی طور سے ہندستانی سماج کے ہر گوشہ میں تجربات ہو رہے تھے اور لوگوں کا تخلیقی عمل مسلسل جاری تھا۔

سودیسی تحریک حقیقت میں بنگال کی تقسیم کی صورت میں وجود میں آئی۔ بنگال کی تقسیم

کے سلسلہ میں بنگالی غیر متوقع طریقے سے بے انتہا ناراض تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت بنگال کی آبادی 78 ملین تھی جو پوری انگریزی حکومت کا چوتھائی حصہ تھی۔ اور اتنی کثیر آبادی پر حکومت کرنا دشوار سا ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بنگال کی تقسیم کا مسئلہ سیاسی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندستانی قومی تصور زور پکڑ رہا تھا اور تیزی سے ابھرتے ہوئے قومی شعور کے مرکز کو توڑنے کے لیے برٹش سرکار نے بنگال کی تقسیم کا فیصلہ لیا۔ لارڈ کرزن (Lord Curzon) (1899-1905) کے لفظوں میں "اس کوشش کا مقصد کلکتہ کی مرکزیت ختم کر کے اس کے زور کو توڑنا ہے جہاں سے بنگال اور پورے ملک میں کانگریس پارٹی متحرک ہوتی ہے۔ یہ حکومت کے خلاف سازش کرنے کا کامیاب مرکز ہے۔ اور بنگالی بولنے والوں کو ٹکڑوں میں بانٹ دو" [1] رائس لے (Riseley) انگریزی سرکار کا ہوم سکریٹری تھا۔ اس کا لہجہ اور بھی زیادہ سخت تھا۔ 6 دسمبر 1904 میں اس نے کہا "متحد بنگال بڑی طاقت ہے۔ ٹکڑوں میں تقسیم کر دینے پر یہ کئی طرح سے کمزور ہو جائے گا۔ یہی بات تو کانگریسی لیڈر محسوس کرتے ہیں اور ان کا اندیشہ بالکل صحیح ہے اور یہی خدشہ تو ہماری اسکیم کی سب سے اہم بات ہے۔ ہمارا مقصد بنگال کا بٹوارہ کرنا ہے جس سے ہمارے دشمنوں کا مضبوط جتھا ٹوٹ جائے" [2] بنگال کے ٹکڑے کرنے کی خبر آگ کی طرح بنگال میں پھیل گئی اور مخالفت کی آوازیں زوروں سے اٹھنے لگیں۔ لارڈ کرزن بہت تلملائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا "اگر ہم نے اس چیخ و پکار کو ابھی نہیں دبایا تو ہم بنگال کے ٹکڑے کبھی نہیں کر پائیں گے۔ اس احتجاج کو نہ دبا پانے کا نتیجہ ہوگا کہ آپ پہلے سے مضبوط ایک ایسی طاقت کو مزید مضبوط بننے کا موقع دے رہے ہیں جو ہمارے لیے مستقبل میں مصیبت کا باعث ہوگا" [3] بنگال تقسیم کا صرف یہی مقصد نہیں تھا کہ بنگالیوں کو دو انتظامی حصوں میں بانٹ کر ان کے اثرات کو کم کرنا رہا ہو۔ بلکہ ان کو خود ان کے صوبے میں اقلیت میں کر دینا تھا۔ نئی تجویز میں بنگال خاص میں ایک کروڑ ستر لاکھ بنگالی اور تین کروڑ ستر لاکھ اڑیا، اور ہندی بھاشی لوگوں کو رکھنا تھا۔

اس طرح کے بٹوارہ میں مذہبی نظریہ بھی کارفرما تھا۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں کانگریس و قومی تحریک کو کمزور کرنے کے لیے مسلم فرقہ واریت کو بھڑکانے کا کام شروع کیا

گیا۔ ایک بار پھر اس ہتھکنڈے کو اپنانے کی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کے رجھانے کے لیے ڈھاکہ میں ہوئی لارڈ کرزن کی تقریر سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہوجاتی ہے۔اس نے دلیل دیا کہ تقسیم بنگال کے بعد ڈھاکہ مسلم اکثریت والے صوبے کی راجدھانی بن جائے گا۔(جس میں اس وقت ایک کروڑ بیس لاکھ مسلم اور ایک کروڑ بارہ لاکھ ہندو تھے)۔اس سے پوربی بنگال میں مسلمانوں کا اتحاد قائم ہوگا جو کسی بھی وائسرائے اور نواب کے زمانہ میں نہیں ہو پایا تھا۔[4] ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا اور پوربی ضلع کلکتہ کے ضرر رساں اثرات سے آزاد ہوں گے''۔

لارڈ کرزن کے وارث لارڈ منٹو (Lord Minto) جو پہلے اس تقسم کے مخالف تھے کی رائے تھی کہ عوام کی منشا کے خلاف ایسی تقسیم مناسب نہیں ہے، مگر بعد میں انھوں نے کہا کہ ''قدیمی صوبہ کی انتظامی دقتوں کو درکنار کیجیے، صرف سیاسی زاویہ سے بنگال کی تقسیم ضروری ہے''۔[5]

اس طرح قوم کے لیڈروں کو اس تقسیم کے پیچھے انگریزی حکومت کی اصل منشا کا پتہ چل گیا۔انھوں نے متحدہ طریقے سے اس کی مذمت کی اور تقسیم مخالف اور سودیسی تحریک شروع ہوگئی۔

دسمبر 1903 میں عام طور سے سبھی کو بنگال تقسیم کی تجویز کی خبر مل گئی۔ فوراً احتجاج شروع ہوگیا۔ یہ احتجاج اتنا زبردست تھا کہ دو ماہ میں صرف پوربی بنگال میں 500 میٹنگیں ہوئیں۔ان میں سے زیادہ تر میٹنگیں ڈھاکہ، میمن سنگھ اور چٹگاؤں میں ہوئیں۔ پورے بنگال میں قریب پچاس ہزار پرچے تقسیم کیے گئے جن میں بنگال بٹوارے کے بارے میں تفصیل سے معلومات دی گئی تھی۔ سریندر ناتھ بنرجی، کرشن کمار مشرا، پرتھولیس چندر رائے اور دوسرے لیڈروں نے تقسیم بنگال کی تجویز کے خلاف 'بنگالی' 'ہت وادی' 'سنجیونی' جیسے اخباروں اور میگزینوں کے توسل سے زوردار مہم چلائی۔ مارچ 1904 اور جنوری 1905 میں کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام صرف ڈھاکہ سے 69 عرضداشتیں (Memorandams) بھیجی گئیں جن پر ستر ہزار سے زیادہ لوگوں کے دستخط تھے۔اس زمانہ کے سیاسی شعور کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بہت زیادہ تھی۔ بڑے زمیندار جو اب تک حکومت کے وفادار بنے ہوئے تھے، کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ہوگئے، یہ لیڈران زیادہ تر صحافت، قانون اور آزاد پیشہ سے جڑے دانشور اور سیاسی کارکن تھے۔

1903 اور وسط 1905 کا زمانہ تھا۔اس دوران عرضداشتوں ،اپیلوں ،تقریروں، جلسوں اور اخبارات واشتہارات کے ذریعہ خاموش مہم چلائی جانی شروع ہوئی ۔ان سب کا واحد مقصد بنگال تقسیم کی تجویز کے خلاف ہندوستان اور انگلینڈ میں رائے عامہ تیار کرنا تھا۔لوگوں کو یہ امید تھی کہ حکومت پر ان کا اثر پڑے گا اور وہ ایسا غلط ونا جائز قدم اٹھانے سے باز رہے گی۔

مگر ان سب کا سرکار پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بنگال تقسیم کی تجویز کے خلاف بڑے پیانہ پر ہوئی مخالفت اور احتجاج کے باوجود بنگال کی تقسیم کا باقاعدہ اعلان 19/ جولائی 1905 کو کر دیا گیا۔قومی لیڈروں کو اب پورا یقین ہو گیا کہ ان کے پرامن طریقے بے اثر ہیں ۔اور ان کو کوئی دوسری حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔اس اعلان کے بعد کچھ ہی دنوں میں دیناج پور، پابنا،فرید پور، تنگیل، جیسور، ڈھاکہ، دیربھوم اور باریسال کے مفصل قصبوں میں لگاتار انگنت میٹنگیں کی گئیں۔ان بیٹھکوں میں سب سے پہلے بدیشی سامان کے بائیکاٹ کرنے کا عہد لیا گیا۔کلکتہ میں طلبا نے تقسیم کی مخالفت اور سودیسی چیزوں کے حق میں میٹنگیں کیں۔

سودیشی تحریک کا اعلان باقاعدہ طور سے 7/اگست 1905 کو کلکتہ ٹاؤن ہال کی میٹنگ میں کیا گیا۔تقسیم بنگال کی مخالفت میں منتشر تحریک یکبارگی متحد ہونے لگی ۔اسی میٹنگ میں بائیکاٹ کی تاریخی قرارداد پاس ہوئی ۔ سریندر ناتھ بنرجی جیسے اعتدال پسند لیڈر بھی ملک کے دورے پر نکل کر مینچسٹر کپڑوں اور لیور پول نمک (Liverpool Salt) کے بائیکاٹ کرنے کی اپیل کرنے لگے۔پہلی ستمبر کو سرکار نے اعلان کیا کہ اس تقسیم پر 16/اکتوبر 1905 سے عمل کیا جائے گا۔اس کے بعد تو بائیکاٹ تحریک نے بہت زور پکڑا۔روزانہ میٹنگیں ہونے لگیں۔اور بدیشی سامان کے بائی کاٹ کا نعرہ بلند ہونے لگا۔باری سال (Barisal) میں ہوئی میٹنگ کی طرح دوسری جگہوں پر ہوئی میٹنگوں میں لوگ دس سے بارہ ہزار تک کی تعداد میں جمع ہوئے ۔بائیکاٹ کی یہ خبر گھر گھر پھیل گئی۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ستمبر 1905 تک کلکتہ کے باہر کئی ضلعوں میں انگریزی کپڑوں کی ہوئی آمدنی میں پانچ سے پندرہ گنا تک کی آئی۔

پورے بنگال میں 6/اکتوبر یوم غم تھا۔اس دن لوگوں نے روزے رکھے،گھروں میں چولہے نہیں جلے، کلکتہ میں ہڑتال کی گئی،لوگوں نے صبح گنگا میں نہا کر ننگے پیر ٹولیوں میں 'بندے

ماترم' گاتے ہوئے جلوس نکالا اور سڑکوں پر گشت کیا۔ یہی گیت بعد میں بالکل فطری طریقہ سے تحریک کا موضوع نغمہ بن گیا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی کلائی پر راکھیاں باندھیں صرف یہ تاثر دینے کے لیے کہ بنگال بانٹ کر انگریز ان کے اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر سکتے۔ بعد میں آنند موہن بوس اور سریندر ناتھ بنرجی نے دو بڑے جلسوں کو خطاب کیا جس میں پچاس ہزار سے پچہتر ہزار تک کا مجمع اکٹھا ہوا۔ قومی تحریک کے جھنڈے کے نیچے اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد میں لوگ کبھی جمع نہیں ہوئے تھے اور انھیں جلسوں میں چند لمحوں کے اندر تحریک کے لیے پچاس ہزار کی بڑی رقم اکٹھی ہوگئی۔

بنگال تقسیم سے پیدا ہوئی تحریک اپنے مقصد کے حصول کے لیے بڑے عزم کے ساتھ نئی راہ پر چل پڑی۔ اس کا پھیلاؤ ہونے لگا۔ پارلیمانی اجلاس کے صدر عبدالرسول نے کہا ''پچھلے پچاس سے سو سال کے دوران جو ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے وہ ہم نے چھ مہینے میں تقسیم بنگال کے سانحہ کی وجہ سے حاصل کر لیا۔ سودیشی تحریک کی شکل میں قومی تحریک اسی کا پھل ہے'' 6

سودیشی تحریک اور بدیشی سامان کے بائیکاٹ کی خبر ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ لوک مانیہ تلک نے اس تحریک کو ملک کے دوسرے حصوں خاص طور سے بمبئی اور پونا میں پھیلایا۔ اجیت سنگھ اور لالہ لاجپت رائے نے اسے پنجاب اور شمالی ہندوستان کے دوسرے حصوں تک وسعت دی۔ سید حیدر رضا نے دہلی میں اس کی قیادت کی۔ راولپنڈی، کانگڑہ، ملتان اور ہردوار میں سودیشی تحریک نے خوب زور پکڑا۔ چدمبرم پلے اس تحریک کو مدراس پریسڈنسی تک لے گئے۔ بپن چندر پال نے دور دراز تک اپنے لکچروں کے ذریعہ تحریک کو مضبوط اور مستحکم کیا۔

انڈین نیشنل کانگریس نے بھی سودیشی کاز کو سرگرمی سے اپنایا۔ 1905 میں کانگریس کا جو اجلاس بنارس میں جی۔ کے گوکھلے کی زیر صدارت میں ہوا اس میں سودیشی اور بائیکاٹ تحریک کو پورے بنگال میں چلانے کی بھرپور تائید کی گئی، تلک، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور اروند گھوش جیسے گرم مزاج لیڈر اس تحریک کو پورے ملک میں پھیلانا چاہتے تھے۔ وہ اس کو صرف سودیشی اور بائیکاٹ تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، بلکہ اسے ساری عوام کی سیاسی جدوجہد میں تبدیل کرنا چاہتے تھے اب ''سوراج ان کا مقصد تھا بنگال تقسیم کو ختم کرنا اب سیاسی مقاصد کا

سب سے چھوٹا اور محدود مسئلہ رہ گیا تھا۔7 لیکن نرم رجحان کے لیڈر ابھی ایسے اقدام کے لیے تیار نہیں تھے۔ بہر حال 1906 میں انڈین نیشنل کانگرس نے کلکتہ اجلاس میں قومی تحریک کے سلسلہ میں بڑا قدم اٹھایا۔ دادا بھائی نوروجی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد ہندوستان میں انگلینڈ یا اس کی کلونیل ملکوں کی طرح اپنی حکومت (Self Government.) یا سوراج قائم کرنا ہے''۔8 اس طرح کانگریس کے گرم اور نرم رجحان والے لیڈروں کے درمیان جدوجہد کے طریقوں اور تحریک کی رفتار کے سلسلہ میں تضاد چلتا رہا اور 1907 میں سورت کے اجلاس میں سودیسی تحریک کے مسئلہ پر پارٹی دو خانوں میں بٹ گئی اس کا اثر سودیسی تحریک پر بہت برا پڑا۔

1905 کے بعد بنگال میں سودیسی تحریک پر انتہا پسندوں کی پکڑ مضبوط ہوگئی۔ عوام کو تحریک کے لیے تیار کرنے کے واسطے جدوجہد کے تمام طریقے اپنائے جانے لگے۔ عرض ومعروض اور گذارش کرنے کا رجحان دب گیا۔ گرم رجحان والے قومی لیڈروں نے جنتا کے سامنے کئی اصول، پروگرام اور نظریات پیش کیے۔ عوامی تحریک کے ذریعہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کا مقصد طے پایا۔ اس کے لیے بائیکاٹ تحریک کو عدم تعاون (Non Co-operation) اور خاموش مخالفت تک لے جانا تھا۔ صرف بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ ہی نہیں بلکہ سرکاری اسکولوں، عدالتوں، خطابوں، سرکاری نوکریوں کا بائیکاٹ اس میں شامل تھا۔ ہڑتال کی بات بھی کی گئی۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ملک کا استحصال کرنے والی تجارت، سرکاری مشینری، اور نوکر شاہی کو ایک دم مفلوج کردیا جائے۔9 کچھ دور اندیش لیڈروں نے پرامن احتجاج کی عظیم قوت کو محسوس کیا کہ ''اگر چوکیدار، کانسٹبل، ڈپٹی، منصف، کلرک اور یہاں تک کہ سپاہی اپنا کام بند کردیں تو ایک لمحہ میں فرنگی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے لیے گولہ بارود کی ضرورت نہیں، سپاہیوں کو ٹریننگ کی ضرورت نہیں''۔10 وہیں دوسری طرف اروند گھوش جیسے دوسرے لوگ جن کا انقلاب پسند دہشت گردوں سے برابر تعلق بنا ہوا تھا، اس بات کی وکالت کرتے تھے کہ اگر فرنگی حکومت تشدد کا طریقہ اپنائے گی تو اس کا جواب تشدد سے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس تحریک کی جتنی بھی شکلیں تھیں، ان میں سب سے زیادہ کامیابی بدیسی سامان کے بائیکاٹ تحریک کو ملی۔ عوامی مقبولیت کے لحاظ اور عملی اعتبار سے یہ تحریک بہت کامیاب ثابت ہوئی بنگال اور پورے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ بدیسی سامان کی دوکانوں پر لوگوں کو کام کرنے سے روکا گیا۔ عورتوں نے بدیسی چوڑیاں پہننا اور بدیسی برتنوں کو استعمال کرنا بند کر دیا۔ دھوبیوں نے بدیسی کپڑوں کو دھونے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ پجاریوں نے بدیسی شکر سے بنی مٹھائیوں کو مندر میں چڑھانا بند کر دیا۔

تحریک نے لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے مختلف قسم کے کامیاب طریقے اپنائے۔ بڑے بڑے جلوسوں اور میٹنگوں کا انتظام کیا گیا۔ اظہار خیال اور رائے عامہ تیار کرنے کے یہ اثر دار طریقے تھے۔ بڑے بڑے شہروں سے لے کر ضلعوں، قصبوں، تعلقوں اور گاؤں میں عوام کی اگنت میٹنگیں کی گئیں۔ قومی تحریک کے بعد کے دور میں یہی طریقے بڑے اثر دار ثابت ہوئے۔ ان کے ذریعہ لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور وہ سوراج کے لیے مچلنے لگے۔

عوام کو متحرک کرنے کی دوسری شکلیں رضا کار دستے تھے جن کو سمتیاں کہا جاتا تھا۔ سودیسی تحریک نے رائے عامہ تیار کرنے کے لیے بہت بڑے پیمانہ پر ان کا استعمال کیا۔ ان میں سب سے اہم اور خاص تنظیم سودیس بندھب سمیتی (Swadesh Bandhab Samiti) تھی۔ باریسال کے ایک اسکول ماسٹر اسونی کمار دت کے ذریعہ اس کو قائم کیا گیا۔ اس تنظیم کی 159 شاخیں ضلع کے دور دراز علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ باریسال ضلع میں مسلم آبادی اکثریت میں تھی۔ اسونی کمار نے مسلم کسانوں کو کثیر تعداد میں تحریک میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔ تنظیم نے جوشیلی تقریروں اور گیتوں کے ذریعہ سودیسی تحریک کے پیغام کو گاؤں گاؤں پہنچایا۔ اس طرح لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ انھوں نے تنظیم کے لوگوں کو جسمانی اور اخلاقی ٹریننگ دینے کا معقول انتظام کیا۔ قحط اور وبائی امراض کے دوران لوگوں کے درمیان راحت کار کیا۔ اسکول کھولے گئے، سودیسی دستکاری کی ٹریننگ لوگوں کو کرائی جانے لگی۔ مقدموں کو نمٹانے کے لیے پنچ عدالتیں (Arbitrary Courts) قائم کی گئیں۔ اگست 1906 میں باریسال سمیتی نے 89 پنچ عدالتوں کے ذریعہ 523 معاملے طے کیے۔ باریسال سمیتی کی جڑیں صرف وہیں

تک محدود نہیں تھیں، بلکہ پورے بنگال میں پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریزی حکومت اس کمیٹی کی بڑھتی ہوئی شہرت اور اثر سے بے انتہا فکر مند تھی۔ سودیسی تحریک نے اپنے پرچار کے لیے روایتی تیوہاروں، مذہبی جلسوں، موسیقی اور ڈرامہ کے اسٹیجوں کا بھی سہارا لیا۔ گن پتی اور شیوا جی جینتی کو تلک نے عوام میں بہت مقبول بنایا اور ان کے ذریعہ سودیسی تحریک کی خوب تشہیر ہوئی۔ یہ کام صرف مغربی ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ انھیں تیوہاروں کے توسل سے بنگال میں سودیسی تحریک کا پیغام پہنچا۔ جٹ راس جیسے روایتی لوک تھیٹر کا استعمال تحریک کے پیغام کو دور دور تک پہنچانے کے لیے کیا گیا۔ ایسا پیغام ان لوگوں تک پہنچا جو پہلی بار جدید سیاسی خیالات سے متعارف ہو رہے تھے۔

حکومت کے خلاف سودیسی تحریک کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس نے آتم شکتی یعنی خود پر بھروسہ کا پرزور نعرہ دیا۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں آتم شکتی کا مطلب تھا کہ لوگوں میں قومی وقار اور خود اعتمادی کے جذبات پیدا ہوں'۔ گاؤں میں معاشی اور سماجی ترقی کے لیے تعمیری کام شروع کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس سلسلہ میں سماج میں پھیلی برائیوں مثلاً ذات برادری کے نام پر ظلم، بچپن کی شادیاں، جہیز کا رواج، شراب خوری وغیرہ کے خلاف جہاد چھیڑنا شامل تھا۔ قومی تعلیم کی ضرورت کو بھی شدت سے محسوس کیا گیا۔ اور خود کفیل بننے کے لیے ایسی تعلیم بے حد ضروری سمجھی گئی۔ ٹیگور کے شانتی نکیتن کے طرز پر بنگال نیشنل کالج قائم کیا گیا۔ اروندو کو اس کا پرنسپل بنایا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں پورے ملک میں قومی اسکول قائم ہو گئے۔ اگست 1906 میں قومی تعلیمی بورڈ (National Council of Education) وجود میں آیا۔ جو ملک کے مشہور و معروف شخصیات پر مشتمل تھا۔ کونسل کا مقصد تھا کہ پرائمری سے یونیورسٹی سطح تک سائنس اور تکنیکی تعلیم کا انتظام کرنا جو قومی نہج پر قوم کے کنٹرول میں ہو"11 اور ذریعہ تعلیم دیسی بھاشائیں ہوں جس سے گھر گھر تعلیم کی روشنی پہنچ سکے"۔ تکنیکی تعلیم کے لیے بنگال انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔ اونچی تعلیم دلانے کے لیے طلبا کو جاپان بھیجنے کی غرض سے چندہ اور مالی تعاون لیا گیا۔

مالی اعتبار سے خود کفیل ہونے کے لیے سودیسی دھندوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کپڑا ملیں، صابن و ماچس کے کارخانے، چمڑہ کمانے کے دھندے، بینک و بیما کمپنیاں وجود میں آئیں۔

ان میں سے زیادہ تر ادارے تو بہت دنوں تک نہیں چل سکے اور نہ کامیاب ہی ہوئے کیونکہ ان کے مالکان میں وطن پرستی کے جذبات تو زیادہ تھے مگر تجارتی صلاحیت سے وہ خالی تھے۔ ہاں پی۔ سی۔ رے کی بنگال کیمکل کمپنی کی طرح کچھ دھندے ضرور کامیاب ہوئے اور خاصے مشہور ہوئے۔

تہذیب وثقافت کے میدان میں سودیشی تحریک نے بہت نمایاں اثرات مرتب کیے بنگلہ زبان میں رویندر ناتھ ٹیگور، رجنی کانت سین، دوبجیند رلال رائے، مکند داس، سید ابومحمد، اور دوسروں کے ذریعہ لکھے گئے گیت اور نظمیں، ہر رنگ ونظریے کے قوم پرستوں جیسے گاندھی وادیوں، دہشت گردوں، اور کیمونسٹوں کے لیے جوش وجذبہ کا سرچشمہ تھیں اور آج بھی ہیں۔ رویندر ناتھ ٹیگور کے ذریعہ لکھا گیا ''امار سونار بانگلا'' بعد میں بنگلہ دیش کی آزادی کا خاص محرک تھا۔ یہی 1971 میں بنگلہ دیش کا قومی ترانہ بنا، بنگالی لوک سنگیت (پلی گیت اور جاری گان) جو ہندو مسلم گاؤں میں بہت مقبول تھا، پرسودیشی تحریک کا نمایاں اثر پڑا۔ اور اسی کے زیر اثر پریوں کی کتھاؤں کے بہت سے مجموعے لکھے گئے۔ دکشنا رنجن متر مجومدار (Dakshinaranjan Mitramajumdar) کے ذریعہ ٹھاکر مار جھولی'' (Thakurmar Jhuli) (یعنی دادی اماں کی کہانیاں) کی تخلیق کی گئی۔ آج بھی بنگالی بچے ان کو سن کر بہت مگن ہوتے ہیں۔ آرٹ میں بھی یہی وہ وقت تھا جب رابندر ناتھ ٹیگور نے ہندوستان آرٹ پر مغربی آرٹ کے تسلط کو ختم کیا۔ ان کو مغل، راجپوت، اور اجنتا کی روایتی مصوری سے حوصلہ ملا۔ نندلال بوس جنھوں نے ہندستانی آرٹ پر گہرے اثرات ڈالے ہیں، پہلے شخص تھے جن کو 1907 میں قائم انڈین سوسائٹی آف اورینٹیل آرٹ کی طرف سے وظیفہ دیا گیا۔ سائنس کی دنیا میں جگدیش چندر بوس، پرفل چندرائے، وغیرہ نے نمایاں کامیابی حاصل کی جس کی ساری دنیا میں قدر وستائش ہوئی۔

کئی شکلوں اور پروگراموں والی اسی سودیشی تحریک نے پہلی بار سماج کے ایک بڑے طبقہ کو اپنے دائرہ میں لیا۔ عوام کا بہت بڑا حصہ پہلی بار سیاست میں سرگرم ہوا۔ اس طرح اس کا سماجی دائرہ کافی پھیلا۔ اس میں کچھ زمیندار باشندے اور اسکول وکالج کے طلبا شریک ہوئے۔ پہلی بار عورتیں گھر کی چہار دیواری سے باہر آئیں۔ جلوسوں میں حصہ لینے اور دھرنے پر بیٹھنے لگیں۔ یہی وہ وقت تھا جب پہلی بار مزدور طبقہ کی مالی دشواریوں کو سیاسی سطح پر اٹھایا گیا اور سیاسی جدوجہد سے جوڑا

گیا۔ انقلابی لیڈر جن میں کچھ اس وقت کے جرمنی اور روس کے سوشلسٹ لہر سے متاثر تھے، بدیس مالکوں کے کارخانوں جیسے ایسٹرن ریلوے اور کلایول میں ہڑتال کرانے لگے۔

جہاں تک کسانوں خصوصاً نچلے طبقے کے کسانوں کو سودیسی تحریک کے لیے تیار کرنے کرنے کی بات ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ سودیسی تحریک کو اس معاملہ میں کامیابی نہیں ملی۔ صرف باریسال اس سے مستثنیٰ ہے مگر سودیسی تحریک نے اکادکا جگہوں پر جتنے کسانوں کو تحریک میں شامل ہونے کے لیے تیار کیا۔ یا ان میں سیاسی شعور پیدا کیا وہ اپنے آپ میں تحریک کی بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ حقیقت میں جدید سیاست کی شروعات ملک میں یہیں سے ہوتی ہے۔ پورے کسان طبقہ کو سیاسی جدوجہد کے لیے تیار نہ کر پانے کی بات صرف سودیسی تحریک کے ساتھ ہی نہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد ملک میں جو بھی تحریکیں ہوئیں، وہ پورے کسان طبقہ کو متاثر اور متحرک نہ کر سکیں۔ ان کی سرگرمیاں بھی مخصوص علاقہ تک سمٹ کر رہ گئیں۔ یہ سچ ہے کہ کسان تحریک کے لیے کسانوں کو بڑے پیمانہ پر کسان مسائل کے اردگرد منظم نہیں کیا جا سکا اور وہ قومی تحریک میں سرگرمی سے منسلک نہیں ہو سکے۔ زیادہ تر جگہوں پر وہ بائیکاٹ یا خاموش احتجاج جیسی کارروائی میں سرگرمی سے حصہ نہیں لے سکے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سودیسی تحریک نے میٹنگوں، عوامی جلسوں، جٹ راسوں (Jatras) تعمیری کاموں وغیرہ کے ذریعہ کسانوں کے ایک بڑے طبقہ کو جدید سیاسی نظریہ سے آگاہ کرایا۔

سودیسی تحریک کی خاص کمزوری یہ تھی کہ اس کو مسلمانوں خصوصاً مسلم کسانوں کا تعاون نہ حاصل ہو سکا۔ اس کے لیے انگریزی حکومت کی پالیسی بہت حد تک ذمہ دار تھی۔ جس کا مقصد یہی تھا کہ وہ مسلمانوں میں فرقہ واریت پیدا کر کے ان کو سودیسی تحریک سے باز رکھے۔ بنگال کے اس وقت کے حالات سے بھی حکومت کو اس حربہ کے استعمال میں بڑی مدد ملی۔ اس وقت بنگال کے زیادہ تر زمیندار ہندو اور کھیت مزدور مسلمان تھے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو خوب بھڑکایا اور یہی وہ وقت تھا جب فرنگی حکومت کے اشارے پر انڈین مسلم لیگ کا قیام ہوا۔ بنگال میں خاص طور سے ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ جیسے لوگوں کو سودیسی تحریک کی مخالفت میں استعمال کیا گیا۔ فرقہ واریت کو بڑھانے کے لیے ملا، مولویوں کی مدد لی گئی۔ اور جب سودیسی تحریک کمال عروج پر تھی

تبھی ہندو مسلم دنگے بھڑک اٹھے۔

ایسے حالات میں سودیشی تحریک نے عوام کو متحرک کرنے کے لیے کچھ ایسے طریقے اپنائے کہ ان کے اثرات بہت منفی نکلے۔ دنیا میں زیادہ تر جگہوں پر پہلے پہل سیاسی بیداری پیدا کرنے کے روایتی رسم و رواج، تیوہار اور اداروں کا استعمال بہت وسیع پیمانہ پر کیا جاتا ہے۔ مگر ہندوستان کی سماجی کیفیت اس وقت مختلف تھی۔ جس ملک میں حکومت خود فرقہ واریت کو بڑھانے کا جتن کر رہی ہو، وہاں مذہبی رسم و رواج، تیوہاروں اور اداروں کا سہارا لینا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اپنے ملک میں بھی یہی ہوا۔ فرقہ پرست طاقتوں نے سودیشی تحریک کے مقاصد کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ ان طاقتوں نے اس کے ذریعہ استعمال کیے گئے روایتی طریقوں میں مذہبی تنگ نظری کا احساس کیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان طریقوں میں مقبول عام تہذیب و ثقافت کی عکاسی ہوتی تھی جس نے اس وقت کے مروجہ مختلف مذاہب کے درمیان جوڑ پیدا کرنے میں کیمیا کا کام کیا تھا۔

1908 کے وسط تک سودیشی تحریک کی توانائی ختم ہو گئی۔ اور اس کی عوامی پکڑ ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ حکومت اس کی طاقت سے پوری طرح چوکنا ہو گئی۔ اس لیے اس نے اس کو سختی سے دبانا شروع کر دیا۔ عام جلسوں جلوسوں اور پریس پر پابندی لگا دی گئی۔ تحریک سے منسلک طلبا کو سرکاری اسکولوں سے نکالا جانے لگا۔ سرکاری نوکریوں کے دروزے ان کے لیے بند ہو گئے۔ ان پر جرمانہ ہونے لگا اور پولیس کے ذریعہ ان کی پٹائی ہونے لگی۔ 1906 کے باریسال کانفرنس میں پولیس نے جس بے رحمی سے لوگوں کی پٹائی کی تھی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تحریک کے بارے میں حکومت کا نظریہ اور رویہ کتنا سخت تھا۔

دوسری وجہ کانگریس پارٹی کے آپسی جھگڑے تھے۔ 1907 میں کانگریس جو ہندوستان کی سب سے بڑی تنظیم تھی، کی تقسیم نے تحریک کو بہت کمزور کر دیا۔ سودیشی تحریک یوں تو بنگال تک پھیل گئی تھی۔ مگر ملک کے دسرے بقیہ حصے سیاست کے نئے نظریہ اور اصول کو اپنانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ایسے حالات کا فائدہ اٹھا کر حکومت نے ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا۔ 1907 اور 1908 کے درمیان بنگال کے بڑے بڑے لیڈران جن میں اسونی کمار دت، اور کرشن کمار مصرا شامل تھے، کو جلا وطن کر دیا گیا اور مدراس کے چدمبرم پلے

(Chidambaram Pillai) اور آندھرا کے ہری سرواتم راؤ (Harisarvottam Rao) کو گرفتار کرلیا گیا۔ اروند گھوش اور وپن چندر پال نے سرگرم سیاست سے سنیاس لے لیا۔ اس طرح پوری تحریک ایک جھٹکے میں قیادت سے محروم ہوگئی، پھر بھی حکومت کا ظلم وستم جاری رہا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ سودیسی تحریک کے پاس اثر دار تنظیمی ڈھانچہ نہیں تھا۔ اگر چہ تحریک نے سارے گاندھیائی طریقے اپنائے تھے جیسے خاموش مخالفت عدم تشدد اور عدم تعاون، جیل بھرو مہم، سماج سدھار اور تعمیری کام وغیرہ مگر تنظیم کے نہ ہونے سے تحریک ان تمام طریقوں کو باضابطہ مرکزی سمت دینے میں ناکام رہی۔ گاندھی جی کی طرح ان کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔

آخری بات یہ کہ عوامی تحریکیں لگاتار نہیں چل پاتیں۔ لوگوں میں جنگجوئیت اور خود فروشی کے جذبات ٹھنڈے پڑنے لگتے ہیں۔ خصوصیت سے اس وقت جب ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہوں۔ ایسی حالت میں ان میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ اس درمیان وہ اگلی جدوجہد کے لیے خود کو تیار کرتی ہیں۔

بہرحال 1908 کے وسط میں جب یہ تحریک ختم سی ہوگئی تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد سودیسی تحریک کی دوسری شکل پیدا ہوئی یعنی انقلابی دہشت پسندی (Revolutionary Terrorism) کی شروعات۔ ملک کے نوجوان جو عوامی تحریک کا اہم حصہ تھے، اب خود کو اکیلا پا رہے تھے۔ سودیسی تحریک قریب قریب ختم تھی۔ مگر انگریزی حکومت اب بھی ظلم ڈھائے جارہی تھی۔ ایسے حالات میں مایوس نوجوانوں نے اپنے طور سے انفرادی بہادری (Individual Heroism) کا سہارا لیا جو اب تک کے سیاسی جدوجہد کے بالکل برعکس تھا۔

اس طرح سودیسی تحریک کے خاتمہ کے ساتھ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا ایک دور ختم ہوگیا۔ بہرحال یہ کہنا غلط ہوگا کہ سودیسی تحریک ناکام رہی۔ حقیقت میں اس تحریک نے سماج کے اس طبقہ میں قومی شعور پیدا کیا جو اب تک قومیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس تحریک نے فرنگی حکومت اور کالونیائی نظریات کو بہت نقصان پہنچایا۔ تہذیب وتمدن کے میدان میں تحریک نے جو اثرات مرتب کیے، وہ ہندوستان کی تاریخ میں بے مثل ہیں۔ البتہ 1930 کی دہائی میں بائیں بازو کے زیر اثر ملک میں جو تمدنی بیداری پیدا ہوئی وہ استثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ تحریک نے لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے بے شمار نئے طریقے نکالے حالانکہ ان سب کا کامیابی سے استعمال نہیں کیا جا سکا۔ بہر حال جس طرح اعتدال پسندوں (Moderates) کے ذریعہ کی گئی انگریزی حکومت کی مالیات کی تحقیق کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وہ اس کو عوام تک نہیں لے جا سکے اور جس طرح انتہا پسندوں (Extremists) کے کارناموں کو بھی کم نہیں سمجھا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح سودیسی تحریک کو صرف اس لیے کم اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ان طریقوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکی جن کو اس نے عوام کو متحرک کرنے کے لیے خود وضع کیے تھے۔ مگر ان طریقوں نے ایسی میراث چھوڑی جو بعد کی قومی تحریک کے لیے قوت و توانائی کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔

اس طرح سودیسی تحریک انگریزی حکومت کے خلاف پہلے راؤنڈ (چکر) کی عوامی جدوجہد تھی جس نے درحقیقت مستقبل کی جنگ آزادی کے لیے تخم ریزی کا کام کیا تھا۔ یوں اس کو ہندوستان کی جنگ آزادی کے واسطے مقابلہ کی پیچیدہ اور لمبی لڑائی لڑنے کے لیے انیٹو نیو گرامشی (Antonio Gramsci) کے ذریعہ استعمال کیے گئے اصولوں کو اپنانا چاہیے تھا۔

باب 11

کانگریس میں
تفریق اور انقلابی تخویف پسندی کا ظہور

1907 میں کانگریس میں تفریق پڑ گئی اور قریب قریب انھیں دنوں بنگال میں تخویف پسندی کا ظہور بھی ہوا۔ ان دونوں واقعات کو الگ الگ رکھ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔

1907 تک اعتدال پسند وطن پرستوں کا تاریخی رول ختم ہو چکا تھا۔ ان کے کارہائے نمایاں جن پر ہم نے گذشتہ باب میں روشنی ڈالی ہے بہت عظیم تھے۔ تمام تر دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے عوام الناس میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا اہم کام انجام دیا۔

مگر ان کی ناکامیاں بھی بہت تھیں۔ وہ عوام میں اعتماد قائم نہیں کر سکے۔ ان کے درمیان انھوں نے کوئی مثبت کام نہیں کیا اور اس طرح وہ ان کے درمیان اپنی جڑیں نہیں جما سکے۔ یہاں تک کہ ان کی ساری باتیں ان تک پہنچ بھی نہیں پائیں۔ ان کے درمیان ملکی سطح کی کوئی مہم بھی نہیں چلی۔ 1905 اور 1907 کے دوران ایسی ایک مہم ابھری تو ضرور لیکن وہ اس کے قائد نہیں بن سکے۔ (حالانکہ بنگال میں اعتدال پسندوں نے اپنے صوبہ میں سرگرمی کا مظاہر کیا)

ان کو یہ یقین تھا کہ وہ حکمرانوں سے سیاسی اور مالی سدھار کرانے میں کامیاب ہوں گے مگر ان کو بہت تھوڑی کامیابی ملی۔ ان کی اس اعتدال پسندی کی قدر کرنے کے بجائے فرنگی ان سے نفرت کرتے، ان کی سیاست کا مذاق اڑاتے اور ان کی تحریکوں پر ظلم ڈھاتے تھے۔

ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ان کے ہی اپنے کاموں نے ان کی سیاست کو الگ تھلگ کر دیا ہے۔ قومی تحریک کے نئے اسٹیج کی ضرورت کے مطابق وہ خود کو ڈھال نہ سکے۔ ان کی ناکامی کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ نئی نسل کو اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔

ابتدا سے ہی فرنگی کانگریس کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے مگر شروع میں ان کا رویہ کچھ نرم تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کو یہ یقین تھا کہ کانگریس کی کارگذاری صرف بحث و مباحثہ تک محدود رہے گی اور کچھ علم داں طبقہ کے لوگ ہی اس سے جڑیں گے، لیکن جب حکومت کو یہ معلوم ہونے لگا کہ کانگریس کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور وہ ہندستانی قومیت کی علمبردار بن رہی ہے، تب سرکاری افسران کانگریسی وطن پرستوں اور پریس کو پوری طرح شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔

اب وطن پرستوں پر غداری کا ٹھپہ لگنے لگا۔ انگریز ان کو بے وفا بابو، باغی برہمن، متشدد پاجی (Violent Villain) وغیرہ نام سے یاد کرنے لگے۔ وہ کانگریس کو باغیوں کا کارخانہ کہتے اور کانگریسوں کی بابت کہتے کہ یہ کرسی نہ پا سکنے والے مایوس اور غیر مطمئن لوگ ہیں جو اپنے سوا کسی اور کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں''۔

1888 میں وائسرائے لارڈ ڈفرن نے اپنے ایک عام خطاب میں کانگریس کا خوب مذاق اڑایا اور برا بھلا کہا کہ ''یہ مٹھی بھر بڑے (Elite) لوگوں کی بہت چھوٹی سی ٹولی ہے''[1] ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج ہملٹن نے کانگریس لیڈروں کو ''باغی اور دوغلی خصلت والا بتایا''[2]

جب اعتدال پسند کانگریسیوں جن کا پارٹی پر پورا غلبہ تھا نے تشدد پسند ساتھیوں سے الگ تھلگ رہنا شروع کر دیا، تب بھی حکومت کی دشمنی ذرہ برابر کم نہیں ہوئی۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس نے انڈین پریس کے خلاف انسدادی کارروائی تک کر ڈالی اور کانگریس کو ختم کرنے پر

پوری طرح حل گئی۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اعتدال پسند کانگریسی خیمہ چاہے جتنا وفادار اور معتدل رہا ہو، اس کے سیاسی نظریے کا پرچار سراسر حکومت کے خلاف تھا۔ وائسرائے لارڈ کرزن نے 1905 میں لکھا کہ "یا تو گوکھلے کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ کہاں جارہے ہیں، اور اگر ان کو یہ معلوم ہے تو وہ مکار ہیں۔ بیک وقت ملک میں قومی شعور پیدا کرنے کی اپیل اور برٹش حکومت کے تئیں وفاداری دونوں باتیں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں" 3 کچھ اسی انداز میں سکریٹری آف اسٹیٹ جارج ہملٹن نے دادا بھائی نوروجی کے بارے میں کہا کہ "آپ خود کو انگریزی حکومت کا مددگار کہتے ہیں مگر جو اقدام انگریزی حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں اور ان سے جو نتیجے برآمد ہوتے ہیں ان کی آپ زوردار الفاظ میں مذمت کرتے ہیں" 4

دوسری وجہ یہ ہے کہ برٹش پالیسی مرتب کرنے والے یہ محسوس کرتے تھے کہ معتدل لوگوں کے ذریعہ چلائی جارہی کانگریس پارٹی آسانی سے ختم کی جاسکتی ہے کیونکہ اول تو یہ کمزور ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ عوام میں مقبول نہیں ہے۔ کرزن جس کو ہملٹن کی تائید اور مدد حاصل تھی نے اسی پالیسی پر عمل کیا۔ اس نے 1900 میں یہ اعلان کیا کہ "کانگریس لڑکھڑا کر گرنے والی ہے۔ اور میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میرے سامنے ہی یہ بڑے اطمینان سے فنا ہوجائے" 5 1903 میں اس نے مدراس کے گورنر کو لکھا کہ "ہندوستان میں میری پالیسی یہی رہی ہے کہ میں کانگریس کو بے بس ولاچار کردوں" 6 1904 میں کانگریس کے ایک وفد سے جس کی قیادت خود اس کے صدر کررہے تھے ملنے سے اس نے ایک دم انکار کردیا۔ اس سے کانگریس کی بڑی کرکری اور رسوائی ہوئی۔

جب سودیسی اور بائیکاٹ تحریک اور مجاہدانہ قومی نظریہ نے زور پکڑا تب انگریزی حکومت کی پالیسیوں میں تبدیلی آئی۔ اس نے قومی تحریک کو کمزور کرنے کے لیے دوسری پالیسی اختیار کی۔ اس سلسلہ میں اعتدال پسندوں کی ٹھٹھولی کرنے اور مذاق اڑانے کے بجائے ان کو ساتھ لے چلنے کی حکمت پر عمل کیا گیا۔ یہ پالیسی ہندوستان کے نئے سکریٹری آف اسٹیٹ جان مارلے (John Morley) کے ذریعہ 1908 میں "ڈرا اور لالچ" (The stick and the carrot) کے اصول پر مرتب کی گئی۔ اس کے سہ رخی مقاصد تھے۔ پست کرنا، مصالحت

اور پھر کچلنا۔ شروع میں تشدد اور جنگجو نیشنلسٹوں کو پست کرنے کے لیے ہلکی کارروائی کا مشورہ دیا گیا۔ اس کا مقصد اعتدال پسندوں کو خوفزدہ کرنا تھا۔ اس کے بعد ان کو رعایت دے کر رجھانے اور سمجھانے کی اسکیم بنی۔ ان کو یہ بھی جھانسا دیا گیا کہ اگر وہ تشدد لوگوں سے الگ ہو جائیں تو ان کو مزید مراعات سے نوازا جائے گا۔ اس پالیسی کا واحد مقصد دونوں خیموں میں تفریق پیدا کر کے باری باری سے ان کو مٹا دینا تھا۔ مگر ان دونوں کی بدنصیبی تھی کہ وہ حکومت کی چال کو نہ سمجھ سکے، جس کے نتیجہ میں ان کو بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔

فرنگی حکومت نے لارڈ منٹو کی وائسرائیت اور جان مارلے کی سکریٹریٹ کے زمانے میں کانگریس کو پھنسانے اور جھانسا دینے کے لیے سدھاروں کا چارہ پھینکا۔ 1906 میں قانون ساز کونسل میں سرکار نے اعتدال پسند قیادت والی کانگریس سے بات کرنی چاہی۔ اس خیمہ کے کانگریسی لیڈران سدھاروں پر کونسل میں بات چیت کرنے اور سرکار کو مدد دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ انھیں دنوں ملک میں سودیسی تحریک زوروں پر چل رہی تھی اور اس کو کچلنے کے لیے سرکار پوری طرح مستعد تھی۔ اسی معاملہ کو لے کر کانگریسیوں میں تفریق پڑ گئی۔ حکومت کا مقصد پورا ہوا۔ اس سے پہلے کہ اس تفریق کے بارے میں مفصل چرچہ کی جائے، یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ کانگریس کے دونوں رجحانات والے گروپ کو الگ کرنے کی انگریزوں کی پالیسی بعد کے سالوں میں بھی جاری رہی، مثلاً 1924 میں سوراج وادیوں سے، 1926 میں نہرو اور بائیں بازو والوں سے اور 1942 میں تحریک چلانے والوں سے اعتدال پسندوں کو الگ رکھنے اور ان میں تفریق پیدا کرنے کی کوششیں برابر کی گئیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ 1907 سے 1909 تک کے واقعات سے قومی قیادت سبق لے چکی تھی، اس لیے وہ انگریزوں کی چال میں نہیں پھنسی۔ تمام تر نظریاتی فرق کے باوجود قیادت میں اتحاد قائم رہا۔

1905 اور 1907 کے دوران دونوں خیموں میں زبردست بحث ومباحثے ہوئے۔ ان کے نظریاتی اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ ان سب کے باوجود بنگال تقسیم کے مسئلہ پر دونوں نے مل کر جدوجہد کی۔ انتہا پسند سودیسی تحریک کو پورے ملک میں چلانا چاہتے تھے۔ وہ صرف بدیسی سامان کے بائیکاٹ سے ہی مطمئن نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ انگریزی حکومت کو کسی بھی

طرح کا تعاون نہ دیا جائے اور اعتدال پسند حضرات اس تحریک کو صرف بنگال تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ حکومت کے ساتھ ملکی سطح کے عدم تعاون کے خلاف تھے۔

1906 میں کلکتہ اجلاس میں صدارت کے مسئلہ کو لے کر پارٹی میں تقسیم کی نوبت آ گئی، لیکن دادا بھائی نوروجی جو نیشنلسٹوں کے درمیان عظیم وطن پرست کی حیثیت سے بہت محترم تھے کے صدر بننے سے پارٹی کی ہورہی تقسیم ٹل گئی۔ اس اجلاس میں سودیسی بائیکاٹ تحریک، قومی تعلیم اور سوراج سے متعلق تجاویز بھاری اکثریت سے پاس ہوئیں۔ مگر ان تجاویز کے مسودے کی تشریح کرنے کے سلسلہ میں دونوں گروپ 1907 تک برسر پیکار رہے اور 1907 کے آخر تک نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں گروپ ایک دوسرے کو دشمن ماننے لگے۔ انتہا پسندوں کو اب یہ یقین ہو گیا تھا کہ آزادی کی لڑائی شروع ہو گئی ہے اور عوام میں سیاسی بیداری آ گئی ہے۔ اس لیے یہی وہ مناسب وقت ہے جب بنگال میں تحریک کو مزید تیز کیا جائے اور اسے ملک کے دوسرے حصوں تک پھیلایا جائے۔ ان کو یہ بھی گمان ہوا کہ اعتدال پسند نیشنلسٹ اس میں روڑا ہیں۔ زیادہ تر انتہا پسندوں جن کی قیادت آروند گھوش کر رہے تھے کا خیال تھا کہ اعتدال پسندوں سے ناطہ توڑنے اور ان سے کانگریس کی قیادت چھین لینے کا وقت آ گیا ہے اور انھوں نے یہ بھی طے کیا کہ اگر اس میں کامیابی نہ ملے تو کانگریس کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔

زیادہ تر اعتدال پسند جن کی قیادت فیروز شاہ مہتا کر رہے تھے بھی چاہتے تھے کہ کانگریس کا بٹوارہ ہو جائے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انتہا پسندوں کے ساتھ رہنا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ان کو یہی خدشہ تھا کہ بیس سال کی محنت سے جو تنظیم بنی ہے وہ انتہا پسندوں کی وجہ سے ایک جھٹکے میں بکھر جائے گی کیونکہ سرکار حکومت مخالف کسی بھی تنظیم کو کچلنے کے لیے تیار ہے۔ ایسے حالات میں اپنی ہی ہلاکت کے لیے حکومت کو کیوں دعوت دی جائے۔ 1907 میں گوکھلے نے انتہا پسندوں کو مخاطب کر کے لکھا کہ ''آپ حکومت کی طاقت کو قطعی محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اگر کانگریس آپ کے مشورے پر عمل کرے گی تو حکومت کو اسے ختم کرنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے گا''۔7 منٹو اور مارلے کو اعتدال پسندوں سے بہتر امیدیں تھیں اور زیادہ تر اعتدال پسند بھی یہی سوچتے تھے کہ سیاست اور حکومت میں ان کی شرکت داری کا خواب اب پورا ہونے جا رہا

ہے۔ جلد بازی میں انتہا پسند اگر کوئی قدم حکومت کی مرضی کے خلاف اٹھاتے ہیں تو انگلینڈ کی لبرل پارٹی ناراض ہو جائے گی۔ اس لیے وقت رہتے انتہا پسندوں سے دامن چھڑا لیا جائے۔ اب ان سے دوستی بڑی مہنگی پڑے گی۔

ایچ۔اے۔ وادیہ (H.A. Wadya) جو فیروز شاہ مہتا کے خیالات کی نمائندگی کرتے تھے نے ایک شمارہ میں انتہا پسندوں کو 'سب سے بڑا دشمن' بتاتے ہوئے لکھا کہ ''ان کا کانگریسیوں سے ویسا ہی تعلق ہے جیسا جسم کے کسی بیمار حصہ کا پورے جسم کے دوسرے تندرست حصے سے ہوتا ہے۔ اگر خراب خون کے سبب آدمی کو موت سے بچنا ہے تو اسے اس حصہ کو کاٹ کر الگ کرنا پڑے گا''8

دونوں ہی خیموں میں کمیاں تھیں۔ دونوں کو آپسی اختلاف اور قومی نظریہ کے نقطۂ نگاہ سے دھوکا ہو رہا تھا۔ اعتدال پسند یہ نہیں سمجھ سکے کہ حکومت ان کی طاقت کے ڈر سے نہیں بلکہ انتہا پسندوں کے ڈر سے بات چیت کر رہی ہے۔ اسی طرح انتہا پسندوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اعتدال پسند ان کے لیے (سول آزادی وغیرہ کے معاہدے پر) دفاعی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ نیز وہ یہ بھی نہیں سوچ سکے کہ اپنے بل بوتے پر برٹش حکومت جیسی طاقتور سرکار سے لوہا نہیں لے سکتے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچ سکے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں ایک طاقتور سرکار حکومت کر رہی ہو، کوئی بھی تحریک تبھی کامیاب ہو سکتی ہے جس کا دائرہ ملکی سطح پر ہو اور اس کی قیادت کوئی ٹھوس اور مضبوط تنظیم کر رہی ہو۔ ایسی بات بھی نہیں کہ اس وقت ملک میں ہوش مند سیاست داں نہ رہے ہوں۔ دونوں خیموں میں تلک (انتہا پسندوں کے) اور گوکھلے (اعتدال پسندوں کے) بیدار مغز لیڈر تھے۔ وہ لوگ وطن پرستوں کے درمیان دوری کے خطرہ کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ تلک نہیں چاہتے تھے کہ متحدہ قومی مورچہ ٹوٹے۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مختلف سیاسی نظریات کے درمیان بغیر اتحاد قائم کیے نہ تو کوئی زوردار تحریک چلائی جا سکتی ہے اور نہ حکومت پر سیاسی مطالبات کو منوانے کے لیے دباؤ بنایا جا سکتا ہے۔ ان کی حکمت عملی تو یہ تھی کہ پہلے اپنے سیاسی نظریہ کے تئیں لوگوں کی بھاری تائید حاصل کی جائے، اس کے بعد اعتدال پسندوں کو مصالحت کے لیے مجبور کیا جائے مگر مہاراشٹر کے ان کے انتہا پسند ساتھیوں اور بنگال کے کچھ اور ہی زیادہ انقلابیوں

نے ان کی حکمت عملی کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کی چال کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہی نہیں بلکہ انھیں انتہا پسندوں کی وجہ سے ان کو آروند گھوش جیسے کٹر انتہا پسند کے ساتھ جانا پڑا۔

گوکھلے نے بھی قومی خیموں میں توڑ پھوڑ کے خطرہ کو محسوس کر لیا تھا۔ انھوں نے اس کو ٹالنے کے لیے حتی الامکان کوشش بھی کی۔ 1907 میں انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا ''توڑ پھوڑ کا مطلب تباہی اور تب نوکر شاہ کے لیے دونوں خیموں کو کچلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی'۔9 لیکن گوکھلے کی ایسی ہمت نہیں تھی کہ وہ فیروز شاہ مہتا جیسے طاقتور ضدی شخص کے سامنے ٹک پاتے۔ اس طرح ان کو بھی اپنے ہی خیمہ کے انتہا پسندوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

26 دسمبر 1907 میں تاپتی ندی کے کنارے سورت میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ انتہا پسند اس افواہ سے بے حد پریشان تھے کہ اعتدال پسند کلکتہ اجلاس کے چاروں تجاویز کو بے اثر کر دینا چاہتے ہیں۔ گذشتہ تین دنوں میں سورت میں ہوئی عام میٹنگوں میں اعتدال پسندوں کا خوب مذاق اڑایا گیا تھا اور ان کے خلاف خوب زہر اگلا گیا تھا۔ اس سے وہ بہت دُکھی تھے۔ اس لئے سورت اجلاس میں پوری طرح غم وغصہ اور اشتعال کا ماحول بنا رہا۔

انتہا پسند چاروں قراردادوں کی گارنٹی چاہتے تھے۔ اس کے لیے اعتدال پسندوں پر دباؤ بنانے کی غرض سے انھوں نے صدر راس بہاری گھوش جو باقاعدہ چنے گئے تھے، کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں خیمے پہلے سے ہی جھگڑنے کے لیے آئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں 1600 نمائندے ایک دوسرے پر چیخنے لگے، مار پیٹ پر آمادہ ہو گئے اور کرسیاں پھینکنے لگے۔ اسی درمیان کسی نامعلوم شخص نے ڈائس پر جوتا پھینکا جو فیروز شاہ مہتا اور سریندر ناتھ بنرجی کو لگا۔ اس کے بعد پولیس آئی۔ اس نے میٹنگ ہال کو خالی کرایا۔ اجلاس ختم ہوگیا۔ اس میں فتح انگریزی حکومت کی ہوئی۔ منٹو نے فوراً مارلے کو لکھا ''سورت میں کانگریس کا ڈھیر ہونا ہماری بہت بڑی فتح ہے'۔10

تلک نے اس خطرہ کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور انھوں نے اس کو ٹالنے کے لیے آخری دم تک کوشش کی تھی۔ مگر وہ اپنے پیروؤں کے سامنے مجبور تھے۔ لالہ لاجپت رائے جو انتہا پسند خیمہ کی طرف سے اس واقعہ میں شریک تھے انھوں نے بعد میں لکھا کہ 'اپنی پارٹی کی رہنمائی کرنے کے بجائے تلک بذاتِ خود پارٹی کے گنوار دسوچ سے متاثر ہو گئے۔ سورت میں میری گذارش پر

دوبارہ راس بہاری گوش کے انتخاب کی مخالفت چھوڑنے اور کلکتہ اجلاس کے چاروں قراردادوں کو نائب کمیٹی کو سپرد کرنے کے لیے راضی ہو گئے تھے مگر جیوں ہی میں ان کے پاس سے ہٹا وہ اپنے حالی موالی کی رائے کے سامنے مجبور ہو گئے"۔11

تلک سورت کے اس واقعہ سے حیرت میں پڑ گئے۔ وہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو۔ اس کے بارے میں آروند گوش نے بعد میں لکھا کہ "تلک جانتے تھے کہ کانگریس کی تقسیم بہت بڑی آفت لائے گی"۔ ان کی نگاہ میں کانگریس اس وقت قوم کی بہت بڑی ضرورت اور سچائی تھی اور اس سے بہت سی امیدیں جڑی تھیں"۔ 12 تلک نے بعد میں اس نفاق کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ انھوں نے اپنے مخالفین کو خط لکھ کر افسوس ظاہر کر کے راس بہاری گھوش کو کانگریس کا صدر مان لیا اور کانگریس کو متحد کرنے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ لیکن فیروز شاہ مہتا اور ان کے ساتھیوں کا اڑیل رخ بنا رہا۔ اس میں ذرہ برابر نرمی نہیں آئی۔ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جیت انھی کی ہوگی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی تقسیم سے دونوں میں سے کسی گروپ کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ یہ دونوں کے لیے مصیبت کا باعث بنی۔ اس واقعہ کے فوراً بعد حکومت نے انتہا پسندوں کو کچلنے کی زوردار مہم شروع کی۔ ان کے اخبارات بند کر دیے گئے۔ ان کے خاص لیڈر تلک کو قید کر کے چھ سال کے لیے مانڈلے جیل بھیج دیا گیا۔ ان لوگوں کے بے حد اصول پرست لیڈر آروند گھوش جو حکومت کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں ملزم تھے کو ججوں نے بے قصور مان کر رہا کر دیا تھا انھوں نے مذہبی زندگی گذارنے کے لیے پانڈیچری کی راہ لی۔ بی۔ سی۔ پال وقتی طریقہ سے سیاست سے الگ ہو گئے اور لالہ لاجپت رائے جو سورت سانحہ کے مجبور تماشائی تھے 1908 میں انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں سے 1909 میں لوٹ کر آنے پر امریکہ چلے گئے۔ ایسی حالت میں انتہا پسند اپنی کوئی دوسری مضبوط پارٹی نہیں بنا سکے جو تحریک کو آگے بڑھاتی۔ اس طرح حکومت تھوڑے دنوں کے لیے ان کو دبانے میں کامیاب رہی۔

ان واقعات سے اعتدال پسندوں کو بڑی خوشی نہیں ہوئی۔ ان کو محسوس ہوا کہ اب ان کے لیے میدان صاف ہو گیا ہے۔ اس لیے انھوں نے بنارس و کلکتہ اجلاسوں میں جدوجہد کے لیے تجویز کردہ تمام بنیادی طریقوں کو چھوڑ دیا۔ کانگریس کے اندر اتحاد پیدا کرنے کے لیے انتہا پسندوں کے ذریعہ بتائی گئی تجاویز کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ ان کو پارٹی سے

نکال بھی دیا۔ انھوں نے سوچا کہ اب وہ دوبارہ پارٹی کو از سر نو زندہ کرنے، سجانے اور سنوارنے جارہے ہیں''۔ لیکن کانگریس کی روح نکل چکی تھی۔ اس لیے اس کو زندہ کرنے کی ان کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ ہندستانی عوام خصوصاً نوجوانوں کے درمیان ان کی قدرو قیمت جاتی رہی اور سیاست کے میدان میں ان کا سہارا ملنا بند ہو گیا۔ صرف گوکھلے اپنے سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی (Servant of Indian Society) کے کچھ ساتھیوں کی مدد سے میدان میں ڈٹے رہے۔ سیاسی اعتبار سے بیدار ہندوستانیوں کی اکثریت لوک مانیہ تلک اور انتہا پسندوں کو مدد دینے لگی۔

1908 کے بعد قومی تحریک روبہ زوال ہوگئی۔ 1909 میں جب آروندو گھوش جیل سے رہا ہوئے تب انھوں نے بدلے ہوئے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا'' جب میں جیل جارہا تھا تو پورے ملک میں بندے ماترم کی گونج تھی، پورا ملک نئی قوم بننے کی امید میں زندہ تھا، لاکھوں لوگوں کے دل نئی سیاسی بیداری سے روشن تھے، لیکن جب میں جیل سے باہر آیا تو بندے ماترم کی گونج کے بجائے، پوری طرح خاموشی تھی، پورے ملک پر سکوت طاری تھا''13 لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوام کے دلوں سے قومی احساسات ختم ہو گئے تھے بلکہ لوگ اگلے دور کے منتظر تھے۔ 1914 میں جب تلک جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے تحریکی سرگرمی پھر سے شروع کر دی۔

1909 کے آئینی سدھار سے اعتدال پسندوں اور کل ملا کر پورے ملک کو بڑی مایوسی ہوئی۔ انڈین کونسل ایکٹ 1909 کے تحت امپیریل لجسلیٹو کونسل (Imperial Legislative Council) اور پروونشیل کونسل (Provincial Council) میں منتخب نمائندوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا مگر زیادہ تر نمائندوں کا انتخاب اب بھی بالواسطہ ہوتا تھا۔ گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل (Governor General's Executive Council) میں ایک ہندستانی کی بھی تقرری ہوتی تھی۔ امپیریل کونسل کے 68 نمائندوں میں 36 سرکاری افسران اور 5 غیر سرکاری اشخاص نامزد کیے جاتے تھے۔ 27 منتخب نمائندوں میں چھ کا انتخاب بڑے زمیندار اور دو کا انگریز سرمایہ دار کرتے تھے۔ نئے قانون نے ممبروں کو قرار داد

(Resolution) رکھنے اور سوال پوچھنے کا حق دیا تھا۔ مختلف بجٹ قراردادوں پر رائے دینے کا بھی اختیار دیا گیا۔ مگر ان سب کے باوجود کونسلوں کو عملاً کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ محض صلاح کار ادارے تھے۔ سوراج یا جمہوریت کی بات یہاں نہیں اٹھائی جا سکتی تھی۔ اس طرح ان تمام سدھاروں کے باوجود فرنگی حکومت کے غیر جمہوری، بدیسی اور استحصال کرنے والے کردار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مارلے نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا ''اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نئے سدھاروں کے تحت بلاواسطہ یا بالواسطہ ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت قائم ہو جائے گی تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ میرا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے''14

مارلے منٹو سدھاروں کا واحد مقصد وطن پرستوں کے خیمے میں تفریق پیدا کرنا اور مسلم فرقہ واریت کو بھڑکا کر ہندوستانیوں کے درمیان روز بروز بڑھتے ہوئے اتحاد کو روکنا تھا۔ اسی غرض سے حلقہ انتخاب کا بٹوارہ ذات اور دھرم کی بنیاد پر کیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے سیٹیں محفوظ کردی گئیں جہاں مسلم امیدواروں کو صرف مسلمان ہی ووٹ دے سکتے تھے۔ اس ترکیب کے ذریعہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور تمدنی دلچسپیاں مختلف ہیں۔ اس طرح انگریزوں کے ذریعہ مسلمانوں کے لیے الگ حلقہ انتخاب بنانا ایک ایسا زہریلا پودا لگانا تھا جس نے بعد میں ملک کے لیے فرقہ واریت کا ویسا ہی پھل پیدا کیا۔

1907 کے آخر تک ہندوستان کی سیاست میں ایک اور موڑ آیا۔ فرنگی حکوست سے ناراض بنگالی نوجوان نے انفرادی بہادری اور انقلابی دہشت گردی کا راستہ اپنایا۔ آزادی کی جدوجہد اور جذبات کے اظہار کے لیے اب ان کے پاس کوئی دوسرا طریقہ نہیں بچا تھا۔ اعتدال پسندوں کی سیاست عملاً ناکام ہو رہی تھی۔ سرکاری افسروں کے گھمنڈ اور ظالمانہ کارروائیوں نے بنگال کے نوجوانوں کو دہشت پسند بنا دیا۔ ان کو یہ احساس ہوا کہ پرامن احتجاج کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں۔ اعتدال پسندوں کی سیاست ان کو بھیک منگی سیاست لگی۔ اس لیے انھوں نے بم کی سیاست اپنائی۔ اس کے لیے انتہا پسند بھی ذمہ دار تھے۔ وہ عوام کی صحیح اگوا کاری نہیں کر سکے حالانکہ تحریک کے لیے جو پالیسی اور پروگرام انھوں نے طے کیے تھے وہ صحیح تھے۔ انھوں نے تحریک کو صرف پرچار اور احتجاج تک محدود نہ رکھ کر اس کو آگے لے جانے کی بات کہی۔ بائیکاٹ تحریک کو

صرف بدیسی کپڑوں تک محدود نہ رکھ کر اسے بدیسی عدالتوں اور تعلیمی اداروں وغیرہ کو بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا۔ نوجوانوں سے قربانی دینے کی اپیل کی گئی اور سیدھی کارروائی کا بگل بجایا گیا۔

لیکن ان میں سے کسی پر بھی عمل نہیں کیا جاسکا۔ انتہاپسند یہ نہیں طے کر پائے کہ ان پر عمل کرنے کے لیے کیا طریقے اپنائے جائیں۔ وہ کوئی ایسی تنظیم بھی نہیں بنا سکے جو تحریک کو آگے لے جاتی۔ یہی نہیں، وہ عوام کو اپنی پالیسی اور پروگرام بھی نہیں سمجھا سکے۔ کس طرح وہ اعتدال پسندوں سے مختلف ہیں، یہ بات بھی وہ نہ صاف کر سکے۔ البتہ وہ اعتدال پسندوں سے زیادہ سخت اور جوشیلے اور قربانی کے جذبات سے سرشار تھے اور ہر طرح کی مصیبت جھیلنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ تحریک کو کیسے آگے بڑھایا جائے۔ وہ عوام کے سامنے سیاسی جدوجہد کرنے کے لیے نئی پالیسی نہیں رکھ سکے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1907 کے آخر تک ان کی بھی سیاسی موت ہوگئی۔ ان کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنی قوت کو اعتدال پسندوں کی تنقید کرنے اور کانگریس پر قبضہ کرنے کی جگت میں ضائع کیا۔ ان کی لفاظی کا نوجوانوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ تو طاقت کے زور سے فرنگی حکومت کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ یوگانتر (Yugantar) اخبار نے باری سال کانفرنس میں پولیس لاٹھی چارج کے بعد ان کے زخم خوردہ جذبات کی عکاسی اس طرح کی ہے "ہندوستان کے تیس کروڑ لوگوں کے ساٹھ کروڑ ہاتھ انگریزوں کے ظلم کو روکنے کے لیے اٹھ جائیں اور طاقت کو طاقت سے ہی روکا جائے"۔[15]

لیکن سوال یہ تھا کہ طاقت کے استعمال کا کون سا طریقہ اپنایا جائے۔ اس کے لیے ملکی سطح پر رائے عامہ تیار کرنے کی ضرورت تھی یہ دشواریوں سے بھرا کام تھا۔ فوج کو فرنگی حکومت کے خلاف کرنا بھی آسان نہیں تھا اور اس کے لیے لمبی مدت درکار تھی۔ اس لیے نوجوانوں نے بروقت اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے آئرلینڈ کے وطن پرستوں، روسیوں کے نہلسٹوں (Nihilists) اور پاپولیسٹوں (Populists) جیسے طریقوں کو اپنانے کا فیصلہ لیا۔ انھوں نے انگریز افسروں کو قتل کرنے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے کام سے انگریز حکمراں خوفزدہ ہوں گے اور ہندستانی عوام کو جدوجہد کرنے کے لیے حوصلہ ملے گا اور ان کے دل سے حکومت کا خوف ختم ہوگا۔ اس طرح کے قتل سے قاتل کو پھانسی ضرور ملے گی۔ اس سے لوگوں کے

حوصلے بڑھیں گے اور جدوجہد اور زور پکڑے گی۔ بس اس کے لیے سرفروش نوجوان کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے نوجوانوں سے اپیلیں کی گئیں ،ان کو جوش دلانے کے لیے ان کے اندر چھپی بہادری کو جگایا گیا۔ دیکھتے دیکھتے تمام نوجوان اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

یہاں انتہا پسندوں نے پھر نوجوانوں کو صحیح راہ نہیں دکھائی ان کی بہادری، ہمت اور قربانی کے جذبات کی تعریف میں قصیدے تو پڑھے گئے مگر خود کو ان سے الگ رکھا گیا۔ عوامی تحریک کے بارے میں صحیح تمیز رکھنے کے باوجود وہ اپنی انقلابی طاقت کا مثبت اظہار نہ کر سکے اور نہ نوجوانوں کو یہ حقیقت سمجھا سکے کہ عوامی بنیاد پر قائم تحریک اور انفرادی بہادری کے جذباتی جدوجہد میں بڑا فرق ہے۔ وہ ان کو یہ بتانے میں بھی ناکام رہے کہ انقلابی ہونے کا مطلب ہے تشدد ہونا۔ دراصل اروند گھوش نے نوجوانوں کی اس سلسلہ میں ہمت افزائی کی۔ شاید ان کا نظریہ تھا کہ ان نوجوانوں جن کو گرفتار کرنے کے لیے فرنگی حکومت در پے ہے کی تنقید کرنا مناسب نہیں ہے۔ مگر نوجوانوں کے اس طرح کے جذباتی اور غیر دور اندیش اقدامات کی تنقید نہ کرنا ان کی بڑی بھول تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انقلاب کے انفرادی اور دہشت گردی کے نظریے نے بنگال میں اپنی جڑیں جمالیں۔

1904 میں وی۔ ڈی۔ ساورکر (V.D. Savarkar) نے ابھینو بھارت (Abhinav Bharat) نام کی ایک خفیہ تنظیم بنائی، 1905 کے کچھ اخبار کھلے اور کچھ خفیہ طور سے انقلابی دہشت گردی (Revolutionary terrorism) کی وکالت کرنے لگے 1907 میں بنگال کے لفٹیننٹ گورنر کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی 1908 میں خودی رام بوس اور پرفل چاکی نے ایک بگھی پر یہ سمجھ کر بم پھینکا کہ اس میں مظفر پور کا بدنام جج کنگس فورڈ (Kingsford) سوار ہے، مگر ان کا اندازہ غلط نکلا۔ بدقسمتی سے دو انگریز عورتوں کی جان گئی۔ خودی رام بوس نے تو خودکشی کر لی اور پرفل چاکی پر مقدمہ چلا اور ان کو پھانسی دی گئی۔ ان کی پھانسی پر ہزاروں لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ دونوں وطن پرستوں کے زمرے میں آگئے۔ ان کی بہادری کے گیت ملک بھر میں گائے گئے۔

اس طرح انقلابی دہشت گردی کا دور شروع ہوا۔ دیکھتے دیکھتے ملک بھر میں انقلابیوں

کی خفیہ تنظیمیں بن گئیں۔ ان میں سے سب سے مشہور اور زیادہ مدت تک چلنے والی انوشیلن (Anushilan) اور یوگانتر (Yugantar) سمتیاں تھیں۔ خاص طور سے یہ دو کام کرتی تھیں..........ظالم افسروں، مخبروں اور غداروں کو قتل کرنا اور ڈاکہ زنی کر کے ہتھیار خریدنے کے لیے پیسے حاصل کرنا۔ بعد میں اس طرح کی ڈکیتی کو سودیسی ڈکیتی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس دور میں دو غیر معمولی دہشت گردی کے کام راس بہاری بوس اور سچن سانیال کی قیادت میں کیے گئے پہلا یہ تھا کہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ ایک جلوس میں ہاتھی پر سوار وائسرائے پر بم پھینکا گیا۔ جان تو بچ گئی۔ مگر وہ گھائل ہو گیا۔ لندن میں مدن لال ڈھینگرا (Madan Lal Dhengra) نے کرزن وائی لائی (Curzon Wylie) کو قتل کر دیا۔

1908 اور 1918 کے درمیان سبھی انقلابی یا تو مار ڈالے گئے یا جیل میں ڈال دیے گئے۔ ان لوگوں نے بدیسوں میں بھی اپنے مرکز قائم کر لیے تھے۔ لندن میں شیام جی کرشن ورما، دی۔ ڈی۔ سادر کر اور ہر دیال اور یورپ میں میڈم کاما (Madam Cama) اور اجیت سنگھ بہت مشہور تھے۔

انقلابی دہشت گردی دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔ عوامی مدد کے محروم آخر انفرادی بہادری حکومت سے کب تک مقابلہ کرتی۔ انقلابیوں کی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں طاقتور فرنگی حکومت کے سامنے ٹک نہ سکیں۔ مگر ان کی ناکامیوں نے ہندوستانیوں میں وہ بہادری پیدا کی اور ان کو ایسا حوصلہ دیا جس نے ان کے وطنیت کے نظریہ کو مستحکم اور مضبوط کیا۔ بقول ایک مورخ ''انھوں نے ہماری مردانگی کو پھر سے جگا دیا''[16]

باب-12

پہلی جنگ عظیم اور ہندستانی قوم پرستی: غدر

1914 .میں پہلی جنگ عظیم کے چھڑنے سے اس قومی تحریک میں جان پڑی جو سودیشی تحریک کی سرگری کے دنوں سے ہی سرد پڑ گئی تھی۔ انگلینڈ کی زحمت بھارت کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ اس کی پریشانی کا فائدہ مختلف طریقوں اور کامیابیوں کی شکل میں اتری امریکہ کے غدر انقلابیوں اور ہندوستان میں لوک مانیہ تلک اور اینی بیسنٹ (Annie Besant) اوران کے ہوم رول لیگ (Home Rule League) کے ذریعہ اٹھایا گیا۔ غدر انقلابیوں نے مسلح جدوجہد اور ہوم رول والوں نے ملکی سطح پر تحریک چلا کر انگریزی حکومت کو اکھاڑنے اور سوراج یا ہوم رول قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔

شمالی امریکہ کا مغربی ساحل 1914 کے بعد متواتر کثیر تعداد میں پنجاب سے جارہے لوگوں کا مسکن بن گیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر پنجاب کے کثرت آبادی والے علاقے جیسے جالندھر اور ہوشیار پور اضلاع کے کھیتی کے بھوکے کسان تھے جو روزی روٹی کی تلاش میں یہاں

آ کر آباد ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ سیدھے پنجاب کے گاؤں سے وہاں گئے تھے اور کچھ بہت پہلے دور پورب میلے (Malay) اور فجی (Fiji) میں بس گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ فوج کے رٹائر سپاہی تھے جن کو ہندستانی فوج میں ہونے کی وجہ سے دور دراز ملکوں کو جانے کا موقع ملا تھا۔ وہاں ان کو اچھی زندگی جینے کی امیدیں تھیں۔ ایسے حالات میں وہ اپنی اور اپنے بچوں کی خوش حال زندگی بنانے کے لیے زمین جائداد فروخت کر کے یا گروی رکھ کر اپنے سپنوں کی دنیا میں بسنے کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

لیکن ان تھکے ماندے ترک وطن کرنے والے لوگوں کے لیے کناڈا اور امریکہ امید کے خلاف ثابت ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو امریکہ میں گھسنے تک نہیں دیا گیا خصوصاً ان لوگوں کو جو سیدھے گاؤں سے گئے تھے اور مغربی طور طریقوں سے ناواقف تھے۔ جن کو رہنے کی اجازت ملی انھیں نسلی منافرت جھیلنی پڑی۔ گوری چمڑی کے مزدور ان کو پھوٹی آنکھ بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اور ان کی تنظیموں نے ہندستانی مزدوروں کے داخلہ کے خلاف پوری مہم چھیڑ دی۔ ان کا ووٹ بھنانے کے لیے ان کے نیتاؤں نے بھی ان کا پورا ساتھ دیا۔ اس وقت ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ (Secretary of State for India) نے بھی ہندوستانیوں کے بدیس میں بسنے پر پابندی لگانے کی مانگ کی کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ گورے مزدوروں کی صحبت میں رہنے پر ان کے دلوں میں انگریزوں کے لیے جو عزت ہے اس کو ٹھیس لگے گی، اسی احساس کے تحت ہی تو انگریز ہندوستان پر حکمرانی کر رہے تھے نہ کہ طاقت کے زور سے۔ ان کو یہ بھی فکر تھی کہ کہیں ہندستانی مزدور ساج وادی نظریہ سے نہ متاثر ہو جائیں۔ یہ تو ظاہر ہی تھا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جائے گا اور ان کا یہ عمل ان کو ہندوستان میں قومی تحریک چلانے میں کافی حوصلہ دے گا[1]۔ ان سارے خدشات کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1908 میں کناڈا میں داخل ہونے کے سلسلہ میں ہندوستانیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ تارک ناتھ داس (Tarak Nath Das) جو ہندستانی طالب علم اور اتری امریکہ میں ہندوستانیوں کے اولین لیڈر تھے نے اپنے اخبار فری ہندوستان (Free Hindustan) میں لکھا تھا کہ انگریزی حکومت چاہتی تھی کہ ہندستانی مزدور فجی میں انگریز پلانٹروں کے یہاں کام

کریں وہ امریکہ نہ جائیں تا کہ آزادی کا چھوت ان کو نہ لگ سکے۔

میز بان ملکوں کے امتیازی سلوک سے ہندوستانیوں کے دلوں میں سیاسی اضطراب پیدا ہونے لگا۔ 1907 میں ہی مغربی ساحل پر جلا وطنی کی زندگی گذار رہے رام ناتھ پڑی (Ram Nath Puri) نے ''سرکلر آزادی'' نام کا ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس میں انھوں نے سودیسی تحریک کو مدد دینے کا عہد کیا تھا۔ تارک ناتھ داس نے وینکور (Vancouver) میں ''فری ہندوستان''(Free Hindustan) نکالنا شروع کیا جس کی زبان بے انتہا جوشیلی اور وطن پرستی کے جذبہ سے لبریز ہوتی تھی۔ جی۔ ڈی۔ کمار نے وینکور میں سودیش سیوک ہوم (Swadesh Sewak Home) قائم کیا اور ''لندن ہاؤس''(London House) کے طرز پر ''سودیش سیوک'' نام کا اخبار گورمکھی زبان میں نکالنا شروع کیا۔ اس کے ذریعہ سماج سدھار کی وکالت کی گئی اور ہندستانی فوج کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے جوش دلایا گیا۔ 1910 میں تارک ناتھ داس اور جی۔ ڈی کمار کو وینکور چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ امریکہ آکر انھوں نے سیٹل (Seattle) میں یونائیٹڈ انڈیا ہاؤس (United India House) نام کی ایک تنظیم قائم کیا۔ یہاں وہ لوگ ہر سنیچر کو پچیس ہندستانی مزدوروں کے درمیان تقریر کرتے تھے۔ یونائیٹڈ انڈیا ہاؤس میں زیادہ تر لوگ انتہا پسند وطن پرست طلبا تھے۔ ان کا تعلق کھالسا دیوان سوسائٹی (Khalsa Diwan Society) سے بھی ہو گیا۔ 1913 میں ان تنظیموں نے لندن کو کالونیل سکریٹری اور ہندوستان کے وائسرائے اور دوسرے سرکاری افسروں کے پاس بات چیت کرنے کے لیے وفد بھیجا۔ لندن میں اس کے نمائندوں نے کلونیل سکریٹری سے ملنے کے لیے پورے ایک ماہ انتظار کیا مگر سکریٹری کو اس کے لیے موقع نہ مل سکا۔ البتہ ہندوستان میں وائسرائے اور پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر سے ملاقات کرنے میں ان کو کامیابی مل گئی۔ مگر اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ ان لوگوں کو لاہور، لدھیانہ، امبالا، فیروز پور، جالندھر اور شملہ میں لوگوں کی میٹنگوں کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ ہر جگہ ان کا بڑے جوش وخروش سے خیر مقدم ہوا اور عوام اور پریس نے ان کی پرزور تائید کی[20]

کناڈا اور امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کی مسلسل تحریکوں نے لوگوں کے دلوں میں

قومی بیداری اور باہمی اتحاد کو جنم دیا۔ بدیسی قانون جیسے ایلین لینڈ لا (Alien Land Law) جس کے تحت بدیسیوں کو امریکہ میں زمین خریدنے کی ممانعت وغیرہ کو بدلوانے کے لیے ان تنظیموں کے نمائندوں نے انگلینڈ اور ہندوستان کی برٹش سرکاروں سے مدد لینے کی پوری کوشش کی مگر یہ سرکاریں راضی نہیں ہوئیں۔ اس سے ہندوستانیوں میں اور بھی بے اطمینانی بڑھی مگر اس سے قومی تحریک کو بڑی قوت ملی۔

اس انقلابی تحریک کو پہلی مہمیز بھگوان سنگھ نام کے ایک سکھ گرنتھی سے وینکور آنے پر 1913 میں ملی۔ وہ ہانگ کانگ اور ملیے (Malay) میں کام کر چکے تھے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور اسے اکھاڑ پھینکنے کے لیے عوام سے ''بندے ماترم'' کو انقلابی سلام ماننے کی اپیل کی۔ لیکن وہ کناڈا میں صرف تین ماہ ہی رہ سکے۔ اس کے بعد سرکار نے ان کو وہاں سے نکال دیا۔

ان کے اخراج کے بعد امریکہ سیاسی سرگرمی کا مرکز بن گیا۔ یہاں نسبتاً سیاسی ماحول زیادہ کھلا ہوا تھا۔ سیاسی جلاوطنی کی زندگی گذار رہے لالہ ہردیال نے یہاں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا۔

ہردیال 1911 میں کیلی فورنیا پہنچے۔ کچھ دن انھوں نے وہاں اسٹینفورڈ یونیورسٹی (Stanford University) میں تدریسی کام انجام دیا۔ پھر جلدی ہی وہ سیاسی سرگرمی میں شامل ہو گئے۔ 1912 کے موسم گرما میں امریکی علم داں طبقوں، مزدوروں اور انتہا پسندوں کے درمیان گھوم گھوم کر حکومت مخالف اور مزدور موافق تحریکوں پر تقریر کرتے رہے۔ مگر بدیس میں بسے لوگوں کی دشواریوں پر انھوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے بعد 23 دسمبر 1912 میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر ہوئے بم کے حملہ نے ان کے اندر چھپے انقلابی جذبات کو جھنجھوڑ دیا۔ اب ان کو بھروسہ ہو گیا کہ ہتھیار کی طاقت سے فرنگی حکومت کا تختہ پلٹا جا سکتا ہے۔ تبھی انھوں نے یوگانتر سرکلر جاری کر کے وائسرائے پر ہوئے حملہ کی تعریف کی۔

انھیں دنوں امریکہ کے مغربی ساحل پہ بسے ہندوستانیوں کو ایک نیتا کی شدید تلاش تھی اور اس کے لیے ان لوگوں نے اجیت سنگھ جو پنجاب تحریک کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے تھے، کو

بلانے پر غور بھی کیا تھا۔ مگر ان کو وہیں ان کا لیڈر مل گیا۔ لالہ ہردیال دسمبر 1912 میں بخوشی اس کے لیے تیار ہو گئے۔ جلد ہی مئی 1913 میں انھوں نے ہندی ایسوسی ایشن (Hindi Association) نام کی ایک تنظیم قائم کی۔ کانسی رام کے مکان پر اس کی پہلی میٹنگ ہوئی۔ اس میں بھائی پرمانند، سوہن سنگھ بھاکنا اور ہرنام سنگھ تنڈلاٹ (Tundilat) نے شرکت کی۔ ہردیال نے اس میں اپنا پروگرام اس طرح پیش کیا ''امریکیوں سے مت لڑیئے۔ یہاں جو آزادی آپ کو ملی ہے اس کا استعمال انگریزوں سے لڑنے میں کیجیے۔ جب تک آپ لوگ آزاد نہیں ہو جاتے، آپ کے ساتھ امریکیوں کی طرح کا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان کی غریبی اور زبوں حالی کے لیے انگریزی حکومت ذمہ دار ہے۔ اس لیے اسے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے اور یہ کام خوشامد سے نہیں مسلح بغاوت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس پیغام کو گھر گھر اور ہندستانی فوج کے ہر ایک سپاہی تک پہنچایئے۔ آپ سب لوگ ہندوستان جائیں اور عوام کی تائید حاصل کریں''۔ لالہ ہردیال کی یہ اپیل فوراً منظور کر لی گئی۔ ایک کمیٹی بنائی گئی اور ایک ویکلی اخبار ''یوگانتر'' نکالنے اور مفت تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سینفرانسکو (San Francisco) میں ایک مرکز ''یوگانترم آشرم'' کھولنے کی بھی تجویز ہوئی۔ پورٹ لینڈ کے پہلے اجلاس کے فیصلوں کو منظوری دینے کے لیے مختلف شہروں اور قصبوں میں جلسے کیے گئے۔ آخر میں ان جلسوں کے نمائندے ایسٹوریا (Astoria) میں اکٹھا ہوئے اور پورٹ لینڈ میں لیے گئے سبھی فیصلوں پر اپنی منظوری دے دی۔ اس طرح غدر تحریک شروع ہو گئی۔

غدر انقلابیوں نے بڑے پیانہ پر اشاعتی مہمیں شروع کیں۔ انھوں نے دور دراز جگہوں کا دورہ کیا۔ کارخانوں اور ملوں پر گئے جہاں زیادہ تر نو آباد۔ پنجابی مزدور کام کرتے تھے۔ یوگانتر آشرم ان سیاسی رضاکاروں کا مرکز اور ان کی پناہ گاہ بن گئی۔

یکم نومبر 1913 کو غدر کا اردو اور 9 دسمبر کو گورمکھی ایڈیشن شائع ہوا۔ غدر کا معنی تھا بغاوت۔ اخبار کا نام ہی دیکھ کر لوگ سمجھ سکتے تھے کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ اگر کسی کو کوئی شبہ رہا ہوگا تو وہ بھی اخبار کے نام کے ساتھ ''انگریزی راج کا دشمن'' سطر پڑھ کر ختم ہو گیا ہوگا۔ سبھی اخبار کے پہلے صفحہ پر چھپتا تھا ''انگریزی راج کا کچا چٹھا'' (An Expose of British Rule)

(انگریزی سرکار کے کالے کارنامے) یہ چھا انگریزی راج کے چودہ کالے کرتوتوں پر مشتمل ہوتا تھا جیسے ہندستانی دولت کی لوٹ، ملک میں فی نفر اوسط آمدنی کا کم ہونا، مال گذاری کو برابر بڑھاتے رہنا صحت پر خرچ کا بجٹ کم اور فوج پر زیادہ، ہندستانی صنعت وحرفت کا ستیاناس، وبا وطاعون میں ہزاروں ہندوستانیوں کی موت، ہندوستان کے ٹیکس دہندوں کے پیسوں سے افغانستان، برما، مصر، فارس اور چین میں جنگ، اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے دیسی راجاؤں کے درمیان دشمنی پیدا کرنے کی پالیسی، ان انگریزوں کے ساتھ نرمی برتنے کا امتیازی سلوک جو قتل اور ہندستانی عورتوں کو بے عزت کرنے کے مجرم ہوتے تھے، ہندو مسلمانوں سے دولت وصول کر کے عیسائی مشنری کی مدد کرنا، ان کے درمیان نفرت پیدا کرنا۔قومی تحریک کو تیز کرنے کی غرض سے انگریزوں کے خلاف یہ باتیں ہر ہفتہ اخبار میں شائع کی جاتی تھیں۔اس کچے چٹھے کی آخری باتیں ان مسائل کا حل بتاتی تھیں۔پہلی بات یہ کہ ہندوستان کی آبادی اکتیس کروڑ ہے۔ سات کروڑ ہندستانی ریاستوں میں اور 24 کروڑ برٹش ہندوستان میں جب کہ انگریزوں کی کل آبادی ایک لاکھ اٹھارہ ہزار پانچ سو باسٹھ ہے جن میں اناسی ہزار چھ سو چودہ 79614 افسران اور فوجی اور اڑتیس ہزار نو سو اڑتالیس 38948 دوسرے انگریز ہیں۔دوسری بات یہ کہ 1857 کی پہلی بغاوت کے 56 سال گذر چکے ہیں۔اب دوسری بغاوت کا وقت آن پہنچا ہے۔3

یہ کچا چٹھا بہت آسان زبان میں لکھا جاتا تھا۔ساورکر کی کتاب ''ہندستانی جنگ آزادی'' (The Indian War of Independence) 1857 کو سلسلہ وار چھاپا جاتا تھا۔اس کے علاوہ لوک مانیہ تلک، اروند گھوش، میڈم کاما، شیام جی کرشنا ورما، اجیت سنگھ اور صوفی امبا پرشاد کے کارہائے نمایاں کے حوالے لکھے جاتے تھے۔اس کے علاوہ اس میں انوشیلن سمتی (Anushilan Samiti) یوگانتر اور روس کی خفیہ تنظیموں کی کارگذاریوں کے بارے میں معلومات دی جاتی تھیں۔4

مگر ''غدر'' (The Ghadar) میں چھپی نظموں نے عوام کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔بعد میں ''غدر کی گونج'' نام کا نظموں کا مجموعہ شائع کر کے مفت تقسیم کیا گیا۔ان انقلابی اور جوشیلی نظموں میں سیکولر رجحان پوری طرح نمایاں تھا۔بطور نمونہ ایک نظم کا ٹکڑا اس طرح ہے:5

''ہندو، سکھ، پٹھانو، مسلمانو،
فوج کے لوگو غور سے سنو،
ہمارے ملک کو انگلینڈ نے لوٹ لیا ہے،
ہم کو اس کے خلاف جنگ چھیڑنا ہے،
ہم کو پنڈتوں اور قاضیوں کی ضرورت نہیں ہے،
ہم اپنے جہاز کو ڈبونا نہیں چاہتے ہیں،
پوجا پرارتھنا کا دور ختم ہو گیا ہے،
اب تلوار اٹھانے کا وقت ہے۔''

''غدر'' کے نسخے شمالی امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کے درمیان وسیع پیمانہ پر تقسیم کیے جاتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہانگ کانگ، چین، ملیے، سنگاپور، ترینیداد (Trinidad) اور ہونڈراس (Honduras) میں آباد ہندوستانیوں تک پہنچ گیا۔ یہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ یہ لوگوں میں چرچہ کا خاص موضوع بن گیا تھا۔ وہاں آباد پنجابی جب بھی جمع ہوتے ''دغدر'' میں چھپی نظموں اور گیتوں کو گنگناتے۔ دھیرے دھیرے اس کی نظمیں لوگوں کو زبانی یاد ہو گئیں۔

بلاشبہ تھوڑے ہی دنوں میں ''دغدر'' نے پنجابیوں کی سوچ بدل دی۔ اب وہ انگریزی حکومت کے وفادار نہ رہ کر باغی سے بن گئے تھے۔ اب ان کی زندگی کا واحد مقصد انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنا تھا۔ ''دغدر'' نے پنجابیوں کو ان کے شاندار ماضی کی جنگجو روایات کی یاددہانی کرائی۔ انگریزوں کے تئیں ان کی وفاداری کو شرمناک بتایا اور اس کے کفارہ میں ان کو سینہ سپر ہونے کے لیے اس طرح للکارا6

''تم سکھوں کے نام کو کیوں بےعزت کرتے ہو؟
ارے، تم نے شیروں کی عظمت کیسے بھلا دی؟
اگر دیپ سنگھ اس وقت زندہ ہوتے،
تو سکھوں کی ملامت کیسے ہوتی؟
تم نے دہلی بغاوت میں زمانے کا رخ کیوں نہ موڑ دیا؟

زور سے بولو "آؤ گوروں کو مار ڈالیں"
تم بے شرمی سے کیوں بیٹھے ہو؟
تمھارا تیس کروڑ ہونے سے کیا فائدہ؟
زمین میں دھنس جاؤ۔"

"غدر" کا پیغام گھر گھر پہنچ گیا اور جنگجو نوجوان جہاد کے لیے مچلنے لگے۔ ہردیال کو خود لوگوں کے ردعمل پر تعجب ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کوئی شخص جب ان سے دریافت کرتا کہ ہندوستان میں انقلابی تحریک چھیڑنے میں کتنا وقت لگے گا، تب وہ جواب دیتے "دس یا کچھ سال" مگر جن لوگوں نے "غدر" کی اپیلیں پڑھیں تو وہ اتنے بے چین ہو گئے کہ دس سال ان کو ایک لمبی مدت لگنے لگی۔

آخر کار 1914 میں تین واقعات نے غدر تحریک کو بے حد متاثر کیا۔ وہ تھے ہردیال کی گرفتاری، کوما گاٹا مارو (Koma Gata Maru) حادثہ اور پہلی جنگ عظیم کا چھڑ جانا۔

25 مارچ 1914 کو حکومت کے خلاف سرگرمی میں ملوث ہونے کا الزام لگا کر ہردیال کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت کی منشا سبھی پر ظاہر تھی۔ ضمانت سے رہا ہونے پر وہ چپکے سے ملک کے باہر چلے گئے۔ اس طرح غدر سے ان کا تعلق اچانک ٹوٹ گیا۔

اسی دوران 1914 میں کوما گاٹا مارو کا واقعہ پیش آیا۔ مارچ 1914 میں کوما گاٹا مارو نام کا جہاز کناڈا کے لیے روانہ ہوا۔ اس سے پہلے کناڈا حکومت نے ہندوستانیوں کے داخلہ پر قانوناً پابندی لگا دی تھی۔ یہ بہت سخت قانون تھا۔ اس کے تحت صرف وہی ہندوستانی وہاں جا سکتا تھا جو وہاں برابر جاتا رہا ہو۔ ان دنوں جہاز رانی کا کوئی ایسا نظم نہیں تھا جو اس طرح آبی راستے سے کسی کو کناڈا پہنچاتا۔ لیکن نومبر 1913 میں کناڈا کے سپریم کورٹ (Supreme Court) نے 35 ہندوستانیوں کو کناڈا میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جو لگاتار سفر کر کے وہاں نہیں گئے تھے۔ اس فیصلہ سے حوصلہ لے کر گردت سنگھ نام کے ایک شہری جو سنگاپور میں ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے کرایہ پہ ایک جہاز لے کر پورب اور جنوب مغرب کے مختلف جگہوں پر آباد تین سو چھہتر 376 ہندستانی شہریوں کو بٹھا کر وینکور (Vancouver) چل دیے۔ اسی جہاز کا نام کوما گاٹا مارو تھا۔

جاپان کے یاکوہاما (Yakohama) بندرگاہ پر جب یہ جہاز رکا تو غدر کے جنگجو ہندستانی جہاز پر سوار لوگوں سے ملنے گئے۔ان کو خطاب کیا اور ان کو پرچے تقسیم کئے۔ تبھی پنجاب پریس نے ایک وارننگ نشر کی کہ اگر ہندوستانیوں کو کناڈا میں داخل نہیں ہونے دیا تو اس کے بڑے سنگین نتائج نکلیں گے۔ کناڈا پریس نے اس کے دوسرے معنی لگائے اور وینکور کے کچھ اخباروں نے تو لوگوں کو ایشائی ملکوں کے حملوں سے چوکنا بھی کیا۔ کناڈا حکومت نے سپریم کورٹ کے نومبر کے فیصلہ کی خامیوں کو دور کر کے 35 ہندوستانیوں کے داخلہ کی اجازت کو رد کر دیا۔ بس جنگ کا خاکہ تیار ہو گیا۔

یہ جہاز د جب وینکور کے قریب پہنچا تو اس کو بندرگاہ سے دور ہی روک لیا گیا۔ اور پولیس نے پوری گھیرابندی کر لی۔ لوگوں کے حقوق کی بحالی کے لیے ''ساحل کمیٹی'' (Shore Committee) حسین رحیم، سوہن لال پاٹھک، اور بلونت سنگھ کی قیادت میں قائم کی گئی۔ اس کے لیے لوگوں سے مالی تعاون حاصل کیا گیا اور احتجاجی میٹنگیں ہونے لگیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کی دھمکی بھی دی گئی۔

امریکہ میں بھگوان، برکت اللہ، رام چندر اور سوہن سنگھ بھاکنا کی قیادت میں زوردار تحریک چلائی گئی اور لوگوں کو بغاوت کے لیے تیار ہونے کی اپیل کی گئی۔

جلد ہی کوما گاتا مارو جہاز کو کناڈا کے آبی سرحد سے باہر کر دیا گیا۔ اس کے یوکوہاما پہنچنے کے پہلے ہی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ انگریزی حکومت نے حکم جاری کیا کہ کلکتہ سے پہلے کسی مسافر کو راستے میں اترنے نہ دیا جائے۔ یہ جہاز جس بھی بندرگاہ سے ہو کر گذرتا، انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی۔ جب جہاز کلکتہ کے قریب بج بج (Budge Budge) پہنچا تو پولیس کو دیکھ کر پریشان مسافر غصہ سے بے قابو ہو گئے۔ وہ پولیس سے بھڑ گئے۔ دونوں کے درمیان سخت ٹکراو برپا ہوا۔ جس میں 18 مسافر جان سے مارے گئے اور 202 کو قید کر لیا گیا۔ بہت تھوڑے لوگ بھاگ کر اپنی جان بچا سکے۔

تیسرا اور سب سے اہم واقعہ جس نے غدر تحریک کو آگے بڑھایا وہ پہلی جنگ عظیم کی شروعات تھی۔ انقلابیوں کے لیے یہ ایک انوکھا موقع تھا جس کو وہ یوں ہی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے، جبکہ وہ اس کے لیے پوری طرح تیاری نہیں کر سکے تھے۔ آنا فانا بڑے لیڈروں کی

ایک میٹنگ بلائی گئی اور یہ فیصلہ لیا گیا کہ موقع کا فائدہ اٹھایا جائے لوگوں نے کہا کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرتے ہوئے مرجانا بہتر ہے۔مگر ہتھیار کہاں سے ملے، یہ اہم مسلہ تھا۔اس کے لیے یہ طے پایا کہ ہندوستان جا کر ہندستانی فوجیوں سے مدد لی جائے۔ غدر پارٹی نے اعلان جنگ کردیا۔ پرچے تقسیم کیے گئے۔محمد برکت اللہ، رام چندر اور بھگوان سنگھ نے ہندستانی آبادی میں جا کر میٹنگیں کیں۔ان سے ہندوستان جا کر مسلح جدوجہد کرنے کی اپیل کی گئی۔ خاص خاص لیڈروں کو ہندوستانیوں کو سمجھانے کے لیے جاپان، فلی پین، چین، ہانگ کانگ، ملیے، سنگاپور اور برما بھیجا گیا کہ وہ ہندوستان جا کر انقلابیوں میں شامل ہو جائیں۔کرتار سنگھ اور رگھوبر دیال گپتا جیسے بہت بے قرار انقلابی فوراً ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ وہی کرتار سنگھ ہیں جن کو برٹش حکومت کے خلاف سازش میں شامل ہونے کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی۔

غدر انقلابیوں کو کچلنے کے لیے انگریزی حکومت پوری طرح کمر بستہ تھی۔جیوں ہی بدلیس میں رہنے والے ہندستانی ملک میں داخل ہوتے، ان کی جانچ پڑتال ہوتی۔جن سے کوئی خطرہ نہ سمجھا جاتا، ان کو چھوڑ دیا جاتا اور جن سے کچھ کم خطرہ محسوس ہوتا، ان کو یہ حکم دے کر چھوڑا جاتا کہ وہ اپنے گاؤں کے علاوہ کہیں اور نہیں جائیں گے۔جو بہت خطرناک مانے گئے ان کو گرفتار کرلیا گیا۔کچھ ''خطرناک لوگ'' بچ نکلنے اور پنجاب پہنچ کر انقلابیوں میں شامل ہو گئے۔ایک اندازہ کے مطابق آٹھ ہزار لوگ ہندوستان لوٹے ان میں 5000 پانچ ہزار کو بغیر روک ٹوک گھر جانے دیا گیا۔پندرہ سو پر کڑی نگاہ رکھی جانے لگی۔فروری 1915 تک ایک سو نواسی 189 کو نظر بند کر دیا گیا۔سات سو چار 704 پر گاؤں میں بنے رہنے کی پابندی لگائی گئی۔کولمبو اور جنوبی ہندوستان کے راستے سے آنے والے لوگ حکومت کو چکمہ دے کر پنجاب پہنچ گئے۔

مگر پنجاب ویسا نہیں تھا جیسا انقلابیوں نے سوچا تھا۔پنجابی ان کا ساتھ دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔بدلیس سے آئے ان انقلابیوں نے ان کو اپنے ساتھ لینے کی پوری کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔انھوں نے گاؤں گاؤں کا دورہ کیا، میلوں ٹھیلوں اور تیوہاروں کے موقعوں پر میٹنگیں کیں مگر بے سود۔انگریزی حکومت کے تئیں اپنی وفاداری کا دعویٰ کرنے والے خالصہ دیوان نے ان انقلابیوں کو ذلیل اور جرائم پیشہ سکھ بتایا اور ان کو کچلنے کے لیے حکومت کی مدد کی 7

پنجابی عوام سے مایوس ہوکر ان غدر انقلابیوں نے مدد کے لیے فوج کی طرف رجوع کیا۔ نومبر 1914 میں فوج کو غدر میں شامل کرنے کی کئی کوششیں کی گئیں مگر مرکزی آرگنائزیشن اور لیڈر کی کمی سے ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

انھیں بے چین حالات میں قائد کی تلاش شروع ہوئی۔ اس کے لیے بنگالی انقلابیوں کی طرف رخ کیا گیا۔ آخر کار سچدانند سانیال اور وشنو گنیش پنگلے (Vishnu Ganesh Pingley) کی محنت سے کامیابی ملی۔ انھیں دنوں راس بہاری بوس جنھوں نے لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے کی وجہ سے کافی شہرت پائی تھی، پنجاب پہنچ گئے اور انھوں نے 1915 میں انقلابیوں کی کمان سنبھال لی۔

بوس نے تنظیمی شکل کی ایک جماعت تیار کی۔ ملک کی مختلف چھاؤنیوں (اتر پورب برما سے یو پی کے لکھنؤ اور فیض آباد تک) سے رابطہ قائم کرنے کے لیے لوگوں کو بھیجا گیا اور ان سے 11/ فروری تک اپنی رپورٹ دینے کے لیے کہا گیا جس کے تحت فوجی بغاوت کی تاریخ 21 فروری طے کی گئی جو بعد میں بدل کر 19 فروری کردی گئی۔ سی۔ آئی۔ ڈی ان سارے حالات کا پتہ پہلے سے لگا چکی تھی اور اس لیے حکومت نے ان انقلابیوں کو دھر دبوچا۔ زیادہ تر لیڈران گرفتار کر لیے گئے۔ بوس کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ اس طرح عملی اعتبار سے غدر انقلاب کا خاتمہ ہوگیا۔ حکومت کا ظلم اب بھی نہیں تھما۔ انقلابیوں کے خلاف بہت بھیانک اور جابرانہ کارروائی کی گئی۔ پنجاب اور مانڈلے (Mandalay) میں سازش میں شامل افراد کے اوپر مقدمہ چلانے کے لیے مخصوص عدالتیں قائم کی گئیں۔ 45 انقلابیوں کو موت کی اور 200 کو لمبی سزائیں دی گئیں۔ اس طرح پورے پنجاب میں قومی قیادت کو پوری طرح فنا کردیا گیا۔ برلن (Berlin) میں آباد کچھ انقلابی جن کا تعلق امریکہ میں غدر انقلابی رام چندر سے تھا، جرمنی کی مدد سے بدلیس میں تعینات ہندستانی فوجیوں سے رابطہ قائم کرنے اور ان کو بغاوت کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ راجہ مہندر پرتاپ اور برکت اللہ نے افغانستان کے امیر سے مدد لینے کی کوشش کی اور کابل میں ایک عارضی سرکار کی تشکیل کرلی، مگر اس طرح کی تمام کوششوں کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور مسلح بغاوت کے ذریعہ انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا مقصد پورا نہیں ہوا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غدر انقلابیوں کی ساری جدوجہد رائگاں ہوگئی یا یہ لوگ انگریزی حکومت کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ مگر تحریک کی کامیابی یا ناکامیابی کو اس پیمانہ سے نہیں ناپنا چاہیے۔ اگر اس نظریہ سے دیکھا جائے تو 1920 سے 1922 تک کی، 1930 سے 1934 تک کی یا 1942 کی ساری قومی تحریکیں ناکام تحریکوں کے لسٹ میں آتی ہیں کیونکہ یہ ساری کی ساری ہندوستان کو آزادی دلانے میں ناکام رہیں۔ لیکن اگر لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے، جدوجہد کی نئی حکمت عملی وضع کرنے، احتجاج کے لیے طریقے تخلیق کرنے، سیکولرزم، جمہوریت اور حقوق مساوات کے اصول بنانے کے زاویہ سے دیکھا جائے تو غدر تحریک کی کارگذاریاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

یہ بات چاہے جتنی عجیب لگے مگر حقیقت یہی ہے کہ نظریاتی میدان میں غدر تحریک نے بڑی عظیم کامیابی حاصل کی تھی۔ شروع کے اخبارات خصوصاً ''دغدر'' نے اور اس دور کے قومی لیڈروں نے انگریزی حکومت کے کردار کا وہ تجزیہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جو نئی نسل کے لیے قیمتی سرمایہ تھا۔ ''دغدر'' اخبار نے بہت سادے الفاظ مگر باثر انداز میں آزادی کے پیغام کو بدیس میں آبادان ہندوستانیوں کو پہنچایا جو زیادہ تر مزدور اور کسان تھے۔ اس کے وسیع اشاعت نے ان میں ایسے بہادر جوانمرد پیدا کیے جو ملک اور قوم کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔

غدر تحریک کے زیادہ تر لیڈران اور رضاکاران سکھ تھے مگر ''دغدر'' اور غدر کی گونج، اخبارات نیز دوسرے اخباروں نے ایسی فکر کو جنم دیا جس کا خاصہ مکمل طور سے سیکولر تھا۔ اس زمانے میں مختلف علاقوں، طبقوں اور دھرموں کے لوگوں کو محدود اور تنگ سوچ سے دور رکھنا اور ان کو ایک اسٹیج پر لاکر جدوجہد کے لیے تیار کرنا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ لالہ ہردیال، رام چندر اور کئی دوسرے لوگ ہندو تھے، برکت اللہ مسلمان اور راس بہاری بوس بنگالی ہندو تھے۔ مگر ان انقلابی لیڈروں نے پنجابیوں میں ہمیشہ سیکولر اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی، مثلاً اس زمانہ میں پنجاب میں ''ترک شاہی'' مقولہ لوگوں میں عام تھا۔ اس کو ظلم وزیادتی کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ انقلابی لیڈروں نے پنجابیوں سے یہ اپیل کی کہ وہ اس کا استعمال بند کردیں اور اس کو غلط معنی میں استعمال نہ کریں۔ مسلمانوں کو، جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں سختی جھیلی ہے، اپنا بھائی سمجھیں۔ اسی طرح

سکھ حضرات سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے وقت ست شری اکال نہ کہہ کر بندے ماترم کہیں۔ لوگوں نے آپسی اتحاد کے لیے اس اپیل کو بڑے جوش وخروش سے اپنایا۔ انقلابیوں نے سکھوں کو سمجھایا کہ کیش اور کرپان جیسے روایتی نشانات سے مذہب کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مذہب کی اصل روح تو اچھے اخلاق اور کردار میں ہے۔8

''دغدر'' میں شائع کچھ مبہم نظریاتی باتیں مثلاً ہردیال کی خلافت تحریک کی پیروکاری یہ کہہ کر کرنا کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ ہے یا سکھوں کے ہتھیار لے کر چلنے کی برٹش حکومت کی مخالفت کی تنقید وغیرہ باتوں کی اپج اس وقت ہوئی تھی جب سیکولر قومی نظریہ اپنے ارتقائی دور میں تھا۔ یہی بعد میں غدر تحریک اور اس کے لیڈروں کے ذریعہ پوری طرح پروان چڑھا۔ اس لیے مذہبی شعار کے تحفظ کو انگریزی تہذیب کے مقابلہ پوری ملت کی تہذیب کے ایک حصہ کا تحفظ سمجھنا چاہیے۔ اس کو تعصبانہ یا فرقہ وارانہ نظریہ کا جز نہیں ماننا چاہیے۔

غدر انقلابیوں میں کسی طرح کی علاقہ نوازی نہیں پائی جاتی تھی۔ لوک مانیہ تلک، اروند گھوش، خودی رام بوس، کنھیا لال دت اور ساورکر جیسے انقلابی لیڈران غدر کے ہیرو تھے۔ 1915 میں سبھی انقلابیوں نے ایک رائے ہوکر راس بہاری بوس کو اپنا لیڈر منتخب کیا تھا۔ ان لوگوں نے پنجابیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سکھوں کی عظمت کا گن نہیں گایا بلکہ اس کے برعکس 1857 کی بغاوت کے دوران حکومت کے تئیں ان کی وفاداری کی زور شور سے تنقید کی۔ اسی طرح برٹش انڈین آرمی میں سکھوں کی کثرت کو ''سکھوں کی عسکری روایات'' کے نام سے یاد نہیں کیا جب کہ بعد میں یہی سمجھا جانے لگا۔ فوج میں ان کی کثرت کو شرمناک کہہ کر ان سے بغاوت کی اپیل کی گئی۔ غدر تحریک کے دوران پنجابیوں خصوصاً سکھوں کی حیثیت جنھوں نے انگریزوں کی مدد کی تھی، غدار کی سی تھی۔ اس لیے کفارہ کے طور پر وطن کی عزت وآبرو کے واسطے حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ان سے کہا گیا۔ سوہن سنگھ بھاکنا جنھوں نے غدر تحریک میں اہم رول ادا کیا تھا اور جو بعد میں بڑے کسان اور کمیونسٹ لیڈر ہوئے تھے نے اس دور کو یاد کر کے یہ کہا تھا ''ہم لوگ سکھ یا پنجابی نہیں تھے، ہمارا مذہب وطن پرستی تھا''9

غدر تحریک کی دوسری خاصیت اس کا جمہوری اور سماج وادی نظریہ تھا۔ تحریک کے

لیڈروں نے اس بات کو صاف لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ ان کا مقصد ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا ہے۔ لالہ ہردیال حکومت دشمن، مزدور یونین نواز اور کچھ حد تک سماجوادی فکر سے متاثر تھے۔ انھوں نے غدر تحریک کو اپنی سماجوادی سوچ سے جوڑا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ بہت سے غدر انقلابی بیسویں اور تیسویں دہائی میں کسان لیڈر اور کمیونسٹ بن گئے۔

ہردیال کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے غدر انقلابیوں کے دل و دماغ میں بین الاقوامی نظریہ کی بھی سوچ پیدا کی۔ ان کی تقریر وتحریر آئرلینڈ، میکسکو اور روسی انقلابیوں کے ذکر سے بھری رہتی تھی مثلاً انھوں نے میکسکو کے انقلابیوں کو ''غدر انقلابی'' کے نام سے یاد کیا۔[10] اس طرح غدر انقلابیوں کی پہچان عوام میں سیکولر، جمہوری، سماجوادی اور بین الاقوامی وطن پرست جنگجو کی حیثیت سے ہوئی۔

غدر تحریک کی اپنی کمزوریاں تھیں۔ مسلح بغاوت کے لیے کتنی تیاری، کتنا پیسہ اور کیسا نظم چاہیے اور کب کیسی حکمت عملی اپنانی چاہیے اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ تحریک کے لیڈران کو نہیں تھا۔ پہلی جنگ اتنی جلدی چھڑ جائے گی یہ ان کے وہم وگمان میں نہیں تھا۔ کوما گوٹا مارو حادثہ سے وہ بدحواس ہو اٹھے اور اپنی طاقت اور حالت کا بغیر جائزہ لیے صرف بدیس میں آباد تھوڑے سے ہندستانی جو گوروں کے امتیازی سلوک کا شکار تھے کے بل بوتے پر حکومت سے سینہ سپر ہو گئے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ لاکھوں کسانوں اور فوجیوں کو بغاوت کے لیے تیار کرنا کتنا دشوار کام ہے۔ انھوں نے برٹش حکومت کی طاقت کا اندازہ بھی کم لگایا۔ ان کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ ہندستانی عوام بغاوت کے لیے تیار بیٹھی ہے صرف اس کو للکارنے کی ضرورت ہے۔ جیوں ہی اس کو بغاوت کے لیے آواز دی جائے گی، وہ برٹش حکومت کو اکھاڑ پھینکے گی۔

غدر تحریک کسی ایسی قیادت کو جنم نہیں دے سکی جو اس کو پائیداری دیتی اور اس کے مختلف پہلوؤں میں جوڑ پیدا کرتی۔ ہردیال میں صحیح معنوں میں ناظم بننے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ تو دراصل مبلغ اور مفکر تھے۔ یوں ان کی کوئی اپنی نظریاتی فکر نہیں تھی وہ تو مختلف نظریات کا مرکب تھے۔ پھر وہ اپنے ہم وطنوں کو جنگ میں جھوجھتا ہوا چھوڑ کر امریکہ روانہ ہو گئے۔[11]

قیادت کی دوسری کمزوری یہ تھی کہ اس کے پاس مضبوط اور منظم تنظیم کا فقدان تھا۔ یہی

وجہ تھی کہ اس کے انقلابی تنظیم کے ذریعہ متحرک ہونے کے بجائے جذبات و جوش کا شکار ہو گئے۔

سمجھ، موثر قیادت اور مضبوط تنظیم کے فقدان میں تحریک تو ختم ہی ہوئی، اس کے ساتھ ہندوستان کے انقلابیوں کی قیمتی نسل فنا ہو گئی۔ چالیس انقلابیوں کو پھانسی دی گئی اور دو سو کو قید خانوں میں لمبی مدت کے لیے ڈال دیا گیا۔ ہندوستان کا یہ غیر متلافی نقصان تھا۔ 1914 اور 1915 کے اس غدر تحریک میں اس سیکولر قومی قیادت کو دفن کر دیا گیا جو اگر بعد کے سالوں میں زندہ رہتی تو ایسی سیاست نشونما پاتی جس سے پنجاب کی سیاست کو نیا موڑ ملتا، سیکولر نظریات پروان چڑھتے اور فرقہ وارانہ رجحانات پر بندشیں لگتیں۔ یہ محض اندازہ اور اٹکل نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیس اور تیس کی دہائی میں غدر انقلابیوں نے پنجاب کے دیہی علاقوں میں سیکولر قومی اور کسان تحریکوں کی بنیاد پوری طرح رکھ دی تھی۔

باب۔13

ہوم رول لیگ تحریک اور اس کی ناکامی

غدر تحریک پہلی جنگ عظیم سے متاثر بدیس میں رہ رہے ہندوستانیوں کی بلند ہمت کا نتیجہ تھی۔اس باب میں ہم لوک مانیہ تلک اور اینی بسنٹ کی قیادت میں چلائی گئی قدرے کم جوشیلی مگر زیادہ موثر ہوم رول لیگ تحریک کا ذکر کریں گے۔

16 جون 1914 میں بال گنگا دھر تلک چھ سال کی لمبی سزا کاٹنے کے بعد جیل سے رہا ہوئے۔ان کی قید کا زیادہ تر وقت برما کے مانڈلے جیل میں گذرا۔جب وہ ہندوستان لوٹے تو ملک کے حالات ان کو بہت بدلے ہوئے نظر آئے۔سودیسی تحریک کے شعلہ بیان لیڈر اروندو گھوش پانڈیچری میں سنیاس لے چکے تھے۔اور لالہ لاجپت رائے امریکہ میں مقیم تھے۔انڈین نیشنل کانگریس 1907 میں سورت میں ہوئی تقسیم،سودیسی تحریک کے رضا کاروں پر حکومت کے ذریعہ کیے جارہے ظلم و بربریت اور 1909 کے آئینی سدھاروں کی وجہ سے اعتدال پسندوں پر چھائی مایوسی کے مجموعی صدمے سے ابھی تک بحال نہیں ہو سکی تھی۔

تلک نے بڑی سنجیدگی سے کانگریس میں پھر سے شامل ہونے اور اپنے انتہا پسند

ساتھیوں کو شامل کرنے کی بات پر پوری توجہ دی۔ ان کو پورا یقین تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس قومی تحریک کا ہی روپ ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی سیاسی پارٹی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اعتدال پسندوں سے مصالحت کر کے ان کا اعتماد حاصل کرنے اور حکومت کے ظلم سے بچنے کے لیے انھوں نے یہ اعلان کیا ''میں بہت صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ ہندوستان میں طرز حکومت کا سدھار چاہتے ہیں۔ ٹھیک اس طرح جس طرح آئرلینڈ میں وہاں کے ہوم رول والے چاہتے ہیں۔ انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس بات کے کہنے میں مجھے کوئی جھجھک نہیں کہ ملک کے مختلف حلقوں میں تشدد کے جو واقعات ہوئے ہیں وہ میرے اصول کے خلاف ہیں۔ اوران ناخوش گوار واقعات نے ہماری سیاسی ترقی کی رفتار کو سست کر دیا ہے''1 انھوں نے انگریزی حکومت کے تئیں اپنی وفاداری دہرائی اور ہندستانی عوام سے اپیل کی کہ وہ مصیبت کی گھڑی میں حکومت کا ساتھ دیں۔

اعتدال پسند خیمہ کے بہت سارے لیڈران اب محسوس کرنے لگے تھے کہ 1907 میں سورت میں جو کچھ بھی انھوں نے کیا، وہ سراسر غلط تھا۔ وہ کانگریس کی عدم حرکت سے بھی بددل تھے۔ اس لیے تلک کی اپیل ان کو بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ ان پر اینی بسنٹ جنھوں نے حال ہی میں کانگریس میں شمولیت اختیار کی تھی کا لگاتار دباؤ پڑ رہا تھا کہ کانگریس میں انتہا پسند خیمہ کے لوگوں کو شامل کر کے سیاسی قومی تحریک کو تیز کیا جائے۔

1914 میں اینی بیسنٹ 66 سال کی ہو گئی تھیں جب انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کی شروعات آزاد خیال (Free Thought)، ریڈیکلزم، (Radicalism)، فیبیزم (Fabianism) اور تھیوسوفی (Theosophy) کے مبلغ کی حیثیت سے کی تھی۔ 1893 میں وہ تھیوسوفیکل سوسائٹی (Theosophical Society) کے لیے کام کرنے کی غرض سے ہندوستان آئی تھیں۔ انھوں نے مدراس کے قریب اڈیار (Adyar) میں اپنا دفتر قائم کیا اور 1907 میں وہ تھیوسوفی کی اشاعت میں مصروف ہو گئیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں مختلف مذہب وملت کے وہ تعلیم یافتہ لوگ جو نشاۃ ثانیہ (Renaissance) سے ناواقف تھے کثیر تعداد میں ان کے ماننے والے بن گئے۔ 1914 میں اینی بسنٹ نے اپنی کارکردگی کے دائرہ کو وسیع کرنے

کا ارادہ کیا اور آئر لینڈ کی ہوم رول لیگ کے طرز پر ہندوستان میں ہوم رول کی مانگ کو لے کر ایک تحریک شروع کرنے کا پلان تیار کیا۔ اس کے لیے انھوں نے کانگریس کی منظوری اور انتہا پسند انقلابیوں کے تعاون کو شدت سے محسوس کیا۔ اسی غرض سے انھوں نے اعتدال پسند لیڈروں کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ تلک اور ان کے انتہا پسند ساتھیوں کے لیے کانگریس کا دروازہ کھول دیں۔

مگر 1914 کے کانگریس اجلاس نے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا فیروز شاہ مہتا اور بمبئی کے ان کے اعتدال پسند ساتھیوں نے گوکھلے اور بنگال کے ان کے اعتدال پسندوں کو راضی کر لیا کہ وہ انتہا پسندوں کو دور رکھیں۔ اس کے بعد تلک اور اینی بسنٹ نے اپنے اپنے بل بوتے سیاسی سرگرمی تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ برابر کانگریس پر دباؤ بھی ڈالتی رہیں کہ وہ انتہا پسندوں کو پارٹی میں پھر سے شامل کر لے۔

1915 کے ابتدائی دور میں ہی اینی بسنٹ نے اپنے دو اخبارات نیو انڈیا (New India) اور کومن ویلتھ (Common Wealth) کے ذریعہ اشاعتی مہم شروع کر دی۔ انھوں نے پبلک میٹنگیں کیں اور کانفرنس منعقد کیے، ان کی مانگ تھی کہ گورے لوگوں کے کلونیل ملکوں کے طرز پر ہندوستان کو بھی ہوم رول کی منظوری دی جائے۔ اپریل 1915 کے بعد ان کے تیور اور بھی زیادہ تیز و تند ہو گئے۔

انھیں دنوں لوک مانیہ تلک نے بھی اپنی سیاسی سرگرمی بڑی ہوشیاری سے شروع کی۔ ان کو ابھی کانگریس میں شمولیت نہیں ملی تھی اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کانگریس کا معتدل خیمہ ناراض ہو یا کانگریس کو یہ لگے کہ تلک کی کارگزاریاں اس کے اصول سے میل نہیں کھاتیں۔ یہ بات ان کے ذریعہ بلائی گئی مئی 1915 کی ایک میٹنگ میں ثابت ہو جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ساتھیوں کے مشورہ سے طے کیا کہ گاؤں کے لوگوں کو کانگریس کے اصول و کام سے آگاہ کیا جائے[2] اس کے بعد اسی سال اگست و ستمبر میں مہاراشٹر کے بہت سے شہروں میں جو مقامی تنظیمیں قائم ہوئیں وہ اپنی طاقت کا استعمال سیاسی سرگرمی تیز کرنے کے بجائے کانگریس میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے کرتی رہیں۔ تلک نے کبھی کبھی اعتدال پسند خیمہ کے پرانے خیال کے (Conservative) لوگوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے دھمکی کا سہارا لیا۔ ان کو پورا بھروسہ تھا

کہ وہ زیادہ تر معتدل لیڈروں کو سمجھا بجھا کر اپنے موافق کر لیں گے۔

جلد ہی تلک اور اینی بسنٹ کو اپنے مقصد میں کامیابی ملی۔ دسمبر 1915 کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں انتہا پسند لیڈروں کو کانگریس میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ فیروز شاہ مہتا کی موت کے بعد بمبئی کے اعتدال پسندوں کی مخالفت بہت کمزور پڑ گئی۔ پھر بھی اینی بسنٹ ہوم رول لیگ قائم کرنے کی اپنی تجویز کو کانگریس اور مسلم لیگ سے منظور نہ کرا سکیں۔ لیکن مقامی سطح پر کانگریس کمیٹیوں کو دوبارہ بحال کرنے اور لوگوں کو معلومات بہم پہنچانے کی تجاویز کو کانگریس نے منظور تو کر لیے مگر وہ جانتی تھیں کہ کانگریس ان پر عمل نہیں کرے گی۔ اس لیے انھوں نے اپنے مسودہ میں یہ شرط بھی لگادی کہ اگر ستمبر 1916 تک کانگریس ان پروگراموں کو عملی شکل نہیں دیتی ہے تو وہ خود اپنی تنظیم (لیگ) بنالیں گی۔

تلک کو کانگریس میں واپس آنے کا اختیار مل گیا تھا اور انھوں نے کانگریس سے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپریل 1916 میں بیل گاؤں (Belgaon) میں ہوئے صوبائی کانفرنس میں ہوم رول لیگ قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اینی بسنٹ کے پیرو بے چین ہو اٹھے۔ وہ ستمبر تک انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اینی بسنٹ پر دباؤ ڈال کر ہوم رول گروپ، قائم کرنے کی اجازت لے لی۔ جمنا داس دوارکا داس، شنکر لال بنکر (Shanker Lal Banker) اندولال یاگنک (Indulal Yagnik) نے بمبئی سے ایک اخبار ینگ انڈیا (Young India) نکالنا شروع کیا اور اس کے لیے انگریزی اور علاقائی زبانوں میں اشتہارات شائع کرنے کی غرض سے پورے ملک میں چندہ اکٹھا کرنے لگے۔ اینی بسنٹ نے شرط کے مطابق ستمبر تک انتظار کیا۔ کانگریس کی طرف سے کوئی پہل نہ پاکر انھوں نے بھی ہوم رول لیگ قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور اپنے حامی جارج ارونڈلے (George Arundale) کو تنظیم کا سکریٹری مقرر کیا۔ تلک اور اینی بسنٹ نے اپنی اپنی لیگ کے لیے علاقوں کا بٹوارہ بھی کرلیا جس سے کوئی گڑبڑی نہ پیدا ہو۔ تلک کی لیگ کے ذمہ کرناٹک، مہاراشٹر (بمبئی کے علاوہ) سینٹرل صوبے اور برار کے علاقے تھے۔ ان کے علاوہ باقی ہندوستان اینی بسنٹ لیگ کے ذمہ تھا۔ یہ دونوں لیگیں ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوئیں۔ بقول اینی بسنٹ اس کی وجہ یہ تھی کہ ''ان

کے (تلک کے) کچھ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے تھے اور میرے کچھ لوگ ان کو ناپسند کرتے تھے، لیکن ہم لوگوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں تھا''3

تلک نے مہاراشٹر کا دورہ کر کے ہوم رول تحریک کی خوب خوب اشاعت کی۔ اپنی تقریروں کے ذریعہ انھوں نے ہوم رول کے اصلی مقصد کو اچھی طرح واضح کیا۔ انھیں کے لفظوں میں ''ہندوستان اس بیٹے کی طرح ہے جو اب جوان ہو چکا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ باپ یا پالنے والا اس بیٹے کو اس کا حق دے دے۔ ہندوستان کی عوام کو اب اپنا حق لینا ہی ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے اس کو پورا اختیار ہے''4 تلک نے دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم اور زبان کے لحاظ سے صوبوں کی تشکیل کی مانگوں کو سوراج کے مسئلے سے جوڑ دیا۔ انھوں نے کہا ''مراٹھی، تلگو، کنٹر اور دوسری زبانوں کی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل کا ہی یہ مطلب ہے کہ ذریعہ تعلیم علاقائی زبان ہو۔ کیا انگریز اپنے یہاں فرانسیسی میں، جرمن اپنے لوگوں کو انگریزی میں یا ترک فرنچ میں تعلیم دیتے ہیں؟'' 1915 میں بمبئی کی صوبائی کانفرنس میں تلک نے گوکھلے کی موت پر تعزیتی قرارداد پیش کیا۔ وی۔ بی۔ الر (V.B. Alur) جیوں ہی اس کی تائید میں کھڑے ہوئے تلک نے کہا ''کنٹر زبان کے حق کی تصدیق کرنے کے لیے کنٹر میں بولیے''5 اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تلک میں علاقہ یا مراٹھی پرستی جیسی تنگ نظری نہیں تھی۔

غیر برہمنوں کی نمائندگی اور چھوا چھوت کے معاملہ میں تلک بالکل فرقہ پرست نہیں تھے۔ مہاراشٹر کے غیر برہمنوں نے ایک بار حکومت کو عرضداشت بھیجا اور کہا کہ اونچے طبقوں کی مانگوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے تو کئی لوگوں نے اس بات کی شدید مخالفت کی مگر تلک نے مخالفین کو اس طرح سمجھایا ''آپ لوگ صبر سے کام لیں۔ اگر ہم لوگ ان کو یہ سمجھا سکیں کہ ہم ان کے ساتھ ہیں اور ان کی اور ہماری مانگوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو مجھے یقین ہے کہ غیر برابری مٹانے کے لیے جو تحریک انھوں نے چلا رکھی ہے وہ ہماری تحریک میں گھل مل جائے گی''6 انھوں نے غیر برہمنوں کو سمجھایا کہ فرق برہمن اور غیر برہمن میں نہیں ہے، فرق تو تعلیم یافتہ اور ناخواندہ کے درمیان ہے۔ برہمن غیر برہمنوں کے بہ نسبت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ برہمن مخالف اور غیر برہمن نواز سرکار مجبوراً سرکاری نوکریوں میں برہمنوں کی بھرتی کرتی ہے۔ چھوا

چھوت مٹاؤ مہم کی ایک کانفرنس میں بولتے ہوئے تلک نے اعلان کیا ''اگر بھگوان بھی چھوا چھوت کو برداشت کرے یعنی اس کا حامی بن جائے تو میں ایسے بھگوان کا منکر ہوں''[7]

تلک کی تقریروں میں ہم کو فرقہ پرستی کہیں نہیں ملتی ہے۔ ہوم رول کی مانگ خالص سیکولر بنیادوں پر کی گئی۔ ان کا بھی خیال تھا کہ انگریزوں کی مخالفت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرے مذہب کے ماننے والے ہیں۔ ان کی مخالفت تو ہم صرف اس لیے کرتے ہیں کیونکہ وہ ہندستانی عوام کی بھلائی میں کوئی کام نہیں کررہے ہیں۔ انھیں کے لفظوں میں ''انگریز ہو یا مسلمان، اگر وہ عوام کی بھلائی میں کام کررہے ہیں تو ہمارے لیے بدیسی نہیں ہیں۔ بدیسی پن کا تعلق ہماری بھلائی کے کام سے جڑا ہے۔ اس کا تعلق کالی یا گوری چمڑی سے مطلق نہیں ہے''[8]

تلک نے چھ مراٹھی اور دو انگریزی پرچے نکال کر اشاعتی کام کو اور تیز کیا۔ ان پرچوں کے 47 ہزار نسخے فروخت کیے گئے۔ بعد میں کنڑ اور گجراتی زبانوں میں بھی پمفلٹ نکالے گئے۔ لیگ کی چھ شاخیں قائم کی گئیں......... سنٹرل مہاراشٹر، بمبئی شہر، کرناٹک اور سنٹرل صوبوں میں ایک ایک اور برار میں دو۔

ہوم رول تحریک نے جیسے ہی زور پکڑا، حکومت نے ظلم توڑنا شروع کردیا۔ اسی نے اس پر سخت چوٹ لگانے کے لیے ایک خاص دن کا تعین کیا۔ 23 جولائی 1916 تلک کی یوم پیدائش تھا۔ اس روز ایک بڑا جلسہ کیا گیا اور اس میں ان کو ایک لاکھ روپے کی تھیلی پیش کی گئی۔ اسی دن حکومت نے بھی اپنا تحفہ پیش کیا۔ ان کو وجہ بتاؤ نوٹس تعمیل کی گئی۔ اس میں لکھا تھا کہ آپ کے معاملات کو دیکھتے ہوئے آپ کے اوپر ایک سال تک پابندی کیوں نہ لگادی جائے۔ اور ان سے 60 ہزار روپے کی ضمانت مچلکہ دینے کے لیے کہا گیا۔ ان کے یوم پیدائش پر حکومت کا شاید یہی بہترین تحفہ تھا۔ انھوں نے کہا ''خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اب ہوم رول تحریک جنگل میں آگ کی طرح پھیلے گی۔ سرکاری بربریت تو بغاوت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکائے گی''[9]

تلک کی طرف سے محمد علی جناح کی قیادت میں وکیلوں کے ایک گروپ نے مقدمہ کی پیروی کی۔ مجسٹریٹ کی عدالت میں تو وہ مقدمہ ہار گئے لیکن نومبر میں ہائی کورٹ نے ان کو بری کردیا۔ پورے ملک میں ان کی فتح کا استقبال ہوا۔ گاندھی جی کے ینگ انڈیا اخبار نے لوگوں کے

جذبات کو اس طرح بیان کیا'' ہوم رول کے حق میں اس طرح بہت بڑی فتح حاصل کی گئی، اظہار خیال کی آزادی کی یہ بہت بڑی جیت ہے''[10] اس موقع کا تلک نے پورا فائدہ اٹھایا۔ عوام کے درمیان وہ اپنی تقریروں میں بانگ دہل کہنے لگے کہ ہوم رول کو سرکار نے منظوری دے دی ہے۔ وہ اور ان کے ساتھیوں نے اس کی مشتہری تیز کر دی۔ اپریل 1917 تک انھوں نے 14 ہزار ممبران بنا لیے۔

اینی بسنٹ کی لیگ نے بھی ستمبر 1916 سے کام کرنا شروع کر دیا، مگر ان کی تنظیم تلک کی بہ نسبت ڈھیلی تھی۔ کوئی بھی تین آدمی مل کر کہیں بھی اس کی شاخ قائم کر سکتے تھے جبکہ تلک کی لیگ کا آرگنائزیشن بہت مضبوط تھا۔ سبھی شاخوں کے کام اور دائرے متعین تھے۔ اینی بیسنٹ کی لیگ میں دو سو شاخیں تھیں۔ چند شہروں اور قصبوں میں باقی گاؤں میں تھیں ایک برانچ میں کچھ ہی گاؤں آتے تھے۔ اگر چہ انتظامیہ کمیٹی (Executive Body) کے ساتوں ممبروں کا باقاعدہ انتخاب 34 بنیادی شاخوں کے ذریعہ تین سالوں کے لیے ہوتا تھا، مگر زیادہ تر کام اینی بسنٹ، ان کے لفٹیننٹ اروندلے، سی۔ پی۔ راما سوامی ایر اور بی۔ پی۔ واڈیا کے ذریعہ اڈیار کے ہیڈ کوارٹر سے ہوتا تھا۔ ممبروں کو ضروری ہدایتیں ذاتی طریقے سے ملتی تھیں یا پھر لوگ نیو انڈیا (New India) میں ہوم رول کالم میں شائع اروندلے کے مضامین پڑھ کر معلومات حاصل کرتے تھے کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ ممبر سازی کے سلسلہ میں بھی اینی بسنٹ کی لیگ تلک کے مقابلہ میں پیچھے تھی۔ مارچ 1917 تک ان کی لیگ کے ممبروں کی تعداد صرف سات ہزار تھی۔ ان کی لیگ میں تھیوسفکل سوسائٹی کے ممبروں کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ تھے جس میں الہ آباد سے جواہر لعل نہرو، کلکتہ سے بی۔ چکرورتی اور جے۔ بنر جی شامل تھے۔ بہر حال شاخوں کی تعداد سے لیگ کی طاقت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان میں کچھ تو بہت فعال تھیں اور کچھ غیر فعال، صرف تھیوسفکل سوسائٹیوں کی سرگرمی تک محدود تھیں۔ مثلاً مدراس شہر کی شاخیں تعداد میں بہت زیادہ مگر زیادہ تر غیر فعال جب کہ بمبئی، اتر پردیس کے شہروں اور گجرات کے دیہی علاقوں کی شاخیں بہت فعال مگر تعداد میں بہت کم تھیں۔

ان کی تمام تر سرگیوں کا واحد مقصد ہوم رول کی مانگ کے لیے بڑے پیمانے پر زوردار تحریک چلانا تھا۔ اس کے لیے سیاسی تعلیم اور بحث و مباحثہ بے حد ضروری تھا۔ اروندلے نے نیو انڈیا کے توسل سے لیگ کے حامیوں کو یہ ہدایتیں دیں کہ وہ لوگوں کے درمیان سیاسی بحث

ومباحثہ چھیڑیں، قومی سیاست کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والی لائبریریاں قائم کریں، طلبا کو سیاسی تعلیم دینے کے لیے کلاسوں کا انتظام کریں، پمفلٹ اور پرچے تقسیم کریں، چندہ اکٹھا کریں، سماجی کام کریں، سیاسی میٹنگوں کا نظم کریں، دوستوں کے سامنے ہوم رول کی تائید میں دلائل پیش کریں اور ان سے تحریک میں حصہ لینے کی اپیل کریں۔ کئی شاخوں نے ان باتوں پر پوری طرح عمل کیا۔ سیاسی بحث ومباحثوں پر خاص طور سے توجہ دی گئی۔

ہوم رول کی اشاعت کتنی تیز ہوئی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ستمبر 1916 یعنی اینی بسنٹ کی لیگ کے قیام تک پروپگنڈہ فنڈ سے 26 انگریزی پمفلٹوں کی تین لاکھ کاپیاں بیچی جا چکی تھیں جن میں حکومت کا کچا چٹھا اور ہوم رول کے سلسلہ میں دلائل ہوتے تھے۔ لیگ کے قیام کے بعد ان پرچوں کو پھر چھاپا گیا۔ کئی علاقائی زبانوں میں بھی ان کو شائع کیا گیا۔ لیگ کی زیادہ تر شاخوں نے عوامی جلسوں اور تقریروں کا بھی سلسلہ چلایا۔ اس کے علاوہ جب بھی ملکی سطح پر حکومت کے خلاف احتجاج کا نعرہ بلند ہوا، تب لیگ کی ساری شاخوں نے اس پر عمل کیا۔ نومبر 1916 میں جب اینی بسنٹ پر برار اور سنٹرل صوبوں میں جانے پر پابندی لگائی گئی تو ارونڈلے کی اپیل پر لیگ کی سبھی شاخوں نے احتجاجی جلسے کیے اور وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی قرار دادیں بھیجیں۔ جب فروری 1917 میں تلک پر پنجاب اور دہلی جانے پر روک لگائی گئی، اس وقت بھی یہی ردعمل ہوا۔

کانگریس کی عدم حرکت (Inactivity) سے ناراض کئی اعتدال پسند کانگریسی ہوم رول تحریک میں شامل ہوگئے۔ گوکھلے کی سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی (Servant of India Society) کے ممبران کو لیگ میں ممبر بننے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ان لوگوں نے عوام کے درمیان تقریریں کرکے اور پرچے تقسیم کرکے ہوم رول تحریک میں تعاون کیا۔ اتر پردیش کے کئی معتدل وطن پرستوں نے 1916 میں لکھنؤ کانگریس اجلاس کے لیے ہوم رول لیگ کے رضاکاروں کے ساتھ گاؤں اور قصبوں کا دورہ کیا۔ ان کی زیادہ تر میٹنگیں مقامی عدالت کے کتب خانوں میں ہوتی تھیں۔ اگر بازار کا دن ہوتا تو ان میں طلبا اور تجارت پیشہ لوگ شامل ہوتے تھے۔ لوگوں کو ہندی زبان میں یورپ میں ہوئی تحریک آزادی کی خصوصیات سمجھائی جاتی تھیں اور

ہندوستان کی موجودہ غریبی کا مقابلہ اس کے شاندار ماضی سے کیا جاتا تھا۔ اعتدال پسندوں کا اس طرح ہوم رول میں شرکت کرنا مطلق تعجب کا باعث نہیں تھا۔ وہ لوگ تو دراصل لیگ کا تعاون کر کے اپنے ہی علم اور سیاسی پروپگنڈہ کو عملی جامعہ پہنار ہے تھے۔

1916 میں کانگریس کا لکھنؤ اجلاس ہوم رول لیگ کے لیے اپنی طاقت دکھانے کا اچھا موقع تھا۔ اس کے وہ بہت دنوں سے منتظر تھے۔ تلک کی ہوم رول لیگ نے تو ایک ایسی ریت قائم کر دی جو کانگریس کے سالانہ جلسہ کا ضروری حصہ بن گیا تھا۔ ان کے حامیوں نے لکھنؤ پہنچنے کے لیے ''ہوم رول اسپیشل، اور کانگریس اسپیشل'' نام کی اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کیا تھا۔ اروند لے نے لیگ کے سبھی ممبروں کو لکھنؤ اجلاس میں جانے کی تاکید کی۔ اس طرح وہ کانگریس اجلاس کو ہوم رول لیگ کے ممبروں سے کھچا کھچ بھر دینا چاہتے تھے۔

تلک اور ان کے ساتھیوں کو کانگریس کے اعتدال پسند صدر چرن مجومدار کے ذریعہ پھر سے پارٹی میں شامل کر لیا گیا۔ دس سالوں کی لمبی جدائی اور غلط فہمیوں میں بھٹکنے کے بعد وطن پرستوں کے دونوں خیموں نے محسوس کیا کہ تفریق سے کمزور اور اتحاد سے ہم مضبوط ہوں گے۔ بہر حال دونوں بھائی پھر مل کر ایک ہو گئے''۔[11]

لکھنؤ کا یہ اجلاس کانگریس لیگ سمجھوتہ کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ سمجھوتہ کانگریس لیگ پیکٹ (Congress League Pact) کے نام سے مشہور ہے۔ اس سمجھوتہ میں تلک اور اینی بسنٹ دونوں لیڈروں نے بہت اہم رول ادا کیا۔ کئی پرانے لیڈروں نے اس سمجھوتہ کی مخالفت کی جن میں مدن موہن مالویہ بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کا یہ الزام تھا کہ اس پیکٹ میں مسلمانوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے جس کا تلک نے یوں جواب دیا'' کچھ لوگوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ ہم ہندو اپنے مسلمان بھائیوں پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ یقیناً جب میں یہ کہتا ہوں کہ ان کی ہی بھلائی کی طرف ہمارا زیادہ جھکاؤ نہیں ہونا چاہیے تھا تب میں پورے ملک کے ہندو فرقہ کے خیال کی ترجمانی کرتا ہوں۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر ہوم رول کا اختیار صرف مسلم فرقہ کو دے دیا جائے یا راجپوتوں کو مل جائے تو مجھے کوئی چنتا نہیں اور اگر یہ اختیار ملک کے کمزور نہیں بلکہ سب سے کمزور طبقہ کو مل جائے تب بھی مجھے کوئی چنتا نہیں ہوگی بشرطیکہ برٹش

حکومت ان کو تعلیم یافتہ طبقوں سے زیادہ لائق سمجھے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر یہی اختیار ملک کے کسی طبقہ کو مل جاتا ہے۔ جب ہم کسی تیسری طاقت سے لڑ رہے ہوں تو سب سے ضروری بات یہ ہوتی ہے آپس میں ہر طرح کا اتحاد ہو......... نسلی، مذہبی اور سیاسی''[12]

تلک کو بہت کٹر قسم کا ہندو مانا جاتا تھا۔ وہ ہندو مذہبی کتابوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ اس لیے جب انھوں نے اس طرح کا بیان دیا تو کسی کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے لیے الگ سے انتخابی حلقوں کے اصول کو منظور کرنا جھگڑا والا مسئلہ تھا۔ پھر بھی اس کو اس لیے مان لیا گیا کہ کہیں مسلم اقلیت یہ نہ محسوس کرے کہ اکثریت ان پر حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔

لکھنؤ کانفرنس نے آئینی سدھاروں (Constitutional Reform) کی مانگ پھر اٹھائی جو ان کے نزدیک ہوم رول کی طرف سے پہل تھی، حالانکہ اس میں وہ ساری باتیں نہیں شامل تھیں جو ہوم رول کے ممبران چاہتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس پر انگلی نہیں اٹھائی کیونکہ وہ ہر حال میں کانگریس میں اتحاد بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ تلک نے ایک اور تجویز پیش کی کہ کانگریس کانفرنس کے فیصلوں اور پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ورکنگ کمیٹی بنائی جائے مگر اعتدال پسندوں کی مخالفت سے ان کی تجویز (Proposal) پاس نہ ہو سکی۔ حقیقت میں تلک چاہتے تھے کہ کانگریس کی عدم حرکت (Inactivity) ختم ہو، وہ حرکت میں آئے اور کام کرے۔ چار سال بعد 1920 میں جب گاندھی جی نے کانگریس کے آئین میں سدھار کی تجویز پیش کی تب انھوں نے کانگریس کو حرکت میں لانے کے لیے انھیں باتوں کو ضروری قرار دیا۔

کانگریس کانفرنس کے اختتام کے فوراً بعد اسی پنڈال میں دونوں ہوم رول لیگوں کی میٹنگ ہوئی، جس میں ایک ہزار لوگ شریک ہوئے۔ اس میں کانگریس لیگ پیکٹ کی خوب تعریف ہوئی۔ تلک اور اینی بسنٹ دونوں نے میٹنگ کو خطاب کیا۔ اپنی فتح پر خوش ہو کر دونوں نے لکھنؤ سے لوٹتے وقت ملک کے کئی حصوں کا دورہ کیا۔

لیگ کی بڑھتی ہوئی شہرت سے سرکار کی پیشانی پر بل پڑنا ضروری تھا۔ مدراس سرکار نے کچھ زیادہ ہی سختی کی۔ اس نے طلبا پر سیاسی میٹنگوں میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی۔ تلک نے

اس کی بہت سخت لفظوں میں اس طرح مذمت کی'' حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ دیس پریم کے جذبات سے سب سے زیادہ طلبا ہی متاثر ہوتے ہیں۔ یوں بھی کسی ملک کی ترقی اور خوشحالی نئی پیڑھی کی طاقت وتوانائی پر ہی منحصر ہے'' 13

جون 1917 میں مدراس سرکار نے اینی بسنٹ اوران کے ساتھی جارج اروںڈ لے اور بی۔ پی۔ واڈیا (B.P. Wadia) کو نظر بند کرلیا۔ اس کے خلاف ملک بھر میں احتجاج ہوئے۔ سر سبرامنیا ایر (Sir Subramania Aiyar) نے نائٹ ہوڈ (Knight-Hood) خطاب واپس کردیا۔ مدن موہن مالویہ، سریندر ناتھ بنرجی اور محمد علی جناح جیسے تمام اعتدال پسند لیڈران جواب تک لیگ میں شامل نہیں تھے، اس میں شامل ہوگئے اور انھوں نے اینی بسنٹ اور دوسرے لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف آواز اٹھائی۔ 28 جولائی 1917 کو کانگریس کی میٹنگ میں تلک نے کہا کہ اگر حکومت ان لوگوں کو فوراً رہا نہیں کرتی ہے تو سول نافرمانی (Civil Disobedience) یا انفعالی مزاحمت (Passive Resistance) تحریک چلائی جائے گی۔ اس تجویز پر سبھی صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو عمل کرنے کے لیے تھوڑا وقت درکار تھا۔ گاندھی جی کے کہنے پر شنکر لال بینکر اور جمنا داس دوارکا داس نے ایسے ایک ہزار لوگوں کے دستخط لیے جو سرکاری احکام کی پرواہ کیے بغیر جلوس کی شکل میں اینی بسنٹ سے ملنا چاہتے تھے۔ ان لوگون نے ہوم رول کی تائید میں کسانوں اور مزدوروں کے دستخط بھی کرانے شروع کیے، گجرات کے قصبوں اور گاؤں کا دورہ کیا اور لیگ کی شاخیں قائم کرنے میں وہاں کے لوگوں کی مدد کی۔ مختصر یہ کہ حکومت کے جبر سے تحریک کے لوگوں کا تیور اور بھی سخت ہوا اور وہ حکومت کی مخالفت پر ڈٹ گئے۔ مانٹیگو (Montagu) نے اپنی ڈائری میں اس پر یوں تبصرہ کیا ہے'' شیو نے اپنی بیوی کو باون ٹکڑوں میں صرف اس لیے کاٹ ڈالا تھا جس سے کہ ان کو باون بیویاں مل جائیں۔ انڈین گورنمنٹ کی ٹھیک یہی حالت اینی بسنٹ کو نظر بند کرنے کے بعد ہوئی''۔ 14

ان واقعات کے بعد انگلینڈ کی سرکار نے اپنی پالیسی بدلی۔ اس کا رجحان اب سمجھوتہ پسند ہوگیا۔ اس لیے نئے سکریٹری آف اسٹیٹ مانٹیگ نے 20/اگست 1917 کو ہاؤس آف کامنس (پارلیمنٹ) میں تاریخی اعلان کیا'' شہنشاہ کی حکومت کی منشا ہے کہ ہندوستان کے نظام

حکومت کی ہر ایک شاخ میں ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے اور ہوم رول کے مختلف اداروں کو دھیرے دھیرے ترقی دی جائے جس سے برٹش سلطنت کے تحت کوئی ذمے دار سرکار قائم کی جاسکے[15] یہ اعلان لارڈ مارلے (Lord Morley) کے ذریعہ کیے گئے 1909 کے آئینی سدھار کے بالکل برعکس تھا جس میں اس نے بہت صاف لفظوں میں واضح کیا تھا کہ ان سدھاروں کا مقصد ہندوستان میں سوراج قائم کرنا مطلق نہیں ہے۔ مانٹیگو کے اعلان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب ہوم رول یا سوراج کی مانگ غداری کا ہم معنی نہیں رہا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ برٹش حکومت سوراج کی مانگ کو ماننے ہی جارہی تھی۔ مانٹیگو کے اعلان میں یہ بات بھی تھی کہ ہوم رول کا قیام تبھی ہوگا جب اس کے لیے مناسب وقت آئے گا اور مناسب وقت کا فیصلہ حکومت ہی کرے گی۔ اس کے لیے اتنی گنجائش کافی تھی۔ اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہندوستان کو مستقبل قریب میں حکومت کی باگ ڈور سونپنے نہیں جارہی ہے۔

مانٹیگو کی صلح پسندی کے نتیجہ میں اینی بسنٹ کو ستمبر 1917 میں رہا کردیا گیا۔ اس وقت ان کی شہرت کی دھوم مچی تھی۔ دسمبر 1917 کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں تلک کے مشورہ پر ان کو اس کا صدر منتخب کرلیا گیا۔

1918 کے دوران ہوم رول تحریک کی طاقت کئی وجوہات سے سرد ہوگئی۔ 1917 میں بھاری بھرکم کامیابی ملنے کے باوجود تحریک بے جان سی ہوگئی۔ اینی بسنٹ کی گرفتاری کے بعد جو اعتدال پسند لوگ جذبات میں آکر تحریک میں شامل ہوئے تھے وہ ان کی رہائی کے بعد حکومت کے ذریعہ سدھار کے وعدہ کے بعد خاموش ہوگئے تھے۔ ان لیڈروں کو ایسا لگا کہ سردست اب کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہے۔ سول نافرمانی تحریک چلانے کی چرچا کرنا ہی انھوں نے ترک کردیا تھا۔ ستمبر 1918 کے بعد تو کانگریس کی میٹنگوں میں حصہ لینا بھی چھوڑ دیا۔ جولائی 1918 میں گورنمنٹ رفارم کے اعلان سے نیشنلسٹوں کے خیمہ میں بھی دراڑ پڑ گیا تھا۔ کچھ لوگ اس کو جیوں کا تیوں مان لینے کے لیے تیار تھے اور کچھ لوگ اس کو پوری طرح نامنظور کرنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگ یہ بھی مانتے تھے کہ اس میں کمیاں تو ہیں مگر اسے آزمانا چاہیے۔ ان سدھاروں اور غیر متشدد

مزاحمت (Passive Resistance) کے مسئلے پر خود اینی بسنٹ تذبذب میں تھیں۔ کبھی وہ اسے غلط کہتیں اور کبھی اپنے حامیوں کے دباؤ میں صحیح ٹھہراتیں۔ شروع میں تلک اور اینی بسنٹ نے کہا کہ ان سدھاروں کا کرنا برطانیہ کی اور ان کو منظور کرنا ہندوستان کی شان کے خلاف ہے۔ مگر بعد میں انھوں نے ان کو منظور کرنے کی بھی اپیل کی۔ تلک اپنے فیصلہ پر بہت دنوں تک جمے رہے لیکن اینی بسنٹ کی ڈھلمل پالیسی اور اعتدال پسندوں کے رخ میں تبدیلی کے باعث وہ اکیلے اپنے بل بوتے تحریک کی گاڑی کھینچنے میں قاصر تھے اور سال کے آخر میں وہ انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ''انڈین انریسٹ'' (Indian Unrest) کے مصنف ویلنٹائل چرول (Valentile Chirol) کے اوپر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ اسی مقدمہ کی پیروی میں ایسے نازک دور میں وہ کئی مہینے انگلینڈ میں پڑے رہے۔ اینی بسنٹ مضبوط اور طاقتور قیادت دینے میں قاصر تھیں۔ اس طرح ہوم رول تحریک قیادت سے محروم ہوگئی۔

ہوم رول تحریک کی سب سے قیمتی میراث اور عظیم کامرانی یہ تھی کہ اس نے جانباز نیشنلسٹوں کی ایسی ٹیم تیار کی جو مستقبل قریب میں گاندھی جی کی قیادت میں آزادی کی مشعل کو لے کر آگے بڑھی۔ ہوم رول تحریک نے گاؤں گاؤں اور شہروں شہروں جو تنظیمیں قائم کی تھیں وہ بعد میں بہت کام کی ثابت ہوئیں۔ ان کے ذریعہ سوراج کا پیغام عوام تک پہنچا۔ سماج میں دیش پریم کا ماحول پیدا ہوا۔ یہی ہوم رول کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

1918 میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ہندوستان میں آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے ایک پیڑھی تیار ہوگئی تھی جس کے محرک ہوم رول کے انقلابی ہی تھے۔ یوں وہ اس کو آگے نہ بڑھا سکے مگر ایسا اسٹیج ضرور تیار کر دیا کہ نئی نسل کو موہن داس کرم چند گاندھی کی ذات میں ایک ایسا لیڈر مل گیا جو جنوبی افریقہ میں ہندستانی کسانوں اور چمپارن، احمد آباد اور کھیڑا میں مزدوروں کے حق کی لڑائی لڑ چکا تھا۔ مارچ 1919 میں جب انھوں نے رولٹ ایکٹ (Rowlatt Act) کے خلاف ستیہ گرہ کے لیے اپیل کی تو قریب قریب وہ سبھی لوگ اس میں شامل ہو گئے جن میں ہوم رول تحریک نے پہلے سے سیاسی بیداری پیدا کر رکھی تھی۔

باب 14

گاندھی جی کی سیاسی زندگی کی ابتدائی سرگرمیاں

پہلی بار جب موہن داس کرم چند گاندھی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف کل ہند سطح پر مارچ 1919 میں ستیہ گرہ کا نعرہ بلند کیا تھا، اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔ یہی وہ شخص ہے جو ہندوستان کی جنگ آزادی کی کمان سنبھالنے والا تھا اور جس کی رہنمائی میں جنگ آزادی کو اہم ادوار سے گذرنا تھا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی کہانی پچیس سال پیچھے، 1893 سے شروع کریں جب چوبیس سال کے ایک بیرسٹر نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے شہری حقوق کے تحفظ کے لیے نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کرنا شروع کیا تھا۔

یہی نوجوان بیرسٹر جو 1893 میں، ایک گجراتی تاجر دادا عبداللہ کے مقدمہ کی پیروی میں ایک سال کے معاہدہ پر ڈربن پہنچا، روزی روٹی کمانے والا ایک معمولی سا آدمی اس وقت کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ پہلا ہندستانی بیرسٹر تھا۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کا پہلا جتھا 1860 میں گیا تھا۔ وہاں گنا کی کھیتی کرانے کے لیے اقرارنامہ کے تحت سفید فام لوگ ہندستانی مزدوروں کو لے گئے تھے۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کا خاص طور سے جنوبی ہندوستان کے لوگوں کا جنوبی افریقہ میں بسنے کا سلسلہ

شروع ہو گیا۔ مزدوروں کے ساتھ تاجر بھی جن میں زیادہ تر میمن مسلمان تھے وہاں پہنچے۔ اقرار نامہ کے ختم ہونے کے بعد وہ لوگ وہیں آباد ہو گئے۔ اس طرح وہ اور ان کے بچے جو وہیں پیدا ہوئے تھے جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کا تیسرا طبقہ تھا۔ ان میں زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے اور جو تھوڑا پڑھے لکھے تھے ان کو انگریزی بہت کم آتی تھی۔ دولت مند تجار بھی صرف اتنی انگریزی لکھ پڑھ لیتے تھے جتنی ان کو کاروبار کرنے کے لیے ضروری تھی۔ ہندوستانیوں کے ساتھ یورپی بہت برا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے ظلم و ستم کو برداشت کرنا ہندوستانیوں کی زندگی کا روٹین بن چکا تھا۔ اگر وہ برا بھی مانتے، تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کے خلاف کس طرح آواز اٹھائی جائے۔

مگر نوجوان موہن داس کرم چندر گاندھی روزی روٹی کے خاطر یوں ہی بے عزتی برداشت کرنے والوں میں نہیں تھے۔ وہ ہندوستان کی ریاست کاٹھیاواڑ میں دیوان کے بیٹے تھے۔ مالی تنگی کے باوجود ان کے خاندان کو ان کے وطن کاٹھیاواڑ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وکالت پڑھنے میں ان کے تین سال لندن میں گذرے تھے، مگر نسلی فرق کا جو مظاہرہ وہاں ہو رہا تھا ویسا انھوں نے انگلینڈ یا ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا تھا۔

افریقہ براعظم پر قدم رکھنے کے ایک ہفتہ بعد جب گاندھی جی ڈربن سے پریٹوریا (Pretoria) روانہ ہوئے تو راستے میں ان کو طرح طرح سے بے عزت کیا گیا۔ یہ مشہور واقعہ ہے کہ گاندھی جی کو ایک یورپی نے اول درجہ کے ڈبے سے جبراً اتار دیا تھا۔ اور ان کو ٹھنڈک میں کانپتے ہوئے مسافر خانہ (Waiting Room) میں رات کاٹنی پڑی تھی۔ اس سے بھی زیادہ شرمناک واقعے اور بھی ہوئے تھے۔ ایک بار گاندھی جی نے ٹرین سے سفر کرنے کے لیے اول درجہ کا ٹکٹ خریدا۔ سفید فام لوگوں نے ان سے اول درجہ سے نکل کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا اور جب ڈرائیور کے ساتھ بھی بیٹھنے لائق نہیں سمجھا گیا تو ان سے پائدان پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ اس کی مخالفت کرنے پر ان کو مارا پیٹا گیا۔ جوہنس برگ (Johannesburg) پر اترنے کے بعد رات گذارنے کے لیے جب انھوں نے کمرہ لینا چاہا تو ان کو کوئی کمرہ خالی نہیں ملا۔ جوہنس برگ سے پریٹوریا جانے کے لیے بکنگ کلرک نے اول درجہ کا ٹکٹ دینے سے انکار

کر دیا۔ تمام ریلوے قانونوں کا حوالہ دینے کے بعد ہی ان کو ٹکٹ مل سکا، لیکن پھر ان کو دھکا دے کر ڈبے سے نکالا جانے لگا۔ بہر حال ایک یورپی مسافر کی مداخلت سے ان کی آبرو بچ سکی[1]

ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں وہ پریٹوریا گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے ہندوستانیوں کی ایک میٹنگ بلائی۔ انھوں نے گوروں کے ظلم کی مخالفت کرنے کی لوگوں سے پرزور اپیل کی۔ خواہشمند ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھانے کی پیشکش کی۔ پریس کے ذریعہ انھوں نے خود اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ نیٹال ایڈورٹائزر (Natal Advertiser) کو انھوں نے غصہ بھرا خط لکھا۔ انھوں نے تحریر کیا ''کیا یہی عیسائیت ہے؟ کیا یہی انسانیت ہے؟ کیا یہی انصاف ہے؟ کیا اسی کو تہذیب کہتے ہیں؟ میں جواب کے لیے ٹھہرا ہوں''[2] گاندھی جی کا پروگرام جنوبی افریقہ میں زیادہ دن ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ پھر بھی انھوں نے پریٹوریا میں ہندوستانیوں کے اندر خوداری کے جذبات ابھارنے اور نسلی امتیاز سے پیدا شدہ سبھی برائیوں سے نجات پانے کے لیے جدوجہد کی اپیل کی۔

مقدمہ کے خاتمہ پر گاندھی جی ہندوستان لوٹنے کی تیاری کرنے لگے، لیکن جس روز وہ ڈربن سے روانہ ہونے والے تھے اسی کی پچھلی شام کو انھوں نے ہندوستانیوں کو ووٹ دینے کے اختیار سے الگ رکھنے کی ایک بل کا معاملہ اٹھایا۔ وہ بل نیٹال اسمبلی میں پاس ہونے والا تھا۔ وہاں آباد ہندوستانیوں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ ایک ماہ اور ٹھہر جائیں اور بل کی مخالفت کی قیادت کریں۔ ہندوستانیوں میں انگریزی زبان کی اتنی بھی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ مسودہ تیار کر سکیں۔ گاندھی جی ایک ماہ ٹھہرنے کے لیے راضی ہو گئے مگر ٹھہر گئے پورے بیس سال۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی اور جب وہ ہندوستان لوٹے، ان کی عمر پینتالیس سال ہو گئی تھی۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے تجربے بڑے انوکھے تھے۔ انگلینڈ سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انھوں نے کئی باتوں کا بطور حق دعویٰ کیا مثلاً ٹرین میں سفر کرنے کے لیے پہلے درجہ کا ٹکٹ اور ہوٹل میں ٹھہرنے کے لیے کمرہ۔ ان سے پہلے جنوبی افریقہ میں کوئی بھی ہندستانی اس طرح کی بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستانیوں کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ وہ لوگ مہذب نہیں ہیں یعنی ان کا مغربی رہن سہن نہیں ہے۔ اسی

وجہ سے ان کے ساتھ امتیاز برتا جارہا ہے۔ گاندھی جی خود اپنے تجربات سے اور بقیہ ہندستانی بھی سمجھ گئے تھے کہ نسلی امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ گورے لوگ بہر صورت اپنا دبدبہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی، تو گاندھی جی کے ساتھ ایسا برا سلوک کیوں کیا جاتا ہے جبکہ وہ مغربی تہذیب میں پالے پوسے گئے تھے۔

گاندھی جی کے بارے میں ایک انوکھی بات یہ بھی تھی کہ وہاں وہ اکیلے انگریزی تعلیم یافتہ ہندستانی تھے۔ اسی لیے انھیں کے کندھوں پر نسلی امتیاز کے خلاف تحریک چلانے کی ذمے داری آن پڑی تھی۔ ان کی عمر سے کہیں بڑے تجربہ کار اور امیر تاجروں نے ان کو اپنا نیتا چنا تھا۔ وہی ایسے واحد ہندستانی تھے جو حکمرانوں سے انھیں کی زبان میں بات کرسکتے تھے، وہی قانون اور حکومت کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ان کی درخواستوں کے مسودے تیار کرسکتے تھے، تنظیمیں بنانے کی مہارت رکھتے تھے اور حکمرانوں کے سامنے ہندوستانیوں کی نمائندگی کرسکتے تھے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کی زندگی کی تاریخ لمبی ہے۔ یہاں ہم اس کو بہت مختصر تحریر کرتے ہوئے ان کے وسیع تجربات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔

1894 سے 1906 کے دوران گاندھی جی کی سیاسی سرگرمیوں کو ہم جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کی معتدل (Moderate) تحریک کہہ سکتے ہیں۔ اس دوران گاندھی جی نے زیادہ تر اپنی توجہ جنوبی افریقہ کی اسمبلیوں، کلونیل ملکوں کا کام دیکھنے والے سکریٹری اور انگلینڈ کی پارلیمنٹ کو درخواست اور اپیلیں بھیجنے پر مرکوز کی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس طرح کی کارروائیوں سے برٹش حکومت کو حقیقت کا پتہ چل جائے گا، اس کا جذبۂ حق وانصاف بیدار ہوگا، اس کا دل پگھلے گا اور وہ ہندوستانیوں کی بھلائی میں کچھ کام ضرور کرے گی کیونکہ بہر حال ہندستانی اسی کی سلطنت کے تو باشندے ہیں۔ گاندھی جی ہندوستانیوں کے مختلف فرقوں کو متحد کرنے اور ان کی مانگوں کے پرچار کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اس کے لیے انھوں نے نٹال کانگریس بنائی اور انڈین اوپنین (Indian Opinion) نام کا اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس دوران گاندھی جی کی ساری خوبیاں ایک کامیاب ناظم، صحافی، مشتہر اور فنڈ محصل کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آگئیں۔ لیکن 1906 کے آتے آتے ان کو یہ یقین ہوگیا کہ جدوجہد کی معتدل طریقے بالکل

ناکافی ہیں۔ان سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کی جدجہد کا دوسرا دور 1906 میں انفعالی مزاحمت یا سول نافرمانی (Civil Disobedience) سے شروع ہوا جس کو انھوں نے ستیہ گرہ کے نام سے موسوم کیا۔سب سے پہلے اس کا استعمال اس قانون کے خلاف کیا گیا جس کے تحت ہر ایک ہندستانی کو رجسٹریشن سرٹیفکیٹ لینا ضروری تھا۔اس سرٹیفکیٹ میں اس کے انگوٹھے کے نشانات ہوتے تھے۔اس کو اسے بروقت ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ 11 ستمبر 1906 میں جوہنس برگ ایمپائر تھیٹر (Impire Theatre) میں ہندستانیوں کا ایک عام جلسہ ہوا۔انجام کی پرواہ کیے بغیر لوگوں نے ایک آواز سے اس قانون کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کیا۔حکومت اور ہندستانی دونوں اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔گاندھی جی نے اس قانون کی مخالفت کرنے کے لیے غیر متشدد مزاحمت تنظیم (Passive Resistance Association) بنائی۔رجسٹریشن کی جو آخری تاریخ حکومت نے بتائی تھی اس کے گذر جانے پر اس نے گاندھی جی اور 26 دوسرے لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی شروع کی۔ان کو مجرم ٹھہرایا گیا اور ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ حکم نہ ماننے پر ان سب کو جیل بھیج دیا گیا۔اس کالے قانون کی مخالفت اور تیز ہوگئی اور جیل جانے والوں کی تعداد 155 تک پہنچ گئی۔جیل کا خوف لوگوں کے دلوں سے بالکل نکل گیا اور لوگ جیل کو کنگ ایڈورڈ (King Edward) کا ہوٹل کہنے لگے۔

جنرل اسمٹس (General Smuts) نے گاندھی جی کو بات چیت کرنے کے لیے بلایا اور وعدہ کیا کہ اگر ہندستانی خود سے اپنا رجسٹریشن کرالیں تو یہ قانون واپس لے لیا جائے گا۔وہ اس پر راضی ہوگئے اور سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنا رجسٹریشن کرایا جنرل اسمٹس کی یہ چال تھی۔اس نے یہ حکم جاری کیا کہ خود سے رجسٹریشن کرانے والوں کی قانوناً تصدیق کردی جائے۔اس کے جواب میں گاندھی جی کی قیادت ورہنمائی میں رجسٹریشن کرائے ہوئے سبھی لوگوں نے اپنے اپنے سرٹیفکیٹوں کو برسرِ عام جلا ڈالے۔

اسی دوران حکومت نے ایک دوسرا ایل باہر کے لوگوں کی آمد کو روکنے کے لیے اسمبلی میں پیش کیا۔اس کی مخالفت میں زوردار مہم چلائی گئی۔اگست 1908 میں نئے قانون کی خلاف

ورزی کرنے کی غرض سے نامور ہندستانی لیڈران سرحد (Frontier) کو پار کر کے نیٹال سے ٹرانسوال (Transval) چلے آئے۔ ان سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ ٹرانسوال کے تمام ہندوستانیوں نے اس قانون کی مخالفت کی اور لائسنس حاصل کیے بغیر خونچے لگانے لگے اور جن کے پاس لائسنس تھے انھوں نے دکھانے سے انکار کیا۔ ایسے سبھی لوگوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اکتوبر 1908 میں گاندھی جی کو بھی جیل ہوگئی۔ جیل میں ان کو دوسرے اور ہندوستانیوں کے ساتھ طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ ان کو سخت مشقت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مگر قید خانے کی تکلیفیں بھی ان کے حوصلے کو پست نہ کرسکیں بے بس ہو کر حکومت نے لوگوں کو خصوصاً غریب ہندوستانیوں کو ملک کے باہر نکالنا شروع کیا۔ تاجروں کو بھی مالی اعتبار سے نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی گئیں۔

اب تحریک پر مصیبت کے بادل منڈلانے لگے۔ پکا ارادہ والے ستیہ گرہی تو برابر جیل آتے جاتے رہے مگر عام طور سے ستیہ گرہی تھکے تھکے سے لگنے لگے۔ جدوجہد لمبی کھنچتی معلوم ہوتی تھی اور حکومت کے جھکنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ 1909 میں گاندھی جی انگریز افسروں سے ملنے لندن گئے۔ مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ستیہ گرہ کرنے والے لوگوں کے بال بچوں کے کھانے پینے کے لیے جمع کی گئی رقم بھی دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی۔ گاندھی کی وکالت بھی تحریک میں مکمل مصروف رہنے کے باعث بری طرح متاثر تھی۔ ایسے حالات میں گاندھی جی نے اپنے جرمن معمار دوست کالین باک (Kallen Back) کی فیاضانہ امداد سے ٹالسٹائے فارم قائم کیا اس طرح ستیہ گرہ میں لگے لوگوں کے بال بچوں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا مسئلہ انھوں نے حل کیا۔ یہی ٹالسٹائے فارم گاندھی جی کے ان آشرموں کے قیام کا پیش رو (Precursor) تھا جو بعد میں قومی تحریک کے اہم مراکز بنے تھے۔ اس فارم کے انتظام کے لیے ہندوستان سے امدادی رقمیں بھیجی گئیں۔ سر رتن ٹاٹا نے پچیس ہزار روپے بھیجے تھے۔ کانگریس مسلم لیگ اور نظام حیدرآباد نے بھی مالی امداد دی تھی۔

1911 میں کنگ جارج (King George) کی تاج پوشی کے موقع پر ہندوستانیوں اور جنوبی افریقہ کی حکومت کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا جو صرف 1912 کے آخر تک ہی

قائم رہا۔ انھیں دنوں گوکھلے جنوبی افریقہ کے دورے پر گئے۔ ان کے ساتھ سرکاری مہمان کا سا سلوک کیا گیا۔ حکومت نے ان سے وعدہ کیا کہ امتیاز برتنے والے سارے قوانین ختم کر دیے جائیں گے۔ مگر یہ وعدہ پورا نہ ہوسکا۔ اس لیے 1913 میں ستیہ گرہ پھر سے شروع کر دی گئی۔

اس بار ستیہ گرہ کا دائرہ کافی بڑا تھا۔ حکومت نے اقرارناموں سے الگ مزدوروں پر بھی تین پونڈ کا ٹیکس تھوپ دیا تھا۔ ہندستانی مزدوروں میں زیادہ تر لوگ غریب تھے۔ وہ بمشکل ایک ماہ میں دس شلنگ کما پاتے تھے۔ تین پونڈ ٹیکس ان کے لیے بہت زیادہ تھا۔ اس کے خلاف ستیہ گرہ شروع ہوگئی۔ قریب قریب سبھی ہندستانی اس میں شامل ہو گئے۔ اور اس طرح اس نے صحیح معنی میں عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسی درمیان سپریم کورٹ کے فیصلہ نے آگ میں گھی کا کام کیا۔ عدالت نے ان ساری شادیوں کو جو عیسائی رسم ورواج سے نہیں ہوئی تھیں اور جن کا رجسٹریشن نہیں ہوا تھا کو غیر قانونی قرار دیا اور ان سے پیدا ہوئی اولادیں حرامی قرار پائیں۔ اس فیصلے سے ہندستانی عورتوں کی بڑی بے آبروئی ہوئی اور بہت ساری عورتیں ستیہ گرہ میں شامل ہوگئیں۔

گاندھی جی نے محسوس کیا کہ جدوجہد کا آخری وقت اب آن پہنچا ہے۔ اس لیے اس میں ساری توانائی جھونک دینی چاہیے۔ 16 ستیہ گرہی جن میں کستوربا گاندھی بھی شامل تھیں قانون کی خلاف ورزی کر کے نیٹال کے فونیکس سیٹلمنٹ (Phoenix Settlement) سے ٹرانسوال پہنچ گئے۔ ان سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ گیارہ عورتوں کا ایک جتھہ بغیر پرمٹ کے ٹالسٹائے فارم سے چل کر نیٹال سرحد کو پار کر کے نیوکیسل (New Castle) جو کان کا قصبہ تھا پہنچ گیا۔ یہاں اس جتھہ نے کان کے مزدوروں جن میں زیادہ تر تمل تھے سے بات چیت کی اور ان کو ہڑتال کے لیے آمادہ کیا۔ بعد میں ان سب کو گرفتار کرلیا گیا۔

گاندھی جی فوراً نیوکیسل پہنچ گئے اور تحریک کی کمان سنبھال لی۔ کان مالکوں نے مزدوروں کے کوارٹر کی بجلی اور پانی کا کنکشن کاٹ دیا۔ اس طرح ان کو کوارٹر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ گاندھی جی دو ہزار سے زائد لوگوں کے ایک جتھہ کو لے کر جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے، ٹرانسوال کی جیل میں بھیجنے کے ارادہ سے حد پار کر کے چل پڑے۔ راستے میں ان کو دو بار گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا۔ مگر تیسری بار گرفتار کر کے ان کو ٹرین میں بٹھا کر نیٹال واپس بھیج دیا گیا۔ ان

پر مقدمے چلے اور وہ جیل بھیجے گئے۔ جیل میں ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ ان کو بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ ان پر کوڑے برسائے جاتے اور پولیس کے گھیرے میں رکھ کر ان سے کانوں میں کام لیا جاتا۔ گاندھی جی سے پتھر کھدوایا گیا۔ ان کو جھاڑو لگانے پر مجبور کیا گیا۔ ان کو اندھیری کوٹھری میں رکھا جاتا اور ہتھکڑی بیڑی پہنا کر عدالت لایا جاتا۔

حکومت کے اس ظلم کو سن کر ہندستانی سماج تلملا اٹھا۔ کان اور باغان مزدوروں نے ہڑتال کردی۔ گوکھلے نے پورے ہندوستان کا دورہ کر کے اس ظلم کے خلاف رائے عامہ تیار کی۔ لارڈ ہارڈنگ (Lord Harding) تک نے اس کی مذمت کی۔ انھوں نے کہا ''ایسا کوئی ملک جو خود کو مہذب کہتا ہے، اس طرح کے مظالم برداشت نہیں کرے گا'' 3 انھوں نے ان مظالم کی غیر جانبدارانہ جانچ کرانے کی اپیل بھی کی۔ پورے ملک نے نہتھوں پر ہوئے ایسے مظالم پر غم وغصہ کا اظہار کیا۔

لارڈ ہارڈنگ، گاندھی جی، سی۔ ایف۔ اینڈ ریوز (C.F. Andrews) اور جنرل اسمٹس سے کئی بار ہوئی لمبی بات چیت کے بعد جنوبی افریقہ کی سرکار نے ہندوستانیوں کی خاص خاص مانگوں کو منظور کرلیا۔ تین پونڈ کی چنگی اور رجسٹریشن سرٹیفکیٹ کی پابندی ختم کردی گئی۔ ہندوستانیوں کو اپنے رسم ورواج کے مطابق شادی کرنے کے اختیار کو بحال کردیا گیا۔ نیز ہندستانی آبادی کی دوسری پریشانیوں کو دور کرنے کا اطمینان دلایا گیا۔ پرامن سول نافرمانی تحریک بات چیت کے ذریعہ دشمن سے اپنی مانگ منوانے میں کامیاب ہوئی۔

جدوجہد کے گاندھیائی طریقہ کا ارتقا ہو چکا تھا۔ گاندھی جی وطن واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ اب ان کو اپنے طریقہ کی آزمائش بڑے پیمانہ پر یہیں کرنا تھا۔ جنوبی افریقہ کی جدوجہد نے ان کو کئی معنوں میں قومی تحریک کی قیادت کے لیے تیار کیا۔ غریب مزدوروں کی قیادت کرنے سے ان کو بڑے قیمتی تجربات ہوئے۔ ان غریبوں کی ہمت اور جانفروشی کے جذبات کو دیکھ کر ان کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندستانی کسی بڑے کاز کے لیے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو کر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو ہر طبقہ اور مذہب وملت کے لوگوں کی قیادت کرنے کا

موقع ملا تھا۔ ہندو، مسلم، عیسائی اور پارسی سبھی لوگوں کی حمایت اور مدد ان کو حاصل تھی۔ وہ لوگ ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں خصوصیت سے تمل ناڈ اور گجرات کے باشندے تھے سماج کے مختلف طبقوں سے ان کا تعلق تھا۔ان کے ساتھ امیر تاجر، غریب مزدور، مرد عورت سبھی تھے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے تجربات کی اور بھی اہمیت تھی۔ وہاں انھوں نے اچھی طرح سمجھا کہ کسی تحریک کے لیڈر کو دوست دشمن دونوں کی مخالفت جھیلنی پڑتی ہے۔جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو دوبار جان کی بازی لگانی پڑی تھی۔ 1896 میں ڈربن میں ان کے خون کی پیاسی گوروں کی ایک بھیڑ نے سڑک پر ان کا پیچھا کیا۔ رہائش گاہ میں پناہ لینے پر بھیڑ نے ان کا گھر گھیر لیا۔ جلدی جلدی بھیس بدل کر بڑی مشکل سے انھوں نے اپنی جان بچائی دوسری بار ایک ہندستانی پٹھان نے ان پر جان لیوا حملہ کیا۔ وہ ان سے اس لیے ناراض تھا کیونکہ انھوں نے گورنمنٹ سے ایک سمجھوتہ کرلیا تھا۔ یہ سمجھوتہ اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ان واقعات سے گاندھی جی نے یہ سبق لیا کہ قوم کے لیڈروں کو بارہا ایسے فیصلے لینے پڑتے ہیں جو ان کے پیروؤں کو ناگوار ہوتے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو مخالف سیاسی فکروں سے صرف نظر کرکے ایک نئی سیاسی فکر، قیادت کا نیا انداز اور جدوجہد کے نئے طریقوں کی ارتقا کرنے اور ان کو محدود دائرہ میں آزمانے کا موقع ملا۔ انھوں نے تحریک کو اعتدالی دور (Moderate Phase) سے نکال کر گاندھیائی دور میں داخل کیا۔ وہ گاندھیائی طریقہ کے جزئیات مع اس کی کمیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کو پورا یقین تھا کہ یہی طریقہ تحریکی جدوجہد کے لیے سب سے اچھا اور موثر ہے۔ بس ہندوستان میں اس پر عمل کرنا باقی ہے۔

جنوری 1915 میں گاندھی جی ہندوستان واپس آگئے۔ یہاں ان کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ جنوبی افریقہ میں ان کے کارہائے نمایاں نے ان کو ملک میں بہت مقبول اور معروف کردیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان میں ہی وہ مشہور نہیں تھے بلکہ ان پڑھ دیہاتی بھی ان کے نام سے واقف ہوگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گاندھی جی کمبھ میلہ گئے تو لوگوں کا بھاری ہجوم ان کا درشن کرنے امڈ پڑا۔ گوکھلے اس سے قبل ہی ان کے بارے میں ان الفاظ میں کہہ چکے تھے

'' گاندھی جی میں شہیدوں اور بہادروں کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں''۔ ملک کے اس لیڈر کو ان کے اندر اس سے بھی زیادہ شاندار خوبی کا ادراک ہوا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ'' گاندھی جی میں لوگوں کو متاثر کرنے کی وہ روحانی طاقت ہے جو ہر اس معمولی آدمی کو بہادر، جاں باز اور جاں فروش بنا دیتی ہے جو ان کی صحبت میں آتا ہے''۔[4]

گاندھی جی کا خیال تھا کہ کسی بھی مسئلہ میں اس وقت تک دخل نہیں دینا چاہیے جب تک پورے حالات کی معلومات نہ ہو جائے۔ گوکھلے کی بھی یہی رائے تھی۔ اس لیے گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ فی الحال وہ کسی سیاسی مسئلہ پر عالمی طور سے ردعمل نہیں کریں گے۔ اسی لیے حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے وہ پورے ایک سال ملک بھر کا دورہ کرتے رہے اور احمد آباد میں اپنا آشرم جمانے کا کام کرتے رہے۔ یہاں پر گاندھی جی کے ساتھ جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے پیروؤں کو بسانے اور آباد کرنے کا کام چل رہا تھا۔

دوسرے سال بھی گاندھی جی فعال (Active) سیاست سے دور رہے۔ اس وقت ہوم رول تحریک زور وشور سے چل رہی تھی مگر وہ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ اس وقت کے سارے سیاسی نظریات سے ان کے خیالات میل نہیں کھاتے تھے۔ معتدل (Moderate) سیاست سے بہت پہلے ان کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ وہ ہوم رول تحریک کے لوگوں کی اس حکمت عملی کے خلاف تھے کہ انگریزوں پر آئی مصیبت ان کے لیے فال نیک ہے۔ اسی حکمت عملی کے تحت پہلی جنگ کے چھڑتے ہی ہوم رول تحریک چھیڑی گئی تھی۔ گاندھی جی اس نظریے کے بالکل خلاف تھے۔

اس کے علاوہ وہ اس وقت کی جدوجہد کے طریقوں سے بھی متفق نہیں تھے۔ ان کے نزدیک ستیہ گرہ ہی جدوجہد کا واحد طریقہ تھا۔ اس وقت کی تحریکوں میں گاندھی جی کی عدم شرکت کی وجہ انھیں کے الفاظ میں اس طرح ہے'' میں کسی تنظیم میں اسی وقت شامل ہو سکتا ہوں جب میں اس کی پالیسیوں کو متاثر کر سکوں، میں اس کی پالیسیوں سے خود متاثر ہونے کے لیے اس میں شامل نہیں ہوں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نئی روشنی کو اپنانے کے لیے میرا دماغ کھلا ہوا نہیں ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نئی روشنی اتنی موثر اور چکا چوندھ کرنے والی ہو کہ وہ مجھے موہ لے''۔[5]

1917 کے دوران اور 1918 کے شروع سالوں میں گاندھی جی تین جگہوں پر بہار

کے چمپارن اور گجرات کے احمد آباد و کھیڑا میں اپنی کاوش میں جٹ گئے۔ یہاں پر کی گئی ان کی تینوں کوششیں مقامی لوگوں کے مالی مسائل سے جڑی تھیں۔ چمپارن اور کھیڑا کی تحریکیں کسانوں سے متعلق تھیں اور احمد آباد میں چلائی گئی تحریک کارخانہ مزدوروں سے تعلق رکھتی تھی۔

چمپارن کی کہانی انیسویں صدی کی ابتدا سے ہی شروع ہوتی ہے۔ یورپی باغان مالکوں نے کسانوں سے ایک معاہدہ کرالیا تھا کہ کسانوں کو اپنی زمین کے 3/20 حصہ پر نیل کی کھیتی کرنا ضروری ہے۔ اس کو تین کٹھیا سسٹم کہتے تھے۔ انیسویں صدی کے خاتمہ تک جرمنی کے سنتھلک رنگوں نے نیل کے دھندھے کو بہت نقصان پہنچایا۔ بازاروں میں اس کی مانگ ختم ہوگئی۔ چمپارن کے باغان مالک نیل کی کھیتی بند کرنے کے لیے مجبور ہوگئے۔ مجبوراً کسان بھی نیل کی کاشت سے نجات پانا چاہتے تھے۔ یورپی باغان مالکوں نے کسانوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ کسانوں کو اقرار ناموں سے آزاد کرنے کے لیے لگان اور دوسرے ابوابوں (Dues) کی رقم کو من چاہی شرح سے بڑھادی۔ 1908 میں اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا، مگر باغان مالکوں کی لوٹ کھسوٹ برابر جاری رہی۔ بہرحال 1917 میں چمپارن کے راج کمار شکلا نے گاندھی جی کو چمپارن بلانے کا ارادہ کیا۔ وہ گاندھی جی کے پیچھے پیچھے اس وقت تک گھومتے رہے جب تک وہ اس بات پر راضی نہیں ہوگئے کہ وہ چمپارن آکر کسانوں کے مسائل کا جائزہ لیں گے۔ راج کمار شکلا کا گاندھی جی کو چمپارن بلانا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ گاندھی جی غریب اور مظلوم کے حقوق کی طرفداری میں لڑنے کے لیے کس قدر مقبول ہوچکے تھے۔

گاندھی جی جیوں ہی چمپارن پہنچے، کمشنر نے ان کو وہاں سے فوراً چلے جانے کا حکم دیا۔ گاندھی جی نے چمپارن چھوڑنے سے انکار کردیا اور وہ اس کے لیے کوئی بھی سزا جھیلنے کے لیے تیار تھے۔ لوگوں کے لیے یہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔ تلک اور اینی بسنٹ کے نزدیک بھی یہ نئی چیز تھی کیونکہ جب بھی ان لوگوں کو اس طرح کا حکم دیا گیا، انھوں نے احتجاج کرتے ہوئے بھی اس پر عمل کیا۔ کسی نامناسب حکم کی نافرمانی اور پرامن طریقے سے اس کی مخالفت حقیقت میں نئی بات تھی۔ سرکار ہند اب تک گاندھی جی کو باغی نہیں مانتی تھی اور اس مسئلہ کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے مقامی افسران کو حکم واپس لینے اور گاندھی جی کو چمپارن کے گاؤں میں جانے اور

لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کی اجازت دے دی۔

اس طرح گاندھی جی کسانوں کی پریشانیوں اور دقتوں کی چھان بین میں پوری طرح مصروف ہو گئے۔ وہاں ان کے کام کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں برج کشور، راجیندر پرشاد، مہادیو دیسائی، نرہر پارکھ، جے۔ بی۔ کرپلانی اور بہار کے دوسرے دانشوروں کے ساتھ صبح سویرے نکل جاتے اور گھوم گھوم کر شام تک کسانوں سے ملتے، ان سے پوری معلومات حاصل کرتے اور جب ان کو یہ یقین ہو جاتا کہ ان کا بیان صحیح ہے تو اسے درج کر لیتے۔ انھیں دنوں سرکار نے ان سارے معاملات کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیشن کا تقرر کیا اور گاندھی جی کو اس کا ممبر بنایا۔ گاندھی جی کو کمیشن کو یہ بات سمجھانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ترکٹھیا سسٹم ختم ہونا چاہیے اور یہ کہ کسانوں سے جو پیسہ غیر قانونی طریقے سے وصول کیا گیا ہے اس کے لیے ان کو ہرجانہ دیا جائے۔ اس کے ثبوت میں وہ 8000 کسانوں کے بیانات درج کر چکے تھے۔ گاندھی جی کے ساتھ کسی طرح کیے گئے ایک سمجھوتہ کے تحت باغان مالک غیر قانونی وصولی رقم کا 25 فیصدی واپس کرنے پر راضی ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے اس کی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی نے سو فیصدی وصولی کی مانگ کیوں نہیں کی۔ اس بات پر گاندھی جی نے کہا کہ 25 فیصدی واپس کرنا ہی ان کی بے عزتی کا باعث ہے۔ دوسرے اور معاملوں کی طرح گاندھی جی کا اندازہ اس معاملہ میں بالکل صحیح تھا۔ دس سال کے اندر ہی باغان مالکوں نے چمپارن چھوڑ دیا۔

اس کے بعد گاندھی جی کی توجہ احمد آباد کے مل مزدوروں کی طرف گئی۔ مزدوروں اور مل مالکوں کے درمیان پلیگ بونس کے سلسلہ میں بحث چل رہی تھی۔ طاعون کے ختم ہونے پر مل مالکان پلیگ بونس ختم کر دینا چاہتے تھے مگر مزدور اس کو برقرار رکھنے کی مانگ کر رہے تھے۔ مزدوروں کی دلیل یہ تھی کہ ان کو جو رقم بطور بونس مل رہی ہے وہ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے بڑھی ہوئی مہنگائی سے کافی کم ہے۔ اس لیے اس بھتے کو واپس نہیں لیا جانا چاہیے۔ برٹش کلکٹر نے یہ محسوس کیا کہ کہیں اس بات کو لے کر زور آزمائش نہ ہونے لگے۔ اس لیے اس نے گاندھی جی سے کہا کہ مل مالکوں پر دباؤ ڈال کر سمجھوتہ کرا دیں۔ مل مالکوں میں ایک صاحب امبالال سارا بھائی گاندھی جی کے دوست تھے۔ انھوں نے سابرمتی آشرم کے لیے کافی پیسہ دیا تھا۔ گاندھی جی نے

مزدوروں اور مالکوں کو سارے معاملے ایک ٹریبونل (Tribunal) کے سپرد کرنے پر راضی کر لیا۔ لیکن بعد میں مالکوں نے ہڑتال کا بہانہ بنا کر خود کو اس سے الگ کر لیا۔ انھوں نے بیس فیصدی بونس دینے کا اعلان کیا اور یہ بھی دھمکی دی کہ جو مزدور اس کو نہیں مانیں گے، ان کو نوکری سے نکال دیا جائے گا۔

ان کی وعدہ خلافی کو گاندھی جی نے بڑی سنجیدگی سے لیا اور مزدوروں کو ہڑتال پر جانے کی صلاح دی۔ پونجی، پیداوار، منافع اور مزدوروں کی روزی روٹی پر غور وخوض کر کے گاندھی جی نے مانگ کی کہ مزدوروں کی مزدوری میں 35 فیصدی کا اضافہ ہونا چاہیے۔

مزدوروں کی ہڑتال شروع ہو گئی۔ سابرمتی ندی کے ساحل پر گاندھی جی روزانہ مزدوروں کو خطاب کرتے تھے۔ وہ روزنامہ نیو بلیٹن (New Bulletin) اخبار نکالتے تھے انھوں نے مزدوروں کو تشدد کا راستہ نہ اختیار کرنے کی صلاح دی۔ امبالال سارا بھائی کی بہن انسوئیا (Anasuya) ان کے ساتھ تھیں جبکہ ان کے بھائی مخالف خیمہ میں تھے۔

مزدور کچھ دنوں بعد تھکنے لگے۔ اور ان کی میٹنگوں میں ان کی حاضری کم ہونے لگی اور مالکوں کا رویہ سخت تر ہونے لگا۔ مزدوروں کا حوصلہ بڑھانے اور جدوجہد کو تیز کرنے کے لیے گاندھی جی نے خود اپواس (Fast) رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے عہد کیا کہ اگر ہڑتال کی وجہ سے مزدور بھوکے مریں گے تو وہ خود بھوکے رہیں گے۔ مل مالکوں پر گاندھی جی کی اس کارروائی کا من چاہا اثر پڑا۔ وہ لوگ پورا معاملہ ٹریبونل (Tribunal) کو سپرد کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ اس طرح ہڑتال واپس لے لی گئی۔ بعد میں ٹریبونل نے مزدوروں کی منشا کے مطابق ان کی مزدوری میں 35 فیصدی کا اضافہ کر دیا۔

احمد آباد میں مزدوروں اور مالکوں کے درمیان کا جھگڑا ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ گاندھی جی کو معلوم ہوا کہ کھیڑا ضلع کے کسان بڑی مصیبت میں ہیں۔ ان کی فصلیں برباد ہو گئی ہیں پھر بھی سرکار ان سے مال گذاری وصول رہی ہے۔ کسان مال گذاری کی معافی کی مانگ کر رہے ہیں مگر سرکار گونگی ہو گئی ہے۔ سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی (Servant of India Society) کے ممبر بٹھل بھائی پٹیل اور گاندھی جی معاملہ کی پوری تحقیق کر کے اس نتیجہ پر پہنچے کہ

کسانوں کی مانگیں جائز ہیں اور اس لیے مال گذاری اصول (Revenue Rules) کے تحت زمین کا لگان معاف ہونا چاہیے۔

اس تحریک میں گجرات سبھا جس کے گاندھی جی صدر تھے نے اہم رول ادا کیا۔ درخواستوں اور اپیلوں کا جب کوئی اثر حکومت پر نہیں پڑا تب گاندھی جی نے لوگوں کو لگان بیباق نہ کرنے اور اس ظلم اور جبر کے خلاف مرتے دم تک جنگ کرنے کی صلاح دی 6 اور اس طرح سرکار کو یہ بھی واضح کر دیا کہ عوام کی مرضی کے بغیر کوئی سرکار حکومت نہیں کر سکتی" 7 کھیڑا ضلع کے نوجوان وکیل بلبھ بھائی پٹیل، اندو لال یاگنک (Indu Lal Yagnik) اور دوسرے کئی نوجوانوں نے گاندھی جی کے ساتھ گاؤں کا دورہ شروع کیا اور کسانوں سے جدو جہد کرنے کی اپیل کی۔ سرکار نادہندہ کسانوں کی زمینیں قرق کر رہی تھی اور ان کے مویشی ہانکے لیے جا رہی تھی۔ گاندھی جی نے کسانوں سے لگان نہ دینے کی قسم دلائی۔ جو لوگ لگان دینے کی حیثیت رکھتے تھے ان کو بھی منع کیا گیا کیونکہ ان کے لگان دینے کی صورت میں غریب کسانوں کو بھی ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا۔ ایسی حالت میں یا تو وہ قرض لیتے یا پھر اپنی جائدادیں فروخت کرتے۔ گاندھی جی نے حکومت سے کہا کہ اگر وہ غریب کسانوں کا لگان معاف کر دیتی ہے تو جو لوگ لگان دینے لائق ہیں وہ خود اپنی مرضی سے پورا لگان دے دیں گے۔

کھیڑا کے کسان طاعون، مہنگائی اور قحط کی مار سے بدحال تھے۔ اس لیے ان کی جدو جہد کمزور پڑنے لگی۔ تبھی گاندھی جی کو معلوم ہوا کہ سرکار نے اپنے افسروں کو خفیہ ہدایتیں دی ہیں کہ مال گذاری صرف انہیں کسانوں سے وصولی جائے جو دینے کی سکت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سرکار کی خفیہ ہدایتیں صرف اس وجہ سے تھیں کہ اس سے حکومت کے وقار پر آنچ آتی تھی۔ گاندھی جی کی منشا پوری ہو رہی تھی اس لیے انھوں نے اپنی تحریک واپس لے لی۔ بعد میں گاندھی جی نے یہ بات ظاہر کی کہ اس وقت تک لوگ اپنی جدو جہد میں تھک چکے تھے۔ اس لیے تحریک روکنے کے لیے وہ کسی باعزت بہانہ کی تلاش میں تھے 8

چمپارن، احمد آباد اور کھیڑا میں گاندھی جی کو اپنے سیاسی طور طریقوں کے آزمانے کا بڑے پیمانہ پر موقع ملا۔ اس کے علاوہ وہ عوام کے قریب آئے اور ان کے مسائل سے واقف ہوئے۔ ان کو

اس کی قوت اور کمزوریوں کا بھی علم ہوا۔ان کی حکمت عملی کہاں تک کامیاب ہوسکتی ہے اس کی بھی معلومات ان کو ہوئی۔ بہت سارے سیاسی رضاکاران خصوصاً نوجوان ان کو عقیدت کی نظر سے دیکھنے لگے اور اس دوران انھوں نے ہندستانی عوام کے درمیان اچھی خاصی پہچان بنالی۔

گاندھی جی کے تجربات اور ان کی نیک نامی نے ان کو بے انتہا حوصلہ مند بنادیا تھا۔اپنی بے پایاں ہمت، استقلال اور خوداعتمادی کے سہارے گاندھی جی نے 1919 میں رولٹ ایکٹ کے خلاف ملکی سطح پر تحریک چلانی شروع کی۔انگریز، دہشت گردی کو کچلنے کا بہانہ بنا کر ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کو ختم کرنا چاہتے تھے۔رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی نے دو بل تیار کیے جن کو رولٹ بل کا نام دیا گیا۔ان دونوں بلوں کو کونسل میں پاس ہونے کے لیے پیش کیا گیا۔ان میں سے ایک کو ہندستانی ممبروں کی مخالفت کے باوجود جلدی جلدی پاس کر دیا گیا۔ہندستانی عوام اس قانون کو اپنی ہتک وتوہین کا باعث مانتی تھی۔یہ قانون ایسے وقت میں لائے گئے جب پہلی جنگ عظیم اپنے آخری مرحلہ میں تھی اور لوگ ملک میں اہم آئینی سدھاروں کے انتظار میں تھے۔ان کو خاص رعایت پانے کی امید تھی۔جب لوگوں کی مخالفت کا کوئی اثر حکومت پر نہیں پڑا تو گاندھی جی نے ستیہ گرہ شروع کرنے کا مشورہ دیا۔اس کے لیے ستیہ گرہ سبھا کی تشکیل کی گئی۔اس میں ہوم رول لیگ کے نوجوان ممبر تھے۔وہ حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ہوم رول لیگ کی سبھی شاخوں اور ممبروں کے پتے نوٹ کر کے ان سے تعلق جوڑا گیا۔ پھر پرچار کرنے کا کام شروع ہوا۔ملک بھر میں دعاؤں روزوں اور ہڑتالوں کا دور چلنے لگا۔اس کے ساتھ ہی کچھ خاص خاص قانونوں کی خلاف ورزی کا بھی فیصلہ لیا گیا۔

ستیہ گرہ کی تاریخ چھ اپریل طے کی گئی۔لیکن تحریک نے غیر متوقع صورت اختیار کرلی۔ تاریخ کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی۔اور دہلی میں 30 مارچ کو ہی ہڑتال کردی گئی۔اس کے دوران دہلی کی سڑکوں پر تشدد کے بہت سے واقعات ہوئے۔دوسری جگہوں پر بھی یہی ردعمل ہوا۔ پنجاب میں جہاں لوگ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں کی گئی جبریہ بھرتی نیز دوسری زیادتیوں ،اور بیماری کی تباہیوں سے سخت مصیبت میں تھے انھوں نے ایسے حالات کو حکومت سے بدلہ لینے کا نادر موقع سمجھا۔امرت سر اور پنجاب میں تو حالات قابو سے باہر ہو گئے۔گاندھی جی پنجاب

جا کر لوگوں کو سمجھانا چاہتے تھے مگر حکومت نے ان کو پنجاب میں داخل نہیں ہونے دیا اور ان کو بمبئی بھیج دیا۔ ان کا اپنا گجرات اور احمد آباد تشدد کی آگ میں جل رہا تھا اس لیے وہاں رک کر لوگوں کو پر امن کرنا چاہتے تھے۔ بمبئی میں بھی یہی حالت تھی۔

پنجاب میں واقعات بہت خطرناک موڑ پر تھے۔ امرت سر میں 10 / اپریل کو سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری کے خلاف ٹاؤن ہال اور پوسٹ آفس پر حملے کیے گئے۔ ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیے گئے۔ یورپی لوگوں جن میں عورتیں بھی شامل تھیں پر حملے ہوئے۔ تشدد پر قابو پانے کے لیے فوج تک طلب کر لی گئی۔ پورا شہر جنرل ڈائر (Dyer) کے سپرد کر دیا گیا۔ اس نے میٹنگ کرنے پر پابندی عائد کر دی۔

13 / اپریل کو بیساکھی کا دن تھا۔ جلیاں والا باغ میں بیساکھی کا جلسہ تھا۔ پاس پڑوس گاؤں اور قصبوں کے لوگ وہاں جمع تھے۔ جنرل ڈائر نے سمجھا کہ لوگ اس کے حکم کو نظر انداز کر کے جلسہ کرنے آئے ہیں۔ وہ جلسہ گاہ پر پہنچا اور لوگوں پر یکبارگی گولیاں برسانے کا حکم دیا۔ دس منٹ تک گولیاں برستی رہیں۔ ایسی درندگی کرنے کے پہلے اس نے لوگوں کو خبر دار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ جلسہ گاہ کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ وہاں سے بھاگنا آسان نہیں تھا۔ سرکاری اندازہ کے مطابق 379 لوگ مارے گئے مگر مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

جلیاں والا باغ میں جو بربریت کی گئی اس سے پورا ملک صدمہ میں ڈوب گیا۔ حکومت کے مظالم اب بھی جاری تھے۔ پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ امرت سر کے لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ لوگوں کو پیٹ کے بل رینگنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ گاندھی جی سے تشدد کے واقعات نہ دیکھے جا سکے۔ اس لیے انھوں نے 18 / اپریل کو اپنی تحریک واپس لے لی۔

لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ گاندھی جی کا پر امن ستیہ گرہ سے عقیدہ اٹھ گیا تھا یا وہ ہندستانی عوام سے ناامید ہو گئے تھے۔ ایک سال بعد انھوں نے ملکی سطح پر تحریک پھر شروع کی۔ اس کا دائرہ رولٹ ستیہ گرہ سے بھی زیادہ بڑا اور وسیع تھا۔ پنجاب کی وحشیانہ بربریت بھی اس تحریک کی ایک بنا تھی۔ مہاتما کا ہندستانی تجربہ اب شروع ہو گیا تھا۔

باب-15

عدم تعاون تحریک 22-1920

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سال یعنی 1920 ہندستانی عوام کے لیے بے چینی کا سال تھا۔ عوام کو یہ امید تھی کہ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد انگریزی حکومت ان کا کچھ بھلا کرے گی، لیکن رولٹ ایکٹ، جلیان والا باغ سانحہ اور پنجاب میں مارشل لانے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ عوام کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی کہ جبر و زیادتی کے سوا اسے اور کچھ نہیں ملنے والا ہے اور 1919 کے آخر میں بدنیتی سے کیے گئے مانٹیگو چیمس فورڈ (Montagu Chelms ford) سدھاروں کا مقصد کچھ ہی لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے۔ مسلمانوں کو بھی محسوس ہونے لگا کہ انگریزی حکومت نے ان کو بھی دھوکا دیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ترکی کے ساتھ فیاضانہ رویہ اختیار کیا جائے گا مگر اب وہ اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے نہیں معلوم پڑتے تھے۔ ہندستانی مسلمان ترکی کے خلیفہ کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے تھے۔ اس لیے جب ان کو یہ معلوم پڑا کہ ان کی مقدس جگہوں پر ترکی کا تسلط نہیں رہ جائے گا تو فطرۃً وہ بہت بے چین ہوئے۔ تمام وہ لوگ بھی جن کا خیال تھا

کہ جلیان والا باغ سانحہ اور پنجاب کی دوسری جگہوں پر ہوئے تشدد کے واقعات کی غیر جانبدارانہ تفتیش ہوگی، مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ہنٹر کمیٹی (Hunter Committee) کے ذریعہ صرف خانہ پوری ہو رہی ہے تو ان کا بھرم بھی جاتا رہا۔ اتنا ہی نہیں انگلینڈ کی پارلیمنٹ کے ہاؤس آف لارڈز (House of Lords) نے تو جنرل ڈائر کے ذریعہ کی گئی کارروائی کو صحیح قرار دے کر اس کے حق میں ووٹ دیا ہے اور انگلینڈ کی عوام نے جنرل ڈائر کو تیس ہزار پونڈ دینے کے لیے اس رقم کی وصولی کی غرض سے مارننگ پوسٹ (Mornning Post) کی مدد کی ہے۔ یہ ساری کارگذاریاں انگریزی حکومت کی نیت کو صاف ظاہر کر رہی تھیں۔

1920 کی پہلی چوتھائی کے آخر تک انگریزی سرکار کے ذریعہ کیے گئے سارے غلط کاموں کو صحیح ٹھہرانے کی پول کھل گئی تھی۔ خلافت لیڈروں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا گیا کہ وہ اب اور زیادہ امیدیں نہ رکھیں۔ 20 مئی کو ترکی کے ساتھ ہوئی ٹریٹی آف سیور (Treaty of Severs) میں یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ ترکی کی تقسیم کا فیصلہ مکمل ہے۔ اس سے گاندھی جی کو بڑا صدمہ پہنچا۔ تھوڑے دنوں سے خلافت نیتاؤں سے ان کو قریبی تعلقات ہو گئے تھے۔ نومبر 1919 کی خلافت کانفرنس میں ان کی مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ گاندھی جی کو یہ احساس ہوا کہ انگریزوں نے زبردست وعدہ خلافی کی ہے۔ وعدہ نبھانے کی ان کی منشاء مطلق نہیں ہے۔ فروری 1920 میں انھوں نے خلافت کمیٹی کو حکومت کی اس بدعہدی کے خلاف پرامن عدم تعاون تحریک چلانے کی صلاح دی۔ 9/جون 1920 کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کے مشورہ کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو اس تحریک کی قیادت کرنے کی درخواست کی۔

اسی درمیان کانگریس کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا کہ آئینی طریقوں سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ سے بھی کانگریس ناامید ہو چکی تھی۔ سرکار نے پنجاب میں جو وحشیانہ کرتوت کیے تھے اس کی جانچ خود کانگریس نے اپنے طور سے کرائی تھی۔ انھیں حالات میں کانگریس عدم تعاون تحریک پر غور کرنے کے لیے راضی ہوگئی۔ اگلی حکمت عملی طے کرنے کے لیے مئی 1920 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ستمبر 1920 میں مخصوص میٹنگ بلانے کا فیصلہ لیا گیا۔

اب سارے حالات اپنے اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے تھے۔ لوگ جلد سے جلد کارروائی کرنے کے لیے بے چین تھے۔ قومی تحریک نے پچھلے چالیس سالوں کی لگاتار محنت سے عوام کے بڑے حصہ کو سیاسی طور پر فعال بنا دیا تھا۔ لوگ انگریزی حکومت کے ظلم سے تنگ آ چکے تھے۔ اب چپ بیٹھ کر بے عزتی برداشت کرنا ان کے لیے بزدلی کا باعث تھا۔ اس کے علاوہ مالی اور معاشی دشواریوں سے لوگون کی زندگی اجیرن تھی۔ قصبوں اور شہروں میں مزدور، کاری گروں، دستکار، نچلے اور متوسط طبقوں کے لوگ ضروری اشیاء کی مہنگائی سے بری طرح متاثر تھے۔ گاؤں کے کسان قحط سالی اور وبائی بیماریوں سے بدحال تھے۔

22/جون 1920 کو گاندھی جی نے نوٹس کے طور پر وائسرائے کو ایک خط لکھا۔ اس میں انھوں نے بڑے زوردار الفاظ میں ان کو بتایا کہ ''روز اول سے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ خراب حکومت کرنے والے حکمراں کی مدد سے وہ انکار کردیں''1 اس نوٹس کی معیاد ختم ہو جانے پر پہلی اگست 1920 کو تحریک باقاعدہ شروع کردی گئی۔ اسی روز صبح سویرے تلک کا انتقال ہو گیا اس طرح تعزیت اور تحریک ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ لوگوں نے ملک بھر میں ہڑتال کیا اور جلوس نکالے اور بہت سارے لوگوں نے اپواس کیا (روزے رکھے) اور دعاؤں کا نظم کیا۔

ستمبر میں کانگریس کا کلکتہ میں اجلاس ہوا۔ سی۔ آر۔ داس جیسے سینئر نیتاؤں کی مخالفت کے باوجود کانگریس نے عدم تعاون تحریک کو اپنی تحریک مان کر اس کی منظوری دے دی۔ دراصل سی۔ آر۔ داس کی مخالفت کونسلوں کے الیکشن کے سلسلہ میں تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کے الیکشن ہونے والے تھے۔ وہ انتخابات کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر کانگریس میں ڈسپلن قائم رہے اور آپس میں پھوٹ نہ پڑے اسی خیال سے وہ الیکشن بائیکاٹ کے لیے راضی ہو گئے۔ زیادہ تر ووٹروں نے بھی اس پر عمل کیا۔

دسمبر میں کانگریس کا سالانہ جلسہ ناگپور میں منعقد ہوا۔ کانگریس کا اندرونی تضاد ختم ہو چکا تھا۔ کونسلوں کے چناؤ بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے چناؤ بائیکاٹ کا مسئلہ بھی سرے سے ختم تھا، سی۔ آر۔ داس نے ہی اس اجلاس میں عدم تعاون تحریک کی تجویز (Resolution) پیش کیا۔ اس میں بہت ساری باتیں آتی تھیں مثلاً اعزازی خطابوں کو واپس کرنا، سرکاری اسکولوں،

کالجوں، عدالتوں اور بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ۔ ان کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ لوگوں سے سرکاری نوکریوں سے استعفے دینے اور سرکار سے عدم تعاون کرکے ٹیکس نہ ادا کرنے کے لیے بھی کہا جاسکتا ہے۔ نیشنل اسکولوں کا قیام اور مقامی جھگڑوں کے نمٹارے کے لیے پنچایتوں کی تشکیل، کتائی بنائی کی حوصلہ افزائی، ہندو مسلم اتحاد بنائے رکھنا، چھوا چھوت ترک کرنا اور عدم تشدد کے اصول کو سختی سے اختیار کرنا وغیرہ ساری باتیں اس تجویز میں شامل تھیں۔ گاندھی جی نے یہ بھی یقین دلایا کہ اگر ان پروگراموں پر سختی سے عمل کیا گیا تو ایک سال کے اندر ہی سوراج حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح ناگپور کانگریس اجلاس نے دستور سے ہٹ کر عوامی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ بہت سارے انقلابی دہشت پسند گروپوں نے خصوصیت سے بنگال میں ان پروگراموں کی پرزور حمایت کی۔

نئے پروگراموں پر عمل کرنے کے لیے کانگریس کی تنظیمی ڈھانچے میں بھی کئی تبدیلیاں کی گئیں۔ اس کا مقصد بھی بدل گیا۔ پہلے اس کا مقصد آئینی اور قانونی طریقوں سے سوراج حاصل کرنا تھا مگر اب اس کا مقصد عدم تشدد اور مناسب طریقوں سے سوراج حاصل کرنا ہو گیا۔

گاندھی جی کے ذریعہ تیار کیے گئے کانگریس کے نئے دستور میں اہم تبدیلیاں لائی گئیں۔

اب کانگریس کے روزمرہ کام کو دیکھنے کے لیے 15 ممبروں کی ایک ورکنگ کمیٹی (Working Committee) بنائی گئی۔ تلک نے 1916 میں ہی یہ تجویز رکھی تھی۔ مگر اعتدال پسند کانگریسیوں کی مخالفت کی وجہ سے اس کو منظوری نہیں مل سکی تھی۔ گاندھی جی اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی تحریک کو لمبی مدت تک چلانے کے لیے اس طرح کی کوئی کمیٹی ہونی چاہیے جو پورے سال سارا کام کاج دیکھتی رہے۔ صوبائی سطح پر زبان و بھاشا کے لحاظ سے کانگریس کمیٹیاں بنائی گئیں جس سے مقامی لوگ اپنی بول چال کی زبان کا استعمال کرکے زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں۔ اسی کے ساتھ ہی کانگریس نے گاؤں اور قصبوں تک پہنچ کر گاؤں اور محلہ کمیٹیوں کی تشکیل کی۔ فیس ممبری گھٹا کر چار آنہ کردی گئی جس سے غریب عوام بھی ممبر بن سکیں اور لوگوں کی کثیر شرکت سے کانگریس کی مستقل آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اس طرح کانگریس کا دائرہ بہت وسیع ہوا اور اس کی شکل جمہوری بنی۔ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ جہاں تک ممکن ہو ہندی کا استعمال کیا جائے۔

عدم تعاون تحریک جس کی ابتدا خلافت کانفرنس سے ہوئی تھی کو اپنانے سے کانگریس کو نئی طاقت و توانائی حاصل ہوئی جنوری 1921 سے پورے ملک میں تحریک نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ گاندھی جی نے علی برادران جو اس وقت خلافت تحریک کے روح رواں تھے کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا، سیکڑوں میٹنگوں کو خطاب کیا اور سیاسی رضا کاروں کی کثیر تعداد سے ملاقات کی۔ پہلے ہی ماہ ہزاروں طلبا (ایک تخمینہ کے مطابق نوے ہزار) نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا اور نیشنل اسکولوں میں داخلہ لیا۔ اس وقت ملک میں 800 نیشنل اسکول اور کالج تھے سرکاری اسکولوں میں تعلیم کا بائیکاٹ مغربی بنگال میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ کلکتہ کے طلبا نے پورے صوبہ میں ہڑتال کی۔ ان کی مانگ تھی کہ اسکولوں کی انتظامیہ کمیٹی سرکار سے اپنا رشتہ توڑ لے۔ سی۔ آر۔ داس نے اس تحریک کو تیز کرنے میں اہم رول ادا کیا اور سبھاش چندر بوس نیشنل کالج کلکتہ کے پرنسپل ہو گئے۔ ملکی سطح کی اس جدو جہد نے سودیسی اسپرٹ میں نیا جوش پھونکا۔ بنگال کے بعد دوسرے نمبر پر پنجاب میں بڑے پیانے پر تعلیم کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس پروگرام میں لالہ لاجپت رائے نے بہت کام کیا، حالانکہ شروع میں وہ اس سے متفق نہیں تھے۔ بمبئی، اتر پردیش، بہار، اڑیسہ، آسام میں بھی اس پر کافی عمل ہوا صرف مدراس میں لوگوں نے اس سلسلہ میں دلچسپی نہیں دکھائی۔

وکیلوں کے ذریعہ عدالت کا بائیکاٹ تو اتنا کامیاب نہیں تھا جتنا تعلیم کا بائیکاٹ تھا۔ مگر ملک کے نامور وکیلوں مثلاً سی۔ آر۔ داس، موتی لعل نہرو، ایم۔ آر۔ جیکر، سیف الدین کچلو، ولبھ بھائی پٹیل، سی۔ راج گوپال چاری، ٹی۔ پرکاشم اور آصف علی نے چمک رہی منافع بخش وکالت چھوڑ کر مثال قائم کردی۔ ان کی ان قربانیوں سے لوگوں کو بڑا حوصلہ ملا۔ تعداد کے اعتبار سے اس معاملہ میں بنگال اول نمبر پر رہا۔ اس کے بعد آندھرا، اتر پردیش، کرناٹک اور پنجاب تھے۔

بائیکاٹ پروگراموں میں سب سے زیادہ کامیاب بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ رضا کار گھر گھر جا کر بدیسی کپڑے اکٹھا کرتے، مقامی لوگ ایک جگہ جمع ہوتے اور کپڑوں کی ہولی جلائی جاتی۔ گاندھی جی کے ساتھ پربھوداس گاندھی 1921 کے اول نصف میں ملک کے دورے پر نکلے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب ٹرین چند منٹ کے لیے اسٹیشنوں پر رکتی تو گاندھی جی، استقبال

میں کھڑی بھیڑ سے کہتے کہ آپ لوگ کم سے کم سرکی پوشاک ہی اتار دیں۔لوگ فوراً اپنے اپنے دوپٹے ،ٹوپی، پگڑی جو بھی پہنے ہوتے، اتار دیتے۔اور اس طرح ان سامانوں کا ڈھیر بن جاتا۔ پر بھو داس گاندھی بتاتے ہیں کہ جیسے ہی ہماری گاڑی آگے بڑھتی، آگ کی لپٹیں اوپر اٹھتی دکھائی پڑتیں۔2 بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر دھرنا دینا (Picketing) بھی بائیکاٹ تحریک میں شامل تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 21-1920 جہاں ایک ارب دو کروڑ روپے کی درآمدگی (Import) ہوئی تھی وہیں 22-1921 میں گھٹ کر یہ صرف 57 کروڑ ہو گئی۔اس تحریک میں ایک اور کام جس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی وہ تھا تاڑی کی دوکانوں (Toddy Shops) پر دھرنا دینا۔ سرکار کی آمدنی کو اس سے بہت نقصان پہنچا اور مجبور ہو کر وہ اس کی مشتہری میں جٹ گئی کہ اس کے پینے سے بڑے فائدے ہیں۔

بہار اور اڑیسہ کی انگریزی سرکاروں نے تاریخ کی عظیم ہستیوں کے ناموں کی ایک فہرست شائع کی جس میں موسیٰ، سکندر، جولیس سیزر، نپولین، شیکسپیر، گلیڈسٹن (Gladstone) ٹینیسن (Tennyson) اور بسمارک (Bismarck) کے نام تھے اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ شراب پیتے تھے۔

مارچ 1921 میں کانگریس کا اجلاس وجے واڑا (Vijaya wada) میں منعقد ہوا۔ کانگریس کے رضاکاروں کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگلے تین دن وہ اپنی ساری توجہ فنڈ جمع کرنے، ممبر بنانے اور چرکھا بانٹنے پر مرکوز کریں۔ممبر سازی کا نشانہ (Target) ایک کروڑ رکھا گیا۔گو کہ اتنی تعداد میں ممبر نہیں بن پائے پھر بھی موٹے طور سے ممبروں کی تعداد پچاس لاکھ تک پہنچ گئی۔تلک سوراج فنڈ (Tilak Swaraj Fund) تو اپنے نشانہ (Target) سے اوپر نکل گیا۔ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم اکٹھا کر لی گئی۔ چرکھے کی خوب مشتہری ہوئی۔ کھادی تو ی تحریک کا یونیفارم بن گیا۔طلبا کے ایک جلسہ میں جب گاندھی جی تقریر کر رہے تھے تو ایک طالب علم نے کہا کہ کھادی بہت مہنگی ہے۔انھوں نے فوراً جواب دیا کہ اس کا حل کم کپڑے پہننے سے ہوگا۔اور اسی روز سے انھوں نے دھوتی اور کرتا ترک کر کے لنگوٹی پہننا شروع کر دیا3 اور وہ زندگی بھر ''ادھ ننگے فقیر'' بنے رہے۔

جولائی 1921 میں حکومت کے سامنے ایک دوسرا مسئلہ درپیش ہوا۔ 8 / جولائی کو کراچی میں منعقد خلافت کانفرنس میں محمد علی نے یہ اعلان کیا کہ انگریزی فوج میں رہنا مسلمانوں کے لیے مذہباً ناجائز ہے اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے اس پیغام کو فوج میں بھرتی سبھی مسلمانوں تک پہنچا دیا جائے 4 اس کے فوراً بعد وہ دوسرے اور لیڈروں کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے۔ سرکار کی اس کارروائی کے احتجاج میں ان کی تقریر کو پورے ملک میں لاتعداد جگہوں پر میٹنگوں میں دوہرایا جاتا تھا۔ 4/ اکتوبر کو گاندھی جی اور 47 دوسرے بڑے کانگریسی لیڈروں نے بیان جاری کیا جس میں محمد علی کے پیغام کو دوہراتے ہوئے یہ بات کہی کہ ہر ایک ہندستانی شہری کو ایسی ظالم حکومت سے اپنا ناتا توڑ لینا چاہیے۔ اگلے روز کانگریس انتظامیہ نے اسی طرح کا ایک ریزولیشن پاس کیا اور گیارہ اکتوبر کو پورے ملک کی مختلف کمیٹیوں نے اس کو منظوری دے دی۔ ان واقعات سے حکومت کی بڑی کرکری ہوئی مگر اس نے سب ان دیکھا کر دیا۔

دوسرا ڈرامائی واقعہ پرنس آف ویلس (Prince of wales) کا ہندوستان دورہ تھا۔ اس نے اس کی شروعات 17/ اپریل 1921 میں کی۔ جس روز وہ بمبئی آیا اس وقت پورے ملک میں ہڑتال تھی۔ بمبئی میں گاندھی نے قوم پرست عمر سبحانی کے الفسٹن مل (Elphistone Mill) کے احاطہ میں لوگوں کے کثیر مجمع کو خطاب کیا۔ وہیں بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ بدقسمتی سے پرنس آف ویلس کا استقبال کر کے لوٹ رہے اور گاندھی جی کی میٹنگ سے واپس ہو رہے لوگوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہوئے۔ اس کے بعد پورے شہر میں دنگے بھڑک اٹھے۔ ان میں زیادہ تر پارسی، عیسائی اور انگلو انڈین مارے گئے کیونکہ ان کو انگریزی حکومت کا وفادار مانا جاتا تھا۔ تین روز تک فسادات ہوتے رہے۔ تشدد کی آگ اس وقت ٹھنڈی ہوئی جب تین روز کے لیے گاندھی جی مرن برت پر بیٹھ گئے۔ تشدد کے ان واقعات سے گاندھی جی کو بہت صدمہ پہنچا اور ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ایسے واقعات دوبارہ نہ ہوں۔

پرنس آف ویلس کا ہر جگہ ویران سڑکوں اور بند دروازوں نے استقبال کیا۔ تحریک سے جڑے لوگوں کا حوصلہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں کے تیور جارحانہ (Aggressive) ہو رہے تھے۔ کانگریس والنٹیر کورپس (Congress Volunteer Corps) روز بروز طاقتور

اور مضبوط ہورہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ مقابلہ کا پولیس دستہ ہو۔ ان کی وردی اور نظم کو دیکھ کر حکومت کا فکرمند ہونا لازمی تھا۔ کانگریس نے صوبائی کانگریس کمیٹیوں (Pccs) کو یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جب بھی ان کو احساس ہو کہ عوام قانون کی خلاف ورزی کے لیے تیار ہے تو وہ تحریک چھیڑ سکتی ہے۔ بنگال کے مدنا پور ضلع میں یونین بورڈ ٹیکس (Union Board Tax)[5] کے خلاف اور آندھرا کے گنٹور ضلع کے چراِلا۔ پراِلا (Chirala Pirala) اور پیڈنڈ پاڈو (Pedanandpadu) تعلقہ میں ٹیکس نہ ادا کرنے کی تحریک شروع ہوگئی تھی[6]

عدم تعاون تحریک بالواسطہ (Indirectly) لوگوں کو متاثر کر رہی تھی۔ یوپی کے اودھ علاقوں میں کسان سبھا اور کسان تحریک 1918 سے ہی زور پکڑ رہی تھیں۔ جواہر لعل نہرو عدم تعاون تحریک کے پرچار میں گاؤں گاؤں گھوم رہے تھے۔ اس سے تحریک کو بڑی قوت ملی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ سمجھنا مشکل ہوگیا کہ کوئی بیٹھک کسان سبھا کی ہے یا عدم تعاون کے لوگوں کی[7] کیرالا کے ملابار میں عدم تعاون اور خلافت تحریک نے مسلمان کسان اسامیوں کو اپنے اپنے زمینداروں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے اکسایا۔ بس بدنصیبی یہ تھی کہ کہیں کہیں ان کی تحریکوں نے فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی تھی[8]

آسام میں چائے باغان مزدوروں نے ہڑتال کردی سرکار نے جب ان پر گولیاں برسائیں تو اسٹیمر (Steamer) پر کام کرنے والے عملہ نے ہڑتال کر کے ان کا ساتھ دیا۔ جے۔ایم۔سین گپتا (J.M. Sengupta) اور بنگال نیشنلسٹ لیڈروں نے ان کاموں میں اہم رول ادا کیا۔ مدنا پور میں سفید فام زمینداری کمپنی کے خلاف کلکتہ میڈیکل طالب علم کی قیادت میں مزدوروں نے ہڑتال کردی۔ آندھرا میں جنگلات قانون کے خلاف تحریک شروع ہوئی۔ راجستھان کسانوں اور قبائلیوں نے تحریکیں چلائیں۔ پنجاب میں اکالیوں نے بدچلن پجاریوں کی چنگل سے گوردواروں کو نکالنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ حقیقت میں ان کی یہ کاوش ملک بھر میں چل رہی عدم تعاون تحریک کا ایک حصہ ہی تھی۔ تمام جبر وظلم سے پست ہونے کے باوجود اکالی پرامن مزاحمت کے راستہ سے نہیں ہٹے[9] اس طرح کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عدم تعاون نے ملک کے مختلف حصوں میں انگنت مقامی تحریکوں کو

جنم دیا اور جو پہلے سے چل رہی تھیں ان کو اس سے قوت ملی۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ تحریکیں عدم تعاون تحریک کے پروگرام اور عدم تشدد پالیسی سے اکثر ہٹ گئی تھیں۔

ایسی حالت میں حکومت سمجھ گئی کہ اب معاملہ کو نظر انداز کرنے سے کام نہیں چلے گا، سختی کا راستہ اپنانا ہوگا۔ ستمبر 1920 میں جب تحریک شروع ہوئی تب حکومت کا خیال تھا کہ سختی کرنے سے بغاوت کی آگ اور بھڑکے گی اور اس کو کچلنے میں جو لوگ مارے جائیں گے عوام کی نگاہ میں شہید ہوں گے۔ اس طرح حکومت کے خلاف ان میں بڑا جوش پیدا ہوگا۔ مئی 1921 میں وائسرائے لارڈ ریڈنگ (Lord Reading) نے گاندھی جی سے مل کر ان سے کہا کہ وہ علی برادران کو سمجھا دیں کہ وہ اپنی تقریروں میں لوگوں کو بھڑکانے والی باتیں نہ کہیں۔ حکومت کی منشا تھی کہ گاندھی اور خلافت لیڈروں کے درمیان کڑواہٹ پیدا ہو۔ مگر اس چال میں اس کو کامیابی نہیں ملی۔ دسمبر آتے آتے حکومت یہ محسوس کرنے لگی کہ معاملہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ اس نے اپنی پالیسیوں کو بدلنے کا اعلان کیا۔ رضاکارانہ تنظیموں کو غیر قانونی قرار دے کر ان کے ممبروں کو گرفتار کیا جانے لگا۔

سب سے پہلے سی۔ آر۔ داس کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی بیوی بسنتی دیوی کو۔ حکومت کی اس کارروائی کی پورے بنگال میں مخالفت ہوئی۔ ہزاروں لوگوں نے گرفتاریاں دیں۔ اگلے دو مہینوں میں پورے ملک میں تیس ہزار لوگ گرفتار کیے گئے۔ بعد میں تو بڑے لیڈروں میں صرف گاندھی جی باہر رہ گئے۔ دسمبر کے وسط میں مالویہ جی کی ثالثی سے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی گئی، مگر حکومت کے ذریعہ جو شرطیں رکھی گئیں وہ خلافت لیڈروں کے لیے تباہ کن تھیں۔ اس لیے گاندھی جی نے ان کو نامنظور کر دیا۔ ویسے بھی انگلینڈ کی سرکار صلح کے موڈ میں نہیں تھی اور اسی لیے اس نے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو حکم دیا کہ وہ بات چیت وہیں ختم کر دیں۔ مظالم ہوتے رہے۔ میٹنگوں اور جلوسوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اخباروں کی آواز بھی بند کر دی گئی۔ کانگریس اور خلافت دفتروں پر آدھی رات میں چھاپے مارنا تو عام بات تھی۔

ادھر گاندھی جی پر قومی سطح پر سول نافرمانی تحریک چلانے کے لیے عام کانگریسیوں کا برابر دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں فیصلہ لینے کے لیے دسمبر 1921 میں احمد آباد کانگریس اجلاس

نے گاندھی جی کو ذمہ داری سپرد کی۔ ادھر سرکار کے رویہ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جنوری 1922 میں کل پارٹی کانفرنس (All-Party-Conference) کی اپیل اور وائسرائے کے نام گاندھی جی کے ذریعہ لکھے گئے خط کا کوئی اثر سرکار پر نہیں پڑا۔ گاندھی جی نے لکھا کہ اگر حکومت شہری حقوق آزادی بحال نہیں کرتی ہے اور سیاسی قیدیوں کو رہا نہیں کرتی ہے تو پورے ملک میں سول نافرمانی تحریک چلانے کے لیے مجبور ہوں گے۔ جب حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تو گاندھی جی نے مجبوراً سول نافرمانی تحریک چھیڑنے کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک کی ابتدا سورت ضلع کے باردولی تعلقہ سے ہونے والی تھی۔ گاندھی جی نے ملک کے عوام سے یہ اپیل کی کہ وہ پوری طرح ڈسپلن بنائے رکھے جس سے ساری توجہ باردولی پر ہی مرکوز کی جا سکے مگر ایسا ہوا نہیں۔ باردولی کو ٹیکس نہ دینے کی تحریک (No Tax Movement) چلانے کے لیے اگلے چھ سال تک انتظار کرنا پڑا۔ 5 رفروری 1922 کو چوری چورا (گورکھپور) میں کانگریس اور خلافت کا ملا جلا جلوس نکلا تھا۔ کچھ پولیس والوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس میں شامل ایک جتھہ نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ جواب میں پولیس نے گولی چلائی۔ پولیس کی گولہ باری سے جلوس میں شامل لوگ بھڑک اٹھے اور پولیس پر سب مل کر حملہ آور ہو گئے۔ سپاہی بھاگ کر تھانہ میں گھس گئے۔ بھیڑ نے تھانہ پر آگ لگا دی۔ جو سپاہی بچ کر بھاگنے کی کوشش میں باہر آئے، مجمع نے ان کی بوٹی بوٹی کاٹ آگ میں جھونک دیا۔ بائیس پولیس سپاہی مارے گئے۔ اس سانحہ کی خبر ملتے ہی گاندھی جی نے تحریک واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے کانگریس کمیٹی کو اس کو منظور کرنے کی درخواست کی اور اس طرح 12 رفروری 1922 کو عدم تعاون تحریک ختم کر دی گئی۔

چوری چورا میں ہوئے تشدد کے واقعات سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے تحریک روک دی۔ ان کا یہ فیصلہ علم داں حلقہ میں متنازع فیہ بن گیا تھا اور آج بھی علمی حلقوں، نشستوں اور تاریخ کی کتابوں میں بحث ومباحثہ کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ موتی لعل نہرو، سی۔ آر داس، جواہر لعل نہرو، سبھاش چند بوس اور بہت سے دوسرے لیڈران تحریک واپسی کی خبر سن کر حیرت میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آ رہی تھی کہ دور دراز گاؤں میں کی گئی کچھ لوگوں کی غلطی کا خمیازہ پورا ملک کیوں بھگتے۔ بہت

سارے لوگوں نے تو یہاں تک سوچا کہ اب گاندھی جی میں قیادت کی صلاحیت نہیں رہ گئی ہے اوران کے عروج کے دن ختم ہور ہے ہیں۔

بعد کے بہت مبصرین نے (Commentators) انڈیا ٹوڈے (India[10] Today) میں آر۔ پام دت (R. Palme Dutt) کے ذریعہ بنائے اصولوں کے تحت گاندھی جی کے اس اقدام کو غلط ٹھہرایا ہے۔گاندھی جی کے فیصلہ کو وہ لوگ بطور ثبوت پیش کرتے ہیں کہ گاندھی جی امیروں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔انھوں نے یہ فیصلہ محض اس لیے نہیں کیا کہ تشدد کے واقعات ان کے اصول کے خلاف تھے بلکہ چوری چورا میں ہوئے تشدد کے سانحہ سے ان کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ہندستانی عوام اب جارحانہ جدوجہد کے لیے تیار ہورہی ہے اور تیزی سے بڑھتی ہوئی انتہا پسندی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے خلاف جنگ کی شکل اختیار کررہی ہے۔ان کو ایسا محسوس ہوا کہ جنگ کی کمان ان کے ہاتھ سے نکل کر لڑاکو طاقتور کے ہاتھ میں جانے والی ہے ایسے حالات سے گھبرا کر اور سرمایہ داروں اور امیروں کی بھلائی کو مدنظر رکھ کر انھوں نے تحریک واپس لے لی۔ یہ لوگ دلیل کے طور پر بار دولی ریزولوشن (12/فروری 1922) کو پیش کرتے ہیں جس میں تحریک واپس لینے کے ساتھ ساتھ کسانوں سے ٹیکس اور اسامیوں سے لگان دینے کی اپیل کی تھی۔تحریک واپسی کے تاریخی فیصلہ کے پیچھے گاندھی جی کی اصل منشا یہی تھی۔

ہمارے خیال سے گاندھی کے ناقدین نے ان کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا ہے دور دراز گاؤں میں ہوا تشدد کا واقعہ تحریک واپس لینے کی وجہ نہیں ہوسکتا۔ یہ دلیل بہت وزن دار معلوم نہیں پڑتی۔ بار دولی میں جب وہ سول نافرمانی تحریک چلا رہے تھے تب انھوں نے بار بار اس بات کو دوہرایا تھا کہ وہ ملک کے کسی بھی حصہ میں کسی طرح کی کوئی تحریک نہیں چاہتے چاہے وہ اہنسا کی ہی تحریک کیوں نہ ہو۔اور یہ حقیقت ہے کہ آندھرا کی صوبائی کانگریس کمیٹی کو اپنی منظوری واپس لینے کے لیے کہا تھا جو اس نے کچھ ضلع کانگریس کمیٹیوں کو سول نافرمانی تحریک چلانے کے لیے دیا تھا۔اس سلسلہ میں گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس وقت ملکی سطح پر عوام الناس کی کوئی ہمہ گیر تحریک لوگوں کے جوش د جذبات میں یا پھر ان کی شہ پر تشدد کا روپ لے سکتی تھی جیسا کہ بمبئی میں

1921 میں اور بعد میں چوری چورا میں ہوا تھا۔ اس طرح کے واقعات سے حکومت کو جارحانہ کارروائی کا بہانہ مل جاتا۔ گاندھی جی سوچتے تھے کہ اگر ایک جگہ تشدد کا واقعہ ہوتا ہے تو حکومت یہ دلیل دے گی کہ دوسری جگہوں پر بھی ایسے واقعات ہو سکتے ہیں اور اس طرح اس کو ظلم و زیادتی کرنے کا آسانی سے موقع مل جائے گا۔ پھر تو اس طرح پرامن سول نافرمانی تحریک کی پوری حکمت عملی ہی ناکام ہوجائے گی۔ پرامن تحریک چلانے کی ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ اگر حکومت ایسی تحریک کے خلاف جارحانہ کارروائی کر کے نہتے لوگوں پر ظلم ڈھائے گی تو اس کا اصلی روپ بے نقاب ہو جائے گا۔ اس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ چوری چورا سانحہ اور باردولی تحریک کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ باردولی تحریک کو کچلنے کے لیے حکومت کو چوری چورا سانحہ کا بہانہ مل جاتا۔

گاندھی جی یہ بھی سوچتے تھے کہ چوری چورا سانحہ نے باردولی سے سول نافرمانی تحریک چھیڑنے کے امکانات کو کافی حد تک کم کر دیا ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر باردولی میں تحریک شروع ہوئی تو حکومت چوری چورا کا بہانہ لے کر کارکنوں پر ظلم ڈھائے گی اور اس طرح تحریک اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہی فنا ہو جائے گی۔ اس کو واپس لینے کے پیچھے گاندھی جی کی منشا لوگوں کی تحریکی توانائی کو برقرار رکھنا اور عوام کو پست ہمتی سے بچانا تھا۔ یوں تحریک واپسی کے اعلان سے لوگوں کا ایک بڑا طبقہ مایوس ہو گیا تھا لیکن حکومت کو ظلم کرنے کا موقع مل جاتا تو شاید لوگ کہیں اور زیادہ پست ہمت اور مایوس ہو جاتے جیسا 1932 میں ہوا تھا۔ اور پھر مستقبل قریب میں کوئی بھی تحریک حکومت کی بربریت کے سامنے نہ ٹک پاتی۔ یہاں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ سول نافرمانی تحریک حکومت کے خلاف ملکی سطح پر پہلی جدوجہد تھی۔ شروع کے دور میں اس پر کسی طرح کا حملہ جان لیوا ثابت ہوتا اور کل ملا کر سبھی لوگ مایوسی کا شکار ہو جاتے۔

اور اس دلیل میں بھی سچائی نہیں ہے کہ گاندھی جی نے لڑاکو طاقتوں کے بڑھتے اثرات سے ڈر کر سول نافرمانی تحریک واپس لیا۔ اس سلسلہ میں چوری چورا کے سانحہ کو بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ مگر چوری چورا میں پولیس تھانہ پر حملہ کرنے والی بھیڑ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ لوگ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف منظم ہو رہے تھے یا جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کا مال متاع سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ لوگ پولیس کی بدسلوکی سے ناراض تھے اور انھوں

نے اپنا غصہ بھی انھیں پر اتارا۔ اتر پردیش اور ملابار میں تو کسان تحریک بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اودھ کے دیہی علاقوں میں کہیں کہیں ایکہ (Eka) تحریک چل رہی تھی مگر یہ بھی زمینداری نظام کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے نہیں تھی۔ اس کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ زمیندار غیر قانونی ٹیکس وصول نہ کریں اور من مانی طریقے سے مال گذاری نہ بڑھائیں۔ ایکہ تحریک میں شامل ہونے کے پہلے جو قسم دلائی جاتی تھی اس میں یہ بات تھی کہ ''ہم خریف اور ربیع میں باقاعدہ لگان دیتے رہیں گے''11۔ آندھرا کے گنٹور ضلع میں ٹیکس ادائیگی نہ کرنے کی تحریک تو سول نافرمانی کا ہی ایک حصہ تھی۔ یہ سرکار کے خلاف تھی اور پوری طرح پر امن تھی۔ اس کے علاوہ فروری 1922 کے پہلے ہی یہ تحریک گر گئی تھی12۔ اس طرح یہ ڈھونڈھنا مشکل ہے کہ وہ لڑاکو اور جنگجو طاقتیں کون سی تھیں جن سے گاندھی جی خوفزدہ ہو گئے تھے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ باردولی ریزولوشن نے کاشتکاروں سے ٹیکس اور اسامیوں سے لگان ادا کرنے کے لیے کہا اور زمینداروں کو یہ اطمینان دلایا کہ ان کے اختیارات کم کرنے کا کانگریس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ پوری تحریک کے دوران کانگریس نے زمینداروں کے اختیارات پر سوالیہ نشان ہی نہیں لگایا تھا۔ باردولی ریزولوشن نے تو کانگریس کی پالیسی کی محض تصدیق کی تھی۔ ٹیکس اور لگان نہ ادا کرنا سول نافرمانی تحریک کا ایک حصہ تھا۔ اس لیے جب پوری تحریک واپس لے لی گئی تو پھر ٹیکس وغیرہ نہ ادا کرنے کا سوال ہی سرے سے نہیں اٹھتا تھا۔

گاندھی جی کے ذریعہ تحریک واپس لینے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ 1921 کی دوسری ششماہی شروع ہوتے ہوتے تحریک کمزور پڑنے لگی۔ طلبا اسکولوں اور وکیل عدالتوں کو واپس ہونے لگے۔ کاروباری طبقہ بدیسی کپڑوں کے اسٹاک سے فکرمند ہونے لگا۔ میٹنگوں اور جلسوں میں لوگوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ حالانکہ کچھ جگہوں جیسے گجرات میں بردولی اور آندھرا میں گنٹور میں سیاسی سرگرمیاں تیز تھیں اور لوگ تحریک کے لیے بے چین تھے لیکن 1921 کی پہلی نصف دہائی میں پورے ملک میں تحریک کے لیے جو حوصلہ تھا وہ اب نہیں رہ گیا تھا۔ فعال سیاسی کارکن اور نیتا تو چاہتے تھے کہ تحریک کو آگے بڑھایا اور تیز کیا جائے مگر کسی تحریک کی کامیابی اور ناکامی اس بات پر منحصر ہے کہ عوام کا کتنا حصہ اس میں شامل ہے۔ ہم یہ بات دعویٰ کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے

کہ لوگوں کے گھٹتے ہوئے حوصلہ کو دیکھ کر ہی گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی۔ لیکن ہم اتنا تو ضرور کہیں گے کہ تحریک کے واپس لینے کا تمام دوسری وجہوں میں ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔

گاندھی جی کے ناقدین اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک لگا تار نہیں چلتی، اس میں پڑاؤ آتا ہے، ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ کچھ سیڑھیاں چلنے کے بعد وہ ستاتی ہے، تھکان دور کرتی ہے اور آگے بڑھنے کے لیے ضروری توانائی جٹاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلم جھیلنے کی قوت اور قربانی دینے کی طاقت عوام میں لامحدود نہیں ہوتی۔ اس طرح کبھی تحریک کو واپس لینے کا اعلان اور کبھی سمجھوتہ کا رخ اختیار کرنا عوام پر منحصر سیاسی جدو جہد کی صحیح حکمت عملی ہے۔ اس کو واپس لینا غداری کا ہم معنی نہیں ہوتا۔ یہ تو حکمت عملی ہی کا حصہ ہے۔ ہاں، اس بات پر بحث ہوسکتی ہے کہ تحریک مناسب وقت پر واپس لی گئی ہے یا نامناسب وقت پر۔

تحریک واپس لینے کا ٹھیک وقت آ ہی گیا تھا، ایسا سوچنے کے لیے گاندھی جی کے پاس ٹھوس وجہیں تھیں۔ گاندھی جی نے جب واپسی کا فیصلہ لیا، اس وقت تحریک کو چلے ایک سال سے زیادہ مدت گذر چکی تھی اور انگریزی حکومت کا اڑیل رویہ برقرار تھا۔ چوری چورا سانحہ نے باعزت طریقے سے تحریک واپس لینے کا ایک نادر موقع فراہم کیا۔

گاندھی جی نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کی پالیسی پر صحیح طریقے سے عمل کیا گیا تو ایک سال کے اندر سوراج کا قیام ہوجائے گا۔ سال گذر گیا اور سوراج کی بات تو دور انگریزی حکومت چھوٹی چھوٹی رعایتیں بھی دینے کے لیے نہیں تیار تھی لیکن کیا ساری جدو جہد رائگاں تھی؟ تحریک ناکامیاب رہی؟

اس کا جواب مشکل سے ہاں میں دیا جاسکتا ہے۔ سول نافرمانی تحریک کئی معنوں میں کامیاب تھی۔ پہلی بار اس نے ملک کی عوام کو ایک کاز کے تحت مجتمع کیا۔ اب انڈین نیشنل کانگریس پر کوئی یہ اعتراض نہیں کرسکتا تھا کہ یہ ملک کے مٹھی بھر لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ جیسا کہ 1888 میں وائسرائے لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin)۔13 نے کہا تھا۔ اب اس کے ساتھ کسان، مزدور، دستکار، دکاندار، ساہوکار، سرکاری ملازم مرد، عورت بچے سبھی لوگ تھے۔ پورے ملک میں کہیں ایسی جگہ نہیں تھی جہاں اس تحریک کا اثر زیادہ اور کم نہ پڑا ہو۔

اس تحریک نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ہندوستان کے عام لوگ جن کو فرنگی کروڑوں نادار گونگے احمق (Poor dumb millions) پکارتے تھے، وہ قومی سیاست میں فعال حصہ لے سکتے ہیں۔ ان کی بے انتہا قربانی وایثار نے ظالم فرنگی حکومت کو یہ بتادیا کہ آزادی کی چاہت پڑھے لکھے لوگوں کو ہی نہیں ہوتی، جاہل عوام بھی اس کی دلدادہ ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ لوگ آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کے سارے داؤں پیچ ایک دم سے نہیں سمجھ لیتے ہیں، متوقع ڈسپلن نہیں رکھ پاتے ہیں بلکہ دھیرے دھیرے گرتے پڑتے منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ سول نافرمانی تحریک کی سب سے بڑی کامرانی یہی تھی کہ اس نے عوام کو زمانہ حال کی سیاست سے آگاہ کرایا اور اس میں آزادی کے جذبات پیدا کیے۔ یہ پہلا موقع تھا جب شہروں، اسکولوں، کالجوں، دیہاتوں سے قوم کے فدائی نکلے اور انھوں نے تحریک کے پیغام کو گھر گھر پہنچایا۔ آزادی کی یہ جدوجہد اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ اس لیے اس میں کمیاں بہت تھیں، اور کامیابی محدود۔ لیکن اس میں جو بھی حاصل ہوا وہ بہت اہم اور موثر تھا۔

ملابار کے واقعات کے باوجود اس تحریک میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی شرکت اور ہندو مسلم اتحاد بنائے رکھنا اپنے میں بذات خود ایک عظیم کارنامہ ہے مسلمانوں کی شرکت سے تحریک کو عوامی شکل ملی۔ کچھ علاقوں میں تو گرفتار لوگوں میں دو تہائی مسلمان تھے۔ مگر بدقسمتی سے بعد کے سالوں میں جب فرقہ واریت نے زور پکڑا تب قومی تحریک میں بھائی چارگی کی وہ شکل برقرار نہ رہ سکی۔ تحریک کے دوران گاندھی جی دوسرے اور نیتاؤں کے ساتھ مسجدوں میں تقریریں کرتے تھے۔ یہی نہیں گاندھی جی تو خالص مسلم عورتوں کے جلسوں کو بغیر حجاب خطاب کرتے تھے جس میں صرف وہی ایک مرد ہوتے تھے۔ لیکن یہ اتحاد اور آپسی بھائی چارہ بعد کے سالوں میں خواب و خیال ہو گیا۔

بہرحال 12 رفروری 1922 میں تحریک میں پڑاؤ آیا تھا۔ وہ وقتی ثابت ہوا۔ لڑائی تو ختم ہو گئی تھی مگر جنگ جاری تھی۔ مانٹیگو اور برکن ہیڈ (Montagu & Berkinhead) نے چیلنج کیا تھا کہ 'ہندوستان دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت کو چیلنج نہیں کر سکتا اور اگر چیلنج کرتا ہے تو اس کا جواب پوری طاقت سے دیا جائے گا'[14] گاندھی جی نے تحریک واپس لینے کے بعد

23رفروری 1922 کو ینگ انڈیا میں اس چیلنج کا جواب یوں دیا ''انگریزوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ 1920 میں چھڑی جدوجہد آخری جدوجہد ہے، فیصلہ کن جدوجہد ہے، فیصلہ ہو کر رہے گا، چاہے ایک مہینہ لگے چاہے ایک سال لگ جائے، کئی مہینے لگیں، کئی سال لگ جائیں۔ انگریز حکومت چاہے جتنا ہی ظلم کرلے جتنا 1857 کی بغاوت میں کیا تھا، فیصلہ ہو کر رہے گا''[15]

باب۔16

کسان تحریکیں اور 1920 کی دہائی میں نیشنلزم

انیسویں صدی میں کسان بدیسی حکومت کے خلاف بے اطمینانی محسوس کرنے لگے تھے۔انھوں نے کئی بار جدوجہد اور تحریک کا راستہ بھی اختیار کیا تھا۔کسانوں کی اسی بے اطمینانی نے کسان تحریکوں کا روپ لے لیا۔ان کسان تحریکوں اور اس وقت چل رہی قومی آزادی کی جدوجہد نے ایک دوسرے کو بے حد متاثر کیا۔اس لیے ان دونوں کے پیچیدہ تعلق کو سمجھنے کے لیے ہم کو بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ابھری تین اہم کسان تحریکوں کی تاریخ پر غور کرنا پڑے گا۔وہ کسان تحریکیں اودھ کسان سبھا اور ایکہ تحریکیں، ملابار میں میپلا (Mappila) بغاوت اور گجرات میں باردولی ستیہ گرہ تھیں۔

1856 میں اودھ پر انگریزی حکومت کا قبضہ ہو گیا تھا۔انیسویں صدی کے نصف بعد صوبہ کے کسان سماج پر تعلقداروں اور بڑے زمینداروں کا دبدبہ قائم ہو گیا تھا۔یہ لوگ کسانوں کا طرح طرح سے استحصال کرتے تھے۔ان سے ناجائز وصولی ہوتی تھی، نذرانے کی رقم بڑھا کر لی جاتی تھی اور من مانے طریقہ سے زمینوں سے ان کو بے دخل کیا جاتا تھا۔اس طرح زیادہ تر

کسانوں کی زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ ان سب کے علاوہ پہلی جنگ عظیم اپنے ساتھ کھانے کی چیزیں اور ضروری سامان کی جو مہنگائی لائی تھی اس نے لوگوں کا جینا محال کر دیا تھا۔ بغاوت کے سارے حالات بن گئے تھے، بس ایک گہار کرنا باقی تھا۔

اودھ میں ہوم رول تحریک کے کارکنان کافی سرگرم تھے۔ انھوں نے صوبہ کے کسانوں کی ''کسان سبھا'' نام کی ایک تنظیم نئے ڈھرّ وں (Modern lines) پر قائم کی تھی۔ مدن موہن مالویہ کی مدد سے غوری شنکر مسرا اور ہردے نرائن دویدی کے ذریعہ فروری 1918 میں یوپی تک صوبہ کی 173 تحصیلوں میں اس کی 450 شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ کسان سبھا نے کسانوں کو کس حد تک بیدار کیا تھا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ دسمبر 1918 اور 1919 دہلی اور امرت سر کے کانگریس اجلاسوں میں اتر پردیش کے کسانوں کی بڑی تعداد نے حصہ لیا تھا۔

1919 کے آخر ایام میں کسانوں کی منظم مزاحمت کھل کر سامنے آئی۔ پرتاپ گڈھ ضلع کی ایک جاگیر میں نائی دھوبی کے سماجک بائیکاٹ کی منظم کارروائی کا پہلا واقعہ ہوا۔ 1920 کے موسم گرما سے اودھ کے تعلقداری گاؤں میں کسان سبھاؤں اور گاؤں پنچایتوں کی میٹنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ان کاموں میں جھینگری سنگھ (Jhinguri Singh) اور دُرگ پال سنگھ (Durgapal Singh) نے بڑی دلچسپی لی تھی۔ لیکن جلدی ہی بابا رام چندر نام کا دوسرا نیتا ابھر کر سامنے آیا جس نے تحریک کو کافی منظم، مضبوط اور جنگجو بنایا۔

بابا رام چندر بنگال کے برہمن تھے۔ 13 سال کی عمر میں وہ گھر بار چھوڑ کر نکل پڑے۔ گھمنتو قسم کے آدمی تھے۔ محنت مزدوری کرتے فجی پہنچ گئے۔ بالآخر 1909 میں واپس ہوکر وہ فیض آباد آگئے۔ 1920 تک وہ سادھو بن کر گھومتے پھرتے رہے۔ تلسی داس کی رام چرت مانس لے کر وہ گاؤں گاؤں جاتے اور لوگوں کو مانس کے دوہے اور چوپائیاں سناتے۔ بہرحال 1920 کے وسط میں وہ اودھ کے کسان نیتا بن کر ابھرے۔ ان کی تنظیمی اور قائدانہ صلاحیت ابھر کے سامنے آئی۔

جون 1920 میں بابا رام چندر جون پور اور پرتاپ گڑھ کے سیکڑوں اسامیوں کا جتھہ لے کر الہ آباد پہنچے۔ وہاں انھوں نے غوری شنکر مشرا اور پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملاقات کی اور

ان سے گاؤں چل کر اسامیوں کی حالت کو دیکھنے کا اصرار کیا۔ ان کی درخواست پر جواہر لعل نہرو نے کئی بار دیہی علاقوں کا دورہ کیا اور کسان سبھا تحریک سے تعلقات قائم کیے۔

انھیں دنوں کسانوں کو ایک ہمدرد افسر مل گیا۔ پرتاب گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مہتا نے کسانوں کی شکایتیں سننے اور ان کو دور کرنے کا یقین دلایا۔ پرتاپ گڑھ کا روپ پور گاؤں سرگرمی کا مرکز تھا۔ قریب ایک لاکھ کسانوں نے کسان سبھا کے پاس اپنی شکایتیں درج کرائیں۔ ہر ایک کسان سے ایک آنہ (اس وقت کا چھ پیسے) فیس لی جاتی تھی۔ انھیں دنوں غوری شنکر مشرا بھی پرتاپ گڑھ میں کافی سرگرم تھے۔ وہ کسانوں کی بے دخلی اور نذرانہ کی شکایتوں کے سلسلہ میں مہتا سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔

مگر اگست 1920 میں مہتا رخصت پر چلے گئے۔ تعلقداروں کو اچھا موقع ہاتھ آیا۔ ان سب نے کسان تحریک کو کچلنے کی پوری کوشش کی اور 20/اگست 1920 کو چوری کے ایک جھوٹے مقدمہ میں بابا رام چند اور 32 کسانوں کو گرفتار کرا کر جیل بھجوادیا۔ اس خبر کو سن کر چار پانچ ہزار کسان بابا رام چندر سے ملنے کے لیے پرتاپ گڑھ میں جمع ہوئے۔ بڑی خوشامد کے بعد ہی وہ سب وہاں سے ہٹے۔

دس روز بعد یہ افواہ پھیلی کہ گاندھی جی بابا رام چندر کو رہا کرانے آ رہے ہیں۔ اس مرتبہ تو لگ بھگ دس ہزار کسان پرتاپ گڑھ میں جمع ہو گئے۔ اس بار تو وہ تبھی واپس ہوئے جب بابا رام چندر نے گنے کے کھیت میں لگے ایک پیڑ پر چڑھ کر ان کو اپنا درشن دیا۔ اس وقت لوگوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ سرکار نے حالات پر قابو پانے کے لیے مہتا کو چھٹی سے واپس بلا لیا۔ انھوں نے چوری کا جھوٹا مقدمہ واپس لے لیا اور زمینداروں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے رویہ میں تبدیلی لائیں۔ کسانوں کی اس معمولی فتح نے ان کے اندر مزید حوصلہ پیدا کیا۔

اسی درمیان کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں عدم تعاون تحریک شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اتر پردیس کے کئی نیشنلسٹ لیڈروں نے اس میں شرکت کرنے کا وعدہ کیا مگر مدن موہن مالویہ جیسے کئی لیڈر اس کے خلاف تھے۔ یہ لوگ آئینی جدوجہد کے حمایتی تھے۔ اتر پردیس کسان سبھا میں بھی یہ فرق دکھائی پڑا اور عدم تعاون تحریک والوں نے جلد ہی دس اکتوبر 1920 کو

پرتاپ گڑھ میں اودھ کسان سبھا نام کی ایک متوازی تنظیم بنالی۔ اس نئی کسان تنظیم نے پورے اودھ صوبہ کی قریب قریب ان سبھی کسان سبھاؤں کو اپنی تنظیم میں شامل کرلیا جو کچھ ہی دنوں پہلے اودھ کے مختلف ضلعوں میں بنی تھیں۔ غوری شنکر مشرا، جواہر لعل نہرو، ماتا بدل پانڈے بابا رام چندر، دیونرائن پانڈے اور کیدار ناتھ کی کوششوں سے اکتوبر کے آخر تک 330 کسان سبھائیں اس نئے کسان سنگٹھن میں شامل ہوگئیں۔ اودھ کسان سبھا نے کسانوں سے بے دخلی کی زمینیں نہ جوتنے اور بیگار نہ کرنے کی اپیل کی اور اس کو نہ ماننے والوں کو بائیکاٹ کرنے کے لیے کہا گیا۔ کسانوں کو یہ بھی ہدایت کی گئی وہ اپنے معاملوں کا فیصلہ پنچایتوں کے ذریعہ سے کرائیں۔ 20 اور 21 دسمبر کو اجودھیا (فیض آباد) میں کسان سبھا کی ایک بڑی ریلی ہوئی۔ ریلی میں بابا رام چندر رسیوں میں جکڑے ہوئے سامنے آئے صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ کسانوں کی یہی درگت ہے۔ ان پر بے تحاشہ مظالم ڈھائے جارہے ہیں۔ اس ریلی کی سب بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں اونچی اور نیچی ذات کے دونوں لوگ ایک ہی قطار میں کھڑے تھے۔

جنوری 1921 کے شروع میں کسان سرگرمی میں تبدیلی آئی۔ ان کی سرگرمیوں کے خاص مراکز رائے بریلی، فیض آباد اور کچھ حد تک سلطان پور تھے۔ ان کی خاص خاص سرگرمیاں مکانوں، دکانوں، کھلیانوں کی لوٹ اور پولیس سے ٹکراو کی شکل میں تھیں۔ اس طرح کے چھوٹے بڑے واقعات کا سلسلہ ہی چل پڑا۔ ان میں سے کچھ ٹکراؤ لیڈروں کی گرفتاری یا گرفتاری کی افواہوں سے واقع ہوئے مثلاً رائے بریلی کے منشی گنج اور کرھیا (Karhaiya) میں کسان نیتاؤں کی گرفتاری کی افواہ پھیلنے سے لوٹ مار مچ گئی۔ ان واقعات میں بڑے نیتاؤں نے نہیں، بلکہ مقامی لوگوں نے پہل کی۔ ان میں سادھو، مذہبی لوگ اور وراثت سے خارج مالکان شامل تھے۔

اس طرح کے چھٹ پٹ واقعات کو کچلنا سرکار کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کئی بار تو کسان بھیڑ پر گولیاں برسا کر اس کو تتر بتر کردیا گیا۔ نیتاؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر کے مقدمے چلائے گئے۔ فروری اور مارچ میں ہوئے ایک دو واقعات کو چھوڑ کر یہ تحریک جنوری میں ہی ختم سی ہوگئی تھی۔ مارچ میں تمام تر متاثر ضلعوں میں بغاوتی میٹنگ قانون (Seditious Meeting Act) لاگو کردیا گیا۔ جس کی وجہ سے سیاسی سرگرمیاں ٹھپ ہوگئیں۔ قومی لیڈران

اسامیوں کے مقدمے لڑنے کے علاوہ دوسرے معاملوں میں ان کی بہت کم مدد کرسکتے تھے۔ انھیں دنوں حکومت نے مال گذاری ترمیم قانون (Oudh Rent Amendment Act) پاس کردیا۔ اس سے کسانوں کو کوئی خاص راحت تو نہیں ملی مگر امیدیں ضرور جگیں۔ اس قانون نے بھی اپنے طور سے تحریک کو کمزور ہی کرنے کا کام کیا۔

لیکن سال کے آخر میں کسانوں کی بے اطمینانی پھر ابھر کر سامنے آنے لگی۔ اس سرگرمی کے مقامات تھے ہردوئی، بہرائچ، سیتاپور یعنی صوبہ کے اتری ضلع۔ کانگریس اور خلافت لیڈروں نے کسانوں کی اس بے اطمینانی کو تحریک کی شکل دے دی۔ انھوں نے اس کو ایکہ یا اتحاد تحریک نام سے موسوم کیا۔ کسانوں کی خاص شکایتیں لگان میں اضافہ اور پیداوار کی شکل میں لگان وصول کرنے کے رواج کو لے کر تھیں۔ اِن سے پچاس فیصدی زیادہ لگان وصول کیا جارہا تھا۔ زمینداروں کے ٹھیکیدار اور گماشتے کسانوں پر طرح طرح کے ستم توڑ رہے تھے۔

ایکہ میٹنگ شروع کرنے کے پہلے ایک خاص مذہبی رسم ادا کی جاتی تھی۔ میٹنگ کی جگہ پر ایک گڈھا کھود کر اس میں پانی بھرا جاتا تھا اور اس کو گنگا پکارا جاتا تھا۔ وہاں جمع لوگوں کو ایک پوجاری گنگا کی سوگندھ (قسم) دلاتا تھا کہ وہ پہلے والا مقررہ لگان ہی دیں گے اور اس کو وقت پر ادا کریں گے۔ بے دخل کیے جانے پر زمینیں نہیں چھوڑیں گے، جبریہ مزدوری نہیں کریں گے، جرائم پیشہ لوگوں کی مدد نہیں کریں گے اور پنچایت کے فیصلوں پر عمل کریں گے۔

ایکہ تحریک نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی جڑیں جمالیں۔ تحریک کی اگواکاری نیچی ذات کے ایک آدمی مداری (Madari) پاسی اور دوسرے نیچی ذات کے لیڈروں نے کی۔ یہ لوگ کانگریس اور خلافت لیڈروں کے اہنساوادی اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس طرح اس کا تعلق نیشنلسٹ لیڈروں سے کم ہوگیا اور یہ اپنے طور سے چلتی رہی۔ ایکہ تحریک پہلے کی کسان سبھا تحریک سے مختلف تھی۔ کسان سبھا میں خالص اسامی ہی تھے مگر اس نے چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو جو بڑھے ہوئے لگان کے بوجھ سے پریشان اور سرکار سے ناراض تھے، اپنے گروپ میں شامل کرلیا تھا، مگر مارچ 1922 تک انگریز حکمرانوں نے اپنے ظلم و جبر کے بل پر ایکہ تحریک کو کچلنے میں کامیابی حاصل کرلی۔[1]

اگست 1921 میں ملک کے بالکل دوسرے کنارے پر واقع ملابار ضلع میں کسانوں کی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہاں میلا (مسلم) کسانوں نے بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ ان کی بھی پریشانیاں اودھ کسانوں جیسی تھیں۔ وہ بھی زمینداروں کی من مانی بے دخلی، لگان اور نذرانہ کی بڑھی رقم اور تمام دوسری وصولیابیوں سے عاجز تھے۔ انیسویں صدی میں بھی میلا کسانوں نے زمینداروں کے خلاف جدوجہد کیا تھا مگر اس باران کی مزاحمت بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔

ان کی بے اطمینانی کو سب سے زیادہ ہوا اپریل 1920 میں منجیری (Manjeri) میں ہوئے ملابار ضلع کانگریس کانفرنس نے دی۔ کانفرنس نے کسانوں کی مانگوں کو واجب ٹھہراتے ہوئے ایک ایسے قانون کو بنانے کی مانگ کی جو زمیندار اور کاشتکار کے تعلقات کو طے کرے۔ اس سے پہلے زمیندار کانگریس کو کاشتکاروں کی مانگ اٹھانے سے روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ منجیری کانفرنس کے بعد کوزی کوڈا (Kozhikoda) میں کاشتکاروں نے ایک تنظیم بنائی۔ اس کے فوراً بعد ضلع کے دوسرے حصوں میں بھی کسان تنظیموں کا قیام ہو گیا۔

انھیں دنوں خلافت تحریک کے اثرات ان علاقوں میں برابر بڑھ رہے تھے۔ حالات اس حد تک پہنچ گئے کہ خلافت اور کسان میٹنگوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ دونوں کی میٹنگوں میں سامعین اور نیتا ایک ہی ہوتے تھے۔ دونوں تحریکیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئیں۔ یہ تحریک بنیادی اعتبار سے میلا کاشتکاروں کی ہی تھی۔ اس میں کئی ہندو نیتا شامل ضرور تھے مگر عام ہندوؤں کی فعال حصہ داری اس میں بالکل نہیں تھی۔ خلافت میلا کسان تحریک کی بڑھتی ہوئی مقبولیت جس کو گاندھی جی، شوکت علی، اور مولانا آزاد کے دوروں نے کافی تیز کر دیا تھا، سے گھبرا کر حکومت نے 5/ اور 18/ فروری 1921 کو خلافت کی میٹنگوں پر روک لگا دی۔ یعقوب حسن، یو۔ گوپالا مینن (U. Gopala Menon) پی۔ معین الدین کویا، کے۔ مدھو بن نائر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک کی اگواکاری اب میلا لیڈروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

حکومت کے ظلم وستم سے عاجز آ کر اس افواہ سے خوش ہو کر کہ پہلی جنگ عظیم میں انگریزی طاقت کمزور پڑ گئی ہے اور اس طرح وہ موثر فوجی کارروائی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے میلا حکومت کے خلاف تال ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ افسروں کے احکامات کی خلاف ورزی

کرنے لگے۔ وہ بے قابو سے ہو گئے۔ 21/اگست 1921 کو ایرناڈ (Eranad) تعلقہ کے ضلع مجسٹریٹ ای۔ایف۔ تھامس۔(E.F. Thomas) نے پولیس اور فوج کا دستہ لے کر مذہبی پیشوا اور خلافت لیڈر علی مسلیر (Ali Musaliar) کو گرفتار کرنے کے لیے ترورانگڈی (Tirurangadi) کی مسجد پر حملہ کیا۔ وہاں اس کو خلافت کے صرف تین معمولی کارکن ہی ملے جن کو اس نے گرفتار کروالیا۔ اس واقعہ کے بعد چاروں طرف یہ خبر پھیل گئی کہ انگریزوں نے ممبراتھ مسجد (Mambrath Mosque) جس کے علی مسلیر امام تھے پر حملہ کر کے اس کو برباد کر دیا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی کوٹاکھال (Kottakhal) تنور (Tanur) اور پارپاناگڈی (Parappanagadi) کے موپلا ترورانگڈی میں جمع ہوئے اور ان کے لیڈران سرکاری افسروں سے مل کر خلافت نیتاؤں کی رہائی کی مانگ کرنے لگے۔ سبھی لوگ پرامن اور خاموش تھے مگر پولیس نے ان نہتھوں پر اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ کئی لوگ مارے گئے۔ اب موپلا بھی تشدد پر اتر آئے۔ زبردست ٹکراؤ ہوا۔ لوگوں نے سرکاری دفتروں کو تہس نہس کر دیا۔ کاغذات جلا دیے اور خزانہ لوٹ لیا۔ بغاوت کی آگ پورے ایرناڈ، والوواناڈ (Walluvanad) اور پونانی (Ponnani) تعلقوں میں پھیل گئی جو موپلا کے گڑھ تھے۔

بغاوت کے پہلے دور میں باغیوں نے بدنام زمانہ زمینداروں جن میں زیادہ تر ہندو تھے اور سرکاری اداروں جیسے کچہری، تھانہ، خزانہ، آفس اور برٹش باغان مالکوں کو نشانہ بنایا۔ نرم طبیعت زمینداروں اور ہندوؤں کو شاید ہی چھیڑا گیا ہو۔ ہندو اکثریت کے علاقوں میں باغی میلوں جاتے اور گھوم گھوم کر زمینداروں پر حملہ کرتے اور ان کے دستاویزات جلاتے۔ حاجی کن حمد (Haji Kunhammad) جیسے باغی نیتا اس بات کا پورا خیال رکھتے کہ ہندوؤں کو نہ ستایا جائے اور اگر کوئی باغی ان پر ہاتھ اٹھاتا تو اس کو سزا دی جاتی تھی۔ کن حمد حاجی نے ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں کیا۔ سرکار موافق کئی موپلاؤں کو بھی سزا دینے کا حکم جاری کیا گیا۔

لیکن جیسے ہی انگریزی حکومت نے مارشل لا لاگو کر کے ظلم و ستم ڈھانا شروع کیا، موپلا بغاوت کی شکل بدل گئی۔ ہندوؤں کو اپنے ساتھ کرنے کے لیے حکومت نے دباؤ ڈالا۔ کچھ ہندو تو اپنے طور سے کھلے عام حکومت کا ساتھ دینے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کی ہندوؤں کے خلاف پہلے

سے سلگتی ہوئی میلاؤں کی دشمنی اور تیز ہوگئی۔ زیادہ تر میلا ان پڑھ جاہل تھے اور مذہبی جذبات کا شکار تھے۔ اس لیے جیوں جیوں حکومت کی بربریت بڑھی، میلاؤں کی مایوسی میں اضافہ ہوا اور اس کے نتیجہ میں ہندوؤں پر حملہ کرنے، ان کو قتل کرنے اور ان کا تبدیلیٔ مذہب کرنے کے واقعات بھی بڑھے۔ اس طرح حکومت اور زمینداروں کے خلاف شروع ہوئی سرگری پوری طرح فرقہ واریت کے رنگ میں بدل گئی۔

میلاؤں کے متشدد رجحانات کی وجہ سے پرامن ستیہ گرہ تحریک ان سے پہلے ہی الگ ہوگئی تھی۔ اب ان کی فرقہ واریت نے تو ان کو دوسرے اور لوگوں سے بھی الگ تھلگ کر دیا۔ رہی سہی کمی انگریزی حکومت کے ظلم کے ذریعہ پوری کر دی گئی۔ دسمبر 1921 تک بغاوت پوری طرح کچل ڈالی گئی۔ بڑا مالی نقصان ہوا۔ 2337 میلا مارے گئے اور 1622 زخمی ہوئے۔ یہ تو سرکاری گنتی ہے۔ غیر سرکاری اندازہ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی 45404 باغی قید کر لیے گے۔ جانی نقصان سے زیادہ دوسرا بھی نقصان ہوا، وہ یہ کہ جنگجو میلا اس کے بعد آزادی کی لڑائی میں کسی بھی طرح شریک نہیں ہوئے۔ ان کی ہمت پوری طرح ٹوٹ گئی۔ بعد میں بائیں بازو والوں کی قیادت میں کسان تحریک نے کیرالا میں زور پکڑا مگر میلا اس سے دور رہے۔ انھوں نے نہ تو کسی قومی تحریک میں حصہ لیا اور نہ کسی کسان آندولن میں۔ 2

یوپی اور کیرالہ کی کسان تحریکیں قومی سطح پر سیاست سے پوری طرح جڑی تھیں۔ اتر پردیش کی تحریک کو شروع میں ہوم رول لیگ تحریکوں نے ہوا دی اور بعد میں عدم تعاون اور خلافت نے۔ اودھ میں 1921 کے شروع میں جب کسان سرگرمیاں بہت تیز تھیں تب کسان اور عدم تعاون کی ریلیوں میں فرق کر پانا مشکل تھا۔ ملابار میں بھی یہی حالت تھی کہ کسان اور خلافت تحریکیں اس طرح خلط ملط ہوگئی تھیں کہ دونوں میں فرق کرنا دشوار تھا۔ مگر دونوں ہی جگہوں پر کسانوں کے متشدد ہو جانے پر ان کے درمیان دوری پیدا ہوگئی۔ قومی لیڈروں نے کسانوں سے بارہا یہی اپیل کی کہ وہ تشدد سے دور رہیں۔ کئی ایک قومی لیڈروں خصوصاً گاندھی جی نے ان سے یہی کہا کہ وہ زمینداروں کو لگان وغیرہ ادا کریں اور متشدد نہ ہوں۔

کسانوں اور ان کے مقامی لیڈروں کی کارکردگی اور سوچ، اور قومی لیڈروں کی سمجھ

میں بڑا فرق تھا۔قومی لیڈروں نے اس فرق کو مٹانے کی بڑی کوشش کی۔ان کی ان کوششوں کا مطلب یہ لگایا گیا کہ قومی لیڈروں کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں قیادت کی کمان ان کے ہاتھ سے نکل کر مقامی لیڈروں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے جو کہیں زیادہ لڑاکو اور جنگجو ہیں۔ان کی یہ بات کہ کسان تشدد چھوڑیں اور لگان ادا کریں کے معنی بھی یہ لگائے گئے کہ ان کا مقصد زمینداروں اور امیروں کی دلچسپیوں کا پاس ولحاظ رکھنا ہے۔مگر ناقدین شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کسانوں سے زیادہ قومی لیڈر اس بات سے خوفزدہ تھے کہ اگر کسان تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو اس کے نتائج بہت برے اور سنگین ہوں گے۔ یوپی اور کیرالا میں ہوئے بعد کے واقعات نے یہ ثابت کردیا کہ قومی لیڈروں کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔اسی لیے کسانوں سے ان کی یہ اپیل تھی کہ وہ زمینداروں کو لگان دینا نہ بند کریں، کیونکہ انھوں نے لگان یا زمینداری سسٹم کو ختم کرنے کی کوئی مانگ نہیں اٹھائی تھی۔وہ تو محض بے دخلی، لگان کے من مانی اضافہ اور غیر قانونی وصولیابی روکنے کی مانگ کررہے تھے۔لگان کی ادائیگی روکنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ چھوٹے زمیندار بھی سرکار کی گود میں چلے جاتے۔اس طرح وہ زمیندار جو قومی تحریک اور حکومت کے درمیان چھڑی لڑائی میں غیر جانبدار رہ سکتے تھے، قطعی طور سے قومی تحریک کے خلاف ہوجاتے۔

گجرات کے سورت ضلع کے باردولی تعلقہ میں 1928 میں لگان نہ دینے کی تحریک بھی کئی طرح سے عدم تعاون تحریک کا ہی نتیجہ تھی۔3 1922 میں گاندھی جی اسی باردولی سے اپنی سول نافرمانی تحریک کی شروعات کرنے والے تھے مگر چوری چورا کے واقعہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ بہرحال اس علاقہ میں سول نافرمانی تحریک کی تیاری کے باعث باردولی سیاست کا خاص مرکز بن گیا تھا۔لوگوں میں سیاسی اعتبار سے بڑی بیداری آگئی تھی۔کلیان جی اور کنور جی مہتا برادران اور دیال جی ڈیسائی نے عدم تعاون تحریک کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑا تھا۔یہ لوگ اس علاقہ میں عدم تعاون تحریک کے شروع ہونے کے دس سال پہلے سے ہی سوشل رفارمر اور سیاسی نیتا کی حیثیت سے کافی سرگرمی سے کام کررہے تھے۔انھوں نے کئی قومی اسکول قائم کیے تھے، طلبا کو سرکاری اسکول چھوڑنے کے لیے راضی کیا تھا اور بدیسی کپڑوں اور شراب کے بائیکاٹ کرنے کی مہم چلائی تھی اور ان کا تسلط سورت میونسپلٹی پر بھی قائم ہوگیا تھا۔

عدم تعاون تحریک واپس لیے جانے کے بعد کانگریس کارکن پوری طرح تعمیری کاموں میں مصروف ہوگئے۔ 1922 میں گاندھی جی نے ان سے بڑی سختی سے کہا کہ ان لوگوں نے نیچی ذات، اچھوت اور قبائلی آبادی کے لیے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔4 ان لوگوں کو کالی پراج (Kalipraj) اور اونچی ذات کے لوگوں کو اجلی پراج کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ باردولی تعلقہ میں کالی پراج کی آبادی 60 فیصدی تھی۔ گاندھی جی کی تنبیہ پر اجلی پراج کے لوگوں نے ان کے درمیان سدھار کے کام شروع کیے۔ انھوں نے ان کی بہبودی کے لیے پورے تعلقہ میں چھ آشرم قائم کیے۔ ان میں سے کئی ایک آج بھی قبائلی لوگوں کے درمیان تعلیمی کام انجام دے رہے ہیں۔

کنور جی مہتا اور کیشو جی گنیش جی نے قبائلی زبان سیکھا اور کالی پراج طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی مدد سے کالی پراج ادب تیار کیا۔ نظم ونثر کے ذریعہ ان کے سماج میں پھیلی برائیوں جیسے شراب نوشی، شادی بیاہ میں فضول خرچی جو ان کی غریبی کے خاص اسباب تھے کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے بندھوا مزدوری (Halisystem) کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سسٹم کے تحت وہ اونچی ذات کے لوگوں کے آبائی (Heriditary) مزدور تھے بھجن منڈلیاں جن میں اونچی اور نیچی ذات کے بھی لوگ شامل تھے، گھوم گھوم کر سماجی برائیوں کو دور کرنے کی اپیل کرتے تھے۔ کالی پراجوں کی تعلیم کے لیے نائٹ اسکول قائم کیے گئے۔ 1927 میں باردولی قصبہ میں بھی کالی پراج بچوں کے لیے ایک اسکول کھولا گیا۔ آشرم کے کارکنوں کو اکثر زمینداروں کی دشمنی جھیلنی پڑتی تھی۔ زمیندار یہ سوچتے تھے کہ آشرم والے ان کے مزدوروں کو خراب کر رہے ہیں۔

1922 کے بعد کالی پراج کی ہر سال کانفرنس ہوتی تھی۔ 1927 میں ان کے کانفرنس کی صدارت تو گاندھی جی نے کی۔ انھوں نے ان کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک جانچ کمیٹی بنائی اور ان کا برا اور ذلیل نام کالی پراج بدل کر رانی پراج رکھ دیا جس کے معنی ہوتے تھے جنگل کے رہنے والے۔ گجرات کے نامور نیتا جن میں نرہر پارکھ اور جگت رام دوے (Jagatram Dave) شامل تھے نے کالی پراج لوگوں کے درمیان ہالی سسٹم بندھوا مزدوری کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں اس بات کو اجاگر کیا کہ یہ سسٹم بے انتہا برا ہے۔ اس کے تحت سرمایہ دار غریب عوام کا استحصال کرتے ہیں اور اونچی ذات کے لوگ ان کی عورتوں کی عصمت

لوٹتے ہیں۔ ان سارے کاموں کی وجہ سے کالی پراج لوگوں میں کانگریس کی پکڑ بہت مضبوط ہوگئی۔

بیک وقت کانگریس کارکن کاشت مالکان (Land Owners) کے درمیان بھی کام کر رہے تھے۔ انھوں نے ان کے درمیان اچھی جگہ بنائی تھی۔ جنوری 1926 میں یہ معلوم ہوا کہ لگان افسر نے لگان میں 30 فیصدی اضافہ کی سفارش کی ہے۔ تب کانگریس نیتاؤں نے اس کی مخالفت کی اور اس کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ جولائی 1926 میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اضافہ لگان کو نامناسب بتایا۔ اس کے بعد اخباروں نے لگان اضافہ کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے گاندھی جی نے ینگ انڈیا اور نوجیون اخباروں میں اسکے خلاف آواز اٹھائی۔ آئین نواز نیتاؤں (Constitutionalists) کے ساتھ کونسل ممبروں نے بھی اس مسئلہ کو اٹھایا۔ جولائی 1927 میں حکومت نے اضافہ شدہ لگان میں 21.97 فیصدی کی کمی کر دی۔

لیکن یہ رعایت بہت تھوڑی تھی اور وہ بھی بہت تاخیر سے دی گئی۔ اس لیے کوئی بھی اس سے مطمئن نہیں تھا۔ آئین پرست نیتاؤں نے کسانوں کو یہ صلاح دی کہ کوئی بھی اضافہ شدہ لگان نہ ادا کرے، پرانا لگان ہی دے۔ دوسری طرف آشرم کے کانگریس والوں کی یہ صلاح تھی کہ اگر حکومت پر دباؤ بنانے کا ارادہ ہے تو لوگ لگان دینا ہی بند کر دیں۔ ایسی صورت میں کسانوں نے اعتدال پسند نیتاؤں کی صلاح پر ہی عمل کیا۔

لیکن جلد ہی آئین پرست نیتاؤں کی نیتا گیری کی قلعی کھل گئی۔ وہ اب کسانوں کی قیادت کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگے۔ مجبور ہوکر کسانوں نے آشرم والے کانگریسی نیتاؤں کی طرف رجوع کیا۔ ان لیڈروں نے بلبھ بھائی پٹیل سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کسان تحریک کی قیادت کرنے کے لیے اصرار کیا۔ کادود (Kadod) حلقہ کے ساٹھ گاؤں کے نمائندے بمنی (Bamni) گاؤں میں جمع ہوئے۔ اور بلبھ بھائی پٹیل کو مہم کی قیادت کرنے کے لیے باضابطہ مدعو کیا۔ مقامی لیڈر گاندھی جی سے بھی ملے اور جب گاندھی جی کو یہ یقین ہوگیا کہ کسان تحریک کی منشا اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اپنے فیصلے میں سنجیدہ ہیں تب انھوں نے بھی تائید کر دی کہ پٹیل

ان کی قیادت کریں۔

4 فروری کو پٹیل باردولی پہنچ گئے۔ انھوں نے فوراً کسان نمائندوں اور آئین پرست نیتاؤں کی لگاتار کئی میٹنگیں کیں۔ ایک میٹنگ میں تو اعتدال پسند لیڈروں نے صاف لفظوں میں کہا کہ مقصد کے حصول کے سارے آئینی طریقے ناکام ہو گئے ہیں۔ اس لیے لوگ بلبھ بھائی پٹیل کے طریقہ پر عمل کریں۔ بلبھ بھائی پٹیل نے مجوزہ تحریک کے سارے نتائج اور اونچ نیچ سے لوگوں کو اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ ان کو انھوں نے پھر سے غور کرنے کے لیے ایک ہفتہ کا وقت دیا۔ وہاں سے الہ آباد واپس ہو کر انھوں نے بمبئی کے گورنر کو ایک خط لکھا کہ حکومت نے لگان طے کرنے میں غلطی کی ہے۔ انھوں نے حکومت سے یہ بھی درخواست کی وہ اس معاملہ کی جانچ کسی غیر جانبدار کمیٹی سے کرائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی ہے تو وہ کسانوں کو لگان نہ دینے کی صلاح دیں گے، نتیجہ چاہے جو ہو۔

12 فروری کو پٹیل باردولی واپس ہوئے۔ حکومت کا ٹکا سا جواب سنا کر انھوں نے کسان نمائندوں کو سارے حالات اچھی طرح سمجھایا۔ اس کے بعد باردولی تعلقہ کے کسانوں کی کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں یہ تجویز پاس کی گئی کہ لگان کی ادائیگی اس وقت تک نہیں کی جائے گی جب تک حکومت کسی غیر جانبدار ٹریبونل کی تشکیل نہیں کرتی ہے، یا پہلے کے لگان کو ہی پوری ادائیگی نہیں مانتی ہے۔ ہندوؤں سے پربھو اور مسلمانوں سے خدا کی قسم دلائی گئی کہ وہ لگان نہیں ادا کریں گے۔ اس کے بعد گیتا اور قرآن کی تلاوت کی گئی اور کبیر کے وہ دوہے گائے گئے جو ہندو مسلم اتحاد سے پر تھے۔ اور ستیہ گرہ شروع ہو گئی۔

بلبھ بھائی پٹیل ستیہ گرہ مہم کی رہبری کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ ''کھیڑا ستیہ گرہ'' ناگپور فلیگ ستیہ گرہ اور بلساڈ تعزیری ٹیکس ستیہ گرہ (Balsad Punitive Tax Satyagrah) میں پٹیل تجربہ کار لیڈر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے تھے۔ گاندھی جی کے بعد پورے گجرات میں وہی سب سے زیادہ معروف لیڈر تھے۔ کامیاب منتظم شعلہ بیان مقرر، انتھک مجاہد اور عوام کو حوصلہ مند کرنے والے رہبر کی حیثیت سے پٹیل کی صلاحیت مشہور تھی۔ اسی لیے باردولی کی عورتوں نے سردار کا خطاب دے کر ان کی عزت افزائی کی تھی۔ باردولی کی عوام آج بھی ان کے موثر

اور پر کشش طرز بیان اور ان کی روح پرور اور دل پگھلانے والی تقریروں کو یاد کرتی ہے۔

سردار بلبھ بھائی پٹیل نے پورے تعلقہ کو تیرہ کارکن کیمپوں یا چھاؤنیوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک کیمپ کو ایک تجربہ کار لیڈر کی زیر نگرانی رکھا گیا۔ صوبہ کے مختلف حصوں سے 100 سیاسی کارکنان اور 1500 رضا کاران جن میں زیادہ تر طلبا تھے اس تحریک کے سرگرم سپاہی تھے۔ نشر واشاعت کا ایک شعبہ بھی قائم کیا گیا اور باردولی پتر کا، (Bardoli Patrika) کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس پتر کا میں تحریک کی رپورٹ، لیڈروں کی تقریریں، کسانوں کی جائداد کو قرق، ضبط کرنے کی کارروائی کی تصویریں اور بہت سی دوسری خبریں، شائع ہوتی تھیں۔ رضا کاروں کی فوج اس پمفلٹ کو تعلقہ کے، دور دراز جگہوں تک پہنچاتی تھی۔ تحریک کے پاس اپنی خفیہ ایجنسی بھی تھی جس کا کام یہ دیکھنا تھا کہ کوئی کسان لگان تو نہیں دے رہا ہے یا مشکوک تو نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو لگان دینے سے روکا جاتا تھا۔ یہ خفیہ ایجنسی یہ بھی پتہ لگاتی تھی کہ اب سرکار کیا کرنے والی ہے، وہ کس کی جائداد ضبط کرنے جارہی ہے۔ ایسی کوئی خبر ملنے پر متعلقہ شخص کو خبردار کردیا جاتا تھا کہ وہ اپنا گھر مقفل کردے یا پڑوس میں بڑودہ بھاگ جائے۔

لوگوں کو متحرک کرنے کا کام خاص طور سے جلسوں، تقریروں اور پمفلٹوں کے ذریعہ اور گھر گھر جا کر کیا جاتا تھا۔ عورتوں کو بیدار کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ اس کام کے لیے بمبئی کی ایک پارسی عورت میٹھوبن پٹیٹ (Mithuben Petit) دربار گوپال داس کی بیوی بھکتی با (Bhaktiba) سردار بلبھ بھائی پٹیل کی بیٹی منی بن پٹیل، شاردا بن شاہ اور شاردا مہتا کو لگایا گیا تھا۔ ان لوگوں کی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی بار تو میٹنگوں میں مردوں سے زیادہ عورتیں آئی تھیں۔ عورتوں میں بڑا جوش تھا۔ ان پر حکومت کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ دوسرا طبقہ طالب علموں کا تھا جو اپنے اپنے گھر کے افراد کو سمجھانے اور ثابت قدم رہنے کی اپیل کرتا تھا۔ جو لوگ ذرہ برابر کمزوری دکھاتے ان کو بھی راستے پر لانے کی کوشش کی جاتی، ان کو بائیکاٹ کی دھمکی دے کر ہموار کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں برادری اور گاؤں پنچایتوں کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ جو لوگ تحریک کی مخالفت کرتے ان کو یہ دھمکی دی جاتی تھی کہ نائی، دھوبی کھیتی مزدور اور یہاں تک کہ ان کے پڑوسی اور رشتہ دار ان کا بائیکاٹ کردیں گے۔ عام طور سے یہ دھمکیاں ان کی کمزوری دور کرنے

کے لیے بہت کارگر اور مأثر ثابت ہوئی تھیں۔ سرکاری افسروں پر اس طرح کے بائیکاٹ کا سب سے زیادہ برا اثر پڑا تھا۔ ان کو سواری اور کھانے کے سامان وغیرہ کی سپلائی روک دی گئی۔ سرکاری کام کاج کے لیے ان کو نوکر پانا مشکل ہو گیا۔ کانگریس نے کالی پراج لوگوں کے درمیان جو کام کیے تھے ان کا فائدہ اس تحریک میں ان کو خوب ملا۔ حکومت نے کالی پراجوں کو اونچی ذات کے کسانوں کے خلاف بھڑکانے کی ہر چند کوشش کی مگر وہ پوری طرح ناکام رہی۔

سردار پٹیل اور ان کے ساتھی اہم مسائل پہ آئین پرستوں، معتدل لیڈروں اور عوام کو اعتماد میں لینے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا کہ غیر جانبدار لوگ ہی نہیں بلکہ حکومت کے حمایتی اور ہمدرد بھی کسانوں کے خیمہ میں آنے لگے اور یہاں تک کہ کے۔ ایم۔ منشی اور لال جی نران جی (Lalj Naranji) جو بمبئی کونسل کے ممبر اور انڈین مرچنٹس چیمبر (Indian Merchants Chamber) کے نمائندے تھے اور جو بہت زیادہ گرم مزاج (Hot Headed) انتہا پسند نہیں تھے انھوں نے استعفٰی دے دیے۔ جولائی 1928 آتے آتے وائسرائے لارڈ اِروِن (Lord Irwin) بمبئی سرکار کی کارکردگی کے صحیح ہونے پر شبہ کرنے لگا اور اس نے گورنر ولسن (Wilson) پر دباؤ ڈالا کہ وہ معاملہ کو نمٹانے کی صورت تلاش کریں۔ یہی نہیں یہ مسئلہ برٹش پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا گیا۔

ملک کی رائے عامہ روز بروز سرکار مخالف ہوتی جا رہی تھی۔ کئی جگہوں پر بامبے پریسیڈنسی (Bombay Presidency) کے کسان لگان کو دوبارہ طے کرنے کے لیے تحریک چلانے کی دھمکی دے رہے تھے۔ نجی کپڑا ملوں کے مزدور ہڑتال پر تھے۔ حکومت کو اندیشہ تھا کہ کہیں پٹیل کمیونسٹوں سے مل کر ریل ہڑتال نہ کرا دیں جس سے فوج اور رسد کا باردولی پہنچنا مشکل ہو جائے۔ بمبئی یوتھ لیگ (Bombay Youth League) اور کئی دوسری تنظیموں نے بڑی بڑی عام میٹنگیں کرنے اور جلوس نکالنے کے لیے بمبئی کے لوگوں کو متحرک کر دیا تھا۔ پنجاب سے احتجاجی جتھوں کے پیدل چلنے کی پیش کش ہو رہی تھی۔ 2 اگست کو گاندھی جی اس منشا سے باردولی پہنچ گئے کہ اگر پٹیل گرفتار کر لیے جاتے ہیں تو تحریک کی کمان وہ خود سنبھال لیں گے۔ ایسے حالات میں پیچھے ہٹنے کے علاوہ حکومت کر ہی کیا سکتی تھی؟ بس جھینپ چھپانے کے لیے بہانہ تلاش کرنے لگی۔

اور اس کو بہانہ بھی مل گیا۔ سورت (Surat) لجسلیٹیو کونسل کے ممبروں نے گورنر کو ایک خط لکھا کہ جانچ کے لیے جو شرط انھوں نے رکھی ہے، مان لی جائے گی۔ اور وہ شرط کیا تھی اس میں اس کا ذکر نہیں تھا (جب کہ سب کو معلوم تھا کہ اس میں بڑھے لگان کی ادائیگی ہی شرط تھی) لوگ یوں ہی سمجھ گئے کہ حکومت اضافہ شدہ لگان کی وصولی پر زور نہیں ڈالے گی۔ اس لیے لوگوں نے گورنر کے اس اعلان کو سنجیدگی سے نہیں لیا کہ انھوں نے بلاشرط فتح حاصل کر لی ہے[5] جب کہ حقیقت میں کسان ہی کی جیت ہوئی تھی۔

عدلیہ کے ایک انگریز افسر بروم فیلڈ (Broomfield) اور ریوینو افسر میکسویل (Maxwell) نے سارے حالات کی جانچ کر کے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ لگان کا اضافہ نامناسب تھا۔ اس لیے اس کو کم کر کے 6.03 فیصدی کر دیا گیا ہے۔ لندن سے شائع نیو اسٹیس مین نے 5 رمئی 1929 کے شمارہ میں لکھا ہے ''جانچ کمیٹی کی رپورٹ سرکار کے منہ پر زبردست طمانچہ ہے۔ اس کے نتائج بہت برے اور گہرے ہوں گے۔ اس طرح کی کوئی مثال ہندوستان ریوینو کی لمبی اور متنازعہ تاریخ میں ملنا مشکل ہے''[6]

کسان تحریکوں اور قومی آزادی کی جدوجہد کے آپسی رشتوں کو گاندھی جی نے اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے ''باردولی جدوجہد چاہے جو ہو، یہ سوراج حاصل کرنے کی کوشش بالکل نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی ہر کوشش اور بیداری جیسی باردولی میں ہوئی ہے ہم کو براہ راست سوراج کے قریب سے قریب تر ضرور کرتی ہے''[7]

باب۔ 17

ہندوستان کا محنت کش مزدور طبقہ اور قومی تحریک

انیسوی صدی کے نصف آخر میں جب جدید صنعت وحرفت دھیرے دھیرے ترقی کر رہی تھی اور ریل، تار وڈاک جیسی ایجنسیوں کا جال پھیل رہا تھا، انھیں دنوں محنت کش مزدوروں کا جدید طبقہ بھی منظر عام پر آرہا تھا اور ملک کے مختلف حصوں میں محنت کش لوگوں کی مختلف النوع، منظم اور خود بیدار جماعتیں آل انڈیا سطح پر ابھر رہی تھیں۔ ان کی نشونما کا یہ عمل ہندستانی قومی تحریک کی ترقی اور ہندوستان کے قوم بننے کے عمل سے اس طرح جڑا تھا کہ ہندوستان کے قوم بننے کے تصور سے پہلے مزدور طبقہ کے وجود کا تصور کرنا محال تھا۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں ملک کے قوم پرست تعلیم یافتہ لوگوں نے مزدور تحریکوں سے اپنا رشتہ قائم کیا۔ اس کے پہلے ہی کچھ کوششیں کی گئیں جن میں بمبئی، کلکتہ، سورت، مدراس، کویمبور اور دارد ھا وغیرہ جگہوں پر سوتی ملوں، ریل اور باغان کی ہڑتالیں شامل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ہڑتالیں اکا دکا غیر منظم اور بلا ارادہ بغاوتیں تھیں جن کے پیچھے لوگوں کی وقتی مالی

دشواریاں کام کرتی تھیں۔اسی لیےان سب نے کوئی خاص سیاسی اثرات نہیں مرتب کیے۔

شروع دور میں مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لیے خیر خواہان خلق (Philanthropists) کے ذریعہ 1870 کی دہائی میں کچھ منظم کوششیں کی گئیں۔ 1878 میں سوراب جی شپور جی بنگالی(Sorabjee Shapoorji Bengalee) نے بمبئی کی لیجسلیٹیو کونسل میں مزدوروں کے کام کے گھنٹوں کی حد مقرر کرنے کے لیے ایک بل پیش کیا تھا۔مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ 1870 میں ششی پد بنر جی (Sasipad Banerjee) نام کے ایک برہم سماجی سماج سدھارک نے بنگال میں مزدوروں کا ایک کلب قائم کیااور بھارت شرم جیوی(Bharat Shramjeewi) (ہندستانی مزدور) نام کا ماہانہ پرچہ نکالنا شروع کیا۔اس پرچے کاواحد مقصد مزدوروں کوتعلیم دینا تھا۔ 1880 میں نارائن میگھا جی لوکھانڈے (Narayan Meghajee Lokhandey) نے دین بندھو، (Din Bandhu)(غریب دوست) نام کا مراٹھی،انگریزی ہفتہ وار پرچہ بمبئی سے نکالا اور بامبے مل اورمل ہینڈس ایسوسی ایشن(Bombay Mill & Mill Hands Association) نام کی تنظیم قائم کی۔لوکھانڈے مزدوروں کی میٹنگیں کیا کرتے تھے اور ایک بار تو انھوں نے 5500 مل مزدوروں کی ایک درخواست ان کی مانگوں کو منوانے کے لیے بمبئی فیکٹری کمیشن کے پاس بھیجا تھا۔بنیادی اعتبار سے یہ ساری کوششیں خدمت خلق کے نظریہ سے کی گئی تھیں۔ابتدأیہ کوششیں نہ تو مزدوروں کی منظم تحریک کی شروعات کی نمائندگی کرتی تھیں اور نہ ہی ان کا تعلق قومی تحریک کی خاص دھارا سے تھا۔

دراصل کل ملا کر مزدوری کے مسائل سے قومی دھارا کا کوئی سروکار نہیں تھا اس وقت مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی مگر شروع کے قومی لیڈروں نے اس کی طرف بہت کم توجہ دی۔ اس کے علاوہ ان کا رجحان یورپی اور ہندستانی صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے تئیں یکساں نہیں تھا۔اس سلسلہ میں ان کی عدم دلچسپی کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس وقت سلطنت مخالف تحریک بالکل اپنے ابتدائی مرحلہ سے گذر رہی تھی۔وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندستانی عوام اندر اندر کسی بھی طرح منقسم ہو اور حکومت کے خلاف چلائی جارہی تحریک کمزور پڑ جائے 1886

میں کانگریس کے دوسرے اجلاس میں دادا بھائی نوروجی نے بہت صاف لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ "کانگریس کو صرف انھیں مسائل سے دلچسپی رکھنا چاہیے جن میں پوری قوم کی براہ راست حصہ داری ہو اور سماج سدھار اور دوسرے طبقاتی مسائل کو نمٹانے کے لیے کانگریس کی نائب کمیٹیوں (Class-Congresses) کے سپرد کر دینا چاہیے"[1] آگے چل کر قومی تحریک کے مضبوط ہو جانے پر قومی لیڈروں میں ایسے رجحان اور نظریہ کے لوگ شامل ہو گئے جن کی مزدوروں کے بارے میں نسبتاً منفی سوچ کم تھی۔ اس لیے مزدوروں کے بارے میں کانگریس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ مزدوروں کو متحد کرنے کی تمام تر کوششیں ہونے لگیں اور اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ سلطنت مخالف مورچہ کے اندر اور زیادہ طاقتور طبقوں کی بہ نسبت مزدور طبقہ میں سودا بازی کرنے کی حالت بہتر ہو جائے۔ بہر حال سلطنت مخالف مورچہ کو برقرار رکھتے ہوئے مزدور اور دبے کچلے لوگوں کی بھلائی کی یک طرفہ قیمت پر اتحاد کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس اس اتحاد کے حصول کے لیے سبھی طبقوں کو قربانی دینی اور رعایت کرنی پڑتی۔ اس کام میں سرمایہ دار طبقے بھی شامل تھے۔

بہر حال ایسی حالت میں دیسی مل مالکوں کے خلاف مزدوروں کے مسائل کو اٹھانے میں قومی لیڈروں کو بڑا تذبذب تھا۔ زیادہ تر قومی اخبار یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت مزدوروں کی حالت کو سدھارنے کے لیے قانون بنائے۔ اسی لیے 1881 اور 1891 میں فیکٹری بل کی زوردار مخالفت کی گئی۔ اسی طرح ہندستانی سوتی ملوں میں ہونے والی ہڑتالوں کو عام طور سے مدد نہیں ملی۔ سلطنت مخالف تحریک میں کسی طرح کا من مٹاؤ نہ پیدا ہو، یہی قومی لیڈروں کی منشا تھی۔ اس کے علاوہ بھی ان کی اس منشا کے پیچھے کئی اسباب کام کر رہے تھے۔ قومی لیڈروں نے اس بات کو اچھی طرح سوچا تھا اور ان کی سوچ صحیح تھی کہ سرکار نے لیبر قانون (Labour Legislation) بنانے کی جو پہل کی ہے، اس کے تحت برٹش صنعت کاروں کی دلچسپیوں کے بچاؤ کا خیال کام کر رہا ہے۔ ان برٹش صنعت کاروں کو ہندستانی صنعت کاروں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اور ہندوستان میں ان کے سامان کا بازار سکڑتا اور تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لیے ان لوگوں نے ہندوستان میں فیکٹری قانون بنانے کے لیے حکومت پر زور ڈالا۔ اس بل کے تحت ہندستانی

صنعت کاروں کی پہلے سے بڑھی ہوئی مقابلہ کی طاقت کمزور پڑ جاتی۔ اس کے علاوہ قومی لیڈران ملک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی صنعت کاری کو غریبی اور ناداری کو دور کرنے کا رام بان مانتے تھے اور وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے اس تیزی میں خلل واقع ہو۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستانی صنعت ابھی اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہے، اس لیے لیبر قانون کا اس پر برا اثر پڑے گا۔ یہ سونے کے انڈے والی مرغی کو مارنا جیسا ہوگا۔ لیکن اس وقت بھی ''مراٹھا'' نام کا قومی اخبار جی۔ ایس۔ اگرکار (G.S. Agarkar) جیسے ترقی پسند دانشور کے زیر اثر نکلتا تھا۔ ایسے حالات میں بھی انھوں نے اپنے اخبار کے حوالہ سے مزدوروں کے کاز کی زوردار حمایت کی تھی اور مل مالکوں سے ان کو رعایت دینے پر زور دیا تھا۔ بہرحال ایسا رجحان قومی تحریک میں عام طور سے بہت کم تھا۔

لیکن جب برٹش مالکوں کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا مسئلہ آیا، تو کیفیت بالکل بدل گئی۔ ان مزدوروں کی حمایت کرنے میں قومی لیڈروں کو کوئی جھجھک نہیں ہوئی۔ پی آنندا چارلو (P.Ananda Charlu) جو 1891 میں کانگریس کے صدر تھے کے لفظوں میں کانگریس لیڈروں کی سوچ میں تبدیلی اس لیے آئی کہ یہاں ''مالک اور مزدور ایک ہی ملک کے لازمی حصے نہیں تھے''۔[2]

انڈین نیشنل کانگریس اور قومی اخباروں نے باغان مالکوں کے خلاف زوردار مہم چلائی۔ آسام میں چائے باغان مزدوروں کی حالت غلاموں جیسی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یورپی باغان مالکوں کو مزدوروں کو قید کرنے، سزا دینے اور کام چھوڑ کر جانے سے روکنے کے لیے قانونی اختیارات مل گئے تھے۔ کلونیل حکومت کی مدد سے بدیسی سرمایہ داروں کی اس بے روک ٹوک لوٹ کے خلاف قومی وقار و عزت کے نام پر گہار لگائی گئی۔

یہ واقعہ شاید اتفاقاً نہیں ہوا تھا کہ مزدور طبقہ کے ایک حصہ کی پہلی منظم ہڑتال برٹش ملکیت اور انتظام میں چلنے والی ریلوے میں ہوئی ہو۔ گریٹ انڈین پینسلر (Great Indian Peninsular) (G.I.P.) ریلوے میں 1899 میں سگنلروں (Signallers) کی یہ ہڑتال تھی اور اس کا تعلق ان کی مزدوری، کام کے گھنٹوں اور سروس شرطوں سے تھا۔ قریب قریب

سبھی قومی اخباروں نے کھل کر اس ہڑتال کی حمایت کی۔ تلک کے ''اخبار مراٹھا'' اور ''کیسری'' نے مہینوں اس کی تائید میں مہم چلائی۔ بمبئی اور بنگال میں فیروز شاہ مہتا، ڈی۔ای۔ واچا (D.E. Wacha) اور سریندر ناتھ ٹیگور جیسے نیشنلسٹ شخصیتوں نے ہڑتالیوں کی مدد کے لیے عوام کی میٹنگیں کیں اور ان کی مالی امداد کے لیے پیسے اکٹھا کیے۔ چونکہ استحصال کرنے والے بدیسی تھے۔ اس لیے یہ معاملہ قومی مسئلہ بن کر قومی تحریک کا جز بن گیا۔

نئی صدی کے شروع ہوتے ہی مزدور طبقہ کی ترقی کے ساتھ قوم کے اہل علم حلقہ میں بھی نیا رجحان پیدا ہوا، مثلاً پی۔سی۔ پال اور جی۔ سبرامنیا ایر (G. Subramania Aiyer) غریب کمزور اور محنت کش لوگوں کی بہبودی میں قانون بنانے کی ضرورت پر چرچا کرنے لگے تاکہ طاقتور سرمایہ دار طبقہ کے استحصال سے وہ بچ سکیں۔ 1903 میں جی سبرامنیا ایر (G. Subramania Aiyer) نے مزدوروں پر زور ڈالا کہ وہ متحد اور منظم ہو کر یونین کے ذریعہ حقوق کے حصول کے لیے لڑیں۔ انھوں نے عوام سے بھی ان کی مدد کرنے کی اپیل کی۔3

مزدور تحریک کی تاریخ میں 1903 سے 1908 کے دوران سودیشی تحریک کا چلنا حقیقت میں نئے دور کا آغاز تھا۔ ایک سرکاری جائزہ میں اس کی دو خصوصیات کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا گیا ہے......... ایک پیشہ آندولن کرنے والے (Professional Agitators) اور دوسری صنعتی کارخانوں میں مزدوروں کی تنظیمی قوت4 (Power of Organisation) اس زمانہ میں ہڑتالوں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا اور کئی سودیشی لیڈروں نے مستقل ٹریڈ یونین بنانے، ہڑتال کا نظم کرنے، مزدوروں کی قانونی مدد کرنے اور فنڈ اکٹھا کرنے کے کاموں میں خود کو پوری طرح جھونک دیا۔ تحریک کرنے والے مزدوروں کی حمایت میں ہونے والی میٹنگوں میں بی۔سی۔ پال، سی۔آر۔ داس اور لیاقت حسین جیسے قومی لیڈروں نے تقریریں کیں۔ سودیشی تحریک کے لیڈروں میں چار بڑے نیتاؤں میں اشونی کمار بنرجی، پربھات کمار رائے چودھری، پریم توش بوس اور اپورب کمار گھوش نے مزدور تنظیموں کے لیے خود کو پوری طرح وقف کر دیا۔ ہڑتالوں میں ان کا رول بہت فعال تھا مگر مزدوروں کی تنظیم بنانے، ان کے لیے عوام کی حمایت حاصل کرنے، سرکاری پریس، ریلوے اور جوٹ ملوں کے

مزدوروں کو منظم کرنے میں انھوں نے سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ ایسے اہم شعبے تھے جہاں یا تو بدیسی پونجی لگی تھی یا یہ کلونیل حکومت کے ذریعہ چلتے تھے۔

ہڑتالوں کی حمایت میں اکثر کلکتہ کی سڑکوں پر جلوس نکالے جاتے تھے۔ جلوس میں حصہ لینے والے لوگوں کو لوگ کھلاتے پلاتے تھے۔ کثیر تعداد میں مرد و عورت یہاں تک پولیس کانسٹبل روپیہ پیسہ، چاول، آلو اور ساگ سبزی سے ان کی مدد کرتے تھے۔ آل انڈیا یونین بنانے کی سب سے پہلی تجرباتی مگر ناکام کوشش بھی کی گئی۔ اس دوران بھی ہندستانی اور بدیسی سرمایہ داروں کے صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے تئیں مختلف نظریہ برقرار رہا۔

شاید سودیسی تحریک کے دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ جو مزدور اس سے پہلے صرف اپنی مالی مانگوں کے تحت جدو جہد کرتا تھا، اب اس کی کوشش میں اس وقت کے سیاسی مسائل بھی شامل ہوگئے۔ مالی مسائل کو لے کر غیر منظم اور بلا ارادہ بھڑک اٹھنے والی ہڑتالوں نے قومی لیڈروں کی مدد سے منظم اور ہمہ گیر سیاسی تحریکوں کی شکل لے لی۔ مزدور اب ہڑتال کرنے میں ٹرینڈ گریجویٹ بن گئے تھے۔

بنگال تقسیم کے روز یعنی 16/اکتوبر 1905 کو سارے ملک میں تحریک کی لہر دوڑ گئی۔ بنگال کے مزدور طبقہ نے اس کی حمایت میں ہڑتال کردی۔ کئی جوٹ ملوں میں کام کرنے والے مزدور پریس اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے محنت کش، ریلوے قلیوں اور گاڑی بھرنے والے مزدوروں نے کام پر جانے سے انکار کردیا۔ وجہ یہ تھی کہ ان لوگون کو فیڈریشن ہال میں سودیشی نیتاؤں کے ذریعہ منعقد کی گئی سبھا میں جانے کے لیے چھٹی نہیں دی گئی تھی۔ مزدوروں نے اس وقت بھی ہڑتال کردی جب فیکٹری منیجروں کے ذریعہ ان کو "بندے ماترم" گانے اور ایک دوسرے کی کلائی پر راکھی باندھنے جوان کے اتحاد کی نشانی تھی، سے روکا گیا۔

تمل ناڈو کے ٹیوٹی کورن (Tuticorin) مقام پر فروری مارچ 1908 میں بدیشی ملکیت والی ایک سوتی مل میں سبرا منیا سیو (Subramaniya Siva) نے یہ کہہ کر مزدوروں کی ہڑتال کرادی کہ زیادہ مزدوری سے بدیشی ملیں پٹ جائیں گی ان کا جنازہ نکل جائے گا۔ اور جب ان کے دوسرے لیڈر چدمبرن پلے (Chidambaran Pillai) کو گرفتار کیا

گیا تو ٹیوٹی کورن اور ٹرونیلویلی (Tirunelveli) میں ہڑتالیں ہوئیں اور دنگے ہوئے۔

پنجاب کے راولپنڈی میں ہتھیار گودام اور ریلوے انجینئرنگ شعبہ کے مزدور ہڑتال پر چلے گئے، جب لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کو جلاوطن کیا گیا شاید سب سے بڑا سیاسی مظاہرہ ان دنوں اس وقت ہوا جب تلک پر مقدمہ چلایا گیا اور ان کو سزا دی گئی۔ اس واقعہ کا ذکر باب آٹھ میں پہلے ہی آچکا ہے۔

سودیسی تحریک کے دوران ہی کچھ ترقی پسند نیشنلسٹ لیڈروں میں ہم کو سوشلسٹ نظریہ کی ہلکی سی جھلک دکھائی پڑتی ہے یہ لوگ اس وقت یورپ کے مارکسٹ اور سوشلسٹ جمہوری طاقتوں سے متاثر ہوئے تھے۔ روس میں محنت کش مزدوروں کے ذریعہ ہوئے زوردار سیاسی مظاہروں کی مثال لوگوں کے سامنے تھی۔ اس لیے اس کی پرزور نقل ہندوستان میں شروع ہوگئی۔

1908 کے بعد جب تحریک کا زور کم ہوگیا تو مزدور تحریک کو بھی دھچکا لگا۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد جب قومی تحریک میں دوبارہ ابھار پیدا ہوا تو مزدوروں کو پھر سے حوصلہ ملا جس کا معیار پہلے سے کہیں زیادہ اونچا تھا۔

1915 میں ہوم رول لیگ کے ساتھ شروع ہوکر اور 1919 میں رولٹ ستیہ گرہ سے گذرتی ہوئی قومی تحریک ایک بار پھر 1920 اور 1922 کے درمیان عدم تعاون اور خلافت کے دوران اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ 1919 اور 1922 کا وقت ہی وہ دور تھا جب مزدور طبقہ دوبارہ سرگرم ہوا۔ محنت کشوں نے اپنے حقوق کے تحفظ میں قومی سطح کی اپنی ایک تنظیم بنائی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مزدور طبقہ بہت حد تک قومی تحریک کی خاص دھارا میں شامل ہوگیا۔

1920 میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (ایٹک) (AITUC) کا قیام مزدور تاریخ میں سب سے بڑا واقعہ تھا۔ اس تنظیم کے خاص روح رواں لوک مانیہ تلک تھے جن کے بمبئی کے مزدوروں سے خاصے تعلقات ہوگئے تھے۔ پنجاب کے شدت پسند گروپ کے مشہور نیتا لالہ لاجپت رائے اس کے پہلے صدر اور ہندوستان مزدور تحریک کے بہت مامور شخص، دیوان چمن لال اس کے سکریٹری تھے۔ ایٹک کے پہلے اجلاس میں لالہ لاجپت رائے نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات پر بہت زور دیا کہ ''ہندستانی مزدوروں کو تنظیم بنا کر متحد ہونے میں ایک لمحہ کی تساہلی نہیں

کرنا چاہیے.......ملک کی سب سے بڑی ضرورت بروقت منظم وسرگرم ہونے اور تعلیم دینے کی ہے۔ ہمیں اپنے مزدوروں کو منظم کرنا چاہیے اور ان میں طبقاتی شعور پیدا کرنا چاہیے'' جبکہ ان کو معلوم تھا کہ ''مستقبل قریب میں'' مزدوروں کو ایسے دانشور لوگوں کی مدد، رہنمائی اور تعاون کی ضرورت پڑے گی جو ان کے کاز میں مددگار ہوسکیں''۔ انھوں نے بڑے بھروسے سے کہا کہ ''مزدوروں کو آخرکار خود اپنے میں سے ہی اپنا لیڈر تلاش کرنا پڑے گا''[5]

اینگ نے مزدوروں کے لیے جو منشور مرتب کیا اس میں نہ صرف ان سے منظم و متحد ہونے کے لیے کہا گیا بلکہ قومی سیاست میں شامل ہونے کے لیے بھی زور ڈالا گیا۔ ''ہندوستان کے مزدورو! آپ لوگوں کے قومی لیڈران سوراج کی مانگ کر رہے ہیں۔ آپ کو کہیں وہ چھوڑ نہ دیں۔ اس لیے آپ کو اس میں اپنی گنتی کرانی چاہیے۔ آپ کے لیے سیاسی آزادی بے سود ہے۔ جب تک آپ کو مالی آزادی نہیں حاصل ہو جاتی ہے۔ اس تحریک کے آپ لازمی جز ہیں۔ اگر آپ اس کو نظرانداز کریں گے تو آپ کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی''[6]

ہندوستان میں لالہ لاجپت رائے پہلے شخص تھے جنھوں نے سرمایہ داری کو شہنشاہیت سے ملا کر دیکھا تھا اور اس متحدہ مورچہ سے فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس معاملہ میں مزدور طبقہ کا کردار بہت اہم ہے۔ 7 رنومبر 1920 میں انھوں نے کہا کہ ''پونجی کے باقاعدہ نظم نے ہندوستان کا خون چوس لیا ہے۔ آج اس کے قدموں پر وہ بے حال پڑا ہے۔ سرمایہ داری کی جڑواں اولادیں، فوجی نظام اور شہنشاہیت ہیں۔ یہ تینوں ایک ہیں اور ایک ہی میں یہ تینوں ہیں۔ ان کا سایہ، ان کا پھل اور ان کی چھال سبھی زہریلے ہیں۔ حال ہی میں ان کے لیے زہرکش دوا ڈھونڈھ لی گئی ہے۔ اور وہ زہرکش دوا منظم و متحد مزدور طبقہ ہے''[7]

ہندستانی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے تئیں قومی نظریہ میں ہو رہے بدلاؤ کو ظاہر کرتے ہوئے لالہ لاجپت رائے نے کہا کہ ''اکثر ہم سے کہا جاتا ہے کہ جاپان اور مینچسٹر سے کامیاب مقابلہ کے لیے ہندستانی پونجی کو اونچی شرح پر منافع ملنا چاہیے اور اس کے لیے سستی محنت ضروری ہے۔ اس دلیل کو ماننے میں ہم کو ہچک ہے۔ وطن پرستی کی اپیل کا اثر غریب اور امیر پر یکساں ہونا چاہیے اور درحقیقت غریب سے زیادہ امیر پر ہونا چاہیے.......ہندستانی

صنعت کی ترقی صرف مزدوروں کی قیمت پرنہیں ہونا چاہیے''۔ ہندستانی پونجی اور مزدور میں برابر کی ساجھے داری اور مناسب ومعقول نسبت سے منافع کی حصہ داری پر دونوں میں رضامندی ہونی چاہیے......... اگر اس کے بعد بھی ہندستانی سرمایہ دار مزدوروں کی ضرورتوں کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں اور صرف اپنے ہی بھاری منافع کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، تو مزدوروں کی طرف سے کسی طرح کے سہارے اور عام لوگوں کی طرف سے ہمدردی کی امید نہیں کرنی چاہیے''8

اسی طرح ایٹک کے دوسرے جلسہ میں سوراج کے حق میں تجویز پیش کرتے ہوئے دیوان چمن لال نے اشارہ کیا کہ یہ سوراج سرمایہ داروں کے لیے نہیں، مزدوروں کے لیے ہوگا۔

لالہ لاجپت رائے کے علاوہ اس وقت کے کچھ نامور لیڈران ایٹک میں بہت قریب سے جڑے تھے۔ اس کے تیسرے اور چوتھے اجلاس کی صدارت چترنجن داس نے کی تھی۔ اس کے صدروں کی فہرست میں کچھ بہت معروف نام یہ ہیں.........سی۔ ایف۔ اینڈریوز (C.F. Andrews) جے۔ ایس۔ سین گپتا، سبھاش چندر بوس، جواہر لعل نہرو اور ستیہ مورتی۔ 1922 کے گیا اجلاس میں انڈین نیشنل کانگریس نے ایٹک کے قیام کا استقبال کیا اور اس کی مدد کے لیے کانگریس کے بڑے لیڈروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی۔

گیا کانگریس کی اپنی صدارتی تقریر میں چترنجن داس نے کہا کہ ''کانگریس کو مزدوروں اور کسانوں کو اپنا لینا چاہیے.........ان کی خاص دلچسپیوں اور اونچے مقصد کو سامنے رکھ کر ان کو منظم کرنا چاہیے۔ اسی اونچے اونچے مقصد کا تقاضا ہے کہ ان کی خاص دلچسپیوں کی تسکین ہو اور انھیں دلچسپیوں کے تحت کام کرنا سوراج کے حصول کے لیے کام کرنا ہے''۔ انھوں نے خبردار کیا کہ ''اگر ایسا نہیں کیا گیا تو مزدور اور کسان سوراج کے کاز سے اپنا ناتا توڑ لیں گے اور وہ اپنی غرض کے لیے طبقاتی جنگ کا راستہ اختیار کر لیں گے''9

ایسے بدلے سیاسی رویہ کا مزدوروں پر بہت بڑا اثر پڑا۔ 1920 میں ان کی یونینوں کی کل تعداد ایک سو پچیس اور ممبروں کی دو لاکھ پچاس ہزار تھی۔ ان میں سے زیادہ تر 1919 اور 1920 کے دوران وجود میں آئی تھیں۔ ملک کے بڑے سیاسی واقعات میں مزدوروں کی شرکت بہت اہم تھی۔ پنجاب میں ہوئے ظلم اور گاندھی جی کی گرفتاری کے خلاف 1919 میں احمد آباد اور

گجرات کے دوسرے علاقوں میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی، تحریک چلائی اور جلوس نکالے۔ احمد آباد کی سرکاری عمارتوں میں آگ لگا دی گئی، ریلوں کو پٹری سے اتار دیا گیا اور ٹیلیفون کے تار کاٹ ڈالے گئے۔ سرکاری مظالم میں 28 لوگ مارے گئے اور 123 گھائل ہوئے۔ مزدوروں کے ذریعہ کی گئی احتجاجی شورش میں بمبئی اور کلکتہ ہل گئے۔

معاشیاتی (مالی) مطالبوں کے سلسلہ میں اور نسلی امتیاز کے خلاف ریل عملہ کی اور کلونیل حکومت کے خلاف عوام کی کاوشیں ساتھ ساتھ ہوئیں۔ 1919 اور 1921 کے دوران کئی موقعوں پر ریل عملہ نے رولٹ ایکٹ، عدم تعاون اور خلافت تحریکوں کی حمایت میں ہڑتالیں کیں۔ اپریل 1919 میں نارتھ ویسٹرن ریلوے (NWR) کے عملہ نے آل انڈیا عام ہڑتال کی گوہار لگائی تو اتری علاقہ نے بڑے جوش وخروش سے لبیک کہا۔ لاجپت جگا (Lajpat Jagga) نے یہ ثابت کر دکھایا کہ جس طرح ریلویز برٹش سلطنت کی سیاست وصنعت کی منشا کی علامت ہے، ٹھیک اسی طرح گاندھی جی ملک کے دور دراز حصوں میں کام کر رہے ریل عملہ کے لیے، انگریزی حکومت اور اس کے ذریعہ کیے جا رہے استحصال کے خلاف احتجاج کی علامت بن گئے ہیں'[10]

نومبر 1921 میں پرنس آف ویلس (Prince of Wales) کی آمد پر کانگریس نے پورے ملک میں بائیکاٹ کی اپیل کی۔ مزدوروں نے عام ہڑتال کر کے اس پر عمل کیا۔ بمبئی کے سوتی کارخانے بند ہو گئے اور قریب ایک لاکھ چالیس ہزار مزدور سڑکوں پر نکل آئے، فسادوں میں حصہ لیا اور ان پارسیوں اور انگریزوں پر حملہ کیا جو شہزادے کا استقبال کرنے کے لیے نکلے تھے۔ ہلچل کے اس دور میں جس جوش وجذبہ نے مزدوروں کو متاثر کیا اور قومی تحریک کی لہر اور مزدوروں کی تمنائیں جس طرح ایک دوسرے میں گھل مل گئیں ان کا اظہار ارجن آتما رام الوے (Arjun Atma Ram Alwe) جو بمبئی سوتی مل میں ایک ان پڑھ مزدور تھے اور جن کو اپنے طبقہ کے مزدوروں کی بہت اہم شخصیت بنی تھی نے اپنے لفظوں میں اس طرح کہا ہے'' جس وقت ہماری جدوجہد چل رہی تھی تبھی سیاسی تحریک کا طبل بھی بج رہا تھا۔ کانگریس نے حقوق خود مختاری کے حصول کے لیے بہت بڑی تحریک چلا رکھی تھی۔ اس وقت ہم مزدور سوراج کا صرف یہ

کوئی ذات نہ تھی اور جو بعد میں ہریجن کہلائے پر ذلت آمیز غیر انسانی پابندیاں عائد تھیں۔ وہ اونچی ذات والوں کے قریب سے بھی نہیں گذر سکتے تھے۔ اونچی ذات والوں کو نجس اور ناپاک ہوجانے کا ڈر تھا۔ اس لیے اَیجھوا (Azhavas) اور پلیا نام کی ہریجن ذات والوں کو بالترتیب 16 اور 32 فٹ کی دوری اونچی ذات والوں سے بنائے رکھنی پڑتی تھی۔ انیسویں صدی کے اختتام کے وقت سے ان برائیوں کو دور کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ شری نرائن گرو، این کمارن آسن اور ٹی۔ کے مدھ بن (Madhavan) جیسے مصلحین اور دانشوران برائیوں کے خلاف برابر لڑتے آرہے تھے۔

کیرالا صوبائی کانگریس کمیٹی (KPCC) نے کاکیناڈا (Kakinada) اجلاس کے فوراً بعد چھوا چھوت کو ختم کرنا وقت کی اہم ضرورت بتایا۔ اس کے خلاف بڑے پیانے پر پرچار شروع ہوا۔ ہریجنوں کی معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کے لیے تمام کام شروع کیے گئے۔ ہندو مندروں میں ان کے داخلے کے لیے اور پبلک سڑکوں پر ان کے چلنے کے لیے مہم چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی گئی کہ چھوا چھوت پر حملہ کی یہ کارروائی فیصلہ کن ثابت ہوگی، کیونکہ چھوا چھوت کی بنیاد مذہب پر تھی اور مندروں میں جانے کی ممانعت ہریجنوں کی ذلت اور پستی کا داغ تھا۔

ٹراونکور (Travancore) کے ایک گاؤں وائکوم (Vaikom) سے اس کی شروعات ہوئی۔ اس گاؤں میں ایک بڑا مندر تھا جس کی چہار دیواری کے چاروں طرف مندر کی ہی سڑکیں تھیں۔ ان سڑکوں پر اَیجھوا (Azhavas) اور پلیا (Pulayas) کی طرح کے اور ان یعنی ہریجن نہیں چل سکتے تھے۔ کیرالا صوبہ کی کانگریس کمیٹی (KCC) نے حال ہی میں حاصل شدہ ستیہ گرہ ہتھیار کو چھوا چھوت کے خلاف وائکوم گاؤں میں استعمال کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ 30 مارچ 1924 کو سورن اور اورن (اونچی اور نیچی) ذاتوں کے ہندو جلوس کی شکل میں قانون کی خلاف ورزی کرکے مندر کی سڑکوں پر پہنچ گئے۔

ستیہ گرہ کی اس خبر سے سماج کے اصلاحی کارکنوں کو بڑا حوصلہ ملا۔ انھوں نے اونچی ذات کے لوگوں کے ضمیر کو جگانے اور ان کو متحرک کرنے کی مہم تیز کردی۔ بہت ساری سورن

شاخوں میں تقسیم ہوگئی۔ گوردواروں کی آزادی کے بعد ان تینوں رجحانات کے درمیان اتحاد بنے رہنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اس کی ایک شاخ میں وہ لوگ آتے تھے جو معتدل اور حکومت کے حمایتی تھے۔ یہ لوگ تحریک میں محض اس لیے شامل ہوئے تھے کیونکہ اس پر مکمل مذہبی رنگ تھا۔ اور وہ عوام کے زیر اثر تھی۔ مذہبی مقاصد کے حصول کے بعد یہ لوگ حکومت کی طرف واپس ہو کر اس کی سیاست کے وفادار بن گئے۔ دوسری شاخ کے نیشنلسٹ قومی تحریک کی خاص دھارا سے منسلک تھے۔ وہ گاندھیائی یا بائیں بازو کی کرتی (Kirti) کسان یا کیمونسٹ خیموں کے جز بن گئے تھے۔ تیسری شاخ ان لوگوں کی تھی جو اکالی تحریک کے وارثین تو نہیں تھے مگر انھوں نے اکالی لقب (Title) کو بنائے رکھا تھا۔ دیہی علاقوں میں ان لوگوں کو بڑی قدر و عزت حاصل تھی اور یہی لوگ سکھ فرقہ واریت کے ترجمان بن گئے۔ انھوں نے مذہب اور سیاست کو ایک میں گڈمڈ کر کے سکھوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ کرنے کا فلسفہ دل نشین کیا۔ 1947 کے پہلے اکالی دل کی سیاست وطن پرستی اور حکومت نوازی کے درمیان مسلسل تذبذب میں بنی رہی۔

1917 تک کانگریس سماج سدھار کام کرنے سے کتراتی رہی۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے درمیان بڑھتا ہوا اتحاد بکھر جائے، لیکن 1917 میں ایک تجویز پاس کر کے اس نے عوام سے ان برائیوں کو دور کرنے کی اپیل کی جن کی وجہ سے پست طبقے کے لوگوں کو سماج میں ذلیل سمجھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ ناانصافی کی جاتی تھی۔ لوک مانیہ تلک نے بھی چھوا چھوت کی مذمت کی اور اس کو دور کرنے کے لیے لوگوں سے کہا۔ بہر حال ان لوگوں نے ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے کوئی خاص پروگرام نہیں بنایا۔ نیشنلسٹ لیڈروں میں صرف گاندھی جی پہلے شخص تھے جنھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کے نزدیک چھوا چھوت ختم کرنا پہلا کام تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ چھوا چھوت کا خاتمہ جنگ آزادی سے کم اہم نہیں ہے۔

1923 میں کانگریس نے چھوا چھوت ختم کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے کا فیصلہ لیا۔ اس کے تحت اونچی ذات کے ہندوؤں کو سمجھانا اور تیار کرنا ضروری تھا۔ انھیں دنوں کیرالہ کے دو واقعات نے قومی لیڈروں کے اسی رجحان کو عملی جامہ پہنا دیا تھا۔

کیرالا میں بے حد چھوا چھوت تھا۔ پست طبقہ یعنی اورن (Avarnas) جن کی

حکومت ایک بار پھر پسپا ہوئی اور اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر کے ذریعہ متنازعہ آراضی پٹے پر لے کر اکالیوں کے حوالے کیا اور سبھی گرفتار کیے گئے اکالی رہا کردیے گئے۔

گوردوارے تو ایس۔ جی۔ پی۔ سی کے قبضہ اختیار میں آ گئے مگر جنگجو اکالیوں کو پورا احساس تھا کہ ملک نام کا سب سے بڑا گوردوارہ اب بھی آزاد نہیں ہے۔ اس لیے وہ حکومت سے ٹکرانے کا موقع تلاش کرنے لگے۔ ستمبر 1923 میں اکالیوں نے نابھا کے مہاراجہ کا معاملہ اٹھایا جن کو حکومت نے زبردستی بے دخل کر دیا تھا۔ نابھا میں مشہور جیتو مورچہ (Jaito Morcha) اسی سلسلہ میں بنا تھا۔ مگر اکالیوں کو کوئی خاص کامیابی نہیں مل سکی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق نہ تو مذہب سے تھا اور نہ ہی ملک کی عوام اس کے ساتھ تھی۔ اس درمیان حکومت اکالیوں کے معتدل حلقہ کو راضی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے جولائی 1925 میں قانون بنا کر پنجاب کے سبھی گوردواروں کو سکھوں کی ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ اس کمیٹی کا نام بھی ایس۔ جی۔ پی۔ سی تھا۔

اکالی تحریک اپنے مقصد میں کامیاب ہی نہیں ہوئی بلکہ اس نے پنجاب میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے پنجاب کے کسانوں کو جگایا۔ اکالی تحریک کے مورخ مہندر سنگھ کے لفظوں میں ''اکالی تحریک کے دوران ہی سکھوں کی قیادت برٹش نواز جاگیردارانہ ہاتھوں سے نکل کر تعلیم یافتہ وطن پرست متوسط طبقہ کے ہاتھ میں پہنچ گئی اور شہری اور دیہی عوام کے درمیان اتحاد قائم ہو سکا''۔ اس تحریک کی سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ مذہبی مسئلہ کو لے کر چلی اس تحریک پر کسی بھی مرحلہ میں فرقہ وارانہ رنگ نہیں چڑھ سکا۔ مہندر سنگھ نے پھر کہا ''بدیسی حکومت سے ملک کو آزاد کرانے کی غرض نے ہی پنجاب میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو اکالی تحریک کے جھنڈے کے نیچے متحد کیا تھا''[3] اکالی تحریک نے پنجاب کے شاہی خاندان کے لوگوں کو بھی جگایا اور ان کے اندر سیاسی سرگرمی پیدا کی۔ یوں اس تحریک میں کچھ خامیاں بھی تھیں جن کے اثرات بہت بعد میں دکھائی پڑے۔ اس نے خاص طور سے مذہبیت پر بہت زیادہ توجہ دی جس کا بعد میں فرقہ پرست طاقتوں نے ناجائز استعمال کیا۔

چونکہ اکالی تحریک میں تین سیاسی رجحانات پائے جاتے تھے۔ اس لیے جلد ہی یہ تین

گوردوارہ کو آزاد کرانے کی تحریک اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب گرو کا باغ گوردوارہ کے سلسلہ میں پر امن اور زوردار جدو جہد چل رہی تھی اور جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چابی معاملہ میں ہارسے تلملائی پنجاب نوکر شاہی اکالیوں کو سبق سکھانے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت کو حاصل کرنے کے لیے موقع تلاش کر رہی تھی۔ فروری 1922 میں عدم تعاون تحریک واپس لے لی گئی۔ اس سے بھی اس کو کافی تقویت ملی۔ اب وہ بدلہ لینے کی تاک میں لگ گئی۔

آخر کار امرت سر سے تقریباً 20 کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے گاؤں گھو کے والا (Ghoke Wala) میں ہوئے ایک واقعہ نے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ ''گرو کا باغ'' گوردوارہ مہنت نے اگست 1921 میں اس کو ایس۔ جی۔ پی۔ سی۔ کے سپرد کر دیا تھا مگر اس سے ملی آراضی پر اپنی ذاتی ملکیت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ اسی آراضی پر لگے ایک سوکھے درخت کو اکالیوں نے ایندھن کی غرض سے کاٹ ڈالا۔ مہنت نے اس کے خلاف تھانہ میں چوری کی رپورٹ درج کرائی۔ انگریزی افسروں کو اکالیوں کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع مل گیا۔ 9 اگست 1922 کو پانچ اکالی گرفتار کر لیے گئے اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اکالی دل تلملا اٹھا۔ اس کے جتھے گورو کا باغ پہنچ کر متنازعہ آراضی پر لگے سارے درخت کاٹنے لگے۔ پولیس نے سبھی کو چوری اور فساد کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ 29 اگست تک چار ہزار اکالی گرفتار کر لیے گئے۔

افسروں نے ایک بار پھر اپنی تدبیر بدلی۔ اکالیوں کو گرفتار کرنے کے بجائے وہ ان کو بڑی بے رحمی سے لاٹھی ڈنڈوں سے پیٹتے مارتے۔ اکالی اپنی جگہ چپ چاپ کھڑے اس وقت تک مار سہتے رہتے جب تک ان کی ہڈیاں ٹوٹ نہ جاتیں اور وہ لہولہان ہو کر گر نہ پڑتے۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز (C.F Andrews) نے نوکر شاہی کے اس طرح کے ظلم کو جنگلی پن بتا کر انگلینڈ کے لیے اخلاقی ہار سے تعبیر کیا ہے[2] حکومت کے ذریعہ کیے گئے اس طرح کے ظلم و ستم سے پورا ملک تڑپ اٹھا۔ تمام قومی لیڈران اور صحافی گرو کا باغ پہنچ گئے۔ پورے پنجاب میں اس کے خلاف میٹنگیں ہوئیں۔ 10 ستمبر کو امرت سر میں اکالیوں کا بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں سوامی شردھانند، حکیم اجمل خاں نیز دوسرے لیڈروں نے شرکت کی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے پولیس زیادتی کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی۔

لالہ لاجپت رائے نیز دوسرے قومی لیڈروں نے ننکانہ کا دورہ کر کے اپنے اتحاد کا اظہار کیا۔

حکومت نے اب اپنی پالیسی بدل دی۔ اکالی دل اور قومی تحریکوں میں ایکہ اور اتحاد دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس نے دوہری پالیسی اپنانے کا فیصلہ لیا۔ ایسے معتدل لوگوں جن کا تعلق صرف مذہبی اصلاح سے تھا، کو اپنی طرف ملا لیا یا غیر متعلق کر دیا۔ ان کو خوش کرنے کے لیے اصلاحات کا وعدہ کر کے قانون بنایا جانے لگا اور انتہا پسندوں کو امن وامان کے بہانے ستایا جانا شروع ہوا۔

اکالیوں نے بھی اپنی پالیسی بدل دی۔ قومی طاقتوں سے حوصلہ پا کر انھوں نے اپنی تحریک کا دائرہ بڑھا دیا اور اپنی عبادت گاہوں کو مکمل طریقہ سے سرکاری دخل اندازی سے آزاد کرانے کی مہم تیز کی۔ انھوں نے اپنی تحریک کو قومی تحریک کا جز بھی مان لیا۔ مئی 1921 میں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی (SGPC) نے ایک تجویز پاس کر کے عدم تعاون تحریک کو اپنی منظوری دے دی۔ بدیسی سامان اور شراب کے بائیکاٹ کی تائید کی۔ انگریزی عدالتوں کا بائیکاٹ اور پنچائتوں کے قیام پر زور دیا۔ قانون توڑنے کے جرم میں گرفتار اکالیوں نے بدیسی عدالتوں میں عذرداری کرنے سے بھی انکار کیا۔

اکتوبر 1921 میں اکالیوں نے توشہ خانوں کی چابی کے سلسلہ میں شاندار فتح حاصل کی۔ حکومت نے سورن مندر کے توشہ خانہ کی چابی کو اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کی۔ اکالیوں پر فوراً اس کا ردعمل ہوا۔ انھوں نے بڑے بڑے جلسے کیے۔ اکالیوں کے دسیوں جتھے امرت سر پہنچ گئے۔ ایس۔ جی۔ پی۔ سی۔ نے سکھوں کو پرنس آف ویلس (Prince of Wales) کی آمد پر ہڑتال کرنے کی صلاح دی۔ حکومت جھلا گئی اور اس نے ایس۔ جی۔ پی۔ سی۔ کے بابا کھڑک سنگھ اور تارا سنگھ جیسے نامور اور جنگجو لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ مگر تحریک ختم ہونے کے بجائے دور دراز کے دیہی علاقوں تک پھیل گئی۔ اس وقت ملک کے دوسرے حصوں میں عدم تعاون تحریک پورے عروج پر تھی۔ ایک بار پھر حکومت نے سکھوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ان سبھی لوگوں کو قید سے آزاد کر دیا جو توشہ خانہ کی چابی کے سلسلہ میں گرفتار کیے گئے تھے اور اس کی چابی ایس۔ جی۔ پی۔ سی۔ کے صدر کھڑک سنگھ کو سونپ دی۔ مہاتما گاندھی نے بابا کے نام فوراً ٹیلی گرام بھیجا کہ ''ہندوستان کی آزادی کی پہلی جنگ جیت لی گئی، مبارکباد''[1]

لینا چاہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ مذہبی جذبات کو چھیڑنے سے معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے سرکاری ایجنٹوں سے استعفے لے کر سورن مندر کا انتظام مصلحین کے حوالے کر دیا۔

سورن مندر، اکال تخت اور دوسرے گوردواروں کا انتظام کس طرح کیا جائے، اس کو طے کرنے کے لیے نومبر 1920 میں تقریباً دس ہزار مصلحین کی ایک میٹنگ کی گئی اور 175 ممبروں پر مشتمل شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی (SGPC) نام کی ایک تنظیم بنائی گئی۔ اس کے علاوہ دوسرے اور کاموں کو باضابطہ کرنے کے لیے ایک مرکزی کمیٹی کی بھی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس لیے دسمبر میں شرومنی اکالی دل کا قیام وجود میں آیا۔ اکالی جتھوں کو بنانے کی پوری ذمے داری اسی دل پر ڈالی گئی۔ جاٹ کسان اس کا سرمایہ قوت اور نیشنلسٹ دانشور اس کے قائد تھے۔ انھیں دنوں ملک میں پرامن عدم تعاون تحریک چل رہی تھی۔ گوردوارہ تحریک کے سبھی لیڈران اس سے منسلک ہو گئے۔ اسی لیے اکالی دل اور ایس۔ جی۔ پی۔ سی کے تمام رہنماؤں نے اہنسا اصول کو اپنا لیا تھا۔

فروری 1921 میں گرونانک کی جائے پیدائش ننکانا میں پہلی بار اکالی تحریک کو خون وخرابہ سے گذرنا پڑا۔ ننکانہ گوردوارہ کا مہنت نرائن داس پرامن طریقہ سے گوردوارہ سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اکالی والنٹیر وں سے نمٹنے کے لیے 500 کرایہ کے غنڈے تیار کیے۔ ان کو بندوق، تلوار، لاٹھی، ڈنڈوں وغیرہ سے لیس کیا۔ قریب ایک سو اکالی مارے گئے اور کثیر تعداد میں زخمی ہوئے۔ یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ اکالی قیادت غضبناک ہو گئی۔ کرتار سنگھ کے حکم سے تقریباً ایک سو اکالی جتھوں کی بڑی تعداد مندر میں یکبارگی گھس گئی اور ڈپٹی کمشنر کی دہشتناک وارننگ کے باوجود اکالیوں نے مندر پر اپنا تسلط جما لیا۔ مہنت پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا۔ سرکار کو اس وقت بڑی ہچکچاہٹ تھی۔ ایک طرف وہ سکھوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی، دوسری طرف وہ گوردواروں پر اپنا قبضہ بنائے رکھنا چاہتی تھی۔

ننکانہ ٹریجڈی اکالی تحریک کا دور آفریں واقعہ تھا۔ ننکانہ گوردوارہ کے آزاد کرانے والے کرتار سنگھ جھبر کے لفظوں میں "ننکانہ ٹریجڈی نے سکھوں کو جگا دیا اور سوراج کے لیے ہو رہی کوشش کو اور تیز کر دیا"۔ اس نے پورے ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی،

زیادہ لوگ جیل گئے، قریب چار سو لوگ مارے گئے اور دو ہزار سے زائد لوگوں کو زخمی کیا گیا۔

اس تحریک کا واحد مقصد گوردواروں کو جاہل اور بد اطوار مہنتوں سے آزاد کرانا تھا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں سکھ راجا رنجیت سنگھ نیز دوسرے سکھ سرداروں اور عقیدت مندوں نے بڑی بڑی آراضیاں گوردواروں کو مفت عنایت کی تھیں۔ یہ عبادت گاہیں اٹھارھویں صدی میں اداسی سکھ مہنتوں کے زیرِ انتظام ہوگئیں۔ یہ اداسی مہنت مغل حکمرانوں کے قہر وغضب سے بچنے کے لیے چھوٹے چھوٹے بال رکھتے تھے۔ (کچھ ناسمجھ ان کو ہندو مانتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔) وقت کے ساتھ ان میں بگاڑ پیدا ہوا۔ یہ مہنت گوردواروں میں چڑھاوے کی رقم اور ان کی آمدنی کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے۔ پھر کیا تھا، ان میں زیادہ تر مہنتوں کی زندگی عیش وطرب میں گذرنے لگی۔ 1849 میں جب پنجاب انگریزی حکومت کا حصہ بن گیا تب انگریزوں کے ذریعہ نامزد محافظ اور منیجر گوردواروں پر تھوڑا حاوی ہو کر مہنتوں کے شریک کار بن گئے۔

حکومت ان مہنتوں کی بڑی مددگار تھی۔ وہ انھیں کے ذریعہ سکھوں کو وفادار رہنے اور قومی تحریک سے دور رہنے کا درس دلواتی تھی۔ سکھ مصلحین یہ چاہتے تھے کہ گوردوارے مہنتوں اور سرکاری ایجنٹوں سے آزاد ہو جائیں۔ نیشنلسٹوں کو اس وقت بے انتہا صدمہ پہنچا جب امرت سر کے سورن مندر (Golden Temple) کے گرنتھوں کا ''حکم نامہ'' جاری ہوا کہ غدر انقلابی باغی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے جلیان والا باغ کے قاتل جنرل ڈائر کو سروپا یعنی خلعت پہنا کر عزت افزائی کی اور اعلان کیا کہ وہ سکھ ہے۔

گوردواروں کو بدکردار مہنتوں کے چنگل سے آزاد کرانے کی تحریک 1920 کے دوران کافی تیز ہوگئی۔ سکھ مصلحین نے والنٹیروں کی ٹیمیں بنائیں جن کو جتھہ کہا جاتا تھا۔ یہ جتھے گوردواروں کو مہنتوں اور انگریزی ایجنٹوں سے آزاد کرا کر مقامی عقیدت مندوں کے سپرد کرانا چاہتے تھے۔ شروع میں ہی ان کو اس معاملہ میں کامیابی مل گئی۔ سال بھر کے اندر درجنوں گوردوارے آزاد ہو گئے۔ ابتدائی کامیابی سے حوصلہ پا کر ان لوگوں نے سورن مندر اور اکال تخت کا مسئلہ اٹھایا کہ سکھوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کا انتظام سکھ نمائندوں کے حوالہ کیا جائے۔ اپنے دعویٰ کی تشہیر وحمایت کے لیے ان لوگوں نے پبلک جلسوں کا مسلسل نظم کیا۔ سرکار ان سے جھگڑا مول نہیں

باب-18

گوردوارہ سدھار اور مندر داخلہ تحریک

قومیت (Nationalism) اور جمہوریت کے ابھرتے ہوئے جذبات اب صرف سیاست تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ، مذہبی اور سماجی ماحول بھی ان سے متاثر ہو رہا تھا۔ دبے کچلے اور پست طبقے کے لوگوں پر ان کے اثرات ناگزیر طریقہ سے مرتب ہو رہے تھے۔ پرامن ستیہ گرہ کے نئے حاصل شدہ ہتھیار اور عوام کی سرگری کو بہت سے نیشنلسٹوں نے ایسے مسائل کی طرف موڑنا شروع کر دیا تھا جو ہندستانی سماج کے اندرونی شاخت کو متاثر کرتے تھے۔ مذہبی اور سماجی اداروں میں کی جا رہی سدھار کی کوششیں اکثر و بیشتر حکمرانوں سے تصادم کراتی تھیں۔ اس طرح سماج سدھار کی چھڑی تحریک زور پکڑتی گئی، کالونیائی حکومت کی گرفت سماج میں ڈھیلی پڑتی گئی۔ اس لیے اس نے سماج کے رجعت پسند طاقتوں کی مدد تلاش کرنی شروع کی۔ پنجاب کی اکالی تحریک اور کیرالا کی مندر داخلہ تحریک اسی کی مثالیں ہیں۔

یوں تو اکالی تحریک مذہبی مسائل کے سلسلہ میں ہی شروع ہوئی تھی، مگر جنگ آزادی کے ایک اہم واقعہ کی شکل میں اس کا خاتمہ ہوا۔ 1920 اور 1925 کے دوران تیس ہزار سے

کے ذریعہ کی گئی ہڑتال شاید اس دور کی سب سے زیادہ شاندار کارروائی تھی۔ 22 رفروری کو کیمونسٹوں کی پکار اور سوشلسٹوں کی حمایت پر کی گئی ہڑتال میں دو سے تین سو ہزار مزدوروں نے اپنے کام کے اوزار الگ رکھ دیے۔ پولیس کی مداخلت پر پرامن' جلسے اور جلوس تصادم میں تبدیل ہو گئے۔ گلیوں میں مورچہ بندی کر کے راستے روکے گئے۔ فوج اور پولیس کے ساتھ زبروست تصادم ہوا۔ جس میں قریب دوسو پچاس 250 تحریک کارکنان کی جانیں گئیں۔ شہر میں امن قائم کرنے کے لیے دو فوجی دستوں کی ضرورت پڑی۔

کلونیل حکومت کے آخری زمانہ میں مالی مسائل کے تحت پورے ملک میں ہڑتالوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ہڑتال ڈاک وتار ملازمین کی تھی۔ جنگ کے دوران مالی شکایتوں پر پابندی لاگو تھی۔ اس کے ساتھ ہی جنگ کے خاتمہ پر فوجیوں کی برخاستگی، کھانے کی قلت، ضروری اشیا کی قیمتوں میں لگاتار اضافہ اور اصل مزدوری میں آئی گراوٹ نے مزدوروں کی قوت برداشت کو آخری حد تک پہنچا دیا۔

اس کے علاوہ لوگ پرامید ہو گئے تھے کہ آزادی ملنے والی ہے۔ ملک کے سبھی طبقوں کے لوگ یہ سوچتے تھے کہ آزادی ملتے ہی ان کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ مزدور اس سے اچھوتے نہیں تھے۔ اب ان کو بھی آس بندھی تھی کہ آزادی حاصل ہونے پر ان کو ان کا جائز حق ملے گا۔

دلیل دی کہ اب جنگ کی شکل بدل گئی ہے۔ شہنشاہیت پرور سے اب یہ عوام پرور ہو گئی ہے۔ ایسے حالات میں مزدوروں کا یہ فرض ہے کہ وہ دوست ملکوں کے متحدہ مورچہ کی مدد کریں جس سے فاشزم کو زک دیا جا سکے۔ سوشلسٹ فادر لینڈ کو اس سے بڑا خطرہ ہے۔ کیونسٹ پارٹی میں آئے اس بدلاؤ کی وجہ سے اس نے اگست 1942 میں خود کو گاندھی جی کے ذریعہ چلائی گئی ہندوستان چھوڑو تحریک سے الگ کر لیا۔ انھوں نے مالک کے ساتھ مل کر صنعتی امن (Industrial Peace) کی پالیسی پر بڑی کامیابی سے عمل کیا جس سے صنعتی پیداوار اور جنگی سرگرمی میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔

کیونسٹوں کی بے وفائی اور مخالفت کے باوجود ہندوستان چھوڑو تحریک سے مزدور طبقہ اچھوتا نہیں رہا۔ 9/اگست 1942 کو گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں کی گرفتاری کے فوراً بعد ہندوستان چھوڑو تحریک کی حمایت میں مزدوروں نے پورے ملک کے مختلف جگہوں پر……. دہلی، لکھنؤ، کانپور، بمبئی، ناگپور، احمد آباد، جمشید پور، مدراس، اندور اور بنگلور وغیرہ میں قریب ایک ہفتہ تک ہڑتالیں کیں۔ ٹاٹا اسٹیل پلانٹ تیرہ دنوں تک بند رہی اور مزدوروں نے نعرہ دیا کہ وہ کام پر واپس نہیں ہوں گے جب تک قومی حکومت نہیں بن جاتی ہے۔ احمد آباد سوتی مل میں قریب تین سال چھ ماہ ہڑتال رہی۔ مل مالکوں کے قومی احساس مسرت (National Euphoria) میں انھوں نے پوری مدد کی۔ وہ علاقہ جن میں کیونسٹوں کا بول بالا تھا، ان میں مزدوروں نے قدرے کم تعاون کیا۔ پھر بھی کئی علاقوں میں پارٹی لائن کے باوجود مزدوروں نے ہندوستان چھوڑو تحریک میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔

1945-47 کے درمیان مزدور طبقہ میں پھر ابھار پیدا ہوا۔ جنگ کے بعد سیاسی سرگرمی میں مزدوروں نے کثیر تعداد میں حصہ لیا۔ شہروں اور قصبوں (خصوصاً) کلکتہ میں آئی۔ این۔ اے (INA) کے مقدموں کے سلسلہ میں کی گئی میٹنگوں اور نکالے گئے جلوسوں میں بھی ان کا اشتراک اچھا خاصا تھا۔ 1945 کے آخر میں بمبئی اور کلکتہ کے گودی مزدوروں نے انڈونیشیا جانے والے رسد بردار جہازوں کو لادنے سے انکار کر دیا۔ جس کو ان فوجیوں کو رسد پہنچانا تھا جو جنوبی پوربی ایشیا میں جدوجہد آزادی کو کچلنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے۔

1946 میں بحری فوج کی بغاوت کے ساتھ اتحاد ظاہر کرنے کے لیے بمبئی مزدوروں

کی اپنی منسٹری بنی اور صوبوں کو خود مختاری حاصل ہوئی تب مزدور طبقہ میں دوبارہ سرگرمی پیدا ہوئی۔

کیونسٹوں نے تھوڑے ہی وقت میں اپنی خود کش محدود (Suicidal Sectarian) پالیسی ترک کر کے 1934 میں پھر سے قومی سیاست کی خاص دھارا میں شامل ہو کر 1935 میں ایٹک میں پھر شمولیت اختیار کر لی۔ قومی سیاست اور ٹریڈ یونین تحریک میں بائیں بازو کے اثرات ایک بار پھر تیزی سے بڑھنے لگے۔ کیونسٹوں، کانگریسیوں، سوشلسٹوں اور بائیں بازو کے نیشنلسٹوں نے جواہر لعل نہرو اور سبھاس چندر بوس کی قیادت میں کانگریس کے اندر اور دوسری عوامی تنظیموں میں بائیں بازو والا عنصر بہت مستحکم اور مضبوط ہوا۔

1937 میں جب انتخابی مہم شروع ہوئی تو کچھ مراکز کو چھوڑ کر ایٹک نے کانگریس امیدواروں کی حمایت کی۔ کانگریس نے اپنے منشور میں اعلان کیا کہ وہ مزدوروں کے جھگڑے نمٹانے کے لیے پہل کرے گی اور یونین بنانے اور ہڑتال کرنے کے ان کے حقوق کے تحفظ میں موثر طریقے اپنائے گی۔ کانگریس کی صوبائی سرکاروں میں ٹریڈ یونین تحریک نے غیر معمولی ترقی کی۔ 1934 اور 1937 کے دوران ٹریڈ یونینوں کی تعداد 271 سے بڑھ کر 562 اور ممبروں کی 261047 سے بڑھ کر 399159 ہوگئی۔ اور ہڑتالوں کی تعداد میں بھی بے انتہا اضافہ ہوا۔

اس مدت میں ٹریڈ یونین تحریک کو بہت حوصلہ ملا۔ کانگریس سرکاروں میں بہت سارے منسٹروں کے مزدور موافق رویہ سے لوگوں کی شہری آزادی میں اضافہ ہوا۔ ٹریڈ یونین کے متحرک ہونے کے یہی اسباب تھے۔ اس دور کے ہڑتالوں کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور مزدوروں کو کلی یا جزوی فتح ضرور حاصل ہوئی۔[16]

3 ستمبر 1939 کو دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ بمبئی کے مزدور دنیا کے پہلے لوگ تھے جنھوں نے جنگ کے خلاف ہڑتال کا نظم کیا اور 2 اکتوبر 1939 کو قریب نوے ہزار مزدوروں نے ہڑتال میں شرکت کی اور اس کی وجہ سے جنگ میں ہونے والی دشواری کو روکنے کے لیے حکومت نے سخت مظالم ڈھائے۔ اس کے باوجود پورے ملک میں ہڑتالیں ہوئیں۔

پھر بھی 1941 میں سوویت یونین پر نازیوں کے حملے کو ذہن میں رکھ کر کیونسٹوں نے

خالی کردیا ہے۔ہم نے اسی چھوٹے سے حلقہ سے ہی اپنا ناتہ جوڑ رکھا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا.......
کہ مزدوروں کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ ہم لوگ کچھ نہیں کر رہے ہیں اور کانگریس ہی ایسی واحد پارٹی ہے جو شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد جاری رکھے ہے۔اسی لیے مزدوروں نے کانگریس کی قیادت کے پیچھے چلنا شروع کر دیا''[14]

بہر حال مزدوروں نے پورے ملک میں سول نافرمانی تحریک میں شرکت کی۔شولہ پور کے مل مزدوروں، کراچی کے گودی (Dock) مزدوروں، کلکتہ کے مل اور ٹرانسپورٹ مزدوروں اور مدراس کے مل مزدوروں نے بڑی جواں مردی سے تحریک کے دوران حکومت سے ٹکر لی۔ 7 اور 16 رفروری کے درمیان شولہ پور میں جب پولیس نے ایک برٹش مخالف جلوس کو روکنے کے لیے گولی چلائی تب سوتی مل مزدور تشدد پر اتر آئے اور انھوں نے سرکاری دفتروں، عدالتوں، تھانوں، اور ریلوے اسٹیشنوں پر حملہ کیا اور کچھ روز کے لیے تو شہر کا سرکاری انتظام ان کے ہاتھ میں آ گیا۔انھوں نے شہر پر قومی جھنڈا لہرا دیا۔بغاوت کو روکنے کے لیے سرکار نے مارشل لا نافذ کر دیا۔کچھ مزدوروں کو پھانسی اور کچھ کو لمبی سزائیں دی گئیں۔

سول نافرمانی تحریک کے دوران بمبئی میں کانگریس نے نعرہ دیا کہ ''کسان اور مزدور کانگریس کے ہاتھ پیر ہیں''[15] 4رفروری 1930 کو قریب بیس ہزار جن میں زیادہ تر جی۔ آئی۔پی۔(GIP) ریلوے مزدور تھے نے کام بند کر دیا۔6راپریل کو جس دن گاندھی جی نے نمک قانون توڑا، جی۔آئی۔پی ریلوے یونین عملہ نے بالکل نئے انداز میں ستیہ گرہ شروع کیا۔ شمالی بمبئی کے باہری علاقوں کے اسٹیشنوں پر ان کے غول اپنے سامنے لال جھنڈا لگا کر ریلوے لائن پر لیٹ جاتے اور پولیس کو ریلوے لائن صاف کرانے کے لیے گولی چلانی پڑتی تھی۔ مزدوروں کی بے تحاشہ گرفتاریوں کے خلاف کانگریس ورکنگ کمیٹی نے 6رجولائی کو یوم گاندھی منانے (Gandhi Day) کا اعلان کیا۔اسی روز قریب پچاس ہزار مزدوروں نے ہڑتال میں حصہ لیا اور 49 فیکٹری ملازمین نے اپنے اپنے اوزار الگ رکھ کر کام بند کر دیا۔

1931 اور 1936 کے دوران مزدور تحریک میں گراوٹ آئی۔1932 اور 1934 کے سول نافرمانی تحریک میں اس نے فعال حصہ لیا۔1937 اور 1939 کے درمیان جب ملک میں عوام

کیونسٹوں اور انقلابی قوم پرست لوگوں کے زیر اثر کام کرنے والے مزدوروں نے 1927 اور 1929 کے درمیان پورے ملک میں کثرت سے ہڑتالیں کیں اور جلوس نکالے۔ نومبر 1927 میں جب ایٹک نے سائمن کمیشن (Simon Commission) بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تو بہت سارے مزدوروں نے اس کے جلوسوں میں حصہ لیا۔ مئی یوم (May Day)، لینن یوم اور روسی انقلاب کے جشن سالگرہ پر مزدوروں نے جلسے کیے۔

مزدور طبقہ کی مجاہدانہ روش اور اس کی سیاسی سرگرمی خصوصاً قوم پرستوں اور کیونسٹوں سے بڑھتے ہوئے اس کے قریبی رشتہ سے ڈر کر حکومت نے دوہرے طریقے سے اس کی تحریکوں پر حملہ شروع کیا۔ ایک طرف اس نے پبلک سیفٹی ایکٹ (Public Safety Act) (پبلک تحفظ قانون) جیسا ظالمانہ قانون بنا کر مزدور تحریک کے سارے انقلابی لیڈروں کو میرٹھ کانسپریسی کیس (میرٹھ جعل سازی مقدمہ) کے تحت گرفتار کرلیا۔ دوسری طرف اس نے رعایت دے کر (مثلاً 1929 میں رائل کمیشن آن لیبر (Royal Commision on Labour) کی تقرری کر کے مزدوروں کے اچھے خاصے حصہ کو آئینی اور تنظیمی شکل دے کر تحریک سے الگ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

اس طرح مزدور تحریک کو کچھ تو سرکار کے مخالف رخ سے اور کچھ مزدوروں کے کیونسٹ طبقہ میں آئی تبدیلی کی وجہ سے، بہت نقصان پہنچا۔ اس پہلو کا ہم بعد میں تفصیل سے جائزہ لیں گے کہ 1928 کے آخری ایام سے کیونسٹوں نے قومی تحریک کی خاص دھارا سے جڑنے اور اس کے اندر رہ کر کام کرنے کی اپنی پالیسی قریب قریب بدل دی جس کے نتیجہ میں وہ قومی تحریک سے الگ تھلگ ہو گئے اور مزدور وطبقہ میں ان کی پکڑ بہت ڈھیلی پڑ گئی۔ دسمبر 1928 میں مزدوروں کی جو تعداد 54000 ہزار تھی وہ گھٹ کر 1929 کے آخر تک قریب 800 ہو گئی۔ اسی طرح ایٹک کے اندر بھی کیونسٹ علاحدہ ہو گئے اور 1931 کی تقسیم میں ان کو نکال باہر کیا گیا۔

کیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) کے 1930 کے ایک دستاویز میں بمبئی کے مزدوروں پر سول نافرمانی تحریک سے کیونسٹوں کے الگ ہونے کے اثر کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ "ہم نے سول نافرمانی تحریک سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے اور پورا میدان کانگریس کے لیے

1920 کے آخری دور میں شروع ہوئی۔ اس بار بائیں بازو کے طاقتور اور منظم ابھار نے قومی تحریک کو بڑی توانائی اور قوت بخشی۔

بیسویں صدی کی دہائی کے نصف آخر میں بائیں بازو کے رجحانات قوی اور مضبوط ہوئے اور قومی تحریک کو متاثر کرنے لگے۔ 1927 کی ابتدا میں ملک کے مختلف حصوں میں مختلف کیمونسٹ پارٹیوں نے خود کو ایس۔اے۔ ڈانگے، مظفر احمد، پی۔سی۔ جوشی اور سوہن سنگھ جوش جیسے لیڈروں کی رہنمائی میں ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیز (Workers & Peasants Parties) (کسان مزدور پارٹیاں) (WPPS) کے نام سے منظم کیا۔ یہ کانگریس کے اندر ہی بائیں بازو کی حیثیت سے کام کرتی ہوئی بہت تیزی سے کانگریس تنظیم کے اندر صوبائی اور ملکی سطح پر بہت مضبوط ہوئیں۔

بائیں بازو کے وسیع مورچہ میں مزدور کسان پارٹیوں کے تحت کام کرتے ہوئے کیمونسٹ پارٹی کا جو اثر ٹریڈ یونین میں 1927 کے شروع ایام میں بالکل حاشیہ پر تھا وہ 1928 کے آخر تک بہت مضبوط ہو گیا۔ اپریل سے ستمبر 1928 تک کیمونسٹ پارٹی کے ذریعہ چلائی گئی گرنی کامگار یونین (Girni Kamgar Union) کی چھ ماہ کی طویل، عام ہڑتال نے تاریخی، اعلیٰ اور افضل مقام حاصل کرایا۔ 1928 کے آخر تک اس کے ممبروں کی تعداد 324 سے بڑھ کر 54000 (چون ہزار) ہو گئی۔ کیمونسٹ اثرات بنگال اور بمبئی کی ریلوں، جوٹ ملوں، میونسپلٹوں، کاغذ ملوں اور مدراس کی برما آئل کمپنی کے مزدوروں تک بھی پھیل گئے۔ 1928 کے جھریا (Jharia) اجلاس کے وقت تک ایٹک میں بھی کیمونسٹوں کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کی حالت کافی مضبوط ہوئی۔ اس کے بعد کے اجلاس کی صدارت جب جواہر لعل نہرو کر رہے تھے تب این۔ ایم۔ جوشی (N.M. Joshi) کی قیادت میں کچھ لوگ اس سے الگ ہو گئے اور یہیں سے مزدور تحریک میں کارپوریٹسٹ (Corporatist) کا رجحان پنپنے لگا۔ 1928 کے آخر تک فکر مند ہو کر حکومت نے یہ رپورٹ دینی شروع کی کہ ''مشکل سے پبلک خدمت کا کوئی کام یا صنعت اچھوتا رہا ہوگا جس پر کیمونزم کا تھوڑا بہت اثر نہ پہنچا ہو اور یہ ایسا کیمونزم ہے جس نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے''۔[13]

مطلب لگاتے تھے کہ ہمارے قرض معاف ہوں گے، مہاجنوں کی زیادتیاں بند ہوں گی، مزدوری میں اضافہ ہوگا، مالکوں کے ظلم و جبر، لات گھونسے کی مار روکنے کے لیے قانون بنے گا اور اس طرح مزدوروں پر ہو رہے سبھی ستم و بربریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہم مزدوروں کے دماغ میں یہ اور اسی طرح کے دوسرے تمام خیالات آیا کرتے تھے، اور بہت سارے مزدوروں نے جن میں میں خود بھی تھا، عدم تعاون تحریک کے دوران والنٹیر کی حیثیت سے اپنا نام درج کرالیا تھا۔11

1918 میں گاندھی جی کے ذریعہ احمد آباد ٹیکسٹائل لیبر ایسوسی ایشن (TLA) کا قیام وجود میں آیا۔ اس پر روشنی ڈالے بغیر ان دنوں کے واقعات کا تذکرہ ادھورا رہے گا۔ چودہ ہزار ممبروں پر مشتمل شاید یہ اس وقت کی سب سے بڑی ٹریڈ یونین تھی۔ تولیت (Trusteeship) (جس میں سرمایہ دار مزدوروں کی بھلائی کا متولی ہوتا ہے) اور تولیت کے اصول پر قائم گاندھی جی کے تجزیہ کو اکثر و بیشتر بغیر سوچے سمجھے مزدور مخالف اور طبقاتی تعاون پر قائم کہہ کر خارج و رد کر دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ٹی۔ ایل۔ اے (TLA) نے 1918 میں ایک بحث کے دوران مزدوری میں 27.5 فیصدی کا سب سے بڑا اضافہ کیا تھا، گاندھی جی کے تولیت (Trusteeship) کے اصول میں پیوست اصل قوت کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے جیسا کہ گاندھی جی کے کٹر پیرو جے۔ بی۔ کرپلانی نے واضح کیا ہے کہ "تولیت کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ مالک نہیں ہے۔ اس کا مالک وہ ہے جس کے حقوق کے تحفظ کے لیے اس کو ذمے داری دی گئی ہے" یعنی اصل مالک مزدور ہے۔ گاندھی جی نے خود احمد آباد کے سوتی ملوں کے مزدوروں سے کہا تھا کہ "ملوں کے وہ ہی اصل مالک ہیں اور اگر ٹرسٹی یعنی مل مالک اصل مالک کی بھلائی میں کام نہیں کرتا ہے تو مزدوروں کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے خود ستیہ گرہ کرنا چاہیے"۔12 مزدوروں کے بارے میں گاندھی جی کا فلسفہ جس میں ثالثیت (Arbitration) اور تولیت (Trusteeship) پر زور دیا گیا ہے، سلطنت مخالف تحریک کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے جو ابھرتی ہوئی قوم کے مختلف طبقوں میں یکبارگی جدوجہد کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

ایک بار پھر 1922 کے بعد مزدور تحریک میں سستی پیدا ہوئی اور یہ پوری طرح مالی مطالبات کی طرف لوٹ گئی یعنی کارپوریشن کی طرف۔ مزدور طبقہ میں سرگرمی کی دوسری لہر

تنظیمیں مثلاً نائرسروس سوسائٹی، نائرساجن اور کیرالا ہندو سبھا نے ستیہ گرہ کی حمایت کی۔ نمبودریوں (Namboodiris) (سب سے اونچی برہمن ذات) کی سب سے بڑی تنظیم ''یوگکشیم سبھا (Yogakshem Sabha) نے ایک تجویز (Resolution) پاس کر کے مندروں میں اورنوں کے داخلے کی تائید کی۔ دوسری طرف مندر کے پجاریوں اور سرکار نے اورنوں کو روکنے کے لیے کافی انتظام کیا تھا۔ مندر کی ساری سڑکوں پر روک لگائی گئی اور مجسٹریٹ نے ستیہ گرہی لیڈروں پر حکم امتناعی نافذ کر دیا۔ 30/ مارچ کو کے۔ پی۔ کیسومینن (K.P. Kesava Menon) کی قیادت میں ستیہ گرہی کیمپ سے لوگ مندر کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کو اور ان کے بعد چلنے والے دوسرے جتھوں کو قید کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

وائکوم ستیہ گرہ کی خبر سے پورے ملک کو بے پناہ جوش اور ولولہ ملا۔ وہاں ملک کے مختلف حصوں سے والنٹیر پہنچنے لگے۔ پنجاب سے ایک اکالی جتھہ بھی گیا تھا۔ ای۔ وی۔ راما سوامی نائکر (جو بعد میں پیریار (Periyar) کے نام سے معروف ہوئے مدرائی سے ایک جتھہ لے گئے۔ ان کو گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا تھا۔ دوسری طرف اونچی ذات کے ہندوؤں میں اس کا ردعمل ہوا۔ انھوں نے وائکوم گاؤں میں میٹنگ کی اور طے کیا کہ وہ سبھی ستیہ گرہ نواز کانگریس کا بائیکاٹ کریں گے۔ ان کو اپنے اسکولوں میں استاذ نہیں رکھیں گے، مقدموں میں وکیل نہیں بنائیں گے اور الیکشن میں ووٹ نہیں دیں گے۔

اگست 1924 میں مہاراجہ کی موت کے بعد مہارانی نے ولیہ (Regent) کی حیثیت سے سارے ستیہ گرہیوں کو رہا کر دیا۔ ان کے اس لطف وکرم سے متاثر ہو کر اونچی ذات کے ہندوؤں نے جتھہ کی شکل میں جا کر مہارانی کو ایک عرضداست پیش کرنے کا ارادہ کیا کہ وہ مندر کی سڑکیں سبھی کے لیے کھول دیں۔ کیرالا کے مختلف حصوں سے ایسے جتھے (ترونندرم (Trivandrum) پہنچنے لگے۔ 31/ اکتوبر کو تقریباً سولوگوں کا ایک جتھہ پیدل چل دیا۔ راستے میں تقریباً دوسو گاؤں اور قصبوں میں بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال ہوا۔ ترونندرم پہنچتے پہنچتے اس میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ شامل ہو گئے۔ بہر حال مہارانی نے ان کی درخواست رد کر دی مگر ستیہ گرہ چلتا رہا۔

شروع مارچ 1925 میں گاندھی جی نے کیرالا کا دورہ کیا۔ انھوں نے مہارانی اور دوسرے افسروں سے ملاقات کی۔ ان میں ایک سمجھوتہ ہوا۔ مندر کی باہر کی سڑکیں اورنوں کے لیے کھول دی گئیں مگر مندر کے اندر ان کا جانا ممنوع رکھا۔ چونکہ مندر ہندو اورنوں کے لیے بند تھے، اس لیے گاندھی جی وہاں کسی مندر میں نہیں گئے۔

1924 کے بعد پورے ملک میں گاندھی جی کے تعمیری کام کے ایک پارٹ کی حیثیت سے، چھوا چھوت کے خلاف اور دبے کچلے لوگوں کی معاشی اور معاشرتی حالت کو سدھارنے کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ اور کیرالا میں تو اس جدوجہد نے دوبارہ سب سے زیادہ زور پکڑا۔

کے۔ کیلپن (K. Kalappan) کے اکسانے پر کیرالا صوبائی کانگریس کمیٹی (KPCC) کے ذریعہ 1931 میں مندر داخلہ مسئلہ پھر سے اٹھایا گیا۔ ان دنوں سول نافرمانی تحریک روک دی گئی تھی۔ پورے ملابار میں پبلک میٹنگیں کی گئیں۔ کیرالا صوبائی کانگریس کمیٹی نے پہلی نومبر 1931 کو گروواپور (Guruvayur) میں مندر داخلہ کے سلسلہ میں ستیہ گرہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔

21/ اکتوبر 1931 کو 16 والنٹیر وں کا ایک جتھہ شاعر سبرامنین تِرومنبو (Subramanian Tirumanbu) جو کیرالا کی گاتی تلوار (Singing Sword of Kerala) کے لقب سے معروف ہوئے، کی قیادت میں کنانور (Kannanore) جو گروواپور کے اتر واقع ہے سے پیدل روانہ ہوا۔ اس جتھہ میں سب سے نچلی ذات کے ہریجن سے لے کر سب سے اونچی ذات کے نمبودری (Namboodiris) تک کے لوگ شامل تھے۔ اس مارچ نے پورے ملک میں ذات مخالف جذبات ابھارے۔ پہلی نومبر کو آل کیرالا مندر داخلہ یوم (Kerala Mandir Entry Day) منایا گیا، دعائیں مانگی گئیں، جلوس نکالے گئے، جلسے کیے گئے اور چندہ اکٹھا کیا گیا۔ مدراس، بمبئی، کلکتہ، دہلی اور کولمبو (شری لنکا) میں بھی ایسے ہی پروگرام کیے گئے۔ عوام کے ذریعہ اس کا زبردست استقبال ہوا، ملکی سطح کے سبھی لیڈران کیرالا پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے والنٹیر امڈ پڑے۔ پیسوں کی ریل پیل ہوگئی۔ نوجوان طبقہ میں خاص جوش

وخروش تھا۔ یہ لوگ جدو جہد میں آگے آگے تھے۔ چھوا چھوت تحریک عوام میں بے انتہا مقبول ہوئی۔ بہت سے مذہبی عقیدت مندوں نے چڑھاوے کی رقم پجاریوں یا مجاوروں کو دینے کے بجائے ستیہ گرہیوں کو دیا۔ ستیہ گرہیوں کا کیمپ ان کے لیے مندر سے زیادہ مقدس اور متبرک تھا۔

مندر کے مہنت اور پجاریوں نے ستیہ گرہیوں کو مندر سے دور رکھنے کا انتظام کیا تھا۔ مندر کے چاروں طرف کٹیلے تار لگائے گئے تھے اور کثیر تعداد میں پہرہ دار تعینات تھے، تاکہ ستیہ گرہی کسی طرح گھس نہ سکیں۔ ان کو مارنے پیٹنے کی بھی دھمکی دی گئی تھی۔

پہلی نومبر کو 16 والنٹیر سفید کھادی میں ملبوس مندر کے پوربی گیٹ کی طرف چل پڑے۔ ایس۔ پی کی نگرانی میں پولیس کی ایک ٹکڑی نے ان کو روک لیا، مندر عملہ اور مقامی رجعت پسند لوگ پرامن ستیہ گرہیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ پولیس کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔ پی۔ کرشن پلے اور اے۔ کے۔ گوپالن جو بعد میں کمیونسٹ تحریک کے بڑے نامی گرامی لیڈر ہوئے ہیں کو بری طرح مارا پیٹا گیا۔ جنوری 1932 میں سول نافرمانی تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔ حکومت نے کانگریس کی سبھی کمیٹیوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس طرح کانگریس کے وہ سبھی لیڈران جو ستیہ گرہ کی قیادت کر رہے تھے، کو گرفتار کر لیا گیا۔

ستیہ گرہ میں اس وقت نیا موڑ آیا جب کے۔ کیلپن 21 ستمبر 1932 کو مرن برت پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جب تک مندر کے دروازے دلتوں کے لیے نہیں کھولے جاتے ہیں، وہ مرن برت کرتے رہیں گے۔ پورا ملک ہل اٹھا۔ ایک بار پھر کیرالا اور ملک کے دوسرے حصوں میں جلسے وجلوسوں کا نظم ہونے لگا۔ کیرالا کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسرے علاقوں کے اونچی ذات کے ہندوؤں نے کالی کٹ کے زمورن (Zamorin) جو مندر کے محافظ (Custodian) تھے سے ناکام اپیل کی کہ وہ مندر کو سبھی لوگوں کے لیے کھول دیں۔

گاندھی جی نے کیلپن سے مرن برت توڑنے کے لیے کئی بار اصرار کیا۔ انھوں نے ان کو اطمینان دلایا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ خود اس کے لیے جدو جہد کریں گے۔ غرضیکہ انھوں نے 2 / اکتوبر کو انشن توڑ دیا۔ ستیہ گرہ کو بھی ملتوی کر دیا گیا، مگر مندر داخلہ جدو جہد تیز تر ہو گئی۔ اے۔ کے۔ گوپالن کی قیادت میں والنٹیر کے ایک جتھہ نے پورے کیرالا کا پیدل

دورہ کیا۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے۔ انھوں نے جلسوں کو خطاب کیا۔ انھوں نے مندر داخلہ کے سلسلہ میں رائے عامہ ہموار کی۔ حکومت نے اس جتھہ پر پابندی لگادی۔ مگر اس سے پہلے اس نے ایک ہزار میل کا دورہ کرلیا تھا اور 500 جلسوں کو خطاب کر چکا تھا۔

یوں گوروو ایور مندر (Guruvayur Temple) فوراً نہیں کھل پایا مگر ستیہ گرہ کو صاف طور پر کئی کامیابیاں ملیں۔ اے۔ کے گوپالن نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ ''حالانکہ گوروو ایور کا مندر اورنوں کے لیے اب بھی بند ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس تحریک نے سماج میں تبدیلی لانے کے لیے محرک کا کام کیا ہے۔ اس نے ملک کے گوشہ گوشہ کو تبدیلی کی طرف مائل کردیا ہے''۔[4]

چھوا چھوت کے خلاف اور مندر داخلہ کے لیے تحریک بعد میں بھی چلتی رہی۔ نومبر 1936 میں ٹراونکور کے مہاراجہ نے سرکاری کنٹرول کے سبھی مندروں کو بغیر امتیاز عام ہندوؤں کے لیے کھولنے کا فرمان جاری کیا۔ مدراس میں 1938 میں سی۔ راج گوپال چاریہ والی کابینہ نے بھی یہی کیا۔ کانگریس کی زیر حکومت سبھی صوبوں میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔

مندر داخلہ تحریک میں وہ ساری حکمت عملی اپنائی گئی جو قومی تحریک کے دوران اپنائی گئی تھی۔ اس تحریک کے روح رواں لوگوں نے قومی اتحاد کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ چھوا چھوت کے خلاف لوگوں کو سمجھا بجھا کر متحد اور سرگرم کیا گیا۔ مگر ملک میں ذات برادری کا فرق اور اس سے منسلک دوسری برائیوں کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ صرف مندر داخلہ سے یہ سارے مسائل حل ہونے والے نہیں تھے۔ پھر بھی کیرالا کے وائکم اور گروو ایور جیسی تحریکوں کی کارگزاریاں اس سلسلہ میں بہت اہم ہیں۔ ای۔ ایم۔ ایس۔ نمبودری (E.M.S. Namboodari Pad) پاد نے بعد میں لکھا کہ '' گروو ایور مندر ستیہ گرہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے مجھ جیسے ہزاروں نوجوانوں کو تڑپایا تھا اور عوام کے ایک بڑے طبقہ کو اپنے جائز حقوق کے حصول کے خاطر لڑنے کے لیے حوصلہ بخشا تھا۔ انھیں نوجوانوں نے بعد میں تحریک کی رہنمائی کی اور کسان مزدوروں کی ایسی تنظیم کو جنم دیا جو مذہبی یا فرقہ وارانہ منافرت سے ایک دم آزاد تھی''۔[5]

ذات پات سے اپجے ظلم و ستم کے خلاف لڑنے کا جو طریقہ مندر داخلہ تحریک اور گاندھیائی یا قومی تحریک نے اپنایا تھا، اس کی سب سے بڑی کمی یہی تھی کہ اس نے ذات سسٹم کو ایک

دم منانے کی کوئی حکمت عملی نہیں اپنائی تھی۔اس نے عوام کو صرف چھوا چھوت کے خلاف بیدار بھر کیا تھا، حالانکہ آزاد ہندوستان کے دستور میں قومی تحریک کے اثرات صاف طور سے نظر آتے ہیں۔اس میں ذات پات کے امتیاز کی نفی کی گئی ہے، چھوا چھوت کو غیر قانونی مانا گیا ہے، اور ملک کے سبھی شہریوں کو بلا تفریق مذہب وملت برابری کا درجہ دیا گیا ہے۔ پھر بھی قومی تحریک کی کمزوریوں کا اثر صاف طور سے 1947 کے بعد ہوئی ذات واد (Castism) میں ترقی، دلت طبقوں پر ہورہے ظلم اور ان کے ساتھ کی جارہی ناانصافی اور زیادتی کی شکل میں دکھائی پڑتا ہے۔

باب-19

ٹھہراؤ کا زمانہ......سوراج پریمی، تغیر مخالفین (No-changers) اور گاندھی جی

فروری 1922 میں عدم تعاون تحریک کے التوا کے بعد گاندھی جی کو مارچ میں گرفتار کر کے چھ سال کی سزا اس الزام کے تحت دی گئی کہ وہ حکومت کے خلاف عوام میں بے اطمینانی پھیلا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی خیموں میں بکھراؤ اور انتشار پیدا ہونے لگا، تنظیم پاش پاش ہونے لگی اور لوگ پست ہمت ہونے لگے۔ تحریک پر جمود طاری ہونے اور اس کے گرنے کا خدشہ پوری طرح پیدا ہو گیا۔ تمام لوگ گاندھی جی کی حکمت عملی پر انگلیاں اٹھانے لگے اور کچھ لوگ ان پیچیدگیوں کو دور کرنے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔

سی۔ آر۔ داس اور موتی لعل نہرو نے کلونیل حکومت کے خلاف سیاسی سرگرمی جاری رکھنے کے لیے ایک نئی حکمت عملی کی وکالت کی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ نیشنلسٹوں کو لجسلیٹو کونسلوں کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کا نمائندہ بن کر نقلی پارلیمنٹ (Sham Parliament) کا پردہ فاش کرنا چاہیے۔ ان کو کونسلوں کے ہر کام میں رکاوٹ ڈال کر نوکر شاہی کا مصنوعی چہرہ

بے نقاب کرنا چاہیے۔ انھوں نے دلیل دی کہ عدم تعاون سے نہیں بلکہ تعاون جاری رکھ کر ہم موثر اقدامات کر سکتے ہیں اور اس طرح کی حکمت عملی سے جنگ کرنے کا نیا مورچہ تیار ہوگا۔

سی۔آر۔داس اس وقت کانگریس کے صدر اور موتی لعل نہرو سکریٹری تھے۔ 1922 کے گیا کانگریس اجلاس میں ان لیڈروں نے ''کونسلوں کو سدھارنے یا ختم کرنے (Mending or Ending the Council) کی تجویز رکھی، لیکن کانگریس کے دوسرے خیمہ جس کی قیادت بلبھ بھائی پٹیل، راجندر پرشاد اور سی۔راج گوپالا چاریہ کررہے تھے، نے اس کی مخالفت کی۔ تجویز کے حق میں 890 اور اس کے خلاف 1748 ووٹ پڑے۔ تجویز نامنظور ہوگئی۔ سی۔آر۔داس اور موتی لعل نہرو دونوں نے کانگریس میں اپنے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا اور جنوری 1923 میں ایک نئی پارٹی ''کانگریس خلافت سوراج پارٹی'' کی تشکیل کرنے کا اعلان کیا۔ یہی پارٹی بعد میں سوراج پارٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ سی۔آر۔داس اس کے صدر اور موتی لعل نہرو سکریٹریوں میں سے ایک تھے۔ کونسل میں حصہ لینے والوں کو موافقین (Pro-Changers) یعنی تغیر موافقین اور اس میں حصہ نہ لینے کے مخالفین کو ''تغیر مخالفین'' (No-Changers) کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔

سوراج پارٹی نے کانگریس کے ہی پروگراموں کو اپنا پروگرام بنایا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس پارٹی نے سال کے آخر میں ہونے والے الیکشنوں میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ ''کونسل کے سبھی ممبران متحد ہو کر کونسل کے اندر اس کی کارروائی میں مسلسل دخل اندازی کریں گے اور اس کے کام کاج کا چلنا دشوار کردیں گے''[1] اس طرح کونسل کے اندر دشواری پیدا ہوگی اور ساری کارروائی ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔

سی۔آر۔داس (پیدائش 1870) اور موتی لعل نہرو (پیدائش 1861) دونوں مشہور و معروف اور کامیاب وکیل تھے۔ دونوں پہلے معتدل تھے لیکن دونوں نے 1920 میں بائیکاٹ اور عدم تعاون کی پالیسی کو اختیار کرلیا تھا۔ دونوں نے وکالت ترک کردی تھی اور خود کو تحریک کے لیے وقف کردیا تھا۔ دونوں نے کلکتہ اور الہ آباد کے اپنے اپنے عالیشان مکانوں کو ملک کی خدمت کے لیے نذر کردیا تھا۔ دونوں لیڈر گاندھی جی کے بڑے مداح تھے، گرچہ

سیاست میں وہ ان کے ہم پلہ تھے۔ دونوں ہی پارلیمنٹ کی باریکیوں کے جانکار یعنی معروف پارلیمینٹیرین تھے۔ ایک کی مذہب میں گہری عقیدت تھی مگر دوسرا فی الواقع ملحد (Agnostic) تھا، مگر دونوں پکے سیکولرسٹ تھے۔ عام باتوں میں مختلف ہونے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے تھے۔ اور دونوں نے مل کر ایک مضبوط اور نامور جتھا تیار کیا تھا۔ سی۔ آر۔ داس جذباتی، صاحب تخیل اور عظیم مقرر تھے۔ وہ سبھی کا دل جیت لیتے تھے۔ دوست دشمن سبھی ان سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ موتی لعل نہرو ثابت قدم، منکسر المزاج، نکتہ سنج، بہت اچھے منتظم اور ڈسپلن پسند شخص تھے۔ دونوں میں دوستی، بھروسہ اور آپسی اعتماد۔ کا معیار اتنا بلند تھا کہ دونوں میں سے کوئی کسی بیان پر، دوسرے سے پوچھے بغیر اس کی رائے کا اعلان کر دیتا تھا۔ سیاست کا تغیر مخالف خیمہ (No-changers) گاندھی جی کو ہی اپنا لیڈر مانتا تھا، حالانکہ وہ اس وقت جیل میں تھے۔ ان لیڈروں نے عدم تعاون اور بائیکاٹ تحریک کو جاری رکھنے، تعمیری پروگرام چلانے اور التوا میں پڑی سول نافرمانی تحریک کو پھر سے شروع کرنے کے لیے پورے اطمینان سے تیاری کرنے کی اپیل کی۔

جلد ہی تغیر موافقین اور مخالفین میں تو تو میں میں ہونے لگی جبکہ دونوں ہی خیمے کئی معنوں میں ایک جیسے تھے۔ دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ کوئی بھی تحریک غیر محدود وقت تک نہیں چلائی جا سکتی ہے۔ دم لینے، پھر سے قوت حاصل کرنے کے لیے اس میں ٹھہراؤ آنا لازمی ہے۔ دونوں نے ہی یہ محسوس کیا کہ سلطنت مخالف طاقتوں کو منظم کرنے، ان کے دل سے اداسی اور پست ہمتی دور کرنے، عوام میں جلدی جلدی سیاسی شعور پیدا کرنے رائے عامہ ہموار کرنے، تنظیم کو مضبوط بنانے اور کارکنوں کو ضروری ٹریننگ دینے وغیرہ کاموں کے لیے وقت درکار ہے۔ درحقیقت قومی تحریک انھیں تمام دشواریوں سے گزر رہی تھی جن سے ہر ایک تحریک کو گزرنا پڑتا ہے۔ بس پریشانی یہی تھی کہ ایسے حالات میں تحریک کی سیاسی سرگرمیوں کو کیسے جاری رکھا جائے؟

اسی سوال کے جواب میں تحریک دو خیموں میں تقسیم ہوگئی۔ سوراجیوں (Swrajists) کا خیال تھا کہ سیاسی خلا کو پر کرنے کے لیے کونسلوں میں حصہ لینا ضروری ہے۔ اس سے وہ ہندستانی جو سیاسی اعتبار سے بیدار ہو چکے ہیں ان کی ہمت بڑھے گی۔ اخباروں میں

ان کی سیاسی کارگذاریاں چھپیں گی۔ اس سے عوام کو حوصلہ ملے گا۔ کونسلوں میں تقریریں کرنے سے قومی تحریک کی ترقی کے نئے راستے کھلیں گے اور تحریک کی بے انتہا مشتہری ہوگی۔

سوراجی یہ بھی کہتے تھے کہ کانگریس کے ذریعہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے باوجود وہ کام تو کرتی ہی رہیں گی اور شاید انتخابات میں لوگ کثیر تعداد میں حصہ بھی لیتے رہیں۔ ایسی حالت میں عوام پر کانگریس کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں کمی آئے گی۔ اہم اور خاص عہدوں پر غیر کانگریسی قابض ہو جائیں گے اور وہ کانگریس کو کمزور کرنے کا جتن بھی کریں گے۔ پھر انقلابی جدو جہد کے دوران دشمنوں کو موقع کا فائدہ کیوں اٹھانے دیا جائے؟ کونسلوں میں حصہ لے کر اور اس کے کام میں رکاوٹ ڈال کر کانگریس کے لوگ حکومت کے ناپسندیدہ کاموں اور شرارتوں سے بچ سکتے ہیں اور اس کو اس کے غلط قانونوں کو جائز ٹھہرانے سے بھی روکا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سوراجیوں کا دعویٰ تھا کہ کونسلوں میں حصہ لینے سے وہ سیاسی سرگرمیوں کا اکھاڑہ بنیں گی۔ حریت پسندوں (Liberals) کے خیال کے برعکس کونسلوں کا استعمال انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی سبیل کے طور پر کرنا چاہیے نہ کہ حکومت کو دھیرے دھیرے بدلنے کے آرگن (Organ) کی شکل میں۔

تغیر مخالفین (No-changers) کی دلیل تھی کہ کونسل کے کاموں میں مصروف رہنے پر عوام میں اصلاحی اور تعمیری کام کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ انقلابی کاموں کے لیے ان کے جوش اور ولولہ میں کمی آئے گی اور ان میں سیاسی بگاڑ پیدا ہوگا۔ جو لوگ کونسل کو توڑنے کی غرض سے اس میں پہنچیں گے، وہ دھیرے دھیرے مخالفت چھوڑ کر سلطنت نواز دستور کے حامی ہو جائیں گے اور حکومت کے ذریعہ کیے گئے چھوٹے چھوٹے سدھاروں کو لطف و کرم سمجھ کر اس کے مددگار بن جائیں گے۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ کونسلوں کے باہر رہ کر عوام میں تعمیری و اصلاحی کام کر کے سول نافرمانی کے دوسرے دور کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر سکتے ہیں۔

جیوں جیوں ان دونوں خیموں میں تلخی بڑھنے لگی، قومی خیمہ مایوس ہونے لگا۔ لوگوں کے دل میں یہی خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں کانگریس میں 1907 کی حالت نہ پیدا ہو جائے اور پھر بکھراؤ کی نوبت نہ آ جائے۔ بہر حال دونوں طرف سے زور پڑنے لگا کہ وہ

ایک دوسرے پر زہر اگلنا بند کریں۔

اس کا اچھا اثر پڑا۔ دونوں ہی خیمے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے باز آ گئے اور وہ مصالحت کی طرف مائل ہوئے۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ سبھی کانگریسیوں کو اتحاد کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ سوراجیوں کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ کونسلوں میں رہنا چاہے جتنا ضروری ہو مگر قومی مانگوں کو منوانے کے لیے کونسل کے باہر زبردست جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دونوں ہی گاندھی جی کی قیادت کو بہت ضروری تسلیم کرتے تھے۔

اس لیے آخر کار ستمبر 1923 میں دلی کے خصوصی کانگریس اجلاس میں کونسلوں کی ممبری کی مخالفت بند کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ کانگریس کارکنوں کو جلد ہی ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے اور ووٹ دینے کی اجازت دے دی گئی۔

5 رفروری 1924 کو گاندھی جی بیماری کی وجہ سے رہا کر دیے گئے۔ چونکہ کونسلوں کی ممبری اور ان کی کارروائیوں میں رخنہ ڈالنے سے پر امن عدم تعاون تحریک کے اصول پر آنچ آتی تھی، اس لیے وہ اس طرح کے کاموں کے سخت خلاف تھے۔ ایک بار پھر کانگریس کے تقسیم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حکومت ایسے وقت کی تاک میں ہی تھی۔ اس لیے گاندھی جی کو رہا کرتے وقت بمبئی حکومت نے ان کو مشورہ دیا کہ ''وہ سوراجیوں کے عدم تعاون کے سچے اصول سے ہٹنے کی مذمت کریں۔ اس طرح اسمبلیوں کو نقصان پہنچانے کی ان کی طاقت میں کمی آئے گی''۔2 اسی طرح 6 رجون 1924 کو وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو بتایا کہ ''سوراجیوں اور گاندھی جی میں دوری کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں...... منجے (Moonje) جو سوراجیوں کے سنٹرل صوبوں کے لیڈر تھے نے مزید کہا کہ ''اس وقت سوراجی گاندھی جی کے اقتدار کو توڑنے میں جی جان سے لگے ہیں''3 گاندھی جی نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ دھیرے دھیرے وہ سوراجیوں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ گاندھی جی کی حکمت عملی کی سب سے بڑی خوبی ہی یہی تھی کہ وہ ایسے لوگوں سے بھی تال میل کر لیتے تھے جن کے خیال سے ان کو اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ یہاں اس کا مختصر ذکر ضروری ہے۔

گاندھی جی سوراجی نیتاؤں کی پالیسی کے خلاف ضرور تھے مگر ان کو ان کی نیک نیتی پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ ان کو سب سے زیادہ قابل قدر و احترام مانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ''وہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے وطن کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں اور اس کی آزادی کے لیے کبھی کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ دیش پریم کے لیے ہی انھوں نے سب کچھ کیا ہے''۔[4] یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی، داس اور موتی لعل نہرو نے زندگی بھر ایک دوسرے کی قدر کرتے ہوئے آپس میں خوشگوار تعلقات بنائے رکھا۔ جیل سے رہا ہونے کے فوراً بعد گاندھی جی نے کونسلوں میں شرکت کرنے کی پالیسی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ سوراجیوں سے ملاقات کرنے کے بعد بھی ان کا نظریہ برابر بنا رہا کہ کونسل داخلہ کے بارے میں سوراجیوں کی پالیسی بے حد بیکار اور نقصان دہ ہے، مگر اپنے خیال کا اظہار انھوں نے عام پبلک میں بالکل نہیں کیا۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ طے شدہ حقائق (Settled Facts) کو عوام کے سامنے رکھ کر ان کی مخالفت کرنے سے نتیجے بہت اچھے نہیں برآمد ہوں گے۔

کونسلوں میں سوراجیوں نے جس ہمت اور بے لوچ مصالحت سے کام کیا تھا اس سے گاندھی جی کو پورا اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کی حکمت عملی چاہے جتنی غلط ہو وہ انگریزی حکومت کے کل و پرزے نہیں بن سکتے۔ ان کے مطابق ان لوگوں نے مضبوط عزم، استقلال و مضبوط، اتحاد اور ڈسپلن کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنی پالیسی پر عمل پیرا رہ کر نافرمانی کی حد تک بہت بے خوفی سے پہنچ گئے ہیں اور یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ انھوں نے ہندستانی اسمبلیوں میں نئی جان ڈالی ہے''۔[5]

گاندھی جی کو دونوں خیموں کے درمیان گھٹیا درجہ کی تو تو میں میں سے بے انتہا تکلیف ہوتی تھی۔ اپریل 1924 میں انھوں نے لکھا کہ ''حکمت عملی کے موافقین اور مخالفین دونوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا ہے۔ ہر ایک نے یہی دعویٰ کیا ہے کہ سچائی پر اسی کی اجارہ داری ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے سچائی سے بے خبر ہو کر ایسا کیا ہے''۔[6] وہ اس طرح کے گالی گلوج کو بند کروانا چاہتے تھے۔

گاندھی جی نے مشاہدہ کیا کہ کونسلوں میں شرکت کرنا تو شروع ہی ہو گیا ہے۔ اب اس سے پیچھے ہٹنا یا اس کی مخالفت کرنا بے انتہا برا ہوگا۔ عوام اور حکومت میں اس سے غلط فہمی پیدا

ہوگی۔ یہ تحریک کی کمزوری اور پسپائی کا باعث ہوگا۔7 اس سے حکومت کو غلط کام کرنے کا حوصلہ ملے گا اور نوکر شاہی بے لگام ہو کر ظلم وستم ڈھائے گی نیز سیاسی حلقے مایوسی کا شکار ہوں گے۔

اسی درمیان تحریک کو تنکے کا سہارا مل گیا جب حکومت نے تشدد کو مٹانے کا نام لے کر لوگوں کے شہری حقوق کو پامال کرنا شروع کیا اور بنگال کے سوراجی نیتاؤں پر ہلّہ بول دیا۔ 25/ اکتوبر 1924 کو حکومت نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت کانگریس دفتروں اور لیڈروں کے گھروں پر چھاپے مارے گئے۔ کئی سوراجی انقلابی جنگجو اور کانگریسی نیتا گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں گرفتار لوگوں میں سبھاش چندر بوس اور بنگال کونسل کے دو سوراجی انل برن رائے (Anil Baran Roy) اور ایس۔سی۔ مترا (S.C. Mitra) بھی تھے۔

ان واقعات پر گاندھی جی کا پہلا ردعمل ان کے غصہ کی شکل میں سامنے آیا۔ 31/ اکتوبر کو انھوں نے ''ینگ انڈیا'' میں لکھا کہ ''رولٹ ایکٹ تو مر چکا ہے مگر جس مقصد کے تحت وہ لایا گیا تھا وہ اب بھی زندہ ہے۔ جب تک انگریزوں کی دلچسپیاں ہندوستانیوں کی دلچسپیوں سے ٹکراتی رہیں گی یا جب تک ایسی بدنظمی رہے گی یا ڈر رہے گا، رولٹ ایکٹ کوئی نہ کوئی شکل لیتا ہی رہے گا''8

سوراجیوں پر ہو رہے ظلم سے نمٹنے کے لیے گاندھی جی نے ان کی حمایت کرنے اور ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ینگ انڈیا میں لکھا ''اگر ضرورت کی اس گھڑی میں میں سوراجیوں کا ساتھ نہیں دیتا ہوں، تو یہ ملک کے ساتھ دھوکا ہوگا۔ مجھے ان کا ساتھ دینا ہی چاہیے حالانکہ میں کونسلوں میں شرکت اور ان کے اندر کی کشمکش کے طریقوں میں یقین نہیں رکھتا ہوں''9 انھوں نے مزید لکھا کہ ''اگرچہ میں پکا تغیر مخالف (No-changer) ہوں پھر بھی مجھ کو ان کی پالیسیوں کو برداشت ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ مل کر کام کرنا اور حتی الامکان ان کو مستحکم اور مضبوط بنانا چاہیے''10

6/ نومبر 1924 کو گاندھی جی نے سوراجیوں اور ان کے مخالفین کے درمیان کی کھائی کو پاٹ دیا۔ سی۔ آر۔ داس، موتی لعل نہرو اور گاندھی جی نے ایک مشترکہ بیان پر دستخط کیے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ سوارجی نیتا کانگریس کے لاینفک جز کی حیثیت سے کانگریس کی قیادت میں،

کونسلوں میں اپنا کام کرتے رہیں گے۔ دسمبر میں بیلگام (Belgaum) کانگریس اجلاس میں اس فیصلے کو منظوری دے دی گئی۔ اس اجلاس کی صدارت گاندھی جی نے کی تھی اور کانگریس کی انتظامیہ میں انھوں نے سوراجیوں کو اکثریت میں عہدے بھی دیے تھے۔

نومبر 1923 میں کونسلوں کے الیکشن ہوئے۔ 14/ اکتوبر کو جاری اپنے الیکشن منشور میں سوراجیوں نے برطانوی شہنشاہیت کی مخالفت کو الیکشن کا خاص موضوع بنایا۔ اس میں کہا گیا کہ ''ہندوستان پر انگریزی حکومت کا مقصد انگلینڈ کی خود غرض دلچسپیوں کی تسکین ہے اور ہندوستان کی ذمے دار سرکار کے منظور شدہ نام ونہاد اصلاحی قوانین تو دھوکے کی ٹٹی ہیں جن کی آڑ میں بدیسی حکومت اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ اس کا اصل مقصد تو ہندوستان کے لامحدود وسائل کا استحصال کر کے ہندوستانیوں کو مستقل طریقے سے انگلینڈ کا تابع دار بنائے رکھنا ہے''[11] اس میں وعدہ کیا گیا کہ سوراجی کونسلوں میں پہنچ کر سرکار کے ڈھونگ کی قلعی کھولیں گے۔

اگر چہ سوراجیوں کو الیکشن کی تیاری کے لیے کچھ ہی ہفتے ملے تھے اور ووٹ دینے کے اختیارات بھی کم ہی لوگوں کو تھے............ صرف 62 لاکھ یعنی تین فیصدی سے بھی کم لوگوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا تھا۔ پھر بھی انھوں نے بہت اچھا مظاہرہ کیا۔ ان لوگوں نے سینٹرل لیجسلیٹیو اسمبلی کی 101 سیٹوں میں 42 پر فتح حاصل کی۔ سینٹرل صوبوں میں ان کو کھلی اکثریت ملی۔ بنگال میں یہ سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے ابھرے، بمبئی اور اتر پردیس میں ان کو اچھی کامیابی ملی۔ مدراس اور پنجاب میں ذات وبرادری اور فرقہ وارانہ ماحول سے ان کو دھچکا لگا۔ وہاں ان کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

سینٹرل لیجسلیٹیو اسمبلی میں سوراجی اتحادی مورچہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اس میں جناح کی قیادت والے آزاد ممبران، حریت پسند (Liberals) اور مدن موہن مالویہ جیسے لوگ انفرادی حیثیت سے شامل تھے۔ زیادہ تر صوبوں میں بھی اسی طرح کا اتحادی مورچہ بنایا گیا تھا۔ اور سرکار کو ہر موقع پر مات کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

لیکن 1919 کے رفارم کے تحت لیجسلیٹیو اسمبلیوں کے پاس اختیارات صرف کاغذ پر تھے۔ یوں تو ان کے زیادہ ممبران منتخب ہو کر آئے تھے مگر مرکز اور صوبوں کی انتظامیہ

(Executive) پر ان کا کوئی دباؤ بالکل نہیں تھا۔ انتظامیہ سیدھے انگریزی حکومت کے تئیں ذمے دار تھی۔ اتنا ہی نہیں وائسرائے یا گورنر کبھی بھی کسی قانون کو جس میں بجٹ قانون بھی شامل تھے کو منظوری کا سرٹیفکیٹ دے سکتے تھے چاہے اس کو اسمبلی نے نامنظور ہی کر دیا ہو۔ سوراجیوں نے بار بار مرکز اور صوبے میں حسب ضابطہ قانون کی تصدیق کرنے کے لیے زور ڈال کر اصلاح شدہ اسمبلیوں کا اصلی چہرہ بے نقاب کیا۔ مارچ 1925 میں ان کو ایک نمایاں کامیابی اس وقت ملی جب وہ سوراجی نیتا بلبھ بھائی پٹیل کو سینٹرل اسمبلی کا صدر منتخب کرانے میں کامیاب ہوئے۔

یوں تو سوراجی سرکار کے ہر کام کی مخالفت کرتے اور اکثر خلاف ووٹ دیتے تھے، مگر تین معاملوں کو انھوں نے زوردار طریقے سے اٹھایا۔ ان پر سوثر تقریریں کیں۔ وہ پوری کی پوری اخباروں میں شائع ہوتیں اور لوگ بڑے شوق وچاؤ سے روزانہ صبح ان کو پڑھتے۔ پہلی بات تھی سوراج کے قیام کے لیے دستور میں تبدیلی، دوسری شہری آزادی کی بحالی جس میں سیاسی قیدیوں کی رہائی اور جابرانہ قانونوں کے خاتمہ کی باتیں آتی تھیں اور تیسرے معاملہ میں دیسی صنعت وحرفت کی ترقی کی باتیں شامل تھیں۔

اسمبلی کے پہلے اجلاس میں موتی لعل نہرو نے نیا دستور بنانے اور ہندوستانیوں کو حکومت سپرد کرنے کی مانگ رکھی جو 48 کے مقابلے 64 ووٹوں سے منظور کر لی گئی۔ ستمبر 1925 میں وہی مانگیں پھر اٹھائی گئیں جو 45 کے مقابلے 72 ووٹوں سے مان لی گئیں۔ سرکار کو بجٹ مانگوں کے سوال پر کئی بار منہ کی کھانی پڑی۔ ایوان میں اکثریت سے مانگوں کو مسترد کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کے ایک موقع پر بٹھل بھائی پٹیل نے سرکار سے کہا کہ ''ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنی حکومت ویٹو (Veto) سے اور ہر ایک مسترد قانون کو تصدیق نامہ دے کر چلائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو ردی کا کاغذ سمجھیں۔ ہم پورے یقین سے کہتے ہیں کہ یہ بات تو ثابت ہی ہو چکی ہے''۔[12]

اسی طرح جابرانہ قانونوں کو واپس لینے اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے سوال پر سرکار کو کئی بار منہ کی کھانی پڑی۔ انقلابی جنگجوؤں پر کی گئی سرکار کی تنقید کے جواب میں سی۔ ایس رنگا ایر (C.S. Ranga Aiyer) نے کہا کہ ''سرکاری حکام بذات خود مجرم ہیں، قاتل

ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آزادی سے پریم کرنے والی قوم کی آزادی کا ہی قتل کر رہے ہیں'' 13

لالہ لاجپت رائے نے کہا'' انقلاب اور انقلابی تحریکیں تو فطری چیزیں ہیں.......... ان کے بغیر دنیا میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی'' 14 سرکار کی جابرانہ پالیسی پر سی۔آر۔داس کی تنقید بہت سخت تیکھی تھی۔ انھوں نے بنگال صوبائی کانفرنس میں کہا کہ '' جبر مطلق العنان حکومت کو مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ جبر ظلم ہنسا کی سب سے دہشتناک شکل ہے، حکومت کے ذریعہ کی جارہی ہنسا کی میں زوردار مذمت کرتا ہوں'' 15

اسمبلیوں میں سوراجیوں کی کارگزاریاں بڑی شاندار تھیں۔ سیاسی اعتبار سے بیدار لوگوں کے دلوں میں انھوں نے جوش و ولولہ پیدا کیا اور ان کی ہمت افزائی کی۔ لوگ اسمبلیوں میں برٹش نوکرشاہی کی ہار کی خبر سن کر جھوم اٹھتے تھے۔ بڑے مگن ہو جاتے تھے۔

1923-24 کے دوران میونسپلٹیوں اور دوسرے لوکل سیلف اداروں میں کانگریسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ سی۔آر۔داس کلکتہ کے میئر چنے گئے (سبھاش چندر بوس اگزیکیوٹیو سکریٹری بنے) وٹھل بھائی پٹیل بمبئی کارپوریشن کے، ولبھ بھائی پٹیل احمد آباد میونسپلٹی کے، راجندر پرساد پٹنہ میونسپلٹی کے، اور جواہر لعل نہرو الہ آباد میونسپلٹی کے صدر چنے گئے۔ نو چینجرس یعنی تغیر مخالفین نے ان چناؤں میں بڑی دلچسپی لی۔ وہ سوچتے تھے کہ تعمیری اور اصلاحی کام کرنے کے لیے یہ لوکل ادارے بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے یوں تو اختیارات بہت محدود تھے مگر قومی لیڈروں کی صدارت میں ان سب نے عام لوگوں کے رہن سہن کو اونچا اٹھانے میں بڑا کام کیا تھا۔ تعلیم، حفظان صحت، صفائی، چھوا چھوت مٹانے اور کھادی کا پرچار کرنے وغیرہ معاملوں میں نمایاں کام کیے گئے۔ دوست و دشمن سبھی نے ان کاموں کی قدر کی نیز لوگوں کے دلوں میں اصلاحی کام کرنے کے لیے حوصلہ پیدا ہوا۔

16/جون 1925 کو سی۔آر۔داس کا انتقال ہو گیا۔ اس سے سوراجیوں کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ کچھ اور سیاسی واقعات نے ان کو مزید نقصان پہنچایا۔ تحریک کی عدم سرگرمی میں فرقہ وارانہ رجحانات کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔ لوگوں کی سیاسی محرومی و مایوسی کا آتش فشاں فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں پھوٹنے لگا۔ کلونیل حکومت ایسی سوچ کو پہلے سے ہی ہوا دے

رہی تھی۔ اس لیے ہر قسم کی فرقہ واریت کو پنپنے کا بروقت کشادہ ماحول مل گیا۔

ایوان میں سوراج پارٹی کے کرنے کے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ مخالفت کی سیاست وہ کر چکے تھے اور حکومت کو بار بار پٹخنی بھی دے چکے تھے مگر اس کے باوجود وہ ایوان میں بلوں کو قانونی شکل دیتی جا رہی تھی۔ اس طرح ایوان کے اندر جدوجہد کو اور آگے بڑھانے کے امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ اس لیے اسمبلی کے باہر عوامی تحریک چلانا لازمی ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن بدقسمتی یہی تھی کہ سوراجی اسمبلی کے اندر چل رہی اپنی جنگجو کوششوں کو باہر ہو رہی عوام کی سیاسی سرگرمیوں سے جوڑ نہ سکے۔ حقیقت میں یہ لوگ اخباروں میں چھپی رپورٹوں پر ہی بھروسہ کرتے رہے۔

سوراجی اپنی اتحادی پارٹیوں کا ساتھ ہمیشہ اور ہر موقع پر نہیں لے پائے۔ ان کی اتحادی پارٹیاں، اسمبلی میں بار بار اس کے ذریعہ رخنہ ڈالنے کی پالیسی پر یقین نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے وہ سوراجیوں کی جنگجو پالیسی سے پیچھے ہٹنے لگیں۔ اس کے علاوہ بہت سے سوراجی اسمبلی ممبر کی حیثیت سے حاصل شدہ بھتہ و دیگر سہولتیں نیز عزت و وقار کو للچائی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس طرح سوراجیوں اور اتحادی پارٹیوں میں بگاڑ پنپنے لگا۔

ایسے ہی حالات میں قومی خیموں میں پھوٹ ڈالنے کی حکومت کی پالیسی رنگ لانے لگی۔ سوراجیوں کو حریت پسندوں، اعتدال پسند سوراجیوں کو جنگجو سوراجیوں اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑانے کی حکمت عملی کامیاب ہونی شروع ہوئی۔ بنگال میں سوراج پارٹی کے اکثر ممبران زمینداروں کے خلاف کاشتکاروں کی حمایت کرنے میں ناکام رہے۔ اس بھول سے کاشتکار جن میں زیادہ تر مسلمان تھے سوراج پارٹی سے ناراض ہو گئے۔ اس کے علاوہ سوراج پارٹی کے اندر خود فرقہ وارانہ عنصر پنپ رہا تھا۔ اس کو روک پانے میں وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

جلد ہی اس پارٹی میں ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے جو حکومت میں عہدہ کے خواہشمند تھے۔ سینٹرل صوبوں میں یہ لوگ حکومت میں شامل ہو گئے ان کو ریسپانسوسٹس (Responsivists) کہا جاتا ہے تھا۔ این۔سی۔ کیلکر (N.C. Kelkar) ایم۔آر۔ جے کر (M.R. Jaykar) اور کئی دوسرے لیڈر ان کے ساتھ آ گئے۔ لالہ لاجپت رائے اور مدن موہن مالویہ سوراج پارٹی سے اس لیے کنارہ کش ہو گئے کہ یہ حکومت میں شامل ہو گئی تھی اور

اس میں فرقہ واریت سماگئی تھی۔

پارٹی نہ بکھرے، پارلیمانی فساد اور خرابی رکے اور ممبران مایوسی کا مزید شکار نہ ہوں وغیرہ اغراض کے تحت پارٹی قیادت نے سول نافرمانی تحریک میں پھر سے اپنے یقین واعتماد کو دوہرایا اور مارچ 1926 میں اسمبلیوں میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ادھر گاندھی جی نے بھی اسمبلیوں میں شمولیت کی پالیسی پر تنقید شروع کردیا۔ انھوں نے اپریل 1926 میں شری نواس آینگر (Srinvasa Aiyengar) کو لکھا کہ ''کونسلوں میں شرکت اور ہندو مسلم پر پڑنے والے اس کے اثرات کے بارے میں جتنا ہی میں سوچتا ہوں، اتنا ہی زیادہ اس کے بیکار اور بے سود ہونے پر میرا یقین پختہ ہوتا جاتا ہے'' 16

نومبر 1926 میں سوراج پارٹی نے الیکشن میں حصہ تو ضرور لیا مگر اس کی حالت بہت خراب اور خستہ تھی۔ یہ بہت کمزور اور پست ہمت ہوگئی تھی۔ ایک طرف وہ سرکار، سرکار کے خوشامدی اور خود اس کے اندر کے باغی کارکنوں سے نمٹ رہی تھی۔ دوسری طرف اس کا ہندو مسلم فرقہ پرست طاقتوں سے مقابلہ تھا۔ فرقہ واریت نے سوراجیوں کے خلاف جہاد سا چھیڑ رکھا تھا۔ موتی لعل نہرو پر الزام تھا کہ وہ ہندو مفاد کو قربان کر رہے ہیں، گئو بتیا کی حمایت کر رہے ہیں اور خود گئو مانس کھا رہے ہیں۔ مسلم فرقہ پرست بھی پیچھے نہیں تھے۔ وہ سوراجیوں کو مسلم مخالف کہہ رہے تھے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوراج پارٹی ایک دم کمزور ہوگئی۔ مرکز میں اس کو 40 سیٹوں پر، مدراس میں آدھی سیٹوں پر کامیابی ملی، مگر بقیہ صوبوں خصوصاً یو پی، سی۔ پی اور پنجاب میں اس کی بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے علاوہ کونسلوں میں ہندو مسلم فرقہ پرست ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور 1923 میں ملی کامیابی کے برعکس اس بار سوراجی مرکز میں قومی مورچہ بنانے میں بھی ناکام رہے۔

سوراجی کئی موقعوں پر پھر کارروائی روکو تجویز (Adjournment Motion) لانے میں کامیاب ہوئے اور کئی قانونی مسودوں (Bills) کے سلسلہ میں حکومت کو سوراجیوں نے شکست دی۔ 1928 میں پبلک سیفٹی ایکٹ پر حکومت کی ہار قابل ذکر ہے۔ حکومت سوشلسٹ اور کمیونسٹ رجحانات سے گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ ہندوستان میں

انگلینڈ اور کمیونسٹ ملکوں سے بھیجے گئے انقلابی انگریزی حکومت کے لیے بڑا خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے حکومت ایسے ناپسندیدہ اور نقصان دہ غیر ملکیوں کو ملک سے باہر کرنے کے لیے قانونی اختیار حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیے سبھی رنگ و رجحان کی قومی پارٹیوں نے متحد ہو کر اس بل کی مخالفت کی۔ لالہ لاجپت رائے نے کہا کہ ''سرمایہ داری، شہنشاہیت کا دوسرا نام ہے............ بالشیوکوں یا لینن پرستوں سے ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے لینن سے بڑا خطرہ سرمایہ داروں اور استحصال کرنے والوں سے ہے''[17] موتی لعل نہرو نے روس میں حاصل اپنے تجربوں کا ذکر کر کے روس کے خلاف کیے جا رہے سرکاری اشاعت کی مذمت کی۔ انھوں نے پبلک سیفٹی بل کو ہندستانی قومیت اور انڈین نیشنل کانگریس پر سیدھا حملہ بتایا۔ انھوں نے اس کو ''ہندستانی غلامی بل نمبر ایک'' نام سے موسوم کیا[18] ٹی۔ پرکاشم نے کہا کہ ''اس بل کا مقصد کسانوں اور مزدوروں کے درمیان قومیت کی اشاعت کو روکنا ہے''[19] شعلہ بیان دیوان چمن لال جن پر موتی لعل دست شفقت رکھتے تھے نے اعلان کیا کہ ''اگر آپ ہم کو سوشلزم کے خلاف نصیحت دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اگر آپ سوشلزم کو کچلنے کا اختیار مانگ رہے ہیں تو اسے حاصل کرنے کے لیے آپ کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا''[20] یہی نہیں سرمایہ دار طبقہ کے دو مبلغین پرشوتم داس ٹھاکر داس اور جی۔ ڈی۔ بڑلا نے بھی بل کی سخت مخالفت کی۔

بل کے پاس نہ ہونے سے حکومت بوکھلا گئی۔ اس نے مارچ 1929 میں اکتیس بڑے کمیونسٹ نیتاؤں، مزدور اور بائیں بازو کے نیتاؤں کو گرفتار کر لیا اور میرٹھ میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ نیشنلسٹوں نے سرکار کے رویہ کی سخت تنقید کی۔ گاندھی جی نے اس کو آگے ہونے والی دہشت گردی کی فال بد بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ''نیتاؤں کی گرفتاری اور ان پر مقدمے چلانے کا مقصد کمیونزم کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ عوام میں ہیبت پھیلانا ہے''۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''یہ (حکومت) وقتاً فوقتاً قانونی قدروں کو پامال کر کے لرزتے ہوئے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اپنا وہ خونی پنجہ دکھاتی رہتی ہے، جس کو وہ عام طور سے چھپائے رکھتی ہے''[21] آخر کار سول نافرمانی تحریک چھیڑنے اور لاہور کانگریس اجلاس میں تجویز پاس ہونے کے نتیجہ میں 1930 میں سوراجی اسمبلیوں سے باہر نکل گئے (Walked out)۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ایسے وقت میں سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھا جب قومی تحریک تازہ دم ہو رہی تھی اور اپنی جدو جہد کے دوران یہ لوگ نہ کلونیل حکومت کے جھانسے میں آئے اور نہ اس کو تعاون ہی دیا۔ موتی لعل نہرو نے اپنے بیٹے جواہر لعل نہرو کو لکھا تھا کہ ''ہم نے بڑے استقلال سے جدو جہد کیا ہے، حالانکہ کچھ لوگوں نے اپنے اصولوں سے تھوڑی سی لاپروائی بھی کی ہے اور پارلیمانی ڈھانچہ میں ایسا ہی ہوتا ہے، مگر پارٹی کے زیادہ تر لوگ پارٹی پالیسی اور اصولوں سے شمہ برابر نہیں ہٹے۔ انھوں نے اسمبلیوں میں اتحاد اور ڈسپلن کا زبردست مظاہرہ کیا اور جب بھی ان کو ان سے نکل آنے کا حکم ملا وہ فوراً باہر نکل آئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ سلطنت مخالف جدو جہد کے دوران چونکہ اسمبلیاں سیاست میں سلطنت مخالف خود اعتمادی کو ترقی دیتی ہیں، اس لیے ان کا استعمال تخلیقی و تعمیری طور پر اس جدو جہد کے لیے کیا جا سکتا ہے''۔ سوراجیوں نے رفارم ایکٹ 1919 کی بھی قلعی کھولی اور لوگوں کو دکھایا کہ کس طرح قاعدہ و قانون کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان پر حکومت کی جا رہی ہے۔

انھیں دنوں تغیر مخالفین (No-changers) محنت، لگن اور سکون سے تربیتی سطح کے سماج سازی کے اصلاحی کام میں لگے رہے مثلاً کھادی و چرخہ کی خوب اشاعت کی۔ قومی تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کافی کام کیا۔ چھوا چھوت کے خلاف جدو جہد اور بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ برابر جاری رہا۔ ملک بھر میں سیکڑوں کھادی آشرم کا قیام ہوا جہاں سیاسی جمعیت (Cadre) کے لوگوں کو کتائی و بنائی کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ پچھڑی ذاتیوں اور آدی واسیوں کے درمیان کافی کام کیا گیا۔ مثلاً بارڈولی تعلقہ (گجرات) ویدچی (Vedchi) آشرم میں چمن لال مہتا، جگت رام دوبے (Dave) اور چمن لال بھٹ (Chiman Lal Bhatt) نے آدی واسیوں یا کالی پراجوں (KaliParaj) کو پڑھانے کے لیے اپنی ساری زندگی لگا دی۔ اسی طرح روی شنکر مہاراج نے کھیڑا ضلع کے نیچی ذات بریوں (Baraiyas) کو پڑھانے لکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

گاندھی جی کے اصلاحی و سماجی کام کئی طرح کے تھے۔ گاؤں کی غریب عوام کو ان سے بڑا فائدہ پہنچا۔ انھیں کاموں سے قوم کی نو تعمیر شروع ہوئی اور انھیں کاموں کے ذریعہ شہر کا

دولت منداور امیر طبقہ گاؤں کے لوگوں کی زبوں حالی سے باخبر ہوا۔انھیں کاموں نے کانگریس کارکنوں کو عدم سیاسی سرگرمی کے دوران بھی متحرک اور مصروف رکھا۔لوگ بیکار نہیں بیٹھے بلکہ سماج سیوا کا کام برابر کرتے رہے۔ سماج کا جو طبقہ اب تک سیاست اور سیاسی سرگرمی سے بے خبر تھا وہ بھی کانگریس کے قریب آیا۔گاؤں میں کانگریس کی مقبولیت بڑھی۔لوگوں کو تنظیم بنانے کی قوت ملی،ان میں خوداعتمادی پیدا ہوئی اور نئی امید جگی۔

پچھڑے طبقوں اور آدی واسیوں کی اصلاح،سدھار اور ترقی کے بغیر انگریزی حکومت کے خلاف متحدہ طریقے سے مضبوط اور طاقتور مورچہ تیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ،کلونیل حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کے اتحاد کا مظاہرہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ آزادی کے لیے کمربستہ تھے۔نیشنل اسکولوں نے نوجوانوں کو انگریزی نظریات سے ہٹ کر ٹریننگ دی تھی۔1920 اور 1921 میں جن طلبا نے پڑھائی چھوڑ دی تھی،ان میں سے زیادہ تر منظور شدہ تعلیمی اداروں میں پھر تعلیم حاصل کرنے لگے اور جو تعلیم پر واپس نہیں ہوئے وہ تحریک کے پورے وقت کے رضاکار بن گئے۔

کل ملا کر یہ سارے اصلاحی اور تعمیری کام جدوجہد آزادی کے لیے سپاہی تیار کرنے اور ان کو ٹریننگ دینے میں مددگار ثابت ہوئے۔ان کے ذریعہ نیتاؤں اور اہل کاروں کی صحیح جانچ وپرکھ بھی ہوسکی۔ان کاموں کے کرنے والوں کو تو تحریک کا اسٹیل فریم(Steel Frame) بنا تھا۔اسی لیے جب ستیہ گرہ نے زور پکڑا تو کھادی بھنڈار میں کام کرنے والے نیشنل اسکولوں کے طلبا اور اساتذہ اور گاندھی آشرم کے افراد اس میں شریک ہوگئے اور یہی کارکن سول نافرمانی تحریک کی سرمایہ قوت بنے۔

1922 سے 1926 کا دور متضاد واقعات کا زمانہ تھا۔اصلاحی وتعمیری کاموں میں یقین رکھنے والے گاندھی وادی اور سوراجی پہلے سے ہی اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ بعد میں ان دونوں خیموں میں اندر اندر تلخی پیدا ہوئی۔دونوں ہی خیمے گروپ بازی کا شکار ہوگئے۔ 1927 کی ابتدا تک ان میں بے مروتی اور مایوسی کا ماحول پیدا ہونے لگا۔مئی 1927 میں گاندھی جی نے لکھا کہ ''اب تو مجھ کو صرف خدا کی عبادت اور اس کے کرم کا ہی سہارا رہ گیا ہے''۔22

مگر کئی سالوں کی عدم سرگرمی میں تازہ دم ہونے کے بعد تحریکیں جدو جہد کے لیے پھر سے تیار ہونے لگیں۔ سائمن کمیشن (Simon Commission) کے خلاف جوانوں کا ردعمل اوران جوانوں کو دی گئی عوامی حمایت اس کا کھلا ثبوت ہے۔

باب۔20

بھگت سنگھ، سوریہ سین اور انقلابی تشدد پسند

پہلی جنگ عظیم کے دوران انقلابی تشدد پسندوں کو بری طرح کچل دیا گیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر قید کر لیے گئے تھے یا وہ بھاگ نکلے تھے، لیکن مانٹیگ چیمس فورڈ رفام (Montagu Chelmsford Reform) لاگو کرنے کی غرض سے خوشگوار ماحول بنانے کے لیے 1920 کی ابتدا میں عام معافی کے تحت انقلابی تشدد پسندوں کو جیلوں سے رہا کر دیا گیا۔ تھوڑے روز بعد ہی کانگریس نے عدم تعاون تحریک شروع کی اور گاندھی جی، سی۔ آر۔ داس اور دوسرے لیڈروں کی اپیل پر انقلابی تشدد پسندوں نے تشدد کا راستہ چھوڑ کر گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔

لیکن عدم تعاون تحریک کے یکا یک واپس لینے پر ان باہمت اور حوصلہ مند نوجوانوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے قومی قیادت پر سوالیہ نشان لگانا شروع کر دیا۔ اہنسا کے نظریہ سے ان کا اعتماد اٹھنے لگا اور اس کے متبادل کی جستجو شروع ہو گئی۔ سوراجیوں کی پارلیمانی سیاست ان کو راس نہیں آتی تھی اور گاندھی نوازوں (No- Changers) کے خشک اور اصلاحی کاموں میں بھی ان کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ ان میں سے زیادہ تر حضرات تو

اب یہ سوچنے لگے تھے کہ صرف تشدد کے ذریعہ ہی ملک کو آزادی مل سکتی ہے۔ تشدد ان کے لیے پھر سے پرکشش ہو گیا۔ اس لیے اس کو حسن اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ انقلابی تشدد کی سیاست کے زیادہ تر افراد مثلاً جوگیش چندر چٹرجی، سوریہ سین جتن داس (Jatin Das) چندر شیکھر آزاد، بھگت سنگھ، سکھ دیو، شیو کمار، بھگوتی چرن ووہرا (B.C. Vohra) اور جے دیو کپور نے پرامن عدم تعاون تحریک میں بے حد جوش وخروش سے حصہ لیا تھا۔

دھیرے دھیرے انقلابی تشدد پسندوں میں دو رجحانات پروان چڑھے۔ ایک پنجاب، یوپی اور بہار میں، دوسرا بنگال میں۔ یہ دونوں رجحانات سماج میں ابھری نئی طاقتوں سے متاثر ہوئے تھے۔ ایک طاقت تھی پہلی جنگ عظیم کے بعد ابھری مزدور تنظیم۔ انقلابیوں کو اس طبقہ کی قوت کا پورا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس کا استعمال قومی انقلاب بپا کرنے کے لیے کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا بڑا واقعہ روس کا انقلاب تھا۔ ہندستانی نوجوانوں کو اس سے بڑا حوصلہ ملا۔ وہ سوشلسٹ روس اور اس کی حکمراں بالشیوک پارٹی (Bolshevik Party) سے ضروری مدد لینے کے خواہشمند تھے۔ تیسرے طبقہ میں کمیونسٹ گروپ آتے تھے جو مارکسزم، سوشلزم اور غریب محنت کش لوگوں کی بھلائی کے علم بردار تھے۔

سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں پرانے اور تجربہ کار انقلابی رام پرساد بسمل، جوگیش چٹرجی اور سچیندر ناتھ سانیال کی قیادت میں مایوسی اور اداسی سے نکل کر تمام انقلابی منظم ہونے لگے۔ سچیندر ناتھ سانیال کی کتاب ''بندی جیون'' (Bandi Jiwan) تو انقلابیوں کے لیے کورس کی کتاب ہو گئی۔ اکتوبر 1924 میں ان انقلابی نوجوانوں کا کانپور میں اجلاس ہوا اور ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن آرمی (HRAA) کا قیام وجود میں آیا جس کا مقصد مسلح انقلاب کے ذریعہ کلونیل حکومت کو اکھاڑ پھینکنا اور اس کی جگہ پر بالغ رائے دہی (Adult Franchise) کے ذریعہ ہندوستان کی متحدہ ریاستوں (United States of India) کا وفاقی جمہوریہ (Federal Republic) قائم کرنا تھا۔

مسلح جدوجہد چھڑنے کے پہلے، اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا گیا۔ نوجوانوں کی بھرتی اور ان کی ٹریننگ اور ان کے لیے اسلحوں کا جگت کرنا ضروری تھا۔ ان سب

کاموں کے لیے پیسے درکار تھے۔اس لیے ''ہندوستان ریپلک آرمی'' (HRA) نے سب سے اول اور بڑی کارروائی کاکوری ڈکیتی کی شکل میں 9/اگست 1925 کو دس آدمیوں نے 8 ڈاؤن ٹرین کولکھنؤ کے پاس کاکوری نام کے غیر معروف گاؤں پر روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ حکومت نے بغیر تامل سخت کارروائی کی۔نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد گرفتار کرلی گئی۔ان پر کاکوری سازش کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔اشفاق اللہ خاں،رام پرساد بسمل،روشن سنگھ اور راجیندر لاہڑی کو پھانسی دی گئی،چار کو عمر قید کی سزا دے کر انڈمان بھیجا گیا اور باقی سترہ کو لمبی سزائیں ملیں۔چندر شیکھر آزاد بچ نکلے۔

کاکوری واقعہ شمالی ہندوستان کے انقلابیوں کے لیے بہت تباہ کن ثابت ہوا مگر تحریک فنا نہیں ہوئی۔چندر شیکھر کی رہنمائی میں دوسرے نوجوان اتر پردیش کے وجے کمار سنہا،شیو روما اور جے دیو کمار کپور اور پنجاب کے بھگت سنگھ،بھگوتی چرن دوہرا اور سکھ دیو پھر سے ایچ۔آر۔ اے۔کو منظم کرنے میں لگ گئے۔ان سب پر بیک وقت سماج وادی نظریات کا بھی اثر پڑ رہا تھا۔ آخر کار 9 اور 10 ستمبر 1928 کو دہلی کے فیروز شاہ کوٹلا میدان میں شمالی ہندوستان کے اہم انقلابی لیڈروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ان سب نے متحدہ قیادت کو منظور کیا اور سماج واد کا قیام ان کا اصلی مقصد طے ہوا۔انھوں نے اپنی تنظیم کا نام بدل کر ''ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن (HSRA) رکھا۔

اگرچہ ایچ۔ایس۔آر۔اے (HSRA) کی قیادت اور اس کے انقلابی نوجوان ذاتی طور سے کررہے تشدد اور جوانمردی کے کاموں کو چھوڑ کر تیزی سے عوامی سیاست کی طرف مڑ گئے مگر 30/اکتوبر 1928 کو لاہور میں سائمن کمیشن کے خلاف جلوس کے دوران لالہ لاجپت رائے پر پولیس کا وحشیانہ لاٹھی چارج اور اس کے نتیجہ میں ان کی موت نے ان انقلابیوں کو ایک بار پھر قتل و غارت گری پر آمادہ کردیا۔ان انقلابی نوجوانوں نے اپنے عزیز نیتا جن کو وہ شیر پنجاب کے نام سے یاد کرتے تھے کے قتل کو ایچ۔ایس۔آر۔اے کے لیے سیدھا چیلنج سمجھا۔ 17/ستمبر 1928 کو بھگت سنگھ،چندر شیکھر آزاد اور راج گرو نے لاہور میں لالہ لاجپت رائے پر لاٹھی برسانے والوں میں سے ایک پولیس افسر سینڈرس (Saunders) کو قتل کردیا۔اس کے بعد

ایچ۔ایس۔آر۔اے کی طرف سے جو پوسٹر لگائے گئے تھے ان میں لکھا تھا کہ "ملک کے لاکھوں لوگوں کے ہردل عزیز لیڈر کا بدمعاش معمولی سپاہی کے ذریعہ قتل پوری قوم کی توہین و ہتک ہے۔ اس کا بدلہ لینا نوجوانوں کے لیے لازم تھا۔ سینڈرس کے قتل پر ہم کو افسوس ہے مگر وہ اس وحشی اور بے رحم حکومت کا کل و پرزہ تھا جس کو برباد کرنے کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں" 1

اس کے بعد ایچ۔ایس۔آر۔اے کی قیادت نے عوام کو یہ سمجھانے کا فیصلہ لیا کہ اس کا مقصد اب بدل گیا ہے۔ وہ اب عوامی انقلاب میں یقین کرتی ہے۔ انگریزی سرکار اس وقت عوام پر خاص طور سے مزدوروں کے بنیادی حقوق پر پابندی لگانے کی غرض سے دو تجاویز "پبلک سیفٹی بل" اور "ٹریڈ یونین بل" پاس کرانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کی مخالفت میں بھگت سنگھ اور بی۔کے۔دت (B.K. Dutt) کو لیجسلیٹیو اسمبلی میں بم پھینکنے کی ذمے داری دی گئی۔ بم پھینکنے کا مقصد کسی کا قتل نہیں تھا۔ بلکہ حکومت کے بہرے کانوں تک مخالفت کی آواز پہنچانا ہی ان کی منشا تھی۔ یہ بم معمولی اور بے ضرر تھا۔ ان لوگوں نے ایوان کے اندر جو پرچے پھینکے تھے ان میں لکھا تھا "بہرے کانوں تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے" اس کام سے ان کا مطلب خود کو گرفتار کرانا اور عدالت میں مقدمہ چلوانا تھا جس سے لوگ ان کے سیاسی نظریات سے آگاہ ہو سکیں۔

بھگت سنگھ اور بی۔کے دت پر اسمبلی میں بم پھینکنے کے لیے مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے بعد بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو اور دس دوسرے انقلابیوں پر حکومت کے خلاف سازشیں کرنے کے الزام میں مقدمے چلائے گئے۔ اپنے اصولوں پر ڈٹے، بے خوف اور نڈر نوجوان انقلابی روزانہ عدالت میں "انقلاب زندہ آباد" "شہنشاہیت مردہ آباد" اور "مزدور کسان امر ہیں" کے نعرے لگاتے ہوئے داخل ہوتے اور گاتے "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" "میرا رنگ دے بسنتی چولا"۔ شہیدوں کے یہ نعرے اور گیت روزانہ اخباروں میں چھپتے لوگوں میں ان کے لیے بے پناہ ہمدردی پیدا ہوتی۔ اہنسا میں بھی یقین رکھنے والے تڑپ اٹھتے۔ بھگت سنگھ کا نام ہر شخص کو زبان زد تھا۔ مارچ 1931 میں جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی، تو پورا ملک رو پڑا، گھروں میں چولھے نہیں جلے، طلبا اسکول نہیں گئے اور لوگوں نے اپنے کام بند رکھے۔

انقلابیوں کے ذریعہ جیل میں کی گئی بھوک ہڑتال نے پورے ملک کو جھنجھوڑ دیا۔ یہ

انقلابی جیل میں کی جا رہی وحشیانہ سلوک کے خلاف بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کو عام مجرم نہ مان کر سیاسی قیدی کی سہولتیں دی جائیں۔ پورا ملک ان کے ساتھ تھا۔ 13 ستمبر کو بھوک ہڑتال کے 64ویں دن جتن داس (Jatin Das) جو کمزور جسم مگر مضبوط ارادوں کے جواں مرد تھے چل بسے۔ پورا ملک صدمہ میں ڈوب گیا۔ ان کا جنازہ لاہور سے کلکتہ لایا گیا۔ راستے میں ہر ہر اسٹیشن پر ہزاروں کے مجمع نے اٹڈ کر ان کا درشن کیا، اور ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کلکتہ میں چھ لاکھ سے زیادہ لوگوں کے جلوس کے ساتھ ان کی ارتھی نکلی۔

لاہور سازش مقدمہ اور اسی طرح کے دوسرے مقدموں میں انقلابیوں کی ایک کثیر تعداد کو لمبی سزائیں دی گئیں۔ ان میں سے کئی لوگوں کو انڈمان بھیجا گیا۔ بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو 23 مارچ 1931 کو پھانسی دی گئی۔

بنگال میں بھی انقلابی متحد ہو کر خفیہ طریقہ سے کارروائیاں کرنے لگے۔ ان میں تو کئی ایک بیک وقت کانگریس تنظیم میں بھی کام کرتے رہے۔ اس طرح ان کو کانگریس کے وسیع حلقہ میں جگہ بنانے کا موقع ملا، دوسری طرف کانگریس نے بھی ان انقلابیوں کی مدد سے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں میں اپنی بنیاد مضبوط کی۔ یہ انقلابی سی۔ آر۔ داس کے لیے ان کے سوراج کے کام میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔ سی۔ آر۔ داس کی موت کے بعد کانگریس قیادت دو خیموں تقسیم ہو گئی۔ ایک خیمہ کے لیڈر سبھاش چندر بوس تھے اور دوسرے کے جے۔ ایم۔ سین گپتا۔ یوگانتر (U g a n t a r) گروپ سبھاش چندر بوس کے ساتھ اور انوشیلن (Anushilan) گروپ جے۔ ایم۔ سین گپتا کے ساتھ ہو گیا۔

نئے طور سے بنے دونوں خیموں کے کاموں کی فہرست میں گوپی ناتھ ساہا کے ذریعہ چارلس ٹیگارٹ (Charles Tagart) جو بے حد ناپسندیدہ کمشنر تھا کو قتل کر ڈالنے کی کوشش بھی شامل تھی۔ مگر ساہا نے غلطی سے اس کو قتل کرنے کے بجائے جنوری 1924 میں ڈے (Day) نام کے دوسرے انگریز کو مار ڈالا۔ حکومت سختی پر اتر آئی۔ ایک نیا حکم نامہ (Ordinance) جاری کر کے ان تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا جن پر انقلابی ہونے یا انقلابیوں کی مدد کرنے کا شک تھا۔ گرفتار لوگوں میں سبھاش چندر بوس اور دوسرے کانگریسی شامل تھے۔

مخالفت کے باوجود ساہا کو پھانسی دے دی گئی۔اس سے انقلابی سرگرمیوں کو بڑا جھٹکا لگا۔

انقلابی سرگرمیوں کے سست پڑنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ انقلابی حلقوں خصوصاً یوگانتر اور انوشیلن گروپوں میں بڑی دوری پیدا ہوگئی تھی۔ اس سے نمٹنے کے لیے نئی نسل کے انقلابی نوجوانوں نے اپنے پرانے حلقوں سے رشتہ بنائے رکھنے اور ضروری صلاح ومشورہ لیتے رہنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے گروپ بنانا شروع کردیا۔ایسی باغی تنظیموں میں سب سے زیادہ سرگرم اور فعال چٹگاؤں گروپ تھا۔اس کے نیتا سوریہ سین (Surya Sen) تھے۔

سوریہ سین نے عدم تعاون تحریک میں بہت فعال حصہ لیا تھا۔ وہ چٹگاؤں کے قومی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ ان کو لوگ پیار سے ماسٹردا (Masterda) کہتے تھے انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے ان کو 1926 سے 1928 تک دوسال کی سزا دی گئی۔جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ کانگریس میں برابر کام کرتے رہے۔ان کی اور ان کے گروپ کی کانگریس سے بڑی قربت تھی۔ 1929 میں وہ چٹگاؤں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور ان کے پانچ ساتھی اس کے ممبر ہوگئے۔

سوریہ سین میں بے انتہا تنظیمی صلاحیت تھی۔ وہ نہایت شیریں زبان، منکسرالمزاج، شریف النفس، بے پناہ حوصلہ منداور مخلص انسان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''اخلاص انقلابی کا خاص جوہر ہے''۔ان کو شعروشاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ رویندر ناتھ ٹیگور اور نظرالاسلام کے وہ بڑے مداح تھے۔

سوریہ سین نے جلد ہی انقلابی نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنا ساتھی اور مددگار بنالیا۔ اس میں انت سنگھ، گنیش گھوش اور لوک ناتھ باول (Lok Nath Baul) شامل تھے۔ان انقلابی نوجوانوں نے عوام کو یہ بتانے کی غرض سے کہ مسلح بغاوت کے ذریعہ انگریزی سلطنت کو اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے باغیانہ کارروائی کرنے کے لیے چھوٹی اسکیم بنائی جس میں چٹگاؤں کے دو اسلحہ خانوں پر قبضہ کرکے اسلحوں کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا، جس سے انقلابیوں کی کثیر تعداد کو اسلحہ فراہم کیا جاسکے۔اس منصوبہ میں شہر کی ٹیلیفون اور ٹیلیگراف سسٹم کو درہم برہم کرنا اور چٹگاؤں اور بنگال کے دوسرے حصوں کے درمیان ریل آمدورفت کو بھی برباد کرنا تھا۔منصوبہ بہت خفیہ طریقے

سے اور بڑی ہوشیاری سے رچا گیا۔ 18 اپریل 1930 کی رات دس بجے اس پر عمل بھی کیا گیا۔ گنیش گھوش کی قیادت میں چھ انقلابیوں نے ''انقلاب زندہ آباد، شہنشاہیت مردہ آباد اور گاندھی جی کی حکومت قائم ہوگئی'' کے نعرے لگاتے ہوئے پولیس اسلحہ خانہ پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح لوک ناتھ باول (Baul) کی قیادت میں دس جواں مردوں نے فوج اسلحہ خانہ پر قبضہ کر کے لیوس بندوقیں (Lewis guns) اور فوجی رائفلیں حاصل کرلیں۔ بس بدنصیبی یہی تھی کہ ان کو گولہ بارود کا ذخیرہ نہ مل سکا۔ اس طرح ان کا منصوبہ ناکام رہا۔ البتہ ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور ریل آمد ورفت درہم برہم کرنے میں ان کو کامیابی ضرور ملی۔ یہ کام ''انڈین ریپبلکن آرمی چٹگاؤں شاخ'' کے نام پر کیا گیا اور اس میں 65 انقلابیوں کی ٹولی شامل تھی۔

سبھی انقلابی مجاہدین پولیس اسلحہ خانہ کے سامنے جمع ہوئے۔ سوریہ سین صاف شفاف سفید کھادی دھوتی، لمبا کوٹ اور اچھی طرح کلف کی ہوئی گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ انقلابیوں نے ان کو فوجی سلامی دی اور بندے ماترم اور انقلاب زندہ آباد کا نعرہ لگاتے ہوئے قومی پرچم لہرایا اور عارضی انقلابی گورنمنٹ (پرو ویزنل ریوولوشنری گورنمنٹ (Provisional Revolutionary Government) کے قیام کا اعلان کیا۔

چٹگاؤں میں فوج کسی بھی وقت آسکتی تھی اور یہ انقلابی فوج سے کہاں مقابلہ کر سکتے تھے۔ اس لیے علی الصباح ان لوگوں نے شہر چھوڑ دیا اور محفوظ جگہ کی تلاش میں چٹگاؤں کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ 22 اپریل کو دوپہر میں جلال آباد کی پہاڑیوں کا کئی ہزار فوج کے سپاہیوں نے محاصرہ کرلیا۔ فوج اور انقلابیوں کے درمیان ہوئے ٹکراؤ میں 80 سے زیادہ فوجی اور بارہ انقلابی مارے گئے۔ سوریہ سین اور کچھ دوسرے انقلابی قریب کے گاؤں میں جا کر چھپ گئے۔ وہیں ان لوگوں نے فوجی دستے بنا کر سرکاری عملوں اور جائدادوں پر حملہ کرنا شروع کیا۔ گاؤں والوں نے جن میں زیادہ تر مسلمان تھے، حکومت کے بے انتہا ظلم کے باوجود، انقلابیوں کو پناہ اور کھانا دے کر تین سال تک مدد کی۔ آخرکار سوریہ سین 16 فروری 1933 کو گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور 12 جنوری 1934 کو وہ پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ ان کے بہت سے ساتھی پکڑ لیے گئے اور ان کو لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔

چٹاگاؤں فوجی اسلحہ خانہ پر کی گئی یورش کا بنگال کے لوگوں پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ''اس واقعہ نے انقلابی سوچ رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی اوران کی بہت بڑی تعداد مختلف انقلابی دستوں میں شامل ہوگئی''۔ 1930 میں انقلابی سرگرمیوں نے پھر سے زبردست زور پکڑا اور یہ سلسلہ 1931 سے 1932 تک چلتا رہا۔ جاں فروش نوجوانوں کی سرگرمیوں میں بے حد اضافہ ہوا۔ صرف مدناپور ضلع میں تین برٹش مجسٹریٹ قتل کردیے گئے۔ دو گورنروں پر قاتلانہ حملے ہوئے اور دو انسپکٹر جنرل آف پولیس مار ڈالے گئے۔ انھیں تین سالوں میں 22/افسران اور 22 غیر افسران موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

پہلے تو حکومت اسلحہ خانوں کی لوٹ سے گھبرائی اور خوفزدہ ہوئی مگر بعد میں وہ وحشیانہ انتقام پر اتر آئی۔ اس نے 20/انسدادی قوانین (Twenty Repressive Acts) لگا کر نیشنلسٹوں کو پست کرنے کے لیے پولیس کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ چٹاگاؤں میں کئی گاؤں پولیس کے ذریعہ جلا کر راکھ کردیے گئے اور تمام گاؤں والوں سے تعزیری جرمانہ وصول کیا گیا۔ عام طور سے دہشت کا راج قائم ہوگیا۔ 1937 میں جواہر لعل نہرو کو باغی قرار دے کر دو سال کے لیے قید کرلیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے کلکتہ میں اپنی تقریروں میں شہنشاہیت کی مذمت، انقلابی نوجوانوں کی بہادری کی تعریف، پولیس دہشت گردی اور زیادتی کی پرزور تنقید کی ہے۔

بنگال میں نئی انقلابی تحریک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نوجوان عورتوں نے کثیر تعداد میں حصہ لیا تھا۔ سوریہ سین کی قیادت میں یہ عورتیں انقلابیوں کو پناہ دینے، خبر رسانی کرنے اور اسلحوں کی حفاظت کا کام کرتی تھیں۔ پریتی لتا وڈیدار (Pritilata Waddedar) ریلوے انسٹی ٹیوٹ پر چھاپہ مارتے وقت ماری گئیں۔ کلپنا دت کو سوریہ سین کے ساتھ ہی گرفتار کیا گیا تھا اور ان کو عمر قید کی سزا دی گئی تھی۔ دسمبر 1931 میں کوملا (Comilla) کی دو اسکول لڑکیوں، شانتی گھوش اور سنیتی چودھری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو گولی سے بھون دیا تھا۔ فروری 1932 میں بینا داس (Bina Dass) نے کنووکیشن کے موقع پر ڈگری لیتے ہوئے گورنر پر بہت قریب سے گولی چلائی تھی۔

پرانے انقلابی تشدد پسندوں مثلاً بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ کی گئی

کارگزاریوں کی بہ نسبت چٹگاؤں بغاوت کہیں زیادہ زوردار تھی۔ انفرادی جوانمردی دکھانے اور قتل کے فرداً فرداً واقعات کرنے کے بجائے یہ بغاوت سیدھے کلونیل حکومت کے خاص حصوں پر متحدہ وار کرتی تھی، لیکن اس کا مقصد اب بھی صرف نوجوانوں کو اکسانا اور نوکرشاہی کو پست ہمت کرنا ہی ہوتا تھا جیسا کلپنا جوشی (دت) نے خود لکھا ہے کہ چٹگاؤں بغاوت کے بعد ''جب سرکاری فوجیں چٹگاؤں پر پھر سے کنٹرول کرنے آئیں گی تب انقلابی ان سے لڑتے ہوئے نام کمالیں گے۔ ان کی شہرت نوجوانوں کے لیے نمونہ بنے گی۔ وہ ان کی تقلید کرکے ان کی برابری کریں گے''۔ 2 یا جیسا سوریہ سین نے آنند گپتا سے کہا تھا ''جاں فروش نوجوانوں کے گروہ کو انفرادی جوانمردی دکھانے کے بجائے متحد ہوکر مسلح جدوجہد کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس مرحلہ میں ہم میں سے زیادہ تر لوگ نیک مقصد کے حصول کے لیے قربان تو ہوجائیں گے مگر ان کی یہ قربانی رائیگاں نہیں ہوگی''۔ 3

1920 اور 1930 کے دوران بنگال انقلابیوں کی ہندو مذہبیت میں تھوڑی سی کمی آگئی تھی۔ اب وہ مذہب کے نام پر حلف نہیں لیتے تھے۔ کچھ گروپ تو مسلمانوں کو بھی شامل کرنے لگے تھے۔ چٹگاؤں آئی۔آر۔اے (IRA) میں ستار، میر احمد، فقیر احمد میاں، تنو میاں (Tunu Mian) جیسے بہت سے مسلمان شامل تھے۔ چٹگاؤں کے پاس پڑوس گاؤں کے مسلم باشندے اس تنظیم کی ہر طرح سے پوری مدد کرتے تھے۔ اس کے باوجود اس طرح کی تنظیموں میں قدامت پسندی کے عناصر برابر بنے رہے اور سماج میں کوئی وسیع مالی نصب العین پروان نہ چڑھ سکا۔ خصوصاً انقلابی تشدد پسند افراد جو سوراج پارٹی میں کام کرتے تھے وہ زمینداروں کے خلاف مسلم کسان مزدوروں کی کوئی مدد نہ دے سکے۔

بھگت سنگھ اور ان کے انقلابی ساتھیوں نے پہلی بار اپنے ہم نواؤں کے سامنے انقلابی فلسفہ پیش کیا۔ انھوں نے انقلاب کا اصلی مقصد واضح کیا۔ یوں ایچ۔آر۔اے کے اندر ایک عرصہ سے انھیں باتوں پر دوبارہ سوچ بچار ہو رہا تھا۔ 1925 کے اس کے منشور میں یہ کہا گیا کہ ایچ۔آر۔اے۔ کا مقصد ان تمام سسٹم کی بیخ کنی کرنا ہے جن کے تحت ''ایک شخص دوسرے شخص کا استحصال کرتا ہے''۔4 اکتوبر 1924 میں اس کو قائم کرنے والی کونسل نے عوام کو سماجی انقلاب

اور کمیونزم کے اصولوں کو سمجھانے کا فیصلہ لیا تھا''[5] اس کے خاص اخبار دی ریوولوشنری (The Revolutionary) نے ریل اور نقل وحرکت کے دوسرے ذرائع اور اسٹیل اور جہاز بنانے جیسی بڑی صنعتوں کو قومیانے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ اس نے کسانوں اور مزدوروں کو تنظیم بنانے اور منظم و مسلح انقلاب کے لیے کام کرنے کا عہد کیا تھا''[6]

جیل کی کال کوٹھری سے رام پرساد بسمل نے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ ''پستول اور روالور رکھنے کی خواہش چھوڑ دیں''۔ ''انقلابی سازشوں میں حصہ نہ لیں'' اور ''کھلی تحریک چلائیں'' انھوں نے عوام سے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی اپیل کی اور کہا کہ ''سارے سیاسی گروپ کانگریس کے جھنڈے کے نیچے ایک ہو جائیں''۔ انھوں نے کمیونزم اور اس کے اصولوں میں اپنے یقین کی توثیق کرتے ہوئے کہا کہ ''قدرت کی پیدا کی ہوئی ساری چیزوں پر ہر شخص کا حق برابر ہے''[7]

بھگت سنگھ 1907 میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ انقلابی اجیت سنگھ کے بھتیجے تھے، غضب کے دانا و بینا تھے۔ کتابوں کے مطالعہ کے بے حد حریص۔ بھگت سنگھ اپنے وقت کے سبھی سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ ذی علم شخص تھے۔ انھوں نے لاہور کی دوارکا داس کتب خانہ میں سوشلزم و کمیونزم اور انقلابی تحریکوں خصوصاً روس، آئرلینڈ اور اٹلی پر دستیاب ساری کتابوں کو چھان ڈالا تھا۔ انھوں نے لاہور میں سکھ دیو وغیرہ کی مدد سے کئی مطالعہ حلقے (Study Circles) قائم کیے تھے جہاں سیاسی عنوان پر بحث و مباحثوں کا دور چلتا تھا۔ جب ایچ۔ ایس۔ آر۔ اے۔ کا دفتر آگرہ منتقل ہو گیا تب انھوں نے بر وقت ایک لائبریری قائم کی اور اس کے ممبران کو مطالعہ کرنے نیز سوشلزم وغیرہ کے انقلابی نظریات پر بحث و مباحثہ کرنے کے لیے رغبت دلائی اور ان کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ ان کی شرٹ کی جیبیں کتابوں سے پھولی رہتی تھیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کو پڑھنے کے لیے کتابیں برابر دیتے رہتے تھے۔ قید ہونے کے بعد انھوں نے جیل کو یونیورسٹی میں بدل دیا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کے سامنے انھوں نے انقلاب بپا کرنے میں فکر و خیال کا کیا کردار ہوتا ہے، اس کو واضح کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''انقلاب کی تلوار کو فکر کے پتھر پر رگڑ کر تیز کیا جاتا ہے''۔ 8 ایچ۔ ایس۔ آر۔ اے کے تمام لوگوں میں گہری فکر و سوچ اور عمیق

مطالعہ کا ماحول رچا بسا تھا۔ سکھ دیو، بھگوتی چرن ووہرا، شیو ورما، وجے سنہا اور یشپال سبھی اونچے درجہ کے دانشور تھے۔ یہاں تک کہ چندر شیکھر آزاد جن کو انگریزی بہت کم آتی تھی، کسی بات کو اس وقت تک نہیں مانتے تھے جب تک وہ اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے تھے۔ بحث کے ذریعہ ہی وہ معاملات کی باریکیوں تک پہنچتے تھے۔ آزاد کے کہنے پر اور ان سے سیر حاصل مباحثہ کے بعد ہی بھگوتی چرن ووہرا نے ''بم کا فلسفہ'' (The Philosophy of Bomb) نام کا مشہور و معروف مسودہ تیار کیا تھا۔

انفرادی جواں مردی اور تشدد (دہشت گردی) کے کاموں سے بھگت سنگھ کا عقیدہ گرفتاری کے پہلے 1929 میں ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ مارکسزم میں یقین کرنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عام اور وسیع انقلاب کے ذریعہ ہی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عوام ہی عوام کے لیے انقلاب لا سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے 1926 میں ''پنجاب نوجوان بھارت سبھا'' کے قیام میں اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ اس کے بانی سکریٹری بھی تھے۔ یہ انقلابیوں کی کھلی تنظیم تھی۔ اس کا مقصد نوجوانوں'' کسانوں اور مزدوروں کے درمیان سیاسی کام کرنا اور ان کو منظم و متحد کرنا تھا۔ اسی غرض سے گاؤں گاؤں میں اس کی شاخیں کھولی جاتی تھیں۔ اسی تنظیم کے تحت منعقد جلسوں میں بھگت سنگھ میجک لالٹین سلائڈ کی مدد سے سیاسی تقریریں کرتے تھے۔ بھگت سنگھ اور سکھ دیو نے طلبا کے درمیان کھلے طور پر کام کرنے کے لیے ''لاہور طلبا یونین کی تشکیل کی تھی۔

1929 سے 1931 کے دوران عدالت کے اندر اور باہر بھگت سنگھ اور ان کے کامریڈ ساتھیوں نے جو باتیں کہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ انقلاب چاہنے والے لوگوں کو اہل علم طبقہ کی قیادت میں سماج کے لٹے پٹے، دبے کچلے اور غریب طبقوں کو منظم کر کے ان کی ترقی کے لیے جد و جہد کرنا چاہیے۔ پھانسی کے پھندے کو پہننے کے تھوڑی دیر پہلے انھوں نے اعلان کیا کہ ''انقلابی فوجیں تو گاؤں اور کارخانوں میں رہتی ہیں''[9] اس کے علاوہ 2/فروری 1931 کو نوجوان سیاسی کارکنوں کو حکم جاری کرتے ہوئے واضح کیا کہ ''یوں تو میں نے دہشت گردی کی طرح کام کیا ہے مگر میں دہشت گرد نہیں ہوں.........میں پورے زور شور سے کہتا ہوں کہ ''شاید شروع

کی انقلابی زندگی کو چھوڑ کر میں نہ دہشت گرد ہوں اور نہ کبھی تھا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ ان طریقوں سے ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے'' 10

پھر تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ بھگت سنگھ اور ان کے کامریڈ ساتھیوں نے انفرادی طریقے سے تشدد کا بہادرانہ کام کیوں اختیار کیا؟ اس کی ایک وجہ تو تیزی سے بدلتی ہوئی سوچ تھی۔ ماضی سے ہی ان کا حال بنا تھا۔ ان نوجوانوں کو دسیوں سال کے کام کو تھوڑی ہی مدت میں کرنا تھا۔ اس کے علاوہ کسی نئے نظریہ کے اثرانداز ہونے میں کافی وقت لگتا ہے۔ یہ تبدیلی مذہب کی طرح نہیں ہے۔ اس کو تو لمبے تاریخی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس وقت وہ بڑی الجھن میں تھے۔ ان کو سب سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ ایسے ضروری کارکن کہاں سے لائے جائیں جو اپنا گھربار چھوڑ کر پوراوقت عوام کے درمیان سیاسی کام میں لگا سکیں۔ اور پھر ان کی بھرتی کیسے کی جائے؟ اس کے علاوہ ان کو پورا احساس تھا کہ سیاسی بیداری کے ان کے کام کانگریس کی ہی طرح دھیمی رفتار سے ہو رہے ہیں۔ یہ انقلابی نوجوان اس کام کو کانگریس سے آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ ان سب کاموں کے لیے ان کے پاس ایک ہی چارہ تھا کہ وہ اپنے قول وفعل سے نوجوانوں کو گرویدہ کریں۔ جواں مردی کے حیرت انگیز کام ڈرامائی انداز میں کریں اور عدالت کے سامنے مسلسل مجاہدانہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ انقلابی نوجوانوں کی جماعت بنا کر بہادری کے غیر معمولی مظاہرے کر کے عوام میں جوش وجذبہ پیدا کریں۔ 31-1930 کے آخری دور میں یہ لوگ جیل کی سزا جھیلتے ہوئے اپنے کامریڈوں کی قربانی کی بہادرانہ عظمت کو پہلے کی طرح بنائے رکھنے کے لیے خاص طور سے برسر جنگ رہتے تھے۔ بھگت سنگھ نے خود لکھا ہے کہ ان کو نوجوانوں سے یہ اپیل کرنی پڑی کہ ''وہ دہشت گردی کا راستہ چھوڑ دیں مگر یہ خیال رہے کہ موت کو گلے لگانے والے مجاہدین کی قربانی پر آنچ نہ آنے پائے'' 11 زندگی کو تو دیر یا سویر سیاست کا صحیح راستہ مل ہی جائے گا، لیکن ایثار وقربانی کا احساس اگر کبھی ختم ہو گیا تو دوبارہ اس کو پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک انقلاب کا مفہوم بہت وسیع تھا۔ اب انقلاب کا مطلب صرف جنگ وجدل یا تشدد نہیں رہ گیا تھا۔ اس کا پہلا مقصد شہنشاہیت ختم کرنا اور اس کی جگہ نیا سوشلسٹ نظام قائم کرنا تھا جہاں ''انسان کے ذریعہ انسان کا استحصال بند ہو''

فلسفۂ بم (The Philosophy of Bomb) کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ''اس کا مقصد ایسا معاشرتی ڈھانچہ تیار کرنا ہے جہاں ہر طرح کی سماجی، سیاسی، معاشیاتی آزادی حاصل ہو اور جس میں سیاسی اور معاشیاتی استحصال قطعی ناممکن ہو''۔ 13 اسمبلی بم کیس میں بھگت سنگھ نے عدالت میں کہا تھا کہ ''انقلاب کے لیے خون خرابہ ضروری نہیں ہے، ذاتی دشمنی کے لیے بھی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے، بم و پستول کا بھی یہ دین نہیں ہے۔ انقلاب سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ سماج کا موجودہ نظام جو ناانصافی پر قائم ہے، بدلنا ہی چاہیے''۔ 14 جیل سے بھیجے گئے ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ ''کسانوں کو صرف بدیسی حکومت سے ہی نہیں بلکہ زمیندا روں اور سرمایہ داروں سے بھی خود کو آزاد کرانا چاہیے''۔ 15 13/مارچ 1931 کو انھوں نے اپنے آخری پیغام میں اعلان کیا کہ ''جب تک مٹھی بھر لوگ عوام کی مشقت کا اپنے فائدے کے لیے استحصال کرتے رہیں گے، ہندستان میں اس کے خلاف جدوجہد جاری رہے گی۔ اس سلسلہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ استحصال کرنے والے خالص انگریز سرمایہ دار ہیں یا مشترکہ طور سے انگریز اور ہندستانی ہیں یا پوری طرح ہندستانی ہی ہیں''۔ 16 بھگت سنگھ نے سائنٹفک طریقے سے سوشلزم کا مطلب واضح کیا کہ ''اس کا مطلب ہے سرمایہ داری اور طبقاتی تسلط کا پوری طرح خاتمہ۔ 17 دراصل بھگت سنگھ انقلاب کرنے والے نہیں بلکہ اس کے پیش رو اور نقیب تھے۔ ہندوستان میں سوشلسٹ تحریک کے مبتدی کی حیثیت سے وہ سوشلزم اور کمیونزم کے مبلغ تھے۔

بھگت سنگھ نے سیاسی حلقوں کو دو نئی باتیں بتائی تھیں۔ مکمل سیکولر ذہن رکھنے کے ناتے اپنے بہت سارے ہم عصر لوگوں سے زیادہ وہ اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ قوم اور قومی تحریک کو فرقہ واریت سے بڑا خطرہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کلونیل حکومت کی طرح فرقہ واریت قوم کا دشمن ہے۔

اپریل 1928 میں نوجوانوں کی کانفرنس میں جہاں نوجوان بھارت سبھا، دوبارہ منظم ہو رہی تھی، بھگت سنگھ اور ان کے کامریڈوں نے پورے شد و مد سے فرقہ واریت کی مخالفت کی تھی۔ بھگت سنگھ نے کہا تھا کہ مذہبی تنظیموں کے نوجوان اس کے ممبر نہیں بن سکتے۔ انھوں نے کہا کہ مذہب آدمی کا ذاتی مشغلہ ہے اور فرقہ واریت انسان کا دشمن ہے۔18 اس سے پہلے 1927 میں انھوں نے فرقہ وارانہ خونریزی کو بربریت بتایا تھا اور اس کی مذمت کی تھی انھوں نے واضح کیا

کہ کوئی متعصب فرقہ پرست قاتل صرف اس لیے گنہگار نہیں ہوتا ہے کہ اس نے ایک شخص کا قتل کیا ہے بلکہ اس لیے کہ اس کا مقتول کوئی ہندو، مسلم یا سکھ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ نوجوانوں کی ایک نئی نسل ابھر رہی ہے جو مذہبی اعتبار سے آدمی میں فرق نہیں کرتی۔ وہ تو سب سے پہلے کسی شخص کو انسان مانتی ہے اور بعد میں ہندستانی۔19

بھگت سنگھ لالہ لاجپت رائے کی بڑی عزت کرتے تھے، لیکن جب لالہ لاجپت رائے نے اپنی زندگی کے آخری وقتوں میں فرقہ وارانہ سیاست کا راستہ اختیار کیا تو انھوں نے ان کو بھی نہیں بخشا۔ انھوں نے ان کے خلاف سیاسی اور نظریاتی مہم شروع کی۔ 20 چونکہ لالہ لاجپت رائے بہت معزز لیڈر تھے، عام پبلک کے سامنے بھگت سنگھ ان کی شان میں سخت الفاظ استعمال نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک پرچے کی شکل میں انھوں نے براوننگ (Browning) کی مشہور نظم ''گم لیڈر'' (The Lost Leader) چھاپا۔ اس نظم میں براونگ نے ورڈس ورتھ (Wordsworth) کا آزادی مخالف ہو جانے کی وجہ سے تنقید کی تھی۔ نظم کا مطلع یہ ہے ''چاندی کے چند سکوں کی خاطر انھوں نے ہم کو چھوڑ دیا (Just for a handful of silver, he left us) اسی نظم کے کچھ اور جملے اس طرح ہیں''۔ ''ان کے بغیر ہم خوشحالی کی طرف بڑھیں گے'' ''ان کی راگنی کے بغیر نظمیں ہم کو حوصلہ دیتی رہیں گی'' اور ''ان کا نام مٹا دو، پھر ایک اور گم آدمی کا نام لکھ لو''۔ اس پرچے میں لالہ لاجپت کے نام پر کہیں تنقید نہیں کی گئی تھی، صرف کور (Cover) پر سامنے ان کا فوٹو چھاپا گیا تھا۔

نوجوان بھارت سبھا'' کے چھ اصول جس کو بھگت سنگھ نے تیار کیے تھے ان میں سے دو اس طرح تھے'' ایسی فرقہ وارانہ تنظیمیں یا پارٹیاں جو فرقہ واریت پھیلاتی ہیں، ان سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہ رکھیے۔ اور اس لیے مذہب کو ذاتی معاملہ مانتے ہوئے عوام کے درمیان محبت اور رواداری کا ماحول پیدا کیجیے۔ 21

بھگت سنگھ لوگوں کو مذہب کی ذہنی غلامی اور اوہام پرستی سے آزاد کرنے پر زور دیتے تھے۔ اپنی موت سے چند ہفتے پہلے انھوں نے ایک مضمون ''میں ملحد کیوں ہوں؟'' لکھا تھا۔ انھوں نے خود ملحدانہ راستہ تلاش کیا تھا۔ انھوں نے واضح کیا کہ سکھ مذہب سے ان کا عقیدہ اٹھ گیا اور آخر

میں خدا کے وجود سے بھی ان کا عقیدہ جاتا رہا۔ وہ کہتے تھے کہ انقلابی ہونے کے لیے کسی بھی شخص میں زبردست اخلاقی قوت ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ اس کے اندر آزاد سوچ اور تنقیدی صلاحیت کی بے حد ضرورت ہے۔ ذاتی آزادی کی جدوجہد کے لیے انسان کو مذہب کے تنگ نظریہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ خدا کے وجود کے عقیدہ کے خلاف جنگ کرنا پڑے گا۔ انھوں نے لکھا کہ ''کوئی شخص جو ترقی کرنے کا خواہشمند ہے اس کو قدیم مذہب کے ہر ایک جز کی تنقید کرنا، اس میں یقین نہ کرنا، اور اس کو چیلنج کرنا پڑے گا۔ موجودہ مذہب کے ایک ایک جز کو باری باری سے مکمل طور سے منطق کی کسوٹی پر رکھ کر جانچنا پڑے گا۔ الحاد اور مادیت پر جے اپنے عقیدہ کا زوردار لفظوں میں انھوں نے اعلان کیا کہ ''ایک بہادر انسان کی طرح، اپنا سر اونچا کر کے، آخر وقت تک، یہاں تک کی پھانسی پر چڑھنے تک میں اپنے عقیدہ پر ڈٹے رہنے کی کوشش کرتا رہوں گا''[22]

حکومت کی ظالمانہ کارروائی سے انقلابی جنگجوؤں کی کثیر تعداد دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔ فروری 1931 میں الہ آباد کے ایک پارک میں ٹکراؤ کے دوران چندر شیکھر کے مارے جانے کے بعد پنجاب، یوپی اور بہار میں انقلابی تحریک کا قریب قریب خاتمہ سا ہو گیا۔ سوریہ سین کی شہادت سے بنگال میں مجاہدانہ جدوجہد کا لمبا شاندار باب بند ہو گیا۔ اس مسئلہ پر جیلوں میں پڑے اور انڈمان میں سزا بھگت رہے لوگوں نے پھر سے غور وخوض کرنا شروع کیا۔ زیادہ تر انقلابی مارکسسٹ ہو گئے اور عوام کے ذریعہ سوشلسٹ انقلاب میں یقین کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ نے کمیونسٹ پارٹی، کچھ نے انقلابی سوشلسٹ پارٹی اور کچھ دوسرے لوگ بائیں بازو کی دوسری پارٹیوں میں شامل ہو گئے۔ بہت سارے لوگوں نے گاندھی جی کی قیادت والی کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔

انقلابی تشدد پسندوں کی سیاست میں کئی کمزوریاں تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کی سیاست عوامی تحریک کی سیاست نہیں بن پائی تھی۔ وہ عوام کو سیدھے سیاست میں سرگرم اور متحرک کرنے میں ناکام رہے۔ عوام سے ان کا سیدھا تعلق نہ جڑ سکا۔ اس کے باوجود جنگِ آزادی میں ان کا رول بہت اہم ہے۔ ان کی وطن پرستی، ہمت و استقلال اور جذبہ قربانی نے لوگوں کو بے پناہ حوصلہ دیا تھا۔ انھوں نے لوگوں میں قومی بیداری پیدا کی اور شمالی ہندوستان میں سوشلزم کی اشاعت انھیں کے باعث ہوئی تھی۔

باب۔21

منڈلاتا طوفان

1922 میں عدم تعاون تحریک کے ختم کے ہونے کے بعد قومیت کی مشعل جلائے رکھنے میں جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا تھا ان میں خاص لوگ یہ تھے: گاندھی جی کے چیلے جو دور دراز گاؤں میں سماج سیوا کے کام میں لگے تھے، وہ سوراجی جنھوں نے اسمبلیوں میں سرکار کو ایک پیر پر کھڑا کر دیا تھا، آندھرا صوبہ کے بہادر کویا آدواسی جنھوں نے رام چندر راجو کی قیادت میں 24-1922 کے دوران کلونیل حکومت کو سخت ٹکر دی تھی، پنجاب کے اکالی ستیہ گرہی جو 1923 میں قومی جھنڈے کی آبرو بچانے کے لیے ناگپور میں جمع ہوئے تھے اور ان کے علاوہ وہ انگنت ہندستانی جنھوں نے الگ الگ تنظیموں کی نظریات اور تحریکی سرگرمیوں میں ہر ایک سطح پر خود کو جھونک رکھا تھا۔

لیکن 1927 کے آخری دور میں سلطنت مخالف عام تحریک نے زور پکڑا۔ 1919 کے رولٹ ایکٹ کی طرح 8 نومبر 1927 کے اعلان نے لوگوں کو مجتمع اور متحرک کر دیا تھا۔ اس کمیشن کے سارے ممبران انگریز تھے۔ اسی لیے اس کو آل وائٹ کمیشن کہا گیا تھا۔ اس کمیشن کا مقصد یہ سفارش کرنا تھا کہ کیا ہندستان اس لائق ہو گیا ہے کہ اس کو اور زیادہ آئینی اختیارات دیے

جائیں اور اگر ہاں، تو اس کا روپ کیا ہو؟ ہندستانی نیشنلسٹوں نے بہت پہلے ہی اس مسئلہ کو اٹھایا تھا کہ 1919 کا رفارم ایکٹ کوتاہ اور ناقص ہے اور وہ زور وشور سے آواز اٹھاتے آرہے تھے کہ دوبارہ اس ایکٹ پر غور کر کے اس کے نقص کو دور کیا جائے۔ لیکن حکومت اڑی تھی کہ دس سال گذرنے کے بعد ہی اس پر غور کیا جائے گا۔ پھر بھی 1927 میں انگلینڈ کی قدامت پسند (Conservative) حکومت کو یہ محسوس ہوا کہ ہونے والے انتخابات میں مزدور پارٹی سے وہ ہار سکتی ہے۔ اس لیے اس نے یکا یک یہ طے کیا کہ اہم مسائل جو برٹش سلطنت کے مستقبل سے جڑے ہیں کو ناتجربہ کار مزدور پارٹی (Labour Party) کے سہارے نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہندستانی قانونی کمیشن (Indian Statutory Commission) جس کو بعد میں اس کے چیئرمین کے نام پر سائمن کمیشن موسوم کیا گیا، وجود میں آیا۔

پورے ملک میں مجموعی طریقے سے اس کا ردعمل ہوا۔ لوگوں نے حکومت کے اس قدم کو اپنے لیے توہین کا باعث سمجھا کہ جس کمیشن کو ہندوستان کا مستقبل طے کرنا ہے اس کا ایک بھی ممبر ہندستانی نہیں ہے۔ اعتدال پسند بھی اس توہین کو برداشت نہ کر سکے۔ اس لیے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ اس کی تائید باقاعدہ تیج بہادر سپرو کی لبرل فیڈریشن، انڈسٹیریل اینڈ کامرسیل کمیشن، ہندومہاسبھا، مسلم لیگ کے بڑے حصہ کے لیڈر محمد علی جناح نے کی۔

لیکن انڈین نیشنل کانگریس وہ تنظیم تھی جس نے اس بائیکاٹ کو عوامی تحریک کا روپ دیا۔ دسمبر 1927 میں مدراس میں ہوئے اپنے سالانہ اجلاس میں کانگریس نے بائیکاٹ کا مکمل اعلان کیا۔ ماحول اتنا جذباتی اور ہیجان سے بھرا تھا کہ جواہر لعل نہرو نے ایک تجویز رکھی کہ کانگریس کا مقصد مکمل سوراج ہے اور یہ مخالفت صرف تجویز رکھنے تک ہی محدود نہیں ہے۔ 12/ جنوری 1928 کو گاندھی جی نے ''ینگ انڈیا'' میں بائیکاٹ کا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ کہا جاتا ہے کہ آزادی کا ریزولوشن ہی معقول جواب ہے............ کمیشن کی تقرری کو مناسب جواب ملنا چاہیے، اس کا جواب بہادرانہ تقریروں اور اعلانات میں نہیں ہے، اس کے لیے مناسب کارروائی درکار ہے''[1]

اور 3 فروری 1928 کو جیوں ہی سائمن اپنے دوستوں کے ہمراہ بمبئی میں اترا،

کارروائی شروع ہوگئی۔اس روز سبھی خاص شہروں اور قصبوں میں مکمل ہڑتال رہی اور لوگوں نے جلوسوں میں حصہ لیا، کالے جھنڈے دکھائے گئے ۔ مدراس میں پولیس اور جلوس کے درمیان ٹکراؤ ہوگیا۔ پولیس نے گولی چلائی اور ایک آدمی کی جان گئی۔ جائے حادثہ پر جب ٹی۔ پرکاشم کو جانے سے روکنے کے لیے پولیس نے ناکام کوشش کی تب وہ سینہ کھول کر مسلح پولیس کے سامنے کھڑے ہوگئے ۔اس طرح انھوں نے بروقت لوگوں کی طرف سے حکومت کو چیلنج کیا۔ سائمن جہاں بھی گیا............کلکتہ، لاہور، لکھنؤ، وجے واڑہ، پونا ہر جگہ لوگوں نے کثیر تعداد میں کالے جھنڈے دکھا کر اس کا استقبال کیا۔ ہر لمحہ مخالفت کے نئے نئے طریقے نکالے جاتے رہے۔ مثلاً پونا کے نوجوان ایک ٹرک پر سوار ہو کر لون والا (Lonavala) سے پونا تک کالا جھنڈا دکھاتے ہوئے ٹرین کے ساتھ ساتھ گئے جس میں سائمن اپنے ممبروں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔لون والا اور پونا تک ریل لائن سڑک سے صاف صاف دکھائی پڑتی تھی۔لکھنؤ میں خلیق الزماں نے اپنی شاندار سوجھ کا ثبوت دیا۔ قیصر باغ لکھنؤ میں تعلقداروں کی طرف سے سائمن اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کیا گیا تھا۔ ایسے موقع پر خلیق الزماں نے غباروں اور پتنگوں کے اوپر معروف نعرہ ''سائمن واپس جاؤ'' لکھ کر ہوا میں اڑایا[2]

اس کی مخالفت میں لوگوں نے جتنا ہی اپنے ذوقِ تمسخر اور عمل کا ثبوت دیا اتنی ہی سختی سے پولیس نے ان سے معاملہ کیا۔ پولیس لاٹھی چارج تو عام بات ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ بزرگ اور معزز نیتاؤں تک کو نہیں بخشا جاتا تھا۔لکھنؤ میں جواہر لعل نہرو اور گووند بلبھ پنت کو پولیس نے بری طرح پیٹا۔سب سے سنگین اور خراب واقعہ پنجاب کے تشدد پسند لیڈر لالہ لاجپت رائے کے ساتھ ہوا۔ ان کو پولیس کی لاٹھی سے 30/اکتوبر کو سینہ میں شدید چوٹ لگی۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور 17/نومبر 1928 کو چل بسے۔انھیں کی موت کا بدلہ لینے کے لیے بھگت سنگھ اور ان کے کامریڈوں نے دسمبر 1928 میں انگریز پولیس افسر سینڈرس کو قتل کر دیا تھا۔

سائمن کمیشن نے نوجوان نسل کو سیاست کے میدان میں کام کرنے کا ابتدائی تجربہ فراہم کیا۔نوجوانوں نے ہی کمیشن کی مخالفت میں اہم کردار ادا کیا اور انھوں نے ہی قومی تحریک کو مجاہدانہ شکل دی۔ یوں تو 1927 سے ہی نوجوانوں کی تحریک رنگ لانے لگی تھی مگر سائمن کمیشن کے

بائیکاٹ سے نوجوانوں میں زوردار تنظیمیں اور لیگیں بننے لگیں۔تحریک کی اس لہر میں نوجوانوں اور طلبا کے درمیان جواہر لعل نہرو اور سبھاش چندر بوس نیتا کی حیثیت سے منظر عام پر ابھرے۔ان لوگوں نے پورے ملک کا دورہ کیا، ہزاروں نوجوان سبھاؤں کو خطاب کیا اور انگنت کانفرنسوں کی صدارت کی۔

نوجوانوں کی اس تحریک نے سوشلزم اور انقلابی رجحانات کے لیے زمین تیار کی۔ سوشلسٹ نظریات تھوڑے دنوں سے ہندوستان کی طرف آنا شروع ہوئے تھے۔ جواہر لعل نہرو بروسیلس (Brussels) میں منعقد شہنشاہیت مخالف کانگریس آف لیگ (Congress of League Against Imperialism) کی نمائندگی کر کے یورپ سے 1927 میں لوٹے تھے۔انھوں نے روس کا بھی دورہ کیا تھا اور وہ سوشلسٹ نظریہ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے نوجوانوں کو ہی اپنے ابھرتے ہوئے نظریات میں شریک کیا تھا۔یوں تو جواہر لعل نہرو کا کردار سوشلسٹ نظریہ کو مقبول عام بنانے میں سب سے اہم تھا مگر دوسرے اور لوگوں اور گروپوں کا رول کم نہیں تھا۔سبھاش چندر بوس ایسے ہی وہ شخص تھے جنھوں نے اس سلسلہ میں انتھک محنت کی حالانکہ سوشلزم کے بارے میں ان کا نظریہ اتنا سائنسی اور صاف نہیں تھا جتنا جواہر لعل نہرو کا تھا۔دوسرے تمام گروپوں میں زیادہ اہم لاہور کا ''نوجوان بھارت سبھا'' گروپ تھا۔اس کے علاوہ کیمونسٹوں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے گروپ تھے جنھوں نے ''ورکرس اور پیزینٹس'' (Workers and Peasants) پارٹیاں بنائی تھیں۔ ان سب کا مقصد کسانوں اور مزدوروں کو متحد کرنا اور کانگریس تحریک کو اندر اندر تیز کرنا تھا۔اس طرح جو نوجوان سلطنت مخالف تحریک میں حصہ لے رہے تھے وہ سوشلزم کے تئیں ہمدرد ہوتے جارہے تھے۔کچھ علاقوں میں تو ان نوجوانوں کے گروپوں نے کسان مزدوروں کی جدوجہد سے اپنا ناتہ جوڑ لیا تھا۔

سائمن کمیشن کا تقرر کرنے والا کنزرویٹیو سکریڑی آف اسٹیٹ (Conservative Secretary of State) لارڈ برکن ہیڈ (Lord Birkenhead) بھی برابر یہی راگ الاپ رہا تھا کہ ہندوستانیوں میں ایسی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ دستور سدھار کے لیے کوئی ٹھوس اسکیم بنا سکیں۔اس کے اسی چیلنج کو مدنظر رکھ کر ایک اسکیم کو آخری شکل دینے کے لیے فروری، مئی اور اگست 1928 میں سبھی پارٹیوں کی مشترکہ کانفرنس منعقد ہوئی۔یہی اسکیم موتی لعل نہرو

کے نام پر نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ وہی اس رپورٹ کے خاص مصنف تھے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ ہندوستان کے لیے ''ڈومینین اسٹیٹس (Dominion States) کی سرکاری ہونی چاہیے۔ اس میں ووٹ دینے کی مانگ کو نامنظور کردیا جس کی بنیاد پر پچھلے آئینی سدھار کیے گئے تھے۔ اس میں سفارش کی گئی کہ مرکز اور صوبوں کی ان جگہوں پر جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں ان کی سیٹیں محفوظ ہوں گی۔ مگر جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں اس کا کوئی جواز نہ ہوگا۔ اس رپورٹ میں کچھ دوسری باتوں کی بھی سفارش کی گئی تھی مثلاً عام بالغ رائے دہی، عورتوں کو مساوی حقوق، یونین بنانے کی آزادی اور سیاست سے مذہب کی علاحدگی وغیرہ باتیں شامل تھیں۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ خود کو ہر طرح سے ان سفارشوں سے الگ رکھے ہوئے تھا۔ سال کے آخری دنوں میں یہ بات ایک دم صاف ہوگئی کہ محمد علی جناح مسلمانوں کے جس طبقہ کی قیادت کررہے ہیں وہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں بھی سیٹوں کو محفوظ کرنے والی مانگ کو چھوڑنے والا نہیں ہے۔ سوتی لعل نہرو اور دوسرے سیکولر لیڈر بڑی الجھن میں تھے کیونکہ مسئلہ کا حل نکلنا آسان نہیں تھا۔ اگر مسلمان فرقہ پرستوں کی بات مان لی جاتی تو ہندو فرقہ پرست ناراض ہوکر الگ ہوجاتے اور اگر اس کے برعکس کیا جاتا تو مسلمان فرقہ پرست ویسا ہی کرتے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو کوئی خصوصی رعایت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناح نے خود کو اس رپورٹ سے الگ کرکے چودہ مانگوں کی ایک فہرست پیش کی۔ دراصل ان مانگوں میں انھوں نے نہرو رپورٹ کے بارے میں اپنے اعتراضات ہی دوہرائے تھے۔

جواہر لعل نہرو کی قیادت میں نوجوانوں اور انتہا پسند انقلابیوں نے نہرو رپورٹ پر الگ طرح کا اعتراض کیا۔ ان کو برٹش سلطنت کے زیر تسلط خود مختار ریاست (Dominion State) کی طرز پر ہندوستان کو خود مختار ریاست اعلان کرنا ناپسند تھا۔ ان کا نعرہ تھا مکمل آزادی اور اس کے لیے ان کی جنگ بھی دسمبر 1928 میں کلکتہ میں ہوئے کانگریس کے سالانہ اجلاس سے شروع ہوگئی۔ جواہر لعل نہرو سبھاش چندر بوس اور ستیہ مورتی جیسے نمائندوں کی کثیر تعداد کی تائید وحمایت سے ''پورن سوراج (Purna Swaraj) یعنی مکمل آزادی حاصل کرنا کانگریس کا اصل مقصد قرار پایا۔ گاندھی جی موتی لعل نہرو اور کئی دوسرے بزرگ لیڈر یہ محسوس کرتے تھے

کہ بڑی مشکل سے ''ڈومینین اسٹیٹس'' (خودمختار ریاست کا درجہ) پر قومی رضا حاصل کی گئی ہے۔ اس کو اس طرح کی جلد بازی کر کے کھونا نہیں چاہیے اور اس کو منظور کرنے کے لیے حکومت کو کم سے کم دو سال کی مہلت دی جانی چاہیے۔ بہر حال یہ مدت دباؤ ڈال کر ایک سال کروائی گئی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ کانگریس نے یہ طے کیا کہ اگر حکومت ملک کو ''ڈومینین اسٹیٹس'' سال کے آخر تک منظور نہیں کرتی ہے تو کانگریس مکمل آزادی ہی نہیں بلکہ سول نافرمانی تحریک کو اپنا اصلی مقصد بنائے گی۔ اسی کے لیے قرارداد پیش کی گئی جس کی نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ تائید ہوئی۔ فوری طور پر ''پورن سوراج'' یعنی مکمل آزادی والی تجویز گر گئی۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر مہلت کے ایک سال گذر جانے پر سول نافرمانی تحریک چلانی ہے تو اس کے لیے پہلے سے تیاری کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے 31 رجنوری 1929 کے ''ینگ انڈیا'' میں واضح کیا کہ ''میں تو سوچتا ہوں اگر میں اس وقت یورپ چلا گیا (جیسا میرا پروگرام ہے) تو یہ لوگوں کے ساتھ دھوکا ہوگا، ان کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ میرے سامنے جو بھی دشواریاں آئیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے جم کر تیاری ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ پورے غور وفکر سے منصوبہ بنانا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سارے ممکن طریقے بھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ مجھے اگلے سال کی جدو جہد، اس کی چاہے جو شکل ہو، کے لیے تیار بھی رہنا چاہیے''3

گاندھی جی لوگوں کو مستقبل میں کی جانے والی جدو جہد کے لیے کئی طرح سے تیار کر رہے تھے۔ جیل سے میڈیکل بنیاد پر چھوٹنے کے بعد اسی غرض سے وہ برابر پورے ملک کا دورہ کرتے رہے۔ 1929 کی ابتدا تک انھوں نے کاٹھیاواڑ، سینٹرل صوبوں، بنگال، ملابار، بہار، یوپی، کچھ، آسام، مہاراشٹر، کرناٹک، تمل ناڈ اور اڑیسہ کا دورہ کر ڈالا۔ ان میں سے کئی جگہوں پر وہ دو دو بار گئے۔ 1929 میں اپنی زندگی کے ساٹھویں سال وہ سندھ گئے پھر دہلی ہوتے ہوئے کلکتہ اور وہیں سے برما اور برما سے پھر کلکتہ آگئے۔ اسی سال اپریل میں انھوں نے آندھرا کے 319 گاؤں کا دورہ کیا۔ جون میں یوپی کی الموڑہ پہاڑیوں پر پہنچ گئے اور ستمبر میں یوپی کے میدانی علاقوں کو چھان مارا۔ سال کے آخر میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں حصہ لینے

کے لیے وہ لاہور پہنچے۔ انھوں نے شمالی مغربی سرحدی صوبہ کوہاٹ (Kohat) جانے کا پروگرام بنایا مگر حکومت نے ان کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دی۔

گاندھی جی نے اپنے دورہ کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا ہے۔ ''میں صرف اس لیے دورے کرتا ہوں کہ عوام مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں مجھ کو بھی عام لوگوں سے ملنا چاہیے۔ میں مختصر اور سادے لفظوں میں ان کو اپنا پیغام دیتا ہوں۔ ہم دونوں ہی مطمئن ہوتے ہیں۔ میری بات دھیرے دھیرے مگر یقیناً ان کے دل و دماغ میں سرایت کر جائے گی'' 4

1929 کے پہلے گاندھی جی اپنے دوروں میں اصلاحی کاموں مثلاً چھوا چھوت خاتمہ، کھادی کے استعمال اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے آرہے تھے۔ اب انھوں نے عوام کو سیدھے سیاسی کارروائی کے لیے تیار کرنا شروع کیا، مثلاً انھوں نے سندھ کے نوجوانوں سے اگنی پریکشا (Fiery ordeal) کی تیاری کے لیے کہا اور انھیں کے اشارے پر عوام کے ذریعہ بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی اور بائیکاٹ کے اس پروگرام کو جارحانہ سطح پر کرنے کے لیے کانگریس کی مجلس انتظامیہ (Congress Working Committee) نے بدیسی کپڑا بائیکاٹ کمیٹی (Foreign Cloth Boycott Committee) کی تشکیل کی۔ کلکتہ میں 4 مارچ 1929 کو کئی ہزار لوگوں کے مجمع کے سامنے بدیسی کپڑوں کو جلا کر گاندھی جی نے مہم کی شروعات کی۔ حکومت نے ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا مگر پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کو باہر جانے کی اجازت دے دی گئی اس شرط پر کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ حکومت کے اس ارادے پر پورے ملک میں بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ برما سے لوٹنے پر جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو عوام کے ذریعہ دوبارہ حکومت کو چیلنج دینے کے لیے بدیسی کپڑے پھر جلائے گئے۔ گاندھی جی نے لوگوں کو سمجھایا کہ یوں تو سول نافرمانی کے لیے ان کو ہر طرح سے پوری تیاری کرنی چاہیے مگر یہ بات بھی ان کو یاد رکھنی چاہیے کہ سول نافرمانی تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو ان کو قانون کے دائرے سے باہر نہیں جانا چاہیے۔

کانگریس کے ذریعہ الگ الگ سطح پر کی جارہی تیاریوں کے علاوہ دوسرے سنسنی خیز واقعات بھی ملک میں ہورہے تھے، ان سب نے 1929 میں سیاسی سرگرمی بنائے رکھا۔

20/مارچ 1929 کو حکومت نے اکتیس مزدور لیڈروں کو آناً فاناً گرفتار کر لیا۔ ان میں زیادہ تر کمیونسٹ تھے۔ ان کو یو پی میں میرٹھ لے جا کر ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان کی گرفتاری کی مذمت گاندھی جی، کانگریسی اور قومی تحریک کے سبھی خیموں نے ایک زبان سے کی۔ نوجوانوں کی تنظیموں نے احتجاجی جلوس نکالے۔ 8/اپریل 1929 کو ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی (HSRA) کے بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت (Batukeshwar Dutt) نے لیجسلیٹو اسمبلی میں غیر نقصان دہ بم پھینکا۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ جیل میں 8/اپریل 1929 کو ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی (HSRA) کے ممبران بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ ان کی مانگ تھی سیاسی قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔ ان بھوک ہڑتالیوں میں ایک قیدی جتن داس (Jatin Das) کی 64ویں روز ستمبر میں موت ہوگئی۔ ان کی موت پر ملک میں کچھ اس طرح غیر معمولی بڑے بڑے مظاہرے ہوئے جیسے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔

انگلینڈ میں اسی درمیان مئی 1929 میں رمزے میکڈونالڈ (Ramsay Mac Donald) کی قیادت میں لیبر پارٹی (Labour Party) نے حکومت بنائی۔ اس وقت لارڈ ارون (Lord Irwin) ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ انگلینڈ بلا کر اس سے صلاح مشورہ کیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں اس نے 31/اکتوبر کو اعلان کیا کہ ''ملک معظم کی طرف سے مجھ کو صاف لفظوں میں یہ کہنے کا حکم ہوا ہے کہ حکومت نے 1917 کے فیصلہ کا جو اعلان کیا تھا اس میں یہ بات چھپی ہے کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے دراصل جو باتیں سوچی گئی تھیں، ان میں ''ڈومینین اسٹیٹس'' کے حصول کی بات شامل ہے''[5] وائسرائے نے اس بات کا بھی وعدہ کیا کہ جیوں ہی سائمن کمیشن اپنی رپورٹ پیش کرے گا، ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے گی۔ اس کے دو دنوں بعد خاص خاص نیتاؤں کی میٹنگ کر کے ایک منشور جاری کیا گیا جس کو دہلی منشور (Delhi Manifesto) کا نام دیا گیا۔ اس میں ان لوگوں (نیتاؤں) نے یہ بات رکھی کہ گول میز کانفرنس کا مقصد اس موضوع پر غور و فکر کرنا نہیں ہونا چاہیے کہ ڈومینین اسٹیٹس کب دیا جائے بلکہ ڈومینین اسٹیٹس لاگو کرنے کا منصوبہ بنانا چاہیے۔ اسی مسئلہ پر ہاؤس آف لارڈس (House of Lords) میں 5/نومبر 1929 کو بحث ہو چکی تھی اور انگریزوں کی نیت مشتبہ ہوگئی تھی۔ بالآخر 23/دسمبر 1929 کو

لارڈ داروِن نے گاندھی جی اور ان کے دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ ان کی مانگوں کے سلسلہ میں وہ ان کو مطمئن کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔ اس طرح بات چیت کا دور ختم ہو گیا اور مقابلہ کی نوبت آ گئی۔

اس بار پنجاب کی راجدھانی لاہور کو کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد کرانے کا اعزاز ملا اور ''پورن سوراج'' (مکمل آزادی) کے اعلان کا شرف جواہر لعل نہرو کو حاصل ہوا جنھوں نے اس نظریہ کو سب سے زیادہ مقبول عام بنایا تھا کہ مکمل آزادی حاصل کرنے سے زیادہ قابل قدر نصب العین کانگریس کے لیے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جواہر لعل نہرو کو دوبارہ کانگریس کا صدر بنانے کی فیصلہ کن آواز گاندھی جی کی تھی۔ انھوں نے عوامی جدوجہد کے نازک دور میں ان پر صدارت کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ یوں صوبائی کانگریس کمیٹیوں میں صرف تین کی حمایت ہی جواہر لعل نہرو کو حاصل تھی مگر سائمن بائیکاٹ کے سلسلہ میں نوجوانوں کی شاندار کامیابی دیکھ کر اور وقت کی نزاکت کو سمجھ کر گاندھی جی نے حسب معمول دباؤ ڈال کر ان کو صدر بنوا دیا اور ناقدین کو ان الفاظ میں جواب دیا'' کچھ لوگ یہ شبہہ کرتے ہیں کہ کانگریس کے اختیارات کو بزرگوں سے لے کر نوجوانوں کو دینے سے وہ (کانگریس) فنا ہو جائے گی .... میں ایسا نہیں سوچتا ہوں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''وہ (نہرو) جلد باز اور غیر دور اندیش ہیں۔ ایسے وقت میں یہی ان کی زائد صلاحیت ہے۔ اگر ان میں ایک سورما کی ہمت اور اتاولا پن ہے تو ان کو ایک سیاستداں کا تدبر بھی حاصل ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ وہ ایسے انتہا پسند ہیں کہ موجودہ گردوپیش سے بہت دور ہٹ کر آگے کی بات سوچتے ہیں۔ وہ اتنے منکسر المزاج اور باعمل ہیں کہ وہ اپنے قدم اتنی دور نہیں لے جائیں گے کہ بات بگڑ جائے''[6] گاندھی جی نے مزید کہا کہ بزرگ اپنی پالی کھیل چکے۔ مستقبل کی لڑائی اب نوجوان مردوں اور عورتوں کو لڑنی ہے۔ اب لڑائی کا مقابلہ ان میں سے ایک کی قیادت میں ہوگا۔ ذمّے داری ان کو پختہ اور سنجیدہ بنائے گی۔ وہ ان کو اس طرح تیار کرے گی کہ وہ اپنا فرض منصبی نبھا سکیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کی یہ ساری خوبیاں بذات خود ان کی سفارش کرتی ہیں۔ کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ذمّے داری غیر معمولی صلاحیت اور لگن سے سالوں نبھائی ہے۔ انھوں نے اپنی بے پناہ محبت، استقلال، خلوص اور

جیوٹ سے ملک کے نوجوانوں کا دل موہ لیا ہے۔ کسان مزدوروں سے ان کا تعلق ہے اور یورپی سیاست میں ان کی معلومات بہت گہری ہے اور اسی وصف کے ذریعہ وہ ہم لوگوں کی صلاحیت کو پرکھ سکتے ہیں''۔[7]

کچھ لوگ یہ چاہتے تھے کہ گاندھی جی کو خود کانگریس کا صدر بننا چاہیے۔ وہ لوگ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ چونکہ حکومت سے اور دوسری پارٹیوں سے نازک مسائل خصوصاً ہندو مسلم اتحاد پر بات چیت کے ذریعہ ہی معاملہ کرنا ہوتا ہے، اس لیے ایسے حالات میں ان کو ہی صدارت کا عہدہ لینا چاہیے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ''جب تک عوام کی محبت اور اس کا اعتماد مجھے حاصل ہے، مجھے شمہ برابر بھی شبہ نہیں ہے کہ میں اپنی قوت وصلاحیت کا پورا استعمال بغیر کسی عہدہ کے نہ کرسکوں۔ 1920 سے ہی خدا نے مجھ کو وہ طاقت بخشی ہے کہ بغیر کسی عہدہ پر ہوئے، میں اپنے اثرات سے ملک کو متاثر کرتا آرہا ہوں''۔[8] جواہر لعل نہرو کا انتخاب نوجوانوں کی خدمت کا انعام ہے اور یہی ان کی خدمت کا ثبوت ہے۔ قوم کو ان پر بڑا بھروسہ ہے اور ان کو بھروسہ لائق بننا چاہیے''۔[9]

جواہر لعل نہرو نے اپنی صدارتی تقریر میں لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے ان الفاظ میں آواز دی۔ ''بدیسی حکومت سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اب ہم کو کھل کر کام کرنا ہے۔ آپ کو، اپنے سبھی ساتھیوں کو، اور ملک کے سبھی عورتوں مردوں کو میں اس کام میں لگنے کی درخواست کرتا ہوں''۔[10] نہرو نے یہ بات بھی صاف کی کہ ان کے نزدیک آزادی کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ بدیسی حکومت ختم کی جائے بلکہ ''مجھے صاف لفظوں میں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ میں سوشلسٹ ہوں، ریپبلکن ہوں، میں راجاؤں اور مہاراجاؤں کا عقیدت مند نہیں ہوں اور نہ اس طرز زندگی کا قائل ہوں جس کے تحت کارخانوں کے جدید راجے مہاراجے پیدا ہوتے ہیں جو راجاؤں اور مہاراجاؤں سے زیادہ لوگوں کی زندگی اور ان کی قسمت کو متاثر کرتے ہیں اور جن کے لوٹ کھسوٹ کے طریقے پرانے تعلقداروں اور نوابوں کی طرح ہیں''۔[11] انھوں نے جدوجہد کے طریقوں کی بھی وضاحت کی ''آزادی کے حصول کے لیے نئی تحریک کو آج عوامی تحریک کی شکل میں ہونا چاہیے اور متحدہ بغاوت کے اس کو ہر حالت میں پرامن ہونا چاہیے اور اگر خاص تحریک

پرامن ہے تو ہمہ وقت کی گئیں اکا دکا تشدد کی کوششیں اس کو مقصد سے ہٹائیں گی اور اس کو کمزور کریں گی'۔[12]

31 دسمبر 1929 کو راوی ندی کے ساحل پر آدھی رات کے وقت ترنگا جھنڈا جو ہندوستان کی آزادی کا نشان ہے، کو تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بڑے جوش و مسرت سے لہرایا گیا۔ اسی جذباتی ماحول میں آنے والے سال میں سخت جدوجہد کرنے کا عزم کیا گیا۔

نئے سال میں کانگریس اور عوام نے خود کو پورے ملک میں 26 جنوری کو جلسے منعقد کرنے کے کام میں جھونک دیا۔ ان میٹنگوں میں آزادی کے حصول کے حلف نامے پڑھے گئے اور مجموعی طریقے سے ان کی تائید کی گئی۔ یہ میٹنگیں بہت کامیاب رہیں۔ گاؤں گاؤں اور قصبوں قصبوں میں اسی طرح کے چھوٹے بڑے جلسے کیے گئے، علاقائی زبانوں میں وہی حلف نامے دوہرائے گئے اور قومی جھنڈے لہرائے گئے۔ حلف ناموں کے الفاظ یہ تھے'[13] ہمارا ایمان ہے کہ کسی بھی ملک کی عوام کی طرح ہندستانی عوام کا بھی غیر منتقل (Inalienable) حق ہے کہ وہ آزاد ہو اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ زندگی کی ساری ضروری چیزیں اس کو حاصل ہوں جس سے اس کو ترقی کرنے کے سارے مواقع فراہم ہو سکیں۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اگر کوئی حکومت عوام کو ان حقوق سے الگ کرتی ہے اور اس پر جبر کرتی ہے تو عوام کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسی حکومت کو بدل دے یا ختم کر دے۔ انگریزی حکومت نے ہندستانیوں سے ان کی آزادی ہی نہیں چھینی ہے بلکہ اس کی (حکومت کی) بنیاد ہی عوام کے استحصال پر ٹکی ہے۔ حکومت نے ہندوستان کی مالی، سیاسی، تمدنی اور روحانی قوت کو پامال کیا ہے۔ اس لیے ہم اپنا رشتہ ہر طرح سے انگلینڈ سے توڑنے پر یقین رکھتے ہیں اور 'پورن سوراج' یا مکمل آزادی چاہتے ہیں'۔

''ہندوستان کو مالی اعتبار سے برباد کر دیا گیا ہے۔ جو مال گزاری ہم سے وصول کی جا رہی ہے وہ ہماری آمدنی سے کہیں زیادہ ہے۔ ہماری روزانہ کی آمدنی دو پیسے یا دو پنیس (Pence) سے بھی کم ہے اور جو بھاری ٹیکس ہم ادا کرتے ہیں اس کا بیس فیصدی لگان سے ملتا ہے، جس کو کسانوں سے وصول کیا جاتا ہے اور تین فیصدی نمک ٹیکس سے وصول ہوتا ہے جس کا اثر بری طرح سے غریب عوام پر پڑتا ہے'۔

''ہتھ کرگھا جیسے گھریلو دھندھے برباد کر دیے گئے ہیں۔ سال میں تقریباً چار مہینے کسان خالی بیٹھتے ہیں۔ دستکاری کے برباد ہو جانے کی وجہ سے ان کی صنعتی صلاحیت کند ہوتی جارہی ہے۔ برباد کی گئی گھریلو صنعت کی جگہ دوسرے دھندوں کے چلن کا کوئی بندوبست دوسرے ملکوں کی طرح یہاں نہیں کیا گیا ہے''۔ کسٹمس اور کرنسی (Currency) میں کچھ ایسا تکڑم کیا گیا ہے کہ کسانوں پر مزید بوجھ لد گیا ہے۔ ملک میں آنے والے سامانوں میں زیادہ تر سامان انگلینڈ کی فیکٹریوں سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ محصول درآمد انگریزی صنعت کاروں کے فائدے کو مدنظر رکھ کر لگایا جاتا ہے۔ ان پر مال گزاری لگائی جاتی ہے۔ اس سے کسانوں کا بار کم نہیں ہوتا بلکہ اس مال گزاری کا استعمال خرچیلی سرکار کو چلانے اور بنائے رکھنے میں کیا جاتا ہے۔ زرمبادلہ کا تناسب اور بھی یکطرفہ ہے، جس کی وجہ سے بے انتہا دولت باہر بھیجی جارہی ہے''۔

''سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت کبھی بھی اتنی خراب نہیں تھی جتنی برٹش حکومت میں ہے۔ سیاست میں کیے گئے کسی بھی سدھار نے عوام کو حقیقت میں سیاسی حقوق نہیں دیے ہیں۔ آزادیٔ رائے اور تنظیم بنانے کے حقوق ہمارے چھین لیے گئے ہیں۔ ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو بدیسوں میں رہنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ وہ بے چارے گھر نہیں لوٹ سکتے ہیں۔ ہماری جملہ انتظامی صلاحیت کو بری طرح روندا گیا ہے۔ اونچی نوکریاں انگریزوں کے لیے محفوظ ہیں۔ عام لوگوں کو دیہی سطح کی چھوٹی چھوٹی نوکریوں اور بابوگیری پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے''۔

''تمدنی اعتبار سے تعلیم کے نئے نظم نے ہم کو ہماری زمین سے ہی اکھاڑ دیا ہے۔ ہم کو اس طرح کی ٹریننگ دی جارہی ہے کہ ہم اپنی گردنوں کو غلامی کی زنجیر سے جکڑے رہیں''۔

ہم سے ہمارے ضروری اسلحے چھین کر ہم کو بزدل بنادیا گیا ہے۔ وطن کی سرزمین پر بدیسی فوج ہمارے حوصلے کو پست کرنے کے لیے تعینات ہے۔ ہم پر اس کا بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ ہم یہ سوچنے کے لیے مجبور ہیں کہ ہم اپنی دیکھ بھال خود نہیں کر سکتے اور نہ بدیسی حملوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں، ڈاکوؤں، چوروں اور اچکوں سے بھی اپنے گھر بار کی حفاظت سے ہم قاصر ہیں''۔

''ہم اس بات کو خدا اور انسان کے تئیں گناہ مانتے ہیں کہ جس حکومت نے چاروں

طرف سے ہمارے ملک کا ستیاناس کر رکھا ہے ہم اس کی اطاعت کریں۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ملک کو آزادی دلانے کا راستہ تشدد یا ہنسا نہیں ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، انگریزی حکومت سے اپنے رشتے توڑنے کی تیاری کرلیں اور سول نافرمانی تحریک جس میں ٹیکس کی عدم ادائیگی بھی شامل ہے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہم کو پورا یقین ہے کہ اگر ہم اپنی مرضی سے حکومت کی مدد کرنے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتے ہیں، یا ٹیکس نہیں ادا کرتے ہیں، اور مشتعل کیے جانے کے باوجود تشدد کا سہارا نہیں لیتے ہیں، تو ایسی بے رحم حکومت کا خاتمہ طے ہے۔ اس لیے ہم پورے عزم سے عہد کرتے ہیں کہ پورن سوراج کے قیام کے لیے جو بھی ہدایتیں کانگریس کی طرف سے وقتاً فوقتاً ہم کو ملیں گی ہم ان پر عمل کریں گے''۔

باب-22

سول نافرمانی تحریک 1930-31

کانگریس 1929 کی مجلس انتظامیہ (Working Committee) کو لاہور سول نافرمانی تحریک چلانے کا اختیار دیا گیا تھا جس میں ٹیکس نہ دینے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے نمائندوں کو اسمبلی سے استعفے دینے کی باتیں شامل تھیں۔ وسط فروری 1930 میں مجلس انتظامیہ نے سابرمتی میں ہوئی میٹنگ میں گاندھی جی کو پورا اختیار دے دیا کہ جب اور جہاں سے وہ چاہیں سول نافرمانی تحریک شروع کر دیں۔ عوامی تحریک کی مانی جانی ہستی گاندھی جی "بڑی سنجیدگی اور متانت سے موثر فارمولا تلاش کرنے میں لگ گئے تھے"[1] 31/جنوری کو ان کے آخری الٹی میٹم (Ultimatum) جس میں گیارہ مطالبے تھے کو لارڈ اروِن (Lord Irwin) نے نظر انداز کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں سول نافرمانی تحریک کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بچا ہی نہیں تھا۔

فروری کے آخر تک گاندھی جی کا فارمولا اس وقت ظاہر ہونے لگا جب انھوں نے نمک کے سلسلہ میں چرچا کرنا شروع کیا کہ "پانی سے الگ نمک نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس پر ٹیکس لگا کر حکومت کروڑوں بیمار، اپاہج اور لاچار لوگوں کو بھوکا مار سکتی ہے۔ بڑی بے دردی اور بے

رحی سے عوام پر تھوپا گیا یہ وہ ظالمانہ ٹیکس ہے جس کو آدمی کی بے حد چالاک سوچ نے جنم دیا ہے''[2]
اور 2/مارچ کو وائسرائے کے نام بڑی وضاحت سے لکھے گئے خط میں انھوں نے کہا کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے لیے عذاب ہے (کیونکہ) ''متواتر استحصال کرنے والے اس کے سسٹم نے کروڑوں بے زبان لوگوں کو کنگال بنا دیا ہے............ سیاسی اعتبار سے ہم کھیت میں کام کرنے والے غلام کی حالت میں پہنچ گئے ہیں۔ اس نے ہمارے تمدن کی چولیں ہلا دی ہیں...... ہماری روحانیت کا ستیاناس کیا ہے''[3] پھر انھوں نے وائسرائے کو اپنے عملی منصوبہ سے آگاہ کیا جس کو ان کی منشا کے مطابق، ہر سچے ستیہ گرہی کو کرنا چاہیے............ میں اس ماہ کی گیارہ تاریخ کو اپنے آشرم کے کارکنوں کو لے کر آگے بڑھوں گا اور نمک قانون توڑوں گا............ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے گرفتار کر کے روک سکتے ہیں مگر مجھے پوری امید ہے کہ ہزاروں لوگ اس کام کو بڑے ضبط سے کرنے کے لیے میرے بعد تال ٹھونک کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس قانون کو جو قانون کی کتاب میں بدنما داغ ہے، توڑ کر ہر سزا کو بھگتنے کے لیے تیار رہیں گے''[4]

یہ منصوبہ بڑی عقلمندی سے بنایا گیا تھا حالانکہ اس کی اہمیت کچھ ہی لوگ شروع شروع میں سمجھتے تھے۔ آشرم کے 78 نفر کے ساتھ جن میں مختلف مذاہب اور علاقوں کے لوگ شامل تھے گاندھی جی احمد آباد کے صدر مقام سے نکل پڑے۔ ان کو گاؤں گاؤں ہوتے ہوئے 240 میل (384 کلومیٹر) کی مسافت پیدل طے کرنی تھی اور ڈانڈی کے ساحل پر پہنچ کر نمک جمع کر کے نمک قانون کو توڑنا تھا۔ بظاہر بے ضرر لگنے والی اس تحریک کو تباہ کن ثابت ہونا تھا۔ ڈانڈی مارچ شروع ہونے کے پہلے ہی ہزاروں لوگ آگے ہونے والے ناگہانی واقعات میں حصہ لینے کے لیے سابرمتی آشرم پر جمع ہونے لگے۔ گاندھی جی نے منصوبہ کی غرض وغایت سمجھانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھا، مستقبل قریب میں کی جانے والی کارگزاریوں کے بارے میں انھوں نے ضروری ہدائتیں دیں، اہنسا کی اہمیت سمجھائی اور حکومت کی طرف سے کی جانے والی کارروائی کے لیے تیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''جہاں بھی ممکن ہو، نمک قانون کے تحت سول نافرمانی تحریک شروع کر دینی چاہیے............ شراب اور بدیسی کپڑوں کی دکانوں کے سامنے دھرنا دیے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم

میں طاقت ہے تو ہم ٹیکس دینے سے باز رہ سکتے ہیں۔ وکیل اپنی وکالت ترک کر سکتے ہیں۔ مقدمہ بازی سے دور رہ کر عوام عدالتوں کا بائیکاٹ کر سکتی ہے۔ سرکاری نوکر اپنے عہدوں سے استعفے دے سکتے ہیں............ میری تو صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ ہم ستیہ (سچائی) اور اہنسا کے عہد پر قائم رہیں۔ صرف یہی سوراج حاصل کرنے کے راستے ہیں"[5]

سول نافرمانی کی قوت کو واضح کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ "فرض کیجیے ہندوستان کے سات لاکھ گاؤں میں سے ہر ایک سے دس آدمی ستیہ گرہ میں حصہ لے کر نمک قانون کو توڑتے ہیں تو ایسے حالات میں آپ کے خیال سے حکومت ان کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ آپ سمجھ لیں کہ بے انتہا جابر و ظالم حکومت کے توپ کے گولے بھی پر امن ستیہ گرہیوں کی فوج کو اڑا نہیں سکتے۔ اگر آپ تھوڑا بھی مستعد ہو جائیں، تو میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ ہم بہت کم مدت میں حکومت کو ہلکان کر دیں گے"[6]

گاندھی جی نے یہ بھی واضح کیا کہ اہنسا کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت اس تحریک میں متوقع ہے۔ اس سے حکومت کو بڑی حیرانی ہوگی۔ 10 / مارچ کو آشرم پر آئے عوام کے مجمع کو دیکھ کر گاندھی جی نے کہا کہ "اگرچہ ہماری جنگ تو دو روز بعد شروع ہونے والی ہے پھر بھی یہ کیسے ممکن ہوا کہ آپ لوگ بے خوف ہو کر یہاں آ گئے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر آپ کو بم یا بندوق کا مقابلہ کرنا ہوتا تو آپ میں سے کوئی بھی یہاں نہیں آتا، لیکن آپ کو بم اور بندوق کا کوئی خوف نہیں ہے۔ کیوں؟ فرض کیجیے اگر میں یہ اعلان کرتا کہ میں ہنسک (متشدد) تحریک چلانے جا رہا ہوں (ضروری نہیں کہ لوگ بندوق سے لیس ہوں، لاٹھی، ڈنڈوں اور پتھروں سے وہ لیس ہو سکتے ہیں) تو آپ کا کیا خیال ہے کہ حکومت اب تک مجھ کو یوں ہی چھوڑے رہتی؟ کیا آپ تاریخ سے کوئی ایسی مثال دے سکتے ہیں (چاہے امریکہ ہو، انگلینڈ ہو یا روس ہو) جہاں کی حکومت نے متشدد بغاوت کو ایک دن بھی برداشت کیا ہو؟ لیکن یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت بڑی الجھن اور پریشانی میں پڑ گئی ہے"[7]

گاندھی جی نے اپنے جاں نثار کارکنوں کے ساتھ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر اپنا ڈانڈی

مارچ شروع کیا۔ اس منظر میں کوئی ایسی کشش تھی جس کو دیکھ کر لوگوں کا دل مچل گیا۔ گاندھی جی کے آگے بڑھنے کی، ان کی تقریروں کی، کثیر تعداد میں لوگوں کا ان کے ساتھ چلنے کی اور ان کے استقبال میں جگہ جگہ تورنوں اور جھنڈوں سے لیے راستہ کو آراستہ کرنے کی، ان کی تنظیم میں گزرگاہوں پر عورتوں اور مردوں کا پرسکون بیٹھ کر چرخوں پر سوت کاتنے کی، ان کی ایک اپیل پر گجرات میں 300 گاؤں کے سرکاری عملہ کے استعفےٰ دینے کی خبریں روز بروز اخباروں میں شائع ہوتیں۔ ملک کے کونے کونے کے لوگ ان کو پڑھتے اور ان کی خبروں کو ہزاروں کانگریس کارکن بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ جب گاندھی جی ڈانڈی پہنچے، اس وقت پوری قوم ''جگ اٹھی اور امید بھری نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگی۔ پورے ملک کے چپہ چپہ سے لوگوں کی کثیر تعداد نے اس میں حصہ لیا۔ اس لحاظ سے قومی تحریک کی تاریخ میں یہ بے مثل واقعہ تھا۔

گاندھی جی تو ڈانڈی کی طرف جا رہے تھے، مگر کانگریس لیڈر اور کارکنان مختلف سطح پر کانگریس کو منظم کرنے کے مشکل کام میں مصروف تھے۔ رضا کاروں اور ممبروں کی بھرتی ہو رہی تھی۔ دیہی سطح پر کانگریس کمیٹیاں بنائی جا رہی تھیں۔ رقم اکٹھا کی جا رہی تھی اور گاؤں گاؤں قصبوں قصبوں گھوم گھوم کر قومی پیغام پہنچایا جا رہا تھا۔ اسی دوران نمک ستیہ گرہ کی تیاریاں کی گئیں، جگہوں کی تجویز ہوئی، رضا کار تیار کیے گئے اور جدوجہد کے لیے ضروری وسائل تلاش کیے گئے۔[8]

6/اپریل 1930 ڈانڈی میں گاندھی جی نے ایک بار بطور رسم نمک ہاتھ میں اٹھا کر ستیہ گرہ کی شروعات کردی۔ پھر تو پورے ملک میں نمک قانون توڑنے کی ستیہ گرہ تحریک شروع ہوگئی۔ تمل ناڈو میں تنجور (Tanjore) ساحل پر سی۔ راج گوپالا چاری نے ترچنا پولی (Trichnopoly) سے ویدارنیم (Vedaranniyam) تک کی نمک یاترا شروع کی اور 30/اپریل کو ان کو گرفتار کیا گیا۔ انھوں نے اتنے زیادہ رضا کار اکٹھا کر لیے تھے کہ ان کی گرفتاری کے بعد وہ اس مہم کو لمبی مدت تک چلاتے رہے۔ ملابار میں ویکم (Vaikom) ستیہ گرہ کے ہیرو (سربراہ) کے۔ کیلپّن (K. Kelappan) نمک قانون توڑنے کے لیے کالی کٹ سے پیانور (Payannur) تک پیدل گئے، ستیہ گرہیوں کی ایک جماعت آسام میں سلہٹ

(Sylhet) سے بنگال میں نوواکھالی تک نمک بنانے کے لیے پہنچ گئی۔ آندھرا کے مختلف ضلعوں میں فوجی کیمپوں کے طرز پر کیمپ (Sibirams) قائم کیے گئے ستیہ گرہ کے یہ صدر مقامات (Head quarters) تھے۔ یہاں سے جتھے نمک قانون کو توڑنے کے لیے، راستے میں واقع گاؤں سے گذرتے ہوئے سمندری ساحل کے مراکز تک جاتے تھے۔ وہاں سے لوٹتے وقت وہ دوسرے گاؤں پہنچتے تھے۔ حکومت گاندھی جی کو نمک قانون توڑنے کے جرم میں گرفتار نہ کرسکی۔ اس کی ناکامی کا مقامی لیڈروں نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ ''ہم جیسے لوگوں سے حکومت ڈر گئی ہے اور یہ کہ جب سے نمک ستیہ گرہ تحریک شروع ہوئی ہے، حکومت غائب ہوگئی ہے، کہیں چھپ گئی ہے اور گاندھی جی کی حکومت بالکل قائم ہوگئی ہے'' 9 14 اپریل کو نمک قانون توڑنے کے جرم میں جواہر لعل نہرو کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے ردعمل میں کلکتہ، مدراس، کراچی وغیرہ شہروں میں زبردست مظاہرے ہوئے اور پولیس سے ٹکراؤ بھی ہوا۔

23 اپریل کو شمالی مغربی صوبہ سرحد میں کانگریس لیڈروں کی گرفتاری پر پیشاور میں عوام کا غیر معمولی مظاہرہ ہوا۔ ان علاقوں میں خان عبدالغفار خان کئی سالوں سے بے انتہا سرگرم تھے۔ انھوں نے لوگوں میں اپنے کام کے بل بوتے بہادر انقلابیوں کی بہت بڑی غیر متشدد جماعت تیار کرلی تھی جس کو خدائی خدمتگار کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ لال قمیض کے نام سے معروف تھے۔ ان لوگوں نے سول نافرمانی تحریک میں بہت فعال رول ادا کیا۔ انھوں نے اپنے کام سے ایسا ماحول بنایا تھا اور عوام میں ایسی سیاسی بیداری پیدا کی تھی کہ ایک ہفتہ سے زیادہ وقت تک پیشاور پر عوام کا تسلط قائم رہا۔ یہاں پر کیے گئے مظاہرے تو اس وجہ سے بھی اہمیت کے حامل تھے کہ فوج کی گڑھوال رجمنٹ نے یہاں نہتھی بھیڑ پر گولی برسانے سے صاف انکار کردیا تھا۔

حکومت نے تو یہ سوچا تھا کہ اگر وہ گاندھی جی کی اس نمک تحریک میں مزاحم نہیں ہوتی ہے تو تحریک بذات خود کچھ ہی دنوں میں فیل ہوجائے گی۔ مگر یہ بات اب اچھی طرح صاف ہوتی جارہی تھی کہ اس کی یہ چال کامیاب نہ ہوسکے گی۔ دراصل ستیہ گرہ کے خلاف کارروائی کا کوئی مناسب طریقہ ہی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی لیے گاندھی جی نے بتایا تھا کہ اس وقت حکومت کو

بڑی ''الجھن اور پریشانی ہے''[10] حکومت کے سامنے نہ روئے رفتن نہ پائے ماندن کی حالت تھی یعنی یہ کر دتو مصیبت اور وہ کر دتو مصیبت۔ اگر وہ اس تحریک کو نہیں کچلتی ہے جس نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو عوام میں اس کی ہوا اکھڑ جائے گی اور وہ کمزور معلوم پڑے گی۔ لیکن وہ پرامن تحریک کو کچلنے میں تشدد اپنا کر زیادہ سختی کرتی ہے تو حکومت کے جابر و ظالم ہونے کا پیغام لوگوں تک پہنچے گا۔ اسی لیے 1930 کے شروع میں مدراس کے ایک سرکاری افسر نے حکومت کی اس مشکل کو یوں بیان کیا تھا ''اگر ہم بہت سختی کرتے ہیں تو کانگریس چلائے گی ''ظلم''.......... (اور) ''اگر ہم معمولی سختی کرتے ہیں تو کانگریس چلائے گی (ہماری) ''فتح''[11] بہرحال دونوں ہی صورتوں میں حکومت کے تسلط کو ضرب لگتی تھی۔

تحریک کے زور پکڑنے اور تیزی سے پھیلنے پر حکومت نے مجبوراً اپنے چہرے پر پڑی ہمدردی کے نقاب کو اتار کر فوجی طاقت کا استعمال کیا۔ سختی کرنے کے لیے اس پر سرکاری افسروں، گورنروں اور فوجی افسروں کا دباؤ پڑنے لگا تھا۔ بالآخر 4 رمئی کو وائسرائے نے گاندھی جی کی گرفتاری کا آرڈر جاری کر دیا۔ گاندھی جی کے اس اعلان نے کہ وہ دھرسنا سالٹ ورکس (Dharasana Salt works) پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھاوا بول کر نمک قانون توڑیں گے، حکومت کو سختی کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن وہ گاندھی جی کو گرفتار کرنے کا مناسب وقت نہیں سوچ سکی تھی۔ اگر وہ اس طرح کی چوٹ شروع میں کیے ہوتی، تو وہ گاندھی جی کو تحریک کا منصوبہ بڑے اطمینان سے بنانے سے باز رکھ سکتی تھی۔ چپ رہنے سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مگر اس کی سختی کی پالیسی نے تحریک کی سرگرمی کو مزید بڑھا دیا۔ اس میں بڑی تیزی آگئی اور اس نے حکومت کی پریشانیوں میں بے انتہا اضافہ کیا[12]

گاندھی جی کی گرفتاری پر لوگوں نے زبردست احتجاج کیا۔ بمبئی میں لوگوں کا بہت بڑا مجمع سڑکوں پر نکل آیا۔ یہ اتنا بڑا مجمع تھا کہ پولیس تک کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس میں ریلوے اور سوتی ملوں میں کام کرنے والے مزدور ہزاروں کی تعداد میں شامل تھے۔ کپڑا تاجروں نے بھی چھ یوم کی ہڑتال کر دی۔ دلی اور کلکتہ میں پولیس کے ساتھ ہوئے تصادم میں گولیاں چلیں۔ مہاراشٹر کے شولا

پور میں گاندھی جی کی گرفتاری کا ردعمل تو بہت ہی تند و تیز تھا۔ یہاں پر سوتی مل مزدوروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ 7 رمئی سے وہ سب کے سب ہڑتال پر چلے گئے اور مقامی آبادی سے مل کر ان لوگوں نے شراب کی دکانیں جلا دیں اور ان ساری جگہوں پر حملہ آور ہوئے جو حکومت کے اقتدار کی نشانی تھیں مثلاً ریلوے اسٹیشن، عدالتیں، تھانے اور میونسپل عمارتیں۔ ان لوگوں نے پورے شہر کو اپنے قبضۂ اختیار میں لے لیا اور فی الواقع ایک متبادل حکومت قائم کر لی جس کو 16 رمئی کو مارشل لا لگانے کے بعد ہی ہٹایا جا سکا۔

لیکن بہادری کے پرامن مظاہرے میں کچھ ایسی کشش تھی کہ جیوں جیوں ستیہ گرہ زوردار ہوتا گیا، لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف کھینچتی گئیں۔ کانگریس کی پہلی عورت صدر سروجنی نائڈو، گاندھی جی کے بیٹے منی لال اور ان کے افریقی جدوجہد کے ساتھی امام صاحب دو ہزار ستیہ گرہیوں کی قیادت کرتے ہوئے پولیس محاصرہ کی طرف بڑھے جس نے دھرسانا کو سیل کر رکھا تھا۔ محاصرہ کے قریب پہنچتے ہی پولیس لوہے کی مٹھ (ہینڈل) لگی لاٹھیاں لے کر آگے بڑھی اور پرامن ستیہ گرہیوں پر اس وقت تک لاٹھیاں برساتی رہی جب تک زخمی ہو کر وہ زمین پر گر نہیں گئے۔ ان کے ساتھی ان کو اسٹریچروں پر اٹھا کر وہاں سے لے گئے، ان کی جگہ ستیہ گرہیوں کا دوسرا جتھا آ گیا۔ اس کو بھی مار پیٹ کر ادھر ادھر کر دیا گیا۔ اس کو بھی اسی طرح وہاں سے ہٹایا گیا۔ اس طرح جتھے پر جتھے آتے گئے اور ان کی ویسی ہی درگت ہوتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد گھیرے کے پاس جانے کے بجائے ستیہ گرہی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور پولیس کی پٹائی کا انتظار کرنے لگے۔ دفاع میں کسی نے اپنا ہاتھ تک نہیں اٹھایا اور گیارہ بجے جب سایہ میں گرمی 14 ڈگری پر پہنچی، پولیس کی مار سے 320 لوگ زخمی ہوئے اور دو کی موت ہو گئی۔ امریکہ کے ایک صحافی، ویب ملر (Webb Miller) جنھوں نے ہندوستانیوں کے قومی جذبہ کو دور دراز ملکوں تک پہنچایا تھا، نے ستیہ گرہیوں کے پکے ارادے اور بے پناہ جیوٹ کا بیان بڑی تفصیل اور بڑے موثر طریقے سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پرامن احتجاج کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ ان کے بیان کا اختصار اس طرح ہے۔ ''بیس ملکوں میں گزاری گئی اپنی اٹھارہ سالہ صحافتی زندگی میں میں نے بے شمار ملکی ہنگامے، فسادات،

سڑکوں پر مارکاٹ اور بغاوتیں دیکھی ہیں مگر دھرسانا جیسا دردناک منظر اپنی زندگی میں نے کہیں نہیں دیکھا ہے''۔13

نمک ستیہ گرہ کی نئی شکل کو لوگوں نے بڑی دلچسپی سے اپنایا اور دیکھتے دیکھتے اس نے عوامی صورت اختیار کر لی۔ بمبئی کے باہری حاشیہ پر واقع وڈالا (Wadala) میں نمک کارخانوں پر دھاوا بولا گیا۔ یکم جون کو پندرہ ہزار لوگوں کے مجمع نے اجتماعی طریقے سے حد درجہ بہادرانہ کارروائی کر ڈالی اور پولیس محاصرہ کو توڑ کر وہاں سے نمک اٹھا لے گئے۔ کرناٹک میں دس ہزار لوگوں نے سینی کٹا (Sanikatta) سالٹ ورکس پر حملہ کر دیا اور لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں۔ مدراس میں نمک قانون توڑنے کی وجہ سے عوام اور پولیس کے درمیان بار بار تصادم ہوئے اور 23/اپریل کو سمندری ساحل پر ایک اجتماعی جلسہ ہوا۔ عوام کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے لاٹھیاں اور گولیاں برسائیں۔ اس میں تین لوگوں کی موت ہوئی۔ اس واقعہ نے پورے شہر کو نسلی (Racial) اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بے حد اعتدال پسند لوگوں تک نے اس کی مذمت کی اور ستیہ گرہیوں کی حمایت میں وہ اکٹھا ہو گئے۔ آندھرا صوبہ میں عورتوں کے جتھے مٹھی بھر نمک لے جانے کے لیے میلوں چل کر گئے۔ بنگال میں شہروں سے رضاکاروں کے آنے سے پرانے گاندھیائی آشرموں میں دوبارہ جان پیدا ہو گئی اور ان کی وجہ سے مدناپور اور دوسرے ساحلی علاقوں میں ستیہ گرہ لمبی مدت تک چلتا رہا۔ اڑیسہ میں بالاسور (Balasore) پری (Puri) اور کٹک (Cuttack) ضلع غیر قانونی طریقے سے نمک بنانے کے خاص مراکز بنے رہے۔

نمک ستیہ گرہ ہی وہ محرک اور شروعات تھی جس کے بعد تو حکومت کو چیلنج کرنے کے مختلف طریقے نکل پڑے۔ گاندھی جی نے اپنی گرفتاری کے پہلے بہت زوردار طریقے سے بدیسی کپڑوں اور شراب کے بائیکاٹ کی اپیل کی تھی۔ انھوں نے عورتوں سے اس تحریک میں خاص رول ادا کرنے کے لیے کہا تھا۔ انھوں نے عورتوں کے بارے میں بتایا کہ ''ان کو کمزور کہنا ان کی توہین ہے۔ یہ عورتوں کے ساتھ کی جانے والی مردوں کی ناانصافی ہے''۔14 اور

1930 میں عورتوں نے خاص طور سے دکھادیا کہ وہ قوت اور مضبوط ارادوں میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ جو عورتیں اپنے گھر کی چوکھٹ اکیلے نہیں پار کر سکتی تھیں، جو پردے میں رہتی تھیں، وہ جوان مائیں اور بیوہ عورتیں اور غیر شادی شدہ لڑکیاں اکثر صبح سے شام تک شراب، بدیسی کپڑوں اور نشیلی چیزوں کی دکانوں کے سامنے کھڑی ہوکر گاہکوں کو گندی عادتیں چھوڑنے کے لیے سمجھاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

عورتوں کے ساتھ ساتھ نوجوان اور طالب علموں نے بدیسی کپڑوں اور شراب کے بائیکاٹ میں اہم کردار ادا کیا مثلاً بمبئی میں کانگریس سنتریوں کی باقاعدہ تقرری کی گئی تھی کہ وہ یہ دیکھیں کہ کوئی تھوک یا پھٹکر دکاندار بدیسی سامان کے بائیکاٹ کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہا ہے۔ بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں مل مالکوں نے بدیسی دھاگوں کا استعمال بند کر دیا اور حلف لیا کہ وہ کوئی ایسا موٹا کپڑا نہیں بنائیں گے جس کا مقابلہ کھادی سے ہو۔ جن لوگوں نے اس کی خلاف ورزی کی، تنظیم کی طرف سے ان پر جرمانہ لگایا گیا۔ ان کا سوشل بائیکاٹ کیا گیا۔ کانگریس نے ان کو اپنی کالی فہرست میں رکھا اور ان کی دکانوں کے سامنے دھرنے (Picketing) دیے۔

شراب اور نشیلی چیزوں کے بائیکاٹ کی وجہ سے ایکسائز ڈیوٹی سے ملنے والی رقم بہت کم ہوگئی۔ اس تحریک نے ایک دوسری طرح کی شکل بھی اختیار کی اور وہ یہ تھی کہ لوگوں نے تاڑی کے پیڑوں (Taddy Trees) کے سر کاٹ ڈالے۔ شراب اور نشیلی چیزوں سے پرہیز سماج میں بڑی عزت اور خوبی کی علامت مانی جاتی تھی۔ اس لیے اس کے بائیکاٹ کی کامیابی کا تعلق اسی مقبول عام روایت سے تھا جس میں اس کے استعمال کرنے والے کو حقیر اور اس سے دور رہنے والے کو افضل مانا جاتا تھا۔ اس رواج کی اہمیت کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ نیچی ذاتوں کے لوگ شراب نوشی اور گوشت خوری چھوڑ کر ہی اونچی ذات کے برابر مرتبہ پر آنے کی کوشش کرتے تھے۔

ٹیکس نہ ادا کرنے کی مہم کا خاص علاقہ مشرقی ہندوستان تھا۔ یہاں لوگوں نے چوکیدارہ (Chowkidara) دینے سے منع کر دیا۔ چوکیدارہ چوکیداروں کو دیا جانے والا ٹیکس تھا۔ گاؤں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا تھا اس کا ایک حصہ خاص طور سے چوکیداروں کے

لیے مقرر تھا۔ چوکیدار گاؤں کے محافظ ہوتے تھے اور پولیس فورس کی ایک چھوٹی اکائی کی طرح کام کرتے تھے۔ ان چوکیداروں سے لوگ بہت نفرت کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ پولیس کے مخبر اور زمینداروں کے پالتو خادم ہوتے تھے۔ ٹیکس کے نہ ادا کرنے، اور چوکیداروں کی تقرری کرنے والی بااثر لوگوں کی پنچایتوں کو برخاست کرنے کی تحریک سب سے پہلے مئی میں بہار کے ضلعوں مثلاً منگیر، سرن اور بھاگلپور سے شروع ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ علاقے سمندری ساحل سے بہت دور تھے۔ شاید اس لیے یہاں نمک تحریک کی گنجائش نہیں تھی۔ ان ضلعوں میں لوگوں کو ٹیکس دینے سے منع کر دیا گیا۔ چوکیداروں کو استعفے دینے کی ترغیب دی گئی۔ جن لوگوں نے مخالفت کی ان کا سوشل بائیکاٹ کیا گیا۔ حکومت نے کچھ روپوں کے بدلے سیکڑوں اور ہزاروں روپوں کی جائدادیں ضبط کر کے لوگوں سے بدلہ لیا۔ ان کو بری طرح سے مارا پیٹا اور ستایا گیا۔ معاملہ تو اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب تیزی سے گرتے ہوئے دبدبہ کو قائم رکھنے کے لیے 31 رمئی کو حکومت نے بھاگلپور ضلع کے بہیہ پور (Bihpur) گاؤں کے کانگریس آشرم پر قبضہ کرلیا۔ یہ آشرم اس علاقہ میں کانگریس کی سرگرمی کا خاص مقام تھا۔ آشرم پر پولیس قبضہ کے بعد روزانہ مظاہرے ہونے لگے۔ پٹنہ سے راجیندر پرساد اور عبدالباری جب دورے پر وہاں پہنچے تو لوگوں نے بہت بڑی ریلی نکالی۔ ریلی کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے لاٹھیاں برسائیں۔ تمام دوسرے لوگوں کے علاوہ راجیندر پرساد بھی زخمی ہوئے۔ پولیس نے یہاں بھی عادت کے مطابق بری طرح ظلم ڈھائے۔ اس سے قومی تحریک کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں اور حالات تو اس حد تک پہنچ گئے کہ دیہی علاقوں میں پولیس کا گھسنا ہی دوبھر ہوگیا۔

برسات شروع ہونے پر بنگال میں نمک بنانا دشوار ہوگیا تب تحریک نمک سے ہٹ کر چوکیدارہ اور یونین بورڈ مخالف بغاوت میں بدل گئی۔ یہاں بھی لوگوں پر بڑا ظلم ڈھایا گیا۔ لوگوں کی ہزاروں روپے کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں یا برباد کر دی گئیں۔ پولیس کے ظلم سے بچنے کے لیے لوگوں نے جنگلوں میں جا کر پناہ لی۔

گجرات کے کھیڑا ضلع میں، سورت کے باردولی تعلقہ میں اور بھڑوچ کے جمبوسر

(Jambusar) میں ٹیکس نہ دینے کی مہم چل رہی تھی۔ یہاں زمین کی مال گزاری دینا لوگوں نے بند کر دیا تھا گاؤں کے لوگ برٹش راج کے علاقے کو چھوڑ کر ہزاروں کی تعداد میں اپنے کنبے، مویشی اور گھریلو سامان کو لے کر پڑوس کے بڑودہ جیسے دیسی رجواڑوں کے علاقوں میں چلے گئے انھوں نے کھلے آسمان کے نیچے بسیرا کیا۔ ایسے لوگوں کے گھر و مکان برباد کر دیے گئے۔ ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ یہاں تک کہ پولیس نے ولبھ بھائی پٹیل کی اسی سالہ بوڑھی ماں کو بھی نہیں بخشا۔ ایک روز اپنے گاؤں کرمساڈ (Karamsad) میں جب وہ کھانا پکا رہی تھیں تبھی پولیس نے پیروں سے ان کے برتن بھاڑے ٹھکرا دیے اور ان میں کنکر پتھر اور مٹی کا تیل بھر دیا۔ 1930 میں ولبھ بھائی پٹیل کا زیادہ وقت جیل میں گزرا، پھر بھی تھوڑے روز کے لیے جب وہ جیل سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے گاؤں اور پڑوس میں سخت مصیبت کی زندگی گزار رہے کسانوں کو ڈھارس بندھائی۔ ان کو صبر دلایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جلا وطن کسانوں کی ضروریات زندگی کا سامان ختم ہو گیا۔ بیچارے تھکے ماندے زندگی سے عاجز آ گئے تھے پھر بھی بیابان میں ڈٹے رہے۔ مارچ 1931 میں عارضی صلح و آشتی قائم ہونے کے بعد ہی وہ اپنے گاؤں واپس ہوئے۔

مہاراشٹر، کرناٹک اور ایم۔ پی میں جنگلات قانون توڑنے کی جدوجہد نے عوامی شکل لے لی تھی۔ اس میں خاص طور سے ان علاقوں کے لوگ شامل تھے جہاں قبائلی آبادی رہتی تھی۔ حکومت نے جنگلات کے استعمال پر سخت پابندی لگا رکھی تھی۔ اس پابندی سے سب سے زیادہ متاثر یہی لوگ تھے۔ اس قانون کو توڑنے والے مجمع میں بعض جگہوں پر لوگوں کی تعداد ستر ہزار سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔

آسام میں بدنام زمانہ قانون کننگھم سرکلر (Cunningham Circular) کے خلاف طلبا کی قیادت نے زبردست تحریک چلا رکھی تھی۔ اس سرکلر کے تحت طلبا اور ان کے سرپرستوں کو اچھے اخلاق کی گارنٹی کا سرٹیفکیٹ دینے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔

ایسا معلوم پڑتا ہے کہ جواہر لعل نہرو کا وہ پیغام عوام کے دلوں میں اتر گیا جو انھوں نے لاہور میں دسمبر 1929 میں قومی جھنڈا لہراتے وقت اس طرح دیا تھا کہ ''ایک بار پھر آپ لوگوں کو

یادرکھنا ہے کہ اب یہ جھنڈا لہرا دیا گیا ہے۔ جب تک ایک بھی ہندستانی، مرد، عورت یا بچہ زندہ ہے، اس کو جھکنا نہیں چاہیے''۔15 ظلم وستم کی سخت آزمائش میں قومی جھنڈے کے وقار کے تحفظ کی کوشش بہادری کا غیر معمولی نمونہ بن جاتا ہے۔ آندھرا ساحل کے بندور (Bundur) مقام پر ٹوٹا نرسیا نائڈو (Tota Narasaiah Naidu) 15 پولیس فورس کی مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوکر گر گئے مگر انھوں نے جھنڈا ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسی طرح کالی کٹ میں پی۔ کرشنا۔ پلے (P. Krishna Pillai) پر بھی لاٹھیوں کی مار پڑی مگر وہ بھی اپنے عزم سے شمہ برابر نہیں ہٹے......... یہی شخص بعد میں بہت بڑا کمیونسٹ لیڈر بنا تھا۔ سورت میں چھوٹے چھوٹے بچوں نے پولیس کو چنوتی دینے کی غرض سے غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ پولیس کے ذریعہ بار بار قومی جھنڈا چھننے سے عاجز آکر ان سب نے ترنگے جھنڈے کا ہی ڈریس سلوالیا۔ اس کے بعد تو چھوٹے چھوٹے زندہ جھنڈے بڑے فخر سے پولیس کو چیلنج کرتے ہوئے سڑکوں پر گھومتے نظر آئے۔ اب پولیس بے بس تھی۔ ان کے جھنڈوں کو نہیں چھین سکتی تھی16 قومی بیداری کا نشان ترنگا جھنڈا اب دور دراز گاؤں میں بھی اکثر دکھائی دینے لگا تھا۔

اتر پردیش میں تحریک کی شکل دوسری تھی۔ یہاں مال گزاری نہ دو، لگان نہ دو، کی مہم چل رہی تھی۔ حکومت کو مال گزاری نہ دینے کی اپیل زمینداروں سے کی گئی تھی اور کسانوں سے زمینداروں کو لگان نہ دینے کے لیے کہا گیا تھا۔ چونکہ زیادہ تر زمیندار حکومت کے بڑے وفادار بندے تھے اس لیے یہ تحریک خاص طور سے لگان نہ دینے کی ہی مہم ہوگئی، شروع مہینوں میں صوبہ سول نافرمانی تحریک کی گرفت میں آگیا تھا، مگر بعد میں حکومت کے جبر و جور نے اس کے زور کو نسبتاً کم کردیا تھا۔ پھر بھی لگان نہ دینے کی مہم چلتی رہی۔ اکتوبر میں اس نے پھر زور پکڑا۔ جب جواہر لعل نہرو تھوڑے روز کے لیے جیل سے باہر آئے تو انھوں نے کانگریس کمیٹی کو لگان مخالف مہم چلانے کی منظوری دے دی۔ دو ماہ تو تشہیر اور تیاری میں لگ گئے۔ اس کے بعد دوبارہ دسمبر میں مہم شروع کی گئی۔ جنوری تک حکومت کا جور وستم اتنا سخت ہوا کہ بہت سے کسان گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آگرہ اور رائے بریلی اضلاع اس مہم کے مراکز میں خاص مقامات تھے۔

عوام کو متحرک کرنے کے لیے تحریک نے کئی طرح کے طریقے اختیار کیے تھے۔ پربھات پھیریوں کا نظم کیا گیا تھا۔ ان میں مرد، عورتیں اور بچے جھنڈ بنا کر قومی ترانہ گاتے ہوئے گلی کوچے میں گھومتے تھے۔ اس طرح کی پربھات پھیریاں نکالنا گاؤں اور قصبوں میں عام سی بات تھی۔ اس کے علاوہ ناپسندیدہ پریس قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لیے پترکائیں (میگزینیں) اور غیر قانونی اخبارات ہاتھ سے لکھ کر یا سائکلو اسٹائل (Cyclo styled) کرا کر پورے ملک میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ قومی پیغام کو گاؤں گاؤں پہنچانے کے لیے میجک لالٹینوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ اور حسب معمول کارکن اور لیڈر فرداً فرداً مسلسل دورے کرتے رہتے تھے اور مرد عورتوں کی جماعتیں برابر چلتی رہتی تھیں۔ ان کاموں کے دوران چھوٹے بڑے عوامی میٹنگیں اور جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔ تحریک کے یہ اہم کام متواتر ہوتے رہتے۔ بچوں نے بھی مختلف جگہوں پر بانر سینائیں یعنی بندروں کی فوجیں نام کی جماعتیں بنائی تھیں اور کم سے کم ایک جگہ لڑکیوں نے تو یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ ان کی الگ سے منجری سینا (Manjari Sena) یا بلیوں کی فوج ہونی چاہیے۔[17]

1930 کے دوران پورے سال حکومت متضاد رجحان کا شکار رہی۔ ہچکچاتے ہوئے گاندھی جی کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد تو لوگوں کے شہری حقوق پر بغیر کسی روک ٹوک کے آرڈیننس جاری کر کے پابندی لگادی گئی اور صوبائی سرکاروں کو سول نافرمانی کرنے والی تنظیموں پر پابندی لگانے کی آزادی دے دی گئی، لیکن جون کے آخر تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کو غیر قانونی ہونے کا اعلان نہیں کیا گیا۔ انھیں دنوں سائمن کمیشن رپورٹ شائع ہوئی۔ اس میں ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس (Dominion States) دیے جانے کا کوئی ذکر نہیں تھا بلکہ جبر و جور کی پالیسی پر منحصر یہ پیچھے ڈھکیلنے والا دستاویز تھا۔ اعتدال پسند نیتاؤں کو بھی سخت الجھن اور پریشانی تھی۔ مدن موہن مالویہ اور ایم۔ ایس۔ انے (M.S. Aney) نے اس کے احتجاج میں گرفتاریاں دیں۔ 9 رجولائی کو وائسرائے نے مصالحاتی رجحان کا مظاہرہ کرتے ہوئے گول میز کانفرنس بلانے کا مشورہ دیا اور ڈومینین اسٹیٹس والے مقصد پر پھر سے زور دیا۔ وائسرائے نے

مرکزی اسمبلی کے 40 ممبروں کے ذریعہ دیے گئے مشورہ کو بھی منظور کیا کہ سر تیج بہادر سپرو اور ایم۔آر۔ جے کر (M.R. Jaykar) کو حکومت اور کانگریس کے درمیان مصالحت کرانے کے امکانات تلاش کرنے کے لیے کہا جائے۔انھیں باتوں کو مدنظر رکھ کر نہرو باپ بیٹے کو گاندھی جی سے ملاقات کرانے کے لیے یرودا (Yervada) جیل لے جایا گیا تاکہ وہ ان سے بات کر کے سمجھوتہ کی راہ نکال لیں۔ بہرحال اس کا نتیجہ تو کچھ نہیں نکلا پھر بھی اشارہ وکنایہ سے یہ امید بندھی کہ سیاسی حلقہ کے کچھ لوگ لندن میں ہونے والی نومبر ماہ کی گول میز کانفرنس میں حصہ لیں گے۔لندن میں ہونے والی یہ پہلی میٹنگ تھی جس میں برٹش حکمرانوں اور ہندوستانیوں کی یکساں حیثیت تھی۔اس میں شرکت کرنے والے ہر ایک نمائندہ نے یہ بات برابر دہرائی کہ آئین سے متعلق کسی بھی گفتگو میں بغیر کانگریس کو شامل کیے ساری دوڑ دھوپ بیکار ہوگی اور یہ بات بھی صاف صاف ظاہر کی گئی کہ اگر حکومت قائم رکھنے کی حکمت عملی کا انحصار آئینی سدھار پر ہے تب تو اس میں کانگریس کی شرکت نہایت ضروری ہے۔ برٹش وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس میں اپنی اختتامی تقریر میں اسی امکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔انھوں نے یہ بھی امید ظاہر کی کہ اسی سال ہونے والی اگلی گول میز کانفرنس میں کانگریس شرکت کرے گی۔اسی نظریہ کے تحت وائسرائے نے 25 رجنوری کو گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبروں کی رہائی کا بلاشرط اعلان کردیا جس سے کہ وہ بے خوف اور آزاد ہو کر وزیر اعظم کے بیان پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تین ہفتے آپس میں بات چیت کرنے،لندن سے واپس لوٹے گول میز کانفرنس کے نمائندوں سے صلاح ومشورہ لینے اور سماج کے مختلف خیال کے سیاسی لیڈروں سے بات چیت کرنے کے بعد گاندھی جی کو وائسرائے سے گفتگو شروع کرنے کا اختیار دیا۔اس طرح وائسرائے سے پندرہ روز کے تبادلہ خیال کے بعد 5 رمارچ 1931 گاندھی ارون سمجھوتہ وجود میں آیا جس کو عارضی صلح (Truce) یا ہنگامی سمجھوتہ کے نام سے پکارا گیا۔

اس معاہدہ (Pact) پر کانگریس کی طرف سے گاندھی جی اور حکومت کی طرف سے لارڈ ارون نے دستخط کیے۔ برٹش نوکر شاہی نے بڑی مشکل سے اس کو پسند کیا کیونکہ کانگریس اور

حکومت دونوں کو اس میں یکساں حیثیت دی گئی تھی۔ معاہدہ کی شرطیں اس طرح تھیں:- ان سارے قیدیوں کی فوراً رہائی جن کو مار پیٹ کے تحت سزا نہیں ملی تھی، ان سارے مالی جرمانوں کی معافی جو وصول نہیں ہوئے تھے، ضبط شدہ جائدادیں اگر دوسروں کے ہاتھ فروخت نہیں کی گئی تھیں ان کی واپسی، جن سرکاری ملازموں نے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دیا تھا ان کے ساتھ نرمی کا سلوک، سمندری ساحلوں پر آباد گاؤں کے باشندوں کو گھریلو استعمال کے لیے نمک بنانے کا اختیار، پرامن اور غیر جارحانہ طریقے سے دھرنا دینے کا بھی اختیار۔ کانگریس کے اس مطالبہ کو نامنظور کر دیا گیا کہ پولیس کے ذریعہ کی گئی زیادتی کے خلاف پبلک انکوائری کرائی جائے۔ بہرحال گاندھی جی کے اصرار پر پبلک انکوائری کی بات معاہدہ میں درج ضرور کر لی گئی۔ کانگریس نے سول نافرمانی تحریک روک دینے کی بات مان لی۔ معاہدہ میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ اگلے گول میز کانفرنس میں کانگریس شرکت کرے گی۔

جن شرائط پر سمجھوتہ پر دستخط ہوئے، اس کا وقت، دستخط کرتے وقت گاندھی جی کی منشا، بھگت سنگھ اور ان کے کامریڈوں کی پھانسی کی سزا معاف کرانے کی شرط رکھنے سے گاندھی جی کا انکار (حالانکہ انھوں نے وائسرائے کو سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی کہ ان لوگوں کی سزا معاف کر دی جائے) وغیرہ باتیں اس زمانے کے لوگوں اور آج بھی مورخین کے درمیان بحث ومباحثہ اور تکرار کا مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ اس سمجھوتہ کو لوگوں نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو دھوکہ بازی بتایا اور کچھ لوگوں نے اس کو ہندستانی سرمایہ داروں کے ڈھلمل رویہ اور ان کے دباؤ میں آکر گاندھی جی کا کام کرنے کا ثبوت مانا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ گاندھی جی اور ملکی سرمایہ دار دونوں ہی عوامی تحریک جو انتہا پسندانہ روپ لے رہی تھی سے خوف زدہ تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ کسانوں کے ساتھ دغابازی کی گئی تھی۔ ان کی ضبط شدہ جائدادیں جو دوسرے لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دی گئی تھیں ان کو واپس نہیں دلائی گئیں وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال چوری چورہ سانحہ کے بعد 1922 میں عدم تعاون تحریک واپس لینے کی جو دلیلیں دی گئی تھیں، اس بار بھی لوگ ویسے ہی خیالات ظاہر کر رہے تھے۔ ان کے خیالات کا انحصار

ایسی سوچ پر ہے جو قومی تحریک کی منشا اور حکمت عملی کو سمجھنے میں قاصر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سوچ میں ایک اہم بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ عوامی تحریک کی عمر بہت لمبی نہیں ہوتی ہے۔ اس کو طویل مدت تک جاری نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ سرگرم سیاسی کارکنوں کی طرح عام لوگوں میں قربانی دینے کی ہمت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی ہے۔ اس لیے عوامی تحریکوں میں سستی اور کمزوری آنے لگتی ہے۔ اور یہی کیفیت تحریک کے بڑے اور اہم طبقہ میں ہونا لازمی تھی۔ شہروں میں نوجوانوں اور طلبا میں توانائی تو ابھی بھی بنی ہوئی تھی مگر دکاندار اور تجارت پیشہ لوگوں کے لیے نقصان اٹھانا اور ان طبقوں کی مدد اور حمایت پانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی حالت میں ستمبر 1930 تک بائیکاٹ کو کامیاب بنانے کے امکانات بالکل کم ہونے لگے تھے۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں اور دوسرے ان علاقوں میں جہاں سال کے شروع میں احتجاج کی ابتدا ہو گئی تھی وہاں سال کے آخر تک سستی آنے لگی تھی حالانکہ احتجاج، پولیس کے ساتھ تصادم اور ان پر حملے کے اکادکا واقعات بنگال، بہار، آندھرا اور گجرات میں متواتر ہوتے رہے۔ اتر پردیش کے علاقوں میں جہاں لگان نہ دینے کی مہم 1930 کے آخر میں شروع ہوئی تھی، وہاں لوگوں میں لڑنے کا حوصلہ اب بھی موجود تھا، لیکن جنگجویانہ مزاحمت کے وہ اکادکا واقعات جو ایک دو علاقوں میں ہو رہے تھے ان سے مشکل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندستان جیسے بڑے ملک کی پوری آبادی میں جدوجہد جاری رکھنے کی توانائی اب بھی باقی تھی؟ پھر اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ اگر توانائی ختم ہو جاتی جیسا کہ دیر سویر ہونا لازمی ہی تھا۔ تو کیا اس وقت بھی حکومت سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتی؟ 1931 کے حالات 1946 جیسے نہیں تھے اور 1932 میں کیا حالات ہوتے؟ حکومت اپنا رویہ بدل کر ظلم و جور کر سکتی تھی اور اس طرح وہ بہت موثر طریقے سے تحریک کو کچل سکتی تھی۔ بلاشبہ نوجوان بہت مایوس تھے۔ وہ ٹھکنے اور منہ بسورنے کے بجائے مر مٹنے کو ترجیح دیتے تھے18 اور گجرات کے کسان تو مطلق خوش نہیں تھے۔ ان کی کچھ زمینیں ان کو بروقت واپس نہیں مل سکی تھیں (1937 میں بمبئی میں کانگریس وزارت بننے کے بعد ہی ان کو زمینیں واپس ملیں) لیکن عوام کی کثیر تعداد پر اس بات کا بہت اثر پڑا کہ عظیم برٹش حکومت کو ان کی

تحریک اور ان کے لیڈروں کو یکساں حیثیت دینا پڑا اور ان کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ حکومت نے ان کی طاقت کو تسلیم کرلیا ہے۔ اس پر ان کو فتح حاصل ہوگئی ہے۔ معاہدہ کے تحت جیل سے رہا ہوئے ہزاروں قیدیوں کو یہ سمجھا گیا کہ وہ ذلت آمیز زندگی سے لوٹے، ہارے ہوئے لوگ نہیں ہیں بلکہ میدان جنگ سے واپس ہوئے فتح مند سپاہی ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پرامن سمجھوتہ ہار کا ہم معنی نہیں ہوتا اور یہ کہ اگر دشمن چاہے تو جنگ دوبارہ چھیڑی جا سکتی ہے۔ سمجھوتہ کے دوران فوجی سپاہی تازہ دم ہو کر جنگ کے اگلے دور کے لیے خود کو تیار کرلیں گے۔ ان میں پوری طرح خوداعتمادی تھی اور ان کو اپنے قائد پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا۔

اس طرح 31-1930 کی سول نافرمانی تحریک سلطنت مخالف جدوجہد کے ایک اہم دور کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس دوران جیل جانے والوں کی تعداد 90,000 سے زیادہ تھی جو 22-1920 کے عدم تعاون تحریک میں حصہ لینے والوں کی تعداد سے تین گنا سے بھی زائد تھی انگلینڈ سے کپڑے کی درآمدگی آدھی ہوگئی تھی۔ شراب اور لگان سے ہونے والی آمدنی بری طرح متاثر ہوئی۔ چونکہ سماج کے مختلف طبقوں کی کثیر آبادی کو سیاسی اور قومی اعتبار سے بیدار کیا جا چکا تھا۔ اس لیے اسمبلی الیکشنوں کا بائیکاٹ بہت موثر طریقے سے کیا گیا۔ ایک طرف اگر تمل ناڈو اور پنجاب کی شہری آبادی کے دکاندار اور تجارت پیشہ لوگ تحریک میں بہت سرگرم تھے، تو دوسری طرف گجرات، یوپی، بہار، بنگال اور آندھرا کے کسان اور سی۔ پی۔ مہاراشٹر کرناٹک اور بنگال کے قبائلی بھی پیش پیش تھے۔ مزدور طبقہ کے لوگ بھی تحریک سے دور نہیں تھے۔ ان لوگوں نے بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں حکومت کے خلاف نکالے گئے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شولاپور کے مزدور تو اس معاملہ میں اگلی ہی قطار میں تھے۔

سول نافرمانی تحریک میں مسلمانوں کی شرکت 22-1920 کے مقابلہ میں کہیں پر بھی اتنی نہیں تھی۔ فرقہ پرست مسلم لیڈروں نے ان سے تحریک سے دور رہنے کی اپیل کی تھی۔ حکومت نے بذات خود قومی طاقت کو کمزور کرنے کے لیے فرقہ واریت کو ہوا دینے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ ان سب مخالف طاقتوں کا تحریک پر برا اثر پڑنا لازمی تھا۔ پھر بھی تحریک میں

مسلمانوں کی شرکت کو معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات پوری طرح ظاہر ہے کہ شمالی مغربی صوبہ میں مسلمانوں نے تحریک میں زبردست حصہ لیا تھا۔ بنگال کے سین ہٹا (Senhatta)، تریپورا، گے بندھا (Gaibandha) میں متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی شرکت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ڈھاکہ میں مسلمان، طلبا، دکاندار اور یہاں تک کہ نچلے طبقہ کی عام جنتا نے تحریک میں پورا تعاون دیا تھا۔19 متوسط اور اونچے طبقوں کی خواتین بھی تحریک میں بہت سرگرم تھیں۔ ملک کی دوسری جگہوں کے لوگوں کی طرح بہار، دہلی اور لکھنؤ کے مسلم بنکر اور نچلے طبقہ کے مسلمان تحریک میں بہت فعال حصہ لے رہے تھے۔ شہروں اور گاؤں کے ناخواندہ اور غریب عوام کی مدد وحمایت غیر معمولی طریقے سے تحریک کو حاصل تھی۔ اس کا ثبوت جیل جانے والوں کی تعداد جو سرکاری روداد میں درج ہے سے اچھی طرح ملتا ہے۔ جیل جانا بھی تحریک میں اشتراک کی ایک شکل تھی۔ بنگال انسپکٹر جنرل آف پولیس ای جے لومین (E.J. Lowman) نے سرکار کی عام گھبراہٹ کو اس طرح ظاہر کیا تھا کہ ''مجھ کو اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کانگریس کو اس طرح کے ناخواندہ اور گنوار لوگوں کا تعاون حاصل ہوگا'' 20

ہندستانی عورتوں کے لیے اس تحریک کو اس وقت تک کا سب سے زیادہ آزادی دلانے والا تجربہ کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں اس کے ذریعہ ہی وہ پبلک زندگی میں داخل ہو پائیں۔

باب۔23

کراچی سے واردھا تک

1932 سے 1934 تک

گاندھی اردن یا دہلی سمجھوتہ کو منظوری دینے کے لیے 29 / مارچ 1931 کو کراچی میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس سے چھ روز قبل بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو پھانسی دی گئی تھی۔ گاندھی جی نے ان کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی پھر بھی لوگ خاص طور سے نوجوان ان سے بہت ناراض تھے۔ ان کی منشا کے مطابق گاندھی جی کو اسی مسئلہ کے تحت سمجھوتہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دینا چاہیے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی جاتے ہوئے گاندھی جی کو لوگوں کی سخت مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ کالے جھنڈے دکھا کر ان کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ کانگریس نے گاندھی جی کے ذریعہ تحریر کردہ قرارداد (Resolution) کو پاس کر دیا جس میں ان تینوں شہیدوں کی بہادری اور قربانی کی تعریف کی گئی اور کسی بھی طرح کی سیاسی ہنسا (Violence) کی حمایت نہ کرنے کی بات بھی دوہرائی گئی[1]۔ کانگریس نے دہلی سمجھوتہ کو اپنی منظوری دیتے ہوئے پورن سوراج (مکمل آزادی) کے اپنے اصلی مقصد کو پھر دوہرایا۔

کراچی اجلاس ایک یادگار واقعہ تھا کیونکہ کانگریس نے پہلی بار بنیادی حقوق اور قومی مالی پروگراموں پر اپنی قرارداد پاس کیا تھا۔ یوں تو کانگریس اپنے جنم کے روز سے ہی عوام کی اقتصادی ترقی، شہری آزادی اور سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کرتی آ رہی تھی، لیکن یہ پہلا موقع تھا جب اس نے عوام کو سوراج کا مطلب واضح کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ بھوک سے مرتی جنتا کے استحصال کو ختم کرنے کے لیے سیاسی آزادی کے ساتھ مالی آزادی ضروری ہے۔ قرارداد میں بنیادی شہری حقوق یعنی اظہار خیال کی آزادی، پریس کی آزادی، سبھا کرنے اور تنظیم بنانے کی آزادی، قانون کی نگاہ میں بغیر امتیاز رنگ ونسل، جنس ومذہب سبھی کو برابری کا درجہ، مذہب کے بارے میں حکومت کا غیر جانبدارانہ رویہ، الیکشنوں میں بالغ رائے دہی اور لازمی مفت پرائمری تعلیم کی گارنٹی دی گئی۔ اس کے علاوہ لگان اور مال گزاری میں مناسب کمی، غیر کاشت بیکار زمینوں کا لگان سے چھوٹ، کسانوں کو قرض میں راحت اور سود خوری پر بندش، مزدوروں کی بھلائی کے لیے بہتر شرطیں جس میں کفالت بھر کی مزدوری اور کام کے اوقات کا تعین شامل تھا، مزدور عورتوں کی حفاظت مزدور کسانوں کو یونین بنانے کی آزادی اور خاص خاص صنعتوں، کانوں اور آمدورفت کے ذرائع کا سرکاری ملکیت میں رکھنے کی گارنٹی دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ اقلیتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی زبان، تہذیب وتمدن اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی[2] یہی کراچی قرارداد کانگریس کی سیاسی اور مالی پالیسیوں کا بنیادی دستاویز تھا جو بعد کے سالوں میں بھی اسی طرح برقرار رہا۔

دوسری گول میز کانفرنس (RTC) میں حصہ لینے کے لیے 29/اگست 1931 کو گاندھی جی جہاز سے لندن روانہ ہوئے.........اس کانفرنس میں کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ لندن کی برٹش حکومت کو کنٹرول کرنے والی سلطنت نواز سیاسی اور مالی طاقتیں ہندوستان کو کسی بھی طرح کی سیاسی یا مالی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ان کو خدشہ تھا کہ ان رعایتوں کے دینے سے ہندوستان ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ دائیں بازو کے لیڈر ونسٹن چرچل (Winston Churchill) انگلینڈ کی حکومت سے اسی بات سے ناراض تھا کہ وہ

''غدر فقیر''(Seditious Fakir) کو برابر کا درجہ دے کر گفتگو کر رہی ہے۔اس نے اس کی بڑی مخالفت کی اور ہندوستان کے لیے سخت حکومت کا مطالبہ کیا[3] دائیں بازو کے اخبار ''میل'' (Mail) نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کے بغیر برٹش کامن ویلتھ (British Common Wealth) کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔تجارتی، مالی، سیاسی، جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان ہماری سلطنت کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔اس پر اپنی گرفت کسی بھی طرح ڈھیلا کرنا کسی بھی برٹش شہری کے لیے غداری کا باعث ہوگا''[4]

ہندوستان میں اردن کی جگہ ولنگٹن (Willington) کو وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ انگلینڈ میں اکتوبر 1931 کے بعد لیبر پارٹی کے لیڈر رمزے میکڈونالڈ (Ramsay Mac Donald) کی قیادت میں نئی کابینہ نے حکومت سنبھالی۔اس کابینہ پر قدامت پسند لوگوں کا غلبہ تھا۔سیموئل ہور (Samuel Hoare) جو سخت رجعت پسند تھا، کو ہندوستان کا ہوم سکریٹری (Secretary of State for India) بنایا گیا۔گول میز کانفرنس میں حصہ لینے والے ہندستانی نمائندوں میں چند کو چھوڑ کر سب کے سب حکومت کے پٹھو، عہدہ پسند اور دنیا پرست بڑے زمیندار اور رجواڑوں کے نمائندے تھے۔حکومت نے ان لوگوں کو اس لیے منتخب کیا تھا تاکہ ان کی مدد سے گاندھی جی کے مطالبۂ آزادی کو دبایا جاسکے اور ان کے توسل سے حکومت یہ بھی دعویٰ کرتی تھی کہ کانگریس سلطنت انگلینڈ کے مقابلہ میں ہندوستان کے سبھی طبقوں کی نمائندگی نہیں کرتی ہے۔

گجراتی کے عظیم شاعر میگھانی (Meghani) نے گول میز کانفرنس کی بات گاندھی جی کے لندن روانگی کے قبل اپنی نظم کو شروع کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا تھا ''چھیلو کٹو رو جرنو آ، پی جایو باپو''، (زہر کی آخری گھونٹ بھی پی جاؤ) گاندھی جی کا خود بھی یہی خیال تھا''۔میں جانتا ہوں کہ لندن میں کیا حاصل ہونے والا ہے، بری طرح مایوسی ہوگی، میں وہاں سے خالی ہاتھ ہی واپس ہوں گا''[5] اور لندن میں یہی کچھ ہوا۔برٹش حکومت نے کانگریس کا بنیادی مطالبہ آزادی ہی سرے سے خارج کردیا۔ستمبر 1931 کے آخر میں جب گاندھی جی ہندوستان واپس لوٹے

تب یہاں سیاسی ماحول بدل چکا تھا۔

ہندوستان کے بڑے انگریز افسروں نے دہلی سمجھوتہ کے سیاسی اثرات سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس نے کانگریس کے وقار اور ہندستانی عوام کے سیاسی حوصلہ کو بڑھایا ہے مگر انگریزی حکومت کے وقار کو دھکا لگا ہے۔ وائسرائے کے ساتھ ساتھ ان سب کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ حکومت نے کانگریس سے بات چیت اور سمجھوتہ کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے تو حکومت اور کانگریس کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اس لیے اب وہ لوگ سمجھوتہ کو ختم کرنے پر تلے تھے"۔ کوئی سمجھوتہ نہیں، کوئی صلح نہیں، گاندھی سے وائسرائے کی اب کوئی میٹنگ نہیں" حکومت کے بھی اصولی اقوال بن گئے تھے۔

انگریزی حکومت کی نئی پالیسی کے تین خاص کام تھے۔

(1) گاندھی جی نے 1919، 21-1920 اور 1930 میں جس طرح کی عوامی تحریک چلائی تھی، ویسی تحریک چلانے کا موقع ان کو نہ دیا جائے۔

(2) سرکاری عملہ، گاؤں سطح کے افسروں، پولیس اور سرکار کے اعلیٰ افسروں اور وفاداروں یعنی "اپنے دوستوں" کے درمیان گاندھی جی کے بڑھتے ہوئے اثرات سے ہمارے اندر ناامیدی کے جذبات نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ ہم کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ گاندھی جی حکومت کے خلاف مقابلہ کی ایک طاقت بن کر ابھر رہے ہیں۔ ہوم ممبر ایچ۔ جی۔ ہیگ (H.G. Haig) نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم کانگریس کی مدد اور تعاون کے بغیر حکومت کر سکتے ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اس کا تعاون مجھ کو ملے گا بھی نہیں، مگر ہم ان لوگوں کو بغیر اعتماد میں لیے کام نہیں کر سکتے جنھوں نے کانگریس کے خلاف لڑی گئی لمبی جنگ میں ہمارا ساتھ دیا ہے"[6]

(3) قومی تحریک کو دیہی علاقوں میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے سے روکا جائے کیونکہ اس وقت یہ پورے ہندوستان میں خصوصاً یوپی۔ گجرات آندھرا، بہار، بنگال اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں زور پکڑتی جارہی ہے۔

ادھر گاندھی جی لندن میں تھے اور ادھر ہندوستان میں گورنمنٹ نے خفیہ طریقے سے

قومی طاقتوں کو کچلنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر تحریک چھیڑنے کی کوشش کی گئی تو اس کو فوراً ناکام کر دیا جائے اور گاندھی جی کو تحریک کی ابتدا میں ہی گرفتار کر لیا جائے۔ حکومت نے حکم ناموں کے مسودے (Ordinances) تیار کر ڈالے جن کے تحت سول حکومت کی آڑ میں مارشل لا کا قیام ہو سکے۔

صلح کی مدت کے دوران ہی اتر پردیش، شمالی مغربی سرحدی صوبہ (NWFP) اور بنگال میں جو کچھ ہوا اس سے پتہ چل گیا کہ آگے کیا ہونے والا ہے یو پی میں کانگریس لگان میں کمی کرنے، بقایا لگان کو معاف کرنے اور لگان نہ دینے پر کاشتکاروں کو بے دخل نہ کرنے کی مہم چلا رہی تھی۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ کے شروع ہوتے ہی کانگریس نے پانچ ضلعوں میں ''کوئی لگان نہیں'' ''کوئی محصول نہیں'' (Revenue) کی تحریک چلا رکھی تھی۔ حکومت نے 26/دسمبر کو جواہر لعل نہرو کو اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ گاندھی جی سے ملنے بمبئی جا رہے تھے۔ شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں حکومت پر امن خدائی خدمت گاروں اور کسانوں پر بے انتہا ظلم ڈھا رہی تھی (چونکہ خدائی خدمت گار لال قمیض میں ملبوس رہتے تھے۔ اس لیے ان کو لال قمیض بھی کہا جاتا تھا) ان لوگوں کا قصور صرف یہ تھا کہ یہ لوگ حکومت کی جارحانہ وصولی کی مخالفت کر رہے تھے۔ 24/دسمبر کو ان کے نیتا خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر لیا گیا اور پیشاور ضلع پر فوج نے قبضہ کر لیا۔ بنگال میں حکومت کالے قانون کے ذریعہ راج کر رہی تھی۔ دہشت گردی سے نمٹنے کے نام پر ہزاروں لوگوں کو جیل میں ٹھونس رکھا تھا۔ ہجلی جیل (Hijli jail) میں ستمبر میں پولیس نے سیاسی قیدیوں پر گولیاں تک برسائیں جس میں دو لوگ مارے گئے۔

28/دسمبر کو گاندھی جی لندن سے بمبئی واپس آ گئے۔ اس کے دوسرے روز ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں سول نافرمانی تحریک کو پھر سے شروع کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ 31/دسمبر کو گاندھی جی نے وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لیے وقت چاہا اور اطمینان دلایا کہ جب تک بات چیت نہیں ہو جاتی، سول نافرمانی تحریک شروع نہیں کی جائے گی۔ وائسرائے نے گاندھی جی سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اگلے پانچ سالوں میں کیے گئے انکاروں میں یہ پہلا انکار

تھا۔ 4 جنوری 1932 کو حکومت نے قومی تحریک پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا اور سرکاری افسروں کو لامحدود اختیارات دینے والے کئی حکم نامے (Ordinances) جاری کیے۔ ایک مورخ کے مطابق اس طرح سول مارشل لا کی شروعات ہوگئی۔ لوگوں کے شہری حقوق ختم کر دیے گئے۔ اب سرکاری افسران کسی کو اپنی مرضی سے گرفتار کر سکتے تھے، ان کی جائدادیں ضبط کر سکتے تھے۔ ایک ہی ہفتہ کے اندر سبھی پرانے کانگریسی لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

عوام غم وغصہ سے بے چین ہو اٹھی۔ اگرچہ کانگریس نے بغیر تیاری کے حکومت کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی، پھر بھی عوام نے پورے طور سے ساتھ دیا۔ پہلے چار مہینوں کے دوران ہی تقریباً اسی ہزار ستیہ گرہی جن میں شہر اور گاؤں کے غریب لوگ شامل تھے، جیل گئے۔ لاکھوں نے شراب اور بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر دھرنا (Picketing) دیا۔ آرڈیننسوں کی خلاف ورزی کرنا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ قانون کی پرواہ کیے بغیر میٹنگیں، پرامن مظاہرے اور قومی ایام (National Days) پر مختلف جلسے کیے جانے لگے۔

حکومت پرامن تحریک کو کچلنے کے لیے بڑی بے رحمی اور سختی پر تل گئی۔ اس نے کانگریس اور کانگریس سے منسلک تنظیموں کو غیر قانونی قرار دے کر ان کے دفتروں اور ان کے پاس جمع رقوم پر قبضہ کر لیا۔ سبھی گاندھی آشرموں پر پولیس کا قبضہ ہوگیا۔ پرامن مظاہرین، دھرنا دینے والوں اور ستیہ گرہیوں پر پولیس نے لاٹھیاں برسائیں، ان کو بری طرح مارا پیٹا گیا اور قید بامشقت کی سزائیں دی گئیں۔ ان سے بھاری جرمانہ وصول کیا گیا۔ جرمانے کی عدم ادائیگی پر ان کی جائدادوں کو معمولی قیمت پر نیلام کر کے جرمانے کی رقم وصول کی گئی۔ جیلوں میں ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا گیا۔ کوڑے کی مار کھانا تو عام بات تھی۔ دیہی علاقوں میں محصول نہ ادا کرنے کی تحریک چلانے والوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے گئے۔ ان کی زمین، مکان، مویشی، کھیتی کے اوزار نیز دوسری جائدادیں قرق کر لی گئیں۔ گجرات کے گاؤں راس (Ras) میں ٹیکس کی عدم ادائیگی پر کسانوں کو ننگا کر کے سب کے سامنے کوڑے لگائے گئے اور بجلی کے کرنٹ مارے گئے۔ عورتوں کے ساتھ بے حد سختی کی گئی۔ جیلوں میں ان کو بڑی اذیت دی گئی جس سے عورتوں میں دہشت پیدا

ہو اور وہ ستیہ گرہ سے دور رہیں۔ پریس کا منہ بری طرح بند کر دیا گیا۔ وہ کسی قسم کی کوئی خبر تحریک کے بارے میں نہیں چھاپ سکتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ کسی بھی قومی لیڈر کی تصویر چھاپنے کی سخت ممانعت تھی۔ 1930 کے نصف اول میں 109 صحافیوں اور 98 چھاپہ خانوں کے خلاف تعزیری کارروائی کی گئی۔ سارے قومی لٹریچر، نظموں، کہانیوں، ناولوں وغیرہ کے چھاپنے پر پوری طرح پابندی لگادی گئی۔

لوگوں نے جم کر اس ظلم کا مقابلہ کیا، مگر گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں کو تحریک کو تیز کرنے کا موقع نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ سرگرمی بہت دنوں تک نہیں چل سکی۔ کچھ ہی مہینوں میں اس کو بری طرح پست کر دیا گیا۔ اگست 1932 میں جیلوں میں ستیہ گرہیوں کی تعداد گھٹ کر 4500 رہ گئی اور اگست 1933 تک صرف 3047 ستیہ گرہی جیلوں میں رہ گئے۔ پھر بھی گاندھی جی کے ذریعہ تحریک واپسی کا اٹل فیصلہ لینے تک یہ چھٹ پٹ طریقے سے اپریل 1934 کے شروع تک چلتی رہی۔

تحریک کے واپس لینے پر سیاسی کارکنوں کا حوصلہ و جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ تمام لوگ سوال کرنے لگے کہ ہم کو حاصل کیا ہوا۔ جواہر لعل نہرو جیسے فعال اور باہمت شخص کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اپنی بیمار بیوی سے الگ ہونے کا غم تو ان کو تھا ہی، نئی صورتِ حال نے ان کی تکلیف میں مزید اضافہ کیا۔ جون 1935 میں جیل کی اپنی ڈائری میں انھوں نے اپنے غم و یاس کو نظم میں اس طرح نقل کیا ہے: ''میری بیٹی، غم کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ان کی خوشگوار سرسراہٹ ساکت ہے۔ پر امید دل اب رنج و الم سے بوجھل ہے''[7]

Sad winds where your voice was;

Tears, tears where my heart was; and even with me,

Child, even with me,

Silence where hope was."7

جب گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی تو جواہر لعل نہرو بہت اداس ہوئے۔ ان کو بڑا

صدمہ پہنچا۔گاندھی جی کے ساتھ ان کا مدتوں کا تعلق خاتمہ پر پہنچ گیا۔[8] سبھاش چندر بوس اور بٹھل بھائی پٹیل کو ان کی قیادت پر ہی شک ہونے لگا۔ 1933 میں یورپ میں ان لوگوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ''سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مہاتما گاندھی ناکامیاب ہو گئے'' انھوں نے مطالبہ کیا کہ ''نئے اصولوں اور طریقوں پر کانگریس کو دوبارہ منظم کیا جانا چاہیے اور اس کے لیے نئی قیادت کی ضرورت ہے''[9]

قومی خیمہ میں پیدا ہوئی اس مایوسی پر دشمنوں کو بڑی خوشی ہوئی۔اس سلسلہ میں وہ ایک طرح سے غلط فہمی کا شکار ہوئے۔تبھی تو شروع 1933 میں ولنگٹن نے اعلان کیا کہ ''1930 کے مقابلے میں کانگریس کی حالت قطعی طور سے بدتر ہے۔عوام کے اوپر اس کی گرفت ختم ہوگئی ہے''[10] لیکن ولنگٹن اور اس کے ساتھی انڈین نیشنل موومینٹ کی فطرت اور خصلت کو سمجھ نہیں سکے کہ بنیادی اعتبار سے اس کا واحد مقصد مردوں اور عورتوں کی ذہن سازی ہے۔اس زاویہ نگاہ سے اگر غور کیا جائے تو جس طرح اروِن کی بات چیت کی پالیسی پہلے بے سود ہوگئی تھی، اسی طرح ولنگٹن کی جبر وظلم کی پالیسی بھی ناکام رہی۔تحریک کو عارضی طریقے سے تو ضرور پست کر دیا گیا مگر لوگوں کی سیاسی بیداری کو دبایا نہ جاسکا۔لوگوں میں بھی سیاسی ہوشمندی اور بھی مستحکم، مضبوط اور تیز ہوئی۔1930 اور 1934 کے دوران تحریک ملک کو آزادی دلانے میں کامیاب تو نہیں ہوئی مگر لوگوں میں آزادی کے لیے جنگ کرنے کا حوصلہ تیز سے تیز تر ہوا۔برٹش حکومت کے تئیں لوگوں کا اعتبار بری طرح مجروح ہوا۔مزدور نواز صحافی ایچ۔این۔بریلس فورڈ (H.N. Brailsford) نے قومی تحریک کے حالیہ جدوجہد کے نتیجے کو بڑے زوردار الفاظ میں لکھا کہ ''ہندوستان نے اپنے ذہن کو آزاد کر لیا ہے۔انھوں نے اپنے دلوں میں آزادی حاصل کر لی ہے''[11]

اور جیسا ہم پہلے غور کر چکے ہیں کہ کوئی بھی تحریک متواتر عرصہ دراز تک نہیں چل سکتی، اس کو ستانا اور تازہ دم ہونا پڑتا ہے۔تحریک واپس لینے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہار گئے یا ہم نے عوام کی تائید کھو دی۔ڈاکٹر انصاری کے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''ہم بہت لڑ چکے ہیں، اب تھوڑا سستا لیں جس سے کہ اگلے دن ہم اس سے بہتر طریقے سے اور بڑی لڑائی

لڑ سکیں'[12] سول نافرمانی تحریک کے اثرات کا اندازہ اس وقت ہوا جب 1934 میں سیاسی قیدی جیل سے رہا ہوئے۔ عوام نے ان کا خیر مقدم اتنے پر جوش طریقے سے کیا کہ اس کا تصور ہی ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ تحریک کے نتائج اور بھی کھل کر سامنے آئے جب 1937 کے انتخاب میں گیارہ صوبوں میں سے چھ میں کانگریس نے اکثریت حاصل کر لی۔

اس عہد کے لیڈروں میں صرف گاندھی جی ہی ایسے شخص تھے جو سول نافرمانی کی غرض وغایت اور اس کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ستمبر 1933 میں انھوں نے نہرو کو لکھا "میں کسی طرح کی ہار کے احساس کا شکار نہیں ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا ملک اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ آج میں اتنا ہی پرامید ہوں جتنا میں 1920 میں تھا'[13] اپریل 1934 میں کانگریس لیڈروں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کو پھر دوہرایا کہ "نہ میں دل شکستہ ہوں اور نہ لاچاری محسوس کرتا ہوں۔ ملک نے جو توانائی حاصل کی ہے اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہے مگر مجھے ہے"[14] دراصل گاندھی جی کو اپنے ہم عصر لیڈروں پر برتری حاصل تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اپنی سیاسی سرگرمی بنائے رکھنے کے لیے تحریک کے چلتے رہنے کی ضرورت کو وہ لوگ محسوس کرتے تھے۔ جبکہ گاندھی جی تعمیری و اصلاحی کام کو اس کا متبادل مانتے تھے۔

انگریزوں کی بانٹو اور راج کرو (Divide and Rule) پالیسی کی ایک اور عملی شکل اگست 1932 میں فرقہ وارانہ بخشش تھی۔ اس کے تحت ہر ایک اقلیتی فرقہ کے لیے اسمبلیوں میں کچھ جگہیں محفوظ کر لی گئی تھیں۔ ان کے ممبروں کا انتخاب انھیں فرقوں کے ووٹروں کے ذریعہ ہونا تھا، یعنی مسلمان صرف مسلمان کو اور سکھ صرف سکھ کو ووٹ دے سکتے تھے۔ مسلمان، سکھ اور عیسائی پہلے ہی سے اقلیت مانے جا رہے تھے۔ اب اس نئے قانون کے تحت دلت طبقہ (آج سیڈولڈ کاسٹس کہا جاتا ہے) کو بھی اقلیت قرار دے کر ہندو سماج سے الگ کر دیا گیا۔

کانگریس مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے لیے الگ سے حلقہ انتخاب کے خلاف تھی۔ اس کے مطابق اس سے فرقہ واریت کو ہوا ملے گی۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ ان کے مفاد

دوسرے ہندوستانیوں سے مختلف ہیں۔ انگریزوں کی تو پالیسی ہی تھی کہ ہندستانی عوام میں نفاق پیدا ہو جس سے قومی سوچ پروان نہ چڑھ سکے اور لوگوں میں محبت اور یکجہتی نہ پیدا ہو۔ یوں کانگریس 1916 میں مسلم لیگ کے ساتھ ہوئے ایک سمجھوتے میں مسلمانوں کے لیے الگ سے حلقہ انتخاب کی بات مان چکی تھی، اس لیے اس بار اس نے کہا کہ اگرچہ وہ الگ حلقہ انتخاب کے خلاف ہے مگر اقلیتوں کی مرضی کے بغیر وہ اس طرح کی تبدیلی کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے دل سے اس کو برا مانتے ہوئے کانگریس نے فیصلہ لیا کہ وہ نہ تو اس کو تسلیم کرے گی اور نہ رد۔

بہرحال پست طبقہ کو بقیہ ہندو سماج سے الگ کرنے کی کوشش کو تقریباً سبھی قومی لیڈروں نے مخالفت کی۔ گاندھی جی اس وقت یرودا جیل میں تھے۔ اس کی خبر ملتے ہی انھوں نے حکومت کے اقدام کی سخت مخالفت کی۔ 15 انھوں نے اس کو ہندستانی اتحاد اور قومیت پر حملہ کہا۔ ان کے خیال سے پست طبقوں کی معاشرتی حالت کی اصلاح کے بارے میں اس میں کچھ بھی نہیں کہا گیا ہے۔ اگر پچھڑے اور پست طبقے کو ایک بار الگ سے فرقہ کا درجہ دے دیا گیا تو پھر چھوا چھوت کو ختم کرنے کا معاملہ ہی سرے سے دب جائے گا اور ہندو سماج میں سدھار کا کام ٹھپ ہو جائے گا۔

گاندھی جی کی دلیل تھی کہ الگ حلقہ انتخاب سے مسلمانوں یا سکھوں کو چاہے جو نقصان ہو مگر وہ پھر بھی مسلمان مسلمان رہیں گے اور سکھ سکھ، مگر اچھوتوں کے الگ حلقہ انتخاب سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ اچھوت ہمیشہ اچھوت ہی بنے رہیں گے۔ جب کہ وہ اور ان کی طرح کے بہت سارے مصلحین چھوا چھوت کے خاتمہ کے لیے بہت سرگرم تھے۔ گاندھی جی کے مطابق اچھوتوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے اسمبلیوں اور نوکریوں میں سیٹوں کے محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت ہے سماج سے چھوا چھوت کی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی۔

گاندھی جی نے مطالبہ کیا کہ دلت طبقہ کے نمائندوں کا انتخاب بالغ رائے دہی سے عام ووٹروں کے ذریعہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ انھوں نے دلت طبقہ کے لیے بڑی تعداد میں سیٹیں محفوظ کرنے کے مطالبہ کی مخالفت نہیں کی۔ اپنی بات منوانے کی غرض سے وہ 20 ستمبر 1932 سے مرن

برت پر بیٹھ گئے۔ پریس کو دیے گئے ایک بیان میں انھوں نے کہا ''مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ہے۔ اس نیک مقصد کے لیے اگر مجھ جیسی سیکڑوں زندگیاں قربان ہو جائیں تو بھی اس ظلم کا کفارہ نہیں ہو سکتا جو ہندوؤں نے اپنے ہی غریب اور لاچار ہم مذہب بھائیوں اور بہنوں پر ڈھائے ہیں''۔

کئی سیاسی ہستیوں نے گاندھی جی کے برت کو سیاسی تحریک کے اصول کے خلاف مانا۔ اس لیے ان کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگی۔ مگر عوام نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے۔ 20 ستمبر دعا و برت کے دن کے طور پر منایا گیا۔ پورے ملک میں مندر اور کنویں دلتوں کے لیے کھول دیے گئے۔ رویندر ناتھ ٹیگور نے گاندھی جی کو ٹیلیگراف کے ذریعہ ایک پیغام بھیجا ''ملک و سماج میں اتحاد اور یکجہتی کے لیے یہ بیش قیمت جان کی قربانی ہے .... ہمارے غمزدہ دل آپ کی اس شان دار تپسیا کی اتباع بڑی محبت اور عقیدت سے کریں گے''۔ مختلف نظریے کے سیاسی لیڈر جن میں مدن موہن مالویہ، ایم۔ سی۔ راجا اور بی۔ آر۔ امبیڈکر شامل تھے اب بہت فعال اور سرگرم ہو گئے۔ آخر کار ان لوگوں نے ایک سمجھوتہ جس کو پونا سمجھوتہ (Poona Pact) کے نام سے جانا جاتا ہے کے کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، جس کے تحت دلتوں کے لیے الگ سے حلقہ انتخاب کی بات ترک کر دی گئی، لیکن صوبائی اسمبلیوں میں دلتوں کی محفوظ سیٹوں کی تعداد 71 سے بڑھا کر 147 کر دی گئی۔ اور سنٹرل لیجسلیٹیو میں محفوظ سیٹوں کی تعداد میں 18 فیصدی کا اضافہ کیا گیا۔

گاندھی جی نے برت توڑنے کے بعد پونا سمجھوتہ کے بارے میں کہا ''میں اپنے ہریجن بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں .... کہ میری زندگی ان کے حوالے ہے''۔ اور وہ اپنے عہد کو پورا کرنے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہو گئے۔ پہلے جیل کے اندر اور پھر جیل کے باہر وہ پورے دو سال دوسرے اور کام کاج چھوڑ کر خالص چھوا چھوت کے خاتمہ کے لیے پوری طرح مصروف رہے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے سابرمتی احمد آباد چھوڑ کر واردھا آشرم چلے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے 1930 میں تہیہ کیا تھا کہ سوراج حاصل ہونے کے پہلے وہ سابرمتی نہیں لوٹیں گے۔ 7 نومبر 1933 کو واردھا سے گاندھی جی نے اپنی ہریجن یاترا شروع کی۔ 29

جولائی 1934 تک وہ پورے نو ماہ ملک کا دورہ کرتے رہے۔ انھوں نے بیس ہزار کلومیٹر کا سفر ٹرین، کار، بیل گاڑی اور پیدل طے کیا۔ ''ہریجن سیوک سنگھ'' جو حال ہی میں ہریجنوں کی بہبودی کی غرض سے قائم کیا گیا تھا کے لیے رقم اکٹھا کرتے ہوئے ہر طرح کی چھوا چھوت کے خاتمہ کے لیے انھوں نے زبردست اشاعتی مہم چلائی، اور پسماندہ لوگوں کو ہریجن نام سے موسوم کیا۔ ان کی معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کو اونچا اٹھانے کے لیے سماجی کارکنوں کو گاؤں گاؤں جا کر کام کرنے کی صلاح دی۔

ہریجن ترقی مہم کے دوران گاندھی جی دو بار 8 مئی اور 16 / اگست 1933 کو لمبے انشن پر بیٹھے۔ اس سے ان کا مقصد اپنے پیرودں کو اس کام کی اہمیت سے اچھی طرح آگاہ اور مطمئن کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ''یا تو وہ چھوا چھوت کو جڑ سے ختم کر دیں یا پھر مجھے ہی اپنے درمیان سے ہٹا دیں'' برت کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ''یہ میرے ضمیر کی آواز ہے''۔ ''میرے ذہن کی پکار ہے'' برت کی اس پالیسی سے قومی خیمہ میں حیرانی پیدا ہوئی۔ کچھ لوگ بے انتہا بے چین ہوئے۔ 8 مئی 1933 کے برت کی مخالفت تو ان کی بیوی کستور با تک نے کی۔ جب برت کا وقت قریب آیا تو میرا بین (Miraben) نے گاندھی جی کو ایک ٹیلیگرام بھیجا۔ ''با کو بہت صدمہ ہے ان کے خیال سے آپ کا فیصلہ بہت غلط ہے، لیکن آپ نے کسی کی بات نہیں مانی ہے۔ اس لیے ان کی بھی بات نہیں مانیں گے۔ صدق دل سے وہ آپ کے لیے دعا کر رہی ہیں''۔ گاندھی جی نے نرالا جواب دیا'' با سے کہہ دیجیے کہ ان کے والد نے ان کے اوپر ایسا آدمی تھوپ دیا ہے جس کے ساتھ کوئی دوسری عورت نہیں رہ سکتی۔ ان کا پیار ہی میرے لیے قیمتی چیز ہے۔ ان کو آخری دم تک باہمت بنے رہنا چاہیے''۔

ہریجن مہم کے دوران دقیانوس اور رجعت پسند لوگوں کے ذریعہ گاندھی جی کی قدم قدم پر مخالفت کی گئی۔ ان کو کالے جھنڈے دکھائے گئے اور ان کے جلسوں کو منتشر کیا گیا۔ ان کے خلاف ہتک آمیز پرچے نکالے گئے اور ان کی ہر طرح سے کردار کشی کی گئی۔ ان کے اوپر ہندو مذہب کی اہانت کا الزام لگایا گیا۔ عام پبلک میں ان کے پتلے جلائے گئے۔ یہی نہیں، 5 / جون

1934 کو پونا میں ایک کار پر یہ سوچ کر بم پھینکا گیا کہ گاندھی جی اس میں سوار ہیں دہشت گردی کی اس حرکت میں سات لوگ مجروح ہوئے۔ انھیں مخالفین نے کانگریس اور سول نافرمانی تحریک کے خلاف حکومت کو مدد دینے کی پیش کش کی بشرطیکہ وہ چھوا چھوت کے خلاف چل رہی مہم کی تائید نہ کرے۔ حکومت نے انہی کی حمایت میں اگست 1934 میں لجسلیٹو اسمبلی میں مندر داخلہ قانون (Temple Entry Bill) گرادیا۔

گاندھی جی نے اپنے برت اور ہریجن ادھار کاوش کے دوران جن باتوں پر بہت زور دیا، ان میں ہریجنوں پر ہورہے ظلم کی بات خاص تھی۔ ہندو سماج کو انھوں نے اس کے لیے موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا کہ ''ہریجنوں کی سماجی حیثیت جذام کے مریض کی سی ہے۔ مالی اعتبار سے وہ کنگال ہیں اور مذہبا ان کو مندروں جو خدا کے گھر مانے جاتے ہیں، میں داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔ پبلک اسکولوں، سڑکوں، اسپتالوں اور کنوؤں، پانی کے نلوں اور پارکوں وغیرہ کا استعمال بھی ان کے لیے ممنوع ہے۔ شہروں، قصبوں اور گاؤں میں ان کو ایسی بدترین جگہ بسایا جاتا ہے جہاں کسی طرح کی کوئی بھی سہولت ان کو میسر نہ ہو''۔ اس کے لیے سب سے پہلے انھوں نے مندروں میں ہریجنوں کے داخلے کا معاملہ اٹھایا۔

گاندھی جی کی پوری تحریک انسانی قدروں اور شعور کی بنیادوں پر منحصر تھی۔ چھوا چھوت کو باطل قرار دینے کے لیے وہ شاشتروں کا حوالہ دیتے تھے کہ ہندو دھرم گرنتھوں میں چھوا چھوت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی کسی بھی شکل کا ذکر ان میں نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر کسی مذہبی کتاب نے اس برائی کو تسلیم بھی کیا ہو تو بھی ہریجنوں کو اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ قطعاً ہمت نہ ہاریں۔ سچائی کسی ایک ہی کتاب میں بند نہیں ہے۔ جو کتابیں انسانی عظمت کو پامال کرتی ہیں ان کو نظر انداز کر دینا چاہیے''۔

ان کی تقریروں اور تحریروں کا لب لباب یہی تھا کہ ''ہم اونچی ذات کے ہندوؤں نے ہریجنوں اور دلتوں پر صدیوں سے جو ظلم ڈھاتے آئے ہیں، اس کے لیے اب ہم کو توبہ کرنا چاہیے، اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے''۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی امبیڈکر اور دوسرے ہریجن نیتاؤں کے تئیں

بدگمان نہیں تھے۔وہ ان کی تنقیدوں کو برا نہیں مانتے تھے۔گاندھی جی نے لکھا تھا ''مجھ پر بھروسہ نہ کرنے کا ان کو پورا حق ہے۔آخر میں بھی تو ہندوؤں کے اونچے طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں جس نے ہریجنوں کو کچل کر رکھ دیا ہے، ان پر بے انتہا ظلم ڈھائے ہیں''۔انھوں نے اونچی ذات کے ہندوؤں کو خبردار کیا کہ ''اگر چھوا چھوت کا مرض ختم نہ ہوا تو ہندو سماج ختم ہو جائے گا اور اگر ہندو مذہب کو زندہ رکھنا ہے تو چھوا چھوت کو ختم کرنا ہی ہوگا''۔(شاید یہ ہندو سماج کا کفارہ ہی تھا کہ جو ہندو 1947 کے پہلے پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے انھوں نے بڑی تیزی سے آزادی کے بعد نوکریوں وغیرہ میں سیڈولڈ کاسٹس اور شیڈولڈ ٹرائبس کے لیے بڑے پیمانے پر سیٹوں کو محفوظ کرنے کا قانون بنایا)۔

گاندھی جی اس بات کے حق میں بھی نہیں تھے کہ چھوا چھوت مٹانے کے لیے غیر برادری سے روٹی بیٹی کا رشتہ جوڑا جائے۔ان کے خیال سے رشتوں کی پابندی ہندو سماج کی ترقی میں حارج ہے۔مگر اونچی ذات کے ہندوؤں اور ہریجن برادریوں میں بذات خود اس طرح کے رشتے نہیں پائے جاتے ہیں''۔گاندھی جی کہتے تھے کہ ہریجنوں کو اوپر اٹھانے کی آل انڈیا مہم کا صرف یہی مقصد ہے کہ ان کے درمیان پائی جانے والی برائیوں اور دشواریوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے وہ پست اور ذلت ہیں۔اس طرح انھوں نے چھوا چھوت خاتمہ اور ذات برادری خاتمہ میں فرق سمجھا۔وہ ڈاکٹر امبیدکر کے اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ ''اچھوت ہونا ذات پات سسٹم کی ہی اپج ہے۔جب تک ذات پات سسٹم رہے گا، اچھوت اچھوت بنے رہیں گے۔ذات پات سسٹم کو ختم کیے بغیر اچھوت ادّھار ناممکن ہے''۔مگر گاندھی جی کہتے تھے کہ ''ورن آشرم (ذات پات سسٹم) کی چاہے جو خامیاں ہوں، اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں، لیکن چھوا چھوت گناہ ہے''۔وہ یہ بھی کہتے تھے کہ چھوا چھوت ذات پات سسٹم کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ تو اونچ نیچ کے مصنوعی بٹوارے کا نتیجہ ہے۔ذاتیں اگر ایک دوسرے کی مددگار بن کر کام کریں تو ذات سسٹم میں کوئی برائی نہیں ہے۔کوئی ذات نہ اونچی ہے اور نہ نیچی۔ان کے خیال سے ورن آشرم کے موافقین اور مخالفین ایک ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں کیونکہ دونوں ہی چھوا چھوت کے خلاف ہیں''۔

گاندھی جی یہ بھی مانتے تھے کہ چھوا چھوت کے خلاف جدو جہد کا مثبت اثر فرقہ واریت جیسے دوسرے مسائل پر بھی پڑے گا۔ ہندو غیر ہندوؤں کو اچھوت مانتے ہیں خصوصاً کھانے پینے کے معاملہ میں اور غیر ہندوؤں پر خاص طور سے اس کا اثر پڑا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ چھوا چھوت ختم ہونے پر سارے ہندو ایک ہو جائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ سماج نے انسان انسان کے درمیان اونچ نیچ کی جو کھائی کھودی ہے، چھوا چھوت اس کا ہی ایک روپ ہے۔ اس کے خلاف جدو جہد کا مطلب ہے فرق اور امتیاز کے خلاف جدو جہد اور اس کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ موجودہ جدو جہد تو اس سمت میں محض ایک شروعات ہے۔

گاندھی جی انیسویں صدی کے روشن خیال انسان تھے۔ اہنسا میں ان کی اٹوٹ عقیدت تھی۔ وہ کسی پر دباؤ ڈالنے اور جبر کرنے کے موافق نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چھوا چھوت کے موافقین جن کو وہ سناتن دھرمی کہتے تھے پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنا انھوں نے پسند نہیں کیا۔ ان کے خیال سے سناتن دھرمی جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کو برداشت کرنا چاہیے اور سمجھا بجھا کر ہی ان کو صحیح راستے پر لانا چاہیے۔ ان کے دلوں کو جیتنا چاہیے۔ وہ کہتے تھے کہ میرا برت میرے مخالفین کے خلاف نہیں ہے۔ دباؤ ڈال کر ان سے مندر اور کنویں کھلوانا بھی میرا مقصد نہیں ہے۔ میں تو ان کے ذریعہ اپنے موافقین اور ساتھیوں کی ہمت بڑھانا چاہتا ہوں تا کہ وہ دوہرے حوصلے اور جذبے سے چھوا چھوت کے خاتمہ کے لیے ڈٹ جائیں۔

گاندھی جی کی ہریجن اُدھار تحریک میں خود ہریجن سماج میں انھیں کے ذریعہ اصلاح کرنے کی بات شامل تھی مثلاً تعلیم کی اشاعت صفائی وحفظان صحت پر توجہ، سور، مردار کا گوشت کھانے اور شراب سے پرہیز اور ان کے اندر خود چھوا چھوت کا خاتمہ۔ مگر وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہریجن ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے ستیہ گرہ، دھرنا اور مظاہرہ جیسے مجاہدانہ کام کا سہارا لیں۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ہریجنوں کے اندر بیداری اور شعور پیدا ہو۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کی پسند اور ناپسند کا خیال کیے بغیر وہ خود اپنی حالت کو سدھارنے کی جدو جہد کریں۔

گاندھی جی نے بارہا اس بات پر زور دیا کہ ہریجن تحریک سیاسی تحریک بالکل نہیں ہے۔

اس کا واحد مقصد ہندو اور ہندو سماج کو پاک وصاف کرنا ہے۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ اس تحریک کے بہت دوررس سیاسی نتائج برآمد ہوں گے۔ چھوا چھوت کی وبا نے ہمارے معاشرتی اور سیاسی ماحول کو زہر آلود کر دیا ہے۔ حقیقت میں گاندھی جی نے ہریجن تحریک کے دوران صرف ہریجنوں کے لیے ہی کام نہیں کیا۔ انھوں نے کانگریس کارکنوں سے کہا کہ عوام کی عدم تحریک کے دوران وہ بہت سے اصلاحی اور رفاحی کام کر سکتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چھوا چھوت تحریک نے قومیت کے پیغام کو ڈھیرے ڈھیرے ہریجنوں تک پہنچایا۔ انھیں طبقوں کے لوگ ملک کے زیادہ تر حصوں میں کھیتی مزدور تھے۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ قومی اور کسان تحریکوں سے منسلک ہوتے چلے گئے۔

باب-24

بائیں بازو کا ابھار

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سالوں اور تیسری دہائی کے دوران بہت زوردار بائیں بازو کی ترقی ہوئی۔ قومی تحریک کے بنیادی مقصد کو متاثر کرنے میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ حصول آزادی کے مقصد کے ساتھ اس کا معاشرتی اور اقتصادی نظریہ صاف اور کھل کر سامنے آیا۔ آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد اور بیکس مظلوم اور محنت کش عوام کو ان کی معاشرتی اور اقتصادی زبوں حالی سے نجات دلانے کی جدوجہد ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ سوشلسٹ نظریات ہندوستان کی سرزمین میں پہنچنے شروع ہوئے اور سوشلزم نوجوانوں کا مقبول عقیدہ بن گیا۔ جواہر لعل نہرو اور سبھاش چندر بوس اس نظریے کی نمایاں علامت بن گئے تھے۔ دھیرے دھیرے بائیں بازو کی دو طاقتور پارٹیاں....... کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی (CSP) ابھر کر منظر عام پر آئیں۔

روسی انقلاب کا ان سب پر خاص اثر پڑا۔ 7/نومبر 1917 میں آئی۔ وی۔ لینن (I.V. Lenin) کی قیادت میں بالشیوک (کیمونسٹ) نے روس میں زار شاہی کا تختہ پلٹ کر

سوشلسٹ حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ روس کے نئے سوشلسٹ حکمرانوں نے چین اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں قائم اپنے کالونیائی اختیارات کو ترک کرنے کا اعلان کیا۔ روس کے اس نئے نظام حکومت سے کلونیل ملکوں میں روشنی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے ایک سبق اس واقعہ سے یہ بھی لیا کہ اگر عام لوگ یعنی کسان مزدور اور اہل علم طبقے متحد ہو کر زار شاہی حکومت کا تختہ پلٹ کر ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کر سکتے ہیں جس میں کوئی کسی کا استحصال نہیں کرتا ہے تب تو انگریزی سلطنت کے ساتھ برسرِ جنگ ہندستانی عوام بھی ایسا کر سکتی ہے۔ اس لیے سوشلسٹ اصول خصوصاً مارکسی نظریۂ فکر جو بالشیوک پارٹی کا رہنما اصول تھا، نے لوگوں کو بے حد موہ لیا اور ایشیا کے رہنے والے خاص طور سے اس کی طرف کھچے۔ 1919 میں انتہا پسند (Extremist) بپن چندر پال نے لکھا تھا ''آج جرمنی کی فوجی حکومت کے زوال اور مطلق العنان زار شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد پورے سنسار میں عوام کی ایک نئی طاقت ابھری ہے جو اپنے جائز حقوق کے تحفظ اور دولت مند و نام نہاد اونچے طبقوں کے ذریعے کیے جا رہے استحصال اور ظلم سے نجات پا کر آزادی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا اختیار حاصل کرنے کے لیے پوری طرح کمر بستہ ہے''[1] سوشلسٹ فکر تیزی سے نوجوانوں میں پھیلنے لگی، خصوصاً ان لوگوں میں جنھوں نے عدم تعاون تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور جو اس کے نتیجہ اور گاندھیائی اصول و اس کی جگہ سوراجیوں کے پروگرام سے غیر مطمئن تھے۔ اس کے نتیجہ میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی بہت سی تنظیمیں پورے ملک میں وجود میں آگئیں۔ بمبئی میں ایس۔ اے۔ ڈانگے (S.A. Dange) نے ''گاندھی اور لینن'' نام کا ایک پمفلٹ شائع کیا اور پہلے ہفتہ وار پرچہ کی شروعات کی جس کا نام ''دی سوشلسٹ'' تھا۔ بنگال میں مظفر احمد نے ''نو یگ'' نکالا اور بعد میں نظر الاسلام کے تعاون سے ''لانگل'' (Langal) وجود میں آیا۔ پنجاب میں غلام حسین نے کچھ دوسروں کے ساتھ مل کر ''انقلاب'' شائع کیا اور مدراس میں ایم۔ سنگارویلو (M. Singaravelu) نے ''لیبر کسان گزٹ'' کی بنا ڈالی۔

1927 کے بعد سے پورے ملک میں طلبا تنظیموں کا جال سا بچھ گیا۔ 1928 اور 1929 کے دوران سیکڑوں نوجوان کانفرنسوں کا نظم بھی پورے ملک میں کیا گیا۔ جن معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی برائیوں سے ملک دوچار ہو رہا تھا ان کا کلی حل تلاش کرنے کی پرزور کوشش کی

گئی۔ سلطنت، سرمایہ داری اور زمینداری کے خلاف بولتے ہوئے جواہر لعل نہرو اور سبھاش چند بوس نے گھوم گھوم کر پورے ملک میں سوشلسٹ نظریہ کا پرچار کیا۔ چندر شیکھر آزاد اور بھگت سنگھ کی رہنمائی میں انقلابی تشدد پسند لوگوں کا جھکاؤ سوشلزم کی طرف ہوگیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پورے ملک میں ٹریڈ یونین اور کسان تحریکیں تیزی سے پھیلتی رہیں۔ پوری دنیا کساد بازاری کا شکار تھی اس لیے ان دنوں سوشلسٹ نظریہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چونکہ سرمایہ دار دنیا میں بے روزگاری کا غلبہ تھا اس لیے عالمی سطح پر مندی کے ناتے سرمایہ داری سسٹم کو بڑا دھچکا لگا اور لوگوں کا رجحان مارکسی اور سوشلسٹ نظام کی طرف گیا۔ کانگریس خیمہ میں ہی 1936 اور 1937 میں جواہر لعل نہرو اور 1938 اور 1939 میں سبھاش چندر بوس کے کانگریس کا صدر منتخب ہونے میں بائیں بازو کے رجحان کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی (CSP) کے قیام سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔

لیکن جواہر لعل نہرو وہ شخص تھے جنھوں نے قومی تحریک کو سب سے زیادہ سوشلسٹ نظریہ دیا اور 1929 کے بعد تو وہ سوشلزم اور سوشلسٹ فکر کا نمونہ بن گئے۔ ان کے خیال سے سیاسی آزادی کے ساتھ معاشرتی اور اقتصادی آزادی بھی ضروری تھی۔

نہرو چالیس سال کی بھری جوانی میں ہی 1929 کی تاریخی لاہور کانگریس کے صدر بنائے گئے اور اسی عہدہ پر وہ دو بار 1936 اور 1937 میں منتخب کیے گئے۔ کانگریس کے صدر اور گاندھی جی کے بعد عوام کے مقبول ترین لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے کئی بار ملک کا دورہ کیا، ہزاروں میل کا سفر اور کروڑوں لوگوں کو خطاب کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب ''سوانح عمری'' اور ''تاریخ عالم کی ایک جھلک'' (Auto-biography & Glimpses of World History) میں سوشلزم کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کیا اور پرزور طریقے سے اعلان کیا کہ اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔ اسی لیے سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ہی سوشلسٹ سماج قائم کیا جاتا ہے۔ اس طرح نہرو نے قوم پرست نوجوانوں کی پوری نسل کی ذہن سازی سوشلزم کے نہج پر کرنے میں کوئی کور وکسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے نوجوانوں کے دلوں میں سماج وادی قدروں کو اچھی طرح بٹھادیا۔

نہرو کے دل میں اقتصادی معاملات سے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب

1920-21 کے دوران مشرقی اتر پردیش کی کسان تحریک سے ان کا رابطہ قائم ہوا، اور 1922-23 کے دوران جب وہ جیل گئے، تو وہاں فرصت کے اوقات کا استعمال انھوں نے روسی انقلاب نیز دوسرے انقلابات کے مطالعہ میں کیا۔ کلونیل سلطنت اور اس کے ظلم کے خلاف 1921 میں بروسیلس (Brusseles) میں ہوئی بین الاقوامی کانگریس (International Congress) میں انھوں نے حصہ لیا۔ اور تبھی وہ کیمونسٹ اور وہ مجاہدین جو کلونیل سلطنت کے جور و ظلم کے خلاف لڑ رہے تھے، کی صحبت میں آئے۔ اس وقت تک وہ موٹے طور سے مارکسزم (Marxism) کو ماننے لگے تھے۔ اسی سال انھوں نے سوویت یونین کا دورہ کیا اور وہ وہاں قائم نئے سوشلسٹ سماج سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں سے واپس ہونے کے بعد انھوں نے سوویت یونین پر ایک کتاب شائع کی جس کے ٹائٹل ورق پر انھوں نے ورڈس ورتھ (Wordsworth) کے ذریعہ فرانسیسی انقلاب پر لکھی گئی نظم کی مشہور لائن تحریر کیا ''انقلاب کے ابتدائی دور میں رہنا بے حد پر مسرت تھا، مگر انقلاب کی جوانی تو مکمل جنت ہی تھی''۔ (Bliss was it in that dawn to be alive, but to be young was very heaven) ایس۔ گوپال کے لفظوں میں جب نہرو ہندوستان واپس ہوئے تب وہ ''باہوش ترقی پسند انقلابی'' بن چکے تھے[2]

جواہر لعل نہرو نے آزادی کے حصول کے لیے ''انڈیا لیگ'' (India Leagne) بنانے میں سبھاش چندر بوس کا پورا ساتھ دیا تا کہ سماج کے اقتصادی ڈھانچہ کو سوشلسٹ شکل دینے کے لیے جدوجہد کی جاسکے۔ 1929 میں کانگریس کے لاہور کانفرنس میں انھوں نے اعلان کیا ''میں تو سوشلسٹ اور جمہوریت پسند ہوں۔ میں راجاؤں مہاراجاؤں کے اقتدار میں یقین نہیں رکھتا ہوں اور مجھ کو اُس نظم میں بھی یقین نہیں ہے جو صنعت و حرفت کے جدید راجاؤں کو جنم دیتی ہے جن کا تسلط ماضی کے راجاؤں مہاراجاؤں سے بھی زیادہ عوام کی زندگی اور قسمت پر ہوتا ہے اور جن کے طور طریقے سفاک جاگیرداروں کے ہی طرح ہیں''۔ انھوں نے واضح کیا کہ ''ملک سے غریبی اور نابرابری کو دور کرنے کے لیے سوشلسٹ پروگراموں کو مکمل طور سے اپنانا پڑے گا'' کانگریس کے لیے سرمایہ اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار کے درمیان توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے کیونکہ موجودہ حالات میں میزان کا پلہ بری طرح سرمایہ داروں اور زمینداروں کے حق میں جھکا

ہوا ہے'' 3

سوشلزم کے تئیں نہرو کی دلچسپیاں 1933 اور 1936 کے دوران کھل کر ظاہر ہوئیں۔ ''ہندوستان کدھر؟'' کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے اکتوبر 1933 میں لکھا کہ ''بلاشبہ ہندوستان انسان کی معاشرتی اور اقتصادی برابری کے عظیم مقصد کے حصول کی طرف جا رہا ہے۔ وہ ایک قوم کے دوسرے قوم اور ایک طبقہ کے دوسرے طبقہ کے ذریعہ کیے جا رہے استحصال کے خاتمہ کی طرف گامزن ہے'' 4 اور دسمبر 1933 میں انھوں نے لکھا ''سچا شہری نمونہ سوشلسٹ نمونہ ہے، کیمونسٹ نمونہ ہے'' 5 اپریل 1936 میں انھوں نے لکھنؤ کانگریس کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں سوشلزم کے تئیں اپنے نظریہ کی مزید وضاحت بہت پرزور اور صاف لفظوں میں کی کہ ''مجھے کامل یقین ہے کہ پوری دنیا اور ہندوستان کے سارے مسائل کا حل سوشلزم ہے۔ میں جب اس لفظ کا استعمال کرتا ہوں تو مبہم انسانیت نواز معنی میں نہیں بلکہ سائنسی اور مالی مفہوم میں کرتا ہوں۔ میری سمجھ سے ملک کی غریبی، بے روزگاری، غلامی اور زبوں حالی کا حل سوشلزم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس کے لیے ہمارے سماجی اور سیاسی ڈھانچے میں مکمل تبدیلی درکار ہے........ محدود معنی میں نہ لے کر اس کا مطلب نجی جائداد کا خاتمہ اور منافع کے موجودہ سسٹم کی جگہ پر امداد باہمی کے اونچے اصول کا قیام ہے'' 6 انھیں دنوں نہرو نے طبقاتی تجزیہ اور طبقاتی کشمکش کے کردار پر بہت زور دیا۔

انھیں دنوں جواہر لعل نہرو اور گاندھی جی کے آپسی تعلقات میں پیچیدگی سی پیدا ہوئی۔ نہرو نے گاندھی جی کی اس لیے تنقید کی کہ وہ طبقاتی کشمکش کے اصول کو نامنظور کرتے تھے نیز وہ استحصال کرنے والوں اور استحصال سہہ رہے لوگوں کے درمیان تال میل قائم کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ گاندھی جی کے ٹرسٹی شپ (Trusteeship) کے اصول کو نہیں مانتے تھے جس کے ذریعہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کا دل ودماغ بدلنا ہوتا ہے۔ نہرو نے اپنی سوانح عمری (Autobiography) میں ایک پورا باب ہی گاندھی جی کے نظریات کے بنیادی اصولوں کی مخالفت میں صرف کیا اور بڑے نرم لہجہ میں ان کی تنقید کی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ گاندھی جی نے ہندستانی سماج میں جو کردار ادا کیا تھا یا کر رہے تھے اس کو انھوں نے پوری طرح پسند بھی کیا۔ نہرو نے اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں کے ذریعہ گاندھی جی پر کی گئی تنقید کے دفع میں جنوری 1936

میں ایک مضمون تحریر کیا کہ '' گاندھی جی نے ہندوستان میں اہم ترین انقلابی کردار ادا کیا ہے کیونکہ ان کو معاملات سے متعلق حالات کا بہترین استعمال بخوبی معلوم ہے ۔ وہ عوام کے دلوں تک پہنچ سکتے ہیں جبکہ اور زیادہ ترقی یافتہ نظریات کی دوسری جماعتیں صرف ہوا میں کام کرتی ہیں۔'' بہر حال گاندھی جی کے قول وعمل نے 'عوام میں زبردست بیداری پیدا کی اور معاشرتی مسائل کو مرکزی اہمیت دی اور جہاں کہیں بھی ضروری ہوا انھوں نے اپنی دلچسپیوں کی قیمت پر عوام کو اوپر اٹھانے پر زور دیا۔ یہی وجہ تھی کہ قومی تحریک نے عوام کی بھلائی میں کام کرنا اپنا اصلی مقصد بنایا''7

نہرو نے کانگریس اور بائیں بازو کے دوسرے لوگوں کو گاندھی جی کے بارے میں اپنائے گئے رویہ کے سلسلہ میں جو صلاح دی تھی اس کو موہت سین (Mohit Sen) نے بہت خوبصورتی سے مختصر لفظوں میں پیش کیا ہے۔ نہرو کو یقین تھا کہ '' کانگریسیوں کی اکثریت اعتدال پسند لوگوں کی غیر منظم جماعت ہے۔ گاندھی جی نہ صرف اس کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ کسی بھی عوامی تحریک کے لیے ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں کو ان سے یا معتدل لوگوں سے چاہے جتنا بگاڑ ہو ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ان کی حکمت عملی، معتدل لوگوں کو خصوصاً گاندھی جی کو بائیں بازو کی طرف راغب کرنے والی ہونی چاہیے''8

لیکن سوشلزم کے بارے میں نہرو کا ایک دائرہ عمل تھا جس میں سیاسی اور سلطنت مخالف جدوجہد کو اس وقت تک مرکزی مقام دیا گیا تھا جب تک ملک میں بدیسی حکومت قائم ہے۔ دراصل حکومت کی طاقت کو کمزور کیے بغیر ان دونوں باتوں کو نبھانا اس وقت خاص کام تھا۔ نہرو نے 1936 میں سوشلسٹوں سے یہ کہا کہ ان کو دو بنیادی باتوں نے بہت متاثر کیا ہے اور وہ یہ ہیں۔ '' قومیت اور سیاسی آزادی''۔ قومیت کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے اور '' معاشرتی آزادی'' کی نمائندگی سوشلزم کرتا ہے۔ اور ان دونوں کو ایک ساتھ جاری رکھ کر شیر وشکر کرنا ہندستانی سوشلسٹوں کا خاص کام ہے9

اس لیے نہرو نے کسی ایسی تنظیم کو بنانے کی بات پسند نہیں کی جو کانگریس سے الگ اور اس سے آزاد ہو یا گاندھی جی سے اور کانگریس کے بائیں بازو کے عنصر سے بے تعلق ہو۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کانگریس کے پورے ڈھانچہ کو تبدیل کر کے سوشلزم کے نہج پر ڈھالا جائے۔ اس کے لیے کانگریس کے پرچم کے نیچے کام کرنا ضروری ہے۔ اس میں کسان مزدور شامل ہوں اور وہ اس

میں اہم کردار ادا کریں اور یہ بھی کوشش ہو کہ بایاں بازو کسی بھی طرح قومی تحریک کی خاص دھارا سے الگ نہ ہونے پائے۔

سوویت یونین اور اس کے انقلابی نظریات سے متاثر ہو کر ہندستانی انقلابیوں کی کثیر تعداد جو بدیسوں میں جلاوطن تھی وہاں پہنچ گئی۔ ان میں سب سے مشہور اور معروف شخص ایم۔ این رائے (M.N. Roy) تھے جنھوں نے لینن کے ساتھ مل کر کلونیل ملکوں کے لیے کمیونسٹ پارٹی کی بین الاقوامی پالیسی مرتب کرنے میں مدد کی تھی۔ ایسے ہی سات ہندستانی لیڈروں نے ایم۔ این۔ رائے کی امارت میں مل کر اکتوبر 1920 میں تاشقند میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ کہ اس کوشش کے علاوہ بائیں بازو کی بہت سی جماعتیں 1920 کے بعد ملک کی سرزمین پر وجود میں آنے لگی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر تنظیموں کا جوڑ دسمبر 1925 میں کانپور میں ہوا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) نام کی ایک آل انڈیا پارٹی کا قیام ہوا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ایس۔ وی۔ گھاٹے (S.V. Ghate) اس کے جنرل سکریٹری بنے۔ پارٹی نے اپنے سبھی ممبران کو کانگریس کا ممبر بننے اور اس کے اندر رہ کر ہر ایک گوشہ میں بائیں بازو کو مضبوط کرنے اور انقلابی نیشنلسٹوں کو پورا تعاون دینے کے لیے کہا تاکہ کانگریس زیادہ سے زیادہ انقلابی اور عوامی تنظیم کی شکل اختیار کر سکے۔

شروع دور کے کمیونسٹوں کے سیاسی کام کی خاص شکل مزدور اور کسان پارٹیوں کا نظم کرنا اور انھیں کے ذریعہ کام کرنا تھا۔ اس طرح کی پہلی تنظیم کانگریس کی لیبر سوراج پارٹی (Labour Swaraj Party) تھی جس کو نومبر 1925 میں مظفر احمد، قاضی نظر الاسلام، ہیمنت کمار سرکار وغیرہ لوگوں نے بنگال میں قائم کیا تھا۔ 1926 کے آخری دور میں بمبئی میں کانگریس لیبر پارٹی اور پنجاب میں کرتی کسان پارٹی بنائی گئی۔ 1923 سے مدراس میں ایک لیبر پارٹی آف ہندوستان (Labour Party of Hindustan) کام کر رہی تھی۔ 1928 تک ان سبھی صوبائی پارٹیوں نے مل کر ملکی سطح کی تنظیم ''ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی (WPP) بنائی اور اس کی ایک یونٹ راجستھان، یوپی اور دہلی میں قائم کی گئی اور سبھی کمیونسٹ اس کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ ڈبلو۔ پی۔ پی کا خاص مقصد کانگریس کے اندر رہ کر کام کرنا تھا جس سے اس کو اور زیادہ انقلابی رجحان والی عوامی پارٹی بنایا جا سکے اور آزادانہ طریقے سے مزدوروں

اور کسانوں کو شامل کیا جائے تا کہ پہلے مرحلہ میں مکمل آزادی (Purn Swaraj) اور پھر سوشلزم کے حصول کا مقصد پورا ہو۔ ڈبلو۔ پی۔ پی۔ (WPP) نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور تھوڑے وقت میں ہر جگہ خصوصاً بمبئی میں کانگریس پر کیمونسٹ اثرات بڑھنے لگے۔ جواہر لعل نہرو نیز دوسرے انقلابی نیتاؤں نے کانگریس پر مرتب ہو رہے کیمونسٹ اثرات کا خیر مقدم کیا۔ جواہر لعل نہرو کے ساتھ سبھاش چندر بوس، نوجوان تنظیموں (Young Leagues) اور بائیں بازو کی طاقتوں یعنی ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں (Workers And Peasants Parties) نے کانگریس کے اندر بایاں بازو مضبوط بنانے اور ہندستانی قومی تحریک کو بائیں بازو کی طرف لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ٹریڈ یونین مورچہ پر ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں (WPPS) نے تیزی سے ترقی کی اور 1927 اور 1929 کے دوران محنت کش طبقہ کی جدوجہد کے ابھار میں فیصلہ کن رول ادا کیا اور محنت کشوں کے درمیان کیمونسٹ وجود کو پائیدار بنانے میں بڑی تقویت پہنچائی۔

1929 کے دوران اور اس کے بعد دو ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے قومی تحریک پر کیمونسٹ اور ڈبلو۔ پی۔ پی۔ کا تیزی سے بڑھتا ہوا اثر تھوڑا رکا اور آخر میں ختم ہی ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ حکومت نے کیمونسٹوں پر بڑے مظالم ڈھائے اور ان کو سخت اذیت دی۔ 1922 اور 1924 کے دوران سوویت روس سے ہندوستان میں داخل ہونے کی کوشش میں کیمونسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر جعل سازی کے بہت سے مقدمے پیشاور میں چلائے گئے اور لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ 1924 میں ایس۔ اے۔ ڈانگے، مظفر احمد، نالنی گپتا اور شوکت عثمانی کو کانپور بالشیوک کانسپریسی کیس (Kanpur Bolshevik Conspiracy Case) میں پھنسا کر ان سب کو چار چار سال کی سزا دی گئی۔

1929 تک قومی اور ٹریڈ یونین تحریکوں پر کیمونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات سے حکومت بری طرح پریشان تھی۔ اس نے کیمونسٹوں پر سخت چوٹ کرنے کا ارادہ کیا اور اس لیے مارچ 1929 میں یکبارگی ناگہانی حملہ میں 32 سرگرم ٹریڈ یونین اور سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں تین برٹش کیمونسٹ فلپ اسپریٹ (Philip Spratt) بین برڈلے (Ben

(Bradley) اور لیسٹر ہچنسن (Lester Huchinson) بھی شامل تھے۔ یہ لوگ ٹریڈ یونین تحریک کو منظم کرنے میں مددگار کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ حکومت کا واحد مقصد ٹریڈ یونین کو فنا کرنا اور کیونسٹوں کو قومی تحریک سے الگ کرنا تھا۔ ان سبھی لوگوں پر میرٹھ جعل سازی کیس کے تحت میرٹھ میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ جلد ہی قومی اہمیت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ جواہرلعل نہرو، ایم۔ اے انصاری اور ایم۔ سی چھاگلا ان لوگوں کی دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاندھی جی نے میرٹھ جاکر قیدیوں سے ملاقات کی۔ ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور آئندہ کی جانے والی جدوجہد میں تعاون کی اپیل کی۔ قیدیوں نے اپنی دفع میں جو بیانات دیے ان کو سبھی قومی اخباروں نے شائع کیا اور اس طرح پہلی بار کیونسٹ نظریات سے ملک کے لاکھوں لوگ واقف ہوئے۔ کیونسٹوں کو قومی دھارا سے الگ تھلگ کرنے کی خواہش ناکام رہی بلکہ نتائج برعکس ہی برآمد ہوئے، مگر حکومت کو مزدور تحریک کو قیادت سے محروم کرنے میں کامیابی ضرور ملی۔

کیونسٹوں نے بذات خود اپنے ہی اوپر جان لیوا حملہ کیا اور اس سے حکومت کے ذریعہ کیے گئے حملہ کی رہی سہی کسر پوری کردی۔ انھوں نے اچانک جو قدم اٹھائے اس کو کیونسٹ اصطلاح میں ''فرقہ پرست سیاست'' (Sectarian Politics) یا بائیں بازو کا انحراف (Leftist Deviation) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

کیونسٹ انٹرنیشنل کی چھٹی کانگریس کی ہدایت پر کیونسٹوں نے انڈین نیشنل کانگریس سے اپنا ناتا توڑ لیا اور اس کو سرمایہ داروں کی پارٹی بتایا نیز یہ بھی کہا گیا کہ سرمایہ دار طبقہ اور کانگریس دونوں شہنشاہیت کے حمایتی اور مددگار ہیں اور عوامی تحریک کو منظم کرکے مکمل سوراج (Purn Swaraj) کا نعرہ تو کانگریس کا ڈھونگ ہے۔ یہ عوام کے اوپر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی سرمایہ دار طبقہ کے ان لوگوں کی کوشش ہے جو برٹش شہنشاہیت سے مصالحت کرنے میں مصروف ہیں۔ بائیں بازو کے کانگریسی لیڈر جیسے نہرو اور بوس قومی تحریک کے اندر سرمایہ داروں کے ایجنٹ بتائے گئے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ یہ لوگ مزدور و محنت کش عوام کو جھانسا دے کر سرمایہ داروں کے زیر اثر رکھنا چاہتے ہیں۔ اب کیونسٹوں کا ہی کام تھا کہ وہ پرامن تحریک کی ساری باتوں کی قلعی کھولیں اور برٹش شہنشاہیت کے خلاف مسلح جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔ 1931 میں ہوئے

گاندھی اروِن سمجھوتہ کو بتایا گیا کہ یہ قوم کے ساتھ کی گئی کانگریس کی بے وفائی کا کھلا ثبوت ہے۔

بالآخر ڈبلو۔پی۔پی (WPP) کو بھی اس خدشہ کے تحت تحلیل کر دیا گیا کہ دو شاخوں والی پارٹی (مزدور اور کسان) چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کے زیر اثر آجائے گی۔اس لیے کیمونسٹوں نے اس کی جگہ پر ایک غیر قانونی، آزاد اور مرکزی (Illegal, Independent and Centeralised) پارٹی بنانے پر پوری توجہ دی۔ان کے سیاسی نظریہ میں اچانک اُبھے اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی تحریک سے کیمونسٹ ایسے موقع پر الگ تھلگ ہو گئے جب وہ عوام کی سب سے بڑی جدوجہد کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے اوپر بائیں بازو کے اثرات کافی ٹھوس اور مضبوط ہو رہے تھے۔اس کے علاوہ کیمونسٹ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بکھر گئے۔ حکومت نے ایسے حالات کا فائدہ اٹھایا اور سی۔پی۔آئی۔کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

بہرحال کیمونسٹ تحریک مکمل تباہی سے بچی رہی۔اس کے دو اسباب تھے۔پہلی وجہ تو یہ کہ سارے کے سارے کیمونسٹوں نے سول نافرمانی تحریک سے اپنا ناتا نہیں توڑا تھا۔وہ اب بھی اس میں سرگرم تھے۔اس طرح سوشلسٹ اور کیمونسٹ نظریات کی اشاعت ملک میں مسلسل جاری رہی۔اس لیے بہت سارے نوجوان جو سول نافرمانی تحریک نیز انقلابی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف تھے وہ سوشلزم، مارکسزم اور سوویت یونین سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور 1934 کے بعد وہ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو گئے۔

1935 میں پی۔سی۔جوشی (P.C. Joshi) کی قیادت میں کیمونسٹ پارٹی دوبارہ منظم کی گئی۔تب اس کے حالات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔فسطائیت کے خوف سے اگست 1935 میں ماسکو میں کیمونسٹ انٹرنیشنل کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا۔اس میں اس نے اپنے پرانے خیالات کو ترک کر کے بالکل نیا رخ اختیار کیا۔اس نے اینٹی فسطائی اور سرمایہ دار ملکوں کے ساتھ سوشلسٹ ملکوں کا متحدہ مورچہ بنانے کی وکالت کی۔اس میں کلونیل ملکوں میں بورژوا کی قیادت میں چلنے والی قومی تحریکیں بھی شامل تھیں۔کیمونسٹ کارکنوں کو انڈین نیشنل کانگریس کے تحت چلنے والی قومی تحریک کی خاص دھارا میں شمولیت اختیار کرنی پڑی۔ ہندوستان میں کیمونسٹ تحریک میں تبدیلی لانے کی اصولی اور سیاسی بنیاد شروع میں ایک

دستاویز کے ذریعہ رکھی گئی تھی جو ''دت بریڈلے تھیسس'' (Dutt Bradley Thesis) کے نام سے معروف ہے۔اس میں لکھا گیا تھا کہ سلطنت مخالف عوامی محاذ کے کام کو کامیاب بنانے میں انڈین نیشنل کانگریس سب سے نمایاں کردار ادا کرسکتی ہے۔[10]

ایک بار پھر کمیونسٹ پارٹی کے تعلقات انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مضبوط ہونے لگے۔اس نے اپنے ممبروں کو اس میں شامل ہونے کے لیے کہا اور زور ڈالا کہ وہ اپنے زیر اثر لوگوں کو بھی کانگریس میں شامل کریں۔ 1938 میں یہ تھوڑا سا اور آگے بڑھی اور تسلیم کیا کہ ''انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کے عوام کی وہ سیاسی تنظیم ہے جو سلطنت کے خلاف پوری طرح مستعد ہے''۔[11] 1939 میں پی۔سی۔ جوشی نے پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''نیشنل فرنٹ (National Front) میں لکھا کہ'' آج ہماری سب سے بڑی اور طبقاتی جدوجہد قومی تحریک ہے اور کانگریس اس کی ترجمان ہے''۔[12] اس کے علاوہ پارٹی قومی تحریک کو مزدور طبقہ کی قیادت میں لانے کے اپنے موقف پر بھی قائم رہی۔اس دوران کمیونسٹوں نے کانگریس کے اندر بڑی محنت سے کام کیا۔ پارٹی کے بہت سارے لوگ کانگریس کی ضلع اور صوبائی کمیٹیوں کے عہدے دار بن گئے۔اور تقریباً بیس لوگ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی ہو گئے۔1936 اور 1942 کے دوران ان لوگوں نے کیرالا، آندھرا، بنگال اور پنجاب میں زبردست کسان تحریکیں چلائیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان لوگوں نے سلطنت مخالف جنگجو مجاہدین کی حیثیت سے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال کرلیا۔

1930-31 اور 1932-34 کے دوران نوجوان کانگریسیوں کے ایک گٹ نے جیل میں سوشلسٹ پارٹی بنانے میں پہل کی۔گاندھیائی حکمت عملی اور قیادت کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔سوشلسٹ نظریات کے تئیں ان کی دلچسپیاں بڑھی تھیں۔ان میں سے کئی لوگ 1920 کی دہائی کے آخری دور میں نوجوان تحریک میں سرگرم رہ چکے تھے۔جیل میں ان لوگوں نے مارکسی اور دوسرے سوشلسٹ نظریات کا مطالعہ اور ان پر مباحثہ کیا تھا اور وہ مارکسزم، کمیونزم اور سوویت یونین کے نظریات سے بے انتہا متاثر ہوئے تھے۔اس لیے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی (CPI) کے اس وقت کے سیاسی نظریات راس نہیں آئے۔ ایسی صورت میں ان کو متبادل پارٹی کی تلاش

ہوئی۔ بالآخران سب نے مل کر اکتوبر 1934 میں بمبئی میں جے پرکاش نرائن، آچاریہ نریندر دیو اور مینو مسانی کی قیادت میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی (CSP) کو جنم دیا۔

شروع سے ہی سبھی کانگریسی اور سوشلسٹ ان چار بنیادی باتوں پر ایک رائے تھے کہ ہندوستان کی اہم ترین جدوجہد قومی جہدِ آزادی ہے اور سوشلزم تک پہنچنے کے لیے قومیت ہی ناقابل فراموش اسٹیج ہے۔ سبھی سوشلسٹوں کو کانگریس کے اندر ہی رہ کر کام کرنا چاہیے کیونکہ قومی جدوجہد کی قیادت کرنے والی یہی ابتدائی تنظیم ہے اور جیسا کہ آچاریہ نریندر دیو نے لکھا تھا کہ ''ہم لوگوں کے لیے قومی تحریک سے کٹ جانا خودکشی کے مترادف ہوگا اور کانگریس ہی بلاشبہ قومی تحریک کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہم کو ہر حالت میں کانگریس اور قومی تحریک کو سوشلسٹ سمت کی طرف لے جانا چاہیے اور اس کے حصول کے لیے مزدوروں اور کسانوں کو ان کی طبقاتی تنظیموں میں منظم کرنا اور ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے''[13]

کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے شروع سے ہی کانگریس کے مزاج کو بدلنے اور خود کو مضبوط کرنے کے کام میں لگایا۔ اس کے پیچھے اس کے دو مقاصد تھے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ کانگریس کی نظریاتی کایا پلٹ کی جائے جس سے آزاد ہندوستان میں وہ بتدریج سوشلزم کا راستہ اپنا لے اور موجودہ مالی معاملات میں اس کا رجحان کسان مزدوروں کے مفاد میں ہو۔ بہرحال پروگرام اور نظریہ کی یہ تبدیلی اچانک نہیں واقع ہوگی بلکہ اس کے لیے محنت درکار ہے اور اس کو بتدریج آگے بڑھانے کی ضرورت ہے جیسا کہ 1934 میں جے پرکاش نرائن نے اپنے پیروؤں سے بارہا اصرار کیا تھا ''ہم کانگریس کے سامنے ایک پروگرام پیش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کانگریس اس کو منظور کر لے۔ اگر وہ اس کو نہیں منظور کرتی ہے تو ہم یہ نہ کہیں کہ اس کو چھوڑ کر ہم نکلے جا رہے ہیں۔ اگر آج ہم ناکام ہوتے ہیں تو کل پھر کوشش کریں اور اگر کل ناکامی ہاتھ آتی ہے تو دوبارہ کوشش کریں گے''[14]

اور یہ بھی سوچا گیا کہ کانگریس کی تنظیمی ڈھانچہ میں کایا پلٹ ہونی چاہیے یعنی اوپر چوٹی سے اس کی قیادت کو بدلنا ضروری ہے کیونکہ اس نے عوامی جدوجہد کو ہر سطح پر ترقی دینے میں عدم صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس لیے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو کانگریس کے نعم البدل مرکزی

سوشلسٹ قیادت کے طور پر پیش کر کے ترقی دینا تھا جیسا کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی میرٹھ مقالہ (Meerut Thesis) میں 1935 میں لکھا تھا کہ "کانگریس کے اندر کے سلطنت مخالف عناصر کو سرمایہ دارانہ قیادت سے الگ کرنا ہے اور ان کو انقلابی سوشلسٹ والی قیادت کے تحت لانا ہے۔[15]

بہر حال جلد ہی لوگوں کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ ایسی امید لاحاصل ہے۔ اس لیے اس خیال کو ہی ترک کر دیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ملی جلی قیادت قائم کی جائے جس کے ہر سطح کی قیادت پر سوشلسٹوں کو شامل کیا جائے۔ کانگریس اور قومی تحریک کی متبادل بائیں بازو کی قیادت کی بات کو دو بار کامیابی ملی...... پہلی بار 1939 میں تریپورا میں اور دوسری بار 1940 میں رام گڑھ میں۔ لیکن جب دائیں اور بائیں بازو کی بنیاد پر تقسیم کی نوبت آئی اور کانگریس کو خالص بائیں بازو کی قیادت دینے کی بات اٹھی، تو کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور ہندستانی کمیونسٹ پارٹی دونوں ہی پیچھے ہٹ گئیں۔ ان دونوں کے لیڈروں کو یہ احساس ستانے لگا کہ اس طرح کی کوشش سے نہ صرف قومی تحریک کمزور ہوگی بلکہ بائیں بازو کے لوگ خاص دھارا سے کٹ جائیں گے اور یہ کہ ہندستانی عوام کو صرف گاندھی جی کی قیادت میں ہی منظم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کے حالات میں گاندھی جی کی قیادت کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ بہر حال نہرو کی طرح کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور بائیں بازو کے گٹ اور پارٹیاں اس بات کو پوری طرح نہ تو اصولی روپ دے سکیں اور نہ ہی اس کو ہضم کر سکیں۔ اس لیے وہ لوگ بار بار متبادل قیادت کی بات پر لوٹتے رہے۔

مگر کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو ہندستانی صورت حال کی حقیقت کو سمجھنے کا اچھا شعور تھا۔ اس لیے اس نے کانگریس کی موجودہ قیادت کی مخالفت اس حد تک نہیں لی کہ تعلقات ٹوٹ جائیں۔ بہر حال جب حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تب اس نے اپنے اصولوں سے صرف نظر کر کے حقیقت پسندی کا نظریہ اختیار کیا جو جواہر لعل نہرو کے نظریے کے قریب تر تھا۔ اس کے اس ردعمل پر بائیں بازو کی پارٹیوں اور جماعتوں نے جم کر لعنت ملامت کی۔ مثلاً 1939 میں گاندھی جی اور کانگریس کے دائیں بازو والے گروپ کے مقابلہ میں سبھاش چندر بوس کی حمایت نہ کرنے کے لیے ان کی سرزنش کی گئی۔ ایسے موقعوں پر سوشلسٹوں نے اپنا بچاؤ کیا اور ہندستانی حقیقت کو سمجھنے

میں اپنی تجرباتی صلاحیت کو ثابت کر دکھایا۔ مثلاً 1939 میں تریپورا کانگریس کے بعد جے پرکاش نرائن نے کہا تھا کہ ''ہم سوشلسٹ یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس میں گٹ بازی نہ ہو اور ہم قیادت کے مسئلہ پر بھی کوئی کمپیٹیشن نہیں چاہتے ہیں کانگریس کی پالیسی اور پروگرام سے ہی ہمارا تعلق ہے۔ ہم کانگریس کے فیصلوں کو صرف متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ پرانے نیتاؤں سے ہمارا چاہے جتنا اختلاف ہو، ہم ان سے جھگڑنا نہیں چاہتے ہم تو سلطنت مخالف جنگ میں شانہ بہ شانہ چلنا چاہتے ہیں''16

شروع سے ہی سی۔ ایس۔ پی کے لوگ موٹے طور سے تین نظریاتی خیموں میں تقسیم تھے......... مارکیسٹ، فیبین (Fabian) اور وہ لوگ جو گاندھی جی کے نظریے سے متاثر تھے۔ اس کی تقسیم سے اس میں کسی طرح کی کوئی کمزوری نہیں تھی بلکہ یہی اس کی قوت کا سرچشمہ تھا۔ نیشنل کانگریس کے تحت کیڈر اور معیار پر قائم بذات خود وہ ایک تحریک تھی۔ لیکن 1930 کی دہائی کا مارکسزم، بائیں بازو میں ابھی ایسی رنگارنگی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سی۔ ایس۔ پی آخر دم تک پریشانی کے دلدل میں پھنسی رہی۔ بہر حال پارٹی کے بانی ممبروں میں آپسی اور دوستانہ تعلقات کے باعث بہت دنوں تک نظریاتی اختلافات پر پردہ پڑا رہا۔ آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن جو عظیم لیڈران تھے وہ سوشلزم اور قومیت کے اصولوں پر پوری طرح جمے رہے۔

لیڈروں کے درمیان نظریاتی اختلافات کے باوجود سی۔ ایس۔ پی نے کلیتہً سوشلزم کی بنیادی تشخص کو مارکسزم کی شکل میں قبول کر لیا تھا۔ مثلاً جے پرکاش نرائن نے اپنی کتاب ''سوشلزم کیوں؟'' (Why Socialism) میں یہ بات کہی تھی کہ ''پہلے سے کہیں زیادہ آج یہ کہنا ممکن ہو گیا ہے کہ سوشلزم کا صرف ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے کمیونزم''17 اور جیوں جیوں گاندھیائی سیاست کی اہمیت لوگوں کی سمجھ میں آنے لگی، اس کی فکر کا وسیع جمہوری پہلو سی۔ ایس۔ پی قیادت کی سوچ کی بنیاد بن گئی۔

1930 کی دہائی میں بائیں بازو میں کچھ دوسرے گٹ اور رجحانات ابھر کر سامنے آئے۔ 1930 میں ایم۔ این۔ رائے ہندوستان لوٹ آئے۔ انھوں نے اپنے پیروؤں یعنی

رائسٹوں (Royists) کی ایک مضبوط جماعت تیار کی۔ بعد کے سالوں میں ان کی نظریاتی اور سیاسی فکر میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ 1939 میں جب سبھاش چندر بوس کو کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دینے کے لیے مجبور کیا گیا تب انھوں نے اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں کی الگ پارٹی فارورڈ بلاک (Forward Block) قائم کی۔ 1930 کی دہائی میں کئی دوسری جماعتیں کام کر رہی تھیں مثلاً ہندستانی سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن، (Hindustani Socialist Republican Association) ریولوشنری سوشلسٹ پارٹی (Revolutionary Socialist Party) اور بہت سے ٹراٹسکیسٹ گروپ (Trotskyist groups)۔ سوامی سہجا نند سرسوتی پروفیسر این۔ جی رنگا اور اندولال یاگنک جیسے بائیں بازو کے لوگ کسی تنظیم میں شامل نہیں تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے طور پر کام کرتے تھے۔

سی۔ پی۔ آئی، سی۔ ایس۔ پی اور جواہر لعل نہرو، سبھاش چند بوس اور دوسری بائیں بازو کی جماعتوں اور لیڈروں کا مشترکہ سیاسی پروگرام تھا۔ اس لیے تنظیمی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ان سب نے 1935 کے بعد ساتھ ساتھ کام کر کے ہندستانی سیاست کو سوشلسٹ سمت دیا۔ ان کے مشترکہ پروگرام کی بنیادی باتیں یہ تھیں: شہنشاہی اور زمینداری نظام کی مستقل اور زبردست مخالفت کرنا، مزدوروں کی ٹریڈ یونین اور کسانوں کی سبھا کا نظم کرنا، آزاد ہندوستان کو سوشلسٹ سمت کی طرف لے جانا، لوگوں کے معاشرتی اور اقتصادی تبدیلی کے لیے پروگرام چلانا، فاشزم، کالونیائی نظریہ اور جنگ مخالف پالیسی کو تیز کرنا۔

بلا شبہ بائیں بازو کے زیادہ تر لوگ بے انتہا حوصلہ مند، جنگجو اور سرفروش مجاہدین آزادی تھے پھر بھی یہ اپنا بنیادی کام پورا کرنے میں ناکام رہے یعنی قومی تحریک پر سوشلسٹ نظریہ کا تسلط قائم نہ ہو سکا اور 1930 کی دہائی میں کیے گئے عہد وپیمان کو یہ عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ مورخین کے لیے یہ معمہ ناقابلِ حل بنا ہوا ہے۔

اس سنگین صورت حال کے بارے میں جو وضاحتیں کی گئی ہیں ان سے یہ اشارات ملتے ہیں کہ کانگریس کی موثر قیادت کے ساتھ بائیں بازو کی جنگ ہمیشہ غلط باتوں پر ہوتی تھی اور جب رنجش انتہا کو پہنچ جاتی تب بایاں بازو یا تو اس کے پیچھے چلنے کے لیے مجبور ہو جاتا یا پھر قومی تحریک

سے الگ تھلگ ہو جاتا۔ کانگریس کے دائیں بازو کے ٹھیک برعکس اس کی حکمت عملی اور نظریہ میں ذرہ برابر لچیلا پن نہیں آتا بلکہ بائیں بازو والے دائیں بازو والوں کی مخالفت میں یکطرفہ اور انتہا پسندانہ رخ اپنا کر چرب زبانی سے کام لینے اور سطحی اور غلط باتوں کو لے کر ان سے تو تو میں میں کرتے۔ ان کے ساتھ ان کا ٹکراؤ نظریاتی مسئلہ پر نہیں بلکہ جدو جہد کے طور طریقوں اور طرز عمل کے سلسلہ میں ہوا کرتا تھا۔ مثلاً کانگریس کے دائیں بازو کے خلاف ان کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ شہنشاہیت نواز ہے نیز سرمایہ داروں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے شہنشاہیت کی مخالفت پوری توجہ سے نہیں کرتا ہے۔ اس طرح کے لچر اور بے بنیاد الزامات کی تردید بڑی آسانی سے دائیں بازو والوں کے ذریعہ ہو جاتی تھی۔ عوام کا اعتماد دائیں بازو پر تھا مگر بائیں پر نہیں تھا۔ اس کے ثبوت میں تین باتوں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ 37-1936 میں الیکشن اور منسٹری بنانے کے مسئلے پر کانگریس کے اندر دونوں بازوؤں میں جو ٹکراؤ ہوا اس کو شہنشاہیت کے ساتھ مصالحت بتایا گیا۔ 42-1939 میں عوامی تحریک شروع کرنے کے مسئلہ پر پھر ٹکراؤ کی نوبت آئی۔ گاندھی جی نے عوامی تحریک شروع کرنے میں جو ہچکچاہٹ دکھائی اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ گاندھی جی کا رویہ انگریزوں کے تئیں نرم ہے اور وہ سنہرا موقع ہاتھ سے کھو رہے ہیں۔ 47-1945 میں تیسری بار بائیں بازو کا ٹکراؤ کانگریس کے طاقتور گروپ کے ساتھ جس میں جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد شامل تھے اس وقت ہوا جب حکومت منتقلی کی بات چل رہی تھی۔ بائیں بازو والوں نے یہ کہا کہ شہنشاہیت کے ذریعہ اٹکایا گیا یہ آخری روڑا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے اقتدار کی مدت کو دراز کرنا چاہتی ہے اور تھکی ماندی کانگریس قیادت یا تو حکومت کی بھوکی ہے یا پھر وہ بے وفائی کر رہی ہے۔

ہندوستان کی حقیقی صورت حال کے سلسلہ میں بائیں بازو کا مطالعہ بھی ناقص تھا۔ جواہر لعل نہرو کے علاوہ وہ کانگریس کی غالب اکثریتی قیادت کو سرمایہ داروں کا نیتا مانتا تھا۔ بات چیت کے ذریعہ معاملہ سلجھانے کی کانگریس کی پالیسی کو انگریزی شہنشاہیت کے ساتھ مصالحت کی کوشش مانی جاتی تھی۔ اور قانونی دائرہ میں رہ کر کسی بھی کوشش کو ''حصول آزادی کی جدو جہد سے ہٹنا'' سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہندوستان کی معاشرتی طبقات اور ان کی سیاسی کارکردگی کی تشریح و توضیح میں سادہ لوحی اختیار کرتا تھا۔ قومی تحریک کو ڈسپلن میں چلانے کی کوشش کو وہ تحریک پر بندش لگانا مانتا تھا۔ عوام کو

نظریاتی اعتبار سے متحرک کرنے کے بجائے وہ اپنی تمام تر توجہ ہمیشہ اس بات پر دیتا تھا کہ اہنسا کی بہ نسبت مسلح جدوجہد کہیں زیادہ کارگر اور بہتر ہے۔ اس کے خیال سے عوام، لیڈر کے ہر ایک اشارہ پر کام کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ اس نے عوام کے درمیان اپنی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر آنکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جدوجہد کی گاندھیائی حکمت عملی کو سمجھنے میں بھی قاصر رہا۔

بائیں بازو کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کی مختلف پارٹیاں، جماعتیں، اور شخصیتیں بہت دنوں تک متحد نہیں رہ سکیں اور ان کو متحد کرنے کی ساری کوششیں بھی ناکام رہیں۔ اصولی اور نظریاتی تضاد ان میں اتنے زیادہ تھے اور ان کے لیڈران اتنے چڑچڑے تھے کہ بات بات میں جذبات سے بے قابو ہو اٹھتے تھے۔ نہرو اور بوس بہت دنوں تک ساتھ ساتھ کام نہ کر سکے اور 1939 میں برسر عام جھگڑ اُٹھے۔ نہرو اور سوشلسٹ آپس میں تال میل نہیں بٹھا سکے۔ 1939 کے بعد بوس اور سوشلسٹ الگ الگ ہو گئے۔ سی۔ ایس۔ پی۔ اور کمیونسٹوں نے 1935 سے 1940 تک کام کرنے کے لیے سخت محنت کی۔ سی۔ ایس۔ پی نے کمیونسٹوں اور رائسٹوں کے لیے 1935 میں اپنا دروازہ کھول دیا تاکہ غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی کو سیاسی کام کرنے کا جائز راستہ مل سکے، لیکن جلد ہی سوشلسٹ اور کمیونسٹ الگ الگ ہو کر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں لمبے عرصہ کے لیے تفرقہ پڑ گیا۔ ہر ایک سوشلسٹ کو کمیونسٹ دشمن اور ہر ایک کمیونسٹ کو سوشلسٹ سرمایہ داروں کا لیڈر یا (1947 کے بعد) امریکی ایجنٹ دکھائی پڑتا تھا۔

بائیں بازو نے ہندستانی سماج اور سیاست پر بنیادی طور سے گہرا اثر ڈالا۔ کسان اور مزدور تنظیمیں وجود میں آئیں جن پر اس کتاب میں دوسری جگہ بحث کی گئی ہے۔ کسان اور مزدور تنظیموں کا قیام بائیں بازو کا بڑا کارنامہ ہے۔ کانگریس پر بھی اس کا بہت اثر پڑا۔ تنظیمی زاویہ نگاہ سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ایک تہائی ووٹ کچھ اہم باتوں پر بائیں بازو کے زیر اثر تھے۔ 1936-39 کے درمیان نہرو اور بوس کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ نہرو کو اپنی انتظامیہ کمیٹی میں تین عظیم سوشلسٹوں...... آچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن اور اچیت پٹوردھن (Achyut Patwardhan) کو نامزد کرنے میں کامیابی ملی تھی۔ 1939 میں بائیں بازو

کے امیدوار کی حیثیت سے بوس نے صدارتی انتخاب میں 1377 کے مقابلے 1580 ووٹوں سے پٹا بھی سیتا رمیا(Pattabhi Sitaramayya) کو ہرایا تھا۔

نظریاتی اور سیاسی دونوں اعتبار سے کانگریس کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا جیسا نہرو نے لکھا ہے کہ "ہندستانی قومیت کو بڑی اہم معاشرتی تبدیلی کی طرف ڈھکیل دیا گیا ہے اور غیر معین ہی سہی یہ نئے نظریہ کے چاروں طرف گھوم رہی ہے"[18] کانگریس اور اس کے دائیں بازو نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ ہندوستان کی غریبی اور ناداری صرف کلونیل حکومت کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ ملک کے اندرونی سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کا بھی نتیجہ ہے۔ اس لیے ان سب کا مکمل کایا پلٹ بے حد ضروری ہے۔ قومی تحریک پر بائیں بازو کے اثرات 1931 کے کانگریس کے کراچی اجلاس میں پاس کیے گئے بنیادی حقوق اور اقتصادی پالیسی سے صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد 1936 میں کانگریس کے فیض پور اجلاس میں اقتصادی پالیسی کی جو تجویز پاس کی گئی تھی اس سے بھی کانگریس پر بائیں بازو کا اثر اچھی طرح نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ 1936 کے کانگریس کے الیکشن مینی فسٹو (Election Manifesto) اور 1938 میں قومی منصوبہ کمیٹی (National Planning Committee) کا قیام اور طبقاتی اور اقتصادی مسائل پر گاندھی جی کی سوچ میں بتدریج تبدیلی میں بھی اس کے اثرات کی جھلک ہم کو ملتی ہے۔ آل انڈیا اسٹوڈینٹس فیڈریشن (All-India Students' Federation) پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن (Progressive Writers' Association) اور آل انڈیا اسٹیس پیپلس کانفرنس(All India States' People's Conference) کا قیام بائیں بازو کے ہی کارنامے ہیں۔ آل انڈیا ویمنس کانفرنس (All India Women's Conference) میں بھی بایاں بازو بہت سرگرم تھا۔ ان سب کے علاوہ بائیں بازو نے کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی جیسی اہم تنظیموں کو بھی جنم دے کر پروان چڑھایا تھا۔

ابواب 23، 25 اور 39 میں اس عنوان پر بحث کی گئی ہے۔

باب۔25

حکمت عملی پر بحث 1934-1937

سول نافرمانی تحریک واپس لینے کے بعد قومی حلقہ میں حکمت عملی کے متعلق ایک لمبی بحث چھڑی۔ بحث کے پہلے دور (35-1934) کا خاص عنوان یہ تھا کہ مستقبل قریب میں قومی تحریک کون سا راستہ اختیار کرے یعنی عدم تحریک کے ایام میں کس طرح سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھا جائے اور مفلوج سیاست کیسے متحرک ہو؟ اس کے حل کے لیے دو طریقے بتائے گئے...
گاندھی جی نے گاؤں میں اصلاحی اور تعمیری کام کرنے پر زور دیا خصوصاً گھریلو دستکاری کو ترقی دینے پر خاص توجہ دی۔ انھوں نے کہا کہ گاؤں گاؤں میں تعمیری کام کرنے سے عوام میں اتحاد قائم ہوگا اور اس طرح تحریک کے اگلے دور کے لیے لوگوں کو منظم و متحرک کرنے کے لیے راہ ہموار ہوگی[1]

کانگریس کے دوسرے خیمے نے یہ وکالت کی کہ جدوجہد کرنے کے لیے آئینی طریقہ اختیار کیا جائے اور 1934 میں ہونے والے مرکزی لجسلیٹو اسمبلی کے چناؤ میں حصہ لیا جائے۔ اس بار ایم۔ اے۔ انصاری، آصف علی، ستیہ مورتی، بھولا بھائی ڈیسائی اور بدھان چندر رائے (B.C. Roy) کی قیادت میں نئے سوراجیوں نے یہ دلیل پیش کی کہ مایوسی اور افسردگی کے اس

سیاسی ماحول میں جب کانگریس عوامی تحریک جاری رکھنے کی حالت میں نہیں ہے تو الیکشن میں حصہ لینا چاہیے اور اسمبلیوں میں پہنچ کر سیاسی اعتبار سے سرگرم رہنا چاہیے تا کہ عوام کا حوصلہ نہ گرنے پائے۔ وہ کہتے تھے کہ الیکشن میں حصہ لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم آئینی سیاست کے توسل سے آزادی کے حصول کی کوشش کرنے میں یقین نہیں رکھتے ہیں بلکہ اس کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ ہم دوسرا سیاسی مورچہ تیار کریں جو کانگریس کی تنظیمی اثرات کو وسعت دے تا کہ لوگ اگلی جدوجہد کے لیے تیار ہو جائیں۔ سی۔ راج گوپال چاریہ جو اس وقت نوچینجرس (No Changers) کے خاص نیتا تھے نے سوراجیوں کے حکمت عملی کی تائید کی اور اس میں ایک بات اور جوڑنے کی صلاح دی۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ پارلیمانی کام سیدھے کانگریس کی رہنمائی میں ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ منظم پارلیمانی پارٹی کانگریس کو اس لائق بنائے گی کہ وہ لوگوں میں اپنا اعتماد اور وقار قائم کرلے جیسا گاندھی اروِن سمجھوتہ کی قلیل مدت میں ہوا تھا۔ چونکہ حکومت اس طرح کے کسی بھی سمجھوتہ کے خلاف ہے اس لیے اسمبلیوں میں طاقتور کانگریس کی موجودگی اس کے ہم پلہ ہونے کی حیثیت سے تحریک کی ضرورت پورا کرے گی۔

مگر اس بار معاملہ 1920 جیسا نہیں تھا۔ اس بار ایک تیسری متبادل حکمت عملی سامنے آئی۔ 1930 کی دہائی میں پیدا ہوا بایاں بازو اب کافی مضبوط ہو چکا تھا۔ یہ پارلیمنٹ میں شرکت کرنے اور سول نافرمانی تحریک واپس لیے جانے اور اس کی جگہ تعمیری کام شروع کرنے کے خلاف تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ دونوں طریقے عوامی تحریک کو غلط راستہ پر لے جائیں گے اور عوام کی توجہ حکومت مخالف جدوجہد کی بنیادی باتوں سے ہٹائیں گے۔ وہ تو عوامی تحریک کو مستقل چلانے کے حق میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مالی دشواری کا یہ دور انقلابی تحریک کے لیے نہایت موزوں ہے اور عوام مجاہدہ کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

اس وقت بائیں بازو کے رجحان کی نمائندگی نہرو کر رہے تھے اور اسی نئے رجحان نے گاندھی جی کی سلطنت مخالف پالیسی اور حکمت عملی کے نعم البدل کے طور پر بے حد زوردار پالیسی اور حکمت عملی سجھائی تھی۔ مارکسزم کے بنیادی ڈھانچہ کو قبول کرتے ہوئے نہرو نے اپنی تقریروں و تحریروں نیز 1936 میں لکھنؤ اور فیض پور کانگریس اجلاسوں میں اپنے خطبات کے ذریعہ بائیں

بازو کی حکمت عملی کا نیا ڈھانچہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی عوام ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کے سامنے واحد مقصد سرمایہ داری کو مٹانا اور سوشلزم کو قائم کرنا ہے۔ نہرو کے نظریہ کے ایک پہلو کی وضاحت ہم اس سے پہلے والے باب میں کر چکے ہیں، لیکن اس کے دو پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اور ان کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

نہرو کے نزدیک سول نافرمانی تحریک واپس لینا اور کونسلوں میں شرکت کرنا نیز تعمیری کام شروع کرنا ایک طرح کی ''اخلاقی شکست'' تھی۔ یہ امور اصول سے ہٹنے، انقلابی سرگرمیوں سے دور رہنے اور رفارمسٹ ذہنیت کی طرف مائل ہونے کے مظاہرے تھے۔ اس کے علاوہ یہ 1919 سے قبل کے معتدل دور کے چلن کو پھر سے اپنانے جیسی بات تھی۔ نہرو کی نگاہ میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کانگریس سماج میں مکمل تبدیلی لانے کی نفی کرکے اپنی نجی دلچسپیوں کے تئیں نرم رخ اپناتی جارہی تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''بہت سارے کانگریسی لیڈر اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ عوام کے دل بھلے ٹوٹ جائیں مگر کچھ لوگوں کی جیبیں ہلکی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ لوگ ان کی جیبوں کو عوام کے دل ودماغ، انسانی عظمت اور انصاف سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں''[2] ایسا لگتا تھا جیسے اب نہرو اور گاندھی ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہوگئے ہیں۔ انھوں نے اپریل 1934 میں اپنی جیل ڈائری میں لکھا تھا کہ ''ہمارے مقاصد مختلف، ہمارے خیالات مختلف، ہمارے اخلاق اور نظریات مختلف، اس لیے ہمارے ذرائع اور طریقے بھی مختلف ہونا چاہیے''[3]

انھوں نے کہا کہ اب صرف ایک راستہ بچا ہے کہ سماج کے طبقاتی کردار کی حقیقت اور اس کی کشمکش کے رول کو تسلیم کرتے ہوئے، سماج میں پیوست سبھی دلچسپیوں کو عوام کی بہبودی کی طرف پھر موڑا جائے اور زمینداروں وسرمایہ داروں کے خلاف کسانوں کی جدوجہد اور ان کے مطالبات کی حمایت کی جائے۔ کسانوں اور مزدوروں کو کسان سبھا اور ٹریڈ یونین میں منظم کرکے ان کا کانگریس سے الحاق ہوتا کہ وہ (کانگریس) ان کو متاثر کرکے ان کی سرگرمیوں اور پالیسیوں کی ضروری راہ نمائی کرسکے۔ ان کے خیال سے سلطنت مخالف صحیح جدوجہد طبقاتی جدوجہد کے بغیر نہیں چلائی جاسکتی ہے۔

اس پوری مدت میں وہ موجودہ قومی نظریہ کی خامیوں کا ذکر کرتے رہے اور نئے

سوشلسٹ اور مارکسی نظریے کو اپنانے اور ان کو عملی جامہ پہنانے پر زور دیتے رہے۔ ان کے خیال سے انھیں نظریات اور اصولوں پر چل کر ہی عوام اپنے معاشرتی حالات کا جائزہ لے سکتی ہے اور ان کا مطالعہ سائنسی طریقہ سے کر سکتی ہے۔ انھوں نے 1935 میں شائع اپنی "سوانح عمری" کے کئی ابواب انھیں نظریات کی وضاحت میں صرف کیے ہیں اور بڑے نرم لہجہ اور محتاط انداز میں گاندھی جی کے نظریہ کی تنقید کی ہے۔

جواہر لعل نہرو نے گاندھی جی کی جدوجہد کی بنیادی حکمت عملی کو بھی چیلنج کیا۔4 گاندھی جی کی حکمت عملی کو "جہد وجہد- التوا- جدوجہد (Struggle-Truce-Struggle) (STS ایس۔ٹی۔ایس) کہا جا سکتا ہے۔ یہ کلونیل حکومت کے خلاف قانون سے ہٹ کر عوامی تحریک تین زوردار مراحل سے گذرتی تھی۔ پہلے مرحلہ میں زبردست تحریک چلائی جاتی، پھر جیسے تیسے حکومت سے کچھ سیاسی رعایتیں پا کر تحریک واپس لے لی جاتی اور موقع پا کر پھر تحریک چھیڑ دی جاتی تھی۔ اس طرح یہ ادوار باری باری سے آتے رہتے تھے۔ عدم تحریک کے دوران گاندھی جی، قانون کے دائرہ میں رہ کر سماج میں تعمیری کام کرنے کی اپیل کرتے تھے۔ ان کے خیال سے عوام میں اس سے سیاسی بیداری آتی تھی، حکومت کے کاموں کی اہمیت کا بھرم ٹوٹتا تھا اور لوگوں کے ذہن سے یہ وہم نکل جاتا تھا کہ اس کو اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جدوجہد- التوا- جدوجہد کی پالیسی سے تحریک آزادی تمام نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی اوج کمال پر پہنچ جائے گی اور بالآخر کلونیل سرکار زمام حکومت ہندوستانیوں کو سونپ کر رخصت ہوگی"۔5

نہرو کو ان باتوں سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کے مطابق ہندستانی قومی تحریک آج اس منزل تک پہنچ گئی ہے جہاں ہم کو کلونیل حکومت سے اس وقت تک مسلسل لڑتے رہنا ہے جب تک ہم اس کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ لڑائی میں کبھی دو قدم آگے تو کبھی دو قدم پیچھے جانا ہی پڑتا ہے مگر اس سے تحریک میں ٹھہراؤ کی حالت نہیں آنی چاہیے اور نہ ہی کلونیل حکومت سے صلح سمجھوتہ کرنا چاہیے، بلکہ کانگریس کو اس سے مستقل عدم تعاون، اور عدم مصالحت کی پالیسی بنائے رکھنی چاہیے۔ حکومت کے خلاف اس کو سیدھے اور جارحانہ اقدامات جاری رکھنا

چاہیے۔عوامی تحریک چاہے جس حالت میں اور چاہے جتنی کمزور ہو اسے جاری رکھنا ضروری ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جس آئین کو ہم چیلنج کر رہے ہیں، اس کے خلاف قانونی طریقے سے جدوجہد لاحاصل تھی۔ اسی طرح سیاسی، اقتصادی اور طبقاتی مسائل کو نظر انداز کر کے تعمیری کام نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ جلد یا بدیر ہر ایک عوامی تحریک ایسی منزل پر پہنچتی ہے جہاں وہ پورے موجودہ نظام پر چوٹ کرتی ہے اور اس کے کاموں میں خلل ڈالتی ہے۔ تبھی تحریک عوامی اور دوامی شکل اختیار کرتی ہے۔ اور اس کو اس حد تک صرف غیر قانونی اور غیر آئینی ذرائع سے ہی آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس میں صلح سمجھوتے اور للّو پتّو کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ ''پورن سوراج'' (مکمل آزادی) کی لاہور تجویز پاس ہو جانے کے بعد ہندوستان اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں جدوجہد کو مستقل جاری رکھنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ انھیں بنیاد پر نہرو نے سول نافرمانی تحریک کو واپس لینے کے سارے اقدامات کی مخالفت کی اور اس کی کھل کر تنقید کی۔ انھوں نے آگاہ کیا کہ سول نافرمانی تحریک واپس لینے کا مطلب ہوتا ہے شہنشاہیت سے سمجھوتہ کرنا اور یہ کام اصل مقصد سے ہٹنا مانا جائے گا۔ اس لیے جدوجہد ہی واحد راستہ ہے۔ سمجھوتہ اور چاپلوسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہرو نے مختلف مراحل میں آزادی کے حاصل کرنے کے اصول کی بھی مخالفت کی کہ حکومت پر قبضہ کئی حصوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے اکنی دونّی میں نہیں کیا جاسکتا بلکہ لگاتار پرامن عوامی جدوجہد سے ہی یکبارگی حکومت پر قبضہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح گاندھی جی کی ایس۔ ٹی۔ ایس کی حکمت عملی سے ان کو زبردست اختلاف تھا۔ فتح کے لیے لگاتار جدوجہد (Struggle for Victory)(S.V.) کے اصول میں وہ یقین رکھتے تھے۔

اس طرح ایک طرف نہرو اور بائیں بازو اور دوسری طرف کونسل داخلہ طرفداروں کے درمیان زبردست اختلاف رائے تھا۔ اس سے ایشنلسٹوں کو قومی حلقہ میں بکھراؤ کا ڈر اور برٹش حکام میں اس سے خوشی کا ماحول بنا ہوا تھا کہ آج نہیں تو کل کانگریس بکھر جائے گی۔ لیکن ایک بار پھر گاندھی جی نے کانگریس کو ٹوٹنے سے بچالیا۔ اگرچہ گاندھی جی کو یہی یقین تھا کہ حصول آزادی کا واحد طریقہ ستیہ گرہ ہی ہے، پھر بھی انھوں نے کونسل داخلہ کی تائید کرنے والوں کی کچھ بنیادی باتوں سے مصالحت کرلی۔ ان کو کونسلوں میں جانے کی اجازت دے دی۔ کونسل طرفداروں کو

لوگ گھٹیا درجہ کا محب وطن مانتے تھے۔ گاندھی جی نے ان کی اس غلط فہمی کی تردید کی۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ یوں تو پارلیمانی سیاست سے حصول آزادی ممکن نہیں ہے پھر بھی کانگریس کے وہ تمام لوگ جو کنھیں وجوہات سے ستیہ گرہ میں شرکت نہیں کر سکے ہیں یا تعمیری کاموں میں خود کو نہیں لگا سکے ہیں، پارلیمنٹ میں جاکر اس دوران اپنی وطن پرستی کا اظہار کر سکتے ہیں خصوصاً اس وقت جب عوام میں عدم تحریک کا زمانہ ہو۔ ہاں، اس بات کا خیال ان کو ضرور رکھنا ہوگا کہ کہیں وہ آئین پرست بن کر سہولت پسند نہ ہو جائیں۔ 23/اپریل 1934 کو گاندھی جی نے سردار پٹیل کے نام ایک خط میں یہ بات تحریر کی تھی کہ ''ہم کو سچائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ ہم ان کو قابو میں نہیں لا سکتے، ہم ان کی تھوڑی سی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے''[6]

نتیجتاً مئی 1934 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی سرپرستی اور گاندھی جی کی رہنمائی میں پٹنہ میں الیکشن لڑنے کے لیے پارلیمانی بورڈ کا قیام ہوا۔ اس کی مخالفت کرنے والے بائیں بازو کا جواب دیتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ ''مجھے پورا یقین ہے کہ پارلیمنٹ کے سحر (Glamour) سے کانگریس کی اکثریت متاثر نہیں ہوگی۔ یوں اس کے ذریعہ سوراج کا حصول کبھی نہیں ہو سکتا۔ سوراج تو صرف عوام کی ہمہ گیر بیداری سے حاصل کیا جا سکتا ہے''[7]

اس کے ساتھ ہی گاندھی جی نے نہرو اور بائیں بازو کے لوگوں کو یہ بھی یقین دلایا کہ سول نافرمانی تحریک کو واپس لینا وقت کا تقاضا ہے۔ یہ موجودہ سیاسی حالات میں صحیح قدم ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم نے شہنشاہیت سے مصالحت کر لی ہے یا ہم نے ابن الوقت بن کر سیاسی طاقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ صرف سول نافرمانی تحریک ہی ملتوی ہے، لڑائی تو جاری ہے۔ وہ کہتے تھے کہ نئی پالیسی تو پرامن تحریک کے لیے عوام کو منظم کرنے کے بنیادی اصول پر منحصر ہے[8] انھوں نے اگست 1934 میں نہرو سے مزید کہا کہ ''مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ وقت کی نزاکت کو پہچاننے کی قوت صرف مجھ میں ہے''[9] کانگریس کی لکھنؤ کانفرنس میں سی۔ راج گوپال چاریہ اور دائیں بازو کے دوسرے لوگوں کے دباؤ کے باوجود گاندھی جی نے صدر کے عہدہ کے لیے نہرو کی حمایت کر کے بائیں بازو کے لوگوں کو خوش کر دیا۔

ان کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ کانگریس میں ابھرتے ہوئے سب سے طاقتور رجحان سے وہ کٹ سے گئے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ دانشور طبقہ کا بڑا حصہ پارلیمانی سیاست کا طرفدار ہے مگر گاندھی جی کو پارلیمانی سیاست سے مخالفت تھی اور دانشور طبقہ کے دوسرے خیمہ کو گاندھی جی کے تعمیری کام مطلق پسند نہیں تھے۔ اسی طرح سوشلسٹ خیمہ جس کے لیڈر جواہر لعل نہرو تھے اور جو روز بروز طاقتور ہوتا جارہا تھا، گاندھی جی کی پالیسیوں کے خلاف تھا، مگر وہ خود کو ان کی موثر شخصیت سے دبا ہوا پاتا تھا۔ گاندھی جی نے خود لکھا ہے ''وہ لوگ اپنے نظریہ کی جس طرح اشاعت کرنا چاہتے ہیں، میں اخلاقی دباؤ ڈال کر اس کو روکنا نہیں چاہتا۔ تمام تر بنیادی اختلافات کے باوجود میں کانگریس پر اپنی دھونس نہیں جما سکتا کیونکہ میرے لیے یہ ایک طرح کی ہنسا ہی ہے جس کا میں ہمیشہ مخالف رہا ہوں''۔ قول و عمل سے اپنے اس اصول کو ثابت کرنے کے لیے وہ کانگریس سے اکتوبر 1934 میں مستعفی ہو گئے[10]

نہرو اور سوشلسٹوں نے بھی وطن پرستی کا پورا ثبوت دیا۔ کانگریس کے دشمنوں کا خیال تھا کہ نہرو اور سوشلسٹوں کے انقلابی رجحان کی وجہ سے کانگریس بکھر جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنی اولیت (Priorities) صاف صاف طے کرلی تھی۔ ان کے خیال سے سوشلزم کی جنگ چھیڑنے کے پہلے برٹش حکومت کو ختم کرنا ضروری ہے اور اس جنگ کے لیے کانگریس کے ساتھ متحدہ مورچہ بنانا بے حد لازمی ہے کیونکہ کانگریس ہی عوام کی سلطنت مخالف واحد تنظیم ہے۔ نہرو اور دوسرے بائیں بازو کے لوگ سوشلسٹ نقطۂ نظر سے یہ دلیل دیتے ہیں کہ کانگریس جس میں کروڑوں لوگ شامل ہیں۔ ان کے درمیان رہ کر دھیرے دھیرے ان کی ذہن سازی کرنا اور ان کے اندر مجاہدانہ اسپرٹ پیدا کرنا ضروری ہے نہ کہ سیاسی اور نظریاتی تطہیر کے نام پر ان سے ناتا توڑنا مناسب ہے، مثلاً نہرو نے لکھا تھا کہ ''کانگریس سے کنارہ کش ہوجانے اور رجعت پسند لوگوں کے لیے میدان چھوڑ دینے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس لیے ہم کانگریس میں رہ کر اپنے قدم مضبوط کریں اور لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگیں۔ اس طرح یا تو وہ صحیح راہ اپنا لیں گے یا پھر ہم ان کو کانگریس چھوڑنے پر مجبور کردیں گے''[11] دائیں بازو کے لوگ بھی مصالحت چاہتے تھے جیسا کہ سی۔ راج گوپال چاریہ نے لکھا تھا کہ ''انگریزوں کو یہ امید تھی کہ سوشلزم کے مسئلہ پر کانگریسی

آپس میں لڑیں گے۔مگر ہم ان کو مایوس کر دیں گے۔ان کی امیدیں پوری نہیں ہوں گی'' [12]

نومبر 1934 میں مرکزی اسمبلی کا چناؤ ہوا۔ ہندوستانیوں کے 75 چناؤ حلقوں میں 48 میں کانگریس کی جیت ہوئی۔ وائسرائے ولنگٹن نے ان لفظوں میں آہ وزاری کی''یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد بدنصیبی اور ناچیز گاندھی کے لیے بہت بڑی فتح کا باعث ہے'' [13]

اگرچہ حکومت نے عوامی تحریک کو 33-1932 کے دوران بڑی کامیابی سے دبا دیا تھا مگر وہ بخوبی جانتی تھی کہ اس کے جبر وظلم کی پالیسی بہت دنوں تک نہیں چلے گی۔ مستقبل میں کسی بھی وقت تحریک پھر شروع ہوسکتی ہے جس کو طاقت کے ذریعہ دبایا نہیں جاسکتا۔اس لیے تحریک کو مستقل طور پر کمزور کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے کانگریس میں نفاق ڈال کر اس کو توڑا جائے۔ پھر اس کے بڑے حصہ کو کلونیل حکومت کے آئینی اور تنظیمی ڈھانچہ میں شامل کر کے اس کا ایک جز بنالیا جائے۔اس کے بعد آئینی اصلاحات کے ذریعہ تحریک کو دبانے کا دوسرا دور شروع کیا جائے۔

اگست 1935 میں برٹش پارلیمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935) پاس کردیا۔ملک کے مختلف صوبوں اور راجاؤں مہاراجاؤں کی ریاستوں کو ملا کر آل انڈیا فیڈریشن (All India Federation) بنایا گیا۔فیڈرل اسمبلی کے لیے ریاستوں کے نمائندوں کی تقرری کا اختیار راجاؤں کو دیا گیا۔ان نمائندوں کی تقرری کا بنیادی مقصد نیشنلسٹوں پر کنٹرول قائم کرنا اور ان کے کسی بھی کام کو ناکام کرنا تھا۔بالغ رائے دہندوں کے صرف 1/6 حصہ کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔امور خارجہ اور دفاع فیڈرل اسمبلی کے اختیارات سے باہر تھے۔ بقیہ دوسرے امور وائسرائے کے زیر کنٹرول تھے۔

اب صوبہ کی حکومت کو صوبائی خودمختاری حاصل تھی۔جس کے تحت چنے ہوئے وزراء صوبائی شعبوں کا کام کاج دیکھتے تھے۔ایک بار پھر خصوصی اختیارات برطانوی حکومت کے مقرر کیے ہوئے گورنروں کے پاس چلے گئے۔ ان کو اقلیت، سرکاری افسروں، عام نظم ونسق اور انگریزوں کے کاروباری مفاد کے متعلق پورا اختیار ملا تھا۔وہ انتظامی اور آئینی امور اپنی مرضی سے نامنظور کر سکتے تھے۔ وہ جب چاہتے لامحدود مدت تک صوبوں کی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ نئے ایکٹ کے تحت سیاسی اور اقتصادی دونوں اختیارات پوری طرح انگریزوں کے

ہاتھ میں رہے اور کلونیل ازم سلامت اور مستحکم بنا رہا۔

ایکٹ 1935 کے جوائنٹ پارلیمانی کمیٹی کے صدر اور 1936 سے ہندوستان کے وائسرائے لنلتھگو (Linlithgow) نے تو بعد میں کہا بھی کہ "ایکٹ 1935 تو اسی لیے پاس کیا گیا کیونکہ ہمارے خیال سے ہندوستان پر برطانوی اثر و رسوخ برقرار رکھنے کا یہی سب سے اچھا طریقہ تھا۔ ہندوستانیوں کی خیر خواہی میں دستور میں ترمیم کرنا ہماری پالیسی کا مقصد نہیں تھا اور نہ ہی خواہ مخواہ مناسب وقت سے پہلے ہم ہندوستانیوں کو حکومت سپرد کرنے کی جلدی میں تھے۔ ہماری یہی کوشش تھی کہ جب تک ممکن ہو ہندوستان برطانوی سلطنت کا حصہ بنا رہے"۔[14]

1935 سے 1939 کے دوران انگریزی حکومت نے جو دیرپا حکمت عملی طے کی اس میں کئی چیزیں شامل تھیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ اصلاحات کا چارہ ڈال کر وہ ترقی پسندوں، دستور پرستوں اور تمام اعتدال نوازوں کو جو سول نافرمانی تحریک کے دوران عوام کی ہمدردی و حمایت کھو چکے ہیں کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔ ساتھ ہی زبردست ظلم و جبر کر کے کانگریس کے بڑے حصہ کو یہ احساس دلا دیا جائے گا کہ قانون سے ہٹ کر کام کرنا بے اثر، بے سود اور آئین کے تحت جدوجہد کرنا کارگر اور کامیاب ہے۔ اس طرح یہ لوگ عوامی تحریک کی سیاسی راہ ترک کر کے آئینی سیاست کے تحت کام کرنے کی راہ پر عمل کریں گے۔ حکومت کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک بار سرکاری کنبہ میں رہ کر حکمرانی کا مزہ چکھنے کے بعد کانگریسی مجاہدہ اور قربانی کی سیاست کی طرف لوٹنے میں ہچکچائیں گے۔

کلونیل حکمت عملی کا دوسرا پہلو بھی اسی طرح پیچیدہ اور شاطرانہ چال سے بھرا تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ اصلاحی کاموں کا استعمال پست ہمت کانگریسی خیموں میں نفاق و انتشار پیدا کرنے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ دستور نوازوں کو غیر دستور نوازوں سے اور دائیں کو بائیں بازو سے لڑایا جا سکتا ہے۔ دستور نوازوں اور دائیں بازو کے لوگوں کو قانونی اور دوسری رعایتیں دے کر نیز پارلیمانی گیم کی دلفریبی میں پھنسا کر سیاسی شورش سے دور کر کے اعتدال پسندوں، زمینداروں اور دوسرے وفادار گرگروں کو دستور کی کارکردگی میں شامل کر کے نیشنلسٹ حلقوں میں ان کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں بائیں بازو نیز دوسرے انقلابی عناصر جل بھن اٹھیں گے۔ ان کو دایاں بازو اور اس کی معاون جماعتیں حکومت سے مصالحت

کرتی اور عوامی تحریک سے پھرتی ہوئی نظر آئیں گی۔اس طرح بایاں بازو یا تو کانگریس سے الگ ہو جائے گا یا دایاں بازو اس کو اس کی سوشلزم پرستی کی وجہ سے نکال باہر کرے گا۔ دونوں ہی صورتوں میں کانگریس کا کمزور ہونا اور بکھر جانا طے ہے۔ پھر تو قومی متحدہ تحریک کی مدد دوسر پرستی سے محروم بائیں بازو کو بڑی آسانی سے پولیس کے ذریعہ مٹایا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ اس بار حکومت نے 34-1933 کی جیسی جبر وظلم کی پالیسی نہیں اپنائی۔ نظام آئینی کی مخالفت کی آواز کو دبانے کے لیے حکومت نے جارحانہ کارروائی نہیں کی بلکہ اس نے دوسری حکمت عملی سے کام لیا۔اس نے جیوں ہی یہ دیکھا کہ دائیں اور بائیں بازو کے لوگ آپس میں لڑنے لگے ہیں،اس کے رخ میں 1935 کے بعد غیر متوقع نرمی آگئی۔ آئین نوازوں اور دائیں بازو والوں پر نہرو کھلے عام حملہ آور ہو رہے تھے اور انقلابی تحریک کے توسل سے کالونیائی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی وکالت کر رہے تھے مگر حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔نوکر شاہی کو یہ یقین تھا کہ نہرو کے اس طرح کے رویہ سے قومی خیمہ میں امتیاز بردست نفاق پیدا ہوگا جس کو دور کرنا مشکل ہو جائے گا۔نہرو اپنی جارحانہ روش میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور لکھنؤ کانگریس سے ہارنے کے بعد وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ 1935 میں تقریباً سبھی بڑے انگریز افسروں نے وائسرائے کو صلاح دی کہ نہرو کو کسی بھی قیمت پر گرفتار نہ کیا جائے مثلاً مدراس کے گورنر اسکنے (Erskine) نے صلاح دیا کہ ''نہرو اس طرح کی تقریریں جتنی زیادہ کریں گے اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ ان کی یہ تقریریں کانگریس کو منتشر کرنے کا سبب بنیں گی۔ہم کو ان کے تئیں نرمی اور دوستانہ رویہ اپنانا چاہیے کیونکہ یہ شخص نہ چاہتے ہوئے بھی کانگریس کا اندر اندر ستیاناس کر رہا ہے'' 15

صوبائی خودمختاری سے انگریزوں کو مزید توقع تھی کہ اس طرح کانگریس میں بااثر لیڈر پیدا ہوں گے جو انتظامی اختیارات کو اپنے اپنے طور سے استعمال کرنا چاہیں گے۔ یہ لوگ دھیرے دھیرے حکمرانی کے خصوصی اختیارات (Prerogatives) کی حفاظت کرنا بھی سیکھ جائیں گے۔ پھر تو یہ حکمرانی کے خودمختار مراکز بن جائیں گے اور تب کانگریس کا صوبائی کرن ہو جائے گا اور کانگریس کی آل انڈیا مرکزی قیادت اگر ختم نہ بھی ہوئی تو کمزور ضرور پڑ جائے گی۔ جیسا کہ

لنلتھگو نے 1936 میں لکھا تھا کہ ''سیدھے تصادم سے بچنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ ہے صوبائی خودمختاری، کیونکہ اس کے ذریعہ کانگریس جوانقلاب کا سب سے بڑا آلۂ کار ہے، کو برباد کیا جاسکتا ہے''16

1935 ایکٹ کی مخالفت پورے ملک میں ہوئی۔ سبھی ہندستانی اس کے خلاف تھے۔ کانگریس نے اس کو پوری طرح نامنظور کردیا۔ اس نے اس کی جگہ پر آزاد ہندوستان کے لیے دستور بنانے کا مطالبہ کیا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ اس کے لیے دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) کی تشکیل کی جائے اور اس کے ممبروں کا انتخاب بالغ رائے دہی کے ذریعہ کیا جائے۔

سرکار میں شریک ہوکر منصب قبول کرنا ہی کانگریسیوں کے درمیان حکمت عملی کے متعلق دوسرے دور کے بحث کا موضوع تھا۔ انگریزی حکومت نے ایکٹ 1935 کا صرف اعلان ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس کو فوراً لاگو بھی کردیا تھا۔ صوبائی خوداختیاری پر عمل بھی شروع ہوگیا تھا اور 1937 کے شروع میں ہی صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کی مشتہری بھی کردی گئی تھی۔ انقلابی اور جنگجو طاقتوں کو کلونیل ڈھانچہ میں سیٹ لینے کی حکمت عملی پر بھی عمل شروع ہوگیا تھا۔ نیشنلسٹوں کے سامنے یہ ایک نیا سیاسی چیلنج تھا۔ اس مسئلہ پر سبھی لوگ ایک رائے تھے کہ ایکٹ 1935 کی جم کر مخالفت کی جائے۔ مگر اہم سوال یہ تھا کہ ایسے وقت میں جب تحریک چلانا ناممکن ہے، اس کی مخالفت کس طرح کی جائے؟

کانگریسی خیموں میں ایک بار پھر زبردست اختلاف رائے ابھر کر سامنے آیا۔ چناؤ میں حصہ لینے کے مسئلہ پر سبھی ایک رائے تھے۔ سبھی چاہتے تھے کہ ہمہ گیر سیاسی واقتصادی پروگرام طے کیے جائیں اور انہی کو بنیاد بنا کر چناؤ لڑا جائے۔ اس سے عوام میں سلطنت مخالف بیداری جامع اور مضبوط ہوگی۔ مگر سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ چناؤ کے بعد کیا کیا جائے گا؟ اگر صوبوں میں کانگریس کو اکثریت ملتی ہے، تو وہ سرکار بنائے گی یا نہیں؟ اور اس کو سرکار بنانا چاہیے یا نہیں؟ اس طرح اس مسئلہ پر بحث نے پھر دائیں بنام بائیں بازو کی شکل اختیار کرلی۔

جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس، کانگریس سوشلسٹ اور کیمونسٹ، حکومت میں

عہدے قبول کرنے کے خلاف تھے، نہرو نے بائیں بازو کے سامنے بہت جوشیلے اور زوردار الفاظ میں خصوصاً لکھنؤ میں 1936 کے شروع دنوں میں اپنی صدارتی تقریر میں یہ بات پیش کی کہ حکومت میں شریک ہونا ایکٹ 1935 کو منظور کرنا خود کو مجرم ٹھہرانا ہوگا۔ اس کا مطلب ہوگا کہ بغیر اختیار پائے ذمے داری نبھانا جبکہ صوبائی حکومت کا بنیادی ڈھانچہ پہلے ہی کی طرح بنا رہے گا۔ اس طرح کانگریس عوام کا بہت بھلا نہیں کر پائے گی۔ اس کے برعکس جابر و ظالم حکومت کا کل پرزہ بن کر عوام کا استحصال کرنے میں اس کی ہی مددگار بنے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حکومت میں عہدے قبول کرنے سے تحریک کا انقلابی کردار جو اس کے اندر 1919 سے چلا آرہا ہے، ختم ہو جائے گا۔ نہرو نے مزید کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کیا ہم ملک میں انقلابی تبدیلی لانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، یا پھر برطانوی سلطنت کی سرپرستی میں معمولی سدھاروں کے لیے ہی سرگرم عمل ہیں۔ حکومت میں شریک ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ سلطنت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ کانگریس پارٹی پارلیمانی کاموں میں اس طرح کھو جائے گی کہ وہ کلونیل حکومت کا کل و پرزہ بن کر ہی رہ جائے گی اور ہم آزادی، اقتصادی و معاشرتی انصاف اور غریبی دور کرنے کے اپنے اصل مسائل کو بھول جائیں گے۔ وہ ایسی کھائی میں جا گریں گے جہاں سے نکلنا دشوار ہوگا'' 17

نہرو اور بائیں بازو نے اس مسئلہ کو سلجھانے کے لیے جو جوابی حکمت عملی سجھائی وہ کچھ نہیں، پرانے سوراجیوں کی ہی حکمت عملی تھی یعنی پارلیمنٹ میں گھس کر سرکاری کاموں میں رکاوٹ پیدا کی جائے جس سے ایکٹ 1935 پر عمل ہونے ہی نہ پائے۔ طویل المیعادی پروگرام کے تحت ان لوگوں نے کسانوں اور مزدوروں کو منظم کرنے پر زور دیا۔ ان کا یہی مشورہ تھا کہ کسان مزدوروں کو طبقاتی بنیاد پر منظم کر کے کانگریس سے جوڑا جائے۔ کانگریس کو سماج وادی راہ پر لے جایا جائے اور عام تحریک کو پھر سے شروع کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔

عہدوں کو قبول کرنے کے حامی کہتے تھے کہ وہ ایکٹ 1935 کی مخالفت کے بھی پابند ہیں۔ انھوں نے خود کو آئین نواز ہونے سے انکار کیا۔ ان کا بھی خیال تھا کہ اصلی کام پارلیمنٹ کے باہر ہی ہے اور پارلیمانی جدوجہد کو قلیل مدتی حکمت عملی ہی رہنا ہے۔ اس کے

ذریعہ آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے تو قانونی ڈھانچے کے باہر عوامی جدوجہد ضروری ہے، لیکن موجود، سیاسی حالات میں آئینی جدوجہد کا راستہ اختیار کرنا ان کی مجبوری ہے کیونکہ تحریک کا بدل فی الحال ان کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ عوامی سیاست کو پارلیمنٹ کی سیاست سے اور اس کے اندر ہو رہی کارگزاریوں کو صوبائی سرکاروں سے جوڑا جائے جس سے تحریک کے لیے موافق سیاسی ماحول بنایا جاسکے۔

دوسرے لفظوں میں یہاں اصولوں کے درمیان انتخاب کی بات نہیں ہے بلکہ دو متبادل حکمت عملیوں ایس۔ ٹی۔ ایس اور ایس۔ وی کے درمیان انتخاب ہے یعنی جدوجہد۔ پھر التوا اور پھر جدوجہد اور فتح کے لیے مستقل جدوجہد کے درمیان۔ دائیں بازو کی طرف سے ایک خط راجیندر پرساد نے دسمبر 1935 میں نہرو کے نام لکھا کہ ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی غرض کے تحت حکومت میں شریک ہونا نہیں چاہتا ہے۔ کوئی بھی ایکٹ پر اس طرح عمل کرنا نہیں چاہتا جس طرح حکومت عمل کروانا چاہتی ہے۔ ہمارے سامنے بالکل الگ ہی مسئلہ ہے۔ اس ایکٹ کو ہم کیا کریں کیا ہم اس کی بری طرح نفی کریں اور اپنی راہ چلتے رہیں؟ کیا اس وقت ایسا کرنا ممکن ہے؟ یا پھر اس کو قابو میں رکھ کر اس کا استعمال اپنے طور سے کریں؟ ان سب کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہم کو تمام پرانے مفروضوں یعنی سوراجی یا غیر سوراجی، معاون یا غیر معاون سبھی خیالات سے آزاد ہو کر سوچنا ہوگا'' انھوں نے نہرو کو مطمئن کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی بھی شخص عدم تعاون تحریک کے پہلے کی ذہنیت کی طرف نہیں لوٹا ہے۔ ہم 28-1923 کے زمانہ میں نہیں ہیں، ہم ذہنی اعتبار سے 29-1928 میں ہی ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ آنے والے ایام اچھے ہی ہوں گے''[18] لکھنؤ کانگریس کانفرنس میں جے۔ بی۔ کرپلانی نے بھی لگ بھگ یہی بات کہی کہ ''انقلابی تحریک میں بھی مایوسی اور عدم سرگرمی کا دور آتا ہے۔ ایسے وقت میں جو بھی حکمت عملی اور پروگرام طے کیے جاتے ہیں وہ اصلاحی سرگرمی ہی معلوم پڑتے ہیں، مگر حقیقت میں یہ انقلابی حکمت عملی کا ضروری حصہ ہی ہوتے ہیں''[19] اس پوری بحث میں سوشلزم کی بات نہیں تھی۔ آندھرا کے ٹی۔ وشوناتھم کے لفظوں میں ''میں اپنے سوشلسٹ دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت کے کسی منصب پر کام کرنے اور نہ کرنے کا

معاملہ سوشلزم سے مطلق نہیں جڑا ہے۔ میں تو ان سے کہوں گا کہ وہ غور کریں، یہ معاملہ تو حکمت عملی سے متعلق ہے"۔[20]

وہ حضرات جو عہدے قبول کرنے کے حامی تھے وہ یہ بات بھی تسلیم کرتے تھے کہ ایسا کرنا جوکھم سے بھرا ہوا ہے کیونکہ کسی منصب پر فائز کانگریسی میں بے جا دلچسپیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ پھر بھی ان کو منصب نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ کرسی پر جمے رہ کر حرص و ہوس سے لڑنا اور ان کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ حکومت سے کنارہ کشی کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ سرکار کے گرگے اور دلال حکومت پر حاوی ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ تمام فرقہ پرست اور رجعت پسند پارٹیاں اور جماعتیں بھی تاک میں ہیں میدان چھوڑ دینے پر ان کو سرکار میں گھسنے کا موقع ملے گا۔ تب تو قومی تحریک لامحالہ کمزور ہوگی اور ناپسندیدہ طاقتوں کو ہوا ملے گی۔ اس لیے اگر صوبوں میں کانگریس کی سرکاریں بنتی ہیں تو محدود اختیارات کے باوجود ان کا استعمال تعمیری کاموں میں کیا جاسکتا ہے خصوصاً گاؤں، ہریجنوں اور کھادی کی ترقی، شراب بندی، تعلیم کی اشاعت اور قرض ولگان کی تخفیف وغیرہ کاموں میں کانگریس اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔

بنیادی بات یہ تھی کہ حکومت میں شامل ہونے سے کانگریسی وزرا برٹش سلطنت کا ایک جز بن جائیں گے یا پھر وہ اس کی حکمت عملی کو توڑنے اور اکارت کرنے میں استعمال ہوسکیں گے؟۔ وشوناتھم کے لفظوں میں اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ سوال عہدہ یا منصب یا اسے قبول کرنے کا نہیں ہے۔ وزرا کو ان کے منصب سے نہ دیکھیں بلکہ ان کو مرکز اور قلعہ مانیں جہاں سے برٹش سلطنت چلائی جاتی ہے ....کونسلوں میں ہماری شرکت ہم کو آئین پرستی کی طرف نہیں لے جائے گی، ہم بچے تو ہیں نہیں۔ ہم کونسلوں کو اپنے ڈھرے پر لے چلیں گے اور انقلاب بپا کرنے کے لیے ان کا استعمال کریں گے"۔[21]

گاندھی جی نے اس موضوع پر بہت تھوڑا لکھا تھا۔ پھر بھی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں تبادلہ خیال کے دوران انھوں نے حکومت میں شامل ہونے کی مخالفت کی تھی اور لوگوں کو یہ صلاح دی تھی کہ وہ گاؤں گاؤں جاکر سول نافرمانی تحریک پھر سے شروع کرنے کی تیاری کریں۔ بہرحال 1936 کی ابتدا میں یہ محسوس کیا گیا کہ سول نافرمانی تحریک شروع کرنے کا مناسب وقت ابھی

نہیں آیا ہے۔ اس لیے بطور تجربہ و آزمائش وہ کانگریس کو سرکار بنانے کا موقع دینے کے موافق ہو گئے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کانگریس کی اکثریت سرکار میں حصہ داری کے حق میں تھی۔

1936 کے شروع میں لکھنؤ میں اور آخری مہینوں میں فیض پور میں کانگریس اجلاس کے دوران انتخابات میں حصہ لینے کی بات طے کی گئی اور عہدے قبول کرنے کے مسئلہ پر الیکشن بعد غور کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ 24-1922 اور 1934 کی طرح اس بار پھر کانگریس کے دونوں خیموں نے ایک دوسرے کے جذبات اور سلطنت مخالف جدوجہد کے تئیں اپنے عہد و پیان کا پاس و لحاظ رکھ کر کانگریس کو ٹوٹنے سے بچالیا۔ وہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ کانگریس کی تقسیم سے تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ بائیں بازو نے اپنی بات منوانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر وہ کانگریس کے ٹوٹنے کی حد تک پہنچانے سے باز رہا۔

کانگریس نے فروری 1937 کے صوبائی اسمبلیوں کے چناؤ میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا۔ اس نے اپنے الیکشن منشور میں ایکٹ 1935 کو پوری طرح نامنظور کر دیا۔ اس میں شہری آزادی کی بحالی، سیاسی قیدیوں کی رہائی، چھوا چھوت اور جنسی نابرابری کا خاتمہ، کاشتکاری سسٹم میں بنیادی تبدیلیاں، لگان اور مال گزاری میں مناسب تخفیف، سودی قرض کی شرح میں کمی، تنظیم بنانے اور ہڑتال کرنے کے اختیارات دینے کے وعدے کیے گئے۔

کانگریس نے چناؤ مہم بہت زوردار طریقے سے چلائی۔ لوگوں نے بڑے جوش وخروش سے اس کا استقبال کیا۔ ایک بار پھر عوام میں سیاسی بیداری اور جان پیدا ہوئی۔ نہرو ملک کے کونے کونے میں گئے۔ پانچ ماہ سے بھی کم مدت میں انھوں نے قریب اسی ہزار کلومیٹر دورہ کیا۔ تقریباً ایک کروڑ لوگوں کو خطاب کر کے ان کو موجودہ سیاسی حالات سے آگاہ کیا۔ گاندھی جی نے کسی بھی چناؤ جلسہ کو خطاب نہیں کیا۔ پھر بھی وہ ووٹروں کے دل و دماغ میں بسے رہے۔

انتخابات میں کانگریس کو شاندار کامیابی ملی۔ 1161 سیٹوں پر اس نے الیکشن فائٹ کیا تھا۔ ان میں 761 پر اس کو فتح حاصل ہوئی۔ زیادہ تر صوبوں میں کانگریس کو اکثریت ملی۔ بنگال، آسام، شمال مغرب سرحد، پنجاب اور سندھ مستثنیٰ تھے۔ بنگال، آسام اور شمال مغرب سرحد میں تو وہ سب سے بڑی واحد پارٹی بن کر ابھری۔ کلونیل حکومت کے متبادل کی حیثیت سے

کانگریس کے وقار میں حیرت انگریز اضافہ ہوا۔ الیکشن دوروں اور اس کے نتائج نے نہرو کی ہمت اور حوصلہ کو بے حد بلند کیا۔ ان کی دل شکستگی پوری طرح ختم ہو گئی اور انھوں نے ایس۔ ٹی۔ ایس کی موثر حکمت عملی سے مصالحت کر لی۔

باب۔26

کانگریس حکومت کے اٹھائیس مہینے

حکومت کے ساتھ ہوئی کچھ ماہ کی کشمکش کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی، ایکٹ 1935 کے تحت سرکار بنانے کے لیے تیار ہوگئی۔ جولائی کے مہینے میں بمبئی، مدراس، سینٹرل صوبوں، اڑیسہ، بہار اور یوپی کے چھ صوبوں میں کانگریس نے اپنی وزارتوں کی تشکیل کرلی۔ بعد کو شمال مغرب صوبہ سرحد اور آسام میں بھی کانگریس منسٹری بن گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پارلیمانی سب کمیٹی (Parliamentary-Sub-Committee) نام کا ایک سینٹرل بورڈ (Central Board) بنایا گیا۔ سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور راجندر پرشاد اس کے ممبر بنائے گئے۔ اس بورڈ کا مقصد تھا کہ کانگریس سرکاروں کو ضروری گائڈ لائن دے اور ان کے درمیان تال میل قائم رکھے جس سے کانگریسیوں کو صوبہ پرستی (Provincialization) میں بدلنے کی انگریزوں کی منشا پوری نہ ہوسکے۔ اس طرح نئے تجربے کی شروعات ہوئی اور وہ سیاسی پارٹی جس نے برٹش حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا عزم کیا تھا، اس نے نئے دستور جس کو برٹش حکمرانوں نے بنایا تھا اور جس میں ہندوستانیوں کو بہت کم اختیارات دیے گئے تھے اور وہ بھی کسی بھی وقت انگریز آقا کے ذریعہ ان کی اپنی ہی مرضی سے واپس لیے

جا سکتے تھے اس کے تحت زمام حکومت سنبھال لیا۔ ایسے حالات میں کانگریس کو دو حیثیت سے کام کرنا تھا.........صوبوں میں سرکار کی حیثیت سے اور مرکز میں مخالف پارٹی کے روپ میں۔ صوبوں میں اس کو قانون اور حکومت کے ذریعہ معاشرتی سدھار کے کام کرنے تھے اور ساتھ ہی حصول آزادی کی غرض سے لوگوں کو اگلے مرحلہ کے لیے تیار کرنا تھا نیز ایس۔ٹی۔ایس۔ پالیسی کو عملی جامہ پہنانا بھی تھا۔ اس طرح کانگریس غیر معمولی الجھن اور کشمکش میں تھی[1]

سرکار میں شامل ہونے کی بات منظور کر لینے کا مطلب واضح کرتے ہوئے 7 اگست 1937 کے ہریجن اخبار میں گاندھی جی نے لکھا تھا کہ ''کابینہ میں منصب کو سنجیدگی سے نہ لے کر ہلکے طریقے سے لینا چاہیے۔ یہ کانٹوں بھرا تاج ہے یا اس کو کانٹوں بھرا تاج ماننا چاہیے۔ اس سے کبھی بھی وقار نہیں مل سکتا ہے۔ یہ مناصب ہم نے اس لیے قبول کیے ہیں تا کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ جس رفتار سے ہم اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں، اس میں اس سے تیزی آتی ہے یا نہیں''[2] اس سے پہلے انھوں نے کانگریسیوں کو صلاح دی تھی کہ ایکٹ 1935 کا استعمال اس طرح کیا جائے جس کی برٹش حکمرانوں کو امید نہیں ہے اور ان کو اس کے استعمال سے خود کو بچانا چاہیے جس طرح وہ چاہتے ہیں[3]

کانگریس کے ذریعہ وزارتوں کی تشکیل نے ملک کے سارے نفسیاتی ماحول کو بدل دیا۔ لوگوں کو ایسا احساس ہوا کہ جیسے وہ عوام کی حکومت اور فتح کے ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ کیا یہ عظیم کارنامہ نہیں تھا کہ کھادی میں ملبوس عورتیں اور مرد جو ٹھیک ایک دن قبل جیلوں میں قید تھے، اب سکریٹریٹ میں بیٹھے حکومت چلا رہے ہیں اور وہ سرکاری افسران جو ان کو جیلوں میں ٹھونستے تھے، ان کے حکم کی بجا آوری کر رہے ہیں؟ جواہر لعل نہرو نے اپنی کتاب ''تلاش ہند'' (Discovery of India) میں ایسے پرمسرت ماحول کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''لوگوں کو بڑی راحت محسوس ہو رہی ہے جیسے کوئی بڑا بار سر سے اتر گیا ہو اور ایسا بار جس کا دباؤ لوگوں کے سروں پر مستقل بنا ہوا تھا۔ مظلوم عوام کو جو راحت ملی تھی اس کے نقوش ہر جگہ نظر آتے تھے.........صوبائی سرکاروں کے صدر مقامات جو پرانی نوکر شاہی کے گڑھ تھے پر کئی طرح کے مناظر دکھائی پڑتے تھے.............اب گاؤں اور قصبوں کے لوگوں کا غول اچانک ان

مقامات پر آ پہنچتا اور آزادی سے گھومتا پھرتا۔ یہاں کی ہر چیز سے لوگوں کو محبت ہوگئی تھی۔ وہ اسمبلیوں میں اس جگہ گھس جاتے جہاں بیٹھکیں ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ وزرا کے کمروں میں جھانک کر دیکھتے۔ اب ان کو روک پانا دشوار تھا کیونکہ وہ اب اجنبی نہیں لگتے تھے۔ ہر چیز میں وہ اپنی ساجھے داری محسوس کرتے تھے۔ مسلح پولیس اور اردلی اب مفلوج ہوگئے تھے۔ ان کا رعب داب ختم ہو چکا تھا۔ یورپی پوشاک جو اقتدار و وقار کی علامت تھی، اب بے اثر تھی۔ گاؤں اور قصبوں سے آنے والی لوگوں کی بڑی تعداد اور اسمبلی ممبروں کے درمیان فرق کرنا مشکل تھا'' 4

متبادل طاقت کی حیثیت سے کانگریس کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ اب اس کو عام لوگوں خصوصاً کسانوں کی بھلائی میں کام کرنا تھا۔ اس طرح اس کو یہ بھی ثابت کرنے کا نادر موقع ملا تھا کہ وہ عوام کی قیادت جدوجہد کے دوران ہی نہیں کرسکتی ہے بلکہ حکومت کا استعمال بھی لوگوں کی بہبودی کے لیے کرسکتی ہے۔

وزرا کے سامنے بڑی ذمے داریاں تھیں۔ بہر حال کانگریسی وزارتوں کے مالی وسائل اور ان کے اختیارات محدود تھے۔ وہ حکومت کے بنیادی کردار کو نہیں بدل سکتے تھے اور نہ ہی اس میں کوئی انقلابی تبدیلی لاسکتے تھے، پھر بھی اختیارات کے محدود دائرے میں رہ کر تھوڑی مدت میں (دو سال چار ماہ) انھوں نے سدھار کرنے کے لیے قدم ضرور اٹھائے۔ ان کے ذریعہ راحت کے کچھ کام کیے گئے۔ انھوں نے لوگوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے پوری کوشش کی تاکہ لوگوں کو آنے والے سوراج کی ایک جھلک مل سکے۔

کانگریس وزرا نے سادہ زندگی کا شاندار نمونہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنی تنخواہوں میں بھاری کٹوتی کی۔ تنخواہ کی شرح دو ہزار روپیہ ماہانہ سے گھٹا کر پانچ سو روپے کر دی گئی۔ عام لوگوں کی رسائی اب ان تک ہونے لگی اور بہت قلیل مدت میں انھوں نے عوام کو راحت پہنچانے والے قانون بھی پاس کیے۔ الیکشن منشور میں کیے گئے بہت سارے وعدوں کو پورا کرنے کی انھوں نے پوری کوشش کی۔

شہری آزادی کا تحفظ اور اس کو وسیع تر بنانے کا کانگریس کا قول و قرار اتنا ہی قدیمی تھا جتنی کانگریس کی پیدائش تھی، اس لیے کانگریس نے اس میدان میں جو کام کیے ان میں کچھ بھی تعجب نہیں

ہونا چاہیے۔صوبائی سرکاروں کے 1932 میں جتنے بھی ایمرجنسی اختیارات، پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ملے تھے وہ سب منسوخ کر دیے گئے۔''ہندوستان سیوادل'' اور'' یوتھ لیگ'' جیسی تنظیمیں اور وہ سیاسی کتابیں، اخبارات اور رسالے جو غیر قانونی ٹھہرائے گئے تھے، ان سب پر لگی پابندی ہٹالی گئی۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی پر لگی روک برقرار رہی۔ چونکہ اس پر مرکزی سرکار نے پابندی آئد کی تھی اس لیے بغیر اس کی اجازت اس کو ہٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ پھر بھی جن صوبوں میں کانگریسی سرکاریں تھیں، وہاں کمیونسٹ پارٹی کے لوگ آزادی سے کام کرتے تھے۔ پریس پر لگی پابندی بھی ختم کر دی گئی۔ پریس اور اخبارات پر لی گئی ضمانتی رقمیں واپس کر دی گئیں اور ان پر چل رہے مقدمے بھی اٹھا لیے گئے۔ سرکاری اشتہار کے لیے جن پریسوں کو کالی فہرست میں درج کیا گیا تھا، اس کو خارج کر دیا گیا۔ ضبط شدہ اسلحے واپس کر دیے گئے اور رد کیے گئے لائسنس بھی بحال ہو گئے۔

برطانوی حکام میں لوگ سب سے زیادہ پولیس سے ڈرتے اور اس سے نفرت کرتے تھے۔ 21 اگست 1937 میں کانگریس کابینہ بننے کے بعد گاندھی جی نے لکھا تھا کہ'' کانگریس کی فتح کو اسی بات سے جانچا جائے گا کہ وہ پولیس اور فوج کو کس حد تک عملاً بے اثر بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ موجودہ آئین کو توڑنے کا سب سے اعلیٰ اور واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو کلیتہً ثابت کر دے کہ فوج اور پولیس کی کم سے کم مدد کے بغیر وہ حکومت چلا سکتی ہے''[5] اسی لیے وہ صوبے جو کانگریس کے زیرِ حکومت تھے ان میں پولیس کے اختیارات میں کٹوتی کر دی گئی۔ اب خفیہ پولیس سیاسی کارکنوں کے پیچھے نہیں لگ سکتی تھی اور نہ پبلک کے درمیان کی گئی ان کی تقریروں کی رپورٹ ہی کر سکتی تھی۔

کانگریس سرکار کا ایک کام سازش کے ہزاروں سیاسی قیدیوں اور نظر بند لوگوں کو رہا کرنا اور سیاسی کارکنوں کی نظر بندی اور جلاوطنی کے احکامات کو رد کرنا تھا۔ جو لوگ کاکوری اور ایسے ہی دوسرے مقدموں میں پھنسائے گئے تھے ان کو رہا کر دیا گیا، لیکن یوپی اور بہار میں فی الحال حالات ویسے ہی بنے رہے۔ یہاں وہ سیاسی قیدی اب بھی جیلوں میں تھے جن کو تشدد کے مقدمات میں ملزم بنایا گیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر قیدی پہلے کالا پانی (انڈمان کی سیلولر جیل) بھیجے جا چکے تھے۔ اس کے بعد جولائی 1937 میں ان لوگوں نے جب لمبی بھوک ہڑتال کی، تب

ان کو اپنے اپنے صوبوں میں بھیج دیا گیا۔فروری 1938 میں اس طرح کے قیدی یو پی میں 15 اور بہار میں 23 تھے۔ سرکاران کو رہا کرنے پر تلی تھی مگر گورنر نے اس کی منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔اس لیے دونوں صوبوں کی کانگریس سرکاروں نے استعفےٰ دے دیا۔ بالآخر بات چیت کے بعد اس مسئلہ کو حل کر لیا گیا اور مارچ کے آخر تک دونوں ہی صوبوں کے سارے قیدی رہا کر دیے گئے۔

ان معاملوں میں کانگریسی اور بنگال اور پنجاب کی غیر کانگریسی سرکاروں کے درمیان فرق بہت نمایاں تھا۔ غیر کانگریسی سرکاروں میں خصوصاً بنگال میں شہری آزادیوں پر پابندیاں جاری ہی رہیں اور انقلابی قیدیوں اور نظر بند لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے سالوں جیل میں رکھا جاتا رہا۔ان کی رہائی کے لیے بار بار ہڑتالیں کی گئیں اور عوامی تحریکیں چلائی گئیں مگر ان کی رہائی عمل میں نہیں آسکی۔

1930 میں بمبئی میں سول نافرمانی تحریک کے دوران ٹیکس نہ ادا کرنے کی مہم چلائی گئی تھی جس کی پاداش میں کچھ لوگوں کی زمینیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ وہاں کی کانگریس سرکار نے اصل مالکوں کو ان کی زمینیں واپس کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے۔اس کے لیے بھی اس کو استعفےٰ دینے کی دھمکی دینی پڑی، تبھی گورنر منظوری دینے کے لیے راضی ہوئے۔ 1930 اور 1932 کے دوران تحریک سے ہمدردی رکھنے والے سرکاری افسران جو برخاست کر دیے گئے تھے، ایسے افسروں کی پینشن بحال کردی گئی۔ بہر حال اس سلسلہ میں کانگریسی وزرا کے دامن پر دھبے بھی تھے۔ جولائی 1937 میں ملابار میں سوشلسٹ لیڈر یوسف مہر علی پر جذبات بھڑکانے والی تقریر کرنے پر مقدمہ چلایا گیا، مگر جلد ہی وہ بری کر دیے گئے۔ایک دوسرے کانگریس کے سوشلسٹ لیڈر ایس۔ ایس۔ باٹلی والا کو مدراس کی کانگریس سرکار نے حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے لیے چھ ماہ کی سزا دی۔ کانگریسی خیموں میں جواہر لعل کی قیادت میں اسی معاملہ کو لے کر بڑا شور مچا کیونکہ یہ بات کانگریس کے اصول کے خلاف تھی کہ کسی پر کم سے کم کلونیل حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے لیے مقدمہ چلایا جائے گا۔اسی مسئلہ پر بات چیت کے دوران کانگریس ورکنگ کمیٹی میں نہرو نے سی۔ راج گوپال چاریہ جو اس وقت مدراس کے پریمیر (Premier)

تھے (ان دنوں وزیر اعلیٰ کو پریمیر کہا جاتا تھا) سے کہا کہ ''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں بھی مدراس آؤں اور اسی طرح کی تقریر کروں، تو آپ ہم کو بھی گرفتار کر لیں گے''؟ کہتے ہیں کہ راج گوپال چاریہ نے کہا ''ہاں، کیوں نہیں''؟ 6 بالآخر باٹلی والا رہا کر دیے گئے، اور انھوں نے مدراس پریسیڈنسی میں گھوم گھوم کر ویسی ہی تقریریں کیں۔ یوں یہ واقعہ استثنیٰ ہی ثابت ہوا، مگر کانگریس کے اندر دائیں بازو کے رجحان کے بارے میں شبہ ضرور پیدا ہو گیا۔

دائیں بازو کے بعض کانگریس لیڈران کی ذہنیت تو اس سے بھی بدتر تھی، مثلاً کے۔ ایم۔ منشی نے جو بمبئی سرکار میں اس وقت وزیر داخلہ (Home Minister) اور کانگریس قیادت میں ہلکے پھلکے لیڈر تھے انھوں نے کمیونسٹوں اور کانگریس کے بائیں بازو کے لوگوں پر نظر رکھنے کے لیے سی۔ آئی۔ ڈی کا استعمال کیا تھا۔ اس کے لیے ان کو جواہر لعل نہرو کی جھڑکی بھی سننی پڑی کہ ''آپ تو ابھی سے پولیس افسر بن گئے ہیں''۔ 7 مدراس سرکار نے بھی کانگریس انقلابیوں کے پیچھے پولیس لگا رکھی تھی۔ ایسے مخالف حالات کے باوجود بمبئی اور مدراس میں شہری آزادی کے سلسلہ میں بڑا کام ہوا۔ کانگریس کے زیادہ تر لوگ اس معاملہ میں بہت چوکس تھے۔ بائیں بازو کی قیادت میں ان لوگوں نے دائیں بازو کے کانگریس وزرا پر مستقل دباؤ بنائے رکھا جس سے کہ ان کی سرکاریں لوگوں کی شہری آزادی میں دخل اندازی نہ کر سکیں۔

کانگریسی سرکاروں نے کسانوں اور مزدوروں کو جلد از جلد مالی راحت پہنچانے کی حتی الامکان کوششیں کیں۔ کانگریس نے اس سے پہلے کلونیل حکومت کی قلعی کھول کر ان کی اچھی خاصی حمایت حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اس بات کا پوری طرح خلاصہ کر دیا تھا کہ ان کی غریبی اور زبوں حالی کا اصل سبب کلونیل حکومت کا ڈھانچہ اور اس کی پالیسی ہے۔

اس نے ان کے دلوں میں قومی جذبات پیدا کیے تھے اور سلطنت مخالف اس جدوجہد میں ان کی قیادت کی تھی جس میں انھوں نے حکومت سے مالی مطالبات کیے تھے۔ چونکہ اب اس کو ایک حد تک حکومت چلانے کے اختیارات حاصل تھے، اس لیے ضروری تھا کہ وہ ان کی مالی حالت کو سدھارنے کا کام کرے اور اس طرح ان کے درمیان اس کی گرفت مضبوط بھی ہو۔

بہر حال موٹی موٹی باتوں کو مدنظر رکھ کر کھیتی کسانی کے سدھار کے لیے قانون بنانے

کی پالیسی مرتب کی گئی۔ کانگریس نے اپنے الیکشن منشور میں اور اس کی مہم کے دوران کاشتکاری سسٹم میں سدھار لانے کا وعدہ کیا تھا جس میں لگان، مال گزاری میں تخفیف اور قرض سے نجات دینے کی باتیں شامل تھیں۔ کانگریس نے گاؤں کے ووٹروں سے اس معاملہ میں بڑے بڑے وعدے کر کے کانگریس امیدواروں کو کامیاب بنانے کی اپیل کی تھی اور ووٹروں نے اس کی بات پر بڑی سنجیدگی سے عمل بھی کیا تھا مثلاً یو پی کی سرکاری رپورٹ کے مطابق پرتاپ گڑھ میں چناؤ کے دن ''ووٹروں کی بہت بڑی تعداد اپنے گھر سے گوبر کے اوپلے لے کر چناؤ بوتھوں پر گئی تھی۔ کاشتکاروں کے مطابق ان اوپلوں سے آگ سلگائی گئی اور بے دخلی کے احکامات ہمیشہ کے لیے نذر آتش کر دیے گئے''۔8

زمینداری سسٹم کو ختم کر کے کانگریس موجودہ دستور آراضی کا پوری طرح اصلاح نہ کر سکی۔ اس کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب یہ تھا کہ 1935 ایکٹ کے مطابق صوبائی وزرا کو ایسا کرنے کے لیے ضروری اختیارات نہیں حاصل تھے اور دوسرا یہ کہ ان کے پاس ضروری مالی وسائل کا بے انتہا فقدان تھا کیونکہ مال گذاری سے حاصل بیشتر رقم کا استعمال مرکزی حکومت کرتی تھی۔ کانگریسی وزرا موجودہ سرکاری انتظام میں ردوبدل نہیں کر سکتے تھے۔ صرف وائسرائے یا گورنر کو ہی یہ اختیار حاصل تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مختلف طبقوں کے درمیان تال میل بٹھانے کی پالیسی ایسا کرنے سے روکتی تھی۔ مختلف طبقوں کو ساتھ لے کر چلائی جانے والی تحریک تبھی آگے بڑھ سکتی تھی جب ٹکرانے والی دلچسپیوں کا آپس میں تال میل بنائے رکھا جائے۔ کلونیل حکومت جو اس وقت ملک کی سب سے بڑی دشمن تھی کے خلاف ہندوستانیوں کو متحد کرنے کے لیے اس طرح کا تال میل ضروری تھا۔ اس وقت ایسی حکمت عملی درکار تھی جس سے سبھی لوگوں میں موافقت پیدا ہو یا کم سے کم جہاں تک ممکن ہو زمینداروں کو غیر جانبدار (Neutral) کر کے خاص دشمن کو الگ تھلگ کیا جا سکے تاکہ ہندوستان میں اس کو کسی طرف سے سماجی مدد وحمایت نہ مل سکے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ملک کے بیشتر لوگ اور چھوٹے چھوٹے زمیندار ان قومی تحریک کے دوران بہت سرگرم رہ چکے تھے۔ اس حقیقت کو زیادہ تر لوگوں نے بخوبی سمجھا تھا مثلاً بہار کے جنگجو کسان نیتا سوامی سہجانند نے اپنی سرگذشت میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ''قومی

تنظیم کی حیثیت سے کانگریس سبھی طبقوں کا فورم ہے۔ سبھی طبقے کانگریس کے اجزا ہیں۔ یہ سبھی فرقوں اور طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ کانگریس کا یہی دعویٰ ہے اور پسندیدہ بات بھی یہی ہے........کہ کانگریس کا خاص کام سبھی طبقوں کے درمیان تال میل قائم کرنا اور ایسا کرتے ہوئے جدوجہد کو آگے بڑھانا ہے"[9]

اور یہ بھی سوال تھا کہ کانگریس سرکار کی مدتِ کارکردگی کتنی ہے؟ کانگریس کی قیادت کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی کابینہ کی زندگی لمبی نہیں ہے۔ جواہر لعل نہرو نے اسی بات کو اپنی کتاب "تلاشِ ہند" میں بعد میں لکھا تھا کہ "خطرہ کا احساس مستقل بنا رہتا تھا اور یہ خطرہ حالات میں ہی چھپا تھا"[10] یہاں تک کہ جس وقت کانگریس نے حکومت سنبھالی تو اس کے ذریعہ بنائی گئی پالیسی کی زندگی کا جو موٹا اندازہ لگایا گیا تھا وہ دو سال سے زیادہ نہیں تھا۔ 1938 کے بعد جب یورپ میں جنگ کے بادل منڈلانے لگے تو حکومت کی مدت کا اندازہ بھی صاف ہو گیا۔ اس لیے کانگریس حکومتوں کو اپنے کام میں تیزی لانی پڑی کیونکہ قلیل مدت میں ان کو زیادہ سے زیادہ کام کرنا تھا۔

اس کے علاوہ ایک بات اور تھی کہ تقریباً سبھی جگہ کی کانگریسی سرکاروں یعنی یو۔پی۔ بہار، بمبئی، مدراس اور آسام میں رجعت پسند لوگوں کا دوسرا ایوان، لجسلیٹیو کونسل کی شکل میں موجود تھا۔ اس کے ممبروں کا انتخاب صرف ستر ہزار (70000) رائے دہندوں کی مختصر تعداد کے ذریعہ ہوتا تھا جب کہ لجسلیٹیو اسمبلی کے انتخاب میں ایک کروڑ چھتر لاکھ لوگوں کو ووٹ دینے کا اختیار حاصل تھا۔ لجسلیٹیو کونسلوں میں زمینداروں، سرمایہ داروں اور سودی لین دین کرنے والے مہاجنوں کا اقتدار تھا۔ لجسلیٹیو اسمبلی یعنی نچلے ایوان میں کانگریس کی اکثریت کسی قانون کو پاس کرانے کے لیے کافی نہیں ہوتی تھی کیونکہ اونچے ایوان یعنی لجسلیٹیو کونسل میں بھی قانون کا پاس ہونا ضروری تھا۔ اس لیے کانگریس کو کونسل کے ممبروں پر بیک وقت دباؤ بنانا اور ان سے مصالحت کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بہار سرکار نے کاشتکاری سے متعلق قانون پر زمینداروں سے مصالحت کیا اور یو پی سرکار کو کونسل کے سودخور مہاجنوں اور بنیوں سے اس بات پر سمجھوتہ کرنا پڑا کہ وہ قرض سے متعلق قانون پاس کرنے میں بالکل جلد بازی سے کام نہیں لے گی تاکہ کاشتکاری سے

متعلق قانون پاس کرنے پر ان کی تائید مل سکے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں کاشتکاری کا جوڑ ھانچہ تھا، اس کے ارتقا میں صدیاں لگی تھیں اور اس کی شکل بیحد پیچیدہ اور الجھاؤ سے بھری تھی۔ اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لوگوں کو اچھی معلومات بھی نہیں تھی مثلاً حقوق آراضی اور سودی قرض کا مسئلہ بھی کسانوں کی آمدنی اور روزی روٹی سے منسلک تھا۔ اس میں بھی اتنی بڑی پیچیدگی تھی کہ اس کو حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح کے ڈھانچہ میں کسی بھی طرح کی بروقت سدھار کرنے کی کوشش خطرہ سے خالی نہیں تھی۔ اس کام کے واسطے وقت بھی درکار تھا۔ اور یہ حقیقت آزادی کے بعد اس وقت ظاہر ہوئی جب ہندوستان یونین کے مختلف صوبوں میں کانگریسیوں اور کیمونسٹوں نے کاشتکاری ڈھانچہ کو بدلنے کی کوشش کی۔

بہر حال تمام بندشوں کے باوجود کانگریس سرکاروں نے کسانوں کی بھلائی کے کام کرنے میں کوئی کسر بالکل نہیں چھوڑی۔ ان سرکاروں کے ذریعہ بنائے گئے کاشتکاری قانون مختلف صوبوں میں مختلف تھے۔ ان سب کا انحصار کاشتکاروں کے مختلف روابط، کانگریس کی عوامی اساس، طبقاتی بناوٹ، صوبائی کانگریس تنظیم کے نظریہ اور اس کی قیادت اور عوام کو متحرک کرنے کے حدود اور اس کی شکل وغیرہ پر تھا۔ یہ قوانین کاشتکاری کے حقوق، لگان، حقِ ملکیت کی ضمانت اور دیہی قرض سے متعلق تھے۔

کانگریسی سرکار کے کارناموں کو ہم یوں گنا سکتے ہیں!

اکتوبر 1939 میں یو پی میں کاشتکاری'' قانون پاس کیا گیا۔ اس میں آگرہ واودھ کے دونوں صوبوں کے کاشتکاروں کو کاشت کے موروثی حقوق دیے گئے اور زمینداروں سے بے دخلی کے قانون چھین لیے گئے۔ موروثی کاشتکاروں کا لگان دس سال بعد ہی بڑھایا جا سکتا تھا اور اس مدت کے بعد بھی لگان بڑھانے کے لیے زمینداروں پر روک لگا دی گئی۔ لگان کی عدم ادائیگی پر کسی کاشتکار کو نہ تو گرفتار کیا جا سکتا تھا اور نہ جیل بھیجا جا سکتا تھا۔ نذرانہ لینا اور بیگار کرانا جیسے غیر قانونی کام ختم کر دیے گئے۔

بہار میں کاشتکاری قانون تو یو پی سے پہلے ہی 38-1937 میں پاس ہو گیا تھا۔

یہاں پر یہ قانون کئی معنوں میں یوپی سے زیادہ انقلابی تھا۔ اس کی خاص خاص باتیں اس طرح تھیں: 1911 کے بعد لگان میں کیا گیا سارا اضافہ ختم کر دیا گیا۔ ایک اندازہ کے مطابق اس کی وجہ سے لگان میں پچیس فی صد کٹوتی ہوئی۔ اگر لگان کی موجود شرح کے دوران غلہ کی قیمت میں گراوٹ آئی تو لگان میں بھی کٹوتی کر دی گئی اور اگر کاشت کی زمین کی زرخیزی میں کمی ہو گئی یا زمینداروں نے سینچائی کا معقول انتظام نہیں کیا تب بھی لگان میں تخفیف کی گئی۔ آراضی پر قابض رعیت کو مکمل اختیار دیا گیا۔ وہ لگان کا دو فیصد زمیندار کو ادا کر کے آراضی کو منتقل کر سکتا تھا۔ اگر کوئی لگان دہندہ کسی آراضی پر بارہ سالوں تک کھیتی کرتا ہے تو اس آراضی پر اس کو کاشتکاری کا حق مل جائے گا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا۔ لگان کی موجودہ بقایا رقم کافی کم کر دی گئی اور اس بقایا رقم پر لگائی گئی سود کی شرح 12.5 فیصد سے گھٹا کر 6.25 کر دی گئی۔ بٹائی کاشت کے معاملہ میں زمیندار کا حصہ کل پیداوار کے 9/20 سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ 1929 اور 1937 کے دوران کی بقایا رقم نہ بیباق کرنے کی وجہ سے جس زمین کی ڈگری ہو چکی تھی، اس بقایا رقم کا نصف حصہ ادا کر دینے پر وہ زمین کاشتکار کو واپس مل جاتی تھی۔ زمیندار کے لگان وصول کرنے کے اختیارات میں بھی کٹوتی کر دی گئی۔ اب وہ نہ کاشتکار کو قید کر سکتا تھا اور نہ جیل ہی بھیج سکتا تھا اور نہ ہی اس کی مرضی کے خلاف اس کی غیر منقولہ جائیداد فروخت ہی کر سکتا تھا۔ زمینداروں کی غیر قانونی وصولی پر روک لگا دی گئی۔ اور اس کے خلاف ورزی پر چھ ماہ کی سزا تھی۔ مال گزاری نہ ادا کرنے پر قابض دار کو اب بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دراصل اب زمینداروں کو صرف لگان پانے کا اختیار ہی حاصل تھا اور اس اختیار میں بھی بہت تخفیف کر دی گئی تھی۔

اڑیسہ میں مئی 1938 میں کاشتکاری قانون پاس کیا گیا جس میں آراضی کی ملکیت کو منتقل کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ بقایا لگان پر سود کی شرح 12.5 فیصد سے گھٹا کر 6 فیصد کر دی گئی اور کاشتکاروں سے سب طرح کی وصولی پر روک لگا دی گئی۔ ایک دوسرا قانون اس سے پہلے فروری 1938 میں پاس کیا گیا تھا جس کے تحت زمینداری علاقوں میں ہر جگہ لگان کی شرح گھٹا دی گئی تھی۔ یہ وہ علاقے تھے جو مدراس پریسیڈنسی سے ہٹا کر اڑیسہ پریسیڈنسی کو دے دیئے گئے تھے۔ ان کے لگان کی شرح اتنی ہی رکھی گئی جتنی پاس پڑوس کے رعیت واری علاقوں میں لاگو تھی۔

اس کے لیے وہاں کے زمینداروں کو 12.5 فیصد معاوضہ کے طور پر دینا طے کیا گیا تھا۔ لیکن گورنر نے اس قانون پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس کے لاگو ہونے پر زمینداروں کی آمدنی 30 سے 60 فیصد گھٹ جاتی۔

اس وقت مدراس کے وزیر مالیات ٹی۔ پرکاشم (1957-1872) کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے یہ سفارش کی کہ مستقل بندوبست والے علاقوں میں زمین پر مالکانہ حق زمینداروں کا نہیں بلکہ رعیت کا ہونا چاہیے۔ اس لیے 1802 میں بندوبست کے وقت لگان کی جو شرح طے کی گئی تھی اس کو دوبارہ لاگو کیا جائے۔ اس کے لاگو ہونے پر لگان میں دو تہائی کی کمی ہو جاتی اور ایک طرح سے زمینداری سسٹم کا خاتمہ سا ہو جاتا۔ مدراس کے پریمیر (Premier) سی۔ راج گوپال چاریہ نے اس رپورٹ کی پوری طرح حمایت کی۔ انھوں نے زمینداروں کو معاوضہ دینے کے مطالبے کو بھی ٹھکرا دیا۔ ان سفارشوں کو منظور کرتے ہوئے جنوری 1939 میں اسمبلی قرارداد بھی پاس کر دیا مگر اس سے پہلے کہ قانون کا مسودہ تیار کیا جاتا، سرکار ہی مستعفی ہو گئی۔

بمبئی، سنٹرل اور شمال مغرب سرحدی صوبوں کی اسمبلیوں میں کاشتکاری سدھار کے سلسلہ میں ٹھوس قدم اٹھایا گیا۔ زمینداری علاقوں میں خاص طور سے کاشتکاری کی مدت کو ذہن میں رکھ کر اس کے تحفظ کے لیے یہ کیا گیا تھا۔ اس طرح زمینداری علاقوں میں کانگریسی سرکار کے ذریعہ کاشتکاری سے متعلق قانون بنانے سے لاکھوں کاشتکاروں کی حالت میں سدھار ہوا۔ ان قانونوں سے ان کو تحفظ بھی حاصل ہوا، مگر اس سے زمینداری کے بنیادی سسٹم پر کوئی اثر نہیں پڑا، پھر بھی اس سے دونوں طرح کے کاشتکاروں کو فائدہ پہنچا۔ لیکن اس میں اسامیوں کو نظرانداز بھی کیا گیا تھا۔ کھیت مزدوروں پر بھی اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ کچھ حد تک تو ایسا اس لیے ہوا کہ کسان سبھا ان طبقوں کو متحرک نہ کر سکی اور 1935 ایکٹ کے تحت سب کو رائے دہی کا اختیار بھی حاصل نہیں تھا۔ اس لیے نہ تو چناؤ اور نہ کسان تحریک کے ذریعہ کانگریسی سرکار پر مزدوروں کے حق میں کچھ کرنے کے لیے دباؤ ڈال سکی۔

آسام اور یوپی کو سوائے کانگریس سرکاروں نے قرضداروں کو راحت دلانے کے لیے کئی سخت قوانین پاس کیے جن میں سود خور مہاجنوں کے کاروبار کو قابو میں رکھنے کے لیے گئی

طریقے اپنائے گئے مثلاً اکٹھی ہوئی سود کی رقم کورد کیا جانا یا اس میں کافی کٹوتی کر دینا۔ اس طرح کی کٹوتی مدراس میں 6.25 فیصد اور بمبئی اور بہار میں 9 فیصد تھی۔ ان سرکاروں نے دیہی نوتعمیر کے لیے چھوٹے چھوٹے پروگرام بھی چلائے تھے۔ بمبئی میں تقریباً چالیس ہزار بندھوا کسان مزدور جن کو ڈبلا، کہا جاتا تھا کو آزاد کرایا تھا۔ بمبئی کے جنگلوں پر لگا ہوا چراگاہ ٹیکس ختم کر دیا گیا اور مدراس میں اس میں کٹوتی کردی گئی۔ کاشتکاری سے متعلق قانونوں کی زمینداروں نے سخت مخالفت کی اور اسی طرح قرضدار راحت قانونوں کی مخالفت وکیلوں اور سودخور مہاجنوں کے ذریعہ کی گئی، جبکہ یہ دونوں ہی طبقے کانگریس کے پوری طرح معاون تھے۔ وکیلوں نے تو اس لیے مخالفت کی تھی کہ سودی مقدموں سے ہونے والی ان کی آمدنی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

عام طور سے کانگریس سرکاروں نے مزدور موافق رویہ اپنایا تھا۔ ان کا بنیادی نظریہ یہی تھا کہ مزدوروں کی بہبودی کے کام ہوں اور صنعتی کام پرسکون ماحول میں چلتا رہے۔ ہڑتال پر جانے کی نوبت کم سے کم آئے۔ مالک و مزدور کے درمیان مصالحت قائم رکھنے کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ہڑتال پر جانے کے لیے پنچایتی فیصلہ (Arbitration) کو ضروری قرار دینے کی وکالت کی گئی۔ مزدور اور مالک کے درمیان خیرخواہی کا ماحول قائم کرنے کے لیے کانگریس کے لوگوں اور وزرا کو ثالث (Intermediaries) بنانے کی بات کہی گئی۔ اسی کے ساتھ مزدوروں کی حالت سدھارنے اور ان کی مزدوری بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ اس بات نے ہندستانی سرمایہ داروں کو چونکا دیا اور اس طبقہ نے منظم ہونے کی ضرورت محسوس کی تاکہ ایسے معاملوں میں جلد بازی نہ کرنے کے لیے وہ صوبائی سرکاروں پر دباؤ ڈال سکیں۔[11]

بمبئی کابینہ نے ذمے داری سنبھالنے کے فوراً بعد سوتی کپڑا جانچ کمیٹی (Textile Enquiry Committee) مقرر کی۔ اس کمیٹی نے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی سفارش کی کہ مزدوری میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔ اضافہ کی رقم کروڑوں میں ہو رہی تھی۔ مل مالکوں کی مخالفت کے باوجود ان سفارشوں کو لاگو کیا گیا۔ نومبر 1939 میں سرکار نے انڈسٹریل ڈسپیوٹ ایکٹ (Industrial Dispute Act) پاس کیا۔ پریمیر (Premier) یعنی وزیر اعلیٰ بی۔ جی۔ کھیر (B.G. Kher) کے مطابق اس قانون کی بنیاد طبقاتی کشمکش پر نہ ہو کر طبقاتی ہم

کاری (Class Collaboration) پر تھی۔ اس قانون میں سیدھی کارروائی کے بجائے صلح سمجھوتہ، ثالثی فیصلہ اور آپسی بات چیت پر زور دیا گیا تھا۔ اس کو کچھ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ کارخانوں اور ملوں میں یکا یک ہڑتال اور تالا بندی نہ ہو سکے۔ اس کے ذریعہ سرکار کو یہ بھی اختیار ملا تھا کہ کسی بھی صنعتی معاملہ کو وہ صنعتی عدالت (Court of Industrial Arbitration) کے حوالے کر سکتی ہے۔ چار ماہ کی مدت میں عدالت کو فیصلہ کرنا ہوتا تھا اور اس مدت میں نہ ہڑتال ہو سکتی تھی اور نہ تالا بندی ہی۔ کیمونسٹوں، کانگریس سوشلسٹوں اور کانگریس کے بائیں بازو نے اس کی مخالفت کی کیونکہ ان کے مطابق اس قانون نے ہڑتال کرنے کے اختیار کو محدود کر دیا تھا اور ٹریڈ یونین کے رجسٹریشن کے طریقے کو پیچیدہ کر کے اس کو مشکل بنا دیا تھا اور جن یونینوں کو مل مالکوں کی حمایت حاصل تھی ان کو بڑھاوا ملتا تھا۔

مدراس میں بھی سرکار کے ذریعہ تیار کیے گئے صلح سمجھوتہ اور ثالثی فیصلہ کی کارروائی سے مزدوروں کے جھگڑوں کو آپسی بات چیت سے حل کرنے کی پالیسی کو بڑھاوا دیا گیا۔

اس وقت یوپی میں کانپور مزدور بے چینی کا گڑھ تھا۔ وہاں کے مزدور یہ امید کرتے تھے کہ عوام کے ذریعہ منتخب سرکار ان کے کاز کی پرزور حمایت کرے گی۔ مئی 1938 میں زبردست ہڑتال ہوئی۔ راجندر پرشاد کی صدارت میں سرکار نے لیبر انکوائری کمیٹی (Labour Enquiry Committee) مقرر کی۔ اس کمیٹی نے یہ سفارشیں کی تھیں کہ مزدوروں کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار ہونا چاہیے اور ایک ثالثی بورڈ (Arbitration Board) کی تشکیل کی جانی چاہیے سبھی ملوں کے لیے مزدوروں کی بھرتی آزاد بورڈ (Independent Board) کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ عورت مزدوروں کو زچگی سہولتیں ملنی چاہیے اور بائیں بازو کے زیر اثر بنی مزدور سبھا کو مالکوں کے ذریعہ تسلیم کیا جانا چاہیے۔ لیکن مل مالکوں نے کمیٹی کی سفارشوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بہر حال بعد میں سرکار کے مجبور کرنے پر انھوں نے کمیٹی کی خاص خاص سفارشیں مان لیں۔

اسی طرح کی ایک اور کمیٹی بہار میں بھی لیبر انکوائری کمیٹی کے نام سے راجندر پرشاد کی صدارت میں 1938 میں قائم ہوئی۔ اس نے بھی سفارش کی کہ ٹریڈ یونین بنانے کے اختیار کو

مضبوط کیا جائے، مزدوروں کی حالت میں سدھار ہو اور ہڑتال کے اعلان کے پہلے صلح سمجھوتہ کی بات چیت ضرور کی جائے۔

کانگریس سرکاروں نے سماج سدھار اور بہبودی کے کچھ اور کام کیے۔ مختلف صوبوں میں چنندہ علاقوں میں نشہ بندی قانون لاگو کیا گیا۔ اچھوتوں یا گاندھی جی کے لفظوں میں ہریجنوں (خدا کی اولادوں) کی ترقی کے لیے کچھ اقدامات کیے گئے جن میں ان کا مندر میں داخلہ پانے، بغیر روک ٹوک سرکاری دفتروں میں جانے، کنوؤں اور تالابوں سے پانی لینے، پبلک رقم سے چلائی جانے والی آمد و رفت کی سواریوں کو استعمال کرنے، اسکولوں، اسپتالوں اور ہوٹلوں سے فائدہ اٹھانے کی باتیں شامل تھیں۔ ان کے علاوہ وہ ریت و رواج اور دستور جن سے ہریجنوں کے شہری حقوق پر پابندی لگتی تھی یا ان میں دخل اندازی ہوتی تھی، ان کی منظوری کسی عدالت یا افسر کے ذریعہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ہریجن طلبا کے وظیفے اور فیس معافی کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں میں ہریجنوں کی بھرتی اور بڑھائی جائے۔

کانگریس سرکاروں نے پرائمری، ٹیکنکل اور اعلیٰ تعلیم نیز حفظان صحت پر خاص توجہ دی۔ لڑکیوں اور ہریجنوں کے لیے تعلیم کی سہولتیں بڑھائی گئیں۔ ان سرکاروں نے خصوصیت سے بیسک تعلیم کی شروعات کی اور محنت اور دستکاری کے کاموں میں خاص توجہ دی۔ تعلیم بالغان کا نظم ہوا اور اس کے لیے پروگرام چلائے گئے۔ کھادی کپڑوں کے لیے ہاتھ سے سوت کاتنے اور گھریلو دھندوں کو مالی امداد دی گئی اور ان کو ہر طرح کا تعاون دیا گیا۔ جیل سدھار کی اسکیمیں چلائی گئیں۔ دیشی دھندھوں میں رکاوٹ پڑنے والی دشواریوں کو دور کیا گیا اور آٹوموبائل صنعت جیسے عام دھندھوں کو فروغ دینے کی پوری کوشش کی گئی۔

صدر کانگریس سبھاش چندر بوس نے 1938 میں قومی منصوبہ کمیٹی (National Planning Committee) مقرر کی۔ اس کے ذریعہ کانگریس سرکاروں نے منصوبہ کو فروغ دینے میں مکمل تعاون کیا۔

کانگریس کی حکمت عملی کا ایک بنیادی پہلو یہ بھی تھا کہ جب قومی تحریک میں عام طور سے عدم سرگرمی ہو تب بھی عام سیاسی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں اور عوام کو متحرک کرنے کا کام چلتا

رہتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ یہ عمل قانون کے دائرہ میں رہ کر ہوتا ہے۔ وزارت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد یہ پالیسی اپنائی گئی کہ ان عہدوں کا استعمال عوام میں سیاسی سرگرمی تیز کرنے کے لیے کیا جائے۔ مثلاً 10 / جولائی 1937 کو بھی کانگریسیوں کو ایک مراسلہ جاری کرتے ہوئے جواہر لعل نہرو نے اس بات پر زور دیا کہ اسمبلی کے باہر لوگوں کو تنظیمی اور دوسرے کاموں میں مصروف رکھنا ان کا اہم فریضہ ہے۔ اس کے بغیر اسمبلی کے اندر کام کرنا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے دونوں کاموں کو ساتھ ساتھ چلتے رہنا چاہیے اور ان میں تال میل ہونا چاہیے۔ ہم جو کچھ کریں، اس کی معلومات عام لوگوں کو ہونا چاہیے۔ اس معاملہ میں ان سے مشورہ بھی لینا چاہیے اور پیش قدمی بھی انہی کی طرف سے ہونی چاہیے[12]

اب سوال یہ تھا کہ لوگوں کی سیاسی سرگرمیوں کی کیا شکل ہو؟ اسمبلی کے اندر کیے جارہے کاموں کو باہر کی سیاسی سرگرمیوں سے کیسے جوڑا جائے۔ ٹھیک اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ عوام کے ذریعہ منتخب سرکار ان تحریکوں سے کیسے معاملہ کرے جو قانون کو توڑ کر چلائی جارہی ہیں؟ اس کے لیے پہلے سے کوئی تاریخی نظیر بھی موجود نہیں تھی جس کی روشنی میں کام کیا جاتا یا اس پر عمل ہوتا۔ مختلف صوبوں میں ان کے جوابات مختلف ملتے تھے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مورخین نے اس مسئلہ کا گہرائی سے مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ صرف یوپی کے وشالاکشی مینن (Visalakshi Menon) نے اس کے بارے میں تحقیق کی ہے[13] ان کے مطابق اسمبلی کے اندر کی کارگزاریوں اور سرکاری کاموں کا باہر کی سیاسی سرگرمیوں سے اچھا خاصا تال میل تھا۔ عوام کو منظم کر کے مختلف تنظیمیں بنائی گئی تھیں۔ گاؤں گاؤں میں کانگریس کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ کانگریس تھانے بنائے گئے تھے اور پنچایتوں کا نظم کیا گیا تھا۔ مقامی کانگریس کمیٹیوں کی زیر نگرانی انہیں تھانوں اور پنچایتوں کے ذریعہ عدالتی کام ہوتے تھے۔ مجموعی طریقے سے پٹیشن تیار کر کے افسروں اور وزیروں کو بھیجا جاتا تھا۔ ضلع مرکزوں پر شکایتیں سننے کے لیے شکایت کانگریس کمیٹیاں (Congress Grievance Committees) قائم کی گئی تھیں۔ وہ اپنی کارگزاری کی رپورٹیں ایم۔ ایل۔ اے اور وزیروں کو بھیجتی تھیں۔ لوگوں کو وزیروں کی کارگزاریاں بتانے کے لیے خواندگی پروگرام چلائے گئے تھے۔ مقامی، ضلعی اور صوبائی سطح پر

کیمپوں اور جلسوں کا نظم کیا جاتا تھا۔مختلف نام کے یوم، اور ہفتے منائے جاتے تھے۔مقامی کانگریس کمیٹیاں صوبائی اور ملکی سطح کے لیڈر، اسمبلی ممبران یہاں تک کہ ملک کے وزرا پارلیمانی کاموں کے علاوہ عوام کو متحرک اور منظم کرنے کے لیے ان پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔گہری تحقیق کے بعد اس بات کی تصدیق ہونے کے امکانات پائے جاتے ہیں کہ کبھی کانگریس سرکاریں مقبول عام تنظیموں اور سرکاری کاموں کے درمیان تال میل نہیں قائم کرسکیں خصوصاً ان جگہوں پر جہاں صوبائی سرکاروں اور کانگریس پارٹی میں بائیں بازو کا غلبہ تھا۔

بہرحال بڑے تذبذب کا معاملہ سامنے تھا۔اسمبلیوں کے باہر سیاسی کاموں میں عوامی احتجاج کو منظم کرنے کی بات شامل تھی۔کوئی بھی سرکار اپنے ہی خلاف تحریک چلانے کا کام کس طرح کرسکتی تھی؟ کیا یہ ممکن تھا کہ سیاسی پارٹی سرکار چلا رہی ہو، وہی عوامی تحریک بھی چلائے اور نظم ونسق بھی قائم کرے؟ اور ان حالات میں کیا ہوگا جب عوامی تحریک قانون کی مخالفت کو بالائے طاق رکھ کر تشدد کا روپ دھارن کرلے؟ کیا شہری آزادی میں اس طرح کی بے اعتدالی روا ہے؟ پھر تحریک کرنے والوں کے اس بازو کا کیا حشر ہوگا جو حکومت میں شامل ہے؟ حکومت چاہے بدیسی ہو یا قومی، بائیں بازو کی ہو یا دائیں کی، اعتدال پسندوں کی ہو یا رجعت پسندوں کی، نظم ونسق قائم رکھنا تو اس کا فریضہ ہے۔دراصل یہ سوال دورِ جدید کے سماج میں خصوصاً حکومت کے کردار سے جڑا ہے، چاہے حکومت سرمایہ داروں کی ہو یا سوشلسٹوں کی۔ بہرحال عوام کے درمیان کانگریس کے اثر یایوں کہیں کہ سیاسی قیادت بڑھانے کی حکمت عملی کا انحصار اس بات پر تھا کہ قومی تحریک کی قیادت کرنے والی پارٹی ملک کی سرکار چلانے اور اس پر حکومت کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کس طرح کرپاتی ہے جب کہ کلونیل قانون ہی ملک میں نافذ ہیں؟ اور وہ سرکار کس طرح اس کے بنائے ہوئے قانونوں کو نافذ کرسکتی ہے جبکہ وہ خود اس حکومت کو اکھاڑنے پر تلی ہے؟ اس کے علاوہ یہ بھی لازمی تھا کہ مدت دراز سے دبی پسی عوام اپنی ہی سرکار سے اپنے مطالبات جلد از جلد منوانے کی کوشش کرتی جس پر وہ اپنا حق سمجھتی تھی، لیکن سرکار بڑی مشکل میں تھی۔وہ اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں تیزی نہیں لا پا رہی تھی کیونکہ قانون کے ان طریقوں میں بڑی دشواریاں تھیں جن کے تحت اس کو کام کرنا تھا۔ایسی حالت میں تاخیر ناگزیر تھا۔جہاں

تک اہنسا کے اصول کو نبھانے کا تعلق ہے، کانگریسیوں کے نزدیک یہ آسان سا کام تھا، مگر بہت
سے اور لوگ تھے مثلاً دوسرے مزاج کے کانگریسی، کمیونسٹ، سوشلسٹ، رائسٹ، انقلابی، تشدد
پسند اور غیر کانگریسی جو اہنسا کے پجاری نہیں تھے، ان کے خیال سے جو شہری آزادی ملی تھی اس کا
استعمال مجاہدانہ تحریک چلانے کے لیے عوام کو اور زیادہ تند و تیز کیا جانا چاہیے تھا۔ اس طرح ان
لوگوں نے اہنسائی تحریک کو غیر موثر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کانگریس کی بھی ایس۔ ٹی۔ ایس کی
اصلاحی پالیسی تھی۔ تشدد کی چاہے حوصلہ افزائی نہ بھی کی جائے تو کیا حکومت کرنا اور متشدد مخالفت کو
برداشت کرنا دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں؟

اس کے ساتھ ہی ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ بہت سے کانگریسی سرکار کو اپنی ہی سرکار مان کر
تحریک چلاتے تھے۔ عوامی تحریک چلا کر، کانگریس کو مضبوط و مستحکم بنانا ان کا کام تھا۔ وہ ایسی کوئی
بھی حالت نہیں آنے دیتے تھے جس میں یہ نوبت آتی کہ سرکار کو ان کے خلاف سخت کارروائی
کرنی پڑے۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو منتریوں کی وعدہ خلافی کا بھانڈا پھوڑ کر عوام کے سامنے
ان کا اصلی چہرہ لانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال سے کانگریس اونچے طبقہ کے ہی لوگوں کی تنظیم تھی
اور جہاں تک عوام اور اس کی تحریک کا تعلق ہے، اس کا کیریکٹر سلطنت پرست حکمرانوں سے قطعی
مختلف نہیں تھا۔ اس کے جواب میں بہت سے کانگریسی ان نکتہ چیں مخالفین اور جھگڑالو لوگوں کو
لاقانونیت اور بدنظمی پیدا کرنے والا عنصر مانتے تھے۔ اور جب لوگ اپنے جذبات کا اظہار غصہ
سے کرتے تھے تو اس سے پیدا ہوئی کیفیت کو "قابو سے باہر ہوتا" (Getting out of
hand) کہا جاتا تھا۔ یہی نہیں سی۔ راج گوپالا چاریہ اور کے۔ ایم۔ منشی جیسے کانگریسیوں نے
اپنے اپنے صوبوں میں ایسے تمام لوگوں کو دبانے کے لیے سیاسی طریقوں کا استعمال بے جھجک کیا
تھا۔ بدنصیبی یہی ہے کہ مورخین نے ایسے حالات کی تحقیق اب تک نہیں کی ہے۔ آج ان تمام
باتوں کا مطالعہ آمنے سامنے رکھ کر اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ 1947 کے بعد حکمرانوں کی
حیثیت سے کمیونسٹ یا دوسری انقلابی پارٹیوں کی فرض ادائیگی کو کانگریس پارٹی کی فرض ادائیگی کو
آمنے سامنے رکھ کر ہم ان کا تقابلی مطالعہ کر سکتے ہیں جن کی ملک کے کچھ صوبوں میں حکومت ہے یا
جو حکمراں پارٹیوں کے معاون ہیں، جیسا پرتگال یا فرانس میں ہے یا جس طرح ہم سوشلسٹ ملکوں

میں فرماں رواؤں کو پاتے ہیں۔

کانگریس سرکاروں کی تشکیل کے بعد شہری آزادی ملنے کی وجہ سے لوگوں کی چھپی ہوئی قوت و توانائی پھوٹ نکلی۔ ملک کے کونے کونے میں کسان سبھاؤں کی تشکیل ہوئی۔ ٹریڈ یونینوں کی سرگرمی بڑھی اور ان کی تعداد ممبری میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ طلبا اور نوجوانوں کی تحریکیں دوبارہ اٹھنے لگیں۔ ان میں بال و پر آنے لگے۔ صوبوں کی عوامی تحریکوں کو بے حد بڑھاوا ملا۔ بائیں بازو کی پارٹیوں نے اپنی طاقت کئی گنا بڑھالی اگر چہ مرکزی حکومت کی طرف سے اب بھی ان پر پابندی لگی تھی۔ بمبئی میں کمیونسٹوں نے اپنا ہفتہ وار پرچہ "نیشنل فرنٹ" (The National Front) نکالا۔ سی۔ ایس۔ پی نے "دکانگریس سوشلسٹ" (The Congress Socialist) نام کا اخبار شائع کیا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے اخبارات ہندستانی زبانوں میں نکلنے لگے۔ "کرتی لہر" (Kirti Lehar) اخبار کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس اخبار کو کمیونسٹوں نے صوبہ یوپی کے میرٹھ شہر سے نکالا تھا۔ وہ اس کو پنجاب جو مرکز کے زیر حکومت تھا سے نہیں نکال سکتے تھے۔

ایسے حالات میں عوامی تحریکوں کا کانگریس سرکار سے ٹکراؤ ناگزیر ہوگیا۔ اگر چہ کسانوں کی تحریکیں عام طور سے بڑے بڑے جلسوں اور غیر معمولی کسان مظاہروں کی شکل میں منظم ہوتی تھیں مگر بہار میں کسان تحریکوں کا ٹکراؤ وہاں کی سرکار سے اکثر ہو جایا کرتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب کسان سبھائیں کسانوں کو لگان نہ دینے اور زمینداروں کی زمینوں پر جبراً قبضہ کرنے کے لیے اکساتی تھیں۔ چھوٹے بڑے زمینداروں کے ساتھ مار پیٹ کرنے اور فصلوں کو لوٹنے کے واقعات بھی ہوئے تھے۔ کسان سبھا کے کارکنوں نے سوامی سہجانند سرسوتی کے مجاہدانہ نعروں کی خوب مشتہری کی تھی...... "لگان لیں گے کیسے؟" "ڈنڈا ہمارا زندہ آباد" اور "لاٹھی ہماری ساتھی"۔ ان سب کا نتیجہ ہوا کہ بہار کسان سبھا اور کانگریس کی قیادت کے درمیان خلیج پیدا ہوگئی۔

بمبئی میں انڈسٹریل ڈسپوٹ ایکٹ (Industrial Dispute Act) کی منظوری کے احتجاج میں 7 (سات) نومبر 1938 کو 77 میں سے ستر کپڑا ملوں میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (AITUC)، کمیونسٹوں اور ڈاکٹر امبیڈکر کے پیروؤں نے مل کر ہڑتال

کردی۔ تھوڑی سی بدنظمی ہوگئی جس کی وجہ سے دملوں میں بڑے پیمانے پر پتھر بازی کی گئی۔ اس میں کچھ پولیس والوں کو چوٹیں لگیں۔ پھر پولیس نے گولیاں چلائیں جس میں ستر لوگ زخمی ہوئے اور دو کی جانیں گئیں۔ مدراس سرکار نے (اور مدراس کانگریس نے بھی) ان ہڑتالوں کے خلاف سخت کارروائی کی جنھوں نے تشدد کا رویہ اپنایا تھا۔ کانپور میں تو مزدوروں کی کئی بار ہڑتالیں ہوئیں اور ان ہڑتالوں نے تو تشدد کی شکل بھی اختیار کی تھی۔ پولیس پر حملے بھی کیے۔ بہر حال یہاں پر ہڑتالوں کو کانگریس کی حمایت ملتی رہی۔

کانگریس سرکاروں کو غیر مطمئن عوام جو ان کی اپنی تھی سے نمٹنے کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے انھوں نے مصالحت کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ یوپی، بہار اور کچھ حد تک مدراس میں یہ طریقہ ضرور کامیاب رہا مگر بمبئی میں بالکل ناکام ہوگیا۔ بائیں بازو کے ناقدین کو یہ سرکاریں عام طور سے مطمئن کر سکنے میں قاصر رہیں۔ یہ سرکاریں جنگجو مظاہروں خصوصاً ٹریڈ یونینوں کی جدوجہد کو نظم و نسق کا مسئلہ مانتی تھیں۔ مزدور تحریکوں کے خلاف اکثر فوجداری دفعہ 144 کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی کے تحت کانپور میں تحریک کر رہے کسان اور ٹریڈ یونین لیڈروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔

عوامی مظاہروں اور تحریکوں کے خلاف کانگریس سرکار کے رویہ کے تئیں جواہر لعل نہرو ذاتی طور سے خوش نہیں تھے، مگر عوام کے سامنے وہ زبان نہیں کھولتے تھے۔ دریافت کرنے پر وہ اس کا جواب صرف یہ دیتے تھے ''اپنوں کے خلاف ہم شور نہیں کر سکتے''۔ اس طرح عوام کے درمیان انھوں نے وزرا کے تئیں بڑی وفاداری کا ثبوت دیا اور ان کے خلاف کی جا رہی اوچھی باتوں سے ان کا بچاؤ کیا۔''[14] کانگریس سرکاروں کے خلاف بڑھتی ہوئی عوامی تحریکوں کو روکنے کے لیے ستمبر 1938 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کیا، جس میں کچھ کانگریسیوں کے ساتھ ان سبھی لوگوں کو برا بھلا کہا گیا جو شہری آزادی کے نام پر قتل و غارت گری، لوٹ مار، آتشزنی اور طبقاتی کشمکش کی وکالت کرتے تھے۔

قرارداد میں مزید کہا گیا کہ ''اپنی روایات کے مطابق کانگریس مستقل طور طریقے سے سرکار کی انھیں کارروائیوں کی حمایت کرے گی جو وہ لوگوں کی جان و مال کی محافظت میں اپنائے گی[15]''

کیمپوں اور جلسوں کا نظم کیا جاتا تھا۔ مختلف نام کے یوم، اور ہفتے منائے جاتے تھے۔ مقامی کانگریس کمیٹیاں صوبائی اور ملکی سطح کے لیڈر، اسمبلی ممبران یہاں تک کہ ملک کے وزرا پارلیمانی کاموں کے علاوہ عوام کو متحرک اور منظم کرنے کے لیے ان پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ گہری تحقیق کے بعد اس بات کی تصدیق ہونے کے امکانات پائے جاتے ہیں کہ کبھی کانگریس سرکاریں مقبول عام تنظیموں اور سرکاری کاموں کے درمیان تال میل نہیں قائم کر سکیں خصوصاً ان جگہوں پر جہاں صوبائی سرکاروں اور کانگریس پارٹی میں بائیں بازو کا غلبہ تھا۔

بہر حال بڑے تذبذب کا معاملہ سامنے تھا۔ اسمبلیوں کے باہر سیاسی کاموں میں عوامی احتجاج کو منظم کرنے کی بات شامل تھی۔ کوئی بھی سرکار اپنے ہی خلاف تحریک چلانے کا کام کس طرح کر سکتی تھی؟ کیا یہ ممکن تھا کہ سیاسی پارٹی سرکار چلا رہی ہو، وہی عوامی تحریک بھی چلائے اور نظم ونسق بھی قائم کرے؟ اور ان حالات میں کیا ہوگا جب عوامی تحریک قانون کی مخالفت کو بالائے طاق رکھ کر تشدد کا روپ دھارن کرلے؟ کیا شہری آزادی میں اس طرح کی بے اعتدالی روا ہے؟ پھر تحریک کرنے والوں کے اس بازو کا کیا حشر ہوگا جو حکومت میں شامل ہے؟ حکومت چاہے بدیسی ہو یا قومی، بائیں بازو کی ہو یا دائیں کی، اعتدال پسندوں کی ہو یا رجعت پسندوں کی، نظم ونسق قائم رکھنا تو اس کا فریضہ ہے۔ دراصل یہ سوال دورِ جدید کے سماج میں خصوصاً حکومت کے کردار سے جڑا ہے، چاہے حکومت سرمایہ داروں کی ہو یا سوشلسٹوں کی۔ بہر حال عوام کے درمیان کانگریس کے اثر یا یوں کہیں کہ سیاسی قیادت بڑھانے کی حکمت عملی کا انحصار اس بات پر تھا کہ قومی تحریک کی قیادت کرنے والی پارٹی ملک کی سرکار چلانے اور اس پر حکومت کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کس طرح کر پاتی ہے جب کہ کلونیل قانون ہی ملک میں نافذ ہیں؟ اور وہ سرکار کس طرح اس کے بنائے ہوئے قانونوں کو نافذ کر سکتی ہے جبکہ وہ خود اس حکومت کو اکھاڑنے پر تلی ہے؟ اس کے علاوہ یہ بھی لازمی تھا کہ مدت دراز سے دبی پسی عوام اپنی ہی سرکار سے اپنے مطالبات جلد از جلد منوانے کی کوشش کرتی جس پر وہ اپنا حق سمجھتی تھی، لیکن سرکار بڑی مشکل میں تھی۔ وہ اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں تیزی نہیں لا پا رہی تھی کیونکہ قانون کے ان طریقوں میں بڑی دشواریاں تھیں جن کے تحت اس کو کام کرنا تھا۔ ایسی حالت میں تاخیر ناگزیر تھا۔ جہاں

تک اہنسا کے اصول کو نبھانے کا تعلق ہے، کانگریسیوں کے نزدیک یہ آسان سا کام تھا، مگر بہت سے اور لوگ تھے مثلاً دوسرے مزاج کے کانگریسی، کمیونسٹ، سوشلسٹ، رائسٹ، انقلابی، تشدد پسند اور غیر کانگریسی جو اہنسا کے پجاری نہیں تھے، ان کے خیال سے جو شہری آزادی ملی تھی اس کا استعمال مجاہدانہ تحریک چلانے کے لیے عوام کو اور زیادہ تند و تیز کیا جانا چاہیے تھا۔ اس طرح ان لوگوں نے اہنسائی تحریک کو غیر موثر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کانگریس کی یہی ایس۔ ٹی۔ ایس کی اصلاحی پالیسی تھی۔ تشدد کی چاہے حوصلہ افزائی نہ بھی کی جائے تو کیا حکومت کرنا اور متشدد مخالفت کو برادشت کرنا دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں؟

اس کے ساتھ ہی ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ بہت سے کانگریسی سرکار کو اپنی ہی سرکار مان کر تحریک چلاتے تھے۔ عوامی تحریک چلا کر، کانگریس کو مضبوط و مستحکم بنانا ان کا کام تھا۔ وہ ایسی کوئی بھی حالت نہیں آنے دیتے تھے جس میں یہ نوبت آتی کہ سرکار کو ان کے خلاف سخت کارروائی کرنی پڑے۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو منتریوں کی وعدہ خلافی کا بھانڈا پھوڑ کر عوام کے سامنے ان کا اصلی چہرہ لانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال سے کانگریس اونچے طبقہ کے ہی لوگوں کی تنظیم تھی اور جہاں تک عوام اور اس کی تحریک کا تعلق ہے، اس کا کیریکٹر سلطنت پرست حکمرانوں سے قطعی مختلف نہیں تھا۔ اس کے جواب میں بہت سے کانگریسی ان نکتہ چیں مخالفین اور جھگڑالو لوگوں کو لاقانونیت اور بدنظمی پیدا کرنے والا عنصر مانتے تھے۔ اور جب لوگ اپنے جذبات کا اظہار غصہ سے کرتے تھے تو اس سے پیدا ہوئی کیفیت کو "قابو سے باہر ہونا" (Getting out of hand) کہا جاتا تھا۔ یہی نہیں سی۔ راج گوپالا چاریہ اور کے۔ ایم۔ منشی جیسے کانگریسیوں نے اپنے اپنے صوبوں میں ایسے تمام لوگوں کو دبانے کے لیے سیاسی طریقوں کا استعمال بے جھجک کیا تھا۔ بدنصیبی یہی ہے کہ مورخین نے ایسے حالات کی تحقیق اب تک نہیں کی ہے۔ آج ان تمام باتوں کا مطالعہ آمنے سامنے رکھ کر اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ 1947 کے بعد حکمرانوں کی حیثیت سے کمیونسٹ یا دوسری انقلابی پارٹیوں کی فرض ادائیگی کو کانگریس پارٹی کی فرض ادائیگی کو آمنے سامنے رکھ کر ہم ان کا تقابلی مطالعہ کر سکتے ہیں جن کی ملک کے کچھ صوبوں میں حکومت ہے یا جو حکمراں پارٹیوں کے معاون ہیں، جیسا پرتگال یا فرانس میں ہے یا جس طرح ہم سوشلسٹ ملکوں

میں فرماں رواؤں کو پاتے ہیں۔

کانگریس سرکاروں کی تشکیل کے بعد شہری آزادی ملنے کی وجہ سے لوگوں کی چھپی ہوئی قوت و توانائی پھوٹ نکلی۔ ملک کے کونے کونے میں کسان سبھاؤں کی تشکیل ہوئی۔ ٹریڈ یونینوں کی سرگرمی بڑھی اور ان کی تعداد ممبری میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ طلبا اور نوجوانوں کی تحریکیں دوبارہ اٹھنے لگیں۔ ان میں بال و پر آنے لگے۔ صوبوں کی عوامی تحریکوں کو بے حد بڑھاوا ملا۔ بائیں بازو کی پارٹیوں نے اپنی طاقت کئی گنا بڑھالی اگرچہ مرکزی حکومت کی طرف سے اب بھی ان پر پابندی لگی تھی۔ بمبئی میں کمیونسٹوں نے اپنا ہفتہ وار پرچہ "دی نیشنل فرنٹ" (The National Front) نکالا۔ سی ایس پی نے "دی کانگریس سوشلسٹ" (The Congress Socialist) نام کا اخبار شائع کیا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے اخبارات ہندستانی زبانوں میں نکلنے لگے۔ "کرتی لہر" (Kirti Leehar) اخبار کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس اخبار کو کمیونسٹوں نے صوبہ یوپی کے میرٹھ شہر سے نکالا تھا۔ وہ اس کو پنجاب جو مرکز کے زیر حکومت تھا سے نہیں نکال سکتے تھے۔

ایسے حالات میں عوامی تحریکوں کا کانگریس سرکار سے ٹکراؤ ناگزیر ہوگیا۔ اگرچہ کسانوں کی تحریکیں عام طور سے بڑے بڑے جلسوں اور غیر معمولی کسان مظاہروں کی شکل میں منظم ہوتی تھیں مگر بہار میں کسان تحریکوں کا ٹکراؤ وہاں کی سرکار سے اکثر ہوجایا کرتا تھا، خصوصاً اس وقت جب کسان سبھائیں کسانوں کو لگان نہ دینے اور زمینداروں کی زمینوں پر جبراً قبضہ کرنے کے لیے اکساتی تھیں۔ چھوٹے بڑے زمینداروں کے ساتھ مار پیٹ کرنے اور فصلوں کو لوٹنے کے واقعات بھی ہوئے تھے۔ کسان سبھا کے کارکنوں نے سوامی سہجانند سرسوتی کے جارحانہ نعروں کی خوب تشہیر کی تھی...... "لگان لیں گے کیسے؟" "ڈنڈا ہمارا زندہ آباد" اور "لاٹھی ہماری ساتھی"۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہار کسان سبھا اور کانگریس کی قیادت کے درمیان خلیج پیدا ہوگئی۔

بمبئی میں انڈسٹریل ڈسپیوٹ ایکٹ (Industrial Dispute Act) کی منظوری کے احتجاج میں 7 (سات) نومبر 1938 کو 77 میں سے سترہ کپڑا ملوں میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (AITUC)، کمیونسٹوں اور ڈاکٹر امبیڈکر کے پیروؤں نے مل کر ہڑتال

کردی۔ تھوڑی سی بدنظمی ہوگئی جس کی وجہ سے دوملوں میں بڑے پیمانے پر پتھر بازی کی گئی۔ اس میں کچھ پولیس والوں کو چوٹیں لگیں۔ پھر پولیس نے گولیاں چلائیں جس میں ستر لوگ زخمی ہوئے اور دو کی جانیں گئیں۔ مدراس سرکار نے (اور مدراس کانگریس نے بھی) ان ہڑتالوں کے خلاف سخت کارروائی کی جنھوں نے تشدد کا رویہ اپنایا تھا۔ کانپور میں تو مزدوروں کی کئی بار ہڑتالیں ہوئیں اور ان ہڑتالوں نے تو تشدد کی شکل بھی اختیار کی تھی۔ پولیس پر حملے بھی کیے۔ بہر حال یہاں پر ہڑتالوں کو کانگریس کی حمایت ملتی رہی۔

کانگریس سرکاروں کو غیر مطمئن عوام جو ان کی اپنی تھی سے نمٹنے کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے انھوں نے مصالحت کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ یوپی، بہار اور کچھ حد تک مدراس میں یہ طریقہ ضرور کامیاب رہا مگر بمبئی میں بالکل ناکام ہوگیا۔ بائیں بازو کے ناقدین کو یہ سرکاریں عام طور سے مطمئن کرسکنے میں قاصر رہیں۔ یہ سرکاریں جنگجو مظاہروں خصوصاً ٹریڈ یونینوں کی جدوجہد کو نظم ونسق کا مسئلہ مانتی تھیں۔ مزدور تحریکوں کے خلاف اکثر فوجداری دفعہ 144 کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی کے تحت کانپور میں تحریک کررہے کسان اور ٹریڈ یونین لیڈروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔

عوامی مظاہروں اور تحریکوں کے خلاف کانگریس سرکار کے رویہ کے تئیں جواہر لعل نہرو ذاتی طور سے خوش نہیں تھے، مگر عوام کے سامنے وہ زبان نہیں کھولتے تھے۔ دریافت کرنے پر وہ اس کا جواب صرف یہ دیتے تھے ''اپنوں کے خلاف ہم شور نہیں کرسکتے''۔ اسی طرح عوام کے درمیان انھوں نے وزرا کے تئیں بڑی وفاداری کا ثبوت دیا اور ان کے خلاف کی جارہی اونچی باتوں سے ان کا بچاؤ کیا''14 کانگریس سرکاروں کے خلاف بڑھتی ہوئی عوامی تحریکوں کو روکنے کے لیے ستمبر 1938 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کیا، جس میں کچھ کانگریسیوں کے ساتھ ان سبھی لوگوں کو برا بھلا کہا گیا جو شہری آزادی کے نام پر قتل وغارت گری، لوٹ مار، آتشزنی اور طبقاتی کشمکش کی وکالت کرتے تھے۔

قرارداد میں مزید کہا گیا کہ ''اپنی روایات کے مطابق کانگریس مستقل طریقے سے سرکار کی انھیں کارروائیوں کی حمایت کرے گی جو وہ لوگوں کی جان ومال کی حفاظت میں اپنائے گی''15

عوامی تحریکوں سے کانگریس سرکاریں جس طرح نمٹ رہی تھیں، ان کے تئیں بائیں بازو کے لوگوں کا رویہ بڑا ہی تنقیدی تھا۔ انھوں نے ان پر الزام لگایا کہ وہ کسان مزدور تنظیموں کو پست کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ رجنی پامدت نے کانگریس سرکار کے رویہ کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے ''کانگریس کابینہ کے دو سال کے تجربات نے انگریزی حکومت سے الجھنے کے مخفی خطرے کو بری طرح ظاہر کر دیا تھا، اور وہ بھی ایسے وقت جب کابینہ کی غالب اکثریت مصالحت کرنے کے لیے خواہشمند تھی۔ کانگریس پارٹی اور سرکاران دونوں کانگریس کے معتدل خیمہ کی قیادت کے زیر اثر تھی۔ کانگریس کی یہ قیادت دھیرے دھیرے انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون بڑھاتی جا رہی تھی اور وہ اونچے طبقے، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی بھلائی میں کھلے طور سے کام کر رہی تھی اور عوام کی مجاہدانہ کاوشوں اور تحریکوں کے خلاف اس کا مخالفانہ رویہ صاف ہوتا جا رہا تھا۔ اس طرح قومی تحریک پر مصیبت آنی شروع ہوگئی تھی''[16]

گاندھی جی بھی سوچ رہے تھے کہ سرکار بنانے کی پالیسی پر مصیبت آ رہی ہے مگر ان کا خیال اس سلسلہ میں کیمونسٹوں سے مختلف تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ انھوں نے شورشی تحریکوں کی مخالفت بڑے شد و مد سے کی تھی کیونکہ مخفی یا غیر مخفی طریقے سے ایسی تحریکوں کا رویہ ان کے اہنسا کے بنیادی اصول سے بری طرح ٹکراتا تھا۔ سرکار بنتے وقت جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے انھوں نے کانگریسی وزرا کو صلاح دی تھی کہ وہ فوج کی مدد کے بغیر سرکار چلائیں۔ بعد میں انھوں نے یہ بھی کہنا شروع کیا تھا کہ متشدد تقریریں اور تحریریں شہری آزادی کی محافظت کے دائرہ میں نہیں آتی ہیں'[17] لیکن مخالفت ظاہر کرنے کے لیے کی گئی متشدد تحریکوں اور ان کے جنگجو ہونے کا رونا رونے کے خلاف موجودہ قانونی مشینری کا استعمال کرنے کو حق بجانب ٹھہرانے کے بعد بھی عوامی تحریکوں سے نمٹنے کے لیے انگریزی قانونوں اور ان کو لاگو کرانے والی مشینری کے اکثر استعمال کی گاندھی جی نے مخالفت کی۔ بیک وقت وہ بائیں بازو کے ذریعہ طبقاتی کشمکش کے لیے عوام کو اکسانے کی پالیسی کی مذمت کرتے تھے، وہیں وہ دائیں اور بائیں بازوؤں کے ٹکراؤ کو کم کرنے کی برابر کوشش بھی کرتے رہے۔ کانگریس کے اصول کے اندر رہ کر کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں کو اپنے اصولوں کی مشتہری کرنے کے لیے رعایت دینے کی انھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔ انھوں نے

ہمیشہ ان کا پاس ولحاظ رکھا کہ وہ کانگریس کی قدروں کے اندر رہ کر اپنے اصولوں کی اشاعت اور ان پر عمل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ گاندھی جی کو بہت اچھی طرح اس بات کا احساس تھا کہ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی وجہ سے کانگریس کو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ عوام میں خصوصاً کسان مزدوروں پر اس کی پکڑ کمزور ہوگی کیونکہ ان دونوں طبقوں کی تحریکوں سے نمٹنے کے لیے کانگریسی سرکاریں بار بار نظم ونسق کی مشینری کا استعمال کر رہی تھیں۔ ایسی صورت حال میں کالونیائی حکومت کے خلاف قانون کے دائرہ سے باہر جا کر اگلے دور کی عوامی تحریک چلانے میں بڑی دشواری پیدا ہوگی۔ ایسے حالات میں گاندھی جی نے پوشیدہ حیرانی کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ اور 39-1938 کے دوران ہریجن اخبار میں انھوں نے کئی مضامین لکھے تھے۔ انھوں نے کانگریس کا سرکار میں بنے رہنے کو شک کی نظر سے بھی دیکھا تھا۔ اس کے پیچھے یہی خاص وجہ تھی[18] دسمبر 1938 میں انھوں نے لکھا تھا ''اگر کانگریسی سرکار کو یہ احساس ہوتا ہے کہ بغیر پولیس اور فوج کی مدد سے وہ حکومت نہیں چلا سکتی ہے تو اہنسا کے رو سے یہ بات صاف ہے کہ کانگریس کو سرکار سے الگ ہو جانا چاہیے اور مقدس پیالے (Holy Grail) کی تلاش میں صحراؤں کی راہ لینی چاہیے''[19]

(Holy Grail) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہ پیالہ تھا جس میں حضرت مسیح علیہ السلام نے آخری کھانا کھایا تھا اور مصلوب ہونے کے بعد ایک حواری نے ان کے مقدس لہو کو اس میں جمع کیا تھا۔)

کانگریس سرکاروں کے دور حکومت میں کانگریس کی کئی کمزوریاں ابھر کر سامنے آئیں۔ اصولی اور ذاتیاتی دونوں اعتبار سے لوگوں کے درمیان بے انتہا گٹ بازی اور ان میں بڑے جھگڑے پیدا ہوگئے تھے۔ اس کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ وسط ہندوستان کی اسمبلی میں کانگریس وزرا کے درمیان اس قدر تُو تُو مَیں مَیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر ڈی۔ این۔ کھرے کو وزیر اعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ کانگریس میں نقلی (Bogus) ممبر سازی کا کام شروع ہوگیا تھا جو دھیرے دھیرے زور پکڑتا گیا۔ ذاتی فائدوں، عہدوں اور نوکریوں کے لیے مارا ماری شروع ہوگئی۔ کانگریسیوں میں بے ضابطگی عام بات تھی۔ فائدوں کے متلاشی ابن الوقت حضرات

کانگریس میں شامل ہونے لگے اور یہ کام بہت آسان بھی تھا کیونکہ اس نے سبھی کے لیے اپنا دروازہ کھول رکھا تھا۔ بہت سے کانگریسی تو اقتدار کی لالچ میں ذات برادری کو بڑھاوا دینے میں بھی پیش پیش تھے۔

گاندھی جی محسوس کرنے لگے تھے کہ "ہم اندر اندر کمزور ہو رہے ہیں"۔ انھوں نے اپنے ہریجن اخبار میں بار بار کانگریسیوں کے اندر پنپ رہے کرپشن کی ان لفظوں میں بخیہ ادھیڑی تھی کہ کانگریس کے اندر پیوست کرپشن کو برداشت کرنے کے بجائے میں اس کو اچھی طرح دفن کرنا پسند کروں گا۔[20] یہ بات انھوں نے کانگریس سیوا سنگھ کارکنوں سے مئی 1939 میں کہی تھی۔ اس سے پہلے نومبر 1938 میں گاندھی جی نے ہریجن میں لکھا تھا کہ "اگر کانگریس کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک و صاف نہیں کیا جاتا ہے تو جو طاقت اس کی آج ہے وہ کل نہیں رہے گی اور جب ملک کا مشکلات سے کڑا مقابلہ ہوگا تب وہ لوگوں کی امیدوں کو پورا نہیں کر سکے گی"۔[21]

دراصل گاندھی جی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ عدم جدوجہد کے دور میں تحریک کا کمزور پڑنا اور کانگریسیوں میں اخلاقی برائیاں پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے کانگریس کو سرکار سے ہٹنے اور ستیہ گرہ کے دوسرے دور کے لیے تیاری کرنے کی صلاح دی تھی۔

کچھ دنوں سے جواہر لعل نہرو بھی یہی محسوس کر رہے تھے کہ کانگریس سرکاروں کا مثبت رول ختم ہو چکا ہے۔ 28 اپریل 1938 کو انھوں نے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ "میں یہ بات شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ کانگریس سرکاریں بہت لچر طریقے سے کام کر رہی ہیں اور جتنا کام وہ کر سکتی تھیں وہ بھی نہیں کر رہی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ پرانے طور طریقوں میں خود کو ڈھالنے میں مصروف ہی نہیں ہیں بلکہ اس سلسلہ میں وہ خود کو حق بجانب ٹھہرانے میں بھی جٹی ہیں۔ لیکن چلیے یہ سب بھی برداشت کیا جا سکتا ہے مگر اس سے بدتر بات تو یہ ہے کہ جس قدر محنت و مشقت سے عوام کے دلوں میں ہم نے اپنا وقار قائم کیا تھا، وہ ہم کھوتے جا رہے ہیں۔ ہمارا سیاسی معیار گرتا جا رہا ہے۔ ہم سیاست کے اس عامی سطح پر جا پہنچے ہیں جس کا کوئی اصول نہیں اور جس کی روزمرہ کی کارگزاریوں کے پیچھے ابن الوقتی کارفرما ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کانگریس کے اندر اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے مگر ان کے دماغوں میں تو پارٹی بازی اور گروہ بندی کا بھوت سوار ہے۔ بس

وہ تو کسی نہ کسی شخص یا گروہ کو پست کرنے میں لگے ہوئے ہیں"۔22

اکتوبر 1939 میں کانگریس سرکاروں نے دوسری جنگ عظیم کے باعث پیدا ہوئے بحران کی وجہ سے استعفے دے دیا۔ مگر گاندھی جی نے اس واقعہ کا استقبال دوسرے نظریہ سے کیا کہ اس سے کانگریس میں پیوست کرپشن کو صاف کرنے میں مدد ملے گی۔ 23 اکتوبر 1939 کو گاندھی جی نے سی۔ راج گوپال چاریہ کو لکھا تھا کہ "میرا دماغ اس معاملہ میں بالکل صاف ہے کہ جو کچھ ہوا وہ ہمارے مقصد کے حصول کے لیے بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ دوا کڑوی ضرور ہے مگر اس کی ضرورت تھی۔ یہ جسم کے سارے پیراسائٹ (Parasite) کو نکال پھینکے گی۔ ہم غلط کام کرنے کے لیے مجبور کیے گئے ہیں۔ اب ہم ان جیسے کاموں سے بچ سکیں گے"۔23 کانگریس سرکاروں کے استعفے دینے کا مثبت نتیجہ بھی سامنے آیا۔ کانگریس کے اندر بائیں اور دائیں بازو کے لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوئے کیونکہ جنگ میں حصہ لینے کے سوال پر ان دونوں کی ایک رائے تھی۔

بہر حال کل ملا کر کانگریس سرکاروں کی قانونی اور انتظامی کارگزاریاں مثبت تھیں جیسا کہ آر۔ کوپ لینڈ (R. Coupland) نے 1944 میں تبصرہ کیا تھا کہ "اس پرانے خیال کی تصدیق ہوگئی کہ ہندوستان کے سماجی پچھڑے پن پر فیصلہ کن حملہ کے لیے خودمختار حکومت کی ضرورت ہوتی ہے"۔24 اگر چہ نہرو کانگریس سرکاروں کے سخت ناقد تھے مگر انھوں نے بھی 1944 میں لکھا تھا کہ "تمام دشواریوں سے گھرے ہونے کے باوجود اگر پیچھے مڑکر دیکھا جائے تو کانگریس سرکاروں کے کارناموں پر حیرت ہوتی ہے"۔25 گوکہ کانگریس سرکاروں کے تئیں بائیں بازو کے لوگوں کا رویہ تنقید سے بھرا تھا مگر مستقبل کو مدنظر رکھ کر اگر سوچا جائے تو جن باتوں کی ان کو امیدیں تھیں وہ کافی حد تک پوری ہوئیں۔ 1935 میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ششم کانگریس میں کلونیل ملکوں میں انقلابی تحریکوں کے بارے میں اپنی رپورٹ کے ہندوستان پر کیے گئے تبصرہ والے حصے میں وانگ منگ (Wang Ming) نے لکھا تھا کہ "پچھلے دسمبر میں کانگریس پارٹی کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے خلاف متحدہ مورچہ قائم کرنے کی کوشش میں ہمارے ہندستانی کامریڈوں نے اس طرح کے مطالبات رکھے تھے.........ہندستانی کسان

مزدوروں کی سوویت ریپبلک کا قیام، بغیر معاوضہ ادا کیے زمینداروں کی ساری زمینیں ضبط کرنا، موثر کارروائی کے طور پر عام ہڑتال کا پروگرام وغیرہ۔ ہمارے ہندستانی کامریڈوں کی طرف سے اس طرح کے مطالبات رکھنا اس بات کی خوبصورت مثال ہے کہ کلونیل حکومت کے خلاف متحدہ مورچہ کے داؤں پیچ کیسے چلائے جانے چاہیےاور مستقبل قریب میں ہونے والی جدوجہد کے اس پروگرام میں ان مطالبات کو شامل کرنا ہوگا.........(۱) غلامی والے دستور کی مخالفت (2) سبھی سیاسی قیدیوں کی فوری رہائی (3) سبھی غیر معمولی قانونوں کا خاتمہ (4) تنخواہوں میں کمی، کام کے گھنٹوں کے اضافے اور مزدوروں کی برخاستگی کی مخالفت (5) بھاری بھرکم ٹیکسوں، زمینوں کے اونچے لگان، کسانوں کی زمینوں کی ضبطی اور بیگار کرانے کی مخالفت (6) جمہوری اختیارات کے قیام کے لیے جدوجہد26

اوراس بات میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس سرکاروں نے کم وبیش ان مطالبوں کو اچھی طرح پورا کیا۔

کانگریس سرکاروں کا سب سے عظیم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کی زبردست کوشش کی۔ ضلع مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں کو فسادات سے نمٹنے کے لیے ہدایتیں دی گئیں۔

دستور ترمیم کے ذریعہ قومی تحریک کو کمزور کرنے کی حکومت کی منشا کو کانگریس نے ناکام کردیا۔اس کے برعکس ان لوگوں نے یہ بھی دکھایا کہ بغیر اپنی شناخت کھوئے اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے کسی سیاسی ڈھانچہ کا کسی تحریک میں کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے،خصوصاً اس تحریک میں جس کا مقصد ہی حکومت پر قبضہ کرنا ہو۔ بہرحال تھوڑی بہت کمیوں کے باوجود سرکار بنانے کے بعد کانگریس مضبوط ہوکر سامنے آئی۔ اور ایسا بھی نہیں ہوا کہ روزمرہ کے سرکاری کاموں میں مصروف ہوکر قومی تحریک کے خودمختاری حاصل کرنے کے اپنے مقصد سے شمہ برابر ہٹی ہو۔ سرکاری عہدوں کا استعمال بڑی کامیابی سے قومی شعور پیدا کرنے اور قومی اثرات کو بڑھانے میں کیا گیا تا کہ مستقبل میں عام تحریک چلانے میں ضروری قوت حاصل ہو سکے۔تحریک کے مثبت اثرات افسر شاہی خصوصیت سے نچلی سطح کے افسروں پر مرتب ہوئے۔ برٹش سلطنت

کے مضبوط ستون یعنی آئی۔سی۔ایس۔افسروں کا حوصلہ بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔بہت سے آئی۔سی۔ایس۔افسروں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اب برٹش حکومت چند دنوں کی مہمان ہے۔بعد میں خصوصاً ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران ان افسروں کو یہ ڈر ستائے تھا کہ مستقبل قریب میں کانگریس پھر حکومت میں آسکتی ہے۔ایسا احساس ان کو اس لیے ہو رہا تھا کہ کانگریس ایک بار حکومت بنا چکی تھی۔ایسے حالات میں زمیندار اور نوکر شاہ جیسے مخالف عناصر بھی خاموش ہو چلے تھے اور وہ دور بیٹھ کر وقت کے الٹ پھیر کا انتظار کرنے لگے تھے۔

اس سلسلہ میں وسالا کشی کی یہ بات قابل ذکر ہے ''متحدہ صوبوں کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ کانگریس سرکار کے دوران کانگریس کے بارے میں عوام میں کوئی بدگمانی نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ آزادی ملنے کے بعد معاملات کی کیا شکل ہو اس کے بارے میں لوگ اچھی طرح سوچنے لگے تھے''27

اس کے علاوہ ہندستانی یکجہتی میں نہ تو کسی قسم کی کمی آئی تھی اور نہ علاقائی احساسات کو ہوا ہی ملی تھی جیسا کہ 1935 کے دستور بنانے والوں اور اس میں صوبائی خود اختیاری دینے والوں کو برعکس امیدیں تھیں۔گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے ایک متحدہ مورچہ بنانے میں کانگریس سرکاروں کو بڑی کامیابی ملی تھی۔تمام گٹ بازی کے باوجود کانگریس میں نظم وضبط بنا رہا۔کانگریس قیادت کے سخت رویہ نے اونچی سطح پر آئی ہوئی گٹ بازی پر پورا کنٹرول رکھا اور جب شیرازہ بکھرنے کی نوبت آئی تو وزرا اپنی کرسیوں سے چپکے نہیں رہے۔وہ فوراً اپنے عہدوں سے الگ ہو گئے۔اس طرح کانگریس سرکاروں کا وجود میں آنا جدوجہد آزادی کا ایک دور ثابت ہوا۔مفاد پرست اور ابن الوقت عناصر میدان سے ہٹنے لگے،جیسا کہ کانگریس کے جنرل سکریٹری نے اس وقت کہا تھا کہ ''وزرا نے استعفے دے کر یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس اقتدار کی بھوکی اور عہدوں کی حریص نہیں ہے بلکہ وہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتی ہے''28

کانگریس نے اپنے بائیں اور دائیں بازو کے خیموں میں خود کو تقسیم ہونے سے بچایا، جب کہ برٹش حکومت 1934 سے ہی ان کے درمیان نفاق پیدا کرنے میں سرگرم تھی۔ایک دوسرے کی سخت تنقید کرنے کے باوجود دونوں خیمے ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہی نہیں رہے

بلکہ قریب تر ہونے کی کوشش بھی کی۔ یہ بات تری پوری بحران کے وقت صاف طور سے ظاہر ہوئی۔

اہم بات یہ ہے کہ سماج کے تمام طبقات میں اثر ورسوخ حاصل کرنے کی وجہ سے کانگریس کو بہت فائدہ پہنچا۔ ہندستانی سماج میں کانگریس کے فروغ ونشو ونما اور قومی اختیار واقتدار کا عمل تیز تر ہوا، عوامی تحریکوں نے اگر ایک طرف برطانوی کلونیل ازم کے تسلط کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی سوچ کے اہم عنصر کی تکذیب کی تو دوسری طرف حکمرانی کرتے ہوئے بااختیار ہندوستانیوں کی سرگرمیوں نے اس مفروضے کہ ہندستانی حکومت کرنے کے لائق نہیں ہیں، کو پاش پاش کردیا، اسی کی تبلیغ اور ترویج کے سہارے انگریزوں نے ہندوستانیوں کو غلام بنا رکھا تھا۔

باب۔27

1930 اور 1940 کی دہائیوں میں کسان تحریکیں

1930 کی دہائی میں ہندستانی کسانوں میں نیا سیاسی شعور پیدا ہوا۔انھوں نے اپنی قوت پہچانی اور اپنے حالات کو بدلنے کی متحدہ کوشش کی۔ دراصل یہ بیداری سیاست اور اقتصادیات میں پیدا شدہ واقعات کا نتیجہ تھی۔ ایک واقعہ تو کساد بازاری تھی جس کے اثرات 30-1929 میں ہی ہندوستان میں ظاہر ہونے لگے تھے اور دوسرا واقعہ 1930 میں انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعہ چلایا گیا عام جدوجہد کا دور تھا۔

کساد بازاری نے کھیتی کی پیداوار کی قیمتوں کو پچاس فیصد یا نارمل سطح سے بھی کم کردیا تھا۔ مال گزاری، لگان اور ٹیکس کی اونچی شرح سے خستہ حال کسانوں کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی مگر حکومت نہ اپنے ٹیکسوں کی شرح کم کرنے کے لیے تیار تھی اور نہ وہ زمینداروں سے ان کی مال گزاری ہی کم کرا رہی تھی۔ کارخانوں میں بنی چیزوں کے دام بھی گرے تھے مگر اتنا نہیں جتنا کھیتی کی پیداوار کے گرے تھے۔ کل ملا کر کسانوں کو ٹیکسوں، لگانوں اور قرضوں کا بھگتان، مندی کے پہلے کی شرح سے کرنا پڑ رہا تھا جبکہ ان کی آمدنی متواتر کم ہوتی جا رہی تھی۔

ایسے ہی بے اطمینانی کے ماحول میں 1930 میں سول نافرمانی تحریک شروع ہوئی،

جو جلدی ہی ملک کے زیادہ تر علاقوں میں ٹیکس اور لگان نہ دینے کی مہم میں بدل گئی۔ 1928 کی باردولی ستیہ گرہ کی کامیابی سے سرشار کسان بڑی تعداد میں احتجاج میں شامل ہو گئے۔ مثلاً آندھرا میں لگان سے متعلق نئے مجوزہ بندوبست میں اضافہ مقصود تھا۔ وہاں سیاسی تحریک اس طرح کے بندوبست کے خلاف مہم میں شامل ہوگئی۔ اتر پردیش میں لگان و ٹیکس نہ ادا کرنے کی مہم گاندھی اردن سمجھوتے کے بعد بھی جاری رہی۔ گاندھی جی نے بذات خود یو پی کے کسانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ صرف پچاس فیصد قانونی لگان ادا کریں اور رسید پورے بھگتان کی لے لیں (1) گجرات کے کسانوں نے خصوصاً سورت اور کھیڈا میں ٹیکس دینے سے انکار کر دیا اور سرکاری ظلم سے بچنے کے لیے بڑودہ ہجرت کر گئے۔ ان کی زمینیں اور منقولہ جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ بہار و بنگال میں کسانوں کو چوکیدارا ٹیکس دینا پڑتا تھا جو اپنے ہی ستمگر کی بھلائی پر خرچ کرنے کے مانند تھا۔ اس کے خلاف زبردست تحریکیں چلائی گئیں۔ پنجاب میں ''مال گزاری نہ دو'' مہم کے ساتھ کسان سبھائیں وجود میں آئیں۔ ان سب نے ٹیکس اور پانی محصول میں کٹوتی اور قرض کے ایک حصہ کی معافی وغیرہ کے مطالبے کیے۔ مہاراشٹر، بہار اور مدھیہ پردیش میں کسانوں اور قبائلوں نے جنگل ستیہ گرہ کے ذریعہ جنگلات کے ان قانونوں کے خلاف احتجاج کیا جن کے تحت جنگلوں کے عام استعمال پر روک لگائی گئی تھی۔ آندھرا میں زمینداری مخالف مہم چلائی گئی اور نیلور (Nellore) ضلع کی وینکٹا گری (Venkatagiri) زمینداری اس کا پہلا نشانہ تھی۔

سول نافرمانی تحریک نے ابھرتی ہوئی کسان تحریک میں ایک دوسری طرح سے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بطن سے جنگجو سیاسی نوجوانوں کی ایک نسل پیدا ہوئی اور سیاسی کارکنوں کی اس نئی نسل پر دھیرے دھیرے بائیں بازو کا رنگ چڑھنے لگا جس کی اشاعت جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس اور دوسرے مارکسسٹ لیڈروں اور جماعتوں کے ذریعہ کی جا رہی تھی۔ سول نافرمانی تحریک کے کمزور پڑنے پر انھیں رضاکار نوجوان، مردوں اور عورتوں نے کسان سبھاؤں کو منظم کرنے میں اپنی ساری توانائی جھونک دی۔

1934 میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی (CSP) کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی بائیں بازو کی طاقتوں کو منظم ہونے کا عمل بھی تیز ہوا اور اس کا ممبر بن کر کمیونسٹوں کو بھی کھلے

ماحول میں قانونی طریقے سے کام کرنے کا موقع ملا۔ بائیں بازو کے اتحاد نے کسان تحریک کو کامیابی دلائی جس کے لیے این۔ جی۔ رنگا اور دوسرے لیڈر کسان تحریک کو اچھی طرح چلانے کی کوشش ایک مدت سے کرتے آرہے تھے۔ اپریل 1936 میں لکھنؤ میں آل انڈین کسان کانگریس کا قیام ہوا جس کا نام بعد میں بدل کر آل انڈیا کسان سبھا کر دیا گیا۔ 1929 میں صوبائی کسان سبھا بہار کے قائم کرنے والی جنگجو ہستی سوامی سہجانند سرسوتی اس کے صدر اور آندھرا کے کسان تحریک لیڈر اور کھیتی معاملات کے ماہر این۔ جی۔ رنگا اس کے جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے۔ کسان سبھا کے پہلے اجلاس میں جواہر لعل نہرو نے شرکت کی اور تنظیم کے قیام کو سراہا۔ اس اجلاس میں رام منوہر لوہیا، سوہن سنگھ جوش، اندولعل یاگنک، موہن لعل گوتم، کمل سرکار، سدھین پرمانک (Sudhin Pramanik) اور احمد دین نے حصہ لیا۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ ایک کسان منشور (Manifesto) اور ہفت روزہ بلیٹن بھی اندولعل یاگنک کی اڈیٹری میں نکالا جائے۔

آل انڈیا کسان کمیٹی کے بمبئی اجلاس میں کسان منشور کا مسودہ منظور کر کے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ اسے 1937 میں الیکشن کے وقت اپنے اعلانیہ میں شامل کر سکے۔ فیض پور میں کانگریس میں شامل کھیتی پروگرام پر کسان منشور کا اثر کافی حد تک دیکھا جاسکتا ہے۔ کانگریس نے حکومت کے سامنے جو مطالبات رکھے تھے ان میں یہ مطالبے خاص تھے.......... مال گزاری اور لگان میں پچاس فیصد کی کمی، قرض کی وصولی کا التوا، زمیندارانہ وصولیابی کا خاتمہ، کاشتکاروں کے حق ملکیت کا تحفظ، کھیتی مزدوروں کو گزارے لائق مزدوری اور کسان تنظیموں کو منظوری[2]

مہاراشٹر کے فیض پور کانگریس اجلاس کے ساتھ ساتھ آل انڈیا کسان کانگریس کا دوسرا اجلاس بھی ہوا۔ اس کی صدارت این۔ جی۔ رنگا نے کی۔ اس موقع پر 500 کسانوں نے منماڑ (Manmad) سے فیض پور تک دو سو میل پیدل مارچ کیا۔ ان کا مقصد لوگوں کو کسان کانگریس کے مقاصد سے آگاہ کرنا تھا۔ ان کا استقبال بڑی گرمجوشی سے جواہر لعل نہرو، شنکر راؤ دیو، ایم۔ این۔ رائے (M.N. Roy)، نریندر دیو، ایس۔ اے ڈانگے، ایم۔ آر۔ مسانی، یوسف مہر علی

بنکم مکھرجی جیسے بہت سے کانگریس اور کسان لیڈروں نے کیا۔ رنگا نے اپنی صدارتی تقریر میں اعلان کیا کہ "ہم اس لیے منظم ہو رہے ہیں تا کہ سوشلسٹ سماج اور راج کا قیام بالآخر وجود میں آ سکے 3

1937 کے ابتدائی زمانے میں زیادہ تر صوبوں میں کانگریسی حکومت کے قیام کی وجہ سے کسان تحریکوں کے فروغ ونشو ونما کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ملک کا پورا سیاسی ماحول ہی بدل گیا تھا۔ شہری آزادیوں کے بارے میں لوگوں کی سوچ میں خاصی وسعت پیدا ہوئی تھی۔ اپنے ہی لوگ حکومت کر رہے ہیں، اس احساس سے لوگ پر امید تھے کہ حکومت عوام کی بھلائی کے لیے کام کرے گی۔ اس لیے 1937 سے 1939 تک کا دور مجموعی طریقے سے کسان تحریکوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ مختلف وزارتوں نے متفرق زراعتی قانون لاگو کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات بھی کیے تھے۔ مثلاً قرضوں میں راحت، مندی کے ایام میں جن کسانوں کی زمینیں ضبط کرلی گئی تھیں، ان کی واپسی اور اسامیوں کے حق ملکیت کا تحفظ وغیرہ۔ اور اس طرح کے اقدامات سے کسانوں میں مجوزہ قانونوں کی موافقت کرنے یا ان میں ترمیم کا مطالبہ کرنے کی قوت پیدا ہوئی 4

کسانوں کو متحرک کرنے کے لیے تھانہ، تعلقہ، ضلع اور صوبائی سطح پر کسان سبھائیں اور کانفرنسیں منعقد کی جاتی تھیں۔ ان سبھاؤں میں کسانوں کے مطالبات پیش کیے جاتے تھے اور تجویزیں منظور کی جاتی تھیں۔ مقامی، صوبائی اور قومی سطح کے لیڈروں کی تقریریں ہوتی تھیں۔ ان میٹنگوں کے انعقاد کے پہلے رضا کار گاؤں گاؤں جا کر جلسے کرتے، لوگوں کو کسان سبھاؤں اور کانگریس پارٹی کے ممبر بنانے، نقد یا غلہ کی شکل میں چندہ اکٹھا کرتے، اور سبھاؤں میں زیادہ سے زیادہ شرکت کرنے کے لیے کسانوں کو سمجھاتے، سبھاؤں کے دوران ڈرامے وغیرہ کے پروگرام چلائے جاتے اور تحریک کے مقاصد کو بڑے پُر درد انداز میں لوگوں کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ ان سب کا پاس پڑوس کے علاقوں میں خاطر خواہ اثر پڑتا۔ سبھاؤں اور میٹنگوں میں شرکت کرنے والے کسان اپنی طاقت کا نیا شعور اور اپنے حالات کی بہتر سمجھ لے کر لوٹتے تھے۔

کیرالا کے ملابار علاقے میں جو پُر زور کسان تحریک شروع ہوئی وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے کارکنوں کی مستقل کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ کارکن 1934 سے ہی کسانوں کے درمیان

کام کرر ہے تھے۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں گھوم کر ''کرشک سنگھم'' (کسان تنظیمیں) جیسی تنظیموں کی تشکیل کرر ہے تھے۔ ان تنظیموں کے اہم مطالبے تھے: زمیندارانہ وصولی، تجدیدی فیس (Renewal Fees) اور پیشگی لگان ادائیگی ختم ہو اور ذاتی کاشت کی بنیاد پر زمینداروں کے ذریعہ کی جارہی بے دخلی بند ہو۔ کسانوں نے مال گزاری، لگان اور قرض میں تخفیف کا بھی مطالبہ کیا انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ان کے غلہ کی ٹھیک ٹھیک تول ہو۔ ان کے اناج کی زمینداروں کے ذریعہ کرائی جارہی گھٹ تولی اور ان کے منیجر کی بدعنوانیاں اور رشوت ستانی بند ہو۔

ملابار کے کسانوں کے درمیان بیداری پیدا کرنے کے خاص ذرائع تھے گاؤں گاؤں میں سنگھم کی اکائیوں کی تشکیل اور سبھائیں اور جلسے، لیکن جو طریقہ خاصا مقبول ہوا اور جو بہت موثر ثابت ہوا، وہ تھا کسانوں کا جتھا بنا کر زمینداروں (Jenmies) کے گھر جانا، ان کے سامنے اپنے مطالبات رکھ کر فوری راحت پانا۔ ان جتھوں کے خاص مطالبات زمینداروں کی ناجائز وصولیوں جیسے واسی، نوری (Vasi, Nuri) کے خاتمہ کے لیے تھے۔

کرشک سنگھموں نے 1929 کے ملابار کاشتکاری قانون سدھار (Malabar Tenancy Act 1929) کے لیے ایک زوردار مہم چلائی تھی۔ 6/نومبر 1939 کو ملابار کاشتکاری قانون سدھار یوم کی شکل میں بنایا گیا۔ اس روز پورے ضلع میں جگہ جگہ جلسے ہوئے اور مطالبات پر زور دینے کے لیے ان میں ایک ہی طرح کی تجویز پاس کی گئی۔ آل ملابار کرشک سنگھم کے ذریعہ آر۔ رام چندر نیڈم گڈی (R. Rama Chandra Nedumgadi) کی صدارت میں کاشتکاری کی معیاد سے متعلق مسائل (Tenurial Problems) کی چھان بین کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس کی سفارش پر کیرل پردیس کانگریس کمیٹی نے 20/ Nov.1938 کو اپنی مہر لگادی اور دسمبر 1938 میں پانچ سو کسانوں کے دو جتھے شمالی اتری ملابار کے کری ولور (Kari Vallur) اور دکھنی ملابار کے کانجی کوڈ (Kanji kode) سے روانہ ہوئے راستے میں کانگریس کمیٹیوں نے ان کا زوردار استقبال کیا۔ ان دونوں جتھوں کا کالی کٹ کے پاس جوڑ ہوا جہاں اسی شام سمندر کے ساحل پر آل ملابار کرشک سنگھم کا جلسہ ہونے والا تھا۔ جلسہ کی صدارت پی۔ کرشن پلے (P. Krishna Pillai) جو پہلے سی۔

ایس۔ پی میں تھے اور بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے نے کی۔ پبلک کی اس میٹنگ میں تجویز پاس کر کے کاشتکاری قانون میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ عوام کے اصرار پر ٹی۔ پرکاشم (T. Prakasam) جو اس وقت مدراس پریسیڈینسی میں راجہ جی کی کابینہ میں وزیر مالیات تھے نے دسمبر 1938 میں ملابار کا دورہ کیا۔ اور ایک کاشتکاری کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کے تین ممبران بائیں بازو کے تھے۔ کرشک سنگھم کی اکائیوں اور کانگریس کمیٹیوں نے جگہ جگہ جلسے کیے اور کسانوں سے اپیل کی کہ کمیٹی کے سامنے بہ ثبوت اپنا میمورنڈم پیش کریں۔ اس طرح کمیٹی نے مطالبات کے سلسلہ میں اپنی رپورٹ 1940 میں داخل کی مگر تب تک کانگریس حکومت مستعفی ہو چکی تھی۔ اس لیے فوری طور سے اس معاملہ میں کچھ ہو پانا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی کاشتکاری کے مسئلہ پر جو مہم چلائی گئی اس نے کسانوں کو اتنا بیدار کر دیا کہ بعد کے سالوں میں ان کے مطالبوں کو منظور کرنا لازمی ہو گیا۔ دریں اثنا مدراس کی کانگریس سرکار نے قرض میں راحت دینے کے لیے ایک قانون پاس کر دیا تھا۔ کرشک سنگھم نے کانگریس سرکار کی اس کارگزاری کا پرزور خیر مقدم کیا5

آندھرا کے ساحلی علاقوں میں کسانوں کی تحریک غیر معمولی طریقے سے آگے بڑھی۔ انھوں نے وہاں کی سرکار اور زمینداروں کے خلاف آندھرا صوبائی رعیت ایسوسی ایشن اور آندھرا زمین رعیت ایسوسی ایشن کے ذریعہ کامیاب تحریکیں چلائی تھیں ان کی شاندار جدو جہد کا ایک لمبا اتہاس تھا۔ ان سب کے علاوہ این۔ جی رنگا 1933 سے ہی گنٹور (Guntur) ضلع کے اپنے آبائی گاؤں نڈو برولو (Nidobrolu) میں انڈین پیزنسٹز انسٹی ٹیوٹ (Indian Peasants' Institute) نام کا ادارہ چلا رہے تھے۔ جو کسان تحریک کے لیے فعال اور سرگرم کارکن تیار کرتا تھا۔ 1936 کے بعد بائیں بازو کے کانگریسیوں اور سی۔ ایس۔ پی کے لوگوں نے جن میں سے بہت سارے لوگ کمیونسٹ پارٹی میں چلے گئے تھے، کسانوں کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان میں پی سندریا (P. Sundarayya) خاص الخاص تھے۔

1937 کے الیکشن میں بہت سے زمیندار اور زمیندار نواز امیدواروں کی کانگریس کے مقابلے میں ہار نے زمینداروں کے وقار کو بڑا دھکا پہنچایا اور کاشتکاروں میں زبردست خود

اعتمادی پیدا کی۔ انھوں نے بوبلی (Bobbili) اور منگلا (Mungala) زمینداروں کے خلاف جدوجہد شروع کردی اور کھیت جوتنے اور مچھلی مارنے کے حقوق کو لے کر کالی پٹنم (Kalipatnam) کے زمیندار کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہوا۔

آندھرا کے ساحلی علاقوں میں کسان مارچوں کا استعمال 1933 سے ہی بڑی کامیابی سے ہوتا آرہا تھا۔ مختلف سمتوں سے مارچ کرتے ہوئے وہ ضلع یا تعلقہ ہیڈ کوارٹرز پر اکٹھا ہوکر اپنے مطالبات افسروں کو پیش کرتے تھے۔ 1938 میں صوبائی کسان کانفرنس نے ایک بڑے عظیم الشان مارچ کا نظم کیا۔ اس مارچ کے دوران دو ہزار سے بھی زیادہ کسانوں نے شمال میں اچھاپور (Itchapur) سے چل کر نو ضلعوں سے گزرتے ہوئے تقریباً 1500 میل (2400 کلومیٹر) کا پیدل سفر ایک سو تیس دنوں میں پورا کیا۔ راستے میں ان لوگوں نے سیکڑوں میٹنگیں کیں جن میں لاکھوں کسان شریک ہوئے۔ ان لوگوں نے دوران سفر کسانوں کی ایک ہزار ایک سو عرضیاں اکٹھا کرکے 27 / مارچ 1938 کو مدراس صوبائی اسمبلی کو سپرد کیا۔ ان عرضیوں میں خاص مطالبہ قرض میں راحت پانے کے لیے تھا۔ اس کو کانگریس سرکار نے منظور کرکے قانونی شکل دے دی۔ پورے آندھرا میں اس کے لیے کانگریس کی بڑی جے جے کار ہوئی۔ کسانوں کے مطالبے پر مدراس سرکار نے ایک زمینداری جانچ کمیٹی بنائی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ جانچ کمیٹی کی سفارشوں کو قانونی جامہ پہنا پائے وہ مستعفی ہوگئی۔

آندھرا کسان تحریک کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ اس نے کسان کارکنوں کو معاشیات اور سیاسیات کی ٹریننگ دینے کے لیے موسم گرما میں اسکول چلائے۔ کوتھا پٹنم (Kotha patnam)، مانٹے نوری پالم (Mante navari palam) کے علاوہ دوسری جگہوں پر چلائے جارہے ٹریننگ کیمپوں پر پی۔ سی۔ جوشی (P.C. Joshi) اجے گھوش اور آر۔ ڈی۔ بھاردواج (Bhardwaj) جیسے نامی گرامی کمیونسٹ لیڈروں کے ذریعہ تاریخ، مارکسزم، ہندستانی معاشیات اور انھیں سے متعلق دوسرے عنوانات پر لکچر ہوتے تھے۔ ان ٹریننگ کیمپوں کو چلانے کے لیے آندھرا کے کسانوں سے مالی تعاون لیا جاتا تھا۔ کسان یوم، اور دوسرے یوم، منا کر اور کسان گیتوں کو عوام میں گا گا کر کے کسانوں میں بیداری پیدا کرنے کی مہم چلائی گئی تھی۔[6]

بہار بھی کسان تحریک کا اہم علاقہ تھا۔ سوامی سہجانند کے ذریعہ بہار کی صوبائی کسان سبھا کا قیام ہوا تھا اور وہ آل انڈیا کسان سبھا کے خاص لیڈر تھے۔ کسان سبھا تنظیم کو بہار کے گاؤں گاؤں تک وسعت دینے کے لیے کاریانند شرما (Karyanand Sharma) راہل سانکرتیان (Rahul Sankaritayan) پنچانند شرما اور یدونندن شرما جیسے بائیں بازو کے بڑے بڑے لیڈروں نے ان کے ساتھ مل کر بہت کام کیا۔

بہار صوبہ کی کسان سبھا نے میٹنگوں، کانفرنسوں، ریلیوں اور عوامی مظاہروں کے ذریعہ اپنے پروگراموں کو مقبول عام کیا۔ 1938 میں پٹنہ میں ایسا زبردست مظاہرہ کیا گیا جس میں ایک لاکھ کسانوں نے حصہ لیا تھا۔ 1935 میں ہی کسان سبھا زمینداری ہٹاؤ تجویز پاس کر چکی تھی۔ کسان سبھا کے ان جلسوں میں زمینداری ہٹاؤ تجویز کو بار بار پاس کر کے اس کو مقبول ترین نعرہ بنا دیا گیا تھا۔ کسانوں کے دوسرے مطالبات یہ تھے.........غیر قانونی وصولیابیوں اور کاشتکاروں کی بے دخلی کا خاتمہ ہو، اور بہ کاشت (Bakasht) زمین کی واپسی کی جائے۔

کانگریس کابینہ نے لگان کی شرح کم کرنے اور بہ کاشت زمینوں کی واپسی کے لیے قانون بنانے کی کارروائی شروع کی تھی۔ بہ کاشت وہ زمینیں تھیں جو مندی کے زمانے میں لگان نہ ادا کر پانے کی وجہ سے کسانوں نے زمینداروں کو دے دی تھیں، جبکہ وہ زمین اب بھی کسانوں کے قبضے میں تھیں۔ وہ ان پر بٹائی دار کی حیثیت سے کھیتی کرتے تھے۔ بہر حال اسمبلی کے زمیندار ممبروں کی رضامندی سے جو فارمولا بنا اور جس کو قانونی شکل بھی دے دی گئی وہ کسان سبھا کے انقلابی لیڈروں کو قطعی منظور نہیں تھا۔ اس فارمولے کے مطابق بہ کاشت زمینوں کا صرف ایک حصہ ہی کسانوں کو واپس پانا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ وہ ان کی نیلامی قیمت کے نصف کا بھگتان کریں۔ اس کے علاوہ کچھ خاص قسم کی زمینیں اس قانون سے مستثنیٰ تھیں۔

اس طرح بہ کاشت زمینوں کا معاملہ کسان سبھا اور کانگریس کابینہ کے درمیان تنازعہ کا مسئلہ بن گیا تھا۔ کاریانند شرما (Karyanand Sharma) کی قیادت میں منگیر ضلع کے بڑھیا تال (Barahiya tal) میں جس طرح کوششیں ہو رہی تھیں وہ تو جاری رہیں۔ ان کے علاوہ جدوجہد کی نئی شکلیں بھی سامنے آئیں۔ گیا ضلع کے ریوڑ (Reora) میں یدونندن شرما

(Yadunandan Sharma) کی قیادت میں ضلع مجسٹریٹ سے کسان یہ اعلان کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ متنازعہ ایک ہزار بیگھے آراضی میں سے آٹھ سو پچاس بیگھے زمینیں کسانوں کو واپس کردی جائیں گی۔ اس اعلان نے دوسرے علاقوں کے کسانوں کو بڑا حوصلہ دیا۔ دربھنگہ کے پادری، راگھوپور، دیکلی اور پنڈول (Pandoul) میں کسان تحریکیں شروع ہوگئیں۔ جمنا کرجی (Jamuna Karjee) نے سارن ضلع میں اور راہل سانکرتیان نے اناوری (Annawari) میں کسان تحریکوں کی قیادت کی۔ ان تحریکوں نے ستیہ گرہ، جبریہ بوائی اور فصل کٹائی کا سہارا لیا۔ زمینداروں نے لٹھیتوں کے ذریعہ کسان سبھاؤں کو منتشر کرنا اور کسانوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔ زمینداروں اور کسانوں کے درمیان تصادم ہونے لگے۔ پولیس اکثر بیچ میں پڑ کر کسان لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریاں کرتی تھی۔ کچھ جگہوں پر سرکاری نمائندوں اور کسانوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ بہر حال 1938 کے آخر اور 1939 میں کسان تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی مگر اگست 1939 میں سرکار کے ذریعہ کچھ رعایتیں ملنے، نئے قانون بنانے اور چھ سو کارکنوں کی گرفتاری سے یہ تحریک رک سی گئی۔ کسانوں نے کچھ علاقوں میں 1945 میں پھر انگڑائی لی اور ان کی تحریک تب تک جاری رہی جب تک زمینداری سسٹم کا خاتمہ نہیں ہوگیا۔[7]

پنجاب کسان تحریک کا ایک اور مرکز تھا۔ یہاں 1930 کی دہائی میں ہی 'نوجوان بھارت سبھا'، کرتی کسان، کانگریس اور اکالی کارکنوں کی کوششوں سے کسان سبھا وجود میں آ گئی تھی اور 1937 میں پنجاب کسان کمیٹی کا قیام بھی ہوگیا تھا۔ اس نے ان سب کو ایک دھاگے میں پرو دیا تھا۔ اس کے کارکن گاؤں گاؤں کا دورہ کرتے، کسان کمیٹی اور کانگریس کے ممبر بناتے، تحصیل، ضلع اور صوبائی سطح پر کانفرنسیں کرتے اور ان میں شرکت کرنے کے لیے کسانوں سے اپیل کرتے تھے (رفتہ رفتہ ان کانفرنسوں کی تعداد بڑھنے لگی اور قومی معیار کے نیتا بھی ان میں شریک ہونے لگے) پنجاب کے کسانوں کے خاص مطالبے یہ تھے کہ ٹیکسوں میں تخفیف اور قرض کی ادائیگی کا التوا ہو۔ یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) کی کابینہ ان کے حملہ کا خاص نشانہ تھی۔ اس میں مغربی پنجاب کے زمیندار ممبروں کا خاص غلبہ تھا۔

لاہور اور امرتسر ضلعوں میں لگان کا دوبارہ بندوبست اور نہر ٹیکس میں اضافہ دو ایسے

مسئلے بروقت پیدا ہو گئے تھے جن کے خلاف کسانوں کے جتھے نکلتے تھے اور ان کو ضلع ہیڈ کوارٹر تک لے جایا جاتا تھا جہاں پر زبردست مظاہروں کا نظم کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا یہ احتجاج اپنے عروج پر 1939 میں پہنچ گیا جب لاہور میں ایک بہت بڑا کسان مورچہ کا انعقاد ہوا۔ اس میں مختلف ضلعوں کے سیکڑوں کسانوں نے شرکت کی اور گرفتاریاں دیں۔ دریں اثنا ایک دوسرے ہی طرح کا احتجاج ملتان اور مانٹگومری (Montgomery) نہر کالونی علاقوں میں رونما ہوا۔ یہاں پر بڑی بڑی پرائیویٹ کمپنیوں نے سرکار سے کافی آراضی پٹے پر لے لی تھی اور جو بٹائی دار زمینوں پر کھیتی کررہے تھے ان سے طرح طرح کی جاگیردارانہ وصولی کی جاتی تھی۔ یوں سرکار نے ان ٹیکسوں کو غیر قانونی ٹھہرادیا تھا، پھر بھی زمیندار یہ وصولی کرتے ہی جارہے تھے۔ کسان لیڈروں نے ان کے خلاف کچھ علاقوں میں کسانوں کو متحد بھی کیا جس کے نتیجے میں وہاں ہڑتالیں بھی ہوئیں۔ کسانوں نے کپاس چننے اور فصل کاٹنے سے بالکل انکار کردیا۔ مجبوراً کسانوں کو کچھ رعایتیں دینی پڑیں۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کاشتکاروں نے تھوڑے عرصہ کے لیے اپنی تحریک روک دی مگر 47-1946 میں یہ پھر شروع ہوگئی۔

پنجاب میں کسان تحریک خاص طور سے سینٹرل ضلعوں تک محدود رہی۔ سب سے زیادہ مستعدی جالندھر، امرتسر، ہوشیار پور، لائل پور اور شیخوپور ضلعوں نے دکھائی۔ ان ضلعوں کے زیادہ تر کسان سکھ تھے اور ان کی اپنی زمینیں تھیں۔ 1920 کی دہائی کے اوائل میں ہوئے گوردوارا قانون سدھار تحریک اور 32-1930 کی سول نافرمانی تحریک کی وجہ سے وہ پہلے سے ہی جنگ آزادی کا ایک جز بن چکے تھے۔ مغربی پنجاب کے مسلم کسان جن کو زمیندار اپنی مرضی سے بے دخل کرسکتے تھے اور جنوبی مشرقی پنجاب (آج کا ہریانہ) کے جاٹ کسان تحریکوں سے عام طور سے الگ تھلگ رہے۔ مانٹگمری اور ملتان ضلعوں میں جن کسانوں نے اس تحریک میں حصہ لیا تھا ان میں زیادہ تر سینٹرل ضلعوں سے آکر بسے ہوئے لوگ تھے۔ جن کسان لیڈروں نے پنجاب میں بیداری کی روح پھونکی ان کے کچھ خاص نام بابا موہن سنگھ بھاکنا، بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی، بابا جوالا سنگھ، تیج سنگھ سوتنتر، بابا رور (Rur) سنگھ، ماسٹر ہری سنگھ، بھگت سنگھ بلگا (Bhagat Singh Bilga) اور ودھاوارام (Wadhawa Ram) ہیں[8]

پنجاب کی شاہی ریاستیں بھی کسان تحریکوں سے اچھوتی نہیں رہیں۔ سب سے زبردست تحریک پٹیالہ میں شروع ہوئی۔ اس کا خاص مطالبہ یہ تھا کہ دھوکا دھڑی، اور دھمکیوں کے مختلف ہتھکنڈوں سے زمینداروں اور افسروں نے مل کر جو زمینیں غیر قانونی طریقے سے کسانوں سے چھین لی ہیں، ان کو واپس کیا جائے۔ کاشتکاروں نے مالک کے حصے کا لگان دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی قیادت بھگوان سنگھ لونگروالیا (Longowalia) اور جاگیر سنگھ جوگا جیسے بائیں بازو کے لیڈران کر رہے تھے۔ بعد میں تیج سنگھ سوتنتر بھی ان کی قیادت میں شامل ہو گئے۔ یہ تحریک رک رک کر 1953 تک چلتی رہی۔ آخر کار 1953 میں قانون بنا کر کاشتکاروں کو زمینوں کا مالک قرار دیا گیا۔[9]

ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کسان بڑے پیمانے پر بیدار اور متحرک ہوئے۔ ان سب کے خاص مطالبات تھے: حق ملکیت کا تحفظ، زمیندارانہ وصولیابی کا خاتمہ، ٹیکس میں تخفیف اور قرض میں راحت۔ بنگال میں بردوان ضلع کے کسانوں نے بنکم مکھر جی کی قیادت میں دامودر نہر پر لگے نہر ٹیکس کے خلاف لڑائی لڑ کر خاطر خواہ سہولتیں حاصل کیں۔ چوبیس پرگنہ کے کسان اپنے مطالبوں کی تائید میں اپریل 1938 میں جلوس نکال کر کلکتہ تک لے گئے۔ آسام کی سرمہ گھاٹی (Surma Valley) میں زمینداروں کے ظلم وستم کے خلاف چھ مہینے تک لگان روکو تحریک جاری رہی اور کرونا سندھو رائے (Karuna Sindhu Roy) نے کاشتکاری قانون ترمیم (Amendment of the tenancy law) کے لیے تحریک چلائی۔ اڑیسہ میں اُتکل صوبائی کسان سبھا، جو مالتی چودھری اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں 1935 میں قائم ہوئی تھی، کسان منشور (Kisan Manifesto) کو پی۔سی۔سی کے انتخابی منشور میں شامل کرانے میں کامیاب ہوئی اور بعد میں وہاں جو کانگریس سرکار بنی، اس نے زراعتی سدھار کے لیے بہت اہم قانون بنایا۔ اڑیسہ کی ریاستوں کی کسان تحریکوں میں قبائلی ذاتیاں (Tribals) بھی شامل ہوئیں۔ ان کے خاص مطالبے تھے کہ بیگار لینے کا خاتمہ ہو، جنگلوں کے استعمال کے حقوق حاصل ہوں اور لگان میں تخفیف کی جائے۔ ڈھینکانل (Dhenkanal) میں بڑے زبردست تصادم برپا ہوئے۔ اس لیے افسروں اور زمینداروں کے ظلم وستم سے بچنے کے لیے ہزاروں لوگ ریاست چھوڑ کر بھاگ

گئے۔ شمال مغرب سرحدی صوبہ کی غلہ ڈھیر (Ghalla Dhir) ریاست میں کسانوں نے نواب کی من مانی بے دخلی کرنے اور ٹیکس وصول کرنے کی زبردست مخالفت کی۔ گجرات میں بندھوا مزدور سسٹم کے خلاف تحریک چلی اور اس میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ سینٹرل صوبوں کی کسان سبھا کی قیادت میں ناگپور تک ایک مارچ نکالا گیا۔ اس کے مطالبے تھے کہ مال گزاری سسٹم ختم ہو، ٹیکسوں میں تخفیف اور قرض کی ادائیگی کا التوا ہو۔

کسان بیداری کی اونچی ہوتی ہوئی لہر کا زور دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے سے کسی قدر تھم گئی۔ کانگریس وزارتیں مستعفی ہوگئیں۔ چونکہ کسان لیڈر اور بائیں بازو کے لوگ جنگ کے خلاف تھے اس لیے ان پر مظالم ہونے لگے۔ دسمبر 1941 میں جب ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کیا تو ہندستانی کیمونسٹ پارٹی نے ایک تجویز پاس کر کے اس کو عوام مخالف قرار دیا۔ اس طرح کسان سبھا کے کیمونسٹ اور غیر کیمونسٹ ممبروں کے درمیان سخت اختلافات پیدا ہوگئے اور بھارت چھوڑو تحریک (Quit India Movement) کے دوران ان اختلافات نے بڑی شدت اختیار کر لی۔ کانگریس سوشلسٹ کے ممبروں نے جہاں تحریک کی قیادت کی وہیں کیمونسٹ پارٹی نے اپنے کارکنوں کو تحریک سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ پھر بھی پارٹی کے منع کرنے کے باوجود مقامی سطح کے بہت سے کارکنوں نے ہندوستان چھوڑو تحریک میں حصہ لیا، مگر پارٹی لائن کی وجہ سے کسان سبھا کا 1943 میں منتشر ہونا لازمی ہو گیا۔ اسی دور میں آل انڈیا کسان سبھا کے تین بڑے لیڈروں ......این۔ جی۔ رنگا، سوامی سہجانند سرسوتی اور اندر لال یاگنک نے تنظیم کو خیر باد کہہ دیا۔

بہر حال دوسری جنگ کے دوران کسان سبھا فعال بنی رہی۔ اس نے خود کو مختلف فلاحی کاموں میں مصروف رکھا، مثلاً 1943 میں بنگال قحط کے دوران ضروری اشیا کی کمی اور غلے کی قلت سے پیدا ہوئی دشواریوں کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ تنظیمی کام بھی چلاتی رہی کسان سبھا کے لیے یہ بڑے کٹھن دن تھے۔ چونکہ کسان سبھا جنگ کے خلاف تھی۔ اس لیے کسانوں کے ایک طبقہ میں اس نے خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

دوسری جنگ کے اختتام کے بعد اقتدار منتقلی کی بات چیت شروع ہوگئی۔ آزادی ملنے والی ہے اس کا احساس ہونے لگا تھا اس سے کسان تحریک کی نشو ونما کا نیا اور توصیفی اسٹیج تیار ہوا۔

کسانوں میں نیا ولولہ پیدا ہوا اور اس احساس سے ان کو بڑا حوصلہ ملا کہ آزادی کے بعد ایک نیا معاشرتی ڈھانچہ وجود میں آجائے گا۔ سماج کے دوسرے طبقوں میں بھی اپنے حقوق کے حصول کے لیے پوری شدت سے جدوجہد شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے 1939 کے بعد جو تحریکی کوششیں رک گئی تھیں، پھر سے چالو ہوگئیں۔ لوگوں نے بڑی شدت سے مطالبہ کیا کہ زمینداری نظام کا فوری خاتمہ ہو۔ آندھرا میں کھیت مزدور تنظیم جو کچھ عرصہ پہلے بنی تھی اس نے مزدوروں کو مزدوری بڑھانے اور غلہ کی شکل میں دی جارہی مزدوری کی ٹھیک ٹھیک تول کرنے کے لیے جدوجہد شروع کیا۔

ٹراونکور کے پناپراوایالار (Punnapra Vaya Lar) کے کسانوں اور سرکاری عملے کے درمیان خونی تصادم ہوئے۔ تلنگانہ میں کسانوں نے زمینداروں کی زیادتیوں کے خلاف خود کو منظم کیا اور نظام کے خلاف چل رہی کوشش میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح کے واقعات ملک کے دوسرے حصوں میں بھی رونما ہوئے، مگر برٹش ہندوستان میں بنگال کی تیبھاگا (Tebhaga) جدوجہد بے حد زوردار عوامی تحریک تھی۔ تیبھاگا کا مطلب ہے ایک تہائی۔ 1946 کے اواخر میں بنگال کے بٹائی داروں نے یہ اعلان کیا کہ وہ جوت داروں (زمینداروں) کو پیداوار کا آدھا حصہ نہ دے کر ایک تہائی دیں گے اور حصہ تقسیم ہونے کے پہلے تک سارا غلہ زمینداروں کے کھلیان (کھماروں) میں نہ رہ کر ان کے گھر کے کھلیانوں میں رہے گا۔ بلاشبہ اس طرح کی مانگ کرنے کا حوصلہ ان کو بنگال لینڈ ریونیو کمیشن (Bengal Land Revenue Commission) جو فلاوڈ کمیشن (Floud Commission) کے نام سے زیادہ مشہور ہے سے ملا تھا۔ کمیشن نے جو رپورٹ سرکار کو دی تھی اس میں آدھے کی جگہ تہائی کی سفارش کی گئی تھی۔ ادھر ہجونگ قبائل (Hajong Tribals) یہ مطالبہ کررہے تھے کہ ان سے لگان غلہ کی شکل میں نہ لے کر نقد لی جائے۔ تیبھاگا تحریک جس کی قیادت بنگال صوبائی کسان سبھا کررہی تھی جلد ہی جوت داروں (زمینداروں) اور برگاداروں (Bargadars) یعنی بٹائی داروں کے درمیان تصادم میں تبدیل ہوگئی۔ تیبھاگا تحریک نے اگلے سال جنوری میں خاصا زور پکڑا جب سہروردی کی مسلم لیگ کابینہ نے 22/جنوری 1947 کے کلکتہ گزٹ میں بنگال برگادار ٹیمپوریری بل (Bengal Bargadars Temporary Bill) شائع کیا۔ اس میں

یہ کہا گیا کہ تیبھا گا پانے کا مطالبہ غیر قانونی نہیں ہے۔ایسے گاؤں کے لوگ بھی تحریک میں شامل ہو گئے جواب تک اس سے دور تھے۔کئی جگہوں پر کسانوں نے زمینداروں کے کھلیانوں میں رکھی فصل اپنے کھلیان میں لے جانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے کئی جگہ تصادم بھی ہوئے۔یہ دیکھ کر زمینداروں کی اپیل پر پولیس ان کو کچلنے کے لیے آ پہنچی۔کئی جگہوں پر خونی تصادم ہوئے اور خان پور میں 20 کسان مارڈالے گئے۔پولیس کا ظلم جاری رہا اور فروری کے آخر تک تحریک تھم ہی گئی۔مارچ میں ٹکراؤ کے کچھ واقعات ضرور ہوئے مگر وہ سب موت کی آخری سانس ثابت ہوئے۔مسلم لیگ کابینہ نے بل کو کونسل میں پاس کرانے میں کوئی دلچسپی نہیں لی مگر 1950 میں کانگریس سرکار نے جو برگادار بل پاس کیا اس میں تیبھا گا تحریک کے زیادہ تر مطالبے شامل کر لیے تھے۔

تیبھا گا تحریک کے خاص مراکز دناج پور، رنگ پور، جلپائی گڑی، میمن سنگھ اور مدنا پور اور کچھ حد تک پرگنہ اور کھلنا تھے۔شروع میں اس تحریک کے بنیادی لوگ راج بنشی راجپوت کسان تھے مگر جلد ہی مسلمان، ہجونگ، سنتھال اور اراو (Oraons) اس میں شامل ہو گئے۔تحریک کے خاص خاص لیڈران کرشن ونود رائے، آونی لہری، سنیل سین، بھوانی سین، مونی سنگھ، اننت سنگھ، بھوتی گہا، اجت رائے، سشیل سین، سرگانگلی اور گرو داس تعلقدار تھے۔10

ایک ایسی متضاد اور متنوع جدوجہد کا لیکھا جوکھا مرتب کرنا آسان کام نہیں ہے، مگر اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ 1930 اور 1940 کی دہائیوں میں برصغیر کے ایک بڑے حصہ کو متاثر کرنے والی کسان تنظیموں کو حالانکہ بروقت بہت زیادہ کامیابی تو نہیں حاصل ہو سکی پھر بھی ان سب نے ایسا ماحول ضرور تیار کیا کہ ملک کی آزادی کے بعد زراعتی سدھار کرنا ناگزیر ہو گیا۔مثلاً آزادی کے بعد زمینداری نظام کا خاتمہ کسی خاص تحریک کا سیدھا ماحصل تو نہیں تھا مگر کسان سبھا نے اس کے مطالبہ کو اس قدر مقبول عام کر دیا تھا کہ اس کی کوششوں کے بغیر یہ ممکن بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

آزادی سے قبل کے ایام میں جن وقتی مطالبوں کے حصول کے لیے کسان تحریکیں اٹھی تھیں وہ باتیں یہ تھیں.........ٹیکسوں میں تخفیف، جاگیردارانہ وصولی اور بیگار یا وتھی (Vethi) کا خاتمہ، زمینداروں اور ان کے کارندوں کے ذریعہ کیے جا رہے ظلم سے نجات، قرض کے بوجھ

میں کمی، غیر قانونی طریقوں سے غصب کی گئی زمینوں کی واپسی، اور کاشتکاروں کا تحفظ وغیرہ۔ آندھرا اور گجرات کو چھوڑ کر کہیں بھی زرعی مزدوروں کے مطالبے تحریک کا حقیقی حصہ نہیں بنے۔ ان کے رسم ورواج اور روایات نے ان کو اپنے جائز حقوق کے حصول کے تئیں بیدا کر رکھا تھا۔ جب حکومت یا زمیندار کسانوں سے بھاری ٹیکس اور لگان، غیر قانونی وصولی، جبریہ بیگار یا زمین پر حق ملکیت کے مطالبات کرتے تھے، تب کسان اپنی تنظیمی صلاحیت اور اپنے ضروری وسائل کو بروئے کار لا کر احتجاج کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے، اور اپنے جائز مطالبات کو منوانے کے لیے مستعد رہتے تھے۔[11] بظاہر یہ تحریکیں موجودہ زراعتی ڈھانچہ کو بدلنے کے لیے نہیں ہوئی تھیں مگر ان کا مقصد اس ڈھانچے کے ظلم وستم کرنے والے عناصر کو ختم کرنا تھا۔ بہر حال زمینداروں کی طاقت کئی طرح سے کمزور پڑی اور زراعتی ڈھانچہ کی شکل کو بدلنے کے لیے زمین تیار ہوئی۔ کسان تحریکوں کا کام تھا کسانوں میں بیداری کی نئی روح پھونکنا اور اسی شعور پر انحصار کر کے تحریک چلانا۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مختلف علاقوں میں کسان تحریک کی مانگیں اور ان کی شکلیں کم وبیش ایک جیسی تھیں۔ کسانوں میں بیداری لانے کا کام خاص طور سے سبھاؤں، کانفرنسوں، ریلیوں، مظاہروں، ممبر سازی کی مہموں اور کسان سبھاؤں کے ذریعہ کیا گیا۔ جہاں سیدھی لڑائی ہوئی وہاں ستیہ گرہ اور سول نافرمانی تحریک کا سہارا لیا گیا اور لگان ومال گزاری نہ دینے کی مہم چلائی گئی۔ یہ ساری باتیں قومی تحریک کا جز بن چکی تھیں۔ قومی تحریک کی طرح ہی کسان تحریکوں میں تشدد کے واقعات بہت کم ہوئے۔ بہر حال جہاں بھی تشدد کے واقعات ہوئے ان کو قیادت کی تائید نہیں کے برابر حاصل تھی۔ عام طور سے ظلم وستم کے رد عمل میں ہی یہ واقعات رونماں ہوئے تھے۔

کسان تحریک اور قومی تحریک کا اٹوٹ رشتہ کئی زاویے سے اہم تھا۔ کسان تحریکیں صرف وہیں ہوئیں جہاں قومی تحریک جدوجہد کر چکی تھی۔ کم از کم کیرالا، پنجاب، آندھرا، یو۔ پی اور بہار کے لیے یہ بات صحیح ہے۔ بلاشبہ قومی تحریک نے ہی کسان تحریکوں کے لیے زمین ہموار کی تھی۔ کسانوں میں سیاسی شعور کا ارتقا اور ان کے درمیان فعال اور لائق سیاسی کارکن تیار کر کے ہی کسان تحریکوں کی تشکیل ہو پائی اور ان کو مناسب قیادت بھی حاصل ہو سکی۔ قومی نظریہ ہی کسان تحریک کا

اساس تھا۔ اس کے کیڈر اور لیڈر طبقاتی لائن پر کسان کو تنظیم بنانے کا پیغام ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے پر بھی زور دے رہے تھے، جیسا کہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ زیادہ تر علاقوں میں وہ کسان سبھا کے ساتھ ساتھ کانگریس کے ممبر بھی بناتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ کچھ علاقوں جیسے بہار میں کانگریس اور کسان کے مختلف حلقوں میں سنگین اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ کسان تحریک کانگریس سے ٹکراؤ کے راستے پر ہے مگر ایسی صورت حال وہیں پیدا ہوئی جہاں بائیں بازو کے کارکنان اور کانگریس کے دائیں بازو کے قدامت پسند لوگوں نے انتہا پسندانہ رویہ اپنایا اور ایک دوسرے سے مصالحت اور افہام و تفہیم کے سلسلے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ عام طور سے 1942 تک کسان تحریک اور کانگریس تحریک دونوں ہی ایک ساتھ چلتی رہیں۔ 1942 کے بعد جب کسان تحریک قومی تحریک کے راستے سے دور چلی گئی، اس وقت اس کی صرف عوامی پکڑ ہی کمزور نہیں پڑی بلکہ اس کی قیادت میں بھی نفاق پڑ گیا۔ اس طرح کسان تحریک اپنے جنم اور ترقی کے دنوں سے جنگ آزادی کی قومی تحریک کے ساتھ بغیر اس میں گم ہوئے پوری طرح جڑی رہی۔

باب-28

جنگ آزادی اور دیشی ریاستیں

انگریزوں نے جس طرح ہندوستان پر قبضہ کیا اور کلونیل حکومت قائم کرنے کے لیے جو مختلف طریقے اپنائے ان کی وجہ سے اس برصغیر کے 2/5 حصہ پر دیشی راجا مہاراجاؤں کی ہی ریاستیں قائم رہیں۔ یہ ریاستیں چھوٹی بڑی ہر طرح کی تھیں۔ حیدرآباد، میسور، کشمیر جیسی ریاستوں کی وسعت تو کئی یورپی ملکوں کے برابر تھی اور کئی ریاستیں ایسی چھوٹی تھیں جن کی آبادی بمشکل کچھ ہزار رہی ہوگی۔ ان ریاستوں کے متعلق عام اور مشترک بات یہ تھی کہ سبھی انگریزی حکومت کی فوقیت کو تسلیم کرتی تھیں۔

اور اس اطاعت کے بدلے میں انگریزی حکومت نے ان کے حکمرانوں کو داخلی یا خارجی کسی بھی خطرے سے بچانے کی گارنٹی دے رکھی تھی۔ زیادہ تر ریاستوں کے حکمراں خودمختار تھے۔ وہ اور ان کے چہیتے ریاست کے سارے اختیارات کے بلاشرکت غیر مالک ہوتے تھے۔ برٹش ہندوستان کے مقابلے ان میں کاشت کی زمین کی شرح لگان زیادہ تھی۔ عموماً قانون کی حکمرانی اور شہری آزادی نسبتاً کم تھی۔ یہ حکمراں عیش وعشرت میں خزانے کا استعمال اپنی مرضی سے کر سکتے تھے۔ شان وشوکت پر بے دریغ دولت اڑائی جاتی تھی۔ ان میں کچھ حکمراں روشن خیال

بھی تھے، وہ اوران کے وزراء قانوناً انتظامی امور میں سدھار لانے کی کوشش کرتے تھے، لگان سسٹم کو آسان بنایا جاتا تھا اور حکومت کے کاموں میں عوام کی حصہ داری کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ مگر ریاستوں کی بڑی اکثریت مالی، سماجی، سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے کافی پچھڑی ہوئی تھی۔

ان ریاستوں کو انگریز، قومی تحریک کو کمزور کرنے کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جیوں جیوں قومی تحریک زور پکڑتی، انگریزی حکومت ان ریاستوں کو بطور ڈھال استعمال کرتی۔ اگر کوئی راجہ قومی تحریک کے لیے ذرہ برابر ہمدردی رکھتا، تو اس کو شک اور ناخوشی کی نظر سے دیکھا جاتا جیسے مہاراجہ بڑودہ۔ ریاستوں میں اصلاحی پروگراموں کو لاگو کرنے والے راجاؤں پر انگریزی حکومت طرح طرح کے دباؤ ڈالتی اور ان پر خفیہ نظر رکھی جاتی۔ پھر بھی بڑودہ اور میسور جیسی ریاستوں کے حکمراں ان تمام دباؤ کے باوجود اپنے یہاں صنعتی، زرعی، سیاسی، تعلیمی اور انتظامی سدھار کے پروگرام لاگو کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

برٹش ہندوستان میں قومی تحریک کی ترقی، جمہوریت اور شہری حقوق اور ذمہ دار حکومت کے تئیں بڑھتی ہوئی سیاسی بیداری نے دیسی ریاستوں کی جنتا کو بھی متاثر کیا۔ بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں جو تشدد پسند لوگ پناہ لینے کی غرض سے برٹش ہندوستان سے بھاگ کر دیسی ریاستوں میں آکر بس گئے تھے، انھوں نے عوام کے درمیان سیاسی شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1920 میں چلی عدم تعاون اور خلافت تحریکوں نے لوگوں کو بے انتہا متاثر کیا۔ انھیں تحریکوں سے متاثر ہو کر لگ بھگ انھی دنوں ریاستوں میں مختلف عوامی تنظیموں نے جنم لیا۔ میسور، حیدرآباد، بڑودہ، جام نگر، اندور، نوانگر اور کاٹھیاواڑ اور دکن کی ریاستوں میں صوبائی عوامی کانفرنسوں (State's People's Conferenes) کی تشکیل ہوئی اور 1927 میں یہ کاوش اپنے عروج پر پہنچ گئی جب دسمبر 1927 میں آل انڈیا اسٹیٹس پیپلس کانفرنس (AISPC) کا قیام ہوا۔ اس میں مختلف ریاستوں کے 700 سیاسی، کارکنوں نے حصہ لیا۔ بلونت رائے مہتا، منی لال کوٹھاری اور جی۔آر۔ ابھینکر (G.R. Abhayankar) اس کے خاص لوگ تھے۔

کانگریس نے 1920 میں ناگپور اجلاس میں پہلی بار دیسی ریاستوں کے بارے میں اپنی پالیسی کا اعلان کیا۔ اجلاس نے ایک تجویز پاس کر کے دیسی ریاستوں کے راجاؤں سے ذمے

دار سرکار بنانے کا مطالبہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس نے ان کی عوام کو کانگریس کا ممبر بننے کی اجازت دے دی اور یہ ہدایت کی کہ ایسے لوگ کانگریس کے نام پر ریاست کے اندر سیاسی سرگرمی نہیں کر سکتے ہیں، البتہ ذاتی طریقے سے یا مقامی سیاسی تنظیموں کے ممبر کی حیثیت سے ان کو سیاسی سرگرمی کرنے اور اس میں حصہ لینے کی پوری آزادی ہے۔

کانگریس نے خوب سوچ سمجھ کر ریاستوں کی عوام پر یہ بندش لگائی تھی۔ یہ بات قومی تحریک کے لیے بے حد مفید تھی۔ وجہ یہ تھی کہ برٹش ہندوستان اور دیسی ریاستوں کے سیاسی حالات میں بڑا فرق تھا۔ یہی نہیں، ایک ریاست کے حالات دوسری ریاست سے بالکل مختلف تھے۔ ریاستوں میں شہری حقوق نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لوگوں کو تنظیم بنانے کے اختیارات نہیں تھے۔ عوام سیاسی اعتبار سے پچھڑے پن کا شکار تھی اور سب سے خاص بات تو یہ تھی کہ قانونی اعتبار سے یہ ریاستیں خود مختار اور آزاد تھیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود کانگریس نے ریاستوں کی عوام کو کانگریس کے نام پر تحریک نہ چلانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ ریاست کی عوام بذات خود جدوجہد کے لیے منظم ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کانگریس اور دیسی ریاستوں کی عوامی تنظیموں کے درمیان کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان میں غیر رسمی تعلقات مستقل بنے رہے اور آل انڈیا اسٹیس پیپلس کانفرنس (All India States' People's Conference) اور کانگریس کے درمیان گہرا تعلق تھا۔ 1927 میں کانگریس نے اپنی تجویز کو پھر سے دہرایا۔ جواہر لعل نہرو نے 1929 میں لاہور اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں اعلان کیا کہ ''دیشی ریاستیں بقیہ ہندوستان سے الگ نہیں رہ سکتیں........ان ریاستوں کی تقدیر کا فیصلہ صرف وہاں کی جنتا ہی کر سکتی ہے''[1] بعد کے سالوں میں کانگریس نے راجاؤں سے ریاستوں کی جنتا کے بنیادی حقوق بحال کرنے کا مطالبہ کیا۔

تیسری دہائی کے وسط میں آپس میں ملے جلے دو واقعات نے ریاستوں کے بروقت کے حالات کو سب سے زیادہ تبدیل کیا۔ پہلا واقعہ 1935 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ تھا جس کے ذریعہ ریاستوں کو برٹش ہندوستان سے جوڑنے کا منصوبہ بنا تھا۔ اس کے تحت ہندوستان کو وفاقی (فیڈرل) شکل دینے کی اسکیم سوچی گئی۔ جس میں ریاستوں کو فیڈرل اسمبلی میں نمائندے

بھیجتے تھے، مگر اس میں چالاکی کا پہلو یہ تھا کہ ریاستوں کے نمائندے عوام کے منتخب کیے ہوئے نہیں بلکہ راجہ مہاراجاؤں کے نامزد کیے ہوئے ہوں جن کی تعداد اسمبلی کے کل ممبروں کی تعداد کی ایک تہائی ہو۔ انگریزی حکومت کا مقصد راجاؤں کے ان ایجنٹوں کو قومی تحریک کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ آل انڈیا اسٹیس پیپلس کانفرنس (AISPC) اور دوسری عوامی تنظیموں نے حکومت کی اس چالاکی کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس لیے ان سب نے مطالبہ کیا کہ ریاستوں کی نمائندگی کرنے کے لیے عوام کو بذاتِ خود اپنا نمائندہ منتخب کرنا چاہیے۔ راجاؤں کے گرگے عوام کے نمائندے نہیں ہو سکتے۔ یہ مطالبہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ریاستوں کی عوام بھی فوری طور سے ذمّے دار جمہوری سرکار بنانے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ بہر حال یہ اسکیم لاگو ہی نہیں ہوئی۔

دوسرا واقعہ تھا برٹش ہندوستان کے مختلف صوبوں میں 1937 میں کانگریسی سرکاروں کا وجود میں آنا۔ اس واقعہ نے ریاستوں کی عوام میں خود اعتمادی پیدا کی۔ نئی امیدیں جگیں اور سیاسی سرگرمیاں تیز ہوئیں۔ حالات کی اس تبدیلی کو راجاؤں نے بھی محسوس کیا۔ کانگریس اب صرف مخالف پارٹی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ اب تو وہ حکومت میں تھی اور پاس پڑوس کی ریاستوں کے سیاسی صورت حال کو متاثر کر سکتی تھی۔ 1938 اور 1939 دیسی ریاستوں میں نئی بیداری کے سال تھے۔ ان میں ذمہ دار حکومت بننے اور سدھار کے مختلف کام کرنے کے لیے مطالبے ہوئے۔ ان کے لیے تحریکیں چلیں۔ ایسی ریاستیں جہاں اب تک کوئی عوامی تنظیم نہیں بنی تھی وہاں بڑی تعداد میں پرجا منڈل (Praja Mandal) نام کی عوامی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ جے پور، کشمیر، راجکوٹ، پٹیالہ، حیدرآباد، میسور، ٹراونکور اور اڑیسہ ریاستوں میں بڑے پیمانے پر جدوجہد شروع ہوئی۔ (ان کاوشوں میں قیادت کرنے والے شیخ عبداللہ، یو۔ این۔ ڈھیبر، جمنالعل بجاج، جے نرائن ویاس وغیرہ نے بعد کی ملکی سیاست میں اہم رول ادا کیا)۔

ان نئے واقعات سے کانگریس کی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ وہ کانگریس جو 1938 کی ہری پورا اجلاس میں یہ کہہ رہی تھی کہ ریاست کی عوام کانگریس کے نام سے ریاست کے اندر کوئی تحریک نہیں چلا سکتی ہے، وہی کچھ ہی مہینوں بعد ریاستوں کے بارے میں اپنی پالیسی بدلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس نے دیکھ لیا تھا کہ ریاستوں کی عوام جدوجہد

کرنے کے لیے اتاولی ہے اور یہ کہ وہ سیاسی اعتبار سے بیدار ہو چکی ہے۔ کانگریس سوشلسٹ اور بائیں بازو کا خیمہ تو بہت پہلے سے ہی اس کے لیے کانگریس کی قیادت پر دباؤ ڈال رہا تھا۔

24/ جنوری 1939 کو ٹائمس آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے گاندھی جی نے ریاستوں کی عوام کے بارے میں کانگریس کی بدلی ہوئی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''میری رائے میں ریاستوں میں مداخلت نہ کرنے کی کانگریس کی پالیسی صحیح تھی کیونکہ اس وقت تک عوام میں سیاسی بیداری نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اب چونکہ عوام اس سلسلہ میں کافی بیدار ہو چکی ہے اور اپنے جائز حقوق کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنے اور مصیبت جھیلنے کے لیے پوری طرح تیار ہے تب تو پرانی پالیسی پر چلنا بزدلی کا ہم معنی ہوگا۔ اب تو (برٹش ہندوستان اور ریاستوں کے درمیان کی) ساری قانونی، آئینی اور مصنوعی حد بندیاں ٹوٹ گئی ہیں''۔[2]

اس پر عمل پیرا ہو کر مارچ 1939 میں کانگریس نے اپنے ترپوری (Tripuri) اجلاس میں نئی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ''صوبوں کی عوام میں نئی بیداری کا آنا سکون کا باعث ہے اور اس سے کانگریس کو اپنے اوپر تھوپی ہوئی پابندی کو ہٹانا مناسب ہے اس طرح اس کا تعلق صوبوں کی عوام میں مستقل استوار ہو رہا ہے''۔[3] اس کے ساتھ ہی اے۔ آئی۔ ایس۔ پی۔ سی (AISPC) نے 1939 میں جواہر لعل نہرو کو لدھیانہ اجلاس میں اپنا صدر منتخب کیا۔ اس طرح برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں میں چھڑی تحریکیں اب کھلے طور سے ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔

دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے سے سیاسی ماحول میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ کانگریسی سرکاروں نے استعفے دے دیا۔ انگریزی حکومت نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ (Defence of India Act) پاس کیا، جس کی وجہ سے ریاستوں میں سیاسی سرگرمیاں تھم سی گئیں لیکن 1942 میں سیاسی ماحول پھر گرم ہوا۔ بھارت چھوڑو تحریک شروع ہو گئی۔ اس بار کانگریس نے برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا۔ ریاستوں نے بھی جنگ آزادی کو لبیک کہا۔ وہاں کی عوام نے ذمّے دار سرکار بنانے کے مطالبہ کے ساتھ انگریزوں سے بھارت چھوڑنے کا بھی مطالبہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے ریاستوں کو بھی ہندوستان کا غیر منقسم حصہ تسلیم کرنے کی مانگ کی۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے ساتھ اقتدار منتقلی کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس وقت ریاستوں کا مسئلہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ انگریزوں نے ان ریاستوں کو خودمختاری کا درجہ دے کر بڑی پیچیدگی پیدا کر دی تھی۔ مگر قومی قیادت خاص طور سے سردار پٹیل نے بڑی ہوشمندی سے مسئلہ کو سلجھالیا۔ زیادہ تر ریاستوں نے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر، فوجی قوت اور عوامی تحریک سے خوفزدہ ہو کر اور یہ سوچ کر کہ خودمختار بنا رہنا عملاً ممکن نہیں ہے اپنے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی ریاستوں کو ہندستانی یونین میں شامل کر لینے کے لیے کاغذات (Instrument of Accession) پر دستخط کر دیے۔ مگر کچھ ریاستیں جیسے ٹراونکور، جوناگڑھ، کشمیر اور حیدرآباد آخر دم تک خودمختار بنے رہنے کے لیے کوشش کرتی رہیں۔ آخر میں صرف حیدرآباد ہی بچا اور اس نے آزاد رہنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔

ہندستانی ریاستوں میں سیاسی سرگرمی کی کیا شکل تھی اس کے لیے راج کوٹ اور حیدرآباد کا جائزہ تھوڑا قریب سے لینا بہت فائدہ مند ہوگا۔ حیدرآباد سب سے بڑی اور راج کوٹ سب سے چھوٹی ریاست تھی۔ راج کوٹ ریاست گاندھی جی کے بیچ میں پڑنے سے مشہور ہوئی اور حیدرآباد نے 1947 میں ہندستانی جمہوریہ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا مگر بعد میں فوج کشی کے ذریعہ اس کو یونین میں ملا لیا گیا۔

راج کوٹ چھوٹی سی ریاست تھی جس کی آبادی بمشکل پچھتر ہزار 75000 نفوس پر مشتمل تھی۔ اس کا جائے وقوع جزیرہ نمائے کاٹھیاواڑ تھا۔ آبادی اور وسعت سے قطع نظر برٹش انڈیا میں اس کا بہت اہم مقام تھا۔ راج کوٹ شہر انگریزی سیاست کا خاص مرکز تھا جہاں سے انگریزی سرکار دوسرے صوبوں پر نظر رکھتی تھی۔

راج کوٹ ریاست کی یہ خوش نصیبی تھی کہ 1930 تک پورے تیس سال لکھاجی راج نے اس پر حکومت کی تھی۔ انھوں نے ریاست کی صنعتی، تعلیمی اور سیاسی ترقی کے لیے قابل قدر توجہ دی تھی۔ انھوں نے 1923 میں راج کوٹ پرتی ندھی سبھا (Rajkot Pratinidhi Sabha) کا افتتاح کیا تھا۔ عوام کو اس سے حکومت کے کاموں میں شرکت داری کے لیے بڑا حوصلہ ملا تھا۔ اس سبھا کے نوے (90) نمائندے بالغ رائے دہندی کے ذریعہ چنے جاتے تھے۔

اس وقت کے ماحول میں اس طرح کے کام معمولی نہیں تھے۔ باوجود اس کے کہ راجہ صاحب جن کو ٹھاکر جی کہا جاتا تھا کو پرتی ندھی سبھا کے کسی بھی بھاؤ کو مسترد کرنے کا پورا اختیار تھا پھر بھی لکھاجی راج کا دور حکومت بے انتہا قابل تعریف ہے۔ ان کی سرپرستی میں اسمبلی میں عوام کا اشتراک جائز اور مناسب قرار دیا گیا تھا۔

لکھاجی راج نے اپنی ریاست میں سیاسی سرگرمی کے لیے بھی اجازت دے رکھی تھی۔ ان کی ہی مرضی سے من سکھ لال مہتا اور امرت لال سیٹھ نے 1921 میں ''کاٹھیاواڑ سیاسی کانفرنس، کا انعقاد راج کوٹ میں بٹھل بھائی پٹیل کی زیر صدارت کیا تھا۔ انھوں نے خود راج کوٹ کے اجلاس اور 1925 میں بھاؤنگر (Bhavanagar) کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ راج کوٹ نیشنل اسکول چلانے کے لیے انھوں نے راج کوٹ میں ایک قطعہ آراضی بھی عنایت کی تھی۔ یہی اسکول بعد میں سیاسی سرگرمی کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ گاندھی جی اور ان کے عظیم کارناموں پر فخر کرتے تھے۔ انھوں نے ''راج کوٹ کے سپوت، کو دربار میں اکثر مدعو کیا تھا اور اپنے ساتھ دربار میں تخت پر بٹھایا تھا۔ راج کوٹ آنے پر جواہر لعل نہرو کا ان کے ذریعہ خیر مقدم ہوا تھا۔

1930 میں لکھاجی راج کی موت ہوگئی۔ ان کی جگہ ان کا بیٹا دھرمیندر سنگھ جی تخت نشین ہوا۔ نیا ٹھاکر اپنے باپ کے بالکل برعکس تھا۔ عیش کرنا اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ ریاست کا سارا کام کاج دیوان ویروالا کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ اس نے ٹھاکر جی کو ریاست کی دولت اڑانے سے روکنے کے لیے کوئی بھی جتن نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی مالی حالت ایسی نازک ہوگئی کہ دیا سلائی، شکر، چاول اور سنیما لائسنس کی اجارہ داری پرائیویٹ تاجروں کو دی جانے لگی۔ ایسے کاموں سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں اور ٹھاکر جی کی عیش پرست زندگی کی وجہ سے لوگوں کی بے اطمینانی میں اضافہ ہوا۔ عوام کی اسمبلی میں شرکت ہو، اس کے لیے اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پرتی ندھی سبھا معطل ہوگئی اور ٹیکسوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا۔

پچھلے کئی سالوں سے راج کوٹ اور کاٹھیاواڑ میں سیاسی سرگرمی کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی۔ کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آگئی تھیں۔ پہلی جماعت کے سربراہ من سکھ لال مہتا اور

امرت لال سیٹھ تھے۔ بعد میں بلونت رائے مہتا اس میں شامل ہو گئے۔ دوسری جماعت کے پھول چند شاہ، تیسری کے ورج لال شکلا اور چوتھی جماعت کے سربراہ گاندھی وادی کارکن تھے۔ 1936 کے بعد یہی گاندھی وادی جماعت یو۔ این۔ ڈھیبر کی قیادت میں سب سے نمایاں جماعت بن کر ابھری۔

پہلی جدوجہد جیٹھ لال جوشی جو گاندھیائی کارکن تھے کی قیادت میں شروع ہوئی۔ انھوں نے ریاست کے آٹھ سو سوتی مل مزدوروں کو منظم کر کے مزدور یونین بنائی اور 1936 میں ان کی قیادت میں مزدوروں کے مطالبات تسلیم کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اس کامیابی سے تقویت پاکر ڈھیبر نے مارچ 1937 میں کاٹھیاواڑ راجکیہ پریشد (Kathiyawar Rajkiya Parishad) کی پہلی کانفرنس بلائی۔ اس میں پندرہ ہزار لوگوں نے شرکت کی اور مطالبہ کیا کہ ریاست میں ذمّے دار سرکار بنائی جائے، ٹیکسوں میں تخفیف ہو اور اسٹیٹ اخراجات میں کمی کی جائے۔

راجکیہ پریشد کے مطالبات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس لیے 15 ر اگست 1938 کو پریشد کے کارکنوں نے گوکل اشٹمی میلہ میں تفریحی ایجنسی کے خلاف احتجاج کا نظم کیا۔ اس ایجنسی کی اجارہ داری کاریوال نام کے بدنام فرم کو دی گئی تھی۔ احتجاج کرنے والوں کو منصوبہ بند طریقے سے پہلے ایجنسی کی پولیس سے، بعد میں ریاستی پولیس سے بری طرح پٹوایا گیا۔ اس کی مخالفت میں راج کوٹ شہر میں مکمل ہڑتال کی گئی اور سردار پٹیل کی صدارت میں پریشد کی ایک میٹنگ 5 ر ستمبر کو منعقد ہوئی۔ دیوان ویروالا سے مل کر سردار پٹیل نے پریشد کی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ ریاست میں ذمّے دار سرکار بنانے کے لیے تجاویز بنائی جائیں، پرتی ندھی کا نیا الیکشن کرایا جائے، زمین کے لگان میں 15 فیصد تخفیف ہو، اجارہ داری ختم ہو، اور ریاست کے خزانہ کا ٹھاکر جی کے ذریعے کیے جا رہے من مانی صرفہ پر بندش لگائی جائے۔ دربار نے ان مطالبوں کو تسلیم کرنے کے بجائے انگلش صلاح کار (Resident) کو حالات پر قابو پانے کے لیے دیوان کی حیثیت سے ایک برٹش افسر کو تقرر کرنے کے لیے کہا۔ اس کے نتیجہ میں کیڈل (Cadell) نے 12 ستمبر کو دیوان کا چارج لے لیا اور ویروالا ٹھاکر جی کے نجی صلاح کار بن گئے جس سے وہ

پردے کے پیچھے اپنا کام کرتے رہیں۔ اور ستیہ گرہ جس نے اب تک بڑی وسعت حاصل کرلی تھی نے لگان نہ ادا کرنے، حقوق اجارہ داری کی مخالفت کرنے، ریاست کے ذریعہ بنائے گئے سامان کا بائیکاٹ کرنے جس میں بجلی اور کپڑا شامل تھا وغیرہ باتیں اپنے پروگرام میں شامل کرلیا۔ بینک کے کھاتے دار بینک سے روپے نکالنے پر ٹوٹ پڑے، سوتی ملوں میں مزدوروں اور اسکولوں میں طلبا نے ہڑتال کردی۔ ریاست کی آمدنی کے سارے ذرائع جس میں اکسائز اور کسٹم ڈیوٹی شامل تھی، روک دیے گئے۔

سردار پٹیل روزانہ شام کو ٹیلیفون کے ذریعہ راج کوٹ کے حالات سے برابر آگاہ ہوتے رہتے تھے۔ کاٹھیاواڑ کے دوسرے حصوں، برٹش گجرات اور بمبئی سے رضا کار راج کوٹ پہنچنے لگے۔ تحریک نے بے مثل نظم کا ثبوت دیا۔ ایک ستیہ گرہی کے گرفتار ہونے پر فوراً دوسرا ستیہ گرہی خفیہ خفیہ آکر اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ ستیہ گرہیوں کے نام اور ان کے کوڈ اخباروں میں شائع ہوجاتے تھے کہ ان کو کب اور کہاں پہنچنا ہے۔

نومبر کے آخر تک راج کوٹ میں کانگریس کی ہورہی کامیابی سے انگریز پوری طرح گھبرا گئے اور ان کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ وائسرائے لنلتھ گو (Linlith gow) نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ایک تار بھیجا کہ ''مجھے اس بات میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہے کہ اگر کانگریس راج کوٹ معاملہ میں کامیاب ہوگئی تو یہی تحریک پورے کاٹھیاواڑ میں پھیل جائے گی اور پھر وہ اپنی سرگرمی دوسرے علاقوں میں کرنے لگے گی'' [4]

سیاسی شعبہ کی صلاح کے برعکس دربا نے سردار پٹیل سے مصالحت کرنے کے لیے پہل کیا۔ 26/دسمبر 1938 کو دونوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوا کہ ٹھاکر جی کے نجی خرچے کو محدود کیا جائے اور ریاست کی جنتا کے دس عہدے داروں کی تقرری کی جائے جو ایک اصلاحی منصوبہ تیار کریں جس کے تحت عوام کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں۔ ٹھاکر جی نے سردار پٹیل کو اعتماد میں لے کر ایک غیر رسمی خط تحریر کیا جس میں اس نے لکھا کہ دس لوگوں میں سے سات افراد ولبھ بھائی پٹیل کی سفارش پر میرے ذریعہ نامزد کیے جائیں گے'' [5] سبھی قیدی رہا کردیے گئے اور ستیہ گرہ واپس لے لی گئی۔

ٹھاکر جی کی یہ جرأت انگریزی سرکار مشکل سے برداشت کر سکتی تھی۔ سرکاری صلاح کار (Resident) سیاسی شعبہ، وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے درمیان فوراً صلاح ومشورہ شروع ہوگیا۔ ٹھاکر جی کو ہدایت دی گئی کہ وہ سردار پٹیل کے ذریعہ تیار کی گئی ممبروں کی لسٹ کو خارج کر دیں۔ اس طرح سردار پٹیل والی لسٹ یہ کہہ کر خارج کر دی گئی کہ اس میں صرف برہمنوں اور بنیوں کو نمائندگی دی گئی ہے۔ راجپوتوں اور مسلمانوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

ریاست کے ذریعہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے 26 /جنوری 1939 کو ستیہ گرہ پھر شروع کردی گئی۔ ریاست کے دیوان ویروالا نے ستیہ گرہ کو کچلنے کے لیے بڑی سختی دکھائی۔ پہلے کی طرح اس بار بھی لوگ مشتعل ہوا ٹھے۔ راج کوٹ کے باہر وطن پرستوں میں بڑا غم وغصہ تھا۔ گاندھی جی کی شریک حیات کستور با جو راج کوٹ میں پیدا ہوئیں اور وہیں پرورش پائیں ان کو ریاست کے پرآشوب حالات نے اس قدر متاثر کیا کہ وہ اپنی خرابی صحت کے باوجود اور لوگوں کے اصرار کے خلاف منی بین (Mani Ben) جو سردار پٹیل کی بیٹی تھیں ان کے ہمراہ راج کوٹ پہنچ گئیں۔ ان دونوں کو گرفتار کر کے راج کوٹ سے سولہ میل دور ایک گاؤں میں روک کے رکھا گیا۔

لیکن راج کوٹ کی قسمت میں اور بھی سخت واقعات ہونے لکھے تھے۔ مہاتما گاندھی نے بھی راج کوٹ جانے کا ارادہ کرلیا۔ انھوں نے اچھی طرح یہ بات واضح کردی تھی کہ ٹھاکر جی کے ذریعہ معاہدہ توڑنا بہت سنگین معاملہ ہے۔ اس لیے ہر ایک ستیہ گرہی کو احتجاج کے لیے ڈٹ جانا چاہیے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ چونکہ ان کے خاندان کے قریبی تعلقات راج کوٹ اور ٹھاکر جی سے ہیں، اسی لیے انھوں نے راج کوٹ کے معاملات میں مداخلت کرنے کے لیے ذاتی دلچسپی لی ہے۔ ان کی منشا کے مطابق بات چیت کے ذریعہ معاملات کا حل تلاش کرنے کے لیے عام ستیہ گرہ روک دی گئی۔ سرکاری صلاح کار، ٹھاکر جی اور دیوان سے کئی بار بات چیت ہوئی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس لیے گاندھی جی نے الٹی میٹم دیا کہ اگر سرکار سردار پٹیل کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کو تسلیم نہیں کرتی ہے تو وہ مرن برت کریں گے۔ ٹھاکر جی یا یہ کہیں کہ ویروالا جو اصل آدمی تھا اپنی بات پر اڑا رہا۔ اب گاندھی جی کے پاس مرن برت کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں رہ گیا۔

گاندھی جی کا مرن برت پورے ملک کے لیے ستیہ گرہ کرنے کی ہری جھنڈی تھی۔ گاندھی جی کی صحت خراب تھی اور لمبا برت ان کی تندرستی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ پورے ملک میں ہڑتالیں ہوئیں۔ اسمبلی کی کارروائیاں ملتوی کردی گئیں۔ آخر میں کانگریس سرکاروں نے استعفے دے دینے کی دھمکی دی۔ وائسرائے کو تار دیے جاتے رہے کہ وہ مداخلت کریں۔ گاندھی جی نے بذات خود انگریزی حکومت سے درخواست کی کہ وہ عوام کے تئیں اپنی ذمّے داری کا احساس کر کے ٹھاکر جی کو معاہدہ کی شرطوں کو ماننے کے لیے کہے۔ 7/مارچ کو وائسرائے نے ہندوستان کے چیف جسٹس مسٹر مورس گیر (Mr. Maurice Gwyer) کو اس بات کی تفتیش کرنے کے لیے تعینات کیا کہ ٹھاکر جی نے معاہدہ توڑا ہے کہ نہیں۔ وائسرائے کی یہ مناسب کارروائی تھی، اس لیے گاندھی جی نے برت توڑ دیا۔

3/اپریل 1939 کو چیف جسٹس کے فیصلے نے سردار پٹیل کی پوزیشن صاف کردی۔ اس میں کہا گیا کہ دربار نے سردار پٹیل کے سات آدمیوں کو نمائندہ ماننا تسلیم کیا تھا۔ بہرحال دربار نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے بجائے ویروالا اپنے طور سے کام کرتا رہا۔ اس نے راجپوتوں، مسلمانوں اور ہریجنوں کی نمائندگی تو تسلیم کیا مگر کثرت رائے بنائے رکھنے کے لیے سردار پٹیل اور پریشد کے نمائندوں کے بارے میں گاندھی جی کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔

جلد ہی راج کوٹ کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا کے دوران راجپوتوں اور مسلمانوں نے مظاہرے کیے۔ محمد علی جناح اور امبیڈکر نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں اور ہریجنوں کو الگ سے نمائندگی دی جائے۔ دربار نے ان سب کی بات یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ پہلے والے معاہدہ میں اس طرح کی باتیں کسی بھی شکل میں نہیں تھیں۔ انگریزی حکومت بھی اس معاملہ میں مداخلت کرنے سے باز رہی کیونکہ اس سے اس کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا بلکہ کانگریس کی کامیابی سے اس کا نقصان ہی متوقع تھا۔ اس کے علاوہ ریاست میں ذمّے دار سرکار بنوانے کے فریضہ سے وہ بری تھی۔

راج کوٹ کے ایسے حالات میں مخالفین کے ''دل نہ بدل پانے'' کے اسباب کا تجزیہ

کرتے ہوئے گاندھی جی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ٹھاکر جی کو معاہدہ کے لیے راضی کرنے کے لیے انگریزی طاقت کا استعمال کیا تھا۔ اس میں ان کو ہنسا کی بولتی تھی۔ اہنسا کی بات تو تب ہوتی جب وہ سیدھے ٹھاکر جی اور ویروالا کے واسطے برت رکھتے دل بدلنے کے لیے اپنی ہی مظلومیت کی طاقت پر بھروسہ کرتے۔ اس لیے انھوں نے ٹھاکر جی کو معاہدہ سے الگ کر دیا اور وائسرائے اور چیف جسٹس سے ان کا قیمتی وقت برباد کرانے کے لیے معافی مانگی۔ وہ اپنے مخالفین راجپوتوں اور مسلمانوں سے بھی معافی کے طلبگار ہوئے اور راج کوٹ کو برٹش ہندوستان کی طرف جانے کے لیے چھوڑ دیا۔[6]

راج کوٹ ستیہ گرہ نے ریاستوں کی متضاد (Paradoxical) حالت جو اس وقت تھی کو اچھی طرح ظاہر کیا تھا اور اس نے احتجاجی سرگرمی کو بے حد پیچیدہ بنا دیا تھا۔ سدھار کی کسی بھی تحریک کے خلاف انگریزی سرکار نے ریاستوں کے سربراہوں کی پشت پناہی کی تھی۔ جب بھی برٹش حکومت پر عوام کے ذریعہ زور ڈالا گیا کہ وہ ان سے سدھار کے کام کرنے کے لیے دباؤ ڈالے تو اس کی مخالفت یہ کہہ کر کی گئی کہ اس کے ذریعہ ایسی کارروائی کرنے سے ریاستوں کی قانونی خودمختاری پر آنچ آئے گی۔ مگر جب دیسی ریاستیں وہ ڈھرا اختیار کرتی تھیں جو انگریز آقا کو ناپسند ہوتا تھا تب ان کی قانونی آزادی کی بات پس پشت ڈال دی جاتی تھی۔ انگریز حکومت کی شہ پر ہی ٹھاکر جی نے سردار پٹیل سے کیے ہوئے معاہدے کو مسترد کر دیا تھا۔ انگریزی حکومت لوگوں کے کسی بھی دباؤ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتی تھی کہ اس کے اور ریاستوں کے درمیان اختیارات اور ذمّے داریوں کے سلسلہ میں قانونی بٹوارہ ہے، مگر اس بہانہ پر برٹش ہندوستان میں مطلق عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طرح ریاستوں میں تحریک کی شکل برٹش ہندوستان میں ہو رہی تحریک سے الگ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے سالہا سال اس بات کی وکالت کی تھی کہ دیسی ریاستوں اور برٹش ہندوستان میں چل رہی تحریکوں کو گڈمڈ نہ کیا جائے اور کانگریس کی یہ ہچکچاہٹ بجا تھی۔ اس کو ڈر تھا کہ دونوں تحریکوں کو گڈمڈ کرنے کی صورت میں بڑی دشواریاں پیدا ہوں گی۔ اور اس خدشہ کو راج کوٹ کے حالات نے اچھی طرح ثابت کر دیا تھا۔

راج کوٹ ستیہ گرہ یوں تو پوری طرح ناکام رہا مگر اس نے دیسی ریاستوں کی عوام کو

خصوصاً مغربی ہندوستان میں لوگوں کو سیاسی اعتبار سے بے حد بیدار کیا۔ اس نے دیسی حکمرانوں کو یہ بھی باور کرایا کہ وہ صرف برٹش آقا کے رحم وکرم پر زندہ ہیں۔ راج کوٹ میں اور راج کوٹ کی طرح دوسری ریاستوں میں جو جدوجہد ہوئی وہ آزادی ملتے وقت ملک کے مختلف حصوں کو متحد (Integrate) کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی۔ بہت سے دیسی حکمرانوں پر جب 1947 میں یونین (Union) میں شامل ہونے کے لیے دباؤ ڈالا گیا تب وہ مخالفت کی جرأت نہ کر سکے کیونکہ انھوں نے عوام کے مجاہدانہ دم خم کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ اگر ایسی کوششیں نہ ہوئی ہوتیں تو ملک کی سالمیت حاصل کرنے کا مرحلہ بہت طویل اور کٹھن ہوتا۔ یہ بات شبہ سے بالاتر ہے کہ وہ شخص جس نے دیسی راجاؤں کے خلاف جنگیں لڑی تھیں اور جس نے ملک کو 1947-48 میں سالمیت بخشی تھی وہ سردار پٹیل تھے۔

لیکن ملک میں ایک ریاست ایسی بھی تھی جس نے دیوار پر خالص حیدرآبار لکھا جانا پسند نہیں کیا تھا۔ وسعت اور آبادی کے لحاظ سے نظام حیدرآباد سب سے بڑی ریاست تھی۔ لسانی اعتبار سے اس کے تین علاقے تھے.......... 80 فیصد مراٹھی، 22 فیصد کنڑ اور 50 فیصد تیلگو بولنے والے خطے تھے۔ 1911 میں عثمان علی خان اس ریاست کے نظام بنے اور 1948 تک بلاشرکت غیر حکومت پر قابض رہے۔ نظام کی خود کی ریاست ''صرف خاص'' (Sarf Khas) جو پوری مملکت کا دسواں حصہ تھی اس سے ملنے والی ساری مال گزاری نظام کے شاہی خرچ میں استعمال ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ریاست کا 30 فیصد حصہ زمینداروں کے قبضہ میں تھا۔ دیہی علاقوں سے حسب خواہش کافی اونچی شرح پر لگان وصول کیا جاتا تھا۔ دوسری اور غیر قانونی وصولیابی بھی کی جاتی تھی اور بیگار بھی کرایا جاتا تھا۔

ریاست کی کثرت آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ وہ ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے جبر واستبداد کا شکار تھے۔ اردو دربار کی زبان تھی اور اس کی ترقی کے لیے پوری کوشش ہوتی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام اسی کام کے لیے ہوا تھا۔ ریاست کی دوسری زبانیں جیسے مراٹھی، تیلگو اور کنڑ بے توجہی کا شکار تھیں۔ ان زبانوں کی ترقی کے لیے کی جارہی ذاتی کوششوں میں رخنہ ڈالا جاتا تھا۔ حکومت کے انتظامی امور کے خاص خاص عہدوں پر مسلمان خصوصاً اونچے طبقے کے مسلمان فائز

تھے۔آریہ سماج تحریک جس کا کافی ابھار 1920 کی دہائی میں ہوا تھا کو بری طرح کچل دیا گیا تھا۔ ہون کنڈ بنانے کے لیے آریہ سماجیوں کو حکومت سے اجازت لینی پڑتی تھی۔نظام نے حیدرآباد کو مسلم ریاست بنانے کی پوری کوشش کی تھی اور 1927 میں اتحادالمسلمین نام کی تنظیم بننے کے بعد تو اس کوشش میں مزید اضافہ ہوا تھا۔نظام خود کو دکن میں مسلم اقتدار کی علامت مانتے تھے۔

اس طرح ریاست کے لوگوں پر اقتصادی، تمدنی اور مذہبی اعتبار سے ہورہی زیادتی کے تناظر میں وہاں کی سیاسی اور تحریکی سرگرمی کو سمجھا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح ہی 22-1920 میں عدم تعاون اور خلافت تحریکوں کی وجہ سے یہاں سیاسی سرگرمی شروع ہوئی۔حیدرآباد ریاست کے مختلف حصوں سے برابر یہ خبریں آرہی تھیں کہ کتائی چرخہ لوگوں میں بہت مقبول ہورہا ہے اور قومی اسکول تیزی سے قائم ہورہے ہیں، شراب نوشی اور چھوا چھوت کے خلاف جنگ چھڑی ہے اور گاندھی اور علی برادران کی تصویروں والے بلّے خوب بک رہے ہیں۔بہر حال خلافت تحریک کے علاوہ عوامی جلسے نہ کے برابر تھے۔خلافت کے جلسے تو صرف اس لیے ہوتے تھے کہ نظام کو کھلے عام ان کے خلاف قدم اٹھانے میں بڑی ہچکچاہٹ تھی۔اس دور میں ہندو مسلم اتحاد کا تاثر زوروں پر دیا جارہا تھا۔

بعد کے سالوں میں لوگ سیاسی نقطہ نظر سے کافی بیدار ہوئے۔ریاست کے باہر کئی جگہوں پر حیدرآباد سیاسی کانفرنسیں (Hydrabad Political Conferences) منعقد ہوئیں۔ان کانفرنسوں میں بحث کا خاص عنوان یہی ہوتا تھا کہ ریاست میں ذمہ دار سرکار بنائی جائے اور لوگوں کو شہری حقوق دیے جائیں جن کا یہاں فقدان تھا۔بیگار سسٹم، من پسند لگان وصولی اور مذہب وتمدن پر ہورہی زیادتی کی بری طرح مذمت کی جاتی تھی۔

اس کے ساتھ عوام میں علاقائی احساسات بھی پیدا ہونے لگے۔اس سلسلہ میں تلنگانا میں پیش قدمی ہوئی۔آندھرا جن سنگھم نے اس کو اور تیز کیا۔بعد میں یہ تنظیم آندھرا مہاسبھا میں تبدیل ہوگئی۔شروع میں اس کا مقصد تیلگو زبان اور لٹریچر کی اشاعت کرنا، اس کے لیے اسکول اور کتب خانوں کا قیام کرنا اور ریسرچ سوسائٹی کو ترقی دینا تھا۔ریاست کو اس طرح کے اقدامات قطعی پسند نہیں تھے۔اس لیے اس کے ذریعہ قائم کیے گئے سارے اسکول، کتب خانے اور اخبار

حکومت نے بند کرا دیے۔ 1940 تک آندھرا مہا سبھا سرگرم سیاست سے دور رہی۔ اس کو سختی سے اس میں حصہ لینے سے منع کیا گیا۔

1930-32 کے سول نافرمانی تحریک نے ریاست کی عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے کام کو آگے بڑھایا۔ ریاست میں رہنے والے کئی لوگوں نے برٹش انڈیا میں آ کر اس تحریک میں حصہ لیا۔ حیدرآباد کے کئی وطن پرست خصوصاً نوجوان برٹش انڈیا کے وطن پرستوں کے ساتھ جیل گئے۔ وہ اس طرح قومی تحریک کی خاص دھارا سے منسلک ہو گئے۔ 1937 میں اس ریاست کے دوسرے علاقوں نے اپنی اپنی تنظیمیں بنالیں.........مہاراشٹر پریشد اور کنٹر پریشد۔ 1938 میں تینوں علاقوں کے سرگرم سیاسی کارکن اکٹھا ہوئے اور ان سب نے مل کر حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس نام کی تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ نہیں تھی گو کہ نام میں مماثلت تھی اور اس کے کئی ایک لیڈروں کے کانگریس سے گہرے تعلقات تھے، لیکن اس سے پہلے کہ اس کی باقاعدہ تشکیل ہوتی، نظام حکومت نے اس پر پابندی لگا دی۔ الزام یہ لگایا گیا کہ چونکہ اس میں مسلم نمائندگی بہت کم ہے اس لیے یہ فرقہ وارانہ ہندو تنظیم ہے۔ جب بات چیت اور اپیل کا حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑا، تو ستیہ گرہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس ستیہ گرہ کے لیڈر مراٹھی نیشنلسٹ سوامی رامانند تیرتھ تھے۔ عدم تعاون تحریک کے دوران انھوں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور بمبئی میں نیشنل اسکول اور کالج قائم کیا تھا۔ بمبئی اور شولا پور میں مزدور لیڈر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد وہ حیدرآباد کے مومن آباد آ گئے تھے۔ یہاں وہ ایک نیشنل اسکول چلاتے تھے۔ طرز معاشرت میں گاندھی وادی اور سوچ میں نہرو وادی تھے۔ انھوں نے 1930 میں تحریک کی قیادت کی جبکہ پرانے اور معروف لیڈران حکومت کے خلاف ایسا سیاسی مجاہدہ کرنے میں ہچکچاتے تھے۔

اکتوبر 1938 میں ستیہ گرہ شروع ہوئی اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ کسی لیڈر کی امارت میں پانچ لوگوں کا ایک جتھا ستیہ گرہ کرتا اور خود کو حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کا ممبر بتاتا۔ اس جتھا میں ہر ایک علاقہ کی نمائندگی ہوتی تھی۔ ہفتہ میں تین بار ستیہ گرہ کا نظم کیا جاتا تھا۔ یہ پروگرام دو ماہ تک چلتا رہا۔ سارے ستیہ گرہیوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ ان کی حمایت میں کافی مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔

حیدرآباد شہر، مارواڑہ کا اورنگ آباد شہر ستیہ گرہ کے دو مراکز تھے۔

گاندھی جی اس ستیہ گرہ میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اس کی کارگزاریوں کے متعلق پوری معلومات رکھتے تھے۔ انھوں نے وزیر اعظم اکبر حیدری کو متعدد خطوط لکھے کہ حکومت اپنے رویہ میں تبدیلی لائے اور ستیہ گرہیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ بہر حال دو ماہ بعد دسمبر 1938 میں گاندھی جی کے کہنے پر ستیہ گرہ واپس لے لی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی جن دنوں میں ستیہ گرہ شروع ہوئی تھی، انھیں دنوں آریہ سماج اور ہندو سول لبرٹی یونین نے بھی ستیہ گرہ شروع کیا تھا۔ آریہ سماج کی ستیہ گرہ مذہبی زیادتیوں کے خلاف تھی اور اس کے مقاصد مذہب پر مبنی تھے۔ اس لیے ملک کے مختلف علاقوں سے لوگ اس میں شامل ہو رہے تھے۔ اس پر فرقہ وارانہ رنگ بھی چڑھ رہا تھا۔ حیدرآباد اور اسٹیٹ کانگریس کے لیڈروں اور گاندھی جی نے یہ محسوس کیا کہ عام لوگ یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ اسٹیٹ کانگریس کی تحریک غیر فرقہ وارانہ مطالبوں کو لے کر ہو رہی ہے مگر وہ آریہ سماج اور اس کی ستیہ گرہ میں فرق نہیں کر رہے ہیں اور حکومت بھی یہی پرچار کر رہی ہے کہ اسٹیٹ کانگریس ہندوؤں کی تنظیم ہے۔ ایسے ماحول میں اسٹیٹ کانگریس کی قیادت نے ضروری سمجھا ستیہ گرہ واپس لے لی جائے۔

انھی دنوں بندے ماترم تحریک بھی سامنے آئی۔ حیدرآباد شہر کے مختلف کالج ہاسٹلوں کی دعا میں بندے ماترم گانے کی ممانعت تھی۔ طلبا نے اس کے خلاف ہڑتال کر دی اور تھوڑے دنوں میں یہ ریاست کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ حیدرآباد کے کالجوں سے جن طلبا کو نکالا گیا انھوں نے ایم۔ پی۔ کے ناگپور یونیورسٹی میں پناہ لی۔ چونکہ وہاں کے وائس چانسلر ان پر بہت مہربان تھے اس لیے وہ وہاں اطمینان سے پڑھنے لگے۔ اس وقت ایم۔ پی۔ میں کانگریس سرکار تھی۔ یہ تحریک اس معنی میں بے حد اہم ہے کہ اس نے ایسے جنگجو نوجوان تیار کیے تھے جنھوں نے بعد کے سالوں کی سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہو کر تحریک کو قائد فراہم کیے۔

اسٹیٹ کانگریس پر فی الحال پابندی جاری رہی۔ مقامی کلچرل تنظیمیں ہی سیاسی سرگرمیوں کے مرکز بنے رہے۔ آندھرا مہا سبھا اس معاملہ میں کافی فعال تھی اور حال فی الحال میں سیاست میں شامل نوجوان اس سے جڑ گئے۔

1940 میں سیاسی معاملات نے نیا موڑ لیا۔ آندھیرا مہا سبھا کے مشہور و معروف انقلابی لیڈر روی نرائن ریڈی اور بی۔ یلا۔ ریڈی(B. Yella Reddy) کا جھکاؤ کمیونسٹ پارٹی کی طرف ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ بائیں بازو اور کمیونزم کے زیر اثر آ گیا۔ اس طبقہ کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی جس کی وجہ سے آندھرا مہا سبھا کے کردار میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ یہ تنظیم اب کسانوں کے کاز کے لیے کام کرنے میں مصروف ہو گئی۔

دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے کے وجہ سے حکومت کو کسی طرح کا سیاسی اور آئینی سدھار نہ کرنے کا بہانہ مل گیا۔ سوامی رامانند تیرتھ اور چھ دوسرے لوگوں نے جن کو گاندھی جی نے نجی طور سے منتخب کیا تھا، اسٹیٹ کانگریس پر لگی پابندی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ستمبر 1940 میں ان سب کو گرفتار کر کے 1941 تک جیل میں رکھا گیا۔ گاندھی جی ریاست میں علاحدہ جدو جہد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب چونکہ آل انڈیا سطح پر تحریک چھڑنے والی ہے۔ اس لیے کوئی بھی دوسری تحریک اس کا ایک حصہ ہو جائے گی۔

اگست 1942 میں ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوئی اور اس وقت یہ بات واضح کر دی گئی کہ برٹش ہندوستان اور ریاست کے لوگوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس لیے اس تحریک میں ہر ایک ہندستانی کو شریک ہونا چاہیے۔ آل انڈیا اسٹیٹ پیپلس کانفرنس (AISPC) کی اسٹینڈنگ کمیٹی کو گاندھی جی اور جواہر لعل نہرو نے خطاب کیا۔ انھوں نے کمیٹی کو ہندوستان چھوڑو تحریک کی اصل منشا سے آگاہ کیا اور کہا کہ اب صرف ایک ہی تحریک چلے گی اور ریاست میں تحریک اب ذمے دار سرکار بنانے کے واسطے نہیں بلکہ ہندوستان کی آزادی اور ریاستوں کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لیے کی جائے گی۔

حیدرآباد میں ''ہندوستان چھوڑو تحریک کو زبردست حمایت حاصل ہوئی خصوصاً نوجوان طبقہ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اگرچہ سوامی رامانند تیرتھ جیسے خاص لیڈروں کے جیل میں بند ہونے سے تحریک منظم طریقے سے نہیں چل سکی مگر کثیر تعداد میں لوگوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور جیل گئے۔ 2/اکتوبر 1942 کو عورتوں کے ایک جتھا نے حیدرآباد شہر میں ستیہ گرہ کیا۔ سروجنی نائڈو کو صبح ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ '' گاندھی جی کا چرخہ چلانا پڑے گا'' اور '' گوروں کو لندن جانا

پڑے گا" لوگوں کے عام نعرے تھے۔ یہ وہی ریاست تھی جہاں چند دنوں پہلے بڑے بڑے لیڈروں کو اپنی تقریریں لکھ کر کلکٹر کو دینی پڑتی تھیں اور اس کے ذریعہ اصلاح شدہ باتوں پر ہی وہ بول سکتے تھے، اسی ریاست میں ایسا انقلابی ماحول بن گیا تھا۔

مگر ہندوستان چھوڑو تحریک نے کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹ قوم پرستوں کے درمیان پیدا ہوئی نااتفاقی میں مزید اضافہ کیا۔ کیونکہ دسمبر 1941 میں کمیونسٹ پارٹی نے "پیپلس وار" (People's War) کا نعرہ لگایا تھا۔ کیمونسٹ ہندوستان چھوڑو تحریک کے مخالف تھے۔ وہ انگلینڈ کے حامی تھے کیونکہ وہ سوچتے تھے کہ انگلینڈ فسطائی (Fascist) طاقتوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے اور ہندوستان چھوڑو تحریک اس کی طاقت کو کمزور کرے گی۔ تلنگانہ کے نوجوان قوم پرست، جمال پرم کیشو راؤ (Jamal Puram Keshav Rao) کے ساتھ تھے مگر کثیر تعداد روی نرائن کے ساتھ کیمونسٹوں کی طرف چلی گئی۔ نظام نے کیمونسٹوں پر سے پابندی ہٹالی۔ اس لیے اب وہ بہتر حالت میں ہو گئے۔ نظام نے یہ قدم انگریزی حکومت کی منشا کو سمجھ کر اٹھایا تھا۔ کیمونسٹوں کا برٹش موافق رجحان دیکھ کر ہی ان پر سے پابند ہٹائی گئی تھی۔ اس طرح ہندوستان چھوڑو تحریک کی وجہ سے جب قوم پرستوں کی کثیر تعداد جیلوں میں بند تھی، کیمونسٹ عوام میں گھوم گھوم کر اپنی طاقت مضبوط کر رہے تھے۔ 1944 میں نفاق کی کھائی اور چوڑی ہوگئی جب آندھرا مہا سبھا کے بھون گر (Bhongir) اجلاس میں قوم پرستوں کے مددگاروں اور لبرل عناصر نے اجلاس کا بائیکاٹ کر کے ایک الگ تنظیم بنالی۔

اب آندھرا سبھا کی قیادت پر کیمونسٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1945 میں دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر پیپلس وار کے نظریہ میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس لیے اس پر لگی پابندی ہٹالی گئی۔ 1945-46 خصوصاً 1946 کے دوسرے نصف کے دوران نال گونڈہ (Nalgonda) اور کچھ حد تک وارنگل اور کھمم ضلعوں میں زبردست کسان تحریک چھیڑی گئی۔ شروع میں آندھرا سبھا کی قیادت میں کسانوں اور زمینداروں کے لٹھیت غنڈوں کے درمیان زبردست تصادم ہوئے اور یہ تصادم غیر قانونی جبریہ اناج وصولی، بیگار سسٹم اور زمینوں سے غیر قانونی بے دخلی کے خلاف ہوئے تھے۔ کسانوں کا جدوجہد جتنا زوردار تھا اتنا ہی شدید ظلم حکومت کی طرف سے ان پر کیا گیا

اور 1946 کے آخر تک حکومت تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہوگئی۔ ہزاروں کو گرفتار کیا گیا، ان پر ظلم ڈھائے گئے اور ان کے لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا پھر بھی اس تحریک نے کسانوں میں ایسی خود اعتمادی جگائی کہ وہ ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔

4/جون 1947 کو وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ 15/اگست 1947 کو انگریز ہندوستان چھوڑ دیں گے اور 12/جون کو نظام نے بھی اعلان کیا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خاتمہ پر وہ حیدرآباد کے شہنشاہ ہوں گے۔ ان کے اعلان کا مقصد یہ تھا کہ حیدرآباد ہندوستان میں شامل نہیں ہوگا۔ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کا کھلا اجلاس 16 جون سے 18 جون تک چلا۔ اس اجلاس میں حیدرآباد کو ہندوستان میں ملانے اور ریاست میں ذمہ دار حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کیا گیا۔ اس سے کچھ ہی ماہ قبل نظام نے عوام پر غیر جمہوری آئین تھوپنے کی کوشش کی تھی اور اسٹیٹ کانگریس نے اس کی جم کر مخالفت کر کے نظام کی کوشش کو ناکام کر دیا تھا۔ اس نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا اور عوام نے اس کا ساتھ پوری طرح نبھایا تھا۔ عوام کے اندر پیدا ہوئی اس خود اعتمادی نے اس کو نظام کے خلاف ڈٹ جانے کے لیے تیار کر دیا۔ قومی سطح کے نیتاؤں سے بات چیت کرنے کے بعد اسٹیٹ کانگریس نے فیصلہ کن جدوجہد کرنے کا عزم کیا۔ سوامی رامانند تیرتھ نے اپنی کتاب ''حیدرآباد کی جنگ آزادی کی سرگزشت'' میں لکھا ہے کہ ''ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انڈین یونین کی حیدآباد کے ساتھ آخری جنگ مسلح ہوگی، لیکن اس سے پہلے بڑے پیمانے پر ستیہ گرہ تحریک چلائی جائے گی''[7]

ڈی۔ جی۔ بندو (D.G. Bindu) کی صدارت میں کمیٹی آف ایکشن کا قیام ہوا۔ اس کا مقصد ریاست کے باہر رہ کر کام کرنا تھا جس سے اس کے کارکن گرفتاری سے بچ سکیں۔ سولاپور، وجے واڑہ، گاداگ (Gadag) میں آفس اور بمبئی میں مرکزی آفس قائم کیے گئے۔ مزدور فنڈ اکٹھا کیا گیا جس میں جے پرکاش نرائن نے اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ سب کرنے کے بعد 7/اگست کو باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی گئی اور اس دن کو ''جوائن یونین انڈین ڈے'' (Join Union Indian Day) کے طور پر منایا گیا۔ عوام نے اس میں زبردست شرکت کی اور عوام پر لگی پابندی کو چیلنج کرنے کے لیے گاؤں اور قصبوں میں میٹنگوں کا نظم کیا گیا۔ طلبا اور مزدوروں

نے ہڑتال کردی۔ بمبئی میں بارہ ہزار حیدرآبادی مزدوروں نے ہڑتال میں حصہ لیا۔ گرفتاری اور ان کی پٹائی عام بات تھی۔ 13 / اگست کو نظام نے قومی جھنڈا لہرانے پر پابندی لگادی۔ سوامی جی نے اپیل کی کہ "نظام کے ذریعہ لگائی گئی پابندی حیدرآباد کی عوام کے لیے ایک چیلنج ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اس کو قبول کرے گی"۔

15 اگست 1947 کو ملک کی آزادی کی صبح نمودار ہونے کے پہلے سوامی جی اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ سخت سیکورٹی کے باوجود حیدرآباد طلبا یونین دفتر سے سو طلبا نکل پڑے اور پہلے سے طے پروگرام کے مطابق سلطان بازار میں قومی جھنڈا لہرادیا۔ بعد کے دنوں میں کسی طرح کسی کا احتجاج ظاہر کرنے کے لیے قومی جھنڈا لہرانا سب سے اچھا طریقہ بن گیا۔ حیدرآباد ریاست میں داخل ہونے والی ساری ٹرینیں قومی جھنڈوں سے سجی ہوتی تھیں۔ طلبا اس کام میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ جلد ہی عورتیں بھی کثیر تعداد میں ان کے ساتھ ہوگئیں جن میں برج رانی اور یشودا بین (Yashoda Ben) بہت معروف ہیں۔ یہ تحریک جیوں جیوں زور پکڑتی گئی، حکومت حیدرآباد کی طرف سے ظلم و جبر بھی بڑھتا گیا۔ حکومت کے ذریعہ اتحادالمسلمین کے کارکنوں اور رضا کاروں کو نیم فوجی دستے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ مظاہرین کو بھگانے اور ان پر حملہ کرنے کے لیے ان دستوں کو ہتھیاروں سے لیس کیا گیا۔ جن گاؤں سے بغاوت کا خدشہ معلوم پڑتا تھا، ان میں رضا کاروں کے کیمپ لگائے جاتے تھے اور ان پر دھاوا بولا جاتا تھا۔

29 نومبر 1947 کو نظام نے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ پر دستخط تو کردیے مگر ان کے ذریعہ کیا جارہا ظلم اور تیز ہوگیا۔ رضا کار اور بھی ظالمانہ طریقے اپنانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں لوگوں نے ریاست سے باہر جاکر پڑوس کے صوبوں کے کیمپوں میں پناہ لی۔ ریاست کے لوگ بذات خود اپنے طور سے اپنی حفاظت کرنے لگے۔ رضا کاروں سے نمٹنے کے لیے اور ان کے کیمپوں پر حملہ آور ہونے کے کام میں خصوصاً نالگونڈہ، ورنگل اور کھمم کے علاقوں میں کمیونسٹوں نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے کسانوں کو نظام کے خلاف منظم کیا۔ ان کو ہتھیار چلانے کی ٹریننگ دی۔ زمینداروں کے ذریعہ چھینی گئی زمینیں اصل مالکان کو واپس مل گئیں۔ ریاست کے بڑے زمیندار اکثر بھاگ ہی گئے۔ ان کی زمینیں چھوٹے چھوٹے کسانوں کے

درمیان تقسیم کردی گئیں۔

اسٹیٹ کانگریس نے بھی ریاست کی سرحد پر کیمپ لگا رکھے تھے۔اس کے کارکنان مسلح ہوکر رضا کار کیمپوں، کسٹم چوکیوں اور پولیس تھانوں پر حملہ کرتے تھے۔تلنگانہ کے کیمونسٹ گڑھوں کو چھوڑ کر ریاست کے دوسرے علاقوں میں اسٹیٹ کانگریس نے عوام کو مزاحمت کے لیے تیار کیا تھا۔ 20ہزار سے زیادہ ستیہ گرہی جیلوں میں تھےاوراس سے زیادہ ان کی تعداد باہرتحریک میں سرگرم تھی۔

بہرحال ستمبر 1948 تک یہ بات واضح ہوگئی کہ نظام کو سمجھا بجھا کر ہندوستان میں شامل نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس لیے 13 ستمبر کو ہندستانی فوج حیدرآباد میں گھس گئی اور 18 ستمبر کو نظام نے اپنے ہتھیار ڈال دیے۔اس طرح ہندستانی یونین کو متحد کرنے کا مرحلہ پورا ہوگیا۔ریاست کی عوام نے ہندستانی فوج کا زبردست استقبال کیا۔اب اس کو نظام اور اس کے رضا کاروں کے ظلم سے فرصت مل گئی تھی۔ ہر سو خوشی کا ماحول تھا۔قومی جھنڈا لہرا رہا تھا۔لیکن اس خوشی کے ساتھ افسوس کی ایک بات یہ تھی کہ کیمونسٹوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔وہ ہندستانی یونین کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے مگر اس کی کہانی بہت لمبی ہے۔جس پر اس وقت چرچا کرنا ممکن نہیں ہے[8]

حیدرآباد اور راج کوٹ ریاستوں کی جدوجہد کی کہانی واضح کرتی ہے کہ برٹش انڈیا میں اپنائے گئے جدوجہد کے طریقے مثلاً غیر متشدد عدم تعاون تحریک یا ستیہ گرہ ہندستانی ریاستوں کے لیے اتنے موثر کیوں نہیں ثابت ہوئے؟ شہری آزادی یا عوام کی نمائندگی کرنے والے اداروں کے فقدان میں ان ریاستوں میں ستیہ گرہ چلانا اوراس کو کامیاب بنانا بہت مشکل تھا۔ یہ ریاستیں انگریزوں کی سرپرستی کی وجہ سے عوامی تحریک کو دبانے میں بہت حد تک کامیاب ہوئی تھیں ۔راج کوٹ کے سلسلہ میں ایسا ہی ہوا تھا۔بہرحال دیسی ریاستوں میں اس طرح کی تحریکیں جلد ہی متشدد شکل اختیار کرلیتی تھیں۔یوں حیدرآباد میں ایسا نہیں ہوا مگر بڑاوتکور، پٹیالہ اور اڑیسہ کی ریاستوں میں کم وبیش ایسا ہی ہوا۔حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کو آخر کار ہنسا کا راستہ اختیار ہی کرنا پڑا اور نظام نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب ہندستانی فوج نے ان کو ایسا کرنے کے لیے مجبور کردیا۔

بنیادی اعتبار سے کانگریس غیر متشدد جدوجہد کی حمایتی تھی، جب کہ کیمونسٹ اور بایاں

بازو متشدد طریقے اپنانے سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بڑاونکور، پٹیالہ اور اڑیسہ میں کیمونسٹ اور بائیں بازو کے سیاسی حالات خاصے بہتر تھے۔ دیسی ریاستوں اور برٹش انڈیا کے سیاسی حالات میں بڑا فرق تھا۔ برٹش انڈیا میں کانگریس تحریک نے ایسے طریقے اپنائے تھے جو وہاں کے حالات کے مطابق تھے اور اس فرق کی وجہ سے ہی کانگریس برٹش انڈیا اور ریاست کی تحریکوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اگر دیسی حکمرانوں پر قبل از وقت کانگریس اپنا دباؤ بناتی تو دشمن بن کر وہ نیشنلزم کو زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔

باب۔29

ہندستانی سرمایہ دار اور قومی تحریک

ملک کے مختلف طبقوں کے لوگوں کے ساتھ مل کر سرمایہ دار طبقہ کے بہت سے لوگوں نے قومی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے کئی ایک نے کانگریس کے اندر اپنی پہچان بنائی تھی، وہ جیل گئے تھے اور دیگر کانگریسیوں کے ساتھ انھوں نے انگریزی حکومت کی سختیاں جھیلی تھیں۔ اس سلسلہ میں جمنا لال بجاج، وڈی لال (Vadilal) للو بھائی مہتا، سیموئیل ایرون (Samuel Aaron) لالہ شنکر لال وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ کچھ ایسے بھی سرمایہ دار تھے جو کانگریس میں شامل تو نہیں تھے مگر باہر رہ کر ذاتی طور سے کانگریس کو مالی امداد کرتے اور دوسری طرح سے تعاون دیتے تھے۔ اس گروپ میں گھن شیام داس بڑلا، امبالال سارا بھائی اور بال چند ہیرا چند تھے۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ساہو کار اور تاجر تھے جو یا تو غیر جانبدار (Neutral) تھے یا کانگریس اور قومی تحریک کی مخالفت میں سرگرم تھے۔

اس باب میں ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ انفرادی طور پر کس سرمایہ دار کا قومی تحریک میں کتنا تعاون تھا اور سرمایہ دار طبقہ کی حیثیت سے اس سلسلہ میں اس نے کون سے کام کیے تھے بلکہ ہم اس بات کا تجزیہ کریں گے کہ ہندستانی سرمایہ داروں نے طبقاتی حیثیت سے قومی تحریک کے

تئیں کیا حکمت عملی اپنائی تھی۔

ایک بات ہم کو پہلے ہی کہنی چاہیے کہ کلونیل حکومت کے دوران ہندستانی سرمایہ دار طبقہ کی ٹھوس اقتصادی ترقی ہوئی تھی، اور اس کی ترقی کی یہ شکل دوسرے کلونیل ملکوں کی مالی ترقی سے بالکل مختلف تھی، اور اسی غیر معمولی صورت حال کی وجہ سے امپیریل ازم (Imperialism) کے سامنے ہندستانی سرمایہ داری کی حالت کافی مختلف تھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندستانی سرمایہ داروں کی ترقی انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوگئی تھی اور آزادانہ طریقہ سے کم وبیش وہ اپنی پونجی کا استعمال کرتے تھے۔ وہ غیر ملکی سرمایہ کی بیساکھی پر کام نہیں کررہے تھے اور نہ ہی وہ غیر ملکی سرمایہ داروں کے مقامی ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ دوسری بات یہ کی ہندستانی سرمایہ دار طبقہ نہ تو سیاسی اور نہ ہی مالی اعتبار سے سلطنت کا تابع تھا کہ وہ جاگیر دارانہ مفاد میں کام کرنے کے لیے مجبور کیا جاسکے۔ درحقیقت سرمایہ داروں نے 1944-45 میں اپنے بامبے پلان (Bombay Plan) میں زرعی سدھار، مشترکہ کھیتی، زر اور خرید وفروخت (Marketing) کو بڑے پیمانہ پر شامل کیا تھا۔ اس پلان پر پرشوتم داس ٹھاکر داس جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا، جی۔ ڈی برلا، اردیشر دلال، شری رام، کستور بھائی لال بھائی، اے۔ ڈی۔ شراف اور جان متھائی کے دستخط تھے[1]

تیسری بات یہ تھی کہ 1914 سے 1947 کے دوران ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ نے بڑی تیزی سے ترقی کی تھی، اس کی طاقت میں اضافہ ہوا تھا اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی، اور یہ سارے کام اس نے یورپی اجارہ داری کو توڑ کر اور غیر ملکی درآمد کے عوض ملکی پیداوار کا حصہ بڑھا کر کیے تھے۔ 1920 کی دہائی سے نئے علاقوں میں زیادہ تر سرمایہ کاری ہندستانی سرمایہ داروں نے کی تھی۔ ملک کو آزادی ملنے کے دنوں میں تو حالات یہ ہوگئے تھے کہ ملکی بازار پر 72، 73 فیصدی تک ہندستانی سرمایہ داروں کا ہی کنٹرول تھا۔ منظم بینکنگ سیکٹر (Organized Banking Sector) کے کل جمع رقم کا 80 فیصد پیسہ انھیں کا ہوتا تھا[2]

کسی کلونیل ملک کے سرمایہ دار طبقہ کی غیر معمولی ترقی کلونیل حکومت کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی جیسا کچھ لوگ تصور کرتے ہیں۔ یہ ترقی کلونیل حکومت سے بغیر سمجھوتہ کیے حاصل کی گئی تھی۔ ہندستانی سرمایہ دار کلونیل حکومت کے مفاد کے خلاف جدوجہد کرنے کا حامی ہی نہیں تھا

بلکہ اس کے بازار پر بھی قبضہ کرنے کی جرأت کر رہا تھا۔[3]

اسی طرح ہندستانی سرمایہ داروں کے مالی مفاد یا طبقاتی حالات میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کو سلطنت کی مخالفت کرنے سے منع کرتی رہی ہو جیسا اکثر لوگ سوچتے ہیں۔[4] دراصل 1920 کی دہائی کے وسط تک ملکی سرمایہ دار اپنے طبقہ کے مفاد کے بارے میں سوچنے لگے تھے اور سلطنت مخالف مضبوط رجحان پروان چڑھ رہا تھا۔ اس معاملہ میں اس طبقہ نے جو تھوڑی بہت جھجک دکھائی وہ سلطنت کی مخالفت کے بارے میں نہیں بلکہ اس بات پر تھی کہ حکومت سے لڑنے کے لیے مختلف طریقوں میں سے کس طریقہ کو اختیار کیا جائے۔ سرمایہ داروں کو خدشہ یہ تھا کہ آیا ان کے ذریعہ اختیار کیا گیا طریقہ خودکش اور ان کے وجود کے لیے نقصان دہ تو نہیں ثابت ہوگا۔

امپیریل ازم اور امپیریل ازم مخالف تحریک کے تئیں سرمایہ دار طبقہ کے رول پر چرچہ کرنے سے پہلے ہم یہ غور کریں گے کہ اس طبقہ نے سیاست کے میدان میں اپنی پہچان کس طرح بنائی۔

1920 کی شروعات سے ہی گھن شیام داس بڑلا اور پرشوتم داس ٹھاکر داس جیسے کئی سرمایہ دار، قومی سطح کی ایک ایسی تنظیم بنانے کی کوشش کر رہے تھے جو انگریزی حکومت کے سامنے اپنے مطالبات کو موثر طریقے سے پیش کر سکے۔ اس وقت ہندوستان میں یورپی مفاد کی نمائندگی منظم طریقے سے ہو رہی تھی اور ہندستانی سرمایہ دار اس کے مدمقابل اپنی تنظیم بنانا چاہتے تھے۔ ان کی کوششیں 1927 میں کامیاب ہو گئیں جب فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری (Federation of Indian Chambers of Commerce And Industry) (FICCI) نام کی تنظیم وجود میں آئی اور بہت جلد اس نے خاصی قوت حاصل کر لی۔ پورے ملک کے تاجروں کی اس میں نمائندگی ہوئی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں انگریزی حکومت اور ہندستانی عوام کے ذریعہ اس کو منظوری بھی مل گئی اور اس کو ہندستانی سرمایہ داروں کی نمائندگی کرنے والی تنظیم تسلیم کر لیا گیا۔

سرمایہ دار طبقہ کے لیڈر فکی (FICCI) کو ہندستانی تجارت، صنعت و حرفت کا قومی سرپرست تصور کرنے لگے۔ انھوں نے اس کو کلونیل ہندوستان کے اقتصادی معاملوں میں قومی سرکار کا کردار نبھانے والی تنظیم بھی تسلیم کرنا شروع کیا۔[5] دھیرے دھیرے ہندستانی سرمایہ داروں نے اقتصادی معاملات کے ہر میدان میں حکومت کی پالیسیوں کی مخالفت شروع کر دی۔ یہاں تک

کہ غیر برابری پیداوار والے ملکوں کے درمیان تجارت کے بارے میں زرمبادلہ میں تفاوت کی بات بھی اسی وقت اٹھائی گئی تھی۔ گھن شیام داس بڑلا اور ایس۔ پی۔ جین نے 1930 میں یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔[6] کانگریسی نیتاؤں نے متعدد بار کئی قومی مسئلوں میں ان سرمایہ داروں کے تعاون کو بے حد قیمتی اور اہم بتایا، ملک کے اقتصادی معاملوں میں ان سے مشورہ چاہا اور ان کے مشوروں کی قدر کی۔

سرمایہ دار فکّی کو اپنے طبقہ کی بھلائی اور ملک کے مالی مفاد کے لیے جنگ کرنے والی محض ٹریڈ یونین تنظیم ہی نہیں مانتے تھے بلکہ ان کے لیڈروں کو اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کو سیاست میں گھس کر فعال کردار نبھانا چاہیے۔ اسی لیے فکّی کے دوسرے اجلاس 1928 میں اس کے صدر نے یہ اعلان کیا کہ ''ہم اب اپنی مالی پالیسی کو سیاست سے الگ نہیں رکھ سکتے............ ہندستانی تجارت، صنعت و حرفت قومی تحریک سے منسلک ہیں۔ قومی تحریک جتنی مضبوط ہوگی اور جتنی ترقی کرے گی، اسی تناسب میں ہندستانی تجارت، صنعت و حرفت بڑھے گی اور ترقی کرے گی''۔[7] اس کے بعد 1930 میں گھن شیام داس بڑلا نے کم و بیش وہی بات دوہرائی کہ ''موجودہ سیاسی حالات میں سرکار کو اپنی طرف موڑ نا ممکن نہیں ہے، اب ایک ہی چارہ ہے کہ ہندوستان کے تجارت پیشہ لوگ ان لوگوں کا ہاتھ مضبوط کریں جو ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں''۔[8]

بہر حال، جیسا پہلے کہا جا چکا ہے کہ حکومت کے خلاف کس طرح جنگ کی جائے، اس کے بارے میں سرمایہ دار طبقہ کا اپنا نظریہ تھا۔ یہ طبقہ سول نافرمانی کی عام تحریک کے برخلاف آئین کے تحت رہ کر بات چیت کے ذریعہ معاملات کو سلجھانے کے حق میں تھا۔ اس نظریہ کے کئی اسباب تھے۔

پہلا سبب تو یہ تھا کہ سرمایہ داروں کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر سول نافرمانی تحریک لمبی کھچ گئی تو یہ انقلابی شکل اختیار کر لے گی، پھر تو ان کی سرمایہ داری خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لال جی نارائن جی نے مارچ 1930 میں پرشوتم داس کو لکھا تھا کہ ''اس سے نجی دولت کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔ اس کے نتائج بہت برے ہوں گے۔ مستقبل میں دیسی سرکاروں کو بھی اس خطرہ کا مقابلہ کرنا پڑ سکتا ہے''۔[9] اس طرح سرمایہ داروں کو جب بھی یہ احساس ہوتا کہ تحریک خطرناک رخ اختیار کر رہی ہے، تو وہ اس کو آئینی مزاحمت کی حد تک لانے کی ہر چند کوشش کرتے تھے۔

دوسری وجہ یہ کہ سرمایہ دار طبقہ حکومت کے خلاف لمبی مدت تک تحریک کی حمایت کرنے

سے گھبراتا تھا کیونکہ اس سے اس کی روزمرہ کی تجارتی سرگرمی متاثر ہوتی تھی اور اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ تحریک کا یہ رخ اس کے طبقاتی وجود کے لیے خطرہ بن رہا ہے۔

لیکن سرمایہ داروں کے ذریعہ کی جا رہی آئینی سرگرمی مثلاً اسمبلیوں اور کانفرنسوں میں شرکت یا وائسرائے کی انتظامیہ کمیٹی میں نمائندگی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ حکومت کا پٹھو ہو گیا ہو یا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہو۔ اس کے لیے اس طرح کے سارے طریقے حکومت کی مخالفت کرنے کے ذرائع تھے اور ان کے خیال سے ان ذرائع سے پہلو تہی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت بے لگام ہو کر کام کرے گی جس کی وجہ سے ملک کی معیشت اور سرمایہ داروں کی مالی حالت بری طرح متاثر ہوگی۔ پھر بھی سرمایہ دار طبقہ نے کسی بھی آئینی سدھار کو بلا شرط قبول نہیں کیا۔ کانفرنسوں اور اسمبلیوں میں بھی اس کی شرکت داری بلا شرط نہیں ہوتی تھی۔ اپنی شرطوں پر ہی یہ طبقہ ان سب میں حصہ لیتا تھا یا کسی اصلاحی پروگرام کو منظوری دیتا تھا۔ اپنے اصولوں سے اس نے کبھی مصالحت نہیں کی۔ جب بھی اس نے دیکھا کہ حکومت اس کو قومی مانگ سے بھی کم دے رہی ہے، اس نے اس کو منظور نہیں کیا۔[10] اسی وجہ سے فکّی نے 1934 میں ہندوستان میں آئینی سدھار کے لیے پارلیمنٹری کمیٹی آن کانسٹیٹیوشنل رفارم (Parliamentary Committee on Constitutional Reform) کی رپورٹ کو نامنظور کر دیا تھا اور اس کو وائٹ پیپر (White Paper) کی تجاویز سے زیادہ رجعت پسند بتایا تھا۔[11]

آئینی جد و جہد کے تئیں سرمایہ دار طبقہ چاہے جتنا خواہشمند رہا ہو، وہ اسمبلیوں میں بلا شرط شرکت کو فضول سمجھتا تھا۔ 1934 میں فکّی کے صدر آر۔ این سرکار نے کہا کہ اسمبلیوں میں شرکت تبھی فائدہ مند ہوگی جب پوری قوم اس میں حصہ لے۔[12] سرمایہ داروں نے شاید ہی کبھی بغیر کانگریس کی شرکت یا رضامندی کے مالی اور آئینی معاملوں میں بات چیت کی ہو، سمجھوتہ یا کسی فیصلے پر پہنچنے کی بات تو بہت دور تھی۔ 1930 میں فکّی نے حریت پسندوں (Liberals) کی منشا کے بالکل برعکس اپنے ممبروں کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حصہ لینے سے منع کیا اور کہا کہ آئینی معاملہ میں کوئی بھی کانفرنس تب تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک گاندھی جی اس میں شرکت نہیں

کرتے ہیں یا کم سے کم اس طرح کی کسی کانفرنس کے لیے ان سے منظوری نہیں لی جاتی ہے۔[13]
سرمایہ دار طبقہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف کانگریس ہی کچھ حاصل کر سکتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی منقسم صفوں میں ہو۔ نومبر 1929 میں امبا لال سارابھائی نے کہا کہ "کانگریس کی مدد کے بغیر حکومت آپ کی کوئی بات نہیں سنے گی"۔[14]

حقیقت میں آئینی نظام کا قیام (Constitutionalism) سرمایہ دار طبقہ کا مقصد نہیں تھا اور نہ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ حریت پسندوں کے ساتھ ہوتا اور اس کانگریس کے ساتھ نہ ہوتا جو بار بار جدوجہد کے آئینی طریقے اپنا رہی تھی اور اس میں سول نافرمانی تحریک بھی شامل تھی۔ جدوجہد کے دوسرے طریقے اپنانے کے امکانات سے بھی اس طبقہ نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس کے نزدیک آئینی حصہ داری صرف منزل کی طرف بڑھنے کا ایک قدم تھا۔ اس کے حصول کے لیے دوسرے اور اقدامات بھی ضروری ہو سکتے تھے۔ مثلاً 1937 میں گھن شیام داس بڑلا جنھوں نے حکومت میں شرکت کرنے کے لیے کانگریس کو راضی کرنے میں سخت محنت کی تھی اور لارڈ ہیلیفیکس (Lord Halifax) اور لارڈ لوتھین (Lord Lothian) کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ کانگریس محض آئین پر عمل کرنے کے لیے سرکار میں شامل نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کی آخری منزل، مقصد کے حصول کے لیے آگے قدم بڑھانا ہے اور اگر گورنر اور نوکر شاہ اس کام میں مخل ہوئے یا دو تین سالوں کے اندر کانگریس اس کے حصول کے لیے آگے نہ بڑھ سکی تو ہندوستان کو سیدھی لڑائی کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ اس سے ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ پورے ملک میں پرامن سول نافرمانی تحریک چلادی جائے گی۔[15]

اس طرح عام سول نافرمانی تحریک کے سلسلہ میں سرمایہ دار طبقہ کے پیچیدہ نظریہ کے بارے میں ہم کو معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اس کے لمبا کھنچنے پر خوفزدہ تھا اور دوسری طرف وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس سے ہی ملک اور اس کو کچھ اہم فائدے مل سکتے ہیں۔ جنوری 1931 میں گھن شیام داس بڑلا نے پرشوتم داس کو اس وقت چل رہی نافرمانی تحریک کے بارے میں لکھا تھا کہ "بلاشبہ ہم کو اس وقت جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ گاندھی جی کی ہی وجہ سے ہے اور ہم جس چیز کو حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں، اس کو حاصل کرنے کے لیے بروقت چل رہی تحریک کو کمزور

نہیں ہونے دینا چاہیے۔16

جب یہ تحریک بہت دنوں تک چلی تو سرمایہ دار اس کو واپس لینے اور کانگریس اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ طبقہ دونوں کے درمیان ثالث بن کر اکثر مصالحت کرانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی سوچتا تھا کہ سمجھوتہ تبھی ممکن ہے جب حکومت کچھ ٹھوس رعایتیں دینے کے لیے راضی ہو۔ اس طرح کی سودابازی کے لیے دوبارہ تحریک چلانے کی دھونس دینا بھی ضروری ہے مگر امن اور سمجھوتہ کے قیام کے لیے وہ حکومت سے ہار ماننے اور اپنے مطالبات میں کٹوتی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔17 اس طرح سرمایہ دار طبقہ کا دوسرا مقصد تھا مصالحت ہو جائے مگر قومی تحریک کمزور نہ پڑے۔ اسی منشا کے متعلق گھن شیام داس بڑلا نے کہا تھا کہ ''ہم کو دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ایک یہ کہ جب بھی مناسب وقت آجائے ہم کو ایسے سمجھوتہ کے لیے کوشش کرنی چاہیے اور دوسری بات یہ کہ ہم کو کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے ان لوگوں کے ہاتھ کمزور ہوں جن کی کوشش سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں''۔18

بہر حال سرمایہ دار طبقہ سول نافرمانی تحریک کا چاہے جتنا مخالف رہا ہو اس نے اس کے خلاف کلونیل حکومت کی مدد کبھی نہیں کی۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ تحریک سے جڑے لوگوں پر حکومت ظلم نہ کرنے پائے۔ وہ برابر پریس اور کانگریس پر لگی پابندی کو ہٹانے اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالتا رہا۔ اس کا یہ رخ اس وقت بھی تھا جب کانگریس کا غیر آئینی عام جد و جہد (Non-Constitutional Mass Phase) اپنے عروج پر تھا۔ حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی اس کی پہلی شرط یہی تھی کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے، پریس پر سے پابندی ہٹائی جائے اور ظالمانہ قانونوں کو واپس لیا جائے۔ کانگریس کی مجاہدانہ طاقت سے یہ طبقہ خوفزدہ تو ضرور تھا مگر اس نے کبھی بھی 1920 کے بعد حکومت کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی کھلے طور سے کانگریس کی تنقید کی اور نہ ہی اس سے اپنا رشتہ توڑا۔

وقت کے ساتھ اس مسئلہ پر سرمایہ دار طبقے کے نظریے میں کافی تبدیلی آئی۔ سودیسی تحریک 1908-1905 کے دوران یہ طبقہ اس کا سخت مخالف تھا۔ تیسری دہائی کے شروع میں چھڑی عدم تعاون تحریک کی اِس طبقہ کے ایک بڑے حصے نے مخالفت کی تھی۔ پرشوتم داس اور کچھ

دوسرے سرمایہ دار خود کو عدم تعاون تحریک کا دشمن مانتے تھے، لیکن چوتھی دہائی میں چھڑی سول نافرمانی تحریک کی سرمایہ دار طبقہ کی کثیر تعداد نے حمایت کی۔ ستمبر 1930 میں وائسرائے نے سرمایہ دار طبقہ سے کانگریس کی تنقید کرنے کے لیے کہا، اور یقین دلایا کہ اس کام میں حکومت حفاظت کا پورا بندوبست کرے گی، مگر یہ طبقہ حکومت کے جھانسے میں نہیں آیا۔[19] ستمبر 1940 میں پرشوتم داس نے محسوس کیا کہ انگریزوں کے سیاسی رجحان کو دیکھ کر اب کانگریس کے پاس عدم تعاون تحریک چلانے کے سوا دوسرا چارہ نہیں ہے۔[20] ہندوستان چھوڑو تحریک کے شروع ہونے کے چار دنوں بعد 5 اگست 1942 کو پرشوتم داس، جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا اور گھن شیام داس برلا نے وائسرائے کو لکھا کہ ''موجودہ بحران سے نمٹنے کے لیے اور ایک دوسری سول نافرمانی تحریک سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ جنگ عظیم کے دوران ہی ہندوستان کو سیاسی آزادی دے دی جائے''۔[21]

ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ تیسری دہائی کے آخر میں ہندستانی سرمایہ داروں کا بااثر طبقہ کانگریس کی حمایت ضرور کرنے لگا تھا مگر کانگریس پر اس کا اثر کسی بھی طرح بالکل نہیں تھا۔ کانگریس کی قیادت، اس کی پالیسی اور فیصلوں میں اس کا کوئی دخل نہیں تھا اور کانگریس بھی اس طبقہ کی حمایت پر بھی نہیں ٹکی تھی۔ کانگریس نے سرمایہ دار طبقہ کے تعاون کی خواہش بھی نہیں کی تھی بلکہ اس طبقہ نے بذات خود وقت کی نزاکت کو دیکھ اور سمجھ کر قومی تحریک کو حمایت دینے کی پالیسی اپنائی تھی۔ اس کے علاوہ سرمایہ دار طبقہ قومی خیمہ میں تو تھا مگر قومیت کے سلسلہ میں اس کا نظریہ رجعت پسندانہ تھا۔ اسی وجہ سے وہ کسی بھی سطح پر قومی تحریک کو کوئی موڑ نہیں دے سکا۔

اس حقیقت کے باوجود آج بھی کچھ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ سرمایہ دار طبقہ نے دولت کی طاقت پر کانگریس کی مالی پالیسیوں کو متاثر کیا، مثلاً اس نے اسٹرلنگ کے تناسب میں روپیہ کی کم قیمت کے خلاف، بحری محصول اور فوج کے خرچہ میں کمی کرنے وغیرہ کے مطالبے کیے تھے جو سراسر سرمایہ دار طبقہ کے مفاد میں تھے۔[22] یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ کانگریس کی سیاسی سرگرمیاں سرمایہ دار طبقہ کے زیر اثر اور اس کے مشورہ پر ہوتی تھیں، مثلاً تحریک کب چلائی جائے، اس کو جاری رکھا جائے یا واپس لے لیا جائے، اس طرح کے تمام فیصلے اس کی صلاح پر کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں گاندھی اروِن سمجھوتہ کے ذریعہ 1931 میں سول نافرمانی تحریک کو روک

دینے کا فیصلہ اور 1945 سے 1947 کے درمیان نئی تحریک نہ چھیڑنے کے فیصلے کو بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔23

لیکن یہ ساری باتیں سچائی پر پردہ نہیں ڈال سکتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ شہنشاہیت کے روبرو مال وزر کے لین دین کی آزادی اور بحری موصول میں کمی نیز اسی طرح کے دوسرے مطالبوں میں صرف سرمایہ دار طبقہ کا ہی فائدہ نہیں تھا بلکہ استحصال میں پس رہے ملک کے سارے لوگوں کی بھلائی اس میں مضمر تھی، یہاں تک کہ نہرو، سوشلسٹ اور کمیونسٹ جیسے بائیں بازو کے لوگ شہنشاہیت کے خلاف کھڑے ہو گئے اور انھوں نے ان کے مفاد میں جنگ کی۔

دوسری بات یہ کہ اقتصادی قومیت نوازی (Economic Nationalism) کا نظریہ اس وقت سوچا گیا تھا جب سرمایہ دار ایک طبقہ کی حیثیت سے منظم نہیں ہوئے تھے۔ ان کے منظم ہونے کے تقریباً نصف صدی پہلے ہی اس وقت کے نیشنلسٹوں نے مالی قومیت کا نظریہ مرتب کیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ مالی مطالبات کو اٹھانے کے لیے سرمایہ دار طبقہ نے کانگریس پر دباؤ ڈالا تھا۔

تیسری بات یہ کہ کانگریس سرمایہ داروں اور تاجروں سے مالی تعاون لے رہی تھی خاص طور سے آئینی دور (الیکشن) میں، مگر اس معاملہ کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس نے اس کے بدلے میں اپنے اصولوں سے ہٹ کر سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کیا ہو یا اپنی پالیسی میں تبدیلی کی ہو۔ کانگریس کی ضرورتوں کی حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا رہا (خصوصاً ان دنوں جب کانگریس نے عوامی تحریک کی شکل لے لی تھی) مارچ 1939 میں سرکار کے خفیہ شعبہ کے ایک ڈائرکٹر نے وائسرائے کے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ ''کانگریس کے پاس رقم اکٹھا کرنے کی باقاعدہ ایک سبیل (Substitute) ہے۔ حب الوطنی کی ایک اپیل پر پیسے برسنے لگتے ہیں۔ اس کو اپنی سرگرمیوں اور الیکشن کے کاموں کے لیے حسب خواہش رقم مل جاتی ہے۔ گاندھی جی کے تئیں عقیدت رکھنے والی عوام کی طرف سے اتنا پیسہ مل جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کی تجوری اس کے سامنے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہے''24 چناؤ کے علاوہ دنوں میں کانگریس کے کارکن ملک کے چپہ چپہ پر گھوم گھوم کر فیس ممبری اور معمولی چندے وصول کر اچھی خاصی رقم اکٹھا کرتے تھے۔

سرمایہ داروں کے تعاون کے بارے میں گاندھی جی کا نظریہ حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔
1922 میں گاندھی جی نے سرمایہ داروں اور تاجروں کی حمایت کی تائید تو کی مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ" چاہے وہ حمایت کریں یا نہ کریں ملک کی آزادی کے لیے عوام کی کاوش کسی خاص طبقہ کے رحم وکرم پر منحصر نہیں ہے۔ یہ تحریک ہے اور عوام اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کو منظم دولت کا سہارا ملے یا نہ ملے یہ قافلہ آگے بڑھتا ہی رہے گا۔ اس کو دولت پر منحصر نہیں ہونا چاہیے مگر اس کو دولت سے دوری بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر سرمایہ دار عوامی تحریک کو مالی امداد سے نوازتے ہیں تو یہ اچھی بات ہوگی اور اس سے مقصد کے جلد حصول میں مدد ملے گی"۔25
(بعد کے دنوں میں خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے دوران سرمایہ داروں کے تئیں گاندھی جی کا رویہ کافی سخت ہو گیا تھا کیونکہ ان دنوں قومی تحریک بڑی مصیبت سے گزر رہی تھی۔ قحط سالی کی وجہ سے عوام بھوکوں مر رہی تھی مگر سرمایہ دار طبقہ منافع خوری میں مصروف تھا)

قومی تحریکوں پر جہاں تک سرمایہ دار طبقہ کے اثرات کا تعلق ہے اس کے ثبوت ہم کو نہیں ملتے، (حالانکہ ان میں سے کئی ایک تحریکیں مخصوص علاقوں میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے ذریعہ چلائی گئی تھیں یا ان تحریکوں کی ان کے ذریعہ حمایت کی گئی تھی) تحریک شروع کرنے اور ملتوی کرنے کا فیصلہ کانگریس کی صواب دید پر منحصر تھا۔ وقت کی نزاکت کو دیکھ کر، حکومت کی طاقت کا اندازہ کر کے، تنظیمی اور نظریاتی اعتبار سے لوگوں کی تیاری کو سمجھ کر اور ظلم و جبر برداشت کرنے کی ان کی قوت کو بھانپ کر ہی کانگریس کی قیادت تحریک چلانے کے مسئلہ پر کوئی فیصلہ لیا کرتی تھی۔ سرمایہ داروں کا ان پر کوئی زور دباؤ نہیں تھا۔ کانگریس کے ذریعہ 1905 سے 1908 تک، 1920 سے 1922 تک اور 1930، 1932 اور 1942 میں جو بھی تحریکیں چلائی گئیں، ان میں سے کسی میں بھی سرمایہ دار طبقہ یا ان کے کسی اہم سیکشن کی منظوری نہیں لی گئی۔ تحریک شروع کرنے کے بعد سرمایہ دار طبقہ اپنے طور سے اس کے تئیں اپنا ردعمل ظاہر کرتا تھا اور یہی ردعمل، جیسا ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، وقت کے تغیر کے ساتھ تحریک کی حمایت کا روپ لے لیا کرتا تھا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندستانی سرمایہ دار طبقہ نے کانگریس کو کبھی بھی اپنے طبقہ کی پارٹی نہیں تصور کیا۔ وہ اس کو عوام کی رہنمائی کرنے والی کھلی تنظیم مانتا تھا۔ انڈین مرچنٹس

چیمبر کے سکریٹری جے۔ کے مہتا نے کہا تھا کہ ''کانگریس ایک ایسی تنظیم ہے جس میں سبھی سیاسی ومالی نظریے والے لوگوں کو جگہ مل سکتی ہے''۔[26] اس لیے اس کو دائیں یا بائیں کسی رجحان کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

حقیقت میں چوتھی دہائی کے دوران کانگریس میں نہرو، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے بڑھتے اثرات کو دیکھ کر سرمایہ دار طبقہ چوکنا ہو کر سیاست میں سرگرم ہو گیا۔ پھر بھی کانگریس کے اس رجحان سے خوفزدہ ہو کر یہ طبقہ حکومت کی گود میں نہیں گیا جبکہ اس وقت کے ترقی پسند حلقہ کے لوگ یہی سوچتے تھے کہ سرمایہ دار اب تو حکومت کے موافق ہو جائیں گے۔ ان جیسے حالات میں دوسرے کلونیل ملکوں اور نیم کلونیل ملکوں میں یہی کچھ واقع ہوا تھا۔ البتہ بائیں بازو کے اثرات کو کم کرنے کے لیے انھوں نے مختلف شکل کی حکمت عملی اختیار کی، مثلاً 1929 میں جب کچھ سرمایہ داروں نے مزدور تنظیموں میں کمیونسٹوں کے بڑھتے اثرات کو روکنے کے لیے ہندوستان اور یورپ کے سرمایہ دار طبقوں کے لیڈروں نے مل کر ایک پارٹی بنانے کی کوشش کی، تب سرمایہ داروں کی اکثریت نے اس کی مخالفت کی جس سے ان کا ارادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس سلسلہ میں گھن شیام داس بڑلا کا خیال تھا کہ ''ہندستانی سرمایہ دار کی فلاح رجعت پسند (یعنی شہنشاہیت نواز) طاقتوں سے ہاتھ ملانے سے نہیں ہوگی بلکہ ان کی بھلائی تو اس میں ہے کہ وہ ان لوگوں یعنی دقیانوس قوم پرستوں کا ہاتھ مضبوط کریں جو آئینی طریقے سے حصول آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں''۔[27] اس طرح 1928 میں جب حکومت نے کمیونسٹوں پر جبر کرنے کے لیے پبلک سیفٹی بل (Public Safety Bill) تیار کیا تو سرمایہ داروں نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس قانون کا استعمال حکومت قومی تحریک کو پست کرنے کے لیے کرے گی۔

سرمایہ دار طبقہ نے کمیونسٹ اثرات کو روکنے کے لیے اس طرح کی کسی بھی تدبیر سے مدد لینا پسند نہیں کیا۔ کمیونسٹوں سے نمٹنے کے لیے وہ اپنی کوئی طبقاتی تنظیم بھی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس کے مطابق اس طرح کی کوئی بھی تنظیم عوام یا متوسط طبقہ کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتی ہے۔ بڑلا نے اپنے لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ سرمایہ دار طبقہ اپنی تنظیم بنا کر کمیونسٹوں سے نہیں لڑ سکتا ہے''۔[28] بعد میں جب اس طبقہ کو نہرو کے بائیں بازو کے رجحان کو

دیکھ کر ڈر پیدا ہوا تب گھن شیام داس بڑلا نے 1936 میں مزید کہا کہ ''جن لوگوں نے اپنی ذاتی دولت قربان کر دی ہے ان کو وہ بات کہنے دیجیے جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ حکمت عملی یہ ہے کہ ایسے قوم پرستوں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں جن سے سرمایہ داری کو کوئی خطرہ نہیں ہے''۔[29]

وقت کے ساتھ ہندستانی سرمایہ داروں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر بڑے پیمانے پر معاشرتی اتھل پتھل کو روکنا ہے تو متواتر سدھار پروگراموں کو لاگو کرنا ہوگا۔[30] 1943 میں فکّی کے صدر جے۔ ایل مہتا نے یہی بات کہی تھی اور انھیں سدھار پروگراموں کو لاگو کرنے کی غرض سے سرمایہ داروں نے 1942 میں پوسٹ وار اکنامک ڈیولپمنٹ کمیٹی (Post War Economic Development Committee) بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے ہی مشہور بامبے پلان (Bombay Plan) تیار کیا تھا۔ اس کا مقصد سوشلسٹ تحریک کے ان مطالبات کو منظور کرنا تھا جن سے سرمایہ داری پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔[31] بامبے پلان نے فوری طور سے مالی ترقی اور اسباب معیشت کی یکساں تقسیم کے مسئلہ کو بڑی سنجیدگی سے اپنایا تھا۔ قومیت کے جزوی حقوق دینے، زرعی سدھار کرنے اور فلاح و بہبودی کی اسکیمیں چلانے کی بھی بات کہی گئی تھی۔ بہرحال پلان بنانے والوں نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا کہ کوئی قومی سرکار ہی ان پروگراموں کو عملی جامہ پہنا سکے گی۔

اس طرح یہ بات ظاہر ہے کہ ہندستانی سرمایہ دار طبقہ سوشلسٹ اور مزدور عوام کے خلاف تو تھا مگر وہ شہنشاہیت کا حامی بھی نہیں تھا۔

ملک کے سرمایہ دار طبقہ میں کافی پختگی بھی آ گئی تھی۔ یہ طبقہ اپنے مفاد سے باخبر تھا۔ کانگریس کی طاقت اور ملک کے مختلف طبقوں کے ساتھ اس کے تعلقات کا اس کو پورا احساس تھا۔ کمیونسٹوں سے خوفزدہ ہونے اور حکومت کے لالچ دینے کے باوجود اس نے ہندستانی قومیت کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنے مفاد کو عوام کے مفاد سے جوڑ کر ان کے حصول کے لیے آواز لگائی۔ سرمایہ دار طبقہ کی انھیں خوبیوں کی وجہ سے ملک کو آزادی ملنے کے دن تک ہندستانی قومی تحریک پر عوام کی بھلائی کا نظریہ برابر قائم رہا جبکہ تحریک کے اندر متضاد نظریات مستقل کارفرما رہے تھے۔

باب۔30

نیشنلسٹ خارجہ پالیسی کا ارتقا

سلطنت مخالف جدوجہد کے دوران ہندوستانیوں نے اپنی جس خارجہ پالیسی کو فروغ دیا تھا، اس کا واضح مقصد انگریزوں کی سلطنت توسیع پسندانہ پالیسی کی مخالفت کرنا اور اس کے خلاف چل رہی تحریکوں کی مدد کرنا تھا۔ شروع سے ہی ملک کے قوم پرستوں نے دوسرے ملکوں کے داخلی معاملوں میں مداخلت کرنے کی انگریزی پالیسی کی مخالفت کی تھی اور افریقہ وایشیا میں برٹش سلطنت کو بڑھانے اور اس کے تحفظ کے لیے ہندستانی فوج اور وسائل کے استعمال کرنے کے بھی وہ مخالف تھے۔

قومی خارجہ پالیسی کی زمین جنگ آزادی کے ابتدائی دور میں ہی تیار ہوگئی تھی۔ یہ زمانہ انگلش سلطنت کے توسیع کا دور تھا۔ 1878 کے بعد ہندوستان کی انگریزی حکومت نے ملک کی سرحد کے باہر کئی فوجی کارروائیاں کی تھیں۔ انگلینڈ کے ذریعہ ایشیا اور افریقہ میں لڑی گئی کئی جنگوں میں ہندستانی فوج کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان جنگی مہموں کی وجہ سے فوجی اخراجات میں بے تحاشہ اضافہ ہوا تھا۔ ہندوستان کے قومی لیڈروں نے ان کارروائیوں میں ہندوستان کو شامل کرنے کے لیے انگلینڈ کی بری طرح مذمت کی۔ وہ کہتے تھے کہ اس سے ہندستانی عوام پر نہ صرف

مالی بار پڑتا ہے بلکہ ایسی سیاست اخلاقاً بھی غلط ہے۔ آخر جولڑائیاں انگریزی سلطنت کو بڑھانے اور اس کے مالیات کو مضبوط کرنے کے لیے لڑی جارہی ہیں ان سے ہندوستان کا کیا سروکار ہے؟ اس لیے ان جنگوں پر ہورہے اخراجات کو صرف برٹش حکومت کو برداشت کرنا چاہیے نیز ان کے خیال سے امن وآشتی کی پالیسی اپنانے میں ہی ہندوستان کی بھلائی ہے۔

1878-80 کے دوران دوسری افغان جنگ لڑی گئی۔ سریندر ناتھ بنرجی نے ہندستانی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس جنگ کو خالص حملہ کے نام سے موسوم کیا اور کہا کہ ان تمام غیر منصفانہ جنگوں میں سے یہ ایک ہے جس نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کیا ہے[1]۔ ہندستانی یہ مطالبہ کرتے تھے کہ چونکہ یہ جنگ انگلش سلطنت کے حدود کو بڑھانے کے لیے لڑی جارہی ہے۔ اس لیے جنگ کا سارا خرچ اسی کو برداشت کرنا چاہیے۔ امرت بازار پتر کا نے اپنے 19/ مارچ 1880 کے شمارہ میں بڑے طنزیہ انداز میں کہا کہ ''انگریزوں کے جذبات اس وقت تک نہیں بھڑکتے جب تک ان کی جیب نہیں ٹٹولی جاتی اور ان کو اس بات سے زیادہ خوشی اور کسی بات سے نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں کی کمائی پر مستی کررہے ہیں''[2]

1882 میں انگلینڈ نے کرنل عربی کی قیادت میں چل رہی نیشنلسٹ بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنی فوج مصر بھیجی۔ بھارت سرکار نے بھی اس میں حصہ لیا۔ مصر میں انگلینڈ کی بے جا حملہ آور پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے ہندوستان کے نیشنلسٹوں نے کہا کہ چونکہ یہ جنگ انگلش سرمایہ داروں، تاجروں اور بانڈ ہولڈروں (Bond Holders) کے مفاد اور تحفظ میں لڑی جارہی ہے، اس لیے اس جنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

1885 کے آخر میں حکومت ہند نے برما پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے ہندوستان میں شامل کرلیا۔ بری لوگوں پر کیے گئے اس حملہ کی ہندوستان کے نیشنلسٹوں نے ایک زبان سے مذمت کی اور اس کو ناجائز، ظالمانہ اور من مانی پکارتے ہوئے منافی اخلاق بتایا کیونکہ بروقت اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ان کی نظر میں اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انگلینڈ کے کاروباری مفاد کو برما اور اتر چین تک وسعت دی جائے۔ انھوں نے برما کو انگریزی سلطنت میں شامل کیے جانے کی سخت مخالفت کی اور بعد میں جب برمیوں نے انگریزوں کے خلاف گوریلا (Guerrilla) لڑائی

شروع کی تب ان کے اقدامات کی تعریف کی گئی۔

1903 میں لارڈ کرزن نے تبت پر حملہ کیا۔ اس کے متعلق نیشنلسٹوں کے حقارت آمیز نظریہ کو آر۔ سی۔ دت نے لکھا ہے کہ "ایک بار پھر کاروباری لالچ اور سلطنت بڑھانے کی خواہش کے تئیں انگریزی حکومت نے تبت کو ناحق جنگ کی آگ میں جھونک دیا ہے"۔

1890 کی دہائی میں حکومت ہند نے ملک کے شمال مغرب سرحد پر توسیع سلطنت کی جو پالیسی اپنائی اس سے ہندوستانیوں کو بڑا صدمہ پہنچا۔ روس کے ناپاک ارادوں سے ہندوستان کو بچانے کے نام پر حکومت نے سال در سال فوجی معرکہ آرائیاں کیں۔ ان میں باغی قبیلوں کے خلاف ساٹھ ہزار سے زائد فوجی ٹکڑیاں لگائی گئیں۔ ان مہموں میں ہندوستان کی سیاسی سرحد تو ضرور وسیع ہوتی گئی مگر ملک کا خزانہ لگاتار خالی ہوتا گیا۔ ہندستانی تو یہ کہتے تھے کہ روس اور انگلینڈ کی دشمنی، یورپ اور ایشیا میں ان دونوں سلطنت نواز ملکوں کے مفاد کے ٹکراؤ کا ہی نتیجہ ہے۔ انگلینڈ کے ذریعہ روسی حملہ کا ہوا ناحق کھڑا کیا جارہا ہے جبکہ اس کی آڑ میں سلطنت کی توسیع کرنا ہی واحد مقصد ہے۔ اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے سرحد کے قبائلی جس طرح مدافعت کررہے تھے، قوم پرستوں نے اس کو بالکل جائز قرار دیا۔ انھوں نے حکومت کے اس پروپیگنڈے کو باطل ٹھہرایا کہ ہندستانی فوج خون کے پیاسے قانون شکن قبائل کو کچلنے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ سرحدی قبیلوں کے خلاف کی جارہی ظالمانہ فوجی کارروائی کی پرزور مذمت کی گئی۔ انھوں نے وزیراعظم لارڈ سیلسبری (Lord Salisbury) کے اس قول کا مذاق اڑایا کہ سرحد پر لڑی جارہی جنگیں خالص تہذیب وتمدن کی اشاعت کے لیے ہیں، ملک کے مراٹھا اخبار نے 17/اکتوبر 1897 کے شمارہ میں طنزیہ فقرہ لکھا کہ "کہا جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کے تئیں ہمدردی (Philanthropy) دکھانا بدمعاش اور سیاسی لوگوں کا آخری حربہ ہے۔ اس کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب سب دلائل ختم ہوجائیں اور غلط دلائل اجاگر ہوں"۔

قومی لیڈروں نے واضح کیا کہ ملک کی سرحد پر فوج کشی کرنا انگلینڈ کی اسی پالیسی کا نتیجہ ہے جس کا واحد مقصد ساری دنیا میں انگریزی سلطنت کو پھیلا دینا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت ہندوستان میں اتنی بڑی فوج رکھی جارہی ہے جس کی وجہ سے اخراجات متواتر بڑھ رہے ہیں۔

ملک کی مالی حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے اور لوگوں پر ٹیکس کا بار 1815 سے مستقل بڑھ رہا ہے۔ اس لیے انگریزوں کی جارحانہ پالیسی کی جگہ پر ہمارے قوم پرست لیڈر امن و آشتی کے اصول کی وکالت کرتے تھے۔ 1897 میں کانگریس کے صدر سی۔ شنکرن نائر (C. Sankaran Nair) نے بڑے ہی جدید اور بے باک انداز میں کہا کہ ''ہماری بچی پالیسی امن کی پالیسی ہے۔ ہمارے پاس قومی ترقی کی جتنی استعداد ہے اور ملک کی بھلائی کے لیے جن سدھاروں کو کرنے کی شدید ضرورت ہے، ان سب کو مدنظر رکھ کر ہم طویل مدت تک ملک میں امن و شانتی چاہتے ہیں''۔[3]

قومی خارجہ پالیسی میں 1880 سے 1914 کے دوران تین رجحانات خاص طور سے ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں ایک رجحان تو یہ تھا کہ اپنے اپنے ملک میں آزادی کے حصول کے لیے جنگ کرنے والے دوسرے لوگوں کی ہمدردی اور حمایت کی جائے۔ اس کے تحت آئرلینڈ، روس، ترکی، برما، افغانستان، مصر، سوڈان، اتھوپیا اور افریقہ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ نیک خواہشات اور ہمدردی کا زبردست اظہار کیا گیا اور پریس کے ذریعہ ان احساسات کو عوام میں پھیلایا گیا۔ ہوتوان اول (Ho Tuan I) کے وقت میں چین پر غیر ملکی حملہ کی زور دار مخالفت کی گئی اور ہندستانی فوج کے چین بھیجے جانے کی مذمت کی گئی۔

دوسرا رجحان ایشیائی بیداری (Asia Consciousness) کا موضوع تھا۔ 1885 کے دوران برما کی جنگ کی جو مخالفت ہوئی، اس نے شاید پہلی بار ایشیائی شناخت (Identity) کو برقرار رکھنے کا شعور پیدا کیا۔ کئی قومی اخباروں نے ایک آزاد پڑوسی ایشیائی ملک کو برباد کر دیے جانے پر صدمہ کا اظہار کیا۔ 1868 کے بعد صنعتی طاقت کی حیثیت سے جاپان کے ابھرنے کی ہندوستانیوں کے ذریعہ تعریف کی گئی اور اس کی مثال دے کر یہ کہا گیا کہ پچھڑے ایشیائی ملک مغربی کنٹرول کے بغیر ترقی کر سکتے ہیں۔ لیکن جاپان کی تمام تر تعریفوں کے باوجود قومی اخباروں نے جاپان کو آڑے ہاتھوں لیا جب اس نے 1895 میں چین پر حملہ کیا اور ہوتوان اول (Ho Tuan I) کی بغاوت کو کچلنے میں شرکت کی۔ چین کو منقسم کرنے کی انگلینڈ کی پالیسی کی بری طرح مذمت کی گئی کیونکہ اس کوشش کے کامیاب ہو جانے پر ایک آزاد ایشیائی ملک کی طاقت کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ جاپان کے ذریعہ زارشاہی (Czarist Russia) روس

کے ہار جانے پر جہاں یورپی بھائی چارہ کا بھرم (Myth) ٹوٹ گیا، وہیں ایشیائی اتحاد کا احساس بھی مضبوط ہوا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہندوستانیوں نے حکومت کی مالی توجیہ اور غیر ملکی پونجی کے اکسپورٹ کے رول کو بھی سمجھنا اور اس کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح برما پر ہوئے حملہ کے وجوہات پر تبصرہ کرتے ہوئے مراٹھا جس کو ان دنوں تلک اور آگرکر (Agarkar) نکال رہے تھے اس نے اپنے 15 نومبر 1885 کے شمارہ میں لکھا کہ ''سچائی یہ ہے کہ انگلینڈ کے پاس جتنا فاضل مین پاور (Man Power) ہے اور اس کی پونجی جس طرح باہر بہہ رہی ہے، اس کی وجہ سے اگلی کئی صدیوں تک جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is Right) کے سیاسی اصول پر وہ عمل کرتا رہے گا۔ آخر اس کو اپنی فاضل آبادی کے لیے اناج اور صنعتی پیداوار کے لیے بازار درکار ہے'' اسی طرح ''ہندو'' نے 23 ستمبر 1889 کو اس پر تبصرہ کیا کہ '' جس ملک میں غیر ملکی پونجی لگی ہو وہاں کی سرکاری انتظامیہ (Administration) سے سرمایہ کے حصے داروں (Bond Holders) کا تعلق جڑ جاتا ہے''۔

جون 1914 میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ہندوستان کے قومی لیڈروں جن میں لوک مانیہ تلک شامل تھے انھوں نے سرکار کو اس کی جنگی سرگرمی میں مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ یوں تو لوگوں نے بڑے زور وشور سے برٹش سلطنت کے تئیں وفاداری دکھانے اور اس کی حفاظت کرنے کا دم بھرا، مگر جواہر لعل نہرو نے اپنی سوانح حیات میں واضح کیا ہے کہ ''وفاداری کے اس شور وشرابہ میں ہمدردی کا عنصر بہت ہی کم تھا، کیونکہ جب جرمنی کی جیت ہوتی تو اعتدال اور انتہا پسند دونوں حلقوں میں اطمینان محسوس کیا جاتا۔ اور یہ کیفیت اس لیے نہیں تھی کہ وہ جرمنی کے بڑے خیر خواہ تھے، بلکہ وہ تو اپنے حکمرانوں کو پٹا ہوا دیکھنا چاہتے تھے''۔[4] دراصل لوگ یہ سوچتے تھے کہ ان کے انگریز آقا ان کی وفاداری کے مظاہروں سے خوش ہو کر کچھ نہ کچھ مالی اور سیاسی رعایتیں ضرور عطا کریں گے۔ اور انھیں رعایتوں کے سہارے خود مختاری حاصل کرنے کی سمت میں ملک اپنا قدم تیزی سے آگے بڑھا سکے گا، کیونکہ برطانیہ کے ذریعہ ہندوستان میں جمہوریت کے انھیں اصولوں کو لاگو کرنے کے امکانات تھے جن کے لیے وہ اور اس کے دوست ممالک (Allies) جنگ کرنے کا دعویٰ کر رہے تھے۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد قوم پرست لیڈروں نے اپنی خارجہ پالیسی کا یہی اصول بتایا

کہ وہ انگریزی حکومت کی سیاسی اور مالی نظریہ کی مخالفت کریں گے اور پوری دنیا میں امن کے قیام کے لیے سبھی ملکوں کی مدد کریں گے۔ اسی پالیسی کا ایک حصہ تھا جس کا مطالبہ 1919 میں کانگریس نے اپنی دہلی کانفرنس میں کیا تھا کہ ورلڈ پیس کانفرنس (World Peace Conference) میں ہندوستان کی نمائندگی ملک کے منتخب ممبروں کے ذریعہ کی جائے۔

آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف دوسرے ملکوں کے مجاہدین سے ہمدردی رکھنے کی آواز ہندوستانیوں کے ذریعہ متواتر بلند کی جاتی رہی اور اسی کے تحت آئرلینڈ اور مصر کے لوگوں اور ترکی کی سرکار کو عملاً مدد دی گئی۔ 1920 میں کلکتہ اجلاس میں کانگریس نے لوگوں کو مغربی ایشیا میں جنگ کرنے کے لیے فوج میں بھرتی ہونے سے منع کیا۔ مئی 1921 میں گاندھی جی نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے لوگ افغانستان پر ہونے والے ہر ایک حملہ کی مخالفت کریں گے۔ کانگریس نے لیگ آف نیشنس (League Of Nations) کی ہدایتی سسٹم (Mandate System) کے متعلق یہ کہا کہ یہ توسیع سلطنت کی چاہت کو ڈھکنے کا خول (Cover) ہے۔ اس نے 1921 میں برمی لوگوں کو ان کی جنگ آزادی کے لیے مبارک باد دیا۔ ان دنوں برما ہندوستان کا ہی ایک حصہ تھا، لیکن کانگریس نے اعلان کیا کہ اگر ہندوستان آزاد ہوا تو وہ برما کو بھی آزاد کر دے گا۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی نے لکھا کہ ''مجھے اس بات پر کبھی فخر نہیں ہوا کہ برما ہندوستان کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہیں تھا اور نہ ہونا ہی چاہیے۔ برمیوں کی اپنی انفرادی حیثیت ہے''[5] 1924 میں کانگریس نے برما میں رہنے والی ہندستانی آبادی سے کہا کہ وہ برمی عوام کو نقصان میں ڈال کر اپنے لیے علاحدہ حقوق کا مطالبہ نہ کریں۔

1925 میں چین کی قومی فوج (National Army) نے سن یات سین (Sun Yat Sen) کی قیادت میں جب شمالی مارچ (Northern March) شروع کیا تب غیر ملکی طاقتیں مداخلت کرنے کے لیے آمادہ ہو گئیں۔ کانگریس نے بروقت چینیوں کے ساتھ ہمدردی دکھائی اور برطانیہ کو ہندوستان اور چین دونوں کا دشمن بتاتے ہوئے کہا کہ ہندستانی فوج کو برطانیہ کی مدد میں چین نہ بھیجی جانی چاہیے تھی۔ 1925 میں گاندھی جی نے کہا کہ ''بے گناہ چینی طلبا کو گولیوں سے بھوننے کے لیے ہندستانی فوج کا استعمال کرنا ہتک آمیز اور ذلیل حرکت ہے۔

اس بڑے کام سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کو صرف ہندوستانیوں کا ہی استحصال کرنے کے لیے غلام نہیں بنائے رکھا گیا ہے بلکہ اس سے انگلینڈ کو چین جیسے قدیم اور عظیم ملک کے استحصال کرنے میں سہولت ملتی ہے''۔6

جنوری 1927 میں ایس۔ سرینواس اینگر (S. Sriniwas Iyengar) نے مرکزی اسمبلی میں کام روکو تجویز پیش کیا جس میں انھوں نے چینیوں کو پست کرنے کے لیے ہندستانی فوج کے چین بھیجے جانے پر اعتراض کیا تھا۔ کانگریس نے اسی طرح کے جذبات کا اظہار متواتر 1927 کے دوران اپنے اجلاسوں میں کیا تھا۔ اس نے مدراس اجلاس میں ہندوستانیوں کو صلاح دی تھی کہ وہ چینیوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے چین نہ جائیں کیونکہ سلطنت برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے میں چین ان کا ہم نوا ہے۔ کانگریس نے میسوپوٹامیا، ایران اور دوسرے ملکوں سے ہندستانی فوج کو واپس بلانے کا مطالبہ بھی کیا۔ 1928 میں اس نے مصر، سیریا، فلسطین، عراق اور افغانستان کے لوگوں کو اطمینان دلایا کہ وہ ان کی جنگ آزادی میں مدد دینے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

انگریزوں کے ساتھ ہندوستانیوں کے ہمدردانہ ربط وضبط کو اور ساری دنیا میں ان کے تئیں فوجی خدمت کی شکل میں ہندوستانیوں کے کردار کو ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری نے 1927 میں اپنی صدارتی تقریر میں کانگریس کے اجلاس میں اس طرح واضح کیا ''یورپ کے ذریعہ کی گئی ہمدردانہ چوری (Philanthropic Burglary) کی تاریخ اور کانگو سے کینٹن (Canton) تک لوگوں کو دی گئی اذیت خون سے لکھی ہے۔ ایک بار ہندوستان آزاد ہو جائے، پھر تو سلطنت برطانیہ کا پورا محل زمین بوس ہو جائے گا کیونکہ کہ ہندوستان اس محل کے محراب کا بیچ والا پتھر ہے''۔7

1926-27 میں جواہر لعل نہرو نے یورپ کا سفر کیا۔ وہاں ان کا تعلق بائیں بازو کے سیاسی کارکنوں اور دانشوروں سے ہوا۔ اس سفر نے ان کی فکر میں بڑی پختگی پیدا کی اور خارجی معاملات میں ان کے رجحان کو بے حد متاثر کیا۔ بہرحال وہ پہلے سیاسی لیڈر نہیں تھے جنھوں نے انگلینڈ کے سلطنت مخالف خیموں سے تعلق جوڑا ہو اور ان کی حمایت اور یورپی عوام کی رائے کو

حاصل کرنے کی کوشش کی ہو۔ دادا بھائی نوروجی مشہور سوشلسٹ دانشور ایچ۔ ایم۔ ہنڈ مین (H.M. Hyndman) کے گہرے دوست تھے۔ انھوں نے اگست 1904 میں انٹرنیشنل سوشلسٹ کانگریس (International Socialist Congress) کے ہیگ اجلاس میں حصہ لیا تھا اور سلطنت توسیع پسندانہ پالیسی (Imperialism) کو جنگی بربریت کی ایک قسم بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستانیوں کا اعتماد انگلینڈ کی پارلیمنٹ اور وہاں کی سیاسی پارٹیوں سے اٹھ گیا ہے اور اب وہ انگلینڈ کے مزدور طبقہ کے تعاون کی امید کرتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے نے بھی 1914 سے 1918 کے دوران اپنے قیام میں وہاں کے سوشلسٹ لیڈروں سے اچھے تعلقات بنائے تھے۔ 1917 میں انھوں نے جنگ عظیم میں امریکی شرکت کی مخالفت کی تھی کیونکہ جنگ کی فطرت میں بذات خود توسیع سلطنت کی خواہش پوشیدہ رہتی ہے۔ گاندھی جی نے خود یورپ کی نامور ہستیوں مثلاً ٹالسٹائے (Tolstoy) اور رومین رولینڈ (Romain Rolland) سے گہرے تعلقات قائم کئے تھے۔

جواہر لعل نہرو کے یورپی سفر کا خاص مقصد فروری 1927 میں برسیلس (Brussels) میں بین الاقوامی کانفرنس (International Conference) میں کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کرنا تھا، جس کا انعقاد انگریزوں کے ذریعہ ہو رہے جبر وظلم اور توسیع سلطنت کے ارادوں کے خلاف ہوا تھا۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سلطنت برطانیہ کے خلاف جنگ کر رہے ملکوں جیسے افریقہ، ایشیا، اور لاطینی امریکہ کے لوگوں نیز سرمایہ دار ملکوں میں جدوجہد کر رہے مزدور طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے البرٹ آئنسٹائن، رومین رولینڈ (Romain Rolland) میڈم سن یات سین اور جارج سیلسبری (George Salisbury) کے ساتھ ساتھ نہرو کو بھی کانفرنس کا اعزازی صدر منتخب کیا گیا۔ نہرو نے کانفرنس میں اپنی تقریروں اور بیانوں میں سرمایہ داری اور توسیع سلطنت کے اصولی رشتوں اور قربت کو اجاگر کیا اور دنیا بھر میں ان کے خلاف چل رہی کوششوں کے تحت ہندوستان کی دلچسپی کو اچھی طرح واضح کیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے نہرو کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کو وہاں لاطینی امریکہ کے نمائندوں کی صحبت حاصل ہوئی اور ان سے ان کو امریکہ کی

توسیع سلطنت کی منشا کو سمجھنے کا موقع ملا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو جو خفیہ رپورٹ نہرو نے دی، اس میں انھوں نے لکھا کہ ''ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کو خاص طور سے جو لوگ ایشیا سے آئے تھے ان کو جنوبی امریکہ کے مسائل کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ممالک متحدہ امریکہ کا بڑھتا ہوا توسیع سلطنت کا جذبہ اپنے تمام مالی وسائل کے بل بوتے اور باہری حملوں سے بے خوف ہو کر دھیرے دھیرے کس طرح وسط اور جنوبی امریکہ میں اپنا تسلط قائم کر رہا ہے، مگر ہم بہت دنوں تک ان معاملوں سے غافل نہیں رہ سکتے، کیونکہ مستقبل قریب میں امریکی شہنشاہیت انگلینڈ سے کہیں زیادہ بری ثابت ہوگی'' [8]

بروسیلس کانفرنس نے قومی آزادی کے لیے سلطنت کے خلاف ایک لیگ (League) قائم کرنے کا فیصلہ لیا۔ نہرو اس لیگ کی انتظامیہ کونسل کے ممبر منتخب کیے گئے اور کانگریس کو اس کی معاون کی حیثیت سے منظور کیا گیا۔ کلکتہ کانفرنس میں کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ وہ اسی جدو جہد کا ایک حصہ ہے جو عالمی سطح پر سلطنت کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ سلطنت کے خلاف لڑ رہے ملکوں اور لوگوں سے تعلق جوڑنے کے لیے فارین ڈپارٹمنٹ (Foreign Department) قائم کیا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ خیال صرف نہرو یا دوسرے بائیں بازو کے لوگوں کے دماغ کی اپج رہا ہو۔ ستمبر 1933 میں گاندھی جی نے نہرو کو لکھا کہ ''ہم کو یہ ماننا چاہیے ہماری نیشنلزم اور ترقی یافتہ بین الاقوامی نیشنلزم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے سُر سے سُر ملا کر کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں خود کو دنیا کی ترقی یافتہ طاقتوں کی قطار میں رکھنا چاہیے'' [9]

1936 کے بعد قومی خارجہ پالیسی میں بڑی سرگرمی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو جس پر کانگریس اور اس کے لیڈروں نے اپنا ردعمل نہ ظاہر کیا ہو۔ اٹلی، جرمنی اور جاپان میں فسطائیت کی فتح ہو چکی تھی اور اب وہ دنیا کے دوسرے سرمایہ دار ملکوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ کانگریس نے فسطائیت کو سلطنت نوازی (Imperialism) اور ریشیلزم یعنی نسل پرستی (Racialism) کو بدترین شکل بتا کر اس کی مذمت کی اور یہ بھی محسوس کیا گیا کہ ہندوستان کا مستقبل فسطائیت کے خلاف اس جنگ سے منسلک ہے جو سوشلزم،

جمہوریت اور شہری آزادی کے قیام کے لیے ہو رہی ہے۔ فسطائی حملوں کے خلاف اتھوپیا، اسپین، چین اور چیکوسلواکیہ میں عوام کے ذریعہ کی جارہی جدوجہد کی کانگریس نے تائید وحمایت کی۔

1936 کی لکھنؤ کانگریس میں جواہر لعل نہرو جو بین الاقوامی معاملوں پر کانگریس کی نمائندگی کر رہے تھے انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں امن کے متعلق قومی نظریہ کو اچھی طرح واضح کیا۔ انھوں نے دنیا کے حالات کا تجزیہ کیا اور فسطائیت کے خلاف جو جنگ دنیا بھر میں چھڑی ہے اس کے سیاق وسباق میں ملک کی جنگ آزادی کو اچھی طرح ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا کہ "ہماری جدوجہد آزادی دنیا بھر میں ہو رہی بڑی جدوجہد آزادی کا ایک حصہ ہے اور وہ طاقتیں جو ہم کو متحرک کر رہی ہیں وہی طاقتیں ساری دنیا کے لوگوں کو متحرک اور فعال کر رہی تھیں۔ سرمایہ داری کی راہ میں جب دشواریاں آنے لگیں تب وہ فسطائیت کی طرف بڑھنے لگی اور اس کا روپ ویسا ہی بھیانک ہو گیا جیسا امپیریلزم کا غلام کلونیل ملکوں میں بہت پہلے ہوا تھا۔ اس طرح امپیریلزم اور فسطائیت تنزل پذیر سرمایہ دار ملکوں کے دو چہرے ہیں" انھوں نے مزید کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا دو خیموں میں منقسم ہے۔ ایک طرف امپیریلزم اور فسطائیت ہے اور دوسری طرح سوشلزم اور نیشنلزم ہے۔ ہم ان طاقتوں کے ساتھ ہیں جو فسطائیت اور امپیریلزم کے خلاف ہیں۔ یہ ہمارے لیے ناگزیر ہے"۔[10] بعد کے سالوں میں نہرو اسی مسلک کو بار بار دوہراتے رہے۔ جنوری 1939 میں انھوں نے لکھا کہ "ہماری جدوجہد کے زمرہ میں صرف اپنا ملک ہی نہیں ہے بلکہ اس میں چین اور اسپین بھی شامل ہیں"۔[11]

گاندھی جی بھی فسطائیت کے سخت خلاف تھے۔ ہٹلر کے ذریعہ کیے جارہے یہودیوں کے قتل عام کی انھوں نے سخت لفظوں میں مذمت کی۔ "ہٹلر نے خالص فوجی نیشنلزم کا ایسا مذہبی عقیدہ پیش کیا جس کے نام پر کیا جارہا ہر بے رحمی کا کام رحم کا کام ہوتا ہے"۔ انھوں نے لکھا کہ اگر انسانیت کے نام پر کوئی برحق جنگ ہو سکتی ہے تو وہ جنگ جرمنی کو پوری نسل پر بلاوجہ ظلم ڈھانے سے روکنے کے لیے ہوگی"۔[12]

شروع 1936 میں جب فسطائی اٹلی نے اتھوپیا پر حملہ کیا تو کانگریس نے کہا کہ اتھوپیائی عوام کی جدوجہد آزادی دنیا کے سارے مظلوم ومعتوب عوام کی جدوجہد آزادی کا ایک

جز ہے۔ کانگریس نے 9 مئی کو یوم اتھوپیا منانے کا اعلان کیا جس کے تحت پورے ملک میں وہاں کی عوام کی ہمدردی اور حمایت میں جلسے اور مظاہرے ہوئے۔ یورپ سے لوٹتے وقت جواہر لعل نہرو نے کئی بار مدعو کیے جانے کے باوجود مسولنی سے ملاقات نہیں کی۔ ان کے مطابق اگر وہ ان سے ملاقات کرتے تو اس سے لوگوں کو غلط پیغام پہنچتا اور فسطائیت کو بڑی تقویت ملتی۔

کانگریس نے اسپین کی خانہ جنگی میں فسطائی فرینکو کے خلاف زندگی وموت کی کشمکش میں مصروف جمہوریت پسندوں کی پوری حمایت کی۔ دسمبر 1936 کے فیض پور کانگریس میں اپنی صدارتی تقریر میں جواہر لعل نہرو نے اس بات پر زور دیا کہ اسپین میں چل رہی جنگ فقط فرینکو ریپبلکوں یا فسطائیت اور جمہوریت کے درمیان نہیں ہے بلکہ یہ جنگ تو ساری دنیا کے ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ''آج جو لڑائیاں اسپین میں لڑی جا رہی ہیں وہ ہماری ہی لڑائیاں ہیں اور ان لڑائیوں میں مصروف لوگوں سے ہم محض غیر سمجھ کر دوستانہ محبت اور ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ ان کے دکھ درد کا ہم کو بڑا خیال ہے''۔[13] جون 1938 میں وہ کرشنا مینن کو ساتھ لے کر اسپین گئے۔ وہاں انھوں نے جنگی مورچوں کا دورہ کیا اور بری لونا (Barcelona) میں پانچ دن قیام کیا۔ وہاں متواتر بمباری ہو رہی تھی۔ 13 اکتوبر 1938 کو گاندھی جی نے اسپین کے وزیر اعظم جوان نگرن (Juan Negrin) کے نام اپنا پیغام بھیجا کہ میں تہہ دل سے آپ کے ساتھ ہوں۔ خدا کرے آپ کے غم والم سے سچی آزادی کا جنم ہو!''[14]

1938 کے آخر میں ہٹلر چیکوسلواکیہ پر سیاسی سازش کے تحت حملہ آور ہوا جس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس نے میونخ (Munich) میں چیکوسلواکیہ کے ساتھ غداری کی۔ نہرو کی غیر حاضری میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک قرار داد پاس کیا جس میں جرمنی کے ذریعہ چیکوسلواکیہ کو آزادی سے محروم کرنے اور اس کو کمزور بنانے کی بے شرم کوشش پر افسوس اور وہاں کی بہادر عوام کے تئیں دلی ہمدردی کا اظہار کیا گیا''[15] گاندھی جی نے ہریجن میں لکھا کہ ''چیکوسلواکیہ کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب ان کی ہستی کو مٹانے کا فیصلہ ہو رہا تھا تب کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اس پر بے حد صدمہ ہوا تھا اور جہاں تک میرا تعلق ہے ان پر آئی اس مصیبت پر مجھ کو جسمانی اور روحانی صدمہ پہنچا ہے''[16] نہرو ان دنوں یورپ میں تھے۔ انھوں

نے سرکاری مہمان کی حیثیت سے جرمنی جانے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے وہ پراگ (Prague) چلے گئے۔ چونکہ انگلینڈ جرمنی کی پشت پناہی کر رہا تھا اس لیے وہ انگلینڈ سے ناراض تھے۔ مینچسٹر گارجین (Manchester Guardian) کو لکھے گئے اپنے ایک مراسلہ میں انھوں نے کہا کہ "حال میں جو کچھ چیکوسلواکیہ میں واقع ہوا اور برٹش سرکار نے بالواسطہ یا اپنے ثالث (Mediator) کے ذریعہ جس طرح ہر ایک موڑ پر اس کو ڈرایا دھمکایا گیا ہے، اس کو یاد کر کے مجھے متلی آنے لگتی ہے۔"[17] میونخ معاہدہ سے ان کو بڑا صدمہ پہنچا اور 5/اکتوبر کو نیشنل ہیرالڈ کے ایک مضمون میں انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے ایسی حالت کا تصور کیا جس میں انگلینڈ اور فرانس چیکوسلواکیہ کو دبوچے ہیں اور جرمنی اس کے ساتھ زنا بالجبر کر رہا ہے۔"[18] چیکوسلواکیہ کے ساتھ جو دغابازی انگلینڈ اور فرانس نے کی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ وہ دونوں سوویت یونین کو الگ تھلگ کرنا چاہتے تھے اور توازن برقرار رکھنے کے لیے وہ فسطائیت کو وہاں بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ شروع 1939 میں کانگریس نے تری پوری میں انگریزوں کی خارجہ پالیسی سے مکمل طور سے دور رہنے کی تجویز پاس کی، کیونکہ اسی پالیسی کے تحت اس نے مسلسل فسطائی طاقتوں کو تقویت پہنچائی ہے اور جمہوری ملکوں کو برباد کرنے میں مدد دی ہے۔

1937 میں جاپان نے چین پر حملہ کر دیا۔ کانگریس نے ایک قرارداد پاس کر کے جاپان کی مذمت کی اور چینیوں کے تئیں ہمدردی کا اظہار کرنے کی غرض سے ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ وہ جاپان کا بنا ہوا سامان استعمال نہ کریں۔ شروع 1938 میں ہری پورا کے اجلاس میں کانگریس نے اپنی اپیل دوہرائی اور جاپانی حملے کی مذمت کرتے ہوئے اس کو وحشی امپیریلزم سے موسوم کیا جس نے چین میں دہشت اور خوف کا ماحول پیدا کر رکھا ہے۔ وارننگ دیتے ہوئے اس نے جاپان سے کہا کہ چین پر اس کے حملے کے بڑے سنگین نتائج نکلیں گے، دنیا سے امن غائب ہوگا اور ایشیا کی آزادی چھن جائے گی۔ چینیوں کے تئیں خلوص اور ہمدردی کے اظہار کی غرض سے پورے ملک میں 12 جون یوم چین (China Day) کے نام سے منایا گیا اور ڈاکٹر ایم۔ اٹل (Dr. M. Atal) کی قیادت میں چینی فوج کی میڈیکل مدد کے لیے ڈاکٹروں کا ایک دستہ کانگریس کے ذریعہ وہاں بھیجا گیا۔ اسی دستہ کے ایک ممبر ڈاکٹر کوٹ نس (Dr. Kotnis)

نے ماؤزے ڈانگ (Maoze Dong) کی کمان میں آٹھویں روٹ آرمی کے ساتھ کام کرتے ہوئے اپنی قیمتی جان قربان کردی۔

ہندوستان کی قومی خارجہ پالیسی کی پیچیدگی، اس کے انسانیت نوازی کا جذبہ اور سلطنت مخالف رجحان کا پتہ ہم کو اس کے فلسطین مسئلہ کے نظریہ سے ہوتا ہے۔ فلسطین میں ایک طرف عربی سلطنت برطانیہ سے برسر جنگ تھی اور دوسری طرف یہودی جن کو نازی جرمنی میں چن چن کر قتل کیا جارہا تھا اور مظالم ڈھائے جارہے تھے وہی لوگ صیہونی (Zionist) قیادت میں اور انگلینڈ کی مدد سے اپنے لیے فلسطین میں وطن بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہندوستانیوں کو ان مظلوم یہودیوں سے ہمدردی تھی جن کی نسل کشی نازی جرمنی کے ذریعہ کی جارہی تھی مگر وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہودی عربوں کا حق مار کر ان کے وطن پر قابض ہوں۔ اس لیے ہندوستانیوں نے یہودیوں کے ایسے اقدام کی تنقید اور عربوں کی حمایت کی۔ انھوں نے یہودیوں سے اپیل کی کہ وہ عربوں کے ساتھ مل کر معاہدہ کریں۔ کانگریس نے 27 ستمبر 1936 کو یوم فلسطین منایا اور اکتوبر 1937 میں اس نے فلسطین میں دہشت کی حکومت اور اس کے بٹوارے کی تجویز کی مخالفت کی اور انگلینڈ سے کہا کہ وہ عربوں اور یہودیوں کو مل بیٹھ کر اپنا تنازعہ حل کرنے کے لیے چھوڑ دیں اور یہودیوں سے اپیل کی کہ وہ برٹش شہنشاہیت کی پناہ نہ لیں۔ یورپ میں ہورہی یہودیوں کی درگت کے بارے میں لکھتے ہوئے گاندھی جی نے دسمبر 1936 کے ہریجن اداریہ میں وہی باتیں دوہرائیں۔ انھوں نے لکھا کہ ''میری تمام تر ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ ہیں، مگر یہ بھی غلط اور غیر انسانی فعل ہوگا کہ ان کو عربوں پر لاد دیا جائے خوددار عربوں کے بال و پر کترنا انسانیت کے خلاف صریح جرم ہوگا۔ انھوں نے یہودیوں سے اپیل کی کہ وہ عربوں کے ساتھ سمجھداری کا معاملہ کریں اور انگریزوں کی توپ وتفنگ کی مدد لینا چھوڑ دیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایک ایسی قوم کو برباد کرنے میں وہ (یہودی) انگریزوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں جس نے ان کے ساتھ کوئی خطا نہیں کی ہے''۔[19] 39-1936 کے دوران نہرو فلسطین کے بارے میں ایسے ہی خیالات متواتر ظاہر کرتے رہے۔

نیشنلسٹوں خصوصاً نوجوانوں کا دنیا کے بارے میں جو نظریہ تھا اس کا اہم پہلو یہ تھا کہ

ان کے دل میں سوویت یونین کے تئیں بے پناہ ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ تھا۔ اس وقت کے قریب قریب سبھی بڑے لیڈر مثلاً لوک مانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال وغیرہ 18-1917 کے دوران روسی انقلاب کے موافق ہو گئے تھے۔ اس انقلاب میں وہ مظلوم عوام کی کامیابی دیکھ رہے تھے۔ 1920 کی دہائی میں تیار ہو رہے سوشلسٹ اور کیمونسٹ حلقوں میں اور نوجوان دانشوروں میں سوویت یونین اور اس کے مساواتی، سماج وادی اور سلطنت مخالف فکر نیز پانچ سالہ منصوبہ کے لیے بڑی کشش تھی............ان کے دلوں میں اس بات سے بڑی خوشی تھی کہ سوشلسٹوں کا اپنا ایک وطن بن گیا ہے۔ 1927 میں جواہر لعل نہرو اور موتی لعل نہرو نے سوویت یونین کا دورہ کیا۔ وہاں سے لوٹ کر جواہر لعل نہرو نے 'ہندو' میں کئی مضامین متواتر تحریر کیے جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔

سوویت یونین کے بارے میں جواہر لعل کے تاثرات بہت مثبت اور مثالی تھے۔ کتاب کے کور صفحہ پر انھوں نے یہ جملے تحریر کیے تھے "وہ صبح بڑی پر مسرت اور زندگی بخش تھی اور اس وقت جوان ہونے میں تو بہشت کا لطف تھا"۔ 1928 میں اور اس کے بعد بھی نہرو نے سوویت یونین کی بارہا تعریف کی کہ وہی تو انگلش شہنشاہیت کا سب سے بڑا مخالف ہے"۔ جیسے جیسے ان پر مارکسزم کے اثرات مرتب ہوتے گئے، ان کے دل میں سوویت یونین کی قدر بڑھتی گئی۔ 1936 میں انھوں نے لکھنؤ میں کہا کہ جو کچھ سوویت یونین میں ہو رہا ہے اس سے ان کو سخت تکلیف ہے اور وہ قطعی ان کو پسند نہیں کرتے مگر وہاں کے اداس ماحول میں ایسی پر کشش تہذیب جنم لے رہی ہے اور ایسا نیا ضابطہ قائم ہو رہا ہے جس کا مستقبل بے انتہا روشن اور امید افزا ہے۔ دراصل مستقبل کی ساری امیدیں سوویت روس سے ہی وابستہ ہیں[20] 1930 کی دہائی میں روس میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد پر مقدمہ چلانا اور اسٹیلین کے مخالفین سے ملک کو پاک کر دینا وغیرہ کام نہرو کو سخت ناگوار تھے، پھر بھی سوویت کے نظام حکومت سے ان کو بڑی عقیدت تھی، کیونکہ ان کے مطابق ایشیا اور یورپ کو فسطائیت سے اچھی طرح بچانے کے لیے سوویت یونین ایک مضبوط فصیل کی طرح کام کرتا ہے"[21]

سوویت یونین کے تئیں دوسرے کانگریسی لیڈروں مثلاً سی۔ آر۔ داس اور گاندھی جی

کا رخ دوستانہ تھا مگر چونکہ کمیونزم تشدد پر بہت زور دیتا تھا اس لیے وہ خصوصاً گاندھی جی اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے تھے، حالانکہ دھیرے دھیرے ان کے نظریہ میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ 1928 کے آخر میں گجرات ودیا پیٹھ کے طلبا سے گفتگو کرتے ہوئے ایک طرف گاندھی جی نے ذاتی ملکیت کے متعلق بولشیوک (Bolshevik) نظریے کی تعریف کی، وہیں دوسری طرف انھوں نے اس بات کی مذمت کی کہ وہ تشدد کے ذریعہ ذاتی ملکیت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی پیشین گوئی کی کہ اگر بولیشویک حکومت تشدد کے اصول پر چلتی رہی تو اس کا زوال بالکل طے ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بولشیوک فکر کے پیچھے لاتعداد مردوں اور عورتوں کی مقدس ترین قربانیاں ہیں جنھوں نے اس کے حصول کے لیے سب کچھ لٹادیا ہے اور جس فکر کو لینن جیسی عظیم ہستیوں نے اپنی قربانیوں سے مقدس بنادیا ہے وہ ضائع نہیں ہوسکتی۔ ان کی قربانیوں نے ایسی مثال قائم کی ہے جو ہمیشہ درخشاں رہے گی اور وقت کے ساتھ بولشیوک فکر کو تیز تر اور پاکیزہ کرتی جائے گی۔[22]

1930 کے دوران کمیونسٹ پارٹی کانگریس سوشلسٹ پارٹی کسان سبھاؤں اور ٹریڈ یونینوں کی ترقی کے ساتھ سوویت یونین کے تئیں لوگوں کی ہمدردی، حمایت اور ستائش میں خاصہ اضافہ ہوا۔ ان سب نے اپنی تحریکوں اور پروپیگنڈوں میں سوویت یونین کو بطور مثال پیش کیا کہ کسان مزدور سب کچھ کرسکتے ہیں۔

1920 کی دہائی کے ختم ہوتے ہوتے ایک بار پھر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ کانگریس 1927 کا اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ اس میں اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کو کسی بھی امپیرلسٹ جنگ میں نہیں گھسیٹا جاسکتا اور کسی حالت میں ہندوستانیوں کی منشا کے بغیر اس کو جنگ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ بعد کے سالوں میں کانگریس کا یہی اعلان قومی خارجہ پالیسی کا نمایاں اصول بن گیا اور متعدد بار اس کو دوہرایا بھی گیا۔ فسطائیت کے ابھار اور اس کی وجہ سے امن، جمہوریت اور سوشلزم اور مختلف ملکوں میں آزادی کے لیے جو خطرہ پیدا ہوا تھا، اس کے تحت جنگ کے متعلق لوگوں کے نظریہ میں کچھ حد تک تبدیلی ضرور واقع ہوئی مگر جیسا پہلے ہی واضح کیا جاچکا ہے کہ ہندوستان کی قومی قیادت نے کبھی بھی فسطائیت اور فسطائیوں کی جنگ وجیت کی سرگری سے

مصالحت نہیں کی۔اس کے ساتھ ہی قومی قیادت کو اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ اگر انگلینڈ اس جنگ میں شامل ہوتا ہے تو وہ امن وجمہوریت کے لیے نہیں، بلکہ اپنی توسیع سلطنت کی (Imperialism) دلچسپیوں کے تحفظ کے لیے شامل ہوگا اور اس لیے ایسی جنگ میں ہندستانی ساتھ نہیں دے سکتے۔اس کے علاوہ بذات خود امپیریلزم ہی جنگ کا خاص سبب تھا۔وہ یہ بھی مانتے تھے کہ فسطائیت کا مقابلہ تبھی کیا جا سکتا ہے جب ایک ملک دوسرے ملک کو ہڑپ کرنے سے باز آئے۔جس جنگ میں برطانیہ شامل ہوتا ہے، تو اس کے کردار کا صحیح ارادہ اس بات سے ہوگا کہ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں اس کی کیا منشا ہے۔بھلا غلام ہندوستان کسی طرح دوسرے کی آزادی کے لیے جنگ کر سکتا ہے۔اگر ہندوستان کو آزادی دینے کی بات فوراً تسلیم کر لی جاتی ہے تو ہندوستان فسطائیت کے خلاف جنگ میں صرف شریک ہی نہیں ہوگا بلکہ عملاً شریک ہوگا، لیکن ہندوستان کے دھن، جن اور وسائل کا استعمال برٹش سلطنت کے مفاد میں کیا گیا تو ہر قدم پر اس کی مخالفت کی جائے گی۔یہی بات کانگریس نے 1936 سے 1939 کے دوران بار بار دوہرائی۔

جنگ کے بارے میں نیشنلسٹوں کے نظریہ کا خلاصہ کرتے ہوئے نہرو نے 19 اپریل 1939 کو لکھا کہ ''ہم ہندوستانیوں کے لیے راستہ صاف ہے اور یہ راستہ ہے فسطائیت کی پوری طرح مخالفت۔ہم امپیریلزم کے خلاف ہیں۔ہم چیمبرلین (Chamberlain) کے جھنڈے کے نیچے قطار باندھ کے کھڑے نہیں ہوں گے اور نہ ہم اپنے وسائل کو اس کی محافظت میں جھونکنے کے لیے تیار ہیں، مگر ہم انھیں وسائل کو دوسرے آزاد جمہوری ملکوں کی قطار میں کھڑے ہندوستان کی آزادی کے تحفظ میں خوشی سے لگا دیں گے''۔23 اگست 1939 کے دوسرے ہفتہ میں جب جنگ شروع ہونے والی تھی تب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے دوبارہ وہی بات اچھی طرح واضح کی۔اہنسا کے اصول کا پابند ہونے کے ناتے گاندھی جی بنیادی اعتبار سے اس نظریہ کے قائل نہیں تھے مگر وہ بھی اسی راستہ پر چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔اگلے تین سال تک کانگریس کو بڑی دشواریوں سے گزرنا پڑا۔

باب۔31

فرقہ واریت کا جنم اور ارتقا

اس سے پہلے کہ ہم جدید ہندوستان میں فرقہ واریت پر چرچہ کریں، بہتر ہوگا کہ ہم لفظ فرقہ واریت کا صحیح مفہوم متعین کر لیں اور اس کے متعلق رائج تمام تر بنیادی غلط فہمیوں کو سمجھ لیں۔ بنیادی طور سے فرقہ واریت ایک نظریہ ہے جو ہماری زندگی میں اس طرح اور اتنی مدت سے رچا بسا ہے کہ یوں تو بہت سہل، صاف اور عام فہم لگتا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

فرقہ واریت یا فرقہ وارانہ خیالات کے تین ناگزیر اور مسلسل ادوار ہیں۔ سب سے پہلے دور میں مذہبی عقیدہ کی بات آتی ہے جس میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے سیاسی، مالی، معاشرتی اور تمدنی مفادات ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ فرقہ واریت سب سے پہلے یہیں جنم لیتی ہے اور یہیں مذہب کی اساس پر بنا سیاسی سماج کے وجود میں آتی ہے۔ طبقوں، برادریوں، لسانی اور تمدنی جماعتوں قوموں یا سیاسی اکائیوں مثلاً صوبوں کے بجائے وہ فرقے جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں ان کو ہندستانی سماج کی ابتدائی اکائیاں سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی مانا جاتا ہے کہ ہندستانی عوام مذہب پر قائم ان فرقوں کے ممبروں کی حیثیت سے ہی اپنی سماجی اور سیاسی زندگی کو چلا سکتی ہے اور مجموعی اور انفرادی طور سے اپنے مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ ان گونا گوں فرقوں

کے اپنے لیڈر ہوتے ہیں جو خود کو کسی قوم، علاقہ اور مخصوص طبقہ کے لیڈر نہ ہونے کا ڈھونگ کرتے ہیں مگر اصلاً وہ اپنے ہی فرقوں کے لیڈر ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ یہی امید کی جاتی ہے کہ فرقہ وار لیڈروں کی حیثیت سے آپس میں متحد ہو کر قوم یا ملک کی بڑی اکائی کی خدمت کریں۔

فرقہ وارانہ نظریہ کے دوسرے پہلو میں یہ خیال کارفرما ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے مختلف النوع مذہب اور زبان والے ملکوں کے لوگوں کا دنیاوی یعنی ان کا معاشرتی، تمدنی، مالی اور سیاسی مفاد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

فرقہ واریت اپنے تیسرے دور میں اس وقت پہنچتی ہے جب یہ مان لیا جاتا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تبھی ان میں دشمنی جنم لیتی ہے۔ اس اسٹیج پر پہنچ کر فرقہ پرست یہ کہنے لگتا ہے کہ ہندو اور مسلمان کے دنیاوی مفادات ایک ہو ہی نہیں سکتے۔

اس لیے بنیادی صورت میں فرقہ واریت وہ نظریہ ہے جس کی اساس پر فرقہ پرست سیاست کا قیام ہوتا ہے۔ متشدد فرقہ واریت کے بطن سے ہی فرقہ پروری کا نظریہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح فرقہ پسند لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی فرقہ پرستی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔ وہ اوپر سے بھلے الگ الگ نظر آتی ہو مگر اس کے اندر ایک ہی طرح کا فرقہ وارانہ نظریہ کام کرتا رہتا ہے۔

کسی شخص، جماعت یا تحریک میں فرقہ وارانہ نظریہ پہلے ہی دور سے شروع ہوتا ہے۔ بہت سے قوم پرست حضرات نے فرقہ وارانہ نظریہ کو تسلیم کیا تھا یا اسی کے خطوں پر سوچا تھا جبکہ انھوں نے اس کے دو پہلوؤں کو مسترد کر دیا تھا کہ مذہب پر قائم مختلف فرقوں کے مفادات مطلقاً ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے خود کو خالص نیشنلسٹ پکارنے کے بجائے نیشنلسٹ ہندو، نیشنلسٹ مسلمان اور نیشنلسٹ سکھ ناموں سے موسوم کیا تھا۔

فرقہ واریت کے دوسرے دور کو حریت پسند فرقہ واریت یا دوسرے لفظوں میں معتدل فرقہ واریت کہا جا سکتا ہے۔ حریت پسند فرقہ پرست بنیادی اعتبار سے فرقہ وارانہ سیاست پر یقین اور عمل کرتا تھا، پھر بھی وہ غیر متشدد، جمہوری، انسانی اور نیشنلسٹ قدروں کا پاس ولحاظ رکھتا تھا۔ وہ

یہ مانتا تھا کہ ہندوستان مختلف مذہبی فرقوں کی اساس پر بنا ہے جن کے الگ الگ مخصوص مفادات ہیں اور جن میں کبھی کبھی ٹکراؤ کی نوبت بھی آتی ہے۔ پھر بھی وہ یہ مانتا اور بر سر عام کہتا تھا کہ ان مختلف مذہبی فرقوں کو بتدریج متحد کیا جاسکتا ہے۔ اور قوم کی مشترک دلچسپیوں کی خاطر ان میں مصالحت کرائی جاسکتی ہے، تال میل بٹھایا جاسکتا ہے اور اس طرح ہندوستان کو ایک قوم کی شکل دی جاسکتی ہے۔ 1937 کے پہلے زیادہ تر فرقہ پرست ہندو مہاسبھا، مسلم لیگ، علی برادران، 1925 کے بعد ایم۔ اے۔ جناح، مدن موہن مالویہ، لاجپت رائے اور 1922 کے بعد این۔ سی۔ کیلکر اپنے اپنے حریت پسند مذہبی ڈھانچہ کے تحت کام کرتے تھے۔

تیسرے دور میں پہنچ کر کیونلزم نے انتہا پسند کیونلزم کی شکل اختیار کرلی جس میں فسطائی طاقتیں کارفرما ہوگئیں۔ اس کا انحصار پوری طرح سے خوف ونفرت پر تھا اور جس کے رگ وریشہ میں تشدد داخل تھا۔ سیاسی رقیبوں کو وہ اپنا دشمن مانتا تھا اور ان کے خلاف جنگ وجدل کی بھاشا استعمال کی جاتی تھی اسی دور میں پہنچ کر فرقہ پرستوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان، مسلم کلچر اور اسلام، ہندو، ہندو کلچر اور ہندوازم کا وجود خطرے میں ہے اور اسی دور میں انھوں نے یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ ہندو اور مسلم الگ الگ قومیں ہیں اور ان میں اس قدر ٹکراؤ ہے جس کو کسی بھی طرح حل نہیں کیا جاسکتا۔ 1937 کے بعد مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا اور آر۔ ایس۔ ایس میں متشدد یا فسطائی کیونل ازم کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

اگرچہ فرقہ واریت کے یہ تینوں دور الگ الگ وقت پر واقع ہوئے مگر وہ ایک دوسرے کو متواتر متاثر بھی کرتے رہے اور ان میں ایک طرح کا تسلسل بھی بنا رہا پہلے دور کی فرقہ واریت نے حریت پسند اور انتہا پسند دونوں طرح کی فرقہ واریت کو مضبوط کیا اور ان کے خلاف جدوجہد کرنا دشوار کردیا۔ اسی طرح حریت پسند فرقہ واریت، انتہا پسند فرقہ واریت کی نظریاتی تبدیلی کو روک نہیں سکی۔

فرقہ واریت سے منسلک کچھ اور پہلوؤں پر بھی ہم کو غور کرنا چاہیے۔ جب کوئی کیونسٹ اپنے فرقہ کے مفاد کی بات کرتا تھا یا اس کے دل میں اس کے لیے وفاداری کے جذبات ہوتے تھے یا وہ اس کے مفاد کے تحفظ کے متعلق کچھ کہتا تھا، تو یہ سب چیزیں مذہب کے حدود کے

باہر نہیں ہوتی تھیں۔ سچ تو یہ کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سبھی دوسرے فرقوں کے اقتصادی اور سیاسی مفادات ایک ہی طرح کے تھے اور اس نقطۂ نظر سے ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ملکی اور علاقائی سطح پر سیاسی اور سماجی اعتبار سے الگ الگ طرح کی زندگی کا وجود نہیں تھا۔ علاقائی، لسانی، تمدنی، طبقاتی، ذات پات، سماجی حیثیت، رسم ورواج، کھان پان اور لباس کے لحاظ سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مختلف تھے، مگر انھیں پہلوؤں پر ان کی کثیر تعداد ایک دوسرے کے قریب بھی تھی۔ جہاں تک اونچے طبقہ کے مسلمانوں کا تعلق ہے وہ رہن سہن کے اعتبار سے نیچے طبقہ کے مسلمانوں کی بہ نسبت اونچے طبقہ کے ہندوؤں کے زیادہ قریب تھے۔ اسی طرح تہذیب وتمدن کے زاویہ نگاہ سے ایک پنجابی ہندو کسی بنگالی ہندو کی بہ نسبت پنجابی مسلمان سے زیادہ قریب تھا۔ ٹھیک اسی طرح ایک بنگالی مسلمان، پنجابی مسلمان کے مقابلے بنگالی ہندو سے زیادہ میل کھاتا تھا۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ ہندستانی عوام کی فرقہ وارانہ تقسیم غیر فطری کاوش تھی اور اس کا مقصد لسانی، علاقائی اور سماجی لحاظ سے ہندوستانیوں کی حقیقی تقسیم کو نیز ان کے درمیان ابھر رہے قومی اتحاد کے مستقبل کو تاریک کر دینا تھا۔

اگر فرقہ وارانہ مفاد کا وجود سرے سے نہیں تھا تب تو سماج میں جانب دارانہ، یکطرفہ یا گروہی نظریہ کی بات بھی نہیں تھی بلکہ وہ تو چیزوں کو غلط اور غیر سائنسی انداز میں دیکھنے کی کوشش تھی کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فرقہ پرست آدمی تنگ نظر ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے ہی فرقہ کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن اگر اس طرح کے مفادات نہ ہوں تو وہ پھر اپنے فرقہ یا اپنے ہم مذہب کی بات نہیں کرے گا۔ وہ اپنے نام ونہاد فرقہ کا نمائندہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اپنے فرقہ کے مفاد میں کام کرنے کے نام پر عمداً یا سہواً وہ کسی دوسرے کے مفاد میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یا تو وہ دوسرے کو دھوکا دیتا ہے یا لاعلمی میں خود دھوکے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح فرقہ وارانہ مفروضہ، استدلال اور حل بے بنیاد باتیں تھیں۔ فرقہ پرست جن باتوں کو مسائل کے طور پر پیش کرتے تھے وہ اصل مسائل نہیں تھے اور نہ حل ہی اصل حل تھے جن کو وہ حل کہہ کر پیش کرتے تھے۔ فرقہ پرست نہ صرف غلط حل بتاتا تھا بلکہ غلط سوال بھی اٹھاتا تھا۔

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرقہ واریت تو ماضی سے چلی آرہی ہے۔ یہ ہم کو

ماضی سے وراثتاً ملی ہے یا کم از کم اس کی جڑیں عہد وسطٰی میں جمی تھیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ عہد وسطٰی وقدیم کے نظریات میں فرقہ واریت کا وجود ملتا ہے مگر یہ عہد جدید کا نظریہ اور سیاسی رجحان ہے جو سماج کے توقعات کو ظاہر کرتا ہے اور موجودہ سماج کے طبقوں، جماعتوں، قوتوں کی سیاسی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ سماج میں اس کی جڑوں اور سیاسی اور مالی عزائم کو ہندوستان کی دور جدید کی تاریخ میں ڈھونڈھا جاسکتا ہے۔ موجودہ سماج کے اقتصادی ڈھانچہ نے فرقہ واریت کو نہ صرف جنم دیا بلکہ اس کی پرورش بھی اچھی طرح کی۔

فرقہ واریت کا وجود جدید پالیسیوں کے ظہور کے نتیجے کے طور پر سامنے آیا اور عہد جدید کی سیاست عہد اوائی یا وسطٰی یا قبل از 1857 کی سیاست سے ایک دم مختلف تھی۔ نیشنلزم اور سوشلزم کی طرح کیمونلزم کا ابھار سیاسی نظریہ کی شکل میں تب ہوا جب رائے عامہ کے ذریعہ ہی سیاست میں عوام کی شرکت عمل میں آئی۔ دور جدید کے پہلے سیاست میں اونچے طبقے کا تسلط تھا جس میں عوام کو نظرانداز کیا جاتا تھا۔ اگر عوام بغاوت بھی کرتی تھی تو وہ بھی سیاسی ڈھانچہ کے باہر ہوتی تھی۔ خدانخواستہ اگر وہ اس میں کامیاب بھی ہوجاتی تو اس کے لیڈروں کو حکمراں طبقوں میں شامل کرلیا جاتا۔ سمجھدار ہندستانی اس صورت حال سے اچھی طرح واقف تھا۔ مثلاً 1936 میں جواہر لعل نہرو نے لکھا تھا کہ ''یہ بات ہم کو کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ فرقہ ورایت بعد کے وقتوں کی اپج ہے۔ اس کا جنم ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے 1 یہ بات بھی نہیں ہے کہ فرقہ واریت جیسی چیز کی نشونما صرف ہندوستان میں ہی ہوئی ہو۔ یہ ہندوستان کے خاص تاریخی یا معاشرتی ارتقا کا ضروری نتیجہ بھی نہیں تھا جو ہم کو وراثتاً ملا ہو۔ یہ تو ان حالات کا ماحصل تھا جنھوں نے دوسروں کے سماج میں فرقہ واریت جیسا نظریہ پیدا کیا تھا۔ مثلاً فاشزم، اینٹی سیمٹزم (Anti Semitism) نسل پرستی (Racism) شمالی آئرلینڈ میں کیتھولک پروٹسٹنٹ (Catholic Protestant) اور لبنان میں عیسائی مسلم تصادم۔

ہندستانی سماج پر کلونیل ازم کے تحت جو اثرات مرتب ہوئے اور ان کے تحت سماج میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں نیز ان کے خلاف لوگوں نے جو کاوشیں کیں، انھیں سب کی وجہ سے لوگوں میں فرقہ وارانہ ذہنیت کا جنم ہوا۔ ملک اور ملک کے مختلف علاقوں کو اقتصادی، سیاسی اور

انتظامی اعتبار سے متحد کر کے ایک قوم بنانے کا رجحان تیزی سے بڑھنے لگا جس کی وجہ سے کالونیائی حکومت اور ہندوستانیوں کے مفاد میں زبردست ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ جدید سماج میں مختلف طبقے اور ان کے ذیلی طبقے بن گئے اور ان سب کو اپنے مفاد کی تسکین کے لیے سبیل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہی وہ حالات تھے جن کے تحت لوگوں نے اپنی شناخت بنانے کے لیے وسیع تر تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ انیسویں صدی کے آخری نصف زمانہ میں جو نئی سیاست پیدا ہوئی اس کی وجہ سے اس طرح کے نظریات وجود میں آئے۔ جدید سیاست کا مقصد ہی ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری پیدا کر کے ان کو متحرک کرنا تھا۔

نئی ابھر رہی سیاسی حقیقت اور معاشرتی تعلقات کو سمجھنا اور نئے نظریات وافکار کی مدد سے متحد کرنے کے نئے اصولوں، نئی سماجی اور سیاسی شناختوں کو اپنانا بہر حال ایک مشکل عمل تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ قومیت سے جدید تصورات، لسانی اور تمدنی ترقی اور طبقاتی کشمکش کا دور دورہ ہو۔ اس لیے جہاں بھی ان تصورات کی ترقی سُست رفتاری سے ہوئی یا جزوی ہوئی، وہاں لوگوں نے لازمی طور سے نئی حقیقتوں کو جذب کرنے، تعلقات کا وسیع دائرہ بنانے، نئی شناخت اور نئے فکر کو فروغ دینے کے لیے نسل وذات، علاقہ وفرقہ، مذہب وپیشہ جیسے پرانے اور معروف طریقوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس طرح کے حالات میں ساری دنیا میں اسی طرح کے واقعات پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا دیکھا جاتا ہے کہ ان فرسودہ اور باطل نظریات کی جگہ تاریخی لحاظ سے قوم وقومیت اور طبقہ جیسی نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور نئے نظریات جنم لیتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی بڑے پیانہ پر یہی واقع ہوا حالانکہ ملک کے سبھی لوگوں میں ایک جیسے حالات نہیں رونما ہوئے۔ البتہ کچھ خاص جگہوں پر اور لوگوں کے خاص طبقوں میں مذہبی بیداری نے فرقہ وارانہ بیداری کا روپ دھارن کیا جس کے پیچھے ملک کے کچھ ایسے حالات تھے جنھوں نے فرقہ واریت کو ہوا دی۔ اس سے سماج کے کچھ حصوں کی ضرورت پوری ہوتی تھی اور کچھ سماجی اور سیاسی طاقتوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ بیسویں صدی میں فرقہ واریت کی نشو نما کیوں ہوئی اور وہ کون سے پہلو تھے جنھوں نے اس عمل کو تیز کیا اور کیسے یہ ہندوستان کے رگ وریشہ میں پیوست ہو کر اس کی حقیقت کا حصہ بن گئی جبکہ فرقہ واریت نہ تو ہندوستان کو وراثتاً ملی تھی

اور نہ اس کی نشو نما ناگزیر ہی تھی اور یہ بھی نہیں تھا کہ یہ اقتدار کے بھوکے سیاست داں لوگوں کی سازش اور جعل ساز حکمراں کی مکاری کا نتیجہ رہی ہو۔ دراصل اس کی جڑیں ملک کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات میں جمی تھیں۔ پورا سماجی ڈھانچہ ہی ایسا تھا جو اس کے لیے زمین تیار کر رہا تھا۔ اس کے فقدان میں یہ لمبے عرصے تک ٹک ہی نہیں سکتی تھی۔

فرقہ واریت کو ہندستانی اقتصادیات کے کلونیل کردار، اس کے پچھڑے پن اور ملک کی مالی حالت سدھارنے میں اس کے ناکارہ پن سے تقویت ملی۔ لوگوں کی مالی ترقی رک سی گئی خصوصاً متوسط طبقہ کے لوگوں کی زندگی پر جو اثر پڑا اس کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہوئے جو ہندستانی سماج کو بانٹنے، اس کے اندر نفاق پیدا کرنے اور اس کی پوری طرح کایا پلٹنے میں مددگار ثابت ہوئے۔

بیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں نہ تو صنعت وحرفت میں ترقی ہوئی اور نہ تعلیم، صحت اور دوسرے رفاحی کاموں کے میدان میں کچھ کیا گیا۔ بے روزگاری لوگوں کے سامنے اہم اور سنگین مسئلہ تھا، خصوصاً تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے لوگ جن کو کھیتی کا سہارا میسر نہیں تھا ان کی معاشرتی حالت متواتر گرتی جارہی تھی۔ 1928 کے بعد دنیا بھر میں چھائی مندی کے دوران مالی وسائل اور بھی تنگ ہو گئے تھے جس کے نتیجہ میں لوگوں کی کثیر تعداد بے روزگاری کا شکار تھی۔

سماج کے ایسے حالات میں قومی تحریک کے علاوہ دوسری اور عوامی تحریکیں انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے، معاشرہ میں انقلابی تبدیلی لانے اور زندگی کے عام مسائل کو حل کرنے کے لیے لمبی لڑائی لڑ رہی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ متوسط طبقہ 1905 سے 1947 تک جانباز قومی تحریک کا اور 1920 کے بعد بائیں بازو پارٹیوں اور جماعتوں کا خاص اساس تھا۔ ہاں جن لوگوں میں دوراندیشی اور سیاسی شعور کی کمی تھی وہ بروقت اپنے ذاتی مسائل کے حل میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اپنے فرقہ وذات کے لیے نوکریوں میں اور علاقائی طور پر میونسپل کمیٹیوں، اسمبلیوں وغیرہ میں رزرویشن کے علمبردار تھے۔

مالی جمود کی وجہ سے پورے ملک میں سرکاری نوکریوں، وکالت اور ڈاکٹری جیسے

پیشوں اور دھندوں میں بڑا کمپٹیشن تھا۔ جو بھی تھوڑے بہت مالی مواقع موجود تھے ان کو حاصل کرنے کی غرض سے متوسط طبقہ کے لوگ اپنی تعلیمی لیاقت، انفرادی صلاحیت، کنبہ پروری اور رشوت کا سہارا لے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ذات برادری، مذہب اور صوبہ نوازی کے جذبات ان کے لیے بے حد مددگار ثابت ہوئے۔ یہی وہ حالات تھے جن میں متوسط طبقہ کے لوگوں کو فرقہ واریت سے بڑی مدد ملی۔ سرکاری نوکریاں حاصل کرنے میں اس طبقہ نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ فرقہ وارانہ سیاست کو ایک طرح سے جائز اور صحیح ٹھہرالیا گیا اور فرقہ پرست شخص حقیقت کے اپنے تجزیہ کو متوسط طبقہ پر اس لیے تھوپ سکا کیونکہ ہندستانی معاشرہ میں اس طرح کے گمراہ کن عناصر کم وبیش پہلے سے موجود تھے۔

دھیرے دھیرے کھاتے پیتے خوشحال کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کے حلقہ میں تعلیم کی اشاعت ہوئی، جس کے نتیجہ میں دیہات کے متوسط طبقہ میں نوکری تلاش کرنے والے نوجوانوں کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ انگریزوں کے مالی سسٹم کے تحت کھیتی کی ترقی تھم سی گئی تھی۔ اس لیے گاؤں کے نئے تعلیم یافتہ نوجوان چاہے وہ کسان ہوں یا زمیندار، کے لیے روزگار کے مواقع وہاں تنگ ہوگئے تھے۔ ایسی صورت میں وہ قصبوں اور شہروں کی طرف روزگار کی تلاش میں بھاگنے اور فرقہ وارانہ رزرویشن اور نامینیشن کے ذریعہ فوری طور سے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس سے فرقہ واریت کا دائرہ رفتہ رفتہ بڑھا اور اس نے گاؤں کے کسانوں اور زمینداروں کے اونچے طبقوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

اس طرح انگریزوں کے مالی بحران سے متوسط طبقہ میں مستقل دو متضاد نظریے اور سیاسی رجحانات پیدا ہوئے۔ جب سلطنت مخالف تحریک اور سماجی انقلاب کا ایجنڈا منظر عام پر آتا، تب متوسط طبقہ کے لوگ بہت جوش وخروش سے قومی تحریک اور دوسری عام تحریکوں میں حصہ لیتے۔ اسی دور میں ان کے ذریعہ پورے سماج، سرمایہ داروں سے لے کر کسان اور مزدور تک کے مطالبات کو پورا کرنے کی وکالت کی جاتی اور سماج کی بھلائی کا عام نظریہ انفرادی خواہشات پر حاوی ہو جاتا۔ لیکن جب تبدیلی کے امکانات دھندلے پڑنے لگتے تب سلطنت مخالف جدوجہد میں سستی آجاتی اور اس وقت متوسط طبقہ کے بہت سے لوگ ذاتی مسائل جو قلیل مدتی ہوتے تھے

کے حل کے لیے فرقہ وارانہ سیاست اور پارٹیوں کی طرف رخ کرتے تھے۔ اس طرح متوسط طبقہ کا بڑا حصہ ملک کے مختلف علاقوں میں کچھ دنوں تک انھیں دونوں رجحانوں کے درمیان پانسہ بدلتا رہتا۔ پہلے دور میں اس کے اپنے سماجی مسائل قومی مسائل سے منسلک ہو جاتے اور دوسرے دور میں اس کی تنگ نظری اور خود غرضی بری طرح حاوی ہو جاتی، تب وہ سماجی اور سیاسی حالت کو جیوں کا تیوں تسلیم کر کے حکومت کا مددگار بن جاتا تھا۔

بہر حال اس پہلو کا خلاصہ یہ ہے کہ تنگ ہو رہے مالی وسائل کے اس دور میں فرقہ واریت کی جڑیں متوسط طبقہ میں بہت گہری جم گئی تھیں اور انھیں کے ذریعہ اس طبقہ نے اپنے مفاد کے حصول کی کوشش کی۔ اس لیے فرقہ واریت کا مسئلہ ہر اعتبار سے متوسط طبقہ کا ہی مسئلہ تھا۔ فرقہ واریت اس طبقہ کو بہت راس آتی تھی اور یہی طبقہ اس کی سماجی اساس تھا۔ اس سلسلہ میں ہم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ متوسط طبقہ کے بہت سے لوگ 1930 سے 1940 کے دوران غیر متعصبانہ سوچ کے حامل تھے، خصوصاً دانشور طبقہ چاہے وہ ہندو رہا ہو یا مسلمان یا سکھ۔ سچ تو یہ ہے کہ 1930 کی دہائی میں مخصوص ہندستانی دانشوروں کا جھکاؤ سیکولرازم (Secularism) اور بائیں بازو کی طرف ہو گیا تھا۔

کلونیل مالیات کا دوسرا پہلو بھی تھا جس نے فرقہ واریت کو ہوا دی۔ کارخانہ کاری صنعت وحرفت، تعلیم وتہذیب، آرٹ وکلچر، تفریح اور سول سرویسز کے میدان میں نئے مواقع نہیں پیدا ہو رہے تھے اور متوسط طبقہ کو روزگار کے لیے سرکاری نوکریوں کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ ٹیچروں، ڈاکٹروں، اور انجینئروں کی نوکریاں سرکاری کنٹرول میں تھیں۔ 1951 تک بارہ لاکھ لوگ فیکٹری ایکٹ (Factory Act) کے تحت کارخانوں میں لگے تھے جبکہ سرکاری نوکریوں میں لگے لوگوں کی تعداد تینتیس لاکھ تھی۔ ایسی حالت میں فرقہ وارانہ سیاست کا استعمال سرکار پر دباؤ ڈالنے کے لیے کیا جا سکتا تھا کہ وہ پیشہ وارانہ کالجوں (Professional Colleges) اور نوکریوں میں فرقہ وذات برادری کے لحاظ سے سیٹیں محفوظ کرے۔ یہی وجہ تھی کہ 1937 تک فرقہ وارانہ سیاست سرکاری نوکریوں، تعلیمی رعایتوں اور سیاسی عہدوں مثلاً اسمبلیوں ومیونسپل بورڈوں کے سیٹ بٹواروں اور دیگر نفع بخش کاموں کے گرد منڈلاتی رہی۔ یہ

بھی غور طلب ہے کہ فرقہ پرست یوں تو اپنے اپنے نام ونہاد فرقوں کے مفاد کا دم بھرتے تھے مگر وہ جن سہولتوں کی بات کرتے تھے وہ ریزرویشن گارنٹی اور دوسرے حقوق تھے۔ ان کے مطالبے انھیں دو باتوں تک محدود تھے۔ انھوں نے کسی ایسے مطالبہ کے لیے آواز نہیں اٹھائی جس کا تعلق عام لوگوں کی بھلائی سے رہا ہو۔

ایک دوسرے معاملہ میں بھی فرقہ واریت اپنا زہر پھیلاتی تھی۔ دو متضاد مذہب کے ماننے والے مالک ومزدور کے درمیان پیدا ہوئے ٹکراؤ کو فرقہ پرست توڑ مروڑ کر فرقہ وارانہ فساد کا روپ دے دیتے تھے جبکہ اس طرح کی بے اطمینانی اور ٹکراؤ کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ استحصال کرنے اور سہنے والوں کے درمیان تصادم ہونا فطری اور عام بات تھی، مگر چونکہ عوام میں سیاسی شعور نہیں تھا اس لیے اس پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھ جاتا تھا۔ سی۔ جی۔ شاہ نے لکھا ہے کہ ''فرقہ وارانہ پروپگنڈہ کے زیر اثر آ کر لوگ جبر وظلم اور استحصال وستم کے اسباب کی صحیح نشاندہی نہیں کر پاتے تھے اور من گھڑت فرقہ واریت کو ان سب کا سرچشمہ مانتے تھے''۔ 2

ان فرقہ وارانہ باتوں کے پیچھے ہندستانی سماج کی ترقی کرتی ہوئی خاص شکل محرک کا کام کر رہی تھی اور انھیں باتوں نے بعد میں ذات برادری کے مسائل کا روپ دھارن کر لیا تھا۔ ملک کے کئی حصوں میں مذہبی تقسیم، سماجی اور طبقاتی تقسیموں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ان میں زیادہ تر حصوں میں استحصال کرنے والے طبقے زمیندار، تاجر اور مہاجن اونچی ذات کے ہندو تھے جبکہ استحصال کے شکار زیادہ مسلمان یا نیچی ذات کے ہندو تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان فرقہ پرست یہ پروپگنڈہ کرتے تھے کہ ہندو مسلمانوں کا استحصال کر رہے ہیں یا جب ہندو فرقہ پرست یہ پروپگنڈہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کی وجہ سے ہندوؤں کی جائدادیں اور مالی مفادات خطرے میں ہیں، تو یہ بے بنیاد پروپگنڈے اپنا رنگ دکھاتے تھے، مثلاً بنگال اور ملابار میں کاشتکاروں اور زمینداروں کے درمیان اور پنجاب میں قرضداروں اور تاجر ساہوکاروں کے درمیان ہوئے کشمکش کو فرقہ پرستوں کے ذریعہ ہندو مسلم کشمکش کی شکل میں پیش کیا جاسکا۔ اسی طرح زمیندار ساہوکار کے جبر کو ہندوؤں کے ذریعہ مسلمانوں پر ستم کرنا بتایا گیا اور گاؤں کے امیر لوگوں پر غریبوں کے حملے کو ہندوؤں پر مسلمانوں کا ظلم ڈھانا کہا گیا۔ پنجاب میں فرقہ واریت کا ایک پہلو

یہ بھی تھا کہ بڑے مسلم زمینداروں نے اپنے سماجی اور مالی حیثیت کے تحفظ کے لیے اپنے مسلمان کاشتکار اسامیوں کا غصہ ہندو تاجروں اور ساہوکاروں کی طرف موڑ دیا۔ اب ہندو فرقہ پرستوں نے کہنا شروع کیا کہ ہندو خطرے میں ہیں۔ درحقیقت کسانوں کو اپنی آزادی اور مکتی کے لیے لڑنا ہی تھا۔ بس سوال یہ تھا کہ وہ کس نظریہ یا سیاست کے تحت لڑیں۔ فرقہ پرست اور انگریز حکمراں دونوں ایسے کشمکش کے طبقاتی پہلوؤں کے بجائے فرقہ وارانہ پہلوؤں پر زور دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمان کسان اور قرض دار مظلوم تھے اور وہ استحصال کا شکار تھے اور ایسا کسان یا قرض دار ہونے کے ناتے نہیں تھا بلکہ مسلمان ہونے کے ناتے ان پر ظلم ہو رہا تھا۔

عام طور سے کئی معاملوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ سماجی کشمکش میں شرکت کرنے والے لوگ کشمکش کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دیتے ہیں، مگر ناظرین سرکاری افسران، صحافی، سیاستداں اور یہاں تک کہ مورخین بہت پہلے ہوئے واقعہ پر بعد میں اپنے چشمہ سے دیکھ کر جان بوجھ کر یا بھولے سے فرقہ وارانہ رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے زراعت کے میدان میں ہوئے ٹکراؤ کا رنگ فرقہ وارانہ نہیں تھا اور اس کے بعد کے بھی زیادہ تر تصادم غیر فرقہ وارانہ تھے۔ 1873 کے پابنا (Pabna) بغاوت میں ہندو اور مسلم دونوں نے مل کر زمینداروں کے خلاف جنگ کی تھی، اور جیسا گذشتہ ابواب میں لکھا جا چکا ہے کہ 1919 کے بعد کی ساری کسان تحریکیں غیر فرقہ وارانہ تھیں۔ کسان مزدور اور انقلاب پسند دانشوروں نے سلطنت مخالف ایسی تنظیمیں بنائیں اور تحریکیں چلائیں جن کا کردار مکمل طور سے سیکولر تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بنگال میں زمینوں پر ہندو زمینداروں کا قبضہ ہو گیا تھا اور یہ اس لیے نہیں ہوا تھا کہ وہ ہندو تھے بلکہ یہ کیفیت تاریخی عمل کے تحت پیدا ہوئی تھی۔ چونکہ ہندوؤں کے نیچے طبقے اور نیچی ذاتیوں کے لوگ اسلام کے آغوش میں آ گئے تھے، اس لیے زمینوں پر ہندو زمیندار قابض ہو گئے تھے۔ وہاں زمینوں پر ہندو زمینداروں اور مالیات پر ہندو ساہوکاروں کا تسلط، اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں، اورنگ زیب کے خاص وفادار مرشد قلی خان کے زمانہ حکمرانی میں قائم ہوا تھا۔ اس کے دور میں 75 فیصد زمیندار اور تعلقدار ہندو

تھے۔ 1793 کے مستقل بندوبست نے زیادہ تر پرانے ہندو و مسلم زمینداروں کو ہٹا کر اور ان کی جگہ زردار طبقہ کو جما کر جس میں بیشتر ہندو ہی تھے اس عمل کو اور مضبوط کیا۔ اس طرح شمالی ہندوستان میں بینک مالکوں، تاجروں اور ساہوکاروں میں زمانہ وسطیٰ سے ہی ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ برٹش حکومت کے دوران دیہی ساج پر ان کا اقتدار ہندو ہونے کے ناتے نہیں بلکہ اس ناتے قائم ہوا تھا کہ استحصال کرنے والی برٹش حکومت میں زرداروں کا کردار بہت اہم تھا۔ دوسرے لفظوں میں انگریزی حکومت نے تاجروں اور ساہوکاروں کے غلبہ کو مستحکم اور مضبوط کرنے کی وہی گارنٹی دے رکھی تھی جیسی عہد وسطیٰ میں ان کو حاصل تھی۔

دولت، اقتدار اور مالی مراعات حاصل کرنے کی غرض سے دو طبقوں کے درمیان ہوئی کشاکش کی وجہ سے فرقہ واریت کا ظہور ہوا تھا۔ چونکہ یہ دونوں طبقے الگ الگ مذہب اور ذات کے تھے۔ اس لیے اپنے ہی ہم مذہب اور ذات کے لوگوں کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے ان کو فرقہ واریت کی لائن پر متحد اور متحرک کیا۔ اسی مقصد کے تحت مغربی پنجاب کے مسلم زمینداروں نے ہندو ساہوکاروں کی اور مشرقی بنگال کے مسلم جوت داروں (چھوٹے زمینداروں) نے ہندو زمینداروں کی مخالفت کی۔

مالی اور سیاسی نقطہ نظر سے فرقہ واریت کا ارتقا معاشرتی طبقوں اور سیاسی طاقتوں یعنی زمیندار جو نیم جاگیردار تھے سابق نوکرشاہوں (جن کو کے۔ ایم۔ اشرف نے جاگیردار طبقہ بتایا ہے)[3] ان کے ردعمل میں تاجروں، ساہوکاروں اور انگریزی حکومت کے ہتھیار کے طور پر ہوئی تھی۔ فرقہ پرست لیڈروں اور پارٹیوں کے مراسم عام طور سے ان طاقتوں اور طبقوں سے اچھے خاصے تھے۔ چونکہ فرقہ واریت میں یہ گنجائش تھی کہ عوامی جدوجہد کو گمراہ کر دے، اس کی معاشرتی، مالی اور سیاسی طاقتوں میں صحیح سوجھ بوجھ جس کی کمی ان کی گراوٹ کی اصل وجہ تھی نہ پنپنے دے، لوگوں کو قومی اور طبقاتی سطح پر متحد ہونے میں مخل ہو اور معاشرتی و مالی مفادات کے تحت ہونے والی عوامی تحریکوں کو بھٹکا دے، اس لیے معاشرتی، مالی اور سیاسی نقطہ نظر نے ان کی پوشیدہ دلچسپیوں نے سوچ سمجھ کر اس کی حوصلہ افزائی کی اور غیر شعوری طور سے اس کو تسلیم کر لیا۔ فرقہ واریت نے اونچے طبقوں اور انگریز حکمرانوں کو اس لائق بنایا کہ وہ متوسط طبقہ کے لوگوں کی متحدہ قوت کو استعمال کر کے اپنا الو سیدھا کر لے۔

جدید ہندوستان میں فرقہ واریت کی ترقی کے لیے برٹش حکومت اور اس کی پالیسی پھوٹ ڈالو اور راج کرو، خاص طور سے ذمہ دار ہے، حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ ملک میں موجودہ معاشرتی اور سیاسی حالات کی وجہ سے ہی اس کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو سکی۔ بات دراصل یہ تھی کہ حکومت کے پاس جتنی بھی طاقت تھی، اس کا استعمال یا تو وہ قومی اتحاد بڑھانے یا پھر لوگوں میں ہر طرح کی تفریق پیدا کرنے والی طاقتوں کو شہ دینے میں کر سکتی تھی۔ انگریزی حکومت نے پھوٹ ڈالنے کا راستہ اپنایا۔ اس نے فرقہ واریت کا استعمال قومی تحریک کے پھیلاؤ کو روکنے، اس کو کمزور کرنے اور ہندستانی عوام کو قوم کی شکل میں نہ ابھرنے دینے کے لیے کیا۔ حکومت نے ایسا کرنے کے لیے بہانا یہ بنایا کہ اقلیت کے تحفظ کے لیے فرقہ وارانہ تفریق ضروری ہے۔ اس نے یہ تاثر دیا کہ اکثریت کے تسلط اور اس کی زیادتی سے اقلیت کو بچانے کے لیے انگریزی حکومت کا بنا رہنا بے حد ضروری ہے، خصوصاً اس وقت جب محکوم کو متمدن بنانے اور اس کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی ذمہ داری گوروں کے لیے ناپسندیدہ ہو گئی تھی۔

لیکن پھوٹ ڈالو اور راج کرو، پالیسی صرف فرقہ ورایت کو پیدا کرنے میں ہی کارگر نہیں ہوئی بلکہ اس وقت ہندستانی سماج میں جو بھی تفریق پائی جاتی تھی اس کو اس لیے ہوا دی گئی تا کہ قومی یکجہتی کے ابھار کو روکا جا سکے۔ ایک علاقہ کو دوسرے علاقہ کے خلاف، ایک صوبہ کو دوسرے صوبے کے خلاف، ایک ذات کو دوسری ذات کے خلاف، دائیں بازو کو بائیں بازو کے خلاف اور یہاں تک کہ ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف بھڑا دینے کی پوری کوشش کی گئی۔ دراصل وہ فرقہ وارانہ تفریق ہی تھی جو آخر تک بنی رہی اور وہی انگریزی حکومت کا سب سے کارگر حربہ ثابت ہوا اور اسی پر انگریز حکمرانوں نے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا۔ ہاں، اگر فرقہ واریت کو حکومت سے اس حد تک سہارا نہ ملا ہوتا تو ملک دو حصوں میں تقسیم نہ ہوا ہوتا۔ اس معنی میں فرقہ واریت ایسا واسطہ تھا جس کے ذریعہ سماج کے متوسط طبقہ کو حکومت اور جاگیرداروں کی خدمت میں لگا دیا گیا۔ دراصل فرقہ واریت ہی وہ راستہ تھا جس کے ذریعہ حکومت کو اپنے اثرات کسان مزدوروں، متوسط طبقوں اور بورژوا (Bourgeoisie) حلقوں تک بڑھانے میں کامیابی ملی جبکہ ان سب کے مفادات حکومت سے بری طرح ٹکراتے تھے۔

اب اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ وہ کون سی باتیں، پالیسیاں اور غلطیاں تھیں جن کے

ذریعہ انگریزوں نے فرقہ واریت کو پالا پوسا۔ اول اس نے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں کو پرزور طریقہ سے الگ الگ ایسے فرقوں کا درجہ دیا جن کی معاشرتی اور سیاسی شناخت میں بہت معمولی اشتراک تھا۔ یہ کہا گیا کہ ہندوستان نہ ایک قوم ہے اور نہ قوم بننے کے مرحلہ میں ہے اور نہ ہی مختلف قوموں اور مقامی سوسائٹیوں کا مرکب ہے۔ اس کی تخلیق تو مذہب کی بنیاد پر ایسے متضاد فرقوں سے ہوئی ہے جن کے مفادات آپس میں ٹکراتے ہیں۔ دوم فرقہ پرستوں کو سرکاری مراعات اور سرپرستی عنایت کی گئی۔ سوم فرقہ پرست اشخاص، پریس اور تحریکوں کے تئیں غیر معمولی رواداری دکھائی جاتی تھی۔ چہارم فرقہ وارانہ مطالبات فی الفور منظور کر لیے جاتے تھے اور اس طرح فرقہ وارانہ تنظیموں کو سیاسی استحکام دیا جاتا تھا۔ مثلاً 1885 اور 1905 کے دوران کانگریس حکومت سے اپنا کوئی بھی مطالبہ نہ منظور کرا سکی جبکہ 1906 میں وائسرائے نے مسلم لیگ کے سارے فرقہ وارانہ مطالبے منظور کر لیے۔ اسی طرح 1932 میں انگریزوں نے کیمونل اوارڈ (Communal Award) (یعنی فرقہ وارانہ مسائل کا تصفیہ) کے ذریعہ اس وقت کے تمام تر فرقہ وارانہ مطالبات منظور کر لیے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مسلم فرقہ پرستوں کو پورا حق دیا گیا کہ اپنی سیاسی زمین ہموار کرلیں۔ پانچویں یہ کہ انگریزی سرکار فرقہ پرست تنظیموں اور ان کے لیڈروں کو اپنے اپنے فرقوں کا مبلغ (Spokesmen) تسلیم کر لیتی تھی جبکہ قوم پرست لیڈروں کو بڑے لوگوں کی چھوٹی اقلیت کا نمائندہ مانا جاتا تھا۔ چھٹی بات یہ کہ فرقہ وارانہ بنیاد پر بنائے گئے انتخابی حلقوں نے فرقہ وارانہ سیاست کو بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ آخری بات یہ کہ فرقہ واریت کی ترقی کو روکنے کے لیے حکومت کی طرف سے کچھ مثبت اقدامات کیے جا سکتے تھے مگر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر کے اس نے فرقہ پرستی کی بلاواسطہ حوصلہ افزائی کی۔ اس نے ان اخباروں، پرچوں، میگزینوں اور افواہوں پر کوئی بندش نہیں لگائی جو فرقہ واریت کا زہر پھیلانے میں پیش پیش تھے۔ اس کے برعکس قومی پریس اور لٹریچر کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ فرقہ پرست لیڈروں، علم داں وسرکاری نوکر پیشہ لوگوں کو بالترتیب خطابوں، نفع بخش عہدوں اور اونچی تنخواہوں سے نوازا گیا۔ فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے کے لیے حکومت نے نسبتاً لاپروائی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ ان کو کچلنے کے لیے چستی پھرتی اور سختی نہیں برتی جاتی تھی۔ عوام کی قومی اور دوسری احتجاجی تحریکوں کو روکنے کے لیے جو احتیاطی اقدامات کیے جاتے تھے وہ فرقہ وارانہ

فسادات کو روکنے کے لیے نہیں کیے جاتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ جب انگریزی حکومت اس طرح فرقہ واریت کی حوصلہ افزائی کرتی تھی، تو پھر اس کے قیام تک اس مسئلہ کا حل اور خاتمہ کسی طرح ممکن و آسان نہیں تھا۔ ہاں، اس کے خاتمہ کے لیے انگریزی حکومت کا خاتمہ تو ضروری تھا مگر فرقہ واریت کے خلاف کامیاب جدوجہد کرنے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہمارے یہاں جو قومی نظریہ تھا اور اس کے تحت جو پرچار کیا گیا، اس کے بڑے حصہ میں ہندو وادی عنصر موجود تھا اور اس نے بھی فرقہ واریت کی وبا کو پھیلانے میں مدد کی۔

بہت سے انتہا پسند لیڈروں نے قومی نظریہ اور پروپگنڈہ میں ہندو مذہب کے کچھ اجزا شامل کر لیے۔ انھوں نے عہد وسطیٰ میں ہوئی تہذیب و تمدن کی ترقی کو نظر انداز کر کے صرف ہندوستان کی قدیمی تہذیب و تمدن کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ ہندستانی قومیت کو ہندو وادی رنگ دینے کی کوشش کرتے تھے یا کم از کم روزمرہ کی سیاسی تحریکوں میں ہندو محاوروں کا استعمال کرتے تھے۔ اگر تلک نے قومیت کا پرچار کرنے کے لیے گنیش پوجا اور شواجی جینتی کا سہارا لیا تو بنگ بھنگ کے خلاف تحریک کی شروعات گنگا میں ڈبکی لگا کر کی گئی..... اس سے بھی بڑھ کر بات یہ تھی کہ بنکم چندر چٹرجی اور دوسرے بنگلا، ہندی، اردو اور دوسری زبانوں کے بہت سے ادیبوں نے اپنے افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور نظموں میں مسلمان کو بدیسیوں کی حیثیت سے پیش کیا اور قومیت کو صرف ہندوئیت سے جوڑ کر دیکھا۔ مسلم بادشاہوں اور حکمرانوں کو ظالم و جابر لکھنے والا یہ ادب، تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے اطمینانی پیدا کرتا تھا اور ان کو قومی تحریک سے منحرف کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندو علامت، محاوروں اور دیومالاؤں کا استعمال قومی تحریک پر ہندو وادی رنگ ظاہر کرتا تھا۔

بیشک کل ملا کر قومی تحریک کا نظریہ اور رویہ بنیادی اعتبار سے سیکولر بنا رہا اور اس لیے محمد علی جناح اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نوجوان نیشنلسٹوں کو اس میں شرکت کرنے میں کوئی کھٹکا نہیں ہوا۔ گاندھی جی، چترنجن داس، موتی لعل نہرو، جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد، ایم۔ اے۔ انصاری، سبھاس چندر بوس، سردار پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے لیڈروں کی قیادت میں پہنچ کر اس کا سیکولرازم اور مستحکم ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا ہندو عنصر فرقہ واریت کے ابھار کا سبب اس قدر نہیں تھا جتنا اس

کی ترقی کو روکنے میں نیشنلسٹوں کی ناکامی تھی۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو قومی تحریک میں لانا تھوڑا مشکل سا ہو گیا۔ حکومت اور فرقہ پرست مسلمانوں نے ایسی ہندو ذہنیت کا ہوّا کھڑا کر کے مسلمانوں کی کثیر تعداد کو قومی تحریک سے دور رکھنے میں اور ان کے دلوں میں شک پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی کہ اگر قومی تحریک کامیاب ہو گئی تو ہندوستان ہندو راج ہو جائے گا۔

اسی ہندو رنگ نے قومی خیمہ میں ہندو وادی نظریہ کو جنم دیا، پھر تو قومی تحریک کے لیے دشوار ہو گیا کہ وہ اپنی صف سے فرقہ وارانہ سیاست اور نظریہ نکال سکے اور اسی رنگ نے مسلم نیشنلسٹوں پر بھی فرقہ وارانہ رنگ چڑھا دیا۔

ہندوستان کی تاریخ خصوصاً زمانہ قدیم اور وسطیٰ کا تجزیہ غیر سائنسی اور فرقہ وارانہ خطوط پر توڑ مروڑ کر کیا گیا۔ فرقہ وارانہ سوچ کے پھیلنے کا یہی بڑا سبب اور فرقہ وارانہ نظریہ کا یہی بنیادی پہلو تھا۔ اسکول اور کالجوں میں ہندوستانی تاریخ بنیادی طور سے فرقہ وارانہ لائنوں پر پڑھائی جا رہی تھی۔ اس رویہ نے فرقہ واریت کو ابھرنے اور بڑھنے میں بڑی مدد کی۔ پشت در پشت سے اور قریب قریب جدید اسکولی سسٹم کی ابتدا سے ہندستانی تاریخ کے مواد کو پہلے تو انگریز اور بعد میں دوسرے مورخین کے ذریعہ مختلف درجوں میں پڑھانے کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ ان مورخین کی تحریروں کا وسیع پیمانہ پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ کٹر سے کٹر قوم پرست حضرات نے بھی غیر شعوری طور سے ہی سہی ان کی کچھ باتوں کو جیوں کا تیوں تسلیم کر لیا۔ اس وقت کے اہل نظر لوگوں کو اس کیفیت کا پورا احساس تھا مثلاً گاندھی جی نے خود لکھا تھا کہ ''ہمارے ملک میں مذہبی رواداری اس وقت تک مستقل طور سے قائم نہیں کی جا سکتی جب تک ہمارے اسکول اور کالجوں کی درسی کتابوں میں غلط سلط باتیں پڑھائی جاتی رہیں گی''[4] ان درسی کتابوں کے علاوہ فرقہ واریت کا زہر نظموں، ڈراموں، تاریخی ناولوں، افسانوں، اخباروں، مقبول عام میگزینوں، پمفلٹوں، تقریروں، کلاسوں، گھریلو چرچاؤں اور نجی گفتگوؤں کے ذریعہ پھیلایا جا رہا تھا۔

ملک کی تاریخ کو فرقہ واریت کا رنگ دینے کی شروعات سب سے پہلے انیسویں صدی میں ہوئی۔ انگریز مورخ جیمس مل (James Mill) نے زمانہ قدیم کو ہندو عہد اور زمانہ وسطیٰ کو مسلم عہد کے نام سے موسوم کیا[5] (اس لحاظ سے دور جدید کو عیسائی عہد کہنا چاہیے تھا) اس کے علاوہ دوسرے انگریز اور ہندستانی مورخین نے بھی اس معاملہ میں اس کی تقلید کی۔ اگرچہ عہد

وسطیٰ میں مسلم عوام اتنی ہی غریب، دبی کچلی اور مظلوم تھی جتنی ہندو عوام نیز زمینداروں جاگیرداروں اور حکمرانوں میں ہندو مسلم دونوں تھے پھر بھی ان مورخوں نے یہی تاثر دیا کہ اس دور میں سبھی مسلمان حاکم اور سبھی ہندو محکوم تھے۔ اس طرح ملک میں طرز حکومت کی شناخت حکمراں کے مذہب سے کی گئی۔ بعد میں مختلف دور کے کلچر اور سماج کو ہندو یا مسلم کلچر کے نام سے جانا جانے لگا۔

ہندو فرقہ پرستوں نے انگریزوں کے نفرت بھرے اس نظریہ کو فوراً تسلیم کر لیا کہ عہد وسطیٰ کے مسلم حکمراں ہندو مخالف تھے، وہ ہندوؤں پر ظلم ڈھاتے تھے اور ان کو زبردستی مسلمان بناتے تھے۔ سبھی فرقہ پرست مورخین نے انگریز مورخین کی ہاں میں ہاں ملا کر عہد وسطیٰ کی تاریخ کو ہندو مسلم تنازعہ کا طویل دور قرار دیا اور یہ عقیدہ قائم کیا کہ اس پورے دور میں ہندو مسلم کلچر صاف طور سے الگ الگ وجود میں بنے رہے۔ اس دور کے مسلم حکمرانوں کو ان کے مذہب کی بنا پر بدیسی بھی کہا گیا۔ جنگ آزادی کے دنوں میں ہزاروں سال کی غلامی اور ''بدیسی حکومت'' جیسے محاورے عام لوگوں کی زبان پر تھے اور ان محاوروں کا استعمال بھی قوم پرستوں کے ذریعہ بھی کیا جاتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندو وادی نظریہ اس مفروضہ پر بے انتہا زور دیتا تھا کہ عہد قدیم میں ہندو سماج ترقی کی بلندیوں پر تھا اور عہد وسطیٰ میں ہندو سماج مسلم اقتدار کے دور میں لگاتار زوال پذیر ہوتا گیا۔ عہد وسطیٰ میں ہندستانی اقتصادیات وٹکنالوجی، مذہب وفلسفہ، آرٹ وادب تہذیب وسماج نے جو پائیدار ترقی کی تھی اس کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا۔

مسلم فرقہ پرستوں پر ان سب باتوں کا ردعمل فطری چیز تھی۔ انھوں نے مغربی ایشا کے سنہرے زمانہ کے عظیم کارناموں کا گن گان کرنا اور اس کے پیروؤں، دیو مالائی کہانیوں اور تمدنی روایتوں کا راگ الاپنا شروع کیا۔ اس مفروضہ کا پوری طرح پروپگنڈہ کیا گیا کہ عہد وسطیٰ میں سبھی مسلمان حکمران تھے یا کم سے کم نام ونہاد مسلم حکومت میں مستفید ہورہے تھے۔ سبھی مسلم حکمرانوں یہاں تک اورنگ زیب جیسے متعصب شہنشاہ کی تعریف میں وہ قصیدے پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی گراوٹ کا نیا اصول بنایا تھا۔ ان کے مطابق انیسویں صدی میں سیاسی اقتدار چھن جانے کے بعد مسلم سماج کا زوال ہوا اور ہندو آگے بڑھنے لگے۔

کچھ اسکالروں کے مطابق فرقہ واریت کے پھولنے پھلنے کا سبب ملک میں مختلف

مذاہب کا وجود تھا۔ مگر یہ بات سچ نہیں ہے کہ ملک میں کئی مذہبوں کے بیک وقت ہونے سے فرقہ واریت کا پروان چڑھنا ناگزیر ہے اس لیے فرقہ وارانہ مسائل سے نمٹنے اور ان کے حل کے لیے مذہب سے الگ ہونا ضروری ہے یہاں ہم کو طریقہ عبادت جس کے ذریعہ انسان اپنی نجی زندگی جیتا ہے اور مذہب پر قائم منفرد سماج وسیاست کا نظریہ یعنی فرقہ واریت میں امتیاز کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں مذہب فرقہ واریت کا سبب نہیں بنتا ہے، حالانکہ فرقہ پرست لوگ مذہبی فرق کو اس کی وجہ مانتے ہیں اور اسی فرق کا استعمال وہ مذہبی حدود سے باہر ہو رہے معاشرتی ضرورتوں، خواہشوں اور کشمکش کو چھپانے کے لیے کرتے ہیں۔ فرقہ واریت کے حدود میں مذہب اسی حد تک جاتا ہے جہاں تک وہ غیر مذہبی معاملوں میں سیاسی مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ کے۔ ایم۔ اشرف اس پہلو کو بہت مناسب الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ''یہ مذہب کی سیاسی دکان داری ہے''[6] مذہب نے فرقہ واریت کی ہمت افزائی مطلق نہیں کی اور نہ ہی فرقہ پرستی کی سیاست کا مقصد مذہب کی ترقی ہی تھا۔ فرقہ وارانہ سیاست کا تو یہ محض ذریعہ تھا۔

بہرحال فرقہ پرستوں نے مذہب کا استعمال اپنے پیروؤں کو متحد اور متحرک کرنے کے لیے ضرور کیا۔ فرقہ واریت کو 1939 کے بعد اور خصوصاً 47-1945 کے دوران عوام میں مقبولیت تبھی حاصل ہوئی جب لوگوں نے اشتعال انگیز نعرہ لگایا کہ مذہب خطرے میں ہے۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ فساد اور پریشانی کا فوری سبب مذہبی کام ہوتا تھا۔ ہاں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کی وجہ سے فرقہ واریت نہیں پھیلی مگر اس کے پھیلنے میں مذہبیت کا اہم رول تھا۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذہبیت، مذہب کا وہ شدید جذباتی روپ اور رجحان ہے جو انسان کی ذاتی زندگی اور اخلاقی دنیا سے دور اس کے غیر مذہبی معاملات میں دخیل ہو جاتا ہے۔ مذہبیت نے تو فرقہ واریت کو جنم نہیں دیا مگر اس نے وہ زمین ضرور تیار کی جس میں فرقہ واریت کا زہریلا پودا پھل پھول سکا۔ اس لیے سیکولرازم کا مقصد یہ نہیں کہ مذہب کو ختم کر دیا جائے بلکہ یہ کہ مذہب کی شدت کو کم کیا جائے یا مذہب کے دائرہ کو انسان کی نجی زندگی تک ہی محدود رکھا جائے۔

باب-32

فرقہ واریت کا معتدل دور

انیسویں صدی کے آخری پچیس سالوں کے دوران ملک میں فرقہ واریت کا وجود ہم کو مشکل سے ملتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ 1857 میں ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر شانہ بہ شانہ جنگ کی تھی۔ ہندو مسلم مفادات کے درمیان تصادم کا کیا ذکر، غیر مذہبی معاملات میں دونوں کے نظریات میں مجموعی طور سے مطلق کوئی فرق پریس کی نگاہ میں 1860 کی دہائی تک نہیں تھا۔ شمالی ہندوستان کے اخبارات انگریزوں کے بالمقابل ملک کے سبھی باشندوں کو ہندستانی کہتے تھے۔

کچھ مسلم دانشوروں کے اس خیال کے باوجود کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے تعلیم اور سرکاری نوکریوں میں پچھڑ رہے ہیں، تب بھی انھوں نے اس کی وجہ ہندوؤں کے سر نہیں منڈھی، بلکہ اس کے لیے انھوں نے برٹش سرکار اور اونچے طبقہ کے مسلمانوں پر بے توجہی برتنے کا الزام لگایا۔ بیشک، سید احمد خان انیسویں صدی کی غیر معمولی ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے تعلیمی ادارے کھولے جو پوری طرح سیکولر تھے۔ 1860 کی دہائی میں انھوں نے کئی سائنسی سوسائٹیاں قائم کیں جن کے دروازے ہندو مسلم سب کے لیے کھلے تھے۔ علی گڑھ کالج انھوں نے مسلمانوں

میں تعلیمی پستی کو دور کرنے کے لیے کھولا جس میں ہندوؤں نے مالی تعاون دیا اور جس میں ہندو طلبا اور اساتذہ کی کثیر تعداد تھی۔ 1885 میں کانگریس کے قیام کے پہلے تک سید احمد نے ہندو مسلم ساجھے داری پر برابر زور دیا تھا۔ مثلاً 1884 میں انھوں نے کہا کہ ''کیا آپ اس ملک میں نہیں رہتے؟ کیا آپ کو یہاں دفن یا نذر آتش نہیں کیا جاتا؟ اور یاد رکھیے ہندو مسلم صرف مذہبی نام ہیں ورنہ چاہے کوئی ہندو ہو یا مسلمان یا عیسائی، ملک کے سبھی رہنے والے ایک ہی قوم کے لوگ ہیں''۔1 لیکن یہ المیہ ہے کہ فرقہ واریت کی شروعات 1880 کی دہائی سے ہوئی۔ کانگریس کے قیام، کے بعد سید احمد خاں کی آواز بدل گئی اور یہیں سے فرقہ واریت کی پہلی جھلک دکھائی پڑنے لگی۔ جب یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ کانگریس سلطنت کے خلاف ہے تو وائسرائے ڈفرن اور صوبہ کے لفٹیننٹ گورنر اے۔ کالون (A. Colvin) کانگریس پر حملہ آور ہو گئے۔ سید احمد نے اس معاملہ میں حکومت کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کے خیال سے حکومت کے تئیں وفادار ہو کر وہ مسلمانوں کے لیے سرکاری نوکریوں اور پیشوں میں مواقع وسیع کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ علی گڑھ کالج کے لیے بڑے زمینداروں اور سرکاری افسروں سے تعاون کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ شروع میں انھوں نے بھنگا کے راجہ شیو پرشاد وغیرہ کی مدد سے ذات برادری، نسل، طبقہ اور حیثیت وغیرہ کی بنیاد پر جاگیرداروں، اور نوکر شاہوں کو قومی جمہوری تحریک کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کی مگر ان کو اس کام میں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ تب انھوں نے مسلمانوں جاگیرداروں کو مسلم قوم کی حیثیت سے منظم کرنے پر توجہ دی۔

بیسویں صدی کے اول پچاس سالوں میں جس فرقہ وارانہ نظریہ کا پرچار کیا گیا تھا، اس کی بنیاد سید احمد خاں اور ان کے پیروؤں نے دھیرے دھیرے ڈالی تھی۔ اس نظریہ کے تحت کہا گیا کہ اگر برٹش حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ملک میں جمہوری حکومت قائم ہو گئی تو ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے مسلمانوں پر حاوی ہو جائیں گے اور ان کے حقوق چھین لیں گے۔2 سید احمد کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ انگریز ہی کر سکتے ہیں۔3 اس لیے مسلمانوں کو برٹش حکومت کے تئیں وفادار اور نیشنل کانگریس کے خلاف رہنا چاہیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دلچسپیوں میں بڑا فرق ہے، اس بات کو اجاگر کیا گیا۔ پرانے خیال کو ترک کر کے وہ کہنے لگے کہ

ہندوستان کو قوم سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔[4] انھوں نے یہ اعلان کیا کہ کانگریس ہندو تنظیم ہے جس کے زیادہ تر مقاصد مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ انھوں نے کانگریس کے نظریہ مساوات کو تنقید کا نشانہ بنایا جس کے تحت سبھی لوگ برابر ہوتے ہیں۔[5] انھوں نے کانگریس کے اس مطالبہ پر بھی اعتراض کیا کہ ملک میں جمہوری انتخابات ہوں۔ انھوں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ایسے انتخابوں میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہیں رہیں گے، کیونکہ ''یہ پانسے کا ایک کھیل ہوگا۔ جس میں ایک آدمی کے ہاتھ میں چار پانسے ہوں گے اور دوسرے کے ہاتھ میں صرف ایک''۔[6] انھوں نے مزید کہا کہ الیکشن کا کوئی بھی طریقہ بنگالیوں یا بنگالیوں کی طرح کے ہندوؤں کے ہاتھ میں ساری طاقت سونپ دے گا، پھر مسلمان تب تو بدترین حالت میں پہنچ جائیں گے اور ہندو ان کی گردن میں غلامی کا طوق ڈال دیں گے۔[7] سید احمد اور ان کے ہمنواؤں نے مسلمانوں کے تاریخی کردار اور سیاسی اہمیت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ سرکاری نوکریوں، اسمبلیوں اور دسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کے لیے رزرویشن کا نظم ہونا چاہیے اور کونسلوں میں ان کی تعداد ہندوؤں سے کم نہ ہونی چاہیے۔ کانگریس کے خلاف کسی جوابی سیاسی مورچہ کھولنے کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے اقدامات سرکار مخالف مانے جائیں گے اور انگریز حکمرانوں کے ذہن میں مسلمانوں کی وفاداری کے بارے میں شک وشبہ پیدا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کی صلاح دی۔ ان کی باتوں میں فرقہ واریت کی بو سونگھنے میں انگریز حکمرانوں کو بالکل دیر نہیں لگی اور اس لیے وہ پوری توجہ سے اس زہریلے نظریہ کی تائید، ترقی اور حفاظت میں لگ گئے۔

سید احمد کی وفات کے بعد بھی مسلم فرقہ پرست حکومت کے تئیں وفاداری کی پالیسی پر عمل کرتے رہے۔ 06-1905 کے دوران جب بنگال میں سودیشی تحریک شروع ہوئی تب ان لوگوں نے سرکار کی مدد کی اور تحریک میں حصہ لینے والے مسلمانوں کو اسلام کے غدار، پاجی، اور کانگریس کے دلال، پکار کر ذلیل کیا۔

مگر مسلم طبقہ کو بے حس وحرکت کرنے اور حکومت کے تئیں وفادار بنائے رکھنے کی کوشش میں پوری طرح کامیابی نہیں مل سکی۔ 1887 کے کانگریس اجلاس کی صدارت بدرالدین

طیب جی نے کی اور بعد کے اجلاسوں میں مسلمانوں کی شرکت لگاتار بڑھتی گئی۔ آر۔ ایس۔ سیانی، اے۔ بھیم جی، پیر مشرف حسین، حامد علی خاں اور بمبئی، بنگال اور شمالی ہندوستان کے کئی ایک مسلم دانشور کانگریس میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے توجہ دلائی کہ کانگریس کا کوئی بھی مطالبہ فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ اس کی کوئی بھی بات صرف ہندوؤں ہی کے لیے نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک پورے ملک کے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا ہوتا رہا۔ عبدالرسول اور بہت سے بنگالی ذی علم لوگوں نے بنگال تقسیم کے خلاف سودیسی تحریک کی زبردست حمایت کی۔ درحقیقت 1920 کی دہائی میں بنگالی مسلمانوں کے درمیان قومی رجحان پوری طرح غالب رہا۔

سودیسی تحریک سے جس عوامی سیاست کی شروعات ہوئی، روشن خیال ذی فہم مسلم طبقہ کانگریس کی طرف مائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور تب حکومت کو بھی کچھ آئینی رعایتیں دینے کا اعلان کرنا پڑا۔ اور تب اس کو سیاسی لحاظ سے بے حس بنا رہنا ناممکن ہو گیا۔ اب فرقہ پرستوں اور ان کے سرکاری مددگاروں نے بھی محسوس کیا کہ ان کو بھی سیاسی اکھاڑے میں کودنا پڑے گا۔ اس طرح 1907 کے آخر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ہوا۔ اس کے قائم کرنے والوں میں بڑے زمیندار، سابق نوکر شاہ، ڈھاکہ کے نواب آغا خان اور نواب محسن الملک جیسے اونچے مرتبہ کے مسلمان تھے۔ مسلم لیگ جس کا قیام حکومت کی وفاداری کرنے کے لیے ہوا تھا اور جو فرقہ پرست اور رجعت پسند سیاسی تنظیم تھی نے نہ صرف بنگال تقسیم کی تائید کی بلکہ یہ نعرہ لگایا کہ مسلمانوں کا الگ انتخابی سسٹم اور سرکاری نوکریوں میں الگ سے رزرویشن ہو۔ اس نے وہ سارے فرقہ وارانہ مطالبات دہرائے جن کو سید احمد اور ان کے پیرو وقار الملک نے پیش کیا تھا۔ مثلاً سید احمد نے کہا کہ ''خدا معاف کرے، اگر انگریز حکومت ملک سے غائب ہو گئی، تو ہندو ہمارے مالک ہو جائیں گے پھر تو ہماری جان، جائداد، عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان سے بچنے کا مسلمانوں کے پاس صرف ایک طریقہ ہے کہ وہ مستقل کوشش کریں کہ برٹش حکومت ملک میں بنی رہے۔ 9 انھوں نے یہ بھی خوف ظاہر کیا کہ مسلمان اپنی شناخت کھو دیں گے۔ مسلم لیگ کا خاص مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں ابھر رہے ذی علم طبقہ کو کانگریس سے دور رکھا جائے۔ اس نے اپنی تمام تر کوششیں انگریزی حکومت کے خلاف کرنے کے بجائے کانگریس اور ہندوؤں کی مخالفت میں کیں۔

انھیں دنوں ہندو فرقہ پرستی کا بھی جنم ہو رہا تھا۔ 1870 کی دہائی سے ہندو زمینداروں، مہاجنوں، متوسط طبقہ اور پیشہ ور لوگوں کے ایک حصہ میں مسلم مخالف جذبات ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔ ہندستانی تاریخ کے بارے میں انگریز مورخین کے نظریہ کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے وہ لوگ عہد وسطی کی مسلم حکومت کو ظالم وجابر اور انگریزی حکومت کو مسلم مظالم سے نجات دلانے والا کہنے لگے۔ یوپی اور بہار میں انھوں نے ہندی کو فرقہ وارانہ رنگ بھی دے ڈالا۔ انھوں نے ہندی ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان بتایا۔ 1890 کی شروع دہائی میں ملک گیر گوکشی مخالف پرچار کیا جانے لگا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کا سارا پرچار مسلمانوں کے خلاف تھا جبکہ برٹش چھاؤنیوں میں بڑے پیمانے پر گائیں کٹتی تھیں۔ اس پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اسی شورش کی وجہ سے ملک بھر میں فسادات ہوئے۔ 1896 میں اس طرح کی شورش تھوڑی سی ٹھنڈی پڑی مگر انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اس کا اور بھی زہریلا ابھار دکھائی پڑا۔ ہندو فرقہ پرستوں نے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اسمبلیوں اور سرکاری نوکریوں میں ہندوسیٹوں کے رزرویشن کا مطالبہ کیا۔

1909 میں پنجاب ہندو مہاسبھا کا قیام ہوا۔ اس کے لیڈر یو۔ این۔ مکرجی اور لال چند نے ہندو فرقہ وارانہ نظریہ اور سیاست کی بنیاد ڈالی۔ ان لوگوں کو اس بات کے لیے بڑا غم وغصہ تھا کہ نیشنل کانگریس ہندوستانیوں کو ایک قوم کی شکل میں متحد کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور مسلمانوں کی منہ بھرائی کے لیے ہندو مفادات کو قربان کر رہی ہے۔ اپنے کتابچہ "سیاست میں خود" (Self abnegation in politics) میں لال چند نے کانگریس کو ہندوؤں کی خود کی پیدا کردہ مصیبت کا نام دیا۔ انھوں نے لکھا کہ پچھلے پچیس سالوں میں جو زہر پھیلایا گیا ہے اس کی وجہ سے ہندوؤں کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اس لیے ہندوؤں کو نہ صرف کانگریس جیسی برائی سے چھٹکارہ پانا چاہیے، بلکہ اس کی پوری طرح صفائی کر دینی چاہیے"۔ انھوں نے کانگریس کو حکومت سے ناممکن مطالبے منوانے کے لیے ملزم ٹھہراتے ہوئے کانگریس اور ہندوؤں کے تئیں حکومت کے غصے کو جائز بتایا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیسری پارٹی یعنی حکومت کو غیر جانبدار اور بے تعلق کر دینا چاہیے۔ اپنی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے کہ ہندوؤں کو

کانگریس کا ستیاناس کرنا اور اس کو چھوڑنا چاہیے۔ لال چند نے اعلان کیا کہ "ہندوؤں کو نہ صرف اس بات پر یقین کرنا چاہیے بلکہ اپنی زندگی اور طبیعت کا ضروری حصہ بنالینا چاہیے کہ وہ ہندو پہلے اور ہندستانی بعد میں ہیں"۔[10]

ہندومہاسبھا کا پہلا اجلاس 1915 میں قاسم بازار کے مہاراجہ کی صدارت میں ہوا۔ بہت دنوں تک ہندومہاسبھا، مسلم لیگ کے مقابلے بیمار بچہ کی طرح رہی۔ اس کے کئی وجوہات تھے۔ عام سماج اور اس کے متوسط طبقہ پر زمینداروں، اونچی ذات کے لوگوں، اور سابق نوکر شاہوں کا تسلط تھا، جبکہ پارسیوں اور ہندوؤں کے مڈل کلاس کے جدید تعلیم یافتہ حلقوں میں عام طور سے سائنس، جمہوریت، قومیت کا نظریہ زور پکڑ رہا تھا۔ تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی میدان میں ان کا بڑا اثر تھا۔ مسلم سماج پر رجعت پسند زمیندار اور مذہبی پیشوا حاوی تھے۔ ہندو مسلم دونوں حلقوں کے یہ لوگ غیر ترقی پسند، دقیانوس اور حکومت نواز تھے۔ یوں ہندوؤں میں ان کی پکڑ ڈھیلی پڑ رہی تھی مگر مسلمانوں میں اب بھی ان کا اقتدار تھا۔ مسلمانوں کا درمیانی طبقہ سماجی اعتبار سے پچھڑے پن کا شکار تھا اور یہی پچھڑا پن ان کے درمیان فرقہ واریت کی ابھار کا سبب بنا۔

ایک اور بات تھی جس کی وجہ سے ہندو فرقہ واریت نسبتاً کمزور رہی۔ انگریزی حکومت نے ہندو فرقہ کو بہت کم رعایتیں دی تھیں کیونکہ اس کو مسلم فرقہ پر زیادہ بھروسہ تھا۔ ظاہر ہے ہندو مسلم دونوں کی فرقہ واریت کو بیک وقت نوازکر ان کا حوصلہ نہیں بڑھایا جا سکتا تھا۔ 1907 کے مارلے منٹو (Morley Minto) سدھاروں کے تحت الگ الگ چناوی حلقے تھے۔ اس سسٹم نے فرقہ واریت کو مستحکم اور مضبوط کرنے میں محرک کا کام کیا۔ اس کے مطابق مسلمانوں کے لیے (اور بعد میں سکھوں اور دوسرے لوگوں کے لیے) علاحدہ علاحدہ چناوی حلقے بنائے گئے تھے جہاں صرف مسلمان امیدوار کھڑے ہو سکتے تھے اور مسلمان ہی ووٹ دے سکتے تھے۔ چونکہ ان حلقوں کے سبھی رائے دہندہ ہم مذہب ہوتے تھے، اس لیے دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے کسی قسم کی کوئی اپیل نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح الیکشن کے نمائندے جم کر فرقہ وارانہ بنیاد پر چناؤ پرچار کرتے تھے اور رائے دہندوں کو ان کی غیر ذمہ دارانہ باتیں سن کر ایک طرح کی ٹریننگ مل جاتی تھی کہ وہ اپنی سماجی اور مالی دشواریوں کو فرقہ وارانہ طریقے سے پیش کریں۔ سرکاری

نوکریوں اور تعلیمی اداروں وغیرہ میں سیٹوں کے رزرویشن کا مطالبہ بھی ان کے اندر یہی برائی پیدا کرتا تھا۔

یہاں اپنی بات سے تھوڑا سا ہٹنا ضروری معلوم پڑتا ہے۔ جب فرقہ واریت کے جنم اور ارتقا کے بارے میں چرچا کی جاتی ہے تو ایک خاص غلطی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جب بھی کوئی فرقہ پرور مورخ اپنی تحریروں میں اس کا حوالہ دیتا تھا، یا اس وقت دیتا ہے تب وہ ایک کی فرقہ واریت کو دوسرے کی فرقہ واریت کا نتیجہ بتاتا ہے۔ اس طرح وہ اس کے پھیلنے کی ذمہ داری دوسرے کے سر منڈھ دیتا ہے۔ اس کے مطابق کسی خاص جماعت کی فرقہ واریت دوسرے کی فرقہ واریت کے ردّ عمل میں رونما ہوتی ہے۔ ان دنوں ہندو، مسلم اور سکھ اپنی فرقہ واریت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہی استدلال پیش کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ فرقہ واریت کی شروعات اصل میں کس نے کی؟ یہ سوال ویسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا وجود میں آیا۔ مختصر یہ کہ جیسے ہی فرقہ واریت کا تولد ہوا، اس کے مختلف روپوں نے ایک دوسرے کو غذائیت بخشی اور فربہ کیا۔

جلد ہی نوجوان ذی علم مسلمان، مسلم لیگ میں اونچی ذات کی قیادت کی سرکار پرست، ہندو مخالف اور ذہنی غلامی کے نظریہ سے مایوس ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نوجوان طبقہ تیزی سے قومیت کے جدید اور انقلابی رجحان کی طرف کھنچ رہا تھا۔ اسی دوران مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، حسن امام، مولانا ظفر علی خان اور مظہر الحق کی قیادت میں قوم پرور جانباز احرار تحریک کا قیام ہوا۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے راسخ العقیدہ خصوصاً دیوبند مکتب فکر کے علما کے ایک حصہ کا پورا تعاون بھی ملا۔ دوسرے راسخ العقیدہ نوجوان عالم جو قومی تحریک میں شامل ہوئے وہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ انھوں نے قاہرہ کے الازہر یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ وہ اپنے اخبار الہلال کے ذریعہ قومی نظریات کا مستقل پرچار کر رہے تھے۔ الہلال کی شروعات انھوں نے چوبیس سال کی عمر میں 1912 میں کی تھی۔ اس طرح بڑی سخت جدوجہد کے بعد نیشنلسٹ مسلم نوجوانوں کو مسلم لیگ میں اہمیت ملنے لگی۔ یہ لوگ کانگریس میں بھی فعال تھے۔ 1912 میں کانگریس کے نامی گرامی لیڈر محمد علی جناح کو لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ سیلف گورمنٹ کا قیام لیگ

کے عزائم میں سے ایک تھا۔ اسی سال آغا خان نے لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔

1912 سے 1924 تک لیگ کانگریس کی پالیسیوں کے کافی قریب آچکی تھی اور اس میں نوجوان نیشلسٹ سرکار پرستوں پر حاوی ہونے لگے تھے۔ مگر بدنصیبی یہ تھی کہ جناح کے علاوہ باقی لوگوں کا مزاج سیکولر نہیں تھا۔ ان کا زبردست جھکاؤ مذہبی اور اسلامی اتحاد کے تئیں تھا۔ آمرانہ حکومت کے سیاسی اور اقتصادی نتائج کو سمجھنے کے بجائے وہ اس کی مخالفت صرف اس لیے کرتے تھے کہ اس سے خلیفہ اور مقدس مذہبی مقامات کو خطرہ لاحق تھا۔ اس لیے اکثر وہ مذہبی جذبات کو ہی اپیل کرتے تھے۔ بہرحال ان کے مذہبی جذبات اور نیشنلزم کے مابین کوئی ٹکراؤ نہیں تھا بلکہ یہی رجحان شہری علاقوں کے قوم پرست مسلمانوں کے لیے حوصلہ کا باعث بنا تھا، حالانکہ بعد میں یہی رجحان بہت خطرناک ثابت ہوا۔ اس کے تحت سیاسی مسائل کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا۔

کانگریس اور مسلم لیگ جس مثبت سمت میں آگے بڑھ رہے تھے اور جس کا ذکر گذشتہ باب میں کیا گیا ہے، آگے چل کر ان دونوں میں سیاسی ہم آہنگی آنی ہی تھی۔ اس سلسلہ میں لوک مانیہ تلک اور محمد علی جناح کا رول اہمیت کا حامل ہے۔ 1916 کے آخر میں ان دونوں تنظیموں کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا جس میں دونوں نے ایک سمجھوتے پر دستخط کیے جس کو لکھنؤ سمجھوتہ (Lucknow Pact) نام سے پکارا جاتا ہے۔ دونوں نے حکومت کے سامنے ایک جیسے مطالبات رکھے جس میں جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کو خود اختیاری (Self Govt) دینے، اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لیے سیٹیں محفوظ کرنے اور الگ انتخابی حلقے بنانے کے مطالبے تھے۔ کئی معنوں میں یہ سمجھوتہ ترقی پسندانہ تھا مگر اس کے تحت کانگریس نے فرقہ وارانہ سیاست کو ایک طرح سے تسلیم بھی کرلیا تھا۔ سمجھوتہ میں یہ بات مخفی تھی کہ ہندوستان کئی فرقوں کا ملک ہے، جن کی دلچسپیاں الگ الگ ہیں۔ بعد میں یہی نظریہ ہندستانی سیاست میں فرقہ پرستی کو جنم دینے میں مددگار ثابت ہوا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد رولٹ ایکٹ (Rowlatt Act) کی مخالفت اور خلافت اور عدم تعاون تحریک کے دوران قومی رجحان میں غیر معمولی مضبوطی آئی اور ہندو مسلم اتحاد کے

نعرے لگنے لگے۔ یہاں تک کہ کٹر آریہ سماجی سوامی شردھانند کو دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو امرت سر کے سورن مندر کی چابیاں سپرد کر دی گئیں۔ ایسا کرنے سے ساری دنیا پر یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ ہندو مسلمان سیاسی میدان میں پوری طرح متحد ہیں۔ ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کی صدا سارے ملک میں گونج اٹھی۔ فرقہ پرست مسلم زمیندار اور سابق نوکر شاہ اپنے تعلقات مسلم لیگ سے بہت تیزی سے ختم کرنے لگے۔ لیگ کی اہمیت خلافت کمیٹی کی وجہ سے کم ہونے لگی تھی کیونکہ بہت سے لیگ اور کانگریس لیڈروں کو ساتھ ساتھ سیاسی کام کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ یوں خلافت تحریک مذہبی مسئلہ سے تعلق رکھتی تھی مگر یہ عام اور متوسط مسلم طبقوں میں آمرانہ حکومت کے خلاف قومی بیداری پیدا کرنے میں بہت مدد گار ثابت ہوئی۔ خالص مسلم تحریک ہونے کے باوجود خلافت تحریک میں ٹھیک اسی طرح جرح کی کوئی بات نہیں تھی جس طرح سکھوں کی اکالی تحریک اور ہندوؤں کی چھوا چھوت مخالف مہم تھی۔

لیکن اس میں خامی اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی بیداری کو سیکولر سیاسی شعور کے نہج پر نہیں لایا جا سکا۔ مثلاً خلافت لیڈران فتووں نیز دوسرے طریقوں کو استعمال کر کے مذہب کے نام پر مسلمانوں سے اپیل کرتے تھے۔ اس طرح مسلم عوام پر کٹر مذہبی رجحان مضبوط ہوا اور سیاسی مسائل کو مذہبی عینک سے دیکھنے کی عادت پڑی۔ مسلم اتحاد پر زور ڈالنے کے نتیجہ میں سیاست میں فرقہ وارانہ نظریہ پنپنے لگا۔

فروری 1922 میں عدم تعاون تحریک واپس لے لی گئی۔ اس سے لوگوں میں بے انتہا مایوسی پیدا ہوئی۔ اور مایوسی کے اس دور میں فرقہ واریت نے پھر سر اٹھایا۔ 1922 کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات جلدی جلدی ہونے لگے۔ پرانی فرقہ وارانہ تنظیمیں پھر سے متحرک ہو گئیں اور نئی بھی وجود میں آئیں۔ مسلم لیگ پھر سے فعال ہو گئی۔ اب وہ قوم پرستوں سے بالکل خالی ہو گئی تھی۔ اونچی ذات کا حکومت نواز طبقہ اس کی قیادت پر حاوی ہو گیا تھا۔ 1923 میں ہندو مہاسبھا کا دوبارہ جنم ہوا۔ اس نے کھلے عام مسلم مخالف جذبات بھڑکانا شروع کر دیا۔ اس کا واحد مقصد ہندوؤں کا تحفظ اور ہندو راشٹریہ کا قیام و ترقی تھا۔

ہندو مسلم دونوں کے فرقہ پرست اپنے اپنے فرقوں میں لوگوں کے دلوں میں خوف

وہراس پیدا کر رہے تھے کہ لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ ان پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کی بیخ کنی کی جا رہی ہے۔ یہ وہی دور تھا جب ہندوؤں میں سنگٹھن اور شدھی اور مسلمانوں میں تنظیم اور تبلیغ کی تحریکیں اپنے اپنے فرقوں کو متحد کرنے اور لوگوں کے تبدیلئ مذہب میں لگی تھیں۔ قوم پرستوں کو بے دھڑک برا بھلا کہا جا رہا تھا۔ ان کو ملحد، مذہب وملت کا دشمن پکارا جا رہا تھا۔

اس طرح کے فرقہ وارانہ ماحول کا اثر بہت سے قوم پرست لوگوں پر بھی پڑا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا لہجہ فرقہ وارانہ یا نیم فرقہ وارانہ سا ہو گیا۔ سوراج پر یکی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک جماعت کے لوگوں کو رسپانسویٹس (Responsivists) کہا جاتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نام نہاد ہندو مفادات کے تحفظ کے لیے حکومت کو مدد دینے کی پیشکش کی۔ لاجپت رائے، مدن موہن مالویہ اور این۔سی کیلکر ہندو مہا سبھا میں شامل ہو گئے اور ہندوؤں کو متحد کرنے کی وکالت کرنے لگے۔ کچھ کم فرقہ پرست سوراجیوں اور ہندو مہا سبھائیوں نے سیکولر کانگریسیوں کے خلاف زوردار مہمیں چلائیں۔ ان لوگوں نے موتی لعل نہرو پر الزام لگایا کہ وہ ہندو مخالف اور مسلم موافق ہیں۔ وہ گئوکشی کے حق میں ہیں اور بذاتِ خود گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ خلافت تحریک کے بہت سے پرانے لیڈر بھی فرقہ پرست ہو گئے۔ سب سے زیادہ تبدیلی تو مولانا محمد علی اور شوکت علی میں آئی۔ انھوں نے کانگریس پر الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کو پست کرنا اور ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے 24-1923 کے دوران شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں میں متعدد فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ سائمن کمیشن (Simon Commission) کی رپورٹ کے مطابق 1922 اور 1927 کے دوران 112 بڑے بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔

قومی قیادت نے فرقہ وارانہ طاقتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے سخت محنت کیا مگر ان سے نمٹنے کا وہ کوئی مؤثر لائحہ عمل تیار نہ کر سکی۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ کون سا نیا طریقہ تھا جو اس نے اختیار کیا اور آخر وہ کیوں ناکامیاب ہوئی۔ بنیادی حکمت عملی جو اس نے اپنائی وہ یہ تھی کہ فرقہ وارانہ طاقتوں کے چوٹی کے لیڈروں سے بات چیت کے ذریعہ مصالحت کی جائے۔ اس کے

تحت وہ ثالث بن کر مختلف فرقوں کے درمیان مصالحت کراتی تھی یا پھر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر اسمبلیوں اور سرکاری نوکریوں میں رزرویشن جیسے مسئلوں پر مسلم فرقہ پرست لیڈروں سے بات چیت کر کے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی اس نے کوشش کی۔

ایسی کوششوں میں سب سے نمایاں کوشش 1938 میں کی گئی۔ سائمن کمیشن کے چیلنج کے جواب میں فرقہ وارانہ مسائل کا سلجھانا ضروری تھا۔ اس کے لیے آل انڈیا سطح پر کئی کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور عام رائے سے ملک کا ایک دستور مرتب کیا گیا۔ دسمبر 1927 میں مسلم فرقہ کے لیڈروں کی دہلی میں ایک بیٹھک ہوئی جس میں چار نکاتی مطالبے کا قرارداد تیار کیا گیا جس کو دہلی قرار داد (Delhi Proposals) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے قرار داد یہ تھے (1) سندھ کو ایک الگ صوبہ بنایا جائے۔ (2) شمالی مغربی سرحدی صوبہ کو وہی آئینی درجہ دیا جائے جو دوسرے صوبوں کو ملا ہے۔ (3) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو 33.1/3 فیصد نمائندگی حاصل ہو۔ (4) پنجاب اور بنگال کی نمائندگی آبادی کے مطابق ہو۔ ایسا ہونے پر ان صوبوں میں خود بخود اکثریت مسلمانوں کی ہو جاتی۔ اور دوسرے صوبوں میں سیٹوں کا موجودہ رزرویشن برقرار رہتا۔

سبھی پارٹیوں کے ذریعہ تیار کیا گیا کانگریس کا یہ قرارداد نہرو رپورٹ کے نام منظر عام پر آیا۔ دسمبر 1928 کے اواخر میں یہ رپورٹ کلکتہ میں آل پارٹی کنونشن کے سامنے منظوری کے لیے پیش کی گئی۔ دیگر اور باتوں کے علاوہ نہرو رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ ہندوستان کا ڈھانچہ صوبوں کی زبان اور صوبائی خودمختاری (Provincial Autonomy) کی بنیاد پر بنا ایک وفاقی مملکت کا ہوگا۔ انتخابات سبھی رائے دہندہ مل جل کر کریں گے۔ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں آبادی کے لحاظ سے مذہبی اقلیتوں کے نمائندوں کی سیٹیں محفوظ رہیں گی۔ رپورٹ میں سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں آئینی سدھار کرنے کی بھی سفارش کی گئی۔

کلکتہ اجلاس میں نہرو رپورٹ پر سبھی ایک رائے نہیں ہو پائے۔ ایک طرف مسلم فرقہ پرستوں میں اختلاف رائے تھا، تو دوسری طرف لیگ اور خلافت کا ایک حصہ نہرو رپورٹ کو اس

شرط پر ماننے کے لیے تیار تھا کہ محمد علی جناح کے ذریعہ تجویز کردہ تین ترمیمات تسلیم کرلی جائیں۔ ان میں سے دو تجاویز، دہلی قرارداد کے ٹھیک تیسرے اور چوتھے مطالبوں کی طرح تھے۔ پہلا اور دوسرا مطالبہ نہرو رپورٹ میں ہی مان لیا گیا تھا۔ جناح کی تیسری ترمیم میں نیا مطالبہ یہ تھا کہ بقیہ اختیارات صوبوں کے پاس رہیں گے۔ مسلمانوں کے دوسرے فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ ساتھ، لیگ کے ایک بڑے حصہ کو، جس کی قیادت محمد شفیع اور آغا خان کر رہے تھے، یہ ترمیمیں منظور نہیں تھیں۔ ان کو انتخاب میں مشترک رائے دہندگی تسلیم نہیں تھی۔ ہندو مہا سبھا اور سکھ لیگ کو رپورٹ کے اس حصہ پر سخت اعتراض تھا جس کا تعلق سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بنگال اور پنجاب سے تھا۔ ان کو جناح کی ترمیمات بھی ناقابلِ قبول تھیں۔ کانگریس لیڈران کمزور مرکز نہیں چاہتے تھے مگر جناح کی منشا یہی تھی۔

کلکتہ کنونشن پر ردعمل یہ ہوا کہ زیادہ تر مسلم فرقہ پرست ایک ہو گئے اور جناح نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ نہرو رپورٹ ہندو وادی دستاویز ہے۔ مختلف فرقہ وارانہ تنظیموں کے ذریعہ مختلف اوقات میں پیش کیے گئے مطالبوں کو ملا کر جناح نے ایک دستاویز تیار کیا جس کو جناح کا چودہ نکاتی پروگرام (Jinnah's Fourteen Points) کہا جاتا ہے۔ ان چودہ باتوں میں چار باتیں بنیادی اعتبار سے دہلی تجاویز کی شامل تھیں۔ اور تین کلکتہ ترمیمات کی جس میں الگ انتخابی سسٹم، سرکاری نوکریوں اور سیلف گورنمنٹ اکائیوں میں سیٹوں کے تحفظ کو جاری رکھنے کے مطالبے تھے۔ بعد کے سالوں میں جو بھی فرقہ وارانہ پرچار کیے گئے ان کی تہہ میں جناح کے یہی چودہ نکات رہتے تھے۔

ہندو، مسلم اور سکھ لیڈروں کے درمیان مصالحت کے ذریعہ فرقہ وارانہ مسائل کے حل کرنے کی حکمت عملی پوری طرح ناکام رہی دراصل اس پالیسی میں اول روز سے ہی کچھ خاص کمزوریاں تھیں۔ بات چیت اور سمجھوتہ کی کوشش کا صاف مطلب یہ تھا کہ کانگریس نے کسی حد تک خاموشی سے یا اشارتاً تسلیم کرلیا ہے کہ فرقہ پرست لیڈران اپنے اپنے فرقوں کے مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ کہ حقیقی زندگی میں فرقہ وارانہ اور مذہبی دلچسپیوں کا وجود بنا ہوا ہے۔ فرقہ پرست لیڈران سے بات چیت کرکے کانگریس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ ان کی سیاست کو

جائز سمجھتی ہے اور ان کے خیال کی قدر داں ہے۔ اس طرح اس نے فرقہ پرست پارٹیوں اور لوگوں کے خلاف سیاسی نظریہ کے تحت مہم چلانے کے دعویٰ اور منشا کو کمزور کرلیا۔ اس کے علاوہ فرقہ پرست مسلم لیڈروں سے لگاتار بات چیت سے مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری اور آصف علی جیسے سیکولر اور آمریت مخالف مسلم لیڈروں کی پوزیشن مجروح اور کمزور ہوگئی۔ مدن موہن مالویہ، لاجپت رائے اور مولانا محمد علی جیسے لیڈروں، جو اکثر و بیشتر کانگریس سے مل کر کام کرتے تھے ان کی فرقہ پرستی اور نیم فرقہ پرستی کو اجاگر کرنا اور اس کی مخالفت کرنا مشکل ہوگیا۔

بالائی سطح پر بات چیت کی حکمت عملی کے لیے ضروری تھا کہ اسمبلیوں میں سیٹوں اور سرکاری نوکریوں کے معاملہ میں اکثریت، بڑی فراخدلی اور وسیع النظری سے اقلیت کو رعائتیں دے۔ مگر ہندوؤں کے متوسط طبقہ میں فرقہ درایت کافی گہرائی تک جا چکی تھی۔ اس کو بھی کالونیائی حکومت کے ذریعہ پیدا کردہ پچھڑے پن کو جھیلنا پڑا تھا۔ کانگریس کی قیادت کے لیے بہت دشوار تھا کہ وہ ہندو اور سکھ فرقہ پرستوں کو اس بات کے لیے راضی کرسکے کہ وہ مسلمانوں کو رعایتیں دیں۔ اس طرح مسلم فرقہ پرستوں سے سمجھوتہ نہ ہو پانے سے جہاں ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا وہیں ان کو دی گئی کئی اہم رعایت سے ہندو فرقہ پرستی کو تقویت ملتی تھی۔ بہر حال اگر زیادہ سے زیادہ فراخدلی اور دوراندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرقہ پرست لیڈروں سے سمجھوتہ ہو بھی جاتا تو وہ بھی لکھنؤ سمجھوتہ اور نہرو رپورٹ کی طرح زیادہ دنوں تک نہ چل پاتا۔ اس کے علاوہ کسی بھی فرقہ پرست لیڈر، گروہ یا جماعت کا اتنا زیادہ اثر دوسرے لیڈر، گروہ یا جماعت پر نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی مستقل یا عارضی سمجھوتہ پر دستخط کرا سکے۔

جیسے جیسے رعایتیں دی گئیں، فرقہ واریت کی بھوک بڑھتی گئی۔ جیوں ہی ایک گروہ کو ختم کیا جاتا، اس سے زیادہ تیز اور اجڈ گروہ یا لیڈر ابھر کر سامنے آتا اور کچھ زیادہ ہی فرقہ وارانہ مطالبے پیش کرتا۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ جب بہ نسبت معتدل یا معقول کسی لیڈر یا گروہ کو احساس ہوتا کہ اس کی پکڑ اپنے پیروؤں پر ڈھیلی پڑ رہی ہے تو پہلے کیے گئے کسی سمجھوتہ کے جزوی یا پورے حصہ سے انحراف کرنا اس کو ضروری لگنے لگتا۔ 29-1928 کے دوران یہی معمول چلتا رہا۔ جناح اسی زمرہ میں آتے تھے۔ درحقیقت جب تک فرقہ وارانہ نظریہ بڑھتا رہا سماج کے سیاسی حالات

موافق رہے، فرقہ وارانہ سیاست چلتی رہی، مگر بہت دنوں تک فرقہ پرست لیڈروں کو خوش کر پانا یا ان سے مصالحت کرنا دشوار ہوگیا۔

فرقہ واریت کے چیلنج کا معقول جواب تو یہ تھا کہ اس کی کھلی مخالفت نظریاتی، تمدنی، سیاسی اور سماجی ہر ایک میدان میں کی جاتی۔ اس کے سارے پہلوؤں کا سائنسی تجزیہ کیا جاتا، قومی تحریک کی تمام کوششوں کے باوجود اس کی ابتدا، نشوونما اور ترقی کیسے ہوئی وغیرہ کے اسباب تلاش کیے جاتے۔ پھر فرقہ واریت اور فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف بڑی ثابت قدمی اور استقلال سے جنگ چھیڑ دی جاتی۔ جہاں کسانوں کی جدوجہد پر توڑ مروڑ کر فرقہ وارانہ رنگ چڑھایا گیا تھا، وہیں ان کے کام کی حقیقی لڑائیاں لڑی گئی ہوتیں۔ مگر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا۔ دادا بھائی نوروجی سے لے کر گاندھی جی اور نہرو تک کی قومی قیادت اپنے نظریہ پر قائم رہی، پھر بھی فرقہ واریت پر قابو نہ پایا جا سکا۔ ضروری تو یہ تھا کہ اگر فرقہ پرستوں سے منطقی اور سائنسی انداز میں مدلل طریقے سے بحث ومباحثہ کیا گیا ہوتا، تو وہ بھی سائنسی تجزیے کے لیے تعصب، ہٹ دھرمی اور ضد کو چھوڑ کر زمین پر آنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ہندو مسلم اتحاد گاندھی جی اور کانگریس کی قومی سیاست کا اہم جز تھا۔ فیصلہ کن موقعوں پر بھی انھوں نے اس کا دامن نہیں چھوڑا اور ہندو فرقہ واریت کو خوش کرنے سے انکار کر دیا، یہاں تک سیکولرازم کو بچانے کے لیے متعدد بار اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال دیا، مگر گاندھی جی اور کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا بہت گہرائی سے جائزہ نہیں لیا۔

1920 کی دہائی میں فرقہ وارانہ پارٹیوں کے قول وفعل کے تیز وتند ہونے کے باوجود فرقہ واریت سماج کے رگ وریشہ میں پیوست نہ ہو سکی۔ فرقہ وارانہ فسادات شہروں تک محدود تھے اور ملک کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ان کی تعداد بہت نہیں تھی۔ ہندو فرقہ واریت کو عوامی تائید بھی نہیں مل سکی۔ مسلم فرقہ واریت کا دائرہ بھی تنگ تھا۔ نیشنلسٹ مسلمان جو کانگریس کا ایک حصہ تھے، اب بھی سیاسی طاقت کے مالک تھے۔ مزدور تنظیمیں، کسان ونوجوان تحریکیں پوری طرح سیکولر تھیں۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے معاملہ میں بھی فرقہ وارانہ طاقتوں کی کمزوری اچھی طرح ظاہر ہوگئی۔ اس سلسلہ میں مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا دونوں جدا ہوگئیں۔ ایک نے

بائیکاٹ کی موافقت تو دوسرے نے مخالفت کی۔

سائمن کمیشن مخالف تحریک اور 34-1930 کے دوران دوسری سول نافرمانی تحریک نے ملک کے سیاسی حالات ہی بدل دیے۔ ایک بار پھر فرقہ پرست پیچھے چلے گئے۔ کانگریس، جمعیۃ علماء ہند، خدائی خدمتگار اور دوسری تنظیموں کی قیادت میں ہزاروں مسلمان جیل گئے۔ قومی تحریک کا دائرہ وسیع تر ہوا اور پہلی بار شمال مغرب سرحدی صوبہ اور کشمیر اس کے زیر اثر آئے۔

1930 کی دہائی میں فرقہ پرست لیڈروں کو گول میز کانفرنس کے دوران ایک دوسرے کے روبرو ہونے کا موقع ملا۔ ان کانفرنسوں میں فرقہ پرستوں نے برٹش حکمراں طبقوں کے سب سے زیادہ رجعت پسند حصوں سے ہاتھ ملایا۔ ہندو مسلم دونوں ہی فرقہ پرستوں نے اپنے اپنے فرقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے برٹش حکمرانوں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ 1932 میں انگلینڈ کے ہاؤس آف کامنس میں ہوئی ایک نشست میں آغا خان، شاعر محمد اقبال اور مورخ شفاعت احمد خان نے پرزور وضاحت کی کہ ہندو مسلم کے سیاسی یا اصل سماجی مفادات کا خلط ملط ہونا ناممکن ہے۔ ان میں روز اول سے تضاد پایا جاتا ہے اور یہ بھی کہا کہ برٹش ایجنسی کے علاوہ کسی دوسری طاقت کے ذریعہ ملک پر حکومت کرنے کی بات ناقابل قبول ہے۔[11]

اسی طرح 1933 میں ہندو مہا سبھا کی صدارت کی کرسی سے بھائی پرمانند نے ہندوؤں اور برٹش حکومت کے درمیان تال میل بنائے رکھنے کی وکالت کی اور کہا کہ یہ میرے ضمیر کی آواز ہے کہ اگر ہندوؤں کی ذمہ دارانہ حالت نئے ہندوستان کے سیاسی اداروں کے ذریعہ مقدم فرقے کی حیثیت سے تسلیم کر لی جاتی ہے تو وہ انگلینڈ سے بخوشی تعاون کریں گے۔[12]

1937 تک فرقہ وارانہ پارٹیوں اور جماعتوں کی طاقت بالکل کمزور رہی۔ ان کا سماجی دائرہ بھی تنگ تھا۔ ملک کے زیادہ تر مسلمان، ہندو ذی علم لوگ اور کسان و مزدور 1930 دہائی کی ابتدا میں نیشنلزم اور سوشلزم کی خاص دھارا سے منسلک رہے۔ بنگال میں کافی لوگ کرشک پرجا پارٹی کے ممبر بن گئے تھے۔ یہ سیکولر اور انقلاب پسند پارٹی تھی۔ بہر حال مسلم فرقہ واریت کو تقویت پہنچانے کے لیے برٹش حکومت نے کمیونل اوارڈ (Communal Award) کا اعلان کیا جس میں 1927 کے دہلی تجاویز اور 1929 کے جناح کے چودہ نکاتی

پروگرام کو منظور کر لیا۔ اب فرقہ پرست طاقتوں کے سامنے بالکل نئے حالات تھے۔ وہ اب پہلے کی طرح اپنے طور سے کام نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے سامنے بس سوال یہ تھا کہ اب وہ کدھر کا رخ کریں گی؟

باب۔33

جناح گولوا کراور انتہا پسند فرقہ واریت

فرقہ واریت کا دوسرا یعنی معتدل دور 1937 تک جاری رہا۔اس کے بعد وہ تیزی سے تشدد اور فسطائی طریقہ اپنانے لگی۔معتدل فرقہ پرست یہ مانتا تھا کہ مذہب پر قائم مختلف فرقوں کے گٹھ جوڑ سے ہندوستان وجود میں آیا ہے اور ان فرقوں کے نہ صرف الگ الگ مفادات ہیں بلکہ ان کے یہ مفادات آپس میں ٹکراتے بھی ہیں۔اس کے باوجود وہ یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ ہندوستان کی خیر و بھلائی اس میں ہے کہ ملک کے مختلف فرقے ایک دوسرے میں ضم ہوکر ایک قوم بن جائیں۔اس وقت ابھر رہی قومی ایکتا کے دائرہ میں رہ کر وہ اپنے فرقہ کے لیے خاص رعایتوں، رزرویشن اور تحفظ کی بات بھی کرتا تھا۔وہ نہ صرف قومی اتحاد پر یقین کرتا تھا بلکہ یہ بھی مانتا تھا کہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے مفادات مشترک ہیں۔بہر حال معتدل فرقہ واریت کا سماجی دائرہ محدود تھا۔اونچے اور متوسط طبقوں کے لوگ ہی ایسے سیاسی نظریہ کے قائل تھے۔

انتہا پسند فرقہ واریت، نفرت، خوف، گندی ذہنیت اور بد عقلی کی اپج تھی۔دوسروں پر جبر کرنے اور تسلط قائم کرنے کے لیے فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ شروع سے سرگرم رہا ہے۔اب اس سمت میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔دوسرے فرقوں کے مذہب کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم بھی

چھڑ گئی اور یہ کہا جانے لگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی میل ملاپ ہو ہی نہیں سکتا۔ڈبلو۔سی۔ اسمتھ کے مطابق ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے خلاف زہر اگلنے لگا۔ 1937 کے بعد فرقہ وارانہ فسطائیت کے اس دور میں جبر وظلم حاوی ہو جانا، ملیا میٹ کر دینا، دنیا سے وجود ختم کرنا، وغیرہ فقرے زبان زد ہو گئے تھے۔فرقہ پرستوں کا یہ مسلک بنتا جارہا تھا کہ جھوٹ جتنا بڑا ہو، اتنا ہی بڑا کام کرے گا۔وہ کانگریس اور گاندھی جی پر اپنا زہر تو اگلتے ہی تھے، اپنے ہم مذہب قوم پرستوں کو بھی لعن طعن کا ہدف بناتے تھے۔

فرقہ واریت کا سماجی دائرہ تیزی سے بڑھنے لگا اور وہ عوام کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگی۔شہر کے نیچے طبقہ کے لوگوں کو مشتعل کر کے ان کو متحد اور منظم کرنے کی جارحانہ سیاست شروع ہوگئی اس کے لیے ایسے مسئلہ یا نعرہ کی ضرورت تھی جو لوگوں کے جذبات سے کھیل کر ان کو آمادۂ شر کر سکے۔اگر چہ سماج کے اونچے طبقہ میں فرقہ واریت کی جڑیں کافی مضبوط تھیں مگر وہ طبقہ رجعت پسند تھا، اس لیے مالی مسائل کے انقلابی پہلو کو چھیڑنے کی بات مشکل تھی۔ دوسرے لفظوں میں سماج کے مالی یا سیاسی یا نظریاتی اساس پر کوئی پروگرام چلانا ناممکن کاوش تھی۔ ایسے حالات میں مذہب کو حربہ بنا کر خوف وہراس، نفرت وتعصب جیسے بیجا جذبات بھڑکا کر لوگوں کو مشتعل کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔

معتدل فرقہ واریت کئی وجوہات سے متشدد فرقہ واریت میں تبدیل ہوگئی۔قومیت (Nationalism) کی ترقی اور 34-1930 کے دوران سول نافرمانی کی وجہ سے 1937 کے انتخابات میں کانگریس ایک غالب سیاسی طاقت کی حیثیت سے ابھر آئی۔زمینداروں کی مختلف پارٹیاں اور وہ پارٹیاں جو اپنا الوسیدھا کرنا چاہتی تھیں، بری طرح پٹ گئیں۔اس کے علاوہ مزدور، کسان اور نوجوان طبقے، بائیں بازو کے نظریات سے متاثر ہو رہے تھے۔اس لیے قومی تحریک کی مالی اور سیاسی پالیسیوں میں انقلابی تبدیلی آرہی تھی۔ایسے ماحول میں زمینداروں اور زمین مالکوں کو اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کی فکر تھی۔اسی غرض کے تحت انھوں نے فرقہ واریت کی طرف رخ کیا۔یہ کیفیت صرف یوپی اور بہار میں ہی نہیں تھی بلکہ پنجاب اور بنگال میں بھی زمیندار اپنے طبقاتی مفاد کے تحفظ کے لیے تگ ودو کر رہے تھے۔مثلاً پنجاب کے بڑے زمیندار اور مسلم نوکر شاہ، نیم فرقہ پرست یا نیم برادری پرست اور یونینسٹ (Unionist) پارٹی کے

طرفدار برٹش حکومت کے وفادار تھے، لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی پارٹی تو صوبائی سطح کی ہے اور اس طرح وہ ان کو کانگریس کی کایا پلٹ پالیسی سے بچا نہیں سکتی، تو 45-1937 کے دوران وہ دھیرے دھیرے مسلم لیگ کی پناہ میں چلے گئے۔ لیگ نے ان کے مفادات کے تحفظ کا پورے بھروسے سے وعدہ کیا۔ ٹھیک یہی حالت بنگال کے مسلم زمینداروں اور جوت داروں کی تھی۔ پنجابی اور مغربی ہندوستان کے زمیندار، ساہوکار اور تاجر بھی فرقہ وارانہ پارٹیوں اور جماعتوں میں شامل ہونے لگے۔ ان لوگوں کو اپنی طرف موڑنے کے لیے وی۔ ڈی۔ ساور کرنے زمینداروں اور اسامیوں کے درمیان اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ہو رہی کشمکش کی مذمت کرنا شروع کیا۔ اسی طرح پنجاب میں ہندو فرقہ پرست مہاجنوں اور تاجروں کے مفادات کے بچاؤ میں وہ پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے۔

1937 کے بعد فرقہ واریت کلونیل سرکار کے افسروں کا واحد سیاسی حربہ بن گیا اور بانٹو اور راج کرو، ان کی سیاسی پالیسی بن گئی۔ اس کے پہلے جو بھی طریقے انھوں نے ہندستانی عوام کو بانٹنے کے لیے اپنائے تھے وہ قومی تحریک کے ذریعہ ایک ایک کر کے ناکام کر دیے گئے تھے۔ مہاراشٹر میں غیر برہمنوں کا چیلنج دھیرے دھیرے خاموش ہو گیا تھا۔ درج فہرست اور پچھڑی ذاتوں میں، کچھ چھٹ پٹ علاقوں کو چھوڑ کر، کسی کو بھی کانگریس کے خلاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کانگریس کے دائیں اور بائیں بازو کے خیمے اب ٹوٹ کر الگ ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لسانی اور صوبائی جھگڑوں کو بھی کانگریس نے ختم کر دیا تھا۔ اس نے بھاشا پر قائم صوبوں اور ملک کی گوناگوں تمدن کو تسلیم کر لیا تھا۔ زمینداروں اور زمین مالکان کو قومی تحریک کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش بھی پوری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ 1937 کے انتخابات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ برٹش حکومت کی سماجی اور سیاسی جڑیں ہل گئی ہیں۔ اب برٹش حکمرانوں کے پاس صرف ایک ہی پتا تھا........ فرقہ واریت اور انھوں نے اس کا پورا پورا استعمال کرنے کے لیے سب کچھ داؤں پر لگا دینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے مسلم فرقہ واریت کو ہوا دینے میں اپنی پوری طاقت جھونک دی جس کی قیادت محمد علی جناح کر رہے تھے حالانکہ وہ ان کو مطلق پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی برٹش دشمنی اور آزادی کی چاہت سے سخت خوفزدہ تھے۔

ایک ستمبر 1939 سے دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور اب فرقہ وارانہ کارڈ کی اہمیت

برٹش حکومت کے نزدیک اور بڑھ گئی۔ کانگریس نے اپنے وزرا سے استعفے دلا دیے اور برٹش حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جنگ کے بعد مکمل آزادی دینے اور سارے سرکاری اختیارات فوراً سونپنے کا اعلان کرے۔ اس طرح کے قومی مطالبوں کو ناکام کرنے اور ہندستانی عوام کو منقسم کرنے کے لیے مسلم لیگ کا سہارا لیا گیا۔ اس کی پالیسیاں کانگریس سے مختلف تھیں اور مطالبوں میں تضاد تھا۔ لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ پارٹی تسلیم کرلیا گیا۔ اس کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی سیاسی سمجھوتہ کے خلاف اپنا ویٹو (Veto) استعمال کرسکتی ہے۔ اس کے بعد یہ کہا گیا کہ ہندوستان کو اس وقت تک آزاد نہیں کیا جاسکتا ہے جب تک ہندو اور مسلم متحد نہیں ہو جاتے ہیں۔ مگر مسلم فرقہ واریت کو حکومت کے ذریعہ جس طرح تھوک حمایت دی جارہی تھی اس کے تحت دونوں فرقوں میں اتحاد پیدا کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اس حمایت کے بدلے مسلم لیگ اس کو تعاون دینے اور اس کا سیاسی حربہ بننے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کے پیچھے اس کے اپنے مفادات تھے۔ ہندومہا سبھا، سکھوں اور ہندوؤں کی دوسری فرقہ پرست تنظیموں نے جنگ کے دوران مدد دینے کی پیش کش کی۔ حکومت نے ان کی پیش کش کو قبول تو کرلیا مگر مسلم لیگ کے تئیں کیے گئے وعدوں کا پابند وہ جنگ کے دوران بلکہ اس کے بعد بھی بنی رہی۔

مسلم لیگ اور ہندومہا سبھا دونوں نے 1937 میں الیکشن کا پرچار معتدل فرقہ وارانہ خطوں پر کیا۔ ان دونوں نے اپنے الیکشن منشور (Manifesto) میں زراعتی عنوانات کے علاوہ کانگریس کے بہت سے پروگرام شامل کرلیے تھے۔ مگر الیکشن کے نتائج ان کے لیے بہت مایوس کن ثابت ہوئے۔ علاحدہ انتخابی سسٹم کے تحت مسلمانوں کو دی گئی 482 سیٹوں میں مسلم لیگ کے صرف 109 حلقوں میں کامیابی ملی۔ کل مسلم ووٹ کا اس کو صرف 4.8% ووٹ حاصل ہوا۔ ہندومہا سبھا کی پوزیشن اس سے بھی بدتر تھی۔

اس لیے فرقہ پرستوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ عوام میں اپنی گرفت مضبوط نہیں کرتے ہیں اور لڑاکا روش نہیں اپناتے ہیں تو دھیرے دھیرے ان کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ابھی تک جمعیت پر قائم سیاست اور عوامی تحریکیں انقلاب پسند قوم پرستوں کے ذریعہ چلائی گئی تھیں۔ یہ لوگ موجودہ اقتصادی اور سیاسی نظم کے تحت مخالف تھے۔ قدامت پسند عوامی تحریکوں سے دور تھے۔ 1930 میں عوامی سیاست کا دائیں بازو والا ماڈل ابھر کر سامنے آیا۔ اس فسطائی ماڈل میں اپنے

مطلب کی سیاست کرنے والوں کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے ہندو مسلم دونوں فرقہ پرستوں نے اس ماڈل کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چونکہ عوام کے سبھی طبقوں خصوصاً مسلم عوام میں کانگریس کی جڑیں اچھی طرح نہیں جم پائی تھیں۔ اس لیے بغیر وقت ضائع کیے مسلم عوام کی سیاسی ناپختگی کا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ مسلم فرقہ پرستوں کو یہ کام فوری طور سے اس لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کیونکہ کانگریس نے جواہر لعل نہرو کی قیادت میں مسلم عوام میں بڑے پیمانے پر تعلق قائم کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔ اس سرگرمی کو نام دیا گیا۔ ''مسلم عوام سے رابطہ قائم کرنے کا پروگرام'' (Muslim Mass Contact Programme)۔

انتہا پسندانہ فرقہ واریت کے بڑھنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ 1920 کی دہائی کے اواخر میں کانگریس نے مسلمانوں کے بہت سے فرقہ وارانہ مطالبے منظور کر لیے تھے۔ اس کے علاوہ 1932 کے کمیونل اوارڈ (Communal Award) اور پھر 1935 کے انڈیا ایکٹ کے ذریعہ معتدل فرقہ پرستوں کے قریب قریب سبھی مطالبے حکومت کے ذریعہ تسلیم کر لیے گئے تھے۔ اس لیے اب ان کے پاس اپنی سیاسی دکان چلانے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ ایسے حالات میں وہ دو ہی کام کر سکتے تھے کہ یا تو وہ اپنی دکان سمیٹ کر سیاسی خودکشی کر لیں یا پھر نئے خطروں کا ہوّا کھڑا کر کے مطالبات کا نیا پٹارا کھولیں۔ ایسی صورت میں ان کو انتہا پسند فرقہ واریت کی طرف بڑھنا ہی چاہیے تھا۔ ہندو فرقہ پرستوں کی بھی کم وبیش یہی حالت تھی۔ ان پر بھی بریک لگی ہوئی تھی۔ کانگریس نے 1937 تک ہندو مسلم دونوں فرقہ پرستوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ مگر اب جواہر لعل نہرو اور بائیں بازو کے زیر اثر کانگریس ان پر مستقل ہلّہ کر رہی تھی۔ 1934 سے 1937 تک کے انتخابات میں اس نے ان کو اپنے درمیان کوئی جگہ نہیں دی۔ اور بعد میں ان کو اپنی تنظیم سے نکال تک دیا۔ ہندو فرقہ پرستوں کے سامنے اب تو وجود کا خطرہ بھی منڈلانے لگا۔ ان کو بھی سیاسی سطح پر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے نئی زمین اور نئے پروگرام کی تلاش تھی۔

فرقہ واریت کی اپنی دلیل ہوتی ہے اور اگر شروع میں اس کے پر نہ کترے گئے تو اس کا بڑھنا اور متشدد ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ محمد علی جناح کی سوانح حیات سے اس قول کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ فرقہ واریت کا راستہ ڈھالو ہوتا ہے۔ اگر روکنے کے جتن نہ کیے جائیں تو آدمی اس

پر نیچے ہی پھسلتا جاتا ہے اور اگر آدمی فرقہ واریت کی بنیادی باتوں کو ایک بار تسلیم کر لیتا ہے، تو اس کی اپنی منشا چاہے جو ہو، وہ اسی نظریہ سے متحرک ہونے لگتا ہے، ورنہ کوئی اور وجہ نہیں تھی کہ ''ہندو مسلم اتحاد کے سفیر'' کی حیثیت سے جس آدمی نے اپنی سیاسی زندگی شروع کی ہو، وہ آخر میں پاکستان کا مطالبہ کیسے کرنے لگا؟

محمد علی جناح جب 1906 میں بیرسٹر بن کر ہندوستان واپس ہوئے، تب وہ سیکولر، حریت پسند، قوم پرور اور دادا بھائی نوروجی کے پیرو تھے۔ ہندوستان آتے ہی وہ کانگریس میں شامل ہو گئے۔ 1906 میں کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں انھوں نے دادا بھائی نوروجی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ انہی دنوں مسلم لیگ وجود میں آ رہی تھی۔ جناح اس کے سخت مخالف تھے۔ بعد میں آغا خاں جو لیگ کے پہلے صدر تھے نے لکھا کہ ''جناح نے ان سبھی کاموں کی مخالفت کی جو میں نے اور میرے دوستوں نے کیا تھا اور اب بھی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا (جناح کا) خیال تھا کہ ہمارا علاحدہ انتخابی حلقوں کا سسٹم، قوم کی تقسیم کر رہا ہے۔[1] 1906 میں جناح نے جو بھی عوامی تقریریں کیں ان سب میں انھوں نے قومی یکجہتی پر زور ڈالا۔ اسی سے متاثر ہو کر سروجنی نائڈو نے ان کو ''ہندو مسلم اتحاد کا سفیر'' لقب سے نوازا۔

فرقہ واریت کے سمت میں جناح کا پہلا قدم بغیر ان کی منشا کے اس وقت اٹھا جب وہ علاحدہ انتخابی سسٹم کے تحت بمبئی سے مرکزی قانون ساز کونسل سے مسلم امیدوار کی حیثیت سے منتخب ہوئے، لیکن اس سمت میں ان کی حقیقی پھسلن تب شروع ہوئی جب وہ خالص قوم پرست سے فرقہ پرور قوم پرست ہو گئے یعنی جب وہ 1913 میں مسلم لیگ میں باقاعدہ داخل ہوئے۔ اس وقت بھی وہ بنیادی اعتبار سے نیشنلسٹ ہی تھے۔ وہ اب بھی کانگریس میں شامل تھے اور علاحدہ انتخابی سسٹم کی مخالفت یہ کہہ کر کرتے تھے کہ اس سے ملک دو خیموں میں تقسیم ہو جائے گا۔ لیکن اب انھوں نے مسلم لیڈر اور ترجمان کا کردار اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح کا ان کا دوہرا روپ لکھنؤ میں ہوئے کانگریس لیگ معاہدہ کے دوران پورے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ یہ معاہدہ، تلک اور جناح نے مل کر تیار کیا تھا۔ مسلم فرقہ واریت کے ترجمان کی حیثیت سے جناح نے کانگریس سے علاحدہ انتخابی سسٹم اور فرقہ وارانہ رزرویشن منوالیا تھا، لیکن اب بھی وہ سیکولر سیاست اور قومیت کے پابند تھے۔ رولٹ ایکٹ پاس ہو جانے پر انھوں نے قانون ساز کونسل

سے ایکٹ کے احتجاج میں استعفےٰ دے دیا۔ وہ اس وقت فرقہ وارانہ رجحان کی تردید کرتے تھے کہ ہندوستان میں سیلف گورنمنٹ کا مطلب ہوگا ہندو راج، وہ یہ مانتے تھے کہ ملک میں سبھی لوگوں کا اصلی سیاسی مسئلہ ایک ہی ہے اور وہ ہے ''ہوم رول'' یعنی اقتدار کا نوکر شاہی سے جمہوریت کی طرف ٹرانسفر۔[2]

1919-20 میں کانگریس نے سیاسی موڑ لیا۔ اس نے موجودہ قانونوں کو توڑنے کے لیے عوامی تحریک شروع کی۔ جناح اس سے متفق نہیں تھے۔ اب ان کے لیے گاندھی جی کے ساتھ چلنا ناممکن ہوگیا۔ دوسرے اعتدال پسند لیڈروں کی طرح ہی جو آزادی کے لیے برسر جنگ تھے مثلاً بپن چندر پال، تیج بہادر سپرو، سی۔ شنکرن نائر نیز دوسرے اور لوگوں کے ساتھ جناح نے کانگریس ترک کر دی۔ انھوں نے یہ بھی تصور کیا کہ معتدل سیاست کا مستقبل روشن نہیں ہے اور چونکہ وہ سیاست سے سنیاس نہیں لینا چاہتے ہیں، اس لیے وہ اعتدال پسند لیڈروں کی طرح فرقہ پرستی کی سیاست کی طرف مڑ کر اعتدال پسند فرقہ پرست ہوگئے۔ آخرکار ان کی فرقہ درایت کا منطق خود بخود ان پر اثر انداز ہوگئی اور اس نے پہلے ان کو قوم پرست سے فرقہ پرست قوم پرست اور پھر اعتدال پسند فرقہ پرست میں بدل دیا۔

1920 دہائی کے دوران جناح کی قومیت پر فرقہ پرستی پوری طرح غالب نہیں تھی۔ 1924 میں انھوں نے بے جان مسلم لیگ میں روح پھونکی اور مسلمانوں کے مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی۔ انھیں کو حربہ بنا کر اس کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ ان کی سیاست فرقہ وارانہ نہج پر کام کر رہی تھی کہ مسلمانوں کی ایک الگ جماعت بنانا چاہیے۔ ان کو متحد ہونا چاہیے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے سبھی مناسب باتوں پر زور دینا چاہیے۔[3] اس کے ساتھ ساتھ دوبارہ ہوئے لکھنؤ معاہدہ کی بنیاد پر وہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی زور دیتے تھے تاکہ برٹش حکومت کے خلاف مل کر لڑا جا سکے۔ مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں سرکاری پالیسیوں اور کاموں کی مخالفت میں وہ سوراجیوں کے ساتھ تھے۔ 1925 میں جب ایک مسلم نوجوان نے یہ کہا کہ میں مسلمان پہلے ہوں، تب انھوں نے اس کو سمجھایا بیٹا، تم ہندستانی پہلے ہو اور مسلمان بعد میں۔[4] 1927-28 میں انھوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید کی گو اس کے خلاف ہونے والے مظاہرہ میں شامل ہونے سے انھوں نے منع کر دیا۔

مگر فرقہ پرست لوگ ہی اب تک ان کا سماجی سرمایہ تھے۔اب اگر وہ فرقہ داریت ترک کر دیتے،تو ان کے سیاسی اثرات ختم ہو جاتے۔ یہ حقیقت 29-1928 میں نہرو رپورٹ پر بات چیت کے دوران واضح بھی ہو گئی۔اس طرح ایک ایک قدم نیچے اترتے ہوئے انھوں نے بے انتہا رجعت پسند فرقہ داریت کے سامنے سپر ڈال دیے،جس کی قیادت آغا خان اور محمد شفیع کر رہے تھے۔ اس کے عوض میں ان کو نہ صرف ایم۔اے۔انصاری،ٹی۔اے۔کے شیروانی اور سید محمود جیسے قوم پرور لوگوں بلکہ ایم۔سی۔ چھاگلا جیسے پرانے سپہ سالاروں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ان کے پھسلن کی سب سے نمایاں علامت وہ چودہ نکاتی مطالبے جس میں مسلم فرقہ داریت کے سب سے زیادہ زہریلے اور رجعت پسند حصے کو شامل کیا گیا تھا۔یہ مطالبے جناح نے بذات خود تحریر کیے تھے۔

کانگریس نے 1930 میں جب زوردار عوامی تحریک چلائی اور وہ مالی انقلابات بپا کرنے کے پروگراموں کی طرف بڑھنے لگی تب جناح قوم کی خاص دھارا سے الگ تھلگ ہو گئے۔اس کے علاوہ مسلم عوام کا خاص طور سے نوجوان طبقہ قومی اور بائیں بازو کی سیاست اور نظریہ کی طرف تیزی سے مائل ہو رہا تھا۔ایسے حالات میں جناح بڑے تذبذب میں تھے کہ کیا کریں۔اس لیے انھوں نے اپنا زیادہ تر وقت انگلینڈ میں گذارنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن جناح ایسے آدمی نہیں تھے کہ سرگرم سیاست سے زیادہ عرصہ تک دور رہتے۔ 1936 میں وہ ہندوستان واپس آ گئے اور ایک بار پھر مسلم لیگ کو زندہ کر دیا۔شروع میں وہ معتدل فرقہ پرستی کی راہ پر چلنا چاہتے تھے۔پورے سال انھوں نے قومیت اور آزادی کی چاہت پر زور دیا۔ہندو مسلم اتحاد پر برابر تقریریں کیں۔مارچ 1936 میں انھوں نے کہا کہ ''میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ انڈین نیشنل کانگریس میں داخل ہونے کے بعد میں نے جو کچھ کیا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔میں ذرا بھی نہیں بدلا ہوں۔ہو سکتا ہے بعض اوقات مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں،مگر بیجا طرفداری کے جذبات کے تحت ایسا نہیں ہوا ہے۔ہمارا واحد مقصد ملک کی بھلائی رہا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کی بھلائی ہی چاہتا ہوں اور ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔کوئی چیز مجھ کو اس سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا سکتی ہے''[5] ایک طرف انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ الگ سے (ایک قوم کی حیثیت سے) متحد ہوں اور دوسری طرف ان سے یہ بھی کہا کہ وہ ثابت کر دیں کہ ان کی حب الوطنی بے داغ ہے اور ہندوستان اور اس کی ترقی سے

ان کو جتنا پیار ہے وہ ملک کے کسی دوسرے فرقہ سے کسی طرح کم نہیں ہے'' 6

شاید جناح کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کی مدد سے اتنی زیادہ سیٹیں حاصل کر لیں کہ کانگریس کو ایک اور لکھنؤ معاہدہ کے لیے تیار ہونا پڑے۔ انتخابات میں کانگریس کے حصہ لینے کا مطلب انھوں نے یہ لگایا کہ وہ گاندھی جی کے پہلے کی آئینی سیاست کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کچھ تو اس کے تحت اور کچھ اس لیے کہ فرقہ وارانہ مطالبوں کی جھولی اب خالی ہو گئی تھی کیونکہ جناح اور لیگ نے جس نہج پر الیکشن لڑا تھا وہ کانگریس سے ملتا جلتا تھا اس میں صرف یہی مسلم مطالبہ شامل کیا گیا کہ اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے اور مسلمانوں کی زندگی کے عام حالات میں بہتری لائی جائے۔

لیکن الیکشن کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا کہ جناح کا کوئی بھی قیاس صحیح نہیں تھا۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے یا تو وہ اسی نیم قومی معتدل فرقہ وارانہ سیاست سے چپکے رہیں جس کی کامیابی کے سارے امکانات مٹ چکے ہیں یا پھر فرقہ وارانہ سیاست ہی ترک کر دیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو اپنانے سے ان کی سیاسی موت ہو جاتی۔ البتہ ایک تیسرا راستہ بھی تھا کہ وہ عوامی سیاست اپنا لیں اور لیگ کے نیم جاگیردارانہ اور وفادارانہ نظریہ کے تحت اور خود اپنے نقطۂ فکر کو اساس بنا کر جو سماجی، سیاسی اور مالی لحاظ سے رجعت پسندانہ تھا، یہ کہرام مچائیں کہ ''اسلام خطرے میں ہے'' ''ہندو راج قائم ہو جائے گا''۔ 38-1937 میں جناح نے تیسرا راستہ اپنایا۔ نفرت اور خوف کے اصول پر قائم اس نئی سیاست کو آگے بڑھانے میں انھوں نے اپنی ساری قابلیت اور صلاحیت جھونک دی۔ فرقہ پرست لیڈروں میں سب سے قد آور شخص نے مسلمانوں کے درمیان اپنے تمام سیاسی پرچار کا مقصد ان میں نفرت اور عدم تحفظ کے جذبات پیدا کرنا بنا لیا تھا اور ان کو یہ باور کرانے لگا تھا کہ کانگریس ملک کی آزادی نہیں چاہتی ہے بلکہ وہ تو برٹش سرکار سے مل کر ہندو راج قائم کرنا، مسلمانوں پر حاوی ہونا اور یہاں تک کہ ہندوستان سے اسلام کا نام و نشان مٹا دینا چاہتی ہے۔

اس کی کچھ مثالیں پیش ہیں۔ 1938 میں لیگ کا صدر منتخب کیے جانے پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے جناح نے کہا کہ ''کانگریس کا اعلیٰ کمان دوسرے سبھی فرقوں اور ان کے تمدن کو ختم کرنے اور ملک میں ہندو راج قائم کرنے کے لیے پوری طرح در پے ہے'' 7 مسٹر

گاندھی کی منشا مسلمانوں کو ہندو راج میں غلام و تابع دار بنانے کی ہے۔8 مارچ 1941 میں علی گڑھ میں انھوں نے کہا کہ "اگر آپ اسلام کو پوری طرح ختم ہونے سے روکنا چاہتے ہیں، تو پاکستان کا عملاً وجود واحد راستہ ہے"۔9 اپریل 1941 میں جناح نے اپنی صدارتی تقریر میں اعلان کیا کہ "متحد ہندوستان (United India) میں مسلمان صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے"۔10 عبوری سرکار (Interim Government) پر چرچہ کرتے ہوئے 18/ اگست 1946 میں انھوں نے "اشرف ہندوؤں کی فسطائی کانگریس" کا ذکر کیا جو برٹش سنگینوں کی مدد سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر حاوی ہونا اور حکومت کرنا چاہتی ہے"۔11 آج اگر ہم اپنا فرض ادا نہیں کرتے تو آپ کی حالت شودروں جیسی کر دی جائے گی اور اسلام ہندوستان سے مات کھا کر وداع ہو جائے گا"۔12

جب جناح جیسے قد آور لیڈر نے سیاست کو اس معیار تک پہنچا دیا تو اوسط فرقہ پرست داعی کا معیار اور بھی گھٹیا ہونا لازمی تھا۔ زیڈ۔ اے۔ سولیری اور ایم۔ ایم۔ درّانی جیسے لوگوں نے تو گوبلز (Goebbelse) کو بھی اپنی شعلہ بیانی سے مات کر دیا تھا۔13 فضل الحق جیسے شخص جو بنگال کے پریمیر (Premier) کے ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے انھوں نے 1938 میں لیگ کے اجلاس میں کہا کہ "کانگریس سرکار کے صوبوں میں فسادنے دیہاتوں کو تہس نہس کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے جان و مال کو خاک میں ملا دیا گیا۔ ان کی جائیدادیں لوٹ لی گئیں اور ان کا خون بے تحاشہ بہایا گیا۔ وہاں مسلمان ہندوؤں کے ظلم کے سایہ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ان پر مستقل خوف و ہراس طاری ہے۔ ان کی مسجدوں کو ناپاک کیا جا رہا ہے اور مجرم آزاد ہیں۔ مسلم نمازیوں کو بھی بغیر ستائے نہیں بخشا جاتا ہے"۔14 سندھ کے خاص لیگی نیتا ایم۔ ایچ غضدر (M.H.Gazder) نے مارچ 1941 میں کراچی کے ایک جلسہ میں کہا کہ "اگر ہندو بھلمنساہت سے پیش نہیں آتے تو ان کو اسی طرح ختم کرنا ہوگا جیسے جرمنی میں یہودیوں کو ختم کیا گیا تھا"۔15 چونکہ جناح کی تقریر کا لہجہ بھی کچھ اسی طرح ہوتا تھا، اس لیے وہ ان لیڈروں کو ایسی ناشائستہ زبان بولنے سے قطعی نہیں روک سکتے تھے۔

مسلم فرقہ پرستوں نے قوم پرست مسلم لیڈروں کے خلاف بہت گھٹیا درجہ کی مہم چلا رکھی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں کو کانگریس کے "نمائشی بچے" "اسلام

کے غدار' اور 'ہندوؤں کے بھاڑے کے ٹٹو' بتایا۔ 47-1945 کے دوران ان کے خلاف مذہبی پرچار کر کے ان کو خوفزدہ کیا گیا۔ ان کو جسمانی اذیت پہنچانے کی دھمکی دی گئی۔ اپریل 1943 میں جناح نے اپنی صدارتی تقریر میں خان عبدالغفار خاں کے بارے میں کہا کہ ''انھوں نے ہندو اثرات کو پھیلانے اور جنگجو پٹھانوں کو بدھیا بنانے کا ذمہ لے رکھا ہے''۔16

اب مذہب ہی سیاسی پرچار کا محور تھا۔ 1946 میں مسلمانوں سے مذہب کے نام پر لیگ کو ووٹ دینے کی اپیل کی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ لیگ کو ووٹ دینے کا مطلب ہے اسلام کو ووٹ دینا۔ لیگ کی زیادہ تر میٹنگیں بعد نماز جمعہ مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ ان میں عہد کیا جاتا تھا کہ پاکستان میں حکومت شریعت کے مطابق ہوگی۔ مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ مسجد اور مندر میں ایک کو چن لیں۔ قرآن کا استعمال لیگ کی علامت کے طور پر کیا گیا اور لیگ کی لڑائی کو اسلام اور کفر کی لڑائی بتائی گئی۔

اس معاملہ میں ہندو فرقہ واریت بھی پیچھے نہیں تھی۔ اس کا بھی نشانہ وہی تھا۔ 1920 کی دہائی کے دو خاص معتدل ہندو فرقہ پرست لیڈر لالہ لاجپت رائے اور مدن موہن مالویہ سیاسی اسٹیج سے غائب تھے۔ لالہ لاجپت رائے کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور مالویہ بھی جناح کی طرح حالات کے تحت اور خراب تندرستی کے بہانے سرگرم سیاست سے 1937 میں سنیاس لے چکے تھے۔ چونکہ ہندو فرقہ واریت کو باقی رہنا تھا، اس لیے اس نے انتہا پسندی یا فسطائیت اختیار کر لی۔ نئے فرقہ پرست لیڈر منظر عام پر آگئے۔ وی۔ ڈی۔ ساورکر کی قیادت میں ہندو مہاسبھا تیزی سے فسطائیت کی طرف مڑ گئی۔ آر۔ ایس۔ ایس۔ (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) کو شروع سے ہی فسطائی نہج پر منظم کیا گیا تھا۔ اب اس کی شاخیں مہاراشٹر کے باہر بھی قائم ہونے لگی تھیں۔

وی۔ ڈی۔ ساورکر ہندوؤں کو باخبر کر رہے تھے کہ مسلمان ہندوؤں کو محکوم بنانا چاہتے ہیں۔ 1937 میں انھوں نے کہا کہ ''مسلمان، ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم طبقوں پر غالب ہونا چاہتے ہیں۔ اور ہندوؤں کو ان کے ہی وطن میں غلام بنا لینا چاہتے ہیں''۔17 1938 میں انھوں نے مزید کہا کہ 'ہندو تو پورے ملک میں غلام کی حد تک پہنچا دیے گئے ہیں''۔18

انتہا پسند فرقہ واریت آر۔ ایس۔ ایس کا خاص نقطۂ نظر تھا۔ اس کے قائد ایم۔ ایس۔ گولواکر نے آر۔ ایس۔ ایس کے اصولوں کو 'وی' (We) نام کے کتابچہ میں ترتیب دیا تھا۔

1939 میں انھوں نے اعلان کیا کہ "اگر اقلیت کے مطالبے تسلیم کر لیے گئے، تو ہندوؤں کی قومی زندگی درہم برہم ہوجائے گی"[19] اس کے علاوہ انھوں نے مسلم اور کانگریس لیڈروں پر حملے بھی کیے۔ انھوں نے نیشنلسٹوں پر الزام لگایا "کہ وہ ہمارے پرانے اور کٹر دشمنوں کو (مسلمانوں کو) سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے وجود کو ہی خطرہ پیدا ہوگیا ہے"[20] انھوں نے نیشنلسٹوں کی اس لیے بھی مذمت کی کہ وہ ان کے پرانے دشمنوں اور حملہ آوروں کو بدیشی نام "ہندستانی" کے زمرے میں رکھنے لگے ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ "کہ ہم اپنے دشمنوں کو دوست سمجھ کر دھوکا کھا رہے ہیں۔ اصل خطرہ یہی ہے۔ ہم خود کو بھول گئے ہیں اور اپنے کٹر دشمن کو دوست سمجھ بیٹھے ہیں"[21] مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو گولوا کر نے یہ صلاح دی کہ "یا تو ان کو ہندو تہذیب اور زبان اپنانی ہوگی، ہندو مذہب کا احترام کرنا سیکھنا ہوگا اور ہندو قوم کی برتری قبول کرنی ہوگی، ان کو ہندو کلچر اور قوم کا گن گان کرنا ہوگا۔ ان کو ملک کے تئیں کی جارہی غیر رواداری اور بے وفائی کے رجحانات کو ترک کر دینا چاہیے اور اس کی صدیوں پرانی ہندو روایتوں کو محبت اور عقیدت سے دیکھنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ اس طرح ان کا بدیشی پن ختم ہوجائے گا یا پھر وہ ہندوؤں کے تابع بن کر رہ سکتے ہیں اور خصوصی رعایتوں کی بات تو درکنار ان کو شہریت کے عام اختیارات سے بھی محروم رہنا پڑے گا"[22] ایک قدم اور آگے بڑھ کر انھوں نے کہا کہ "ہم ہندو دو مورچوں پر لڑ رہے ہیں ایک طرف مسلمانوں سے اور دوسری طرح برطانیہ سے"[23] انھوں نے مزید کہا کہ اٹلی اور جرمنی دو ایسے ممالک میں جہاں نسلی فخر دوبارہ جاگ اٹھا ہے۔ ہماری بھی یہی کیفیت ہے۔ ہمارا نسلی جذبہ پھر سے بھڑک اٹھا ہے۔ اس طرح ہندوؤں کو یہ حق مل گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو نکال باہر کریں"[24] 47-1946 میں آر۔ ایس۔ ایس نے کانگریس لیڈروں پر اپنا حملہ اور تیز کر دیا۔ بالکل فسطائی انداز میں اس نے کانگریس پر الزام لگایا کہ وہ (کانگریس) ہندوؤں کو مسلمانوں کی غنڈہ گردی کے سامنے سپر ڈالنے کی صلاح دے رہی ہے اور ان کو باور کرا رہی ہے کہ ان کے اندر وطن کی خاطر لڑنے کے لیے کوئی قوت نہیں ہے اور جب تک ان کو مسلم خون کا انجکشن نہیں دیا جاتا، وہ کچھ نہیں کر سکتے، گاندھی جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ جن لوگوں نے یہ نعرہ دیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سوراج نہیں مل سکتا، انھوں نے ہمارے سماج کے ساتھ سب سے بڑی غداری کی ہے اور انھوں نے ایک عظیم اور قدیم قوم کی طاقت کو ضائع

کرنے کا سب سے گھناؤنا کام کیا ہے۔ اس نے گاندھی جی پر ان کے اس قول کے لیے لعن وطعن کیا کہ "ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سوراج نہیں حاصل ہو سکتا۔ اور اس کے حصول کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ سارے ہندو مسلمان ہو جائیں" 25

ہندو فرقہ پرستوں نے بھی آواز بلند کرنے کی کوشش کی کہ ہندو مذہب، ہندو عقیدہ، اور ہندو کلچر یا سنسکرتی سب خطرے میں ہے۔

اس طرح نفرت اور خوف کے جو بیج بوئے جا رہے تھے، ان کی فصل سب سے پہلے کلکتہ میں کاٹی گئی، جہاں اگست 1946 کے فسادات میں پانچ دنوں کے دوران پانچ ہزار لوگوں کی جانیں گئیں۔ پھر تو خونی ڈرامہ ہی شروع ہو گیا............ نواکھالی و بنگال میں ہندوؤں اور بہار میں مسلمانوں کی زبردست خوں ریزی اور بعد میں گاندھی جی کا قتل۔ لیکن سب سے زیادہ نقصان ہوا ان مسلمانوں کا جو پاکستان میں رہ گئے یا بعد میں وہاں چلے گئے۔ پاکستان بننے کے بعد جناح نے معتدل فرقہ پسندی بلکہ سیکولرازم کی طرف لوٹنے کی کوشش کی۔ 11/اگست 1947 کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں صدارت کی کرسی سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "آپ کسی بھی دھرم یا مذہب یا ذات برادری کے ہو سکتے ہیں، اس کا حکومت کے کام کاج سے کوئی لینا دینا نہیں ہے........ ہم اس بنیادی اصول کو مان کر چل رہے ہیں کہ ہم سبھی ایک ہی ملک کے برابر کے شہری ہیں...... اب میرے خیال سے یہی مقصد سامنے رکھا جائے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہ جائیں گے....... مذہبی معنی میں نہیں کیونکہ یہ آدمی کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی معنی میں یعنی ملک کے شہری کی حیثیت سے 26 مگر اب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ جناح نے ایسے راکشس کو جنم دیا تھا جس نے نہ صرف ہندوستان کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا بلکہ ان کے اپنے تصور کے پاکستان کو بھی چبا گیا اور پاکستان کے مسلمانوں کا نقصان سیکولر ترین شخص کے تصور اور اس کی پیشین گوئی سے زیادہ کر ڈالا۔ دوسری طرف پاکستان کے بننے اور 1947 کے خون خرابہ کے بعد نیشنلسٹ ہندوستان ایک ایسا نظام حکومت، چاہے جو کمیاں اس میں ہوں، بنانے میں کامیاب ہوا جس کی بنیادیں سیکولر دستور پر قائم ہیں۔ بہرحال نظریات اپنا رنگ ضرور دکھاتے ہیں۔ ان کے اپنے نتائج نکلتے ہیں۔

پچھلے تیں برسوں سے فرقہ وارانہ مسئلہ کے گرد دو خاص مختلف بحثیں چل رہی ہیں۔
پہلی بحث یہ ہے کہ اگر 39-1937 میں جناح سے مصالحت کر لی گئی ہوتی خصوصاً 1937 میں یو پی میں کانگریس اور لیگ کی ساجھا سرکار بنالی گئی ہوتی تو مسئلہ حل ہو گیا ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ جناح کی سیاسی ہوس کو بڑی چوٹ لگی، وہ تلملا اٹھے اور کنارہ کشی کی راہ لے لی۔

اس مسئلہ پر غور کرنے کے پہلے ہم کو یاد رکھنا ہوگا کہ جناح کے ناراض ہونے کے پہلے وہ مکمل طور سے معتدل فرقہ پرست ہو چکے تھے۔ دوسری بات یہ کہ 1937 سے 1939 تک کانگریس لیڈروں نے ان سے مصالحت کرنے کی پوری کوشش کی، مگر فرقہ واریت کی منطق میں وہ گرفتار تھے۔ ان کا کوئی ایسا مطالبہ نہیں تھا جس پر پورے دلائل سے غور کیا جاتا۔ اس کے علاوہ جناح یہ بھی واضح کرنے میں ناکام رہے کہ کانگریس ان کی کون سی بات مان لے جس سے وہ برٹش مخالف جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔ البتہ ان کی ناقابلِ قبول اور واحد شرط یہ تھی کہ کانگریس اپنا سیکولر کردار ترک کر کے خود کو ہندو تنظیم ہونے کا اعلان کرے اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ مانے۔ کانگریس کے لیے اس شرط کا تسلیم کرنا ممکن نہیں تھا۔ راجندر پرشاد کے لفظوں میں ''کانگریس کے ذریعہ اس کو مان لینا اپنے ماضی کو رد کرنے، اپنی تاریخ کو باطل قرار دینے اور اپنے مستقبل سے بے وفائی کرنے کے ہم معنی ہوتا''27 ظاہر ہے، اگر اس شرط پر سمجھوتہ ہو گیا ہوتا تو آج ہم پاکستان کی ہو بہو ہندو نقل یعنی فسطائی ہندو راج میں رہ رہے ہوتے۔ اس لیے مصالحت کے لیے کوئی بات چیت نہیں ہو سکی۔

دراصل جناح اپنے فرقہ وارانہ نظریہ پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ پاکستان کی ان کی مانگ اب ناگزیر ہو گئی تھی، کیونکہ یہی وہ مطالبہ تھا جو پورا نہیں ہو پاتا تھا۔ اس کا متبادل تھا، فرقہ وارانہ سیاست سے انحراف جو جناح کو تسلیم نہیں تھا۔ اس لیے جناح اور ان کی لیگ نے آخر کار شروع 1940 میں دو قومی نظریہ کے تحت مسلمانوں کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ ہندو فرقہ وارایت نے بھی اپنا قدم ادھر بڑھایا۔ چونکہ وہ ہندوستان کے نام سے الگ ہندو راشٹر کی مانگ تو نہیں کر سکتی تھی، اس لیے اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ بھارت میں ایک ہی قوم کے لوگ بستے ہیں اور وہ ہیں ہندو لہٰذا مسلمانوں کو یا تو بھارت سے نکال باہر کرنا چاہیے یا پھر ان کو دوسرے درجہ کا شہری بنا دینا چاہیے۔

1937 میں یو پی کے بارے میں جو فیصلہ ہوا، اس کے پیچھے بھی ایسے ہی اسباب تھے۔ جناح اور لیگ دونوں عوامی سیاست کے خلاف تھے۔ اس لیے لیگ کو سرکار میں شامل کرنے کا مطلب ہوتا سیاست کے پرانے دستور کی واپسی جس میں لوگوں کی حصہ داری برائے نام تھی۔ اس کے علاوہ جناح سرکار میں شرکت کرنے کے سوال پر بات چیت شروع کرنے کے پہلے مسلمانوں کو برٹش حکومت اور کانگریس سے الگ تیسری پارٹی بتا چکے تھے۔ ایس۔ گوپال کے لفظوں میں ''لیگ سے مل کر سرکار بنانے کا مطلب یہ ہوتا کہ کانگریس ہندو کو تسلیم کر کے بھی ہندوستانیوں کی طرف سے بولنے کا اختیار ترک کر چکی ہے''28 نیشلسٹ مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا قدم بے وفائی کا ہوتا۔ اس کے علاوہ 1936 میں فیض پور کے اجلاس میں زراعت کے بارے میں جو انقلابی پروگرام اپنانے کا عہد کیا گیا تھا، اس سے ہٹنا ہوتا کیونکہ لیگ کی دلچسپیاں زمینداروں کے ساتھ تھیں۔ لیگ کے ساتھ رہ کر کسان کی بہبودی کا کوئی بھی قانون پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سماج وادی اور کیمونسٹ نہیں چاہتے تھے کہ نہرو لیگ کے ساجھے کی کوئی سرکار بنائیں۔ ان سب نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر ایسا سمجھوتہ ہو گیا تو وہ اس کے خلاف زبردست عوامی تحریک چلائیں گے۔ اس سے پہلے کہ کانگریس لیگ کے ساتھ مل کر سرکار بناتی، مئی 1937 میں یو پی کے ذیلی الیکشن میں لیگ نے کانگریس امیدوار کے خلاف زوردار مہم چلائی اور نعرہ بلند کیا کہ اسلام خطرے میں ہے جناح نے بذات خود مسلمانوں سے اللہ اور قرآن کے نام پر ووٹ دینے کی اپیل کی۔

بہر حال اگر کوئی لیڈر صرف اس وجہ سے فرقہ وارانہ خباثت اور ناقص تفریق پسندی کی روش پر چلنے لگے کہ اس کی پارٹی کو صوبائی منسٹری میں محض دو سیٹیں نہیں دی گئیں، تو ایسے لیڈر کو کب تک مطمئن رکھا جا سکتا تھا؟ سیاست کھیل نہیں ہے اور تاریخ سازی لوگوں کی سنک سے نہیں ہوتی۔ ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ فرقہ واریت بنیادی اعتبار سے ایسا نظریہ ہے جس کو نہ کبھی مطمئن کیا جا سکا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ بروقت اس کی مخالفت اور اس کا مقابلہ کرنا ہی واجب تھا مگر کانگریس یا قومی تحریک نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہی اس کی کمزوری تھی۔ کیمونسٹوں نے 1942 سے 1946 تک مسلم لیگ کو خوش کرنے کی کوشش کی ان کو امید تھی کہ وہ اچھے لوگوں کو اپنے ساتھ کر لیں گے، لیکن ہوا اس کے برعکس ان کو اپنے بہترین کارکنوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اس لیے

1946 میں کمیونسٹوں نے لیگ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کانگریس اور کمیونسٹ چاہتے تھے کہ بات چیت کے ذریعہ معتدل فرقہ پرستوں کو اپنے ساتھ کرلیا جائے اور ان کو انتہا پسند فرقہ واریت سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ کرلیا جائے، مگر 1937 کے بعد جن لوگوں نے فرقہ واریت کے خلاف آواز اٹھائی وہ قوم پرست ہندو اور مسلمان تھے۔ مالویہ، شیاما پرشاد مکھرجی اور این۔ سی۔ چٹرجی جیسے معتدل فرقہ پرست، ساورکر یا آر۔ ایس۔ ایس کی مخالفت نہ کر سکے۔ اسی طرح اقبال یا دوسرے معتدل مسلم فرقہ پرست لوگوں میں جناح، سلیری، فضل الحق اور دوسرے لیڈروں کی نفرت انگیز کوششوں کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ یہ ان میں شامل تو نہیں ہوئے، مگر خاموش رہے۔

یہ بات بھی سچ نہیں ہے کہ چونکہ کانگریس نے لیگ کی تقسیم کو منظور کرلیا تھا، اس لیے فرقہ واریت کو روکنے میں وہ ناکام رہی۔ شاید اس وقت اس کے سامنے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ اس وقت تک فرقہ واریت بہت دور نکل گئی تھی۔ اگر بروقت ملک کے بٹوارے کو منظور نہ کیا جاتا تو قومی قیادت ایسے وقت میں وطن کو خانہ جنگی میں جھونک دیتی جب کہ پولیس اور فوجیں بدیشی حکمرانوں کے کنٹرول میں تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے سبھی حالات میں مسائل کے فوری حل موجود نہیں ہوتے۔ بلاشبہ 1947 کے حالات میں ایسا کوئی حل موجود نہیں تھا۔ یوں بھی فرقہ واریت کا فوری حل نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لیے بیسوں سال کام کرنا پڑتا ہے، مگر قومی تحریک نے ایسا کچھ نہیں کیا، حالانکہ سیکولرازم کے تئیں وہ پوری طرح پابند رہی۔ گاندھی جی نہ صرف ہندو مسلم اتحاد پر مستقل زور دیتے رہے بلکہ انھوں نے اس کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی۔ جواہر لعل نہرو نے قومیت کا سماجی اور اقتصادی جائزہ بہت گہرائی سے لیا تھا۔ ملک کے قوم پرستوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ہر طرح کی فرقہ واریت کے خلاف نظریاتی مہم چلاتے، اس کا سائنسی جائزہ لیتے، اس کی منشا اجاگر کرتے اور اس کے سیاسی نتائج کا تجزیہ کرتے۔ دراصل انھوں نے فرقہ پرست لیڈروں کی بات چیت پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ کیا اور سیاسی، نظریاتی اور تمدنی مورچوں پر فرقہ واریت سے مقابلہ کرنے کے لیے کوئی مستحکم، پائیدار اور موثر لائحہ عمل نہیں تیار کیا۔ کانگریس اور اس کی قیادت کی یہی بھول تھی۔

باب ۔ 34

ترپوری کے بحران سے کرپس مشن تک

1937 کے انتخابات میں کانگریس کی فتح اور پھر اس کی حکومتوں کے بننے سے انگریزی سرکار کی قوت میں تھوڑی سی تبدیلی آئی۔ بائیں بازو کی پارٹیاں سرگرم ہوئیں اور ان کے نظریات نے قومی خیموں میں مجاہدانہ جذبات پیدا کیے۔ اس لیے قومی تحریک میں دوبارہ ابھار آتا ہوا معلوم پڑنے لگا۔ لیکن ٹھیک انھیں دنوں کانگریس کی چوٹی کی قیادت کو بحران سے گزرنا پڑا۔ یوں، جب، تب، ایسے بحران کانگریس میں برابر آتے رہے تھے۔

سبھاش چندر بوس کو سب کی مرضی سے 1938 میں کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔ 1939 میں انھوں نے دوبارہ لڑا کو سیاست اور انقلاب پسند طبقوں کے نمائندہ کی حیثیت سے صدارت کے عہدہ کے لیے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ 21 جنوری 1939 کو اپنی امیدواری کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ نئی فکر، نئے نظریات، مسائل اور پروگراموں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا ابھار حکومت مخالف جدوجہد کے تیز ہونے سے ہوا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ صدر کا الیکشن مختلف امیدواروں کے ذریعہ مختلف مسائل اور پروگراموں کی بنیاد پر لڑنا چاہیے'' [1] 24 جنوری کو سردار پٹیل، راجندر پرشاد، جے۔ بی۔ کرپلانی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی

کے چار دوسرے ممبران نے جوابی بیان جاری کیا کہ کانگریس کے صدر کے چناؤ کے سلسلہ میں نظریات، پروگراموں اور پالیسیوں کی بات کرنا فضول ہے کیونکہ ان کے بارے میں فیصلے کانگریس کی مختلف کمیٹیوں کے ذریعہ کیے جاتے ہیں اور کانگریس کے صدر کی حیثیت ایک ایسے آئینی صدر جیسی ہوتی ہے جو قوم کی یکجہتی اور اتحاد کی علامت ہوتا ہے[2] ان لوگوں کے ساتھ مل کر دوسرے لیڈروں نے، گاندھی جی کا آشیرواد لے کر پٹا بھی سیتا رمیا (Pattabhi Sitaramayya) کو صدارت کا امید وار بنایا۔ 29 جنوری 1939 کو الیکشن ہوا اور سبھاس چندر بوس 1377 کے مقابلے میں 1580 ووٹوں سے جیت گئے اس پر گاندھی جی نے کہا کہ سیتارمیا کی ہار ''ان سے زیادہ میری ہے''۔

لیکن سبھاش کے الیکشن سے کوئی حل نہیں نکلا۔ ہوا تو یہ کہ کانگریس میں پنپتا ہوا بحران تری پوری اجلاس میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اس کے دو خاص اسباب تھے.....ایک تو یہ کہ سبھاش چندر بوس، سردار پٹیل اور دوسرے کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں کو لگاتار دائیں بازو کا ہونا قرار دے رہے تھے۔ ان پر کھلا الزام تھا کہ یہ لوگ برٹش حکومت سے مصالحت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انھوں نے متوقع وزرا کی لسٹ بھی تیار کر لی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ بائیں بازو کا کوئی شخص کانگریس کا صدر بنے کیونکہ ایسا آدمی ان کے کام میں مخل ہوسکتا ہے اور بات چیت میں مزاحمت پیدا کرسکتا ہے، اس لیے سبھاش چندر بوس کی اپیل کے مطابق کانگریسیوں کو کوئی ایسا صدر منتخب کرنا چاہیے جو بائیں بازو کا ہونے کے ساتھ ساتھ وفاق (Federation) مخالف ہو[3] بعد میں اپنی سوانح حیات کے دوسرے حصے میں انھوں نے لکھا کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے پوری کوشش کی ہے کہ کانگریس مصالحت کی راہ نہ اختیار کرے اور اس بات سے گاندھی نواز لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ انھوں نے لکھا کہ گاندھی وادی یہ نہیں چاہتے تھے کہ سرکاری کام کاج میں کسی طرح کی دقت آئے اور اس وقت وہ لوگ ہر طرح کی قومی جدوجہد کے خلاف تھے''[4]

کانگریس لیڈروں کو ایسے الزامات سخت ناگوار تھے۔ وہ ان کو بہتان سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک بیان میں یہ واضح کیا کہ'' سبھاش بابو نے وفاقیت کی مخالفت کا جو ذکر کیا ہے وہی تو

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سارے ممبروں کی رائے ہے۔ یہ تو کانگریس کی پالیسی ہی ہے"5
الیکشن کے بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ایسے صدر کے ساتھ کیسے کام کر سکتے ہیں جس نے ان کی حب الوطنی پر کیچڑ اچھالا ہو۔ ان میں سے بارہ نے ورکنگ کمیٹی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس سے پہلے گاندھی جی نے یہ بیان جاری کیا تھا کہ "میں اس ہار پر بے حد خوش ہوں کیونکہ سبھاش بابو جن لوگوں کو دائیں بازو کا سمجھتے ہیں، اس سے ان کی اپنی منشا کی وزارت بنانے اور بغیر کسی روک ٹوک اپنے پروگراموں کو لاگو کرنے میں آسانی ہوگی"6

جواہر لعل نہرو نے ان بارہ لوگوں کے ساتھ ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ نہیں دیا۔ وہ کھلے عام سبھاش سے ٹکرانا نہیں پسند کرتے تھے۔ لیکن وہ ان سے متفق بھی نہیں تھے۔ الیکشن کے پہلے انھوں نے کہا تھا کہ الیکشن میں اصولوں اور پروگراموں کو داؤں پر نہیں لگایا جاتا۔ سبھاش بابو کے ذریعہ ان کے رفقا پر جس طرح کیچڑ اچھالا گیا، اس سے ان کو ملال ہے۔ انھوں نے کہا کہ جھگڑا دائیں اور بائیں بازو کا نہیں ہے۔ 4/فروری 1939 کو انھوں نے سبھاش بابو کو جو خط لکھا اس میں صاف صاف واضح کیا گیا تھا کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو آپ دائیں بازو کا مانتے ہیں اور کس کو بائیں بازو کا۔ صدارتی الیکشن کی مہم کے دوران آپ نے ان لفظوں کا جس طرح استعمال کیا ہے کہ گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ان کے ساتھی دائیں بازو کے ہیں اور ان کے مخالفین چاہے جیسے ہوں سبھی بائیں بازو کے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب باتیں سراسر غلط ہیں۔ میری نظر میں نام نہاد بائیں بازو میں بہت سے نام نہاد دائیں بازو والوں سے بھی زیادہ دائیں بازو فکر کے لوگ موجود ہیں۔ سخت لہجہ کا استعمال اور کانگریس کی پرانی قیادت پر تنقید کرنے اور اس پر برسنے کی طاقت، سیاست میں دائیں بازو کی کسوٹی نہیں ہوتی ہے۔ میرے خیال سے دائیں بازو جیسے لفظوں کا استعمال ہی عام طور سے الجھن پیدا کرتا ہے۔ ان لفظوں کو استعمال کرنے کے بجائے اگر ہم پالیسیوں کی بات کریں تو بہتر ہوگا۔ آپ کن پالیسیوں کی وکالت کرتے ہیں؟ وفاقیت کی مخالفت، بہت اچھی بات ہے۔ میری سمجھ میں ورکنگ کمیٹی کے زیادہ تر ممبران اسی خیال کے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی کسی کمزوری کی طرف اشارہ کرنا نازیبا حرکت ہے"7

بہر حال سبھاش اور گاندھی کے اس مباحثہ میں اصول اور حکمت عملی سے متعلق کچھ

بنیادی باتیں تھیں۔ یہ دونوں لیڈران موجودہ سیاسی حقیقت کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھتے تھے۔ جد وجہد کے لیے عوام کس حد تک تیار ہے اور مستقبل میں عوامی جد وجہد کی کیا شکل ہو، اس پر ان لوگوں کی رائے الگ الگ تھی۔

سبھاش چندر بوس مانتے تھے کہ کانگریس فوراً جد وجہد کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ وہ کافی مضبوط اور طاقتور ہوگئی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ بہت مطمئن تھے۔ کیونکہ بعد میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''ان دنوں ملک انقلاب کے لیے پوری طرح تیار تھا اور ہونے والے بین الاقوامی بحران کی وجہ سے وہ نادر موقع آنے والا تھا جب ہندوستان خود کو آزاد کرالیتا''۔ 8 اس لیے تری پوری میں اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے اس بات کی وکالت کی کہ ''برٹش حکومت کو چھ ماہ کا موقع دیا جائے اور اگر اس دوران اس نے ملک کو آزاد نہیں کیا تو عام سول نافرمانی تحریک چھیڑ دی جائے''9

گاندھی جی کی منشا اس سے مختلف تھی۔ وہ بھی یہ مانتے تھے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کا دوسرا دور شروع کرنا ہوگا کیونکہ ملک کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔ وسط جولائی 1938 میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''ملک کے اوپر چھائی تاریکی چھٹ جائے گی۔ چاہے ڈانڈی مارچ سے زیادہ کٹھن لڑائی لڑنی پڑے یا بغیر لڑائی کے ہندوستان آزادی حاصل کرلے گا''10 لیکن وہ یقین کرتے تھے کہ الٹی میٹم دینے کا یہ ٹھیک وقت نہیں ہے کیونکہ ابھی نہ تو کانگریس اور نہ عوام جد وجہد کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ پہلے ہندوستانیوں کو سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرلینا چاہیے۔ گاندھی جی نے اپنا نظریہ واضح کرتے ہوئے 5 جولائی 1939 کو ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ (سبھاش چندر بوس) مانتے ہیں کہ لڑنے کے لیے ہم میں پوری طاقت ہے۔ میں اس سے قطعی متفق نہیں ہوں۔ دراصل لڑنے کے لیے ہمارے پاس وسائل بالکل نہیں ہیں۔ لامحدود فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں....... بہار کے کسانوں پر اب ہماری اتنی گرفت نہیں ہے جتنی پہلے تھی.......اگر آج ہم سے دلی مارچ کے لیے کہا جائے تو ہم میں حوصلے کا فقدان ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کے بغیر ہم کوئی کام کیسے کرسکتے ہیں؟ ملک تو انھیں کا ہے۔ حکومت کو الٹی میٹم دینے لائق ہم نہیں ہیں (ایسی صورت حال میں) ملک کی حالت بڑی مضحکہ خیز ہوگی''11 گاندھی جی کا یہ اندازہ کانگریس کی موجودہ حالت کی وجہ سے تھا۔ وہ مانتے تھے کہ کرپشن اور بدنظمی نے جد وجہد

کرنے کی اس کی قوت کو فاسد کر دیا ہے 1938 اور شروع 1939 کے دوران گاندھی جی نے متعدد بار کانگریسیوں کی آپسی تکرار، رقابت، فرضی ممبری اور جعلی رائے دہندگی، کانگریس کمیٹیوں پر قبضہ کرنے کے رجحانات اور پارٹی ڈسپلن کی عام گراوٹ کو برسر عام اجاگر کیا تھا۔

کانگریس کا اندرونی جھگڑا تری پوری اجلاس میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ کانگریس کا یہ اجلاس 12 سے 18 مارچ 1939 تک تری پوری میں منعقد ہوا تھا۔ لوگوں کی تائید اور صدارت کے لیے ہوئی اپنی کامیابی کا بوس نے غلط مطلب نکالا۔ کانگریسیوں نے ان کو مختلف وجوہات کے تحت ووٹ دیا تھا۔ وہ اس لیے نہیں چنے گئے تھے کہ لوگ ان کو قومی تحریک کا عظیم ترین قائد مانتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ مجاہدانہ سیاست کی علامت بن گئے تھے۔ کانگریسی، گاندھی جی یا دوسرے لیڈروں کی قیادت ترک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور یہ بات ان لوگوں نے سبھاش کو اچھی طرح بتادی تھی۔ گووند بلبھ پنت نے تری پوری اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں پرانی ورکنگ کمیٹی، گاندھی جی کی قیادت اور بیس برسوں سے چلی آرہی کانگریس کی پالیسیوں پر پورا اعتماد ظاہر کیا گیا تھا اور سبھاش سے کہا گیا تھا کہ وہ گاندھی جی کی منشا کے مطابق اپنی ورکنگ کمیٹی بنائیں۔ یہ قرارداد کثرت رائے سے پاس ہوگئی مگر گاندھی جی نے پسند نہیں کیا کہ سبھاش پر ان کی مرضی تھوپی جائے۔ اس لیے سبھاش سے انھوں نے اپنی پسند کی ورکنگ کمیٹی بنانے کے لیے کہا۔

سبھاش نے اس چیلنج کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ بڑی نازک حالت میں پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کانگریس کو اپنے طور سے نہیں چلا سکتے ہیں، مگر ان کو اکثریت کی قیادت بھی قبول نہیں تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہونے والی جدوجہد کے قائد تو گاندھی جی ہوں مگر جدوجہد کی حکمت عملی اور داؤں پیچ بائیں بازو کی پارٹیاں طے کریں۔ دوسری طرف گاندھی جی چاہتے تھے کہ یا تو وہ اپنی پالیسی کے تحت کام کریں گے یا پھر قیادت سے دست بردار ہو جائیں گے۔ انھوں نے سبھاش کو لکھا کہ ''اگر آپ کا اندازہ صحیح ہے تو میں پچھڑ چکا ہوں اور ستیہ گرہ کے سپہ سالار کی حیثیت سے میرا کام ختم ہو چکا ہے''[12] راجندر پرشاد نے اپنی سوانح حیات میں بعد میں لکھا تھا کہ ''گاندھی جی اور دوسرے لیڈران ایسی حالت میں نہیں پڑنا چاہتے تھے جس میں پالیسی اور حکمت عملی تو دوسروں کی ہو اور ان کو نبھانے کی ذمہ داری ان کی ہو''[13]

بوس کے سامنے اب سوائے استعفیٰ دینے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہرو نے دونوں خیموں میں مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بوس کو سمجھایا کہ وہ استعفیٰ نہ دیں اور گاندھی جی نیز دوسرے لیڈروں سے تعلقات نبھائیں۔ لیکن سبھاش اپنی بات پر اڑے رہے۔ ایک طرف وہ چاہتے تھے کہ ورکنگ کمیٹی میں بائیں بازو نظریہ کے نئے لوگ ہوں اور دوسری طرف وہ اپنی کمیٹی کا اعلان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آخرکار انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ راجندر پرشاد صدر چن لیے گئے۔ اس طرح کانگریس پر آئی دوسری بلا ٹل گئی۔

تری پوری میں اور اس کے بعد بوس کو کانگریسیوں، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی حمایت حاصل نہ ہوسکی کیونکہ وہ سبھی قومی تحریک میں تفریق کے مخالف تھے اور ہر قیمت پر اس میں اتحاد برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ تری پوری اجلاس کے بعد ہندستانی کمیونسٹ پارٹی (CPI) نے اعلان کیا کہ آمرانہ حکومت کے خلاف تحریک کا مطالبہ ہے کہ اس پر ایک ہی خیمہ کا غلبہ نہ ہو بلکہ گاندھی جی کی رہنمائی میں متحدہ قیادت کی کارفرمائی ہو'' 14 اپریل 1939 میں سی۔ پی۔ آئی کے جنرل سکریٹری پی۔ سی۔ جوشی نے لکھا کہ '' آج سب سے بڑی طبقاتی جدوجہد ہماری قومی جدوجہد ہے۔ اور کانگریس ہی اس جہد وجہد کی خاص ترجمان ہے اور یہ کہ اس کی یکجہتی بنائے رکھنا بنیادی کام ہے''15

اسی سال مئی میں سبھاش اور ان کے رفیقوں نے کانگریس کے اندر ہی فارورڈ بلاک (Forward Block) نام کی نئی پارٹی قائم کی۔ 9 جولائی کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قرارداد کے خلاف جب انھوں نے آل انڈیا یوم احتجاج (All India Protest Day) منانے کی اپیل کی، تو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ان کے خلاف تادیبی کاروائی (Disciplinary Action) کر کے بنگال صوبائی کانگریس کمیٹی کی صدارت سے ہٹا دیا اور ان کو تین سالوں تک پارٹی کے کسی بھی عہدہ پر کام کرنے سے روک دیا۔

ایک ستمبر 1939 کو دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی یعنی جس دن نازی جرمنی نے پولینڈ (Poland) پر حملہ کیا۔ اس سے قبل وہ مارچ 1938 میں آسٹریا (Austria) اور مارچ 1939 میں چیکوسلوواکیہ (Czechoslovakia) پر قبضہ کر چکا تھا۔ انگلینڈ اور فرانس جو

اب تک ہٹلر (Hitler) کی منہ بھرائی کرنے کی پالیسی اپنائے ہوئے تھے، اب پولینڈ کی مدد کے لیے آگے آنے اور جرمنی کے خلاف جنگ چھیڑ دینے کے لیے مجبور ہو گئے۔ 3 ستمبر 1939 کو انھوں نے یہی کیا۔ انڈیا گورنمنٹ نے کانگریس یا مرکزی اسمبلی سے بات چیت کیے بغیر فوراً اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی جرمنی سے جنگ ہو رہی ہے۔

کانگریس کو فسطائی حملوں کے شکار لوگوں سے پوری ہمدردی تھی اور جنگ چھڑنے پر ان کا فوری ردعمل فسطائیت مخالف طاقتوں کی مدد کرنے کی شکل میں ہوا۔ گاندھی جی پر جنگ کا بہت جذباتی اثر پڑا۔ انھوں نے وائسرائے سے کہا کہ برٹش پارلیمنٹ اور ویسٹ منسٹر ابے (Westminister Abbey) کی بربادی کے تصور سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ انگلینڈ اور دوست ملکوں سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔ مگر کانگریس کے زیادہ تر لیڈران یہی سوال اٹھاتے تھے کہ ایک غلام قوم دوسرے ملکوں کی آزادی کی لڑائی میں کیسے مدد کر سکتی ہے؟ اس مسئلہ پر کانگریس کا رویہ کیا ہو؟ اس کے لیے واردھا میں 10 سے 14 ستمبر تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ قومی روایت کو مدنظر رکھ کر اس اجلاس میں مختلف الرائے لوگوں میں تال میل بٹھانے کی غرض سے سبھاش چندر بوس، آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش کو مدعو کیا گیا۔ لوگوں کی مختلف رائے تھی۔ گاندھی جی کے دل میں دوست ملکوں کے لیے ہمدردی تھی۔ ان کے خیال سے یورپ کے جمہوری ملکوں اور ہٹلر کی ڈکٹیٹرانہ نازی حکومت میں کھلا ہوا فرق ہے۔ سوشلسٹ اور سبھاش چندر بوس یہ دلیل دیتے تھے کہ یہ جنگ سلطنت وسیع کرنے کی آمرانہ جنگ ہے۔ اس لیے دونوں فریقین اپنی اپنی دلچسپیوں کے تحفظ کے لیے لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں میں سے کسی کی مدد کرنے کی بات سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے کانگریس کو تو اس وقت حالات سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے اور فی الفور سول نافرمانی تحریک شروع کر دینی چاہیے۔

جواہر لعل نہرو کا نظریہ اس معاملہ میں مختلف تھا۔ وہ کئی برسوں سے نازی جرمنی کی جارحانہ خطروں سے پوری دنیا کو خبردار کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک جمہوریت اور فسطائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ انگلینڈ اور فرانس کا نظریہ توسیع سلطنت ہے اور یہ جنگ پہلی جنگ عظیم کے بعد سرمایہ داری میں پیدا شدہ گہرے تضاد کا ماحصل ہے۔ اس لیے آزاد

ہونے کے پہلے ملک کو نہ تو جنگ میں حصہ لینا چاہیے اور نہ انگلینڈ کی مشکلات کا فائدہ اٹھا کر سول نافرمانی تحریک چلانی چاہیے۔گاندھی جی کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے خاص پیرو سردار پٹیل اور راجندر پرشاد ان کی رائے سے متفق نہیں ہیں، تو انھوں نے نہرو کے نظریہ کی تائید کا فیصلہ کیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی اس کو منظور کر لیا۔اس کے ذریعہ پیش کی گئی قرارداد میں پولینڈ پر نازی حملہ، نازیت (Nazism) اور فسطائیت (Fascism) کی مذمت کی گئی اور یہ بھی اعلان کیا کہ ہندوستان کسی ایسی جنگ میں شامل نہیں ہو سکتا جو صاف صاف آزادیٔ جمہوریت کے لیے لڑی جارہی ہو جبکہ خود اس کو آزادی سے محروم رکھا جارہا ہو۔اگر انگلینڈ واقعی جمہوریت اور آزادی کے لیے جنگ کر رہا ہے تو وہ کلونیل ملکوں خصوصاً ہندوستان میں آمرانہ حکومت ختم کر کے اور جمہوریت کا نفاذ کر کے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے۔وہ یہ بھی اعلان کرے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد جنگ کی اصل منشا کے تحت ہندوستان میں کس طرح عمل کیا جائے گا۔تب تو ہندستانی بڑی خوشی سے جمہوری ملکوں کی جنگی سرگرمیوں میں جوق در جوق شامل ہوں گے۔البتہ اس معاملہ میں فیصلہ لینے میں دیر نہیں لگنی چاہیے۔نہرو کے لفظوں میں وائسرائے اور برٹش سرکار کو کانگریس کی قیادت پورا موقع دینا چاہتی تھی''۔

برٹش سرکار کی منشا بالکل برعکس تھی۔ 17 اکتوبر 1939 کو وائسرائے لنلتھگو (Linlithgow) نے اچھی طرح سوچ سمجھے اپنے بیان میں ہندوستانیوں کے اختلافات کا بہت زور شور سے ذکر کیا۔انھوں نے مسلم لیگ اور دیسی حکمرانوں کو کانگریس کے خلاف استعمال کرنے کی پوری کوشش کی اور جنگ کے بارے میں انگلینڈ کی اصل منشا بتانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے تو صرف یہ کہا کہ وہ نازی حملہ کی مزاحمت کر رہے ہیں۔البتہ فوری طور سے انھوں نے ایک صلاح کار کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی جس سے سرکار جب ضروری سمجھے رائے لے سکتی ہے وعدہ کیا کہ مستقبل کے لیے جنگ کے بعد برٹش سرکار ہندوستانیوں کے مختلف فرقوں، پارٹیوں اور جماعتوں کے نمائندوں اور راجہ مہاراجاؤں سے اس مسئلہ پر بات چیت کرے گی کہ 1935 ایکٹ میں کس طرح تغیر وتبدل کیا جائے۔کچھ مہینوں بعد سکریٹری آف اسٹیٹ زیٹ لینڈ (Zetland) سے ذاتی مراسلہ میں وائسرائے لنلتھگو نے تبصرہ کیا کہ ''میں اتنا بے تاب نہیں

ہوں کہ بتادوں کہ انگریزی حکومت کتنی مدت بعد یہاں سے ختم ہوجائے گی۔ میرا گمان ہے کہ وہ دن بہت دور ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں جتنا کم بولوں اتنا ہی بہتر ہے“[16]

18 اکتوبر کو ہاؤس آف لارڈس میں بولتے ہوئے زیٹ لینڈ نے ہندوستانیوں کے خصوصاً ہندو مسلم اختلافات پر بڑا زور دیا اور کانگریس کو خالص ہندو تنظیم قرار دیا[17] اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انگلینڈ جنگ کے دوران یا بعد میں ہندوستان پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور ضرورت پڑنے پر وہ کانگریس کو اپنا دشمن بھی مان سکتا تھا۔

ان باتوں کا ہندستانی عوام اور قومی قیادت پر سخت ردعمل ہوا۔ کم وبیش بلاشرط انگلینڈ کو مدد دینے کی وکالت کرنے والے گاندھی جی بے حد ناراض ہوئے۔ برٹش سرکار پر ”پھوٹ ڈالو اور راج کرو“ کی پرانی پالیسی پر عمل کرنے کی بات کہتے ہوئے انھوں نے واضح کیا کہ ”وائسرائے کا ہندوستان کے بارے میں اعلان یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر انگلینڈ کا بس چلتا تو ہندوستان میں جمہوریت نہیں آسکتی۔ کانگریس نے روٹی مانگی تھی اور دیا گیا اس کو پتھر۔ اقلیتوں، راجا مہاراجاؤں، بدیسی سرمایہ داروں، زمینداروں وغیرہ کے مفاد کے سوال پر انھوں نے توجہ دلائی کہ جب تک ان کے دعووں کا قومی آزادی سے کوئی تصادم نہیں ہوتا، کانگریس ہر ایک اقلیتی فرقہ کے حقوق کی حفاظت کرے گی اور آزاد ہندوستان کسی بھی ایسے دعوے کو برداشت نہیں کرے گا جس کا عوام کے سچے مفادات سے ٹکراؤ ہو“[18]

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے 23 اکتوبر کی میٹنگ میں وائسرائے کے بیان کو پرانی آمرانہ پالیسی کا نمونہ بتا کر خارج کر دیا اور جنگ میں انگلینڈ کی مدد نہ کرنے کا فیصلہ لیا اور کانگریس سرکاروں سے احتجاجاً استعفیٰ دینے کے لیے کہا۔ قومی تحریک کے ڈسپلن پسند سپاہی کی حیثیت سے کانگریس سرکاریں مستعفی ہوگئیں، لیکن کانگریس قیادت کو تحریک چھیڑنے میں ہچک تھی۔ دراصل ورکنگ کمیٹی نے 23 اکتوبر کی اپنی قرارداد میں کانگریسیوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ جلدی میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔

جنگ اور کانگریس سرکاروں کے استعفے کے بارے میں تو کانگریسی ایک رائے تھے مگر فوری طور سے عام ستیہ گرہ چھیڑنے کے سوال پر ان میں سخت اختلاف تھا۔ گاندھی جی فوراً ستیہ گرہ

تحریک نہیں شروع کرنا چاہتے تھے اور کانگریس قیادت بھی یہی چاہتی تھی۔ انھوں نے اس کے تین اسباب بتائے تھے۔ پہلا سبب یہ کہ دوست ممالک انگلینڈ اور فرانس انصاف پر تھے۔ اس لیے دوران جنگ ان کو پریشان کرنا مناسب نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ ہندو اور مسلم متحد نہیں تھے اور یہ کہ جدوجہد میں مخل ہو سکتی تھی۔ ایسے حالات میں اگر سول نافرمانی تحریک چلائی جاتی تو فرقہ وارانہ فسادات ہو سکتے تھے اور خانہ جنگی کی نوبت تک آسکتی تھی۔ تیسرا یہ کہ ملک جدوجہد کرنے کے لیے فوری طور سے تیار تھا، ایسی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے لیے عوام میں اور تنظیمی سطح پر کانگریس میں کوئی تیاری نہیں تھی۔ کانگریس تنظیم نہ صرف کمزور تھی بلکہ 39-1938 کے دوران وہ کرپٹ (Corrupt) بھی ہو چکی تھی۔ ایسے حالات میں حکومت کے ذریعہ کی جانے والی سخت انسدادی کارروائی کا مقابلہ عوامی تحریک نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے بروقت ضرورت یہ تھی کہ عوام کو سیاسی اعتبار سے تیار کیا جائے، کانگریس کی کمزوریوں کو دور کر کے اس کو مستحکم بنایا جائے اور سرکار سے اس وقت تک بات چیت جاری رکھی جائے جب تک سب کے سامنے یہ نہ واضح ہو جائے کہ بات چیت سے مسئلہ کا حل نہیں نکل سکتا اور یہ کہ اس سلسلہ میں غلطی سرکار کی ہے۔ مارچ 1940 میں رام گڑھ اجلاس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے انھیں باتوں کو ایک قرارداد میں سمیٹ لیا۔ اس میں جنگ کے تئیں کانگریس کے رخ کو دوہراتے ہوئے جہاں یہ کہا گیا تھا کہ ''مکمل آزادی سے کم لوگوں کو کچھ بھی تسلیم نہیں'، وہیں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ''جیوں ہی کانگریس تنظیم جدوجہد کے لائق ہو جاتی ہے اور حالات اس قدر بدل جاتے ہیں کہ آفت منڈلاتی ہوئی نظر آنے لگے، اسی وقت کانگریس سول نافرمانی تحریک شروع کر دے گی''19

سبھاش چندر بوس اور ان کا فارورڈ بلاک (Forward Block)، کانگریس سوشلسٹ پارٹی، کمیونسٹ پارٹی اور رائسٹس (Royists) اور بائیں بازو کے مختلف خیموں نے ایک متبادل حکمت عملی پیش کی۔ بائیں بازو کے مطابق یہ جنگ سلطنت توسیع کرنے کی آمرانہ جنگ ہے اور یہی وہ موقع ہے جب برٹش آمریت کے خلاف چوطرفہ جنگ چھیڑ کر آزادی حاصل کر لی جائے۔ اس کو یہ بھی یقین تھا کہ عوام جدوجہد کے لیے پوری طرح تیار ہے اور اس کو تو صرف قیادت کی طرف سے پکار کا انتظار ہے۔ یہ پارٹیاں یہ ضرور مانتی تھیں کہ کانگریس میں فرقہ

واریت (Communalism) جیسی کمزوریاں پائی جاتی ہیں، لیکن ان کے خیال سے عوامی تحریک کے ریلے میں اس طرح کی ساری کمزوریاں بہہ جائیں گی۔ ان پارٹیوں کا یہ بھی نظریہ تھا کہ تنظیمی قوت کا وجود جدو جہد کرنے کے پہلے نہیں ہوتا، بلکہ دوران جدو جہد پیدا ہوتا ہے۔ ''چوکس رہو اور انتظار کرو'' کی کانگریس کی پالیسی پر سخت تنقید کرتے ہوئے بائیں بازو پارٹیوں نے کانگریس قیادت پر الزام لگایا کہ وہ عوام سے ڈرتی ہے، جدو جہد کے لیے اس میں حوصلہ نہیں ہے اور اس لیے چھوٹی چھوٹی معمولی رعایتوں کے لیے آمرانہ طاقتوں سے مصالحت کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ ان سب نے کانگریس قیادت سے پرزور اپیل کیا کہ وہ عوامی تحریک چلانے کے لیے ضروری تیاریاں کرنا شروع کردے۔

اگر کانگریس قیادت ایسا نہیں کرتی ہے، تب کیا کیا جائے؟ اس معاملہ میں بائیں بازو کے لوگ ایک رائے نہیں تھے۔ سبھاش چاہتے تھے کہ اگر کانگریس تحریک نہیں چلاتی ہے تو بائیں بازو والے اس کو توڑ کر اپنی متوازی کانگریس بنائیں اور تحریک شروع کردیں۔ ان کو پورا یقین تھا کہ عام لوگوں کے ساتھ کانگریس کے زیادہ تر ممبران ان کے ساتھ ہو جائیں گے، مگر کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کے مطابق سبھاش عوام میں اپنے اثرات کو حقیقت سے زیادہ آنک رہے تھے بلکہ سچائی تو یہ تھی کہ گاندھی جی اور کانگریس کے بغیر کوئی عوامی جدو جہد کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ لہٰذا کانگریس کو توڑنے اور متحدہ قومی مورچہ کو منتشر کرنے کے بجائے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ جدو جہد کرنے کے لیے اس کی قیادت پر دباؤ ڈال کر راضی کیا جائے۔

جواہر لعل کا جھکاؤ دونوں طرف تھا۔ ایک طرف وہ دوست ملکوں کی آمرانہ ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھے اور دوسری طرف وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے یورپ میں ہٹلر اور نازیوں کی فتح آسان ہو جائے۔ ایک طرف ان کی پوری منشا اور سیاسی فکر سول نافرمانی تحریک کو فوراً شروع کرنے کے موافق تھی اور دوسری طرف وہ یورپ میں نازی مخالف کوشش اور ایشیا میں جاپانی حملہ کے خلاف چینی عوام کی جدو جہد کو کمزور بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال، آخر میں انھوں نے گاندھی جی اور کانگریس قیادت کی اکثریت کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن اس طرح کی پر سکون سیاست زیادہ عرصہ تک نہیں کی جا سکتی تھی۔ نہ صرف

کانگریس کی قیادت بلکہ عوام کا صبر وضبط جواب دے چکا تھا۔ سرکار اپنی بات پر اڑی تھی کہ جب تک کانگریس مسلم فرقہ پرستوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتی ہے تب تک آپسی سدھار کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ وہ آرڈیننس پر آرڈیننس جاری کر رہی تھی اور پریس اور بولنے کی آزادی اور تنظیم بنانے کے حقوق کو سلب کرتی جارہی تھی۔ پورے ملک میں قومی رضا کاروں خصوصاً بائیں بازو سے منسلک کارکنوں کو طرح طرح سے پریشان کیا جارہا تھا۔ وہ گرفتار کیے جارہے تھے اور ان کو جیلوں میں ٹھونسا جارہا تھا۔ سرکار پوری طرح تیار بیٹھی تھی کہ کانگریس عوامی تحریک کے لیے ذرا بھی جنبش کرے، فوراً اس کو کچل دیا جائے۔

ایسی حالت میں ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ کوئی حرکت نہیں کرتے ہیں تو سرکار ان کے صبر کو بزدلی سے تعبیر کرے گی۔ نہرو نے اپنے ایک مضمون ''عمل کا دوراہا'' (Parting of Ways) میں لکھا کہ سرکار یہ یقین کرتی تھی کہ ''بم ہوائی جہاز، ٹینک، توپ وتفنگ کی طاقت سے لیس لوگوں کی اس دنیا میں ہم کتنے کمزور ہیں! ہمارے بارے میں ان کو کیسی فکر؟ لیکن شاید مسلح لڑائیوں کی اس دنیا میں انسان کے پاس قومی جوش اور لافانی روح جیسی کوئی چیز ہے جو نہ تو کمزور ہے اور نہ ادنیٰ اور جس کو نظر انداز کرنا مصیبت کو دعوت دینا ہے۔''[20] 1940 کے آخر میں انھوں نے ایک بار پھر گاندھی جی سے کمان سنبھالنے کے لیے اصرار کیا۔ گاندھی جی نے ایسے اقدامات کرنے شروع کر دیے جن کے ذریعہ وہ اپنی وسیع حکمت عملی کے تحت عوامی تحریک چلا سکیں۔ انھوں نے طے کیا کہ کچھ چنندہ حضرات ہر ایک علاقہ میں ذاتی طور سے ستیہ گرہ کریں۔ ستیہ گرہ کا مطالبہ یہ ہوگا کہ جنگ میں حصہ لینے کے خلاف پرچار کرنے کے لیے بولنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ ستیہ گرہی یہ اعلان کریں گے کہ افراد و زر سے جنگ کے کام میں سرکار کی مدد کرنا سراسر غلط ہے۔ اہنسا کے ذریعہ جنگ کو روکا جائے۔ ضلع مجسٹریٹ کو اس امر کی اطلاع پہلے ہی دے دی جائے گی کہ ستیہ گرہی مرد یا عورت کے ذریعہ جنگ کے خلاف تقریر کہاں اور کب ہوگی۔

17 اکتوبر 1940 کو ونوبا بھاوے پہلے اور جواہر لعل نہرو دوسرے ستیہ گرہی تھے۔ ستیہ گرہیوں کا چناؤ خوب سوچ سمجھ کر کیا جاتا تھا اور جب وہ اسٹیج پر آتے تو لوگ ان کو اس طرح

گھیر لیتے کہ گرفتاری ہونے کے پہلے تک ان کی تقریریں ختم ہو چکی ہوتیں اور اگر کسی ستیہ گرہی مرد یا عورت کو گرفتار نہ کیا جاتا تو وہ گاؤں کی طرف چل دیتے اور اپنا پیغام دیتے ہوئے دلی روانہ ہو جاتے۔اس طرح کے اقدام کا نام ہی ''دلی چلو تحریک'' پڑ گیا۔

ایس۔گوپال کے لفظوں میں ''ہلکی تاثیر کی معمولی خوراک''[21] والے ستیہ گرہ کے مقاصد کو گاندھی جی نے ایک خط کے ذریعہ وائسرائے کو بتایا کہ ''کانگریس نازیت (Nazism) کی اتنی ہی مخالفت کرتی ہے جتنا انگلینڈ کا کوئی شہری کر سکتا ہے۔مگر اس کے مقاصد کا دائرہ اتنا وسیع نہیں کہ وہ جنگ میں حصہ لے اور چونکہ آپ نے اور آپ کے سکریٹری آف اسٹیٹ نے اعلان کر رکھا ہے کہ پورا ہندوستان اپنی مرضی سے جنگ میں مدد کر رہا ہے، اس لیے یہ صاف کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کی اکثریت کو جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ان کے نزدیک نازیت اور ملک پر حکومت کر رہی دوہری خصلت کی مطلق العنان برٹش سرکار میں کوئی فرق نہیں ہے''[22]

اس طرح ذاتی ستیہ گرہ کے دو مقاصد تھے۔ایک طرف یہ ہندستانی عوام کے تیز و تند سیاسی جذبات کو ظاہر کر رہا تھا۔اور دوسری طرف برٹش سرکار کو ایک اور موقع دیا جا رہا تھا کہ وہ ہندوستان کے مطالبوں کو منظور کر لے۔یوں کانگریس اور گاندھی جی کی سوچ نازی مخالف تھی مگر وہ انگلینڈ کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ زوردار تحریک چلا کر انگلینڈ کی جنگی سرگرمیوں میں رخنہ ڈالا جائے۔گاندھی جی کے لیے کانگریس کو مستحکم کرنا زیادہ ضروری تھا وہ لوگوں کو ہونے والی جنگ کے لیے تیار کر رہے تھے کانگریس کو ہر طرح سے مضبوط کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ابن الوقت اور خود غرض عناصر کو تلاش کر کے کانگریس سے باہر کیا جا رہا تھا۔سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لوگوں کو سیاسی اعتبار سے بیدار اور متحرک کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔

15 مئی 1941 تک 25 ہزار سے زیادہ ستیہ گرہیوں کو سول نافرمانی کرنے کے لیے سزا دی گئی تھی۔کم معیار کے سیاسی کارکنوں کو سرکار نے گرفتار کر کے رہا کر دیا تھا۔

1941 میں برٹش سیاست میں دو بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اب تک نازی جرمنی،

پولینڈ، بلجیم، ہالینڈ، ناروے، فرانس اور مشرقی یورپ کے زیادہ تر حصوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ اور 22 رجون 1941 کو اس نے سوویت روس پر حملہ کیا۔ ادھر پورب میں جاپان نے 7 ردسمبر کو امریکہ کے پرل ہاربر (Pearl Harbour) پر اس کے ایک جہازی بیڑہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے فلی پین، ہندچین، انڈونیشیا ملایا اور برما پر قبضہ کرلیا۔ مارچ 1942 میں رنگون پر بھی جاپان کا قبضہ ہو گیا۔ جنگ کی دستک یہاں بھی ہونے لگی۔ ونسٹن چرچل (Winston Churchill) جواب انگلینڈ کا وزیر اعظم تھا اس نے بادشاہ کو آگاہ کیا کہ برما، لنکا، کلکتہ اور مدراس پر بھی دشمن کا قبضہ ہو سکتا ہے۔

ہندستانی لیڈران جن کو شروع دسمبر میں رہا کیا جا چکا تھا، ملک کی دفاع کے بارے میں بہت فکر مند ہو گئے۔ سوویت روس اور چین کے بارے میں ان کو بے حد دلچسپی تھی۔ بہت سارے لوگ تو یہ محسوس کر رہے تھے کہ روس پر ہوئے ہٹلر کے حملہ نے جنگ کی شکل ہی بدل دی ہے۔ جاپان کا نعرہ تھا ''ایشیا، ایشیا والوں کے لئے'' گاندھی جی اس نعرہ کی پہلے ہی مذمت کر چکے تھے۔ انھوں نے ہندوستانیوں سے اپیل کر کہ وہ جاپانی سامان نہ خریدیں۔ اس کے سامان کا بائیکاٹ کریں۔ ہندستانی سرحدوں کی حفاظت کرنے اور دوست ملکوں کی مدد کرنے کے لیے بیتاب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی اور نہرو کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے دسمبر کے آخر میں ایک قرارداد پاس کیا کہ اگر جنگ کے بعد انگلینڈ مکمل آزادی دینے اور صحیح معنوں میں اقتدار سونپنے کے لیے تیار ہو جائے تو دوست ملکوں اور ہندوستان کی حفاظت کرنے میں پورا تعاون دیا جائے گا۔ یہی وہ وقت تھا جب گاندھی جی نے جواہر لعل نہرو کو اپنا وارث نامزد کیا تھا۔ 15 رجنوری 1941 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے روبرو تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ '' کچھ لوگ بتاتے ہیں کہ میرے اور جواہر لعل کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم میں کشیدگی پیدا کرنے کے لیے صرف اختلاف رائے کافی نہیں ہے۔ ہم دونوں میں اختلاف رائے اول روز سے ہے جب سے ہم ساتھ ساتھ کام کرنے لگے ہیں، پھر بھی میں کئی برسوں سے کہتا آ رہا ہوں کہ راجاجی (سی۔ راجگو پالا چاریہ) نہیں، بلکہ جواہر لعل میرے وارث ہوں گے، وہ کہتے ہیں کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتے اور جو زبان وہ بولتے ہیں، میرے لیے اجنبی ہے۔ یہ بات سچ ہو سکتی ہے اور نہیں

بھی۔ بہر حال زبان دلوں کو جوڑنے میں آڑے نہیں آتی اور میں جانتا ہوں کہ جب میں نہیں رہوں گا، تب وہ میری ہی زبان بولیں گے'' 23

جب جنگ میں دوست ملکوں کی حالت بدتر ہونے لگی تو ممالک متحدہ امریکہ کے صدر روز ویلٹ (Roosavelt) چین کے صدر چیانگ کائی شیک (Chiang Kai Shek) انگلینڈ کے لیبر پارٹی لیڈر نے چرچل پر دباؤ ڈالا کہ وہ جنگ میں ہندوستانیوں کی فعال مدد حاصل کریں۔ اس کے لیے انگلینڈ کی حکومت نے مارچ 1942 میں کابینہ وزیر اسٹیفورڈ کرپس (Stafford Cripps) کی قیادت میں ایک مشن ہندوستان بھیجا۔ کرپس لیبر پارٹی کے بائیں بازو کے رکن تھے اور انھوں نے قومی تحریک کی پہلے زوردار حمایت کی تھی۔ ہندوستان میں قدم رکھتے ہی انھوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں برٹش پالیسی کا مقصد ہے کہ ''جتنی جلدی ممکن ہو، ہندوستان میں سیلف گورنمنٹ کا قیام ہو۔ مگر اعلان کرنے کے لیے جو مسودہ (Draft Declaration) وہ اپنے ساتھ لائے تھے بے حد مایوس کن تھا۔ مسودہ میں ہندوستان کو آزاد انگریزی ریاست (Dominion) کا درجہ دینے کی بات تھی اور ایک دستور ساز کونسل کا وعدہ تھا جس کے کچھ ممبران صوبائی اسمبلیوں کے ذریعہ چنے جائیں گے اور دیسی ریاستوں کے ممبران وہاں کے حکمرانوں کے ذریعہ نامزد ہوں گے۔ پاکستان کے مطالبہ کے لیے اس میں گنجائش رکھی گئی تھی کہ اگر کسی صوبہ کو نیا دستور منظور نہیں ہے تو اپنی مستقبل حیثیت (Future Status) کے لیے انگلینڈ سے الگ سمجھوتہ کر سکے گا۔ لیکن یہ سارے کام جنگ کے بعد ہی ہونے تھے۔ بروقت پورے ملک میں ہندوستان کی دفاع پر سارا اختیار انگلینڈ کا رہے گا۔ ایمری (Amery) سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس اعلان کو حقیقت میں قدامت و رُجعت پسند اور محدود پیشکش بتایا 24 نہرو جو کرپس کے دوست بھی تھے انھوں نے بعد میں لکھا کہ ''جب میں نے پہلی بار ان تجاویز کو پڑھا تو مجھے بے حد مایوسی ہوئی'' 25

آخر کار کانگریس لیڈروں اور کرپس کے درمیان بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا کیونکہ ملک کو مکمل آزادی دینے کے بجائے آزاد انگریزی ریاست کا درجہ دیے جانے، دستور ساز کونسل کے ممبروں کو لوگوں کے ذریعہ چنے جانے کے بجائے دیسی حکمرانوں کے ذریعہ نامزد کیے

جانے اور اس کے علاوہ وہ دفعہ جس کے تحت ملک کی تقسیم ہو سکتی تھی، اس پر کانگریس کو سخت اعتراض تھا۔ برٹش حکومت کو بھی تسلیم نہیں تھا کہ مکمل آزادی ہندوستان کو سونپ دی جائے اور ملک کی دفاع میں ان کی شرکت ہو۔ بات چیت ناکام ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ کرپس اپنے طور سے معاملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چرچل، وزیر خارجہ ایمری، وائسرائے لنلتھگو اور کمانڈر ان چیف ویول (Wavell) نہیں چاہتے تھے کہ کرپس مشن کامیاب ہو۔ جہاں تک ممکن تھا ان لوگوں نے ہندوستان کے ساتھ مصالحت کرنے کی کرپس کی ساری کوششوں کی مستقل مخالفت کی۔ اسٹیفرڈ کرپس (Stafford Cripps) ناکام ہو کر وسط اپریل میں ہندوستانیوں کو مایوس اور دکھی چھوڑ کر انگلینڈ واپس چلے گئے۔ اگرچہ لوگوں کو فسطائیت مخالف طاقتوں خصوصاً چین اور روس سے بے حد ہمدردی تھی مگر ان کے لیے ملک کی موجودہ حالت ناقابل برداشت تھی۔ وہ اب محسوس کر رہے تھے کہ آمرانہ سلطنت پر فیصلہ کن حملہ کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

باب۔35

ہندوستان چھوڑو تحریک اور آزاد ہند فوج

بھارت چھوڑو تحریک جو اگست انقلاب کے نام سے بھی مشہور ہے، ہندستانی عوام کی غیر معمولی بہادری، دلیری اور جوانمردی کا بے مثل مظاہرہ تھا، مگر برٹش حکومت کے ذریعہ اس کا انسداد بھی اتنا ہی ظالمانہ اور وحشیانہ تھا۔ جن مخالف حالات میں یہ تحریک چھیڑی گئی ویسے حالات قومی تحریک میں اب تک نہیں آئے تھے۔ فوج کی جنگی کوششوں کی آڑ میں حکومت نے خود کو سخت سے سخت قانونوں سے لیس کر لیا تھا، یہاں تک کہ لوگوں کے سارے بنیادی شہری حقوق پامال کر دیے گئے تھے اور پرامن سیاسی سرگرمیاں بھی ممنوع تھیں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب حالات اتنے نازک اور خراب تھے اور حکومت کی طرف سے وحشیانہ کارروائی کیا جانا طے تھا، تو پھر اتنی جوکھم بھری تحریک چلانا کیوں ضروری ہو گیا تھا؟

پہلی وجہ یہ تھی کہ اپریل 1942 میں کرپس مشن کے ناکام ہونے کے بعد یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ برٹش سرکار جنگ میں ہندوستان کی مرضی کے بغیر اشتراک کو برقرار رکھنا چاہتی ہے، لیکن کسی باعزت سمجھوتہ کے لیے تیار بھی نہیں ہے۔ کرپس مشن کی خالی جھولی سے گاندھی جی اور نہرو جیسے کانگریسیوں کو جو فسطائیت مخالف جنگ میں کسی طرح آڑے نہیں آنا چاہتے تھے (اور

جنھوں نے ان لوگوں کو قابو میں رکھنے میں اہم کردار ادا کیا تھا جو 1939 سے ہی انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بیتاب تھے) یقین ہو گیا تھا کہ اور زیادہ خاموش رہنا یہ تسلیم کر لینا ہوگا کہ برٹش سرکار کو ہندوستان کی منشا لیے بغیر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہے۔ گاندھی جی کا رجحان نہرو ہی کی طرح صاف تھا کہ وہ فسطائیت مخالف جدو جہد خصوصاً روسیوں اور چینیوں کے ذریعہ کی جا رہی جدو جہد میں رخنہ نہیں ڈالنا چاہتے ہیں۔ بہرحال موسم بسنت 1942 تک ان کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب تو جدو جہد کرنا ناگزیر ہے۔ کرپس کے واپس ہونے کے دو ہفتے بعد گاندھی جی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لیے ایک قرارداد تیار کیا جس میں انگلینڈ کو ہندوستان چھوڑنے کے لیے کہا گیا تھا اور اس سے یعنی کانگریس ورکنگ کمیٹی سے جاپانی حملہ ہونے پر، پر امن عدم تعاون تحریک چلانے کی اپیل کی گئی تھی۔ اگست 1942 تک نہرو ایسی کسی جدو جہد کے خلاف تھے مگر بالآخر وہ بھی راضی ہو گئے۔

انگلینڈ کی ضد اور ہٹ دھرمی کے علاوہ اور بھی اسباب تھے جنھوں نے جدو جہد کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ جنگ کی وجہ سے ضروری اشیا کی قیمتیں بے تحاشہ بڑھ گئی تھیں اور ان کی قلت سے عوام میں سخت بے اطمینانی تھی۔ حکومت کے ذریعہ کی جا رہی جابرانہ کارروائیاں مثلاً بنگال اور اڑیسہ میں کشتیوں کو اس خدشہ سے ضبط کر لیا گیا تھا کہ جاپانی ان کا استعمال نہ کر سکیں، عوام کے لیے بے حد پریشانی اور مصیبت کا باعث تھیں۔ لوگوں میں بے انتہا غم و غصہ تھا۔

ملایا اور برما کو برٹش حکومت نے جس طرح خالی کیا تھا، اس سے بھی لوگوں میں بڑی بے اطمینانی تھی۔ گوروں نے بستیاں خالی کر کے مقامی لوگوں کو قسمت کے سہارے چھوڑ دیا تھا۔ جنوب مشرق ایشیا سے ہندوستانیوں کے جو خطوط ان کے گھر آ رہے تھے ان سے وہاں کے خراب حالات کی اچھی طرح معلومات ہو رہی تھی۔ لوگوں کو انگریزوں کی غداری کا علم ہو رہا تھا کہ انھوں نے وہاں کی عوام کو کس طرح جاپانیوں کا ظلم و ستم سہنے کے لیے لاچار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہندوستان پر جاپان کا قبضہ ہوتا ہے تو وہ یہاں بھی وہی کریں گے۔ اس کے علاوہ قومی لیڈروں کے نزدیک تحریک چھیڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں پست ہمتی اور مایوسی کا غلبہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر ایسے ماحول میں جاپانی حملہ ہوا تو لوگ مقابلہ کی ہمت تک نہیں کریں گے۔

اس لیے لوگوں کو اس طرح کے مایوس کن حالات سے نکالنا اور ان کو ان کی قوت کا احساس دلانا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ گاندھی جی کا رجحان اس معاملہ میں بالکل صاف طور سے یہی تھا۔

دھیرے دھیرے برٹش حکومت میں لوگوں کا اعتماد اتنا گر گیا کہ لوگ بینکوں اور ڈاکخانوں سے اپنی جمع رقم نکالنے لگے اور اس کو سونے، چاندی اور سکوں میں بدل کر ذخیرہ کرنے لگے، یہ کیفیت خاص طور سے یو پی اور بہار میں تھی۔ مدراس پریسیڈنسی میں بھی یہی ہو رہا تھا۔

گاندھی جی کو یقین ہو گیا کہ جد و جہد کے لیے مناسب وقت یہی ہے۔ شروع جون میں انھوں نے لوئی فشر (Louis Fischer) سے ملاقات کے وقت کہا کہ "اب میں بیتاب ہوں ممکن ہے میں کانگریس کو نہ سمجھا پاؤں پھر بھی میں آگے بڑھتا ہوں اور سیدھے لوگوں کو اس کے لیے تیار کرتا ہوں" 1 کانگریس نے عوامی تحریک کے لیے وقت کے تعین کے بارے میں گاندھی جی کے مشورے کو منظور کر لیا۔

اگر چہ گاندھی جی نے بہت پہلے سے تحریک چلانے کے بارے میں بات شروع کی تھی مگر 14 / جولائی 1942 کو باقاعدہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے سب سے پہلے واردھا میں اس کو تسلیم کر لیا اور پھر اس کو منظور کرنے کے لیے اگست میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ بمبئی میں ہوئی۔

اگست کا یہ تاریخی اجلاس بمبئی کے گوالیا ٹینک (Gwalia Tank) میں منعقد ہوا۔ لوگوں میں غضب کا حوصلہ تھا۔ لیڈران اندر مختلف نقطوں پر بات چیت کر رہے تھے اور باہر لوگوں کا کثیر مجمع انتظار کر رہا تھا۔ ان کا فیصلہ سننے کے لیے لوگ اس قدر بیتاب تھے کہ جب کھلے اجلاس میں لیڈروں کی تقریریں ہونے لگیں تو مجمع پر خاموشی طاری ہو گئی اگر چہ لوگوں کی انگنت تعداد وہاں موجود تھی۔

گاندھی جی نے حسب معمول سیدھے سادے لفظوں میں بہت پر سکون انداز میں اپنی تقریر کی 3 لوگوں پر ان کی تقریر کا بجلی کی طرح اثر پڑا۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ واضح کیا کہ "اصلی جد و جہد اسی ساعت نہیں شروع ہو رہی ہے۔ آپ نے فیصلہ کرنے کا پورا اختیار مجھے دیا ہے۔ اب میں وائسرائے کی جناب میں حاضر ہو کر عرض کروں گا کہ وہ کانگریس کا مطالبہ تسلیم

کرلیں۔اس کام میں دو تین ہفتے لگ سکتے ہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ ''آپ اتنا سمجھ لیں کہ میں وائسرائے سے وزارت یا اسی طرح کی دوسری باتوں پر معاملہ کرنے نہیں جارہا ہوں، میں مکمل آزادی سے کم کسی بات پر مطمئن ہونے والا نہیں ہوں۔ ممکن ہے وہ نمک ٹیکس اور شراب خوری وغیرہ ختم کرنے کی تجویز رکھیں مگر میں ان سے کہوں گا کہ ''آزادی سے کم کچھ نہیں منظور ہے''۔اس کے بعد ہی انھوں نے ''کرو یا مرو'' کا نعرہ دیا۔میرے پاس ایک منتر ہے، چھوٹا سا منتر ہے، جو میں آپ کو دیتا ہوں۔آپ اس کو اپنے دلوں میں نقش کر لیجیے اور اپنی ہر ایک سانس کے ساتھ اس کا اظہار کرتے رہیے، وہ منتر یہ ہے ''کرو یا مرو'' یا تو ہم ہندوستان کو آزاد کرائیں گے یا اسی کوشش میں اپنی جان دے دیں گے۔مستقل غلامی میں جینے کے لیے ہم زندہ نہیں رہیں گے''۔

گاندھی جی کی تقریر میں مختلف طبقوں کے لیے خصوصی ہدایتیں تھیں۔سرکاری عملہ نوکری نہ چھوڑے مگر اپنی وفاداری کا اعلان کھل کر کردے۔فوجی جوان اپنے عہدے سے استعفیٰ نہ دیں مگر اپنے ہم وطنوں پر گولیاں برسانے سے انکار کردیں۔دیسی راجاؤں مہاراجوں سے کہا گیا کہ وہ بدیسی حکومت کی اطاعت کرنے کے بجائے عوام کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں اور ان کی ریاستوں میں رہنے والی عوام خود کو ہندستانی قوم کا ایک جز اعلان کرے اور راجاؤں کی قیادت تبھی تسلیم کرے جب وہ اپنا مستقبل عوام کے ساتھ جوڑ لیں۔طلبا پڑھائی بند کردیں اگر وہ یقین کرتے ہیں کہ آزادی کے حصول تک وہ اپنے ارادے میں ثابت قدم رہیں گے۔7 راگست کو گاندھی جی نے اپنی ہدایات جن کا مسودہ انھوں نے پہلے تیار کیا تھا، ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ان میں کسانوں سے کہا گیا کہ جو باہمت ہوں اور جو اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کے لیے تیار ہوں ان کو مال گزاری دینے سے انکار کردینا چاہیے۔اسامیوں سے کہا گیا کہ کانگریس کی نگاہ میں زمین کے مالک اس کے جوتنے والے ہوتے ہیں، زمین کسی اور کی نہیں ہوتی۔جن علاقوں میں زمینداری سسٹم لاگو تھا وہاں کے زمیندار اگر رعیت کا ساتھ دیں تو وہاں کی مال گزاری آپسی سمجھوتہ سے طے کر کے ادا کی جائے اور اگر زمیندار سرکار کی موافقت کریں تو ان کو کوئی ٹیکس نہ ادا کیا جائے''[4] یوں تو یہ ہدایتیں اچانک گرفتاریوں کی وجہ سے جاری نہیں کی جاسکیں مگر ان سے گاندھی جی کی منشا اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔

بہر حال حکومت کانگریس سے بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اور نہ وہ یہ انتظار کرنا چاہتی تھی کہ جب کانگریس باقاعدہ تحریک چلائے تب وہ اس کے خلاف کارروائی کرے۔ 9 راگست کو علی الصباح کانگریس کے سبھی بڑے لیڈروں کو بیک وقت آناً فاناً گرفتار کر کے نامعلوم جگہوں پر نظر بند کر دیا گیا۔ دراصل حکومت جنگ کے فوراً بعد ایسی کارروائی کرنے کی تیاری کر رہی تھی اور 1940 میں اس نے ایک مفصل آرڈیننس جس کا نام تھا انقلابی تحریک حکم نامہ (Revolutionary Movements Ordinance) جاری کر دیا تھا۔ 8 راگست 1940 کو وائسرائے لنلتھگو نے اپنے ذاتی مراسلہ میں گورنروں کو اپنی منشا واضح کی تھی کہ "میں بری طرح محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اگر کانگریس کا کوئی حصہ جنگ کا اعلان کر دیتا ہے تو اس کا واحد جواب یہی ہو سکتا ہے کہ پوری تنظیم کو ہی کچل ڈالنے کا علی الاعلان ارادہ کر لیا جائے"۔5 چونکہ ابھی تیاری نہیں تھی اس لیے گاندھی جی نے جلد بازی میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی۔ اس طرح وہ پورے دو سال حکومت کے ذریعہ بچھائے گئے گرفتاری کے جال میں پھنسنے سے بچتے رہے۔ اس کے بجائے انھوں نے انفرادی طور سے سول نافرمانی تحریک چلا کر تنظیم کو منظم کیا اور مسلسل پروپگنڈہ اور پرچار کے ذریعہ تحریکی ماحول بنائے رکھا۔ لیکن حکومت اب ان کو اپنی پالیسی پر چلنے کے لیے اور زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتی تھی: اس لیے قبل اس کے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی "بھارت چھوڑو" قرارداد کا اعلان کرے، سبھی صوبوں میں لیڈروں کو گرفتار کرنے اور تحریک کو کچلنے کے سرکاری احکام بھیج دیے گئے۔

حکومت کے ذریعہ کی گئی اچانک کارروائی سے پورے ملک میں طوفان سا آ گیا۔ لوگوں پر اس کا بڑا ردعمل ہوا۔ لیڈروں کی گرفتاری کی خبر پھیلتے ہی بمبئی کے گوالیا ٹینک میں لاکھوں کا مجمع امڈ پڑا۔ وہیں ایک عام میٹنگ منعقد ہوئی اور افسروں سے تصادم بھی ہوئے۔ 10 راگست کو دہلی، یوپی اور بہار کے بہت سے شہروں کانپور، الہ آباد، بنارس اور پٹنہ میں قانون کے احتجاج میں ہڑتالیں ہوئیں، مظاہرے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ حکومت نے ان سب کے جواب میں پریس پر پابندی لگا دی۔ نیشنل ہیرالڈ اور ہریجن اخباروں کی اشاعت دوران تحریک روک دی گئی۔ دوسرے اور اخباروں پر کچھ ہی مدت کے لیے پابندی رہی۔

کرلیں۔اس کام میں دو تین ہفتے لگ سکتے ہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ'' آپ اتنا سمجھ لیں کہ میں وائسرائے سے وزارت یا اسی طرح کی دوسری باتوں پر معاملہ کرنے نہیں جارہا ہوں، میں مکمل آزادی سے کم کسی بات پر مطمئن ہونے والا نہیں ہوں۔ممکن ہے وہ نمک ٹیکس اور شراب خوری وغیرہ ختم کرنے کی تجویز رکھیں مگر میں ان سے کہوں گا کہ'' آزادی سے کم کچھ نہیں منظور ہے''۔اس کے بعد ہی انھوں نے'' کرو یا مرو'' کا نعرہ دیا۔میرے پاس ایک منتر ہے، چھوٹا سا منتر ہے، جو میں آپ کو دیتا ہوں۔آپ اس کو اپنے دلوں میں نقش کرلیجیے اور اپنی ہر ایک سانس کے ساتھ اس کا اظہار کرتے رہیے، وہ منتر یہ ہے'' کرو یا مرو'' یا تو ہم ہندوستان کو آزاد کرائیں گے یا اسی کوشش میں اپنی جان دے دیں گے۔مستقل غلامی میں جینے کے لیے ہم زندہ نہیں رہیں گے''۔

گاندھی جی کی تقریر میں مختلف طبقوں کے لیے خصوصی ہدایتیں تھیں۔سرکاری عملہ نوکری نہ چھوڑے مگر اپنی وفاداری کا اعلان کھل کر کردے۔فوجی جوان اپنے عہدے سے استعفےٰ نہ دیں مگر اپنے ہم وطنوں پر گولیاں برسانے سے انکار کردیں۔دیسی راجاؤں مہاراجوں سے کہا گیا کہ وہ بدیسی حکومت کی اطاعت کرنے کے بجائے عوام کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں اور ان کی ریاستوں میں رہنے والی عوام خود کو ہندستانی قوم کا ایک جز اعلان کرے اور راجاؤں کی قیادت تبھی تسلیم کرے جب وہ اپنا مستقبل عوام کے ساتھ جوڑ لیں۔طلبا پڑھائی بند کردیں اگر وہ یقین کرتے ہیں کہ آزادی کے حصول تک وہ اپنے ارادے میں ثابت قدم رہیں گے۔7راگست کو گاندھی جی نے اپنی ہدایات جن کا مسودہ انھوں نے پہلے تیار کیا تھا، ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ان میں کسانوں سے کہا گیا کہ جو باہمت ہوں اور جو اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کے لیے تیار ہوں ان کو مال گزاری دینے سے انکار کردینا چاہیے۔اسامیوں سے کہا گیا کہ کانگریس کی نگاہ میں زمین کے مالک اس کے جوتنے والے ہوتے ہیں، زمین کسی اور کی نہیں ہوتی۔جن علاقوں میں زمینداری سسٹم لاگو تھا وہاں کے زمیندار اگر رعیت کا ساتھ دیں تو وہاں کی مال گزاری آپسی سمجھوتہ سے طے کرکے ادا کی جائے اور اگر زمیندار سرکار کی موافقت کریں تو ان کو کوئی ٹیکس نہ ادا کیا جائے''[4]

یوں تو یہ ہدایتیں اچانک گرفتاریوں کی وجہ سے جاری نہیں کی جاسکیں مگر ان سے گاندھی جی کی منشا اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔

بہر حال حکومت کانگریس سے بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اور نہ وہ یہ انتظار کرنا چاہتی تھی کہ جب کانگریس باقاعدہ تحریک چلائے تب وہ اس کے خلاف کارروائی کرے۔ 9/اگست کو علی الصباح کانگریس کے سبھی بڑے لیڈروں کو بیک وقت آنا فانا گرفتار کرکے نامعلوم جگہوں پر نظر بند کر دیا گیا۔ دراصل حکومت جنگ کے فوراً بعد ایسی کارروائی کرنے کی تیاری کر رہی تھی اور 1940 میں اس نے ایک مفصل آرڈیننس جس کا نام تھا انقلابی تحریک حکم نامہ (Revolutionary Movements Ordinance) جاری کر دیا تھا۔ 8/اگست 1940 کو وائسرائے لنلتھگو نے اپنے ذاتی مراسلہ میں گورنروں کو اپنی منشا واضح کی تھی کہ ''میں بری طرح محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اگر کانگریس کا کوئی حصہ جنگ کا اعلان کر دیتا ہے تو اس کا واحد جواب یہی ہو سکتا ہے کہ پوری تنظیم کو ہی کچل ڈالنے کا علی الاعلان ارادہ کرلیا جائے''۔5 چونکہ اچھی تیاری نہیں تھی اس لیے گاندھی جی نے جلد بازی میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی۔ اس طرح وہ پورے دو سال حکومت کے ذریعہ بچھائے گئے گرفتاری کے جال میں پھنسنے سے بچتے رہے۔ اس کے بجائے انھوں نے انفرادی طور سے سول نافرمانی تحریک چلا کر تنظیم کو منظم کیا اور مسلسل پروپگنڈہ اور پرچار کے ذریعہ تحریکی ماحول بنائے رکھا۔ لیکن حکومت اب ان کو اپنی پالیسی پر چلنے کے لیے اور زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتی تھی: اس لیے قبل اس کے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ''بھارت چھوڑو'' قرارداد کا اعلان کرے، سبھی صوبوں میں لیڈروں کو گرفتار کرنے اور تحریک کو کچلنے کے سرکاری احکام بھیج دیے گئے۔

حکومت کے ذریعہ کی گئی اچانک کارروائی سے پورے ملک میں طوفان سا آ گیا۔ لوگوں پر اس کا بڑا ردعمل ہوا۔ لیڈروں کی گرفتاری کی خبر پھیلتے ہی بمبئی کے گوالیا ٹینک میں لاکھوں کا مجمع امڑ پڑا۔ وہیں ایک عام میٹنگ منعقد ہوئی اور افسروں سے تصادم بھی ہوئے۔ 10/اگست کو دہلی، یوپی اور بہار کے بہت سے شہروں کانپور، الہ آباد، بنارس اور پٹنہ میں قانون کے احتجاج میں ہڑتالیں ہوئیں، مظاہرے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ حکومت نے ان سب کے جواب میں پریس پر پابندی لگا دی۔ نیشنل ہیرالڈ اور ہریجن اخباروں کی اشاعت دوران تحریک روک دی گئی۔ دوسرے اور اخباروں پر کچھ ہی مدت کے لیے پابندی رہی۔

اسی اثنا میں صوبائی اور مقامی سطح کے بہت سے لیڈر گرفتاری سے بچ کر خفیہ راستوں سے گھر لوٹے اور احتجاجی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ دور تک اس کی خبریں پھیل گئیں اور وہاں کے لوگ بھی شہر والوں کے ساتھ احتجاج میں شریک ہو گئے۔ 9/اگست سے چھ یا سات ہفتے بعد تک پورے ملک میں بغاوت کی زبردست ہوا چلنے لگی۔ لوگوں نے اپنے غم وغصہ کے اظہار کے لیے مختلف طریقے اپنائے تھے۔ کچھ جگہوں پر لوگوں کی کثیر بھیڑ پولیس تھانوں، پوسٹ آفسوں، کچہریوں، ریلوے اسٹیشنوں اور سرکاری اقتدار کی دوسری علامتوں پر حملہ کرتی تھی۔ دوسری جگہوں پر ستیہ گرہیوں کے جتھے تحصیل یا ضلع کے صدر مقامات پر گرفتاریاں دیتے تھے۔ سرکاری عمارتوں پر قومی جھنڈا جبراً لہرایا جاتا تھا۔ گاؤں کی بھیڑ کے ذریعہ جس میں اکثر کچھ ہی سو یا مشکل سے دو ہزار لوگ ہوتے تھے، ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی جاتی تھیں۔ پورے ملک میں طلبا نے ہڑتالیں کر دیں اور جلوس نکال کر غیر قانونی پرچے تقسیم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح کی سینکڑوں میگزینیں پورے ملک میں نکلنے لگیں۔ طلبا کی ابھرتی ہوئی خفیہ تنظیموں نے جگہ جگہ پیغام بھیجنے کا کام کیا۔ کارخانہ مزدور بھی پیچھے نہیں تھے۔ احمد آباد میں ملیں 3.1/2 ماہ بند رہیں۔ 9 اگست کی گرفتاری کا ردعمل تو بہار اور یوپی میں بے حد سخت تھا۔ یہاں کی تحریک نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ تقریباً وسط اگست سے گرفتاری کی خبر طلبا اور دوسرے سیاسی کارکنوں کے ذریعہ گاؤں تک پہنچ گئی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبا نے ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کے پیغام کو گاؤں گاؤں تک پھیلانے کا فیصلہ کیا۔ ان سب کے یہی نعرے تھے ''تھانہ جلاؤ'' ''اسٹیشن پھونک دو'' ''انگریز بھاگ گیا'' وغیرہ۔ وہ ریل گاڑیوں پر زبردستی قومی جھنڈا لہرا دیتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کے غم وغصہ کا یہ عالم تھا کہ وہ تحصیل یا ضلع ہیڈ کوارٹر پر اکٹھا ہو کر ان عمارتوں پر حملہ کرتے جو سرکاری اقتدار کی علامتیں تھیں۔ گولیاں برسا کر حکومت بغاوت فرو کرنے کی جتنی کوشش کرتی، لوگوں کا حوصلہ اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ بہار کا ترہت علاقہ ملک کے دوسرے حصوں سے تو بالکل کٹ سا گیا تھا۔ وہاں دو ہفتوں تک سرکار کا کوئی وجود ہی نہیں رہا۔ سکریٹریٹ پر گولہ باری کے بعد پٹنہ دو روز تک سرکاری کنٹرول سے باہر ہو گیا۔ اتر اور وسط بہار کے دس ضلعوں میں 80/فیصد تھانوں پر لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ کچھ جگہوں پر یوروپی مارے پیٹے بھی گئے۔ پٹنہ کے قریب فتوا

(Fatwa) میں شاہی ہوائی فوج (RAF) کے دو جوانوں کو لوگوں نے ریلوے اسٹیشن کے پاس قتل کر ڈالا اور ان کی لاشیں شہر میں گھمائی گئیں۔ منگیر میں 18/ اگست کو پسرہا (Pasraha) اور 30/ اگست کو روہار (Ruihar) کے پاس آر۔اے۔ایف کے جو جہاز حادثہ میں گر گئے تھے ان کے عملے کو گاؤں والوں نے قتل کر ڈالا۔ یو پی میں اعظم گڑھ، بلیا اور گورکھپور اور بہار میں گیا، بھاگل پور، سارن، پورنیا، شاہا آباد، مظفرنگر اور چمپارن عوامی بغاوت کے خاص مراکز تھے۔

سرکاری اندازہ کے مطابق، لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پہلے ہفتہ میں 200 ریلوے اسٹیشنوں کو یا تو نقصان پہنچایا گیا یا برباد کر دیا گیا۔ 500 سے زیادہ ڈاکخانوں اور 150 تھانوں پر حملے ہوئے۔ پوری یو پی اور بہار میں ریلوں کی آمدرفت کئی دنوں تک درہم برہم رہی۔ 26 ریلوے اسٹیشنوں اور 32 ڈاکخانوں پر حملے ہوئے۔ 532 موقعوں پر نہتھی بھیڑ نے پولیس اور فوج کی گولہ باری کا مقابلہ کیا۔ ہوائی جہازوں سے ان پر مشین گنیں داغی گئیں۔ بغاوت کو فرد کرنے کے دوسرے طریقے بھی اپنائے گئے۔ گاؤں والوں کو بندھک بنایا گیا، ان پر مجموعی طور سے نو لاکھ روپوں کا جرمانہ تھوپا گیا۔ (جس کو اکثر موقع پر ہی لوگوں کے سامان کو لوٹ کر وصول کیا گیا) مشتبہ لوگوں کو کوڑوں سے پیٹا گیا اور ان گاؤں کو جلا ڈالا گیا جن کے باشندے بھاگ گئے تھے۔ 1942 کے آخر تک ساٹھ ہزار سے زیادہ لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ 26 ہزار لوگوں کو سزائیں دی گئیں اور 18000 لوگوں کو ہندوستان حفاظتی قانون کے تحت نظر بند کیا گیا۔ یوں مارشل لا (Martial Law) نہیں لگایا گیا مگر فوج جو عام حالات میں ضلع افسروں کے حکم پر عمل کرتی تھی اب من مانی کرنے کے لیے آزاد تھی۔ جبر وظلم مارشل لا ہی کی طرح ہو رہا تھا۔

برٹش حکومت کو اس طرح کی کھلی بغاوت کو وحشیانہ جبر وظلم سے فرد کرنے میں چھ سے سات ہفتے لگ گئے۔ انھیں دنوں ملک کے مختلف حصوں میں زمین دوز تنظیموں کا جال پھیل گیا۔ یہ تنظیمیں اندر اندر سرکار مخالف کاموں میں مصروف تھیں۔ زمین دوز تنظیموں کی قیادت اچیوت پٹ وردھن، ارونا آصف علی، رام منوہر لوہیا، سوچیتا کرپلانی، چھوٹو بھائی پرانک (Chhotobhai Puranik) بیجو پٹنائک، آر۔ پی۔ گوئنکا اور بعد میں جیل سے فرار ہے

پرکاش نرائن جیسے آل انڈیا سطح کے مشہور ومعروف لیڈروں نے سنبھال لی۔ یہ لیڈر ملک بھر میں بکھری ہوئی زمین دوز تنظیموں کو ضروری ہدایتیں دے کر ان کا حوصلہ بڑھاتے، نیز پیسے جمع کرتے، بم، ہتھیار گولہ بارود جیسے سامان ملک بھر میں پھیلی ہوئی ان تنظیموں کو تقسیم کرتے تھے، البتہ ان لوگوں کا مقامی سطح کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مقامی کام وہیں کی جماعتیں کرتی تھیں۔ بمبئی، پونا، ستارا، بڑودہ اور گجرات کے دوسرے مقامات کرناٹک، کرالہ، آندھرا، یوپی، بہار، اور دہلی ہی وہ علاقے تھے جہاں زمین دوز تنظیمیں زیادہ سرگرم تھیں۔ عام طور سے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لوگ اس کام میں آگے آگے تھے مگر گاندھی وادی، فارورڈ بلاک کے ممبران، دوسرے کانگریسی اور تخریف پسند انقلابی بھی بے حد سرگرم تھے۔

یوں تو زمین دوز سرگری سے منسلک لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی مگر جو بھی تھی، ان کو سماج کے مختلف لوگوں کی مدد حاصل تھی، تاجر بڑی فراخدلی سے چندہ دیتے تھے۔ سومتی مرارجی (Sumati Murarji) جو بعد میں ہندوستان کی چوٹی کی مل مالکہ ہوئیں انھوں نے اچیوت پٹوردھن کو پولیس کی شناخت سے بچانے کے لیے ہر روز نئی نئی کار اپنے غیر مشتبہ دوستوں سے لے کر دیتی تھیں۔ بہت سارے دوسرے لوگوں نے زمین دوز تنظیموں کے کارکنوں کو خفیہ طور سے ٹھہرانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ طلبا خبر رسانی کا کام کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ پولیس مخبری سے باز رہتے تھے۔ جہاز کے کپتان اور ریلوے ڈرائیور بم اور دوسرے سامان ملک بھر میں پہنچانے کا کام انجام دیتے تھے۔ پولیس اور سرکاری افسران ہونے والی گرفتاریوں کی خبر متعلقہ لوگوں کو کر دیتے تھے۔ اچیوت پٹوردھن خود تصدیق کرتے ہیں کہ تین بڑے سرکاری افسروں پر مشتمل کمیٹی جو کانگریسیوں کو تلاش کرنے کے لیے حکومت کے ذریعہ بنائی گئی تھی، اس کا ایک افسر روزانہ اس کمیٹی کی مختلف کارروائیوں کی خبر دیتا رہتا تھا[6]

عام طور سے پلوں کو ڈائنامائٹ سے اڑا دینا، ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے تاروں کو کاٹ ڈالنا اور ریل کی پٹریاں اکھاڑ کر آمدورفت کے ذرائع درہم برہم کر دینا وغیرہ کام زمین دوز تحریک کرتی تھی۔ کہیں کہیں سول اور پولیس افسروں، پولیس مخبروں پر حملے بھی کیے گئے تھے۔ ان کاموں سے صرف حکومت کی دشواریاں بڑھتی تھیں، لوگوں کو کوئی اور فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ بہر حال ایسے وقت

میں جب توپ وتفنگ کے سامنے کھلی سرگرمی ناممکن تھی، ان کاموں نے لوگوں کا حوصلہ ضرور برقرار رکھا تھا۔ ان دنوں تحریک کی خبریں پہنچانا بھی اہم اور جوکھم بھرا کام تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ڈرامائی کام بمبئی شہر کے مختلف مرکزوں سے ریڈیو کی مخفی نقل وحرکت تھی۔ اس کی خبریں مدراس تک سنی جاتی تھیں۔ رام منوہر لوہیا پابندی سے خبریں نشر کرتے تھے۔ یہ سلسلہ باقاعدہ نومبر 1942 تک چلتا رہا۔ بالآخر پولیس کو اس راز کا پتہ چل گیا اور اس نے اس کو ضبط کرلیا۔[7]

فروری 1943 میں ہوئے ایک واقعہ سے سیاسی سرگرمی بہت تیز ہوگئی۔ گاندھی جی نے 10 فروری 1943 سے جیل میں ورت (Fasting) شروع کردیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ یہ عمل اکیس روز چلے گا۔ سرکار گاندھی جی پر مسلسل دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' کے دوران ہوئے تشدد کے واقعات کی مذمت کریں۔ گاندھی جی نے ایسا کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ بہت واضح طریقے سے یہ بھی کہا کہ ان سب کاموں کے لیے حکومت بذاتِ خود ذمہ دار ہے۔ حکومت کے ذریعہ کیے جارہے وحشیانہ مظالم جن میں ہزاروں کانگریسیوں کی ناجائز گرفتاریاں شامل ہیں، انھوں نے ہی لوگوں کو مشتعل کیا ہے۔ جیل میں گاندھی جی کے لیے اس کے خلاف احتجاج درج کرانے کا صرف ایک ہی طریقہ ورت رکھنے کا تھا۔[8]

گاندھی جی کے ورت کی خبر جیوں جیوں پھیلتی گئی، لوگوں کا غم وغصہ بڑھتا گیا۔ لوگوں پر اس کا زبردست ردعمل ہوا۔[9] پورے ملک میں ہڑتالوں، مظاہروں اور جلوسوں کا سلسلہ چل پڑا۔ کلکتہ اور الہ آباد میں لوگ نسبتاً زیادہ سرگرم تھے۔ جیل کے اندر اور باہر لوگوں نے گاندھی جی کی ہمدردی میں روزے رکھے۔ لوگوں کا غول کا غول چپکے چپکے پونا میں آغا خان پیلیس کے سامنے ستیہ گرہ کرنے کے لیے پہنچ گیا جہاں گاندھی جی نظر بند تھے۔ عوامی جلسے کرکے گاندھی جی کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ طلبا، نوجوان، تاجر، کارخانہ کار، وکیل، عام شہری، مزدور تنظیموں نیز سماج کے ہر ایک طبقہ کی طرف سے ہزاروں خطوط اور ٹیلی گرام حکومت کے پاس گاندھی جی کی رہائی کے لیے بھیجے گئے۔ سمندر پار مین چسٹر گارجین (Manchester Guardian) نیشن کرونکل (Nation Chronicle) شکاگو سن (Chicago Sun) اخباروں کے علاوہ برٹش کمیونسٹ پارٹی (Birtish Communist Party) ومنس انٹرنیشنل لیگ

(Women's International League) لندن اور مین چسٹر شہریوں، آسٹریلین کونسل آف ٹریڈ یونین (Australian Council of Trade Union) سیلون اسٹیٹ کونسل (Ceylone State Council) اور یو۔ ایس گورنمنٹ (U.S. Government) نے گاندھی جی کی رہائی کے لیے دباؤ ڈالا۔

19 اور 20 رفروری کو دہلی میں لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سیاسی اور غیر سیاسی ہستیوں نے شرکت کی۔ ان سب نے گاندھی جی کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ جو لوگ کانگریس کے لیے نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے ان لوگوں نے بھی محسوس کیا کہ حکومت زیادتی کر رہی ہے۔ حکومت کے وقار کو اس وقت سب سے زیادہ چوٹ لگی جب وائسرائے کی انتظامیہ کونسل (Executive Council) کے تین ممبروں ایم۔ ایس۔ اینی (M.S. Aney) این۔ آر سرکار اور ایچ۔ پی۔ مودی نے اسی مسئلہ پر استعفے دے دیے۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے 1942 کی تحریک کو کچلنے میں برٹش سرکار کی مدد کی تھی مگر اب وہ گاندھی جی کی موت میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔

لیکن وائسرائے اور اس کے افسروں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ لوگ ونسٹن چرچل (Winston Churchill) کے اس بیان پر عمل کر رہے تھے جس کو اس نے اپنی کیبنٹ کے سامنے دیا تھا کہ ''جب دنیا میں ہر جگہ ہماری فتح کے ڈنکے بج رہے ہیں، ایسے وقت میں ہم اس کم بخت بڈھے کے سامنے جو ہمیشہ سے ہمارا دشمن رہا ہے کیسے جھک سکتے ہیں؟[10] چرچل اتنا گستاخ اور متکبر تھا کہ ہندوستانیوں کے جذبات سے اس کو کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ گاندھی جی کی موت سے پیدا ہونے والے حالات کے بارے میں وائسرائے بالکل بے فکر اور لاپرواہ تھا۔ اس کے لفظوں میں ''چھ ماہ میں سارے ناخوش گوار حالات دھیرے دھیرے گزر جائیں گے۔ آخر میں بہت تھوڑا یا کچھ نہیں بچے گا''۔ اس طرح کی بات سے تو یہ معلوم پڑتا ہے کہ وہ گاندھی جی کی متوقع موت سے بہت خوش تھا۔ اس کے مطابق گاندھی جی کی عدم موجودگی میں ہندوستان برٹش حکومت کی نقل و حرکت کا بھروسہ مند مرکز اور پایہ بن جائے گا۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کے منظر عام سے ہٹنے پر مصالحت کرنے کے امکانات بھی بڑھ جائیں گے کیونکہ یہی شخص برسوں سے

سمجھوتہ کے لیے ہماری ہر ایک کوشش اکارت کیے ہوئے ہے"۔[11]

ان دنوں حالات یہ تھے کہ پورا ملک گاندھی جی کی زندگی بچانے کی اپیل کر رہا تھا اور دوسری طرف حکومت ان کی زندگی کی آخری رسم ادا کرنے کی تیاری میں مصروف تھی۔ فوجی دستوں کو کسی بھی ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ ان کے جنازہ کا جلوس نکالنے اور ان کی راکھ کو لے جانے کے لیے بڑی فراخدلی سے ہوائی جہاز کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔ اس روز سرکاری دفتروں میں نصف یوم کی تعطیل کا بھی پروگرام تھا۔[12] مگر گاندھی جی نے ہمیشہ کی طرح موت سے انکار کر کے اپنے دشمنوں پر فتح پالی۔ انھوں نے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

بہر حال گاندھی جی کے ورت کا مقصد اچھی طرح پورا ہوا۔ اس سے نہ صرف عوام کا حوصلہ بڑھا بلکہ برٹش مخالف احساسات بھی اس کے تیز تر ہوئے۔ اور ساری دنیا کے سامنے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سرکاری جبر و ظلم کے طریقے کس قدر وحشیانہ تھے اور 1942 کی تحریک کو دبانے میں حکومت جس طرح خود کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتی تھی وہ سب سراسر غلط تھا۔

ہندوستان چھوڑو تحریک کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ملک کے کچھ حصوں میں متوازی سرکاریں قائم ہوگئیں۔ پہلی سرکار مشرقی یوپی کے بلیا ضلع میں چھتو پانڈے جو خود کو گاندھی وادی کہتے تھے کی قیادت میں قائم ہوئی۔ انھوں نے کلکٹر سے سارے سرکاری اختیارات سپرد کرا لیے اور سبھی گرفتار کانگریسیوں کو بری کرا لیا، مگر ان کے اقتدار کی مدت بہت قلیل تھی۔ ایک ہفتہ بعد فوج وہاں پہنچ گئی۔ تب سارے لیڈروں نے راہ فرار اختیار کی۔[13]

بنگال کے مدنا پور ضلع کے تاملک (Tamluk) میں 17 دسمبر 1942 کو جاتیا سرکار (قومی حکومت) کا قیام ہوا اور اس کا وجود ستمبر 1944 تک قائم رہا۔ تاملک ایسا علاقہ تھا جہاں گاندھی وادی تعمیری کام بہت کیے گئے تھے اور جو پہلے سے سرگرم تحریکوں کا خاص مقام تھا۔ جاتیا سرکار نے بہت تیزی سے بڑے پیمانے پر راحت کے کام کیے۔ اسکولوں کو مالی امداد (گرانٹ) دی گئی اور ودیت واہنی (Vidyut Vahini) مسلح فوج کی تشکیل کی گئی۔ آپس میں سمجھوتہ کرانے کے لیے عدالتیں قائم کی گئیں اور امیروں کا زائد دھان غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ یہ علاقہ نسبتاً دور دراز حصہ میں واقع تھا، اس لیے یہاں متوازی حکومت کچھ زیادہ

ہی مدت تک قدرے اطمینان سے چل سکی[14]

مہاراشٹر کے ستارا میں سب سے طویل اور موثر متوازی حکومت کا قیام ہوا۔ ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' کی شروعات سے ہی یہ علاقہ تحریکی جد وجہد میں بہت سرگرم تھا۔ تحریک کے پہلے دور اگست 1942 سے ہی سرکاری مقامات جیسے کرد (Karad)، تاس گاؤں (Tasgaon) اور اسلام پور میں لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں جلوس نکالا، توڑ پھوڑ بھی کیا، ڈاکخانوں پر حملے کیے، بینکوں کو لوٹا اور ٹیلی گراف تار کاٹ ڈالے۔ وائی۔ بی۔ چوان (Y.B. Chavan) جن کے اچیوت پٹوردھن اور دوسرے زمین دوز لیڈروں سے اچھے تعلقات تھے، سب سے اہم لیڈر تھے۔ 1942 کے آخر تک قریب دو ہزار لوگوں کی گرفتاری سے اس دور کی سرگرمی ختم سی ہوگئی مگر 1943 کی شروعات سے زمین دوز کارکن خود کو پھر سے منظم کرنے لگے اور چھ ماہ کے اندر انھوں نے پرتی سرکار (متوازی حکومت) قائم کر دیا۔ نانا پاٹل (Nana Patil) اس کے سب سے اہم لیڈر تھے۔ ان دنوں برٹش حکومت کو تعاون دینے والے لوگوں، اس کے مخبروں اور چھوٹے سرکاری افسروں پر حملہ کیا جاتا تھا اور رابن ہڈ اسٹائل (Robbin Hood Style) میں بینک ڈکیتیاں ڈالی جاتی تھیں۔ نیائے دان منڈل (Nyayadan Mandal) یعنی عوامی عدالتیں قائم کی گئیں اور انصاف ہونے لگا۔ شراب بندی لاگو کر دی گئی اور گاندھی وداہوں (Gandhi Marriages) کا نظم ہونے لگا جن میں کوئی تزک بھڑک نہیں ہوتی تھی۔ اچھوتوں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ گاؤں میں لائبریریاں قائم کی گئیں اور تعلیمی میدان میں کام ہونے لگا۔ آندھرا ریاست کے راجہ جن کی ریاست کا دستور گاندھی جی کے ذریعہ تیار ہوا تھا اور جو قومی لیڈروں سے ہمدردی رکھتے تھے انھوں نے پرتی سرکار کے کارکنوں کو پناہ دے کر بڑی مدد کی تھی ستارا کی یہ پرتی سرکار 1945 تک کام کرتی رہی[15]

ہندوستان چھوڑو تحریک اس لحاظ سے نئی اونچائی پر پہنچ گئی کہ اس میں عوام نے کثیر تعداد میں حصہ لیا اور قومی معاملہ میں پوری ہمدردی دکھائی۔ پہلے ہی کی طرح نوجوان اس تحریک میں بھی آگے آگے تھے۔ اگست کے شروع ایام میں خصوصاً کالج کے طلبا اور یہاں تک کہ اسکول کے بچے تحریک میں پیش پیش تھے (شاید پہلے کی تحریکوں میں حصہ لینے والے طلبا کی اوسط عمر سے کم

عمر کے بچوں نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔ ارونا آصف علی اور سوچیتا کرپلانی زمین دوز تنظیموں کی خاص ناظمین تھیں۔ اوشا مہتا اس چھوٹی سی جماعت کی خاص فرد تھیں جنھوں نے کانگریس ریڈیو پر کام کیا تھا۔ مزدور پیشہ لوگوں کی بھی قربانیاں قابلِ قدر ہیں جنھوں نے ہڑتالیں کیں اور سڑکوں پر پولیس مظالم کا زبردست مقابلہ کیا۔

پورے ملک کے کسان چاہے وہ غریب رہے ہوں یا امیر، اس تحریک کے روح رواں تھے خصوصاً مشرقی یوپی، بہار، بنگال کے مدنا پور، کسان تحریک میں سرگرم تھے۔ یوپی اور بہار کے چھوٹے چھوٹے زمینداروں نے تحریک میں خاص طور سے حصہ لیا تھا۔ بڑے زمیندار عموماً غیر جانبدار رہے۔ انھوں نے تحریک کو کچلنے کے لیے حکومت سے تعاون نہیں کیا۔ دربھنگہ کے راجہ جو بڑے زمینداروں میں سے تھے ان کا کردار قابلِ تعریف تھا۔ انھوں نے حکومت کو اپنے مسلح فوجی دستہ سے مدد کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنے منیجروں سے ان کسانوں کو مدد کرنے کے لیے ہدایتیں دیں جو گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ کسانوں نے زمینداروں کے خلاف کسی طرح کی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا جبکہ تھوڑے عرصہ کے لیے حکومت کے لڑکھڑا جانے پر بہار، مشرقی یوپی، ستارا اور مدنا پور میں ان کے خلاف کھڑے ہونے کا ان کو موقع مل گیا تھا مگر انھوں نے اپنی تمام تر توجہ حکومت کے خلاف ہی مرکوز رکھی16 سرکاری افسران خصوصاً پولیس اور انتظامیہ کے نچلے طبقہ کے اہل کاران تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انھوں نے بڑی فراخدلی سے اس میں مدد کی تھی۔ وہ لوگوں کو پناہ دیتے، ضروری معلومات فراہم کرتے اور مالی امداد کرتے تھے۔ دراصل ہندوستان چھوڑو تحریک کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حکومت کے تئیں سرکاری افسروں کی وفاداری اٹھ سی گئی تھی۔ جیل افسران اب قیدیوں کے لیے پہلے سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے اور وہ اکثر ان سے کھل کر ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان چھوڑو تحریک میں مسلم عوام کی شرکت بہت زیادہ نہیں تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مسلم لیگ نواز لوگوں نے بھی زمین دوز کام کرنے والوں کو پناہ دی تھی اور کسی طرح کی مخبری کا کام نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ کہیں کوئی فرقہ وارانہ فساد بھی نہیں ہوا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ گرچہ مسلم عوام کی اکثریت میں تحریک کے لیے کوئی حوصلہ نہیں تھا مگر اس سے لوگوں

میں عداوت بھی نہیں تھی۔

ہندوستان چھوڑو تحریک کی کشش اس قدر زبردست تھی کہ اگرچہ کمیونسٹ پارٹی کا فیصلہ تحریک کے خلاف تھا مگر گاؤں اور مقامی سطح کے سیکڑوں کمیونسٹوں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ چھوٹے چھوٹے کارکنان اپنے لیڈروں کے فسطائی مخالف رجحان سے بے حد متاثر تھے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ تحریک کے تیئں مائل ہو کر دوسرے ہندوستانیوں کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک پر دو طرح سے بحث کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ کیا یہ تحریک اچانک رونما ہوئی یا اس کے لیے کوئی منظم کاوش کی گئی؟ دوسری بات یہ کہ عوام نے تحریک کے دوران تشدد کے جو کام کیے اس کا تال میل کانگریس کی اہنسا پالیسی سے کیسے بٹھایا جائے؟

اس بات میں شک نہیں کہ پہلے کی تحریکوں کے لحاظ سے 1942 کی تحریک میں خود بخود متحرک ہونے کا عنصر کہیں زیادہ تھا۔ 1922-1919، 31-1930 اور 1932 میں کانگریس قیادت نے عام لوگوں کی پہل اور جذبات کے ابھار کے لیے اچھی خاصی گنجائش چھوڑی تھی۔ دراصل عوامی تحریک کا گاندھیائی طریقہ ہی یہی تھا کہ قیادت پروگرام کا موٹا موٹا خاکہ تیار کر لیتی تھی جس پر مقامی اور بنیادی سطح کے کارکن عمل کرتے تھے۔ 1930 کی سول نافرمانی تحریک عوام کی سب سے زیادہ منظم گاندھیائی تحریک تھی۔ ڈانڈی مارچ کر کے اور نمک قانون توڑ کر گاندھی جی نے تحریک شروع کرنے کا سگنل دے دیا۔ اب مقامی لیڈروں اور دوسرے لوگوں نے اپنی صواب دید سے طے کر لیا کہ کیا وہ لگان دینا بند کریں گے، جنگل قانون کے خلاف ستیہ گرہ کریں گے یا شراب کی دکان پر دھرنا دیں گے اور اسی طرح کے دوسرے کام کریں گے۔ یہ سچ ہے کہ 1942 میں پروگرام کا خاکہ واضح نہیں کیا گیا تھا کیونکہ قیادت کو تحریک چھیڑنے کا باقاعدہ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ لیکن عوام نے اپنی طرف سے جو پیش قدمی کی اس کی منظوری ایک طرح سے قیادت پہلے ہی دے چکی تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 1942 کی اپنی قرارداد میں صاف صاف کہا تھا کہ "ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب ہدایتیں جاری کرنا ممکن نہ ہو سکے یا ہدایتیں لوگوں تک نہ پہنچ سکیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو ہر ایک مرد وعورت جو تحریک میں شریک ہے اس کو خود

فیصلہ کرنا ہوگا کہ جاری کی گئی ہدایتوں کے دائرہ میں رہ کر وہ کام کرے۔ ہر ایک ہندستانی جو آزادی کا دلدادہ ہے اور اس کے لیے کوشاں ہے اس کو اپنی رہنمائی خود کرنی ہوگی"[17]

اس کے علاوہ کانگریس بہت عرصہ سے نظریاتی، سیاسی اور تنظیمی اعتبار سے جدوجہد کے لیے تیاریاں کرتی آ رہی تھی۔ 34-1932 کے دوران ظلم وستم کے ایام میں اس کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ مگر 1937 کے بعد کانگریس کو خوب چست و درست کرلیا گیا۔ سیاسی اور فکری لحاظ سے کانگریس وزارتوں نے تنظیم کے وقار کو بڑھانے میں بڑی مدد کی تھی۔ مشرقی یوپی اور بہار میں 1942 کے دوران انھیں جگہوں پر سب سے زیادہ سرگرمی ہوئی جہاں 1937 سے عوام میں بیداری پیدا کرنے اور تنظیم کو مضبوط بنانے کا کام مستقل ہو رہا تھا[18] گجرات میں سردار پٹیل برابر باردولی اور دوسرے مقامات کا دورہ جون سے کر کے لوگوں کو کی جانے والی جدوجہد کے بارے میں آگاہ کر رہے تھے اور لوگوں سے مشورۃً کہہ رہے تھے کہ لگان نہ دینے کی مہمیں اس کا حصہ نہیں ہیں۔ پونا میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لوگ جون 1942 سے رضاکاروں کو ٹریننگ دینے کے لیے کیمپ لگائے ہوئے تھے[19] گاندھی جی نے بذات خود ذاتی ستیہ گرہ کے ذریعہ شروع 1942 سے لوگوں کو ہونے والی جنگ کے لیے مستعد کرلیا تھا۔ ان کے مطابق اس جنگ کی مدت قلیل مگر شدید ہوگی[20]

بہرکیف تسلط قائم کرنے کی بنیادی جدوجہد جو ہندستانی قومی تحریک نے کی تھی اس کی اہمیت کو سرگرمی کی شدت سے نہیں ناپا جاسکتا ہے۔ دراصل اہمیت تو اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس نے لوگوں پر اپنے اثرات کس حد تک مرتب کیے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ 1942 میں مجاہدین آزادی کے ذریعہ کیے گئے تشدد کے کاموں کا تال میل کانگریس کی غیر متشدد پالیسی (اہنسا) سے کیسے بٹھایا جائے؟ پہلی بات تو یہ کہ اس وقت بہت سارے لوگ تھے جنھوں نے تحریک کے دوران ہنسا کا سہارا لینے سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے اس کو پسند تک نہیں کیا۔ وہ کانگریس کی روایتی پالیسی پر عمل کرتے رہے۔ البتہ بہت سے گاندھی وادی ایسے بھی تھے جنھوں نے 1942 میں تشدد کا سہارا لیا کیونکہ ان کے نزدیک حالات ہی ایسے تھے کہ ہنسا کا استعمال ناگزیر تھا۔ کچھ لوگ یہ دلیل دیتے تھے کہ چونکہ پلوں کو مسمار کرنے،

ریل کی پٹریوں کو اکھاڑ دینے اور ٹیلگراف تاروں کو کاٹ دینے میں کسی طرح کا جانی نقصان نہیں ہوتا تھا، اس لیے ایسے کام ہنسا کے دائرہ میں نہیں آتے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی صفائی دی کہ انھوں نے تشدد کا سہارا تو لیا مگر تشدد میں ان کا عقیدہ مطلق نہیں تھا۔ گاندھی جی نے بذاتِ خود ہنسا کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے مطابق یہ ہنسا تو حکومت کے ذریعہ کی گئی کہیں بڑی ہنسا کا ردعمل تھا۔ فرانسس ہچن (Francis Hutchin) کے لفظوں میں '' گاندھی جی کو تشدد کے استعمال پر اس لیے اعتراض تھا کیونکہ اس کے ہونے سے تحریک میں عوام کی شرکت گھٹتی تھی مگر 1942 میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس سے عوام کی شرکت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے''۔[21]

تاریخی اہمیت کی اس تحریک کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے ذریعہ کیا گیا آزادی کا مطالبہ قومی تحریک کا پہلا مطالبہ بن گیا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کے بعد اب پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا تھا۔ حکومت سے صرف اب اقتدار ٹرانسفر کرنے پر بات چیت کی جا سکتی تھی۔ آزادی کے سوا اب کوئی سودا نہیں ہو سکتا تھا اور جنگ کے بعد یہ بات اچھی طرح واضح بھی ہو گئی۔

گاندھی جی کو بیماری کی وجہ سے 6 رمئی 1944 کو رہا کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی سیاسی سرگرمی میں پھر سے تیزی آ گئی۔ تعمیری اور اصلاحی کام اس وقت کانگریس کے پروگرام میں خاص تھے۔ کانگریس مشینری کو مضبوط کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ کانگریس ورکرس اسمبلی (Congress Workers Assembly) یا ریپرزنٹیٹیو آف کانگریس مین (Representative of Congress Men) وغیرہ مختلف ناموں سے کانگریس کمیٹیوں کو پھر سے زندہ کیا گیا۔ اس سے کانگریس پر لگی پابندی اپنے آپ بے اثر ہو گئی۔ کارکنوں کی ٹریننگ، ممبری مہم اور رقم اکٹھا کرنے کے کام شروع کر دیے گئے کانگریس کے ان کاموں کو حکومت شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ کانگریس اس طرح دوسرے دور کی جدوجہد کے لیے خود کو اچھی طرح مضبوط کر لے گی۔ 22 اس لیے کانگریس کے کاموں پر سخت چوکسی رکھی گئی۔ البتہ جبر کا راستہ نہیں اپنایا گیا۔ وائسرائے نے اپنی ساری قوت کانگریس سے سمجھوتہ کرنے میں لگا دی۔ جون 1945 میں شملہ کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے کانگریس لیڈروں کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس طرح حکومت کے ساتھ تصادم کا وہ دور ختم ہوا جو اگست

1942 سے چل رہا تھا۔

آخر میں آزاد ہند فوج پر تھوڑی گفتگو کرنا بے حد ضروری ہے۔ سب سے پہلے موہن سنگھ نے ملایا میں اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اس وقت وہ برٹش فوج میں ہندستانی افسر تھے۔ جب برٹش فوج ملایا میں پیچھے ہٹنے لگی تب انھوں نے جاپانیوں سے مدد لینے کا ارادہ کیا۔ جاپانیوں نے اب تک ہندستانی شہریوں کی برٹش مخالف تنظیم بنانے کے لیے ہمت افزائی کی تھی مگر انھوں نے ہندوستانیوں پر مشتمل کوئی فوجی بازو بنانے کی بات نہیں سوچی تھی۔

جاپانیوں نے ہندستانی فوجی قیدیوں کو موہن سنگھ کے حوالے کردیا۔ تب موہن سنگھ نے انھیں کو بھرتی کر کے آزاد ہند فوج کی تشکیل کی۔ ملایا میں برٹش مخالف مظاہرے کیے گئے۔ سنگاپور پر جاپانیوں کا قبضہ بڑی اہمیت کا باعث تھا کیونکہ اس سے 45000 (پینتالیس ہزار) ہندستانی فوجی قیدی (Pows) موہن سنگھ کے زیر اثر ہو گئے۔ 1942 کے آخر تک 40000 (چالیس ہزار) لوگوں نے آزاد ہند فوج میں شمولیت اختیار کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہندوستانیوں کی قیادت کرنے والے لوگوں اور ہندستانی فوجی افسروں کے درمیان مختلف نششتوں میں یہ بات بار بار واضح کی گئی کہ آزاد ہند فوج، کانگریس اور ہندوستانیوں کی دعوت پر ہی حرکت میں آئے گی۔ بہت سے لوگ یہ بھی مانتے تھے کہ آزاد ہند فوج کی وجہ سے جنوبی مشرقی ایشیا میں جاپان ہندوستانیوں کے ساتھ برا سلوک نہیں کرے گا اور نہ مستقبل میں ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بارے میں ہی سوچے گا۔

ہندوستان چھوڑو تحریک نے آزاد ہند فوج کو بڑی تقویت پہنچائی۔ ملایا میں برٹش مخالف مظاہرے کیے گئے۔ اب ستمبر 1942 کو 16300 (سولہ ہزار تین سو) لوگوں پر مشتمل آزاد ہند فوج کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اس وقت تک جاپانی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے اور ان کو ہندوستانیوں کا فوجی شکل میں منظم ہونا فائدہ مند نظر آنے لگا تھا، لیکن دسمبر 1942 تک آزاد ہند فوج کے رول کے بارے میں جاپانی اور ہندستانی افسروں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ موہن سنگھ اور نرنجن سنگھ جو آزاد ہند فوج کے سینئر فوجی افسران تھے کو گرفتار کرلیا گیا۔ دراصل جاپانی چاہتے تھے کہ ہندستانی فوج میں صرف بیس ہزار سپاہی ہوں

جبکہ موہن سنگھ دولاکھ لوگوں کی ہندستانی فوج تیار کرنا چاہتے تھے۔

آزاد ہند فوج کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب سبھاش چندر بوس کو جرمن اور جاپان پنڈبیوں کے ذریعہ 2 جولائی 1943 کو سنگاپور لایا گیا۔ وہاں سے وہ ٹوکیو گئے اور اس کے بعد ہی جاپان کے وزیراعظم ٹوجو (Tojo) نے اعلان کیا کہ جاپان ہندوستان پر قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔ بوس سنگاپور لوٹ گئے اور وہاں انھوں نے 21 اکتوبر 1943 کو پروویژنل گورنمنٹ آف فری انڈیا (Provisional Government of Free India) قائم کیا۔ اس پروویژنل گورنمنٹ نے انگلینڈ اور امریکہ کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ جرمنی، جاپان اور اس کے مددگار ملکوں نے اس کو تسلیم بھی کرلیا۔ سبھاش چندر بوس نے رنگون اور سنگاپور میں دو ہیڈکواٹر بنائے اور آزاد ہند فوج کو دوبارہ منظم کرنا شروع کیا۔ فوج میں بھرتیاں شروع ہوئیں۔ پیسہ اکٹھا کیا جانے لگا اور رانی جھانسی رجمنٹ نام کا عورتوں کا ایک فوجی دستہ بنایا گیا۔ 6 جولائی 1944 کو سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند ریڈیو پر بولتے ہوئے گاندھی جی کو مخاطب کیا۔ ''ہندوستان کی آزادی کی آخری جنگ شروع ہوگئی ہے۔ ہمارے بابائے قوم ہندوستان کی آزادی کی اس مقدس جنگ میں میں آپ کی دعاؤں اور نیک خواہشات کا طالب ہوں''۔[23] آزاد ہند فوج کی ایک بٹالین شاہ نواز کی کمان میں جاپان فوج کے ساتھ ہندوستان برما، سرحد پر امپھال مہم میں شرکت کے لیے بھیجی گئی، مگر وہاں ہندستانی فوجیوں کے ساتھ ایسا برا سلوک کیا گیا کہ ان کا حوصلہ پست ہوگیا۔ فوجیوں کو نہ صرف رسد اور ہتھیار سے محروم رکھا گیا بلکہ ان کو جاپانی فوجیوں کی خدمت کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ امپھال مہم ناکام ہوگئی اور جاپانی فوج پیچھے ہٹنے لگی۔ اس کے بعد تو ساری امیدوں پر ہی پانی پھر گیا کہ آزاد ہند فوج ہندوستان کو آزاد کرالے گی۔ 1944 کے وسط سے جاپانی فوج کا پیچھے ہٹنا شروع ہوگیا تھا اور یہ سلسلہ 1945 کے وسط تک چلتا رہا جو جاپان کے ذریعہ انگلینڈ کی اطاعت قبول کرنے پر ہی ختم ہوا۔ اس کے بعد آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کو جنگی قیدی کی حیثیت سے ہندوستان لایا گیا اور ان کے لیے سخت سزائیں تجویز کی جانے لگیں۔ پھر تو ان کی دفاع میں ایک اور تحریک چل پڑی۔[24]

باب ـ 36

دوسری جنگ عظیم کے بعد قومی لہر

دوسری جنگ عظیم سے ہندستانی سیاست میں ڈرامائی تبدیلی ظاہر ہوئی۔ تب سے 1947 تک سیاسی افق پر عوامی سرگرمی کا لمبا سلسلہ ابھر کر سامنے آیا۔ پورے ملک میں وقتاً فوقتاً ہوئی عوامی تحریکیں مثلاً تبھا گا تحریک، وارلس بغاوت (Warlis Revolution) پنجاب کسان مورچے، ٹراونکور میں پناپراویالر (Punnapra Vayalar) بغاوت پر ہم یہاں غور نہیں کریں گے۔ چونکہ یہ تحریکیں سیدھے برٹش حکومت کے خلاف نہیں تھیں بلکہ ان دیسی حکمرانوں اور زمینداروں کے خلاف ہوئی تھیں جنھوں نے اپنے نجی فائدے کے لیے ان کا استحصال کیا تھا، اس لیے ہم یہاں لوگوں کی حکومت مخالف اسی جدوجہد کا ذکر کریں گے جو سیدھے برٹش راج کے جائز ہونے کا چیلنج کر رہی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ہندوستانیوں نے راحت کی سانس لی۔ البتہ جنگ کی وجہ سے ملک کے کچھ طبقوں کو بے حد فائدہ پہنچا تھا، مثلاً صنعت کاروں کے منافع میں اچانک اضافہ ہوا تھا اور متوسط طبقہ کے لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع بھی پیدا ہو گئے تھے، لیکن جنگ سے جو عام تباہی ہوئی وہ کہیں زیادہ بھیانک تھی۔ جنگ کی تیاریوں میں صرف کی

گئی دولت سے حکومت کی مالی حالت لڑکھڑا سی گئی تھی۔ قحط، افراط زر، ضروری اشیا کی کمی، جمع خوری کالا بازاری وغیرہ سے لوگ بہت تنگ تھے۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران عوام نے بغیر کسی قیادت کے بڑی دلیری سے جدوجہد کیا تھا مگر اس جدوجہد کی مدت آٹھ ہفتوں سے زیادہ نہیں تھی۔ کچھ جگہوں پر جدوجہد کی مشعل تھوڑے روز تک ضرور جلتی رہی مگر برٹش حکومت کے جبر نے آخرکار اس کو بھی بجھا دیا۔

وسط جون 1945 میں جب کانگریس لیڈر جیلوں سے رہا ہوئے تو ان کا خیال تھا کہ جیل کے باہر ان کو ایسے لوگ نظر آئیں گے جو بری طرح پست ہمت ہو چکے ہوں گے، 1942 کے جبر وظلم نے ان کو بے حس و بے جان کر دیا ہوگا، کمر توڑ دی ہوگی، مگر اس کے برعکس وہ یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے کہ ان کے استقبال کے لیے لوگ پلکیں بچھائے کھڑے ہیں۔ ان کے دلوں میں نہ صرف برٹش مخالف جذبات ہی موجزن ہیں بلکہ وہ کچھ کر ڈالنے کے لیے بے چین و بیتاب ہیں۔ دراصل تین برسوں سے زیادہ مدت کے ظلم وستم کو سہتے ہوئے جواں مرد لوگوں کے حوصلے بڑھے تھے۔ ان میں پختگی اور مضبوطی آئی تھی۔ ان کی سیاسی قوت میں اضافہ ہوا تھا اور دور بیٹھے عام لوگوں کے جذبات میں بھی ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ لیڈروں کی رہائی سے وہ پرامید ہو گئے تھے کہ ان کی سیاسی ترقی کے ایام بہت قریب آ چکے ہیں۔ اپنے لیڈروں سے ملنے کے لیے لوگ اس قدر بیتاب تھے کہ جب ان کو پتہ چلا کہ جواہر لعل الموڑہ جیل سے رہا ہونے والے ہیں تو وہ بڑی کثیر تعداد میں جیل کے سامنے اکٹھا ہو گئے۔ اسی طرح مولانا آزاد کا استقبال کرنے کے لیے بانکرا (Bankura) جیل کے باہر پھاٹک پر کثیر مجمع انتظار میں کھڑا تھا۔ بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جب اجلاس ہوا، تو بارش کے باوجود اپنے لیڈروں کا خیر مقدم کرنے کے لیے پانچ لاکھ سے بھی زائد لوگ سڑک کے کنارے قطار میں کھڑے تھے۔ یہی حال وائسرائے کے ذریعہ بلائے گئے شملہ اجلاس کا تھا۔ دور دراز گاؤں کے لوگ وہاں آئے ہوئے تھے اور اپنے لیڈروں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پیڑ کی شاخوں پر بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔

جنگ کے بعد جب انگلینڈ میں لیبر پارٹی حکومت میں آئی تو اس نے ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے تیزی دکھائی۔ سب سے پہلے اس نے کانگریس پر لگی پابندی ہٹائی اور

الیکشن کرانے کا اعلان کیا۔لوگوں نے بڑی خوشی سے ان فیصلوں کا استقبال کیا۔ان کو اس بات سے بے حد خوشی تھی کہ اب عوام کے ذریعہ سرکار کی تشکیل ہوگی۔اس لیے الیکشن کے جلسوں میں اوسط پچاس ہزار تک لوگ جمع ہونے لگے۔جن جلسوں میں کسی بڑے لیڈر کی آمد متوقع ہوتی تو یہ تعداد ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ ہوجاتی۔نہرو جو 1937 کے الیکشنوں میں بے حد سرگرم تھے انھوں نے تسلیم کیا کہ انھوں نے اس سے پہلے کبھی بھی لوگوں میں اتنا جوش وخروش نہیں دیکھا تھا۔ ان انتخابی حلقوں کو چھوڑ کر جہاں نیشنلسٹ مسلمان الیکشن لڑ رہے تھے، نمائندوں کو نہ تو ووٹ مانگنے کی ضرورت پڑی تھی اور نہ پیسہ خرچ کرنے کی۔دراصل الیکشن کے نتیجوں نے یہ ظاہر کردیا تھا کہ لوگوں نے نہ صرف الیکشن جلسوں میں جمع ہوکر اپنا جوش دکھایا تھا بلکہ وہ ووٹ دینے میں بھی کانگریس کے ساتھ تھے۔اسی لیے کانگریس نے صوبوں کے عام انتخابی حلقوں میں 90 فیصد کامیابی حاصل کی تھی (ان میں 36 لیبر سیٹوں میں 23 جیتی ہوئی سیٹیں شامل تھیں) مسلم انتخابی حلقوں میں مسلم لیگ کی بھی یہی حالت تھی۔الیکشن مہموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ووٹ بٹورنا نہیں بلکہ عوام کو حکومت کے خلاف کھڑا کرنا خاص مقصد تھا۔چناؤ پرچار میں دو باتوں پر خصوصی چرچہ ہوتی تھی۔1942 میں حکومت کے ذریعہ کیا گیا ظلم وستم اور آزاد ہند فوج کے جنگی قیدیوں کے خلاف عدالتوں میں دائر مقدمے۔

1942 کے دوران سرکاری افسروں کے ذریعہ کی گئی زیادتی کا معاملہ کانگریس نے اٹھا رکھا تھا۔ایک طرف شہیدوں کی عظمت کے چرچے تھے تو دوسری طرف سرکاری افسروں کی بدعنوانیوں کی مذمت۔کانگریس ان لوگوں کی بڑی معترف تھی جنھوں نے بغیر کسی لیڈر کی رہنمائی کے برٹش حکومت کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔شہیدوں کی یادگار میں مجسمے نصب کیے گئے۔جن لوگوں کا مالی نقصان ہوا تھا ان کی راحت کے لیے پیسہ اکٹھا کیا گیا۔لوگوں پر ڈھائے گئے ظلم کی کہانی تفصیل سے سنائی جاتی تھی۔اور اکثر ان افسروں کا نام لے کر ان کی لعنت ملامت کی جاتی تھی جنھوں نے ستم ڈھائے تھے۔ان کے خلاف جانچ کرانے کا عہد لیا جاتا تھا اور سزا دینے کی بے روک ٹوک دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ان سب کا افسروں کے حوصلہ پر بہت برا اثر پڑتا تھا۔ان کے خلاف جانچ کرانے کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ہونے والے الیکشن میں کانگریس ان صوبوں میں

حکومت میں آنے والی تھی جہاں خاص طور سے وحشیانہ مظالم ہوئے تھے۔ 19 فروری 1946 کو یو پی کے گورنر وائی لی (Wylie) نے تسلیم کیا کہ ''1942 میں افسروں نے کبھی کبھی (ظلم کے) ایسے طریقے اپنائے تھے جن کو میں معاف نہیں کر سکتا اور 1946 کی غیر جانبدار نظر سے دیکھیں تو ان کی دفاع میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا'' 1 وائسرائے بھی اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ کانگریس کے ساتھ ہوا شرافت کا سمجھوتہ ہی معاملہ کو حل کر سکتا تھا۔

بہر حال جو معاملہ بری طرح لوگوں کے ذہنوں کو پریشان کیے تھا وہ سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ تھا جو شرقی ایشیا کی جنگ میں انگریزوں کے ذریعہ گرفتار کیے گئے تھے۔ ان کے خلاف اگست 1945 کے آخر تک حکومت بڑی سختی سے مقدمہ چلانے جا رہی تھی۔ ایسی کارروائی کیے جانے کے پہلے نہرو نے 16 اگست 1945 کو سری نگر کی میٹنگ میں آواز اٹھائی تھی کہ ان قیدیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور ان ''گمراہ کن وطن پرستوں'' کے ساتھ فراخدلی دکھائی جائے۔ نہرو نے یہ بھی اپیل کی کہ چونکہ برٹش حکومت نے ہندوستان میں بڑی اہم تبدیلیوں کے لانے کا وعدہ کیا ہے اس لیے ان سپوتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے۔ کانگریس کے دوسرے لیڈروں نے جنگ کے بعد 21 سے 23 ستمبر 1945 تک بمبئی میں منعقد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ان کے معاملہ کو بڑے زوردار انداز میں اٹھایا اور ان کی حمایت میں ایک قرارداد پاس کیا۔ جب لال قلعہ میں آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کے خلاف تاریخی مقدمہ شروع ہوا تو بھولا بھائی ڈیسائی، نہرو اور آصف علی اور دوسرے کانگریسی لیڈران کی دفاع میں عدالت میں حاضر ہوئے۔ کانگریس نے آئی۔ این اے۔ راحت اور جانچ کمیٹی بنائی جو بری کیے گئے سپاہیوں کو کچھ پیسہ اور کھانا فراہم کرتی تھی۔ اس نے کچھ لوگوں کو روزگار بھی دینے کی کوشش کی حالانکہ اس میں اس کو زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ کانگریس نے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے سینٹرل۔ آئی۔ این۔ اے فنڈ کمیٹی، بمبئی میں میئرس فنڈ (The Mayor's Fund) اے آئی۔ سی۔ سی (AICC)، پی۔ سی سی (PCC) آفیسوں اور سرت بوس (Sarat Bose) کو اختیارات دیے تھے۔ پورے ملک میں ہوئے کانگریس کے جلسوں میں آئی۔ این۔ اے کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی جاتی تھی کہ دونوں کے جلسوں میں امتیاز

کرنا اکثر بہت مشکل ہوتا تھا۔ آئی۔ این۔ اے کی موافقت میں نہرو نے شروع میں جو کام کیے اور کانگریس نے بعد میں مختلف طریقوں سے اس کے کاز میں جو دلچسپی لی، ان سب کو مدنظر رکھ کر اکثر یہ الزام لگایا گیا کہ کانگریس نے الیکشن میں فائدہ اٹھانے کی غرض سے یہ حربہ استعمال کیا تھا۔ ایسا الزام بہرحال بے بنیاد ہے[2]

آئی۔ این۔ اے شورش کئی معنوں میں دور حاضر کی تاریخ کا اہم واقعہ تھا۔ پہلی بات یہ کہ جس جوش و خروش اور تند و تیز طریقے سے آزاد ہند فوج کے قیدیوں کی رہائی کے لیے کوششیں کی گئیں ان کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ ان کے بارے میں اخباروں میں اپیلیں شائع کی گئیں اور پبلک پلیٹ فارم سے ان کی رہائی کے لیے دھمکیاں دی گئیں۔

شروع میں تو ''گمراہ لوگوں'' (Misguidedmen) کے اوپر رحم کرنے کے لیے پریس کے ذریعہ 8 مئی تک اپیلیں ہوتی رہیں۔ مگر جب لال قلعہ پر ان کے خلاف مقدمہ کی سماعت ہونے لگی تو روزانہ ان کے بارے میں اڈیٹوریل (Editorial) نکلنے لگا کہ وہ ہمارے سب سے بہادر محب وطن ہیں اور یہ کہ ان کے خلاف حکومت کی عدالتی کارروائی سراسر غلط اور ناجائز ہے۔ اخباروں میں ان کے اوپر چلائے جارہے مقدموں کی خبریں موٹی موٹی سرخیوں میں پہلے صفحہ پر چھپتی تھیں اور بین الاقوامی خبروں کو ثانوی اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کی مدح میں بہت سارے پمفلٹ ملک بھر میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تھا ''غدار نہیں، محب وطن'' (Patriot, Not Traitors) اجمیر میں عمارتوں کی دیواروں پر ''جے ہند'' اور ''ہندوستان چھوڑ دو'' فقرے لکھے گئے تھے۔ دہلی میں ہر جگہ دھمکی بھرے پوسٹر چپکائے گئے تھے کہ اگر آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کو سزا ملی، تو ہر ایک کے عوض بیس انگریز کتے (20 English Dogs) قتل کر دیے جائیں گے۔ بنارس کے ایک عام جلسہ میں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کو بری نہیں کیا گیا تو اس کا بدلہ انگریز بچوں کو مار کر لیا جائے گا[3] اکتوبر 1945 کے پہلے دو ہفتوں میں سینٹرل صوبوں اور برار میں 160 سیاسی میٹنگیں ہوئیں۔ وہاں ایک آواز سے فوجیوں پر رحم کرنے کی بات کہی گئی۔ 12 نومبر کو آئی۔ این۔ اے یوم اور 5 سے 11 نومبر تک آئی۔ این۔ اے۔ ہفتہ منایا گیا۔ پچاس ہزار لوگ اس سلسلہ میں بڑے بڑے جلسے کرنے کے

لیے نکل پڑے۔ سب سے بڑا جلسہ راحت کمیٹی کے زیر انتظام ہوا تھا جس میں عام اندازہ کے مطابق دو سے تین لاکھ اور نہرو کے اندازہ میں پانچ سے سات لاکھ لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ اس جلسہ کو سرت بوس، نہرو اور پٹیل نے خطاب کیا تھا۔

آئی۔ این۔ اے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ سماجی اور جغرافیائی اعتبار سے اس کا دائرہ بڑا وسیع ہو گیا تھا۔ اس میں سماج کے مختلف طبقوں اور سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا تھا۔ سبھی کو اس سے دلی لگاؤ تھا۔ خفیہ شعبہ کے ڈائرکٹر نے بھی تسلیم کیا تھا کہ ''شاید ہی کوئی ایسا معاملہ رہا ہو جس میں ہندستانیوں نے اتنی دلچسپی لی ہو اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس کو اتنی ہمدردی ملی ہو4 دور دراز گاؤں کے بھی رنگ ونسل، مذہب وملت کے لوگ اس سے بے پناہ ہمدردی رکھتے تھے اور اس کے بارے میں فکر مند تھے۔ نہرو نے بھی اس کی تصدیق کی تھی کہ ''آزاد ہند فوج کے بارے میں ملک کے مختلف طبقوں نے جس طرح اپنے جذبات اور دردمند احساسات کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی''۔5 دہلی، پنجاب، بنگال، یوپی، بمبئی اور مدراس تحریک کے خاص مراکز تھے۔ اس سے بھی زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کُرگ (Coorg) بلوچستان، اجمیر، آسام کے دور دراز علاقوں تک آزاد ہند فوج کی ہمدردی میں حکومت مخالف تحریک پھیل گئی تھی۔

اس میں لوگوں کا اشتراک کئی طرح سے ہوا تھا۔ کچھ نے پیسے دیے تھے، کچھ نے میٹنگیں کی تھیں، دکانداروں نے دکانیں بند کردی تھیں اور سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں نے قیدیوں کی رہائی کے لیے زوردار آواز اٹھائی تھی۔ میونسپل کمیٹیوں، گوردوارہ کمیٹیوں اور بدلیش میں رہ رہے ہندوستانیوں نے بڑی فراخدلی سے آزاد ہند فوج کو مالی تعاون دیا تھا۔ شرمتی گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرت سر نے سات ہزار روپوں کا عطیہ دیا تھا اور دس ہزار روپے راحت کام کے لیے الگ سے رکھ رکھا تھا۔ پونا سٹی میونسپلٹی، ذ کانپور سٹی فنڈ اور مدراس پریسیڈنسی کے ہر ایک ڈسٹرک بورڈ نے ایک ایک ہزار روپیوں کا عطیہ پیش کیا تھا۔ سب سے زیادہ قابل ذکر مالی امداد بمبئی اور کلکتہ کے فلمی اداکاروں، کیمبرج مجلس (Cambridge Majlis) اور امراؤتی کے تانگا والوں کے ذریعہ کی گئی تھی۔ اس تحریک میں طلبا کا تعاون غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ کلاسوں کا بائیکاٹ کر کے جلسے جلوسوں کا انتظام کرنے میں شمال میں راولپنڈی اور جنوب میں سلیم

(Salem) تک بے حد سرگرم تھے۔ تجارتی ادارے، اور بازار مقدموں کی سماعت کے روز یعنی 5 نومبر 1945 کو آئی۔ این۔ اے یوم پر اور آئی۔ این۔ اے ہفتہ کے دوران بند رہے۔ قیدیوں کی رہائی کے مطالبے دھمن گاؤں (Dhamangaon) اور شولا پور کی کسان کانفرنسوں کے ذریعہ 16 نومبر 1945 کو اور حیدرآباد میں آل انڈیا ویمنس کانفرنس (All India Women's Conference) کے دسویں اجلاس میں 29 دسمبر 1945 کو اٹھائے گئے۔ پوربی کمان (Eastern Command) کے جنرل ٹوکر (Tuker) کے مطابق انگریز دانشور جو یہاں ایک یا دو سالوں کے لیے آئے تھے آزاد ہند فوج کی خوبیوں اور خرابیوں کے بارے میں خاصی دلچسپی لے رہے تھے[6] پنجاب کے کچھ علاقوں میں آزاد ہند فوج کی ہمدردی میں دیوالی نہیں منائی گئی۔ کلکتہ کے گوردوارے آزاد ہند فوج کی سرگرمیوں کے خاص مراکز تھے۔ مسلم لیگ، سی۔ پی۔ آئی۔ کمیونسٹ پارٹی، اکالی، جسٹس پارٹی راولپنڈی کی احرار پارٹی، آر۔ ایس۔ ایس۔، ہندو مہاسبھا اور سکھ لیگ نے مختلف حد و معیار میں آزاد ہند فوج کی حمایت کی تھی۔ وائسرائے نے لکھا تھا کہ ''سبھی پارٹیوں نے کانگریس کا ہی راستہ اختیار کیا ہے، البتہ کانگریس دوسروں سے زیادہ شور مچاتی ہے''[7]

آزاد ہند فوج کی وسیع گرفت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن طبقوں کو اب تک برٹش راج کا روایتی مددگار مانا جاتا تھا مثلاً سرکاری عملہ اور مسلح فوجی وہ بھی ہمدردوں میں شامل تھے۔ تحریک کے اس پہلو سے انگریز افسروں کو خاص طور سے بڑی فکر اور پریشانی تھی۔ شمال مغرب سرحدی صوبہ کے گورنر کننگھم نے وائسرائے کو آگاہ کیا کہ ''برٹش مخالف گروہ میں شامل ہونے والے اچھے بھلے لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے''[8] خفیہ بیورو کے ڈائرکٹر نے بھی سرکار کو خبردار کیا تھا کہ ''آزاد ہند فوج کے لیے ہمدردی صرف انھیں لوگوں تک محدود نہیں جو عام طور سے سرکار کے خلاف ہیں'' بلکہ وہ یہ بھی مانتا تھا کہ ''آزاد ہند فوج کے لوگ عام طور سے انھیں خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو پشتوں سے سرکار کے تئیں وفادار رہے ہیں''[9] فروری 1946 تک آزاد ہند فوج کے جو لوگ رہا ہوئے تھے ان میں 48.7 فیصد لوگ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ جب یہ لوگ اپنے گھر پر پہنچے تو ان لوگوں نے گاؤں والوں کو متحرک کیا جواب

تک سیاسی اعتبار سے بے حس تھے۔ ان علاقوں کے لوگوں کی دلچسپیوں کو آزاد ہندفوج کے ان افسروں نے مزید بڑھایا تھا جو ہیں کے بااثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سہگل ان تین افسروں میں سے تھے جن پر لال قلعہ پر پہلا مقدمہ چلا تھا۔ وہ پنجاب ہائی کورٹ کے سابق جج دیوان اچھرو رام (Achhru Ram) کے بیٹے تھے۔ برٹش کے ذریعہ خطابات سے نوازے گئے 4۔ شرفا نے جنگی قیدیوں کی تعریف تو نہیں کی تھی مگر حکومت سے یہ اپیل ضرور کی تھی کہ ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے ان پر چل رہے مقدمے اٹھا لیے جائیں۔ عام طور سے سرکاری افسران ان سے ہمدردی رکھتے تھے اور اس کی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ سینٹرل صوبوں اور برار کے ریلوے افسروں نے ان کے لیے پیسے بھی اکٹھا کیے تھے۔

فوج کے افسروں کی غیر متوقع حمایت بھی اہمیت رکھتی تھی جبکہ برٹش افسروں کی نظر میں حکومت کے وفادار فوجی آزاد ہندفوج کے سخت مخالف تھے مگر ایسا نہیں تھا۔ رائل انڈین ایرفورس (RIAF) کے لوگ کوہاٹ میں شاہ نواز کی تقریر سننے کے لیے جاتے تھے۔ یو پی اور پنجاب کے فوجیوں کو آزاد ہندفوج کی حمایت میں ہونے والے جلسوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ان میں بہت سے فوجی وردی میں بھی ہوتے تھے۔ کلکتہ، کوہاٹ، الہ آباد، بمرولی (Bamrauli) اور کانپور کی ایرفورس کی اکائیوں نے آزاد ہندفوج کی دفاع میں مالی امداد بھیجی تھی۔ کمانڈر۔ ان۔ چیف کے مطابق پورے ملک میں آزاد ہندفوج کے لیے عام طور سے لوگوں کے دلوں میں زبردست ہمدردی تو تھی ہی، ہندستانی فوج میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ تھا۔ اس لیے کمانڈر۔ ان۔ چیف نے بھی نتیجہ اخذ کیا کہ چونکہ ہندستانی آرمی میں آزاد ہندفوج کے لیے پوری ہمدردی ہے، اس لیے اس نے لندن وائٹ ہال (White Hall) سے یہ سفارش کی کہ ''اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے''10۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ آزاد ہندفوج کے سپاہیوں کے کاموں کی اچھائی اور برائی پر بحث کبھی نہیں ہوئی۔ اگر سوال اٹھتا بھی تو یہ کہ کیا انگلینڈ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہندستانی معاملہ میں کوئی فیصلہ لے۔ نہرو نے اس بات پر زور دیا کہ اگر انگلینڈ اپنے اس اعلان پر سنجیدہ ہے کہ ہند انگلش تعلقات میں تبدیلی لائی جائے تو وہ آزاد ہندفوج کے مسئلہ کو حل کرنے کی ذمے داری

ہندوستانیوں کو دے کر اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے۔ حریت پسند ہندوستانیوں تک نے ہند انگلش تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لیے اس سلسلہ میں اپیلیں کی تھیں۔ انگریزوں نے آزاد ہند فوج کے مسئلہ کی سیاسی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کیا۔ اسی لیے شمال مغرب سرحدی صوبہ کے گورنر نے پرزور وکالت کی کہ آزاد ہند فوج کے مقدمہ کی سماعت ترک کردی جائے کیونکہ یہ معاملہ روز بروز ہندوستان بنام انگلینڈ کی شکل لیتا جارہا ہے۔

مسلسل بڑھتے ہوئے قومی جذبات نے آزاد ہند فوج کے مقدموں کی سماعت کے دوران حکومت کے خلاف 1945 میں متشدد شکل اختیار کرلیا تھا۔ ان دنوں آزاد ہند فوج کے مقدموں کے سلسلہ میں تین واقعات ہوئے۔ پہلا 21 نومبر 1945 کو کلکتہ میں، دوسرا پھر کلکتہ میں 11 فروری 1946 کو آزاد ہند فوج کے ایک افسر راشد علی کو دی گئی سات سال کی سزا کے احتجاج میں اور تیسرا بمبئی میں رائل انڈین نیوی (RIN) کے غیر کمیشن فوجیوں کی ہڑتال کرنے پر ہوا۔ ان تینوں واقعات کی شکل ایک جیسی تھی۔ پہلے دور میں طالب علموں یا ملاحوں کے کسی طبقہ کے ذریعہ افسروں کی حکم عدولی کرنا پھر ان پر جبر کیا جانا اور دوسرے مرحلہ میں پورے شہر کے لوگوں کا ان کے مطالبات میں شامل ہوجانا اور تیسرے مرحلہ میں ملک کے دوسرے حصوں میں لوگوں کے ذریعہ ان کے لیے ہمدردی اور اتحاد کا اظہار۔

پہلے دور کی شروعات طلبا اور ملاحوں (Ratings) کے ذریعہ حکومت کو دیے گئے چیلنج سے ہوئی اور اس کا خاتمہ جبریہ روک تھام سے ہوا۔ 21 نومبر 1945 کو طلبا کا ایک جلوس جن میں فارورڈ بلاک کے ہمدردان، اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور اسلامیہ کالج کے طلبا شامل تھے، کلکتہ میں ڈلہوزی چوک کی طرف نکلا۔ یہ چوک برٹش اقتدار کا خاص مرکز تھا۔ پولیس نے اس کو روکنے کی کوشش کی مگر مظاہرین منتشر نہیں ہوئے۔ تب پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کیا۔ جواب میں مظاہرین نے ان پر اینٹ پتھر پھینکے۔ پولیس نے اس کا بدلہ گولیاں برسا کرلیا۔ اس میں دو طالب علم جاں بحق ہوئے اور 52 افراد بری طرح زخمی ہوگئے 11 نومبر 1946 کو مسلم لیگ، کانگریس اور کیمونسٹ کی طلبا تنظیموں نے جلوس کا نظم کیا۔ دھرتم ٹولہ (Dharama Tola) اسٹریٹ پر کچھ گرفتاریاں کی گئیں۔ اس پر طلبا بھڑک اٹھے اور انھوں نے ڈلہوزی چوک علاقہ میں

نافذ دفعہ 144 توڑ ڈالا۔ اس کے نتیجہ میں پولیس نے کچھ گرفتاریاں کیں اور لاٹھی چارج بھی کیا۔

رائل انڈین نیوی (RIN) بغاوت کی شروعات 18 فروری 1946 کو ہوئی جب بمبئی میں ایچ۔ ایم۔ آئی۔ ایس۔ تلوار (H.M.I.S. TALWAR) کے ایک ہزار ایک سو (1100) ملاحوں نے (Naval Ratings) نے ہڑتال کر دیا۔ یہ احتجاج نسلی امتیاز کے تحت ان کے ساتھ کیے جا رہے برے سلوک، دیے جا رہے خراب کھانوں اور کی جا رہی بے عزتی کے خلاف تھا۔ وہ اس لیے بھی ناراض تھے کہ بی۔ سی۔ دت نام کے ایک ملاح کو ایچ۔ ایم۔ آئی۔ ایس تلوار پر ''ہندوستان چھوڑ دو'' نعرہ لکھنے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ دوسرے دن کیسل (Castle) اور فورٹ بیرکس (Fort Barracks) ملاح بھی اس ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ جب ان ملاحوں کو خبر ملی (حالانکہ غلط تھی) کہ تلوار کے ملاحوں پر گولیاں برسائی گئی ہیں تو وہ اپنی جگہ چھوڑ کر نکل پڑے اور کانگریسی جھنڈوں سے سجی لاریوں پر بیٹھ کر بمبئی میں گشت کرنے لگے۔ راستے میں یورپ اور پولیس والوں کو دھمکیاں دیں اور کچھ دکانوں کی ایک آدھ کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔

بغاوت کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب شہر کے بھی لوگ باغیوں کے ساتھ ہو گئے اور ملک کے دوسرے شہروں کلکتہ اور بمبئی میں عام زندگی مفلوج کر دی گئی۔ شروع میں باغیوں کی ہمدردی میں میٹنگیں کی گئیں، جلوس نکالے گئے، ہڑتالوں کا نظم ہوا اور راستوں پر روک لگائے گئے، گلیوں میں اور گھروں کی چھتوں پر سے گھمسان ہوئی، یورپ والوں پر حملے ہوئے، تھانے، ڈاکخانے، دکانیں، ٹرام ڈپو، ریلوے اسٹیشن، بینک، غلہ دکانیں اور یہاں تک کہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے (YMCA) سینٹر پر آگ لگا دی گئی۔ تینوں ہی واقعات میں بھی سب کیا گیا۔ رائل انڈین نیوی (RIN) کی بغاوت اور عوام کے غم و غصہ میں صرف بمبئی میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 30 دکانیں 10 پوسٹ آفس، 10 پولیس چوکیاں، 64 غلہ دکانیں اور 200 اسٹریٹ لیمپ برباد کر دیے گئے۔ شہر کی عام زندگی درہم برہم ہو گئی۔ کمیونسٹ پارٹی کی ایک آواز پر لاکھوں فیکٹری مزدور سڑکوں پر نکل آئے۔ دکانداروں، تاجروں، ہوٹل مالکوں، طالب علموں، مزدوروں اور پبلک ٹرانسپورٹ ملازمین کی ہڑتال سے

شہر کی عام زندگی ٹھہر سی گئی۔ ریل لائنوں پر دھرنا دے کر ٹرینوں کا آمد و رفت روکا گیا۔ پولیس اور فوجی گاڑیوں کو نذر آتش کیا گیا اور راستوں پر روک لگائی گئی۔

تیسرے دور کی بغاوت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگوں نے ملک کے دوسرے حصوں میں زبردست اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ طلبا نے اسکولوں کو خیر باد کہہ دیا۔ عوام نے ان کی اور ملاحوں کی ہمدردی میں ہڑتالیں کیں، جلوس نکالے گئے اور افسروں کے ذریعہ کیے گئے جبر وظلم کی مذمت کی گئی۔ اس سلسلہ میں بمبئی کے بعد کراچی کا دوسرا نمبر تھا۔ بمبئی کے ملاحوں کی بغاوت کی خبر اگلے ہی روز یعنی 19 رفروری کو کراچی پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد ایچ۔ ایم۔ آئی۔ ایس ہندوستان (H.M.I.S. HINDUSTAN) اور دوسرے جہاز کے ملاحوں اور ساحل پر قائم تین دوسرے نیوی اداروں کے ملازمین نے ہڑتال کردی۔ مدراس، وشاکھا پٹنم، کلکتہ، دہلی، کوچین، جام نگر، انڈمن، بحرین، اور عدن میں بھی علامتی ہڑتالیں ہوئیں۔ ان میں 78 جہازوں اور 20 ساحلی اداروں کے بیس ہزار لوگ شامل تھے۔ رائل انڈین ایئر فورس (Royal Indian Air Force) کے میرین ڈرائیو (Marine Drive) بمبئی اور پونا کے اندھیری اور سون (SION) کلکتہ، جیسور (Jessore) اور امبالا اکائیوں کے جوانوں نے ہمدردی میں ہڑتالیں کیں۔ جبل پور کے سپاہی ہڑتال پر چلے گئے اور کولابا (Colaba) فوجی چھاؤنی میں بے چینی کا خوفناک منظر تھا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان واقعات کی کیا اہمیت تھی؟ اس بات میں شک نہیں کہ ان تینوں واقعات نے لوگوں کی مجاہدانہ دلیری اور جنگجو اسپرٹ اچھی طرح واضح کر دیا تھا۔ یوں جو بھی کارروائی کی گئی وہ سوچ سمجھ کر نہیں ہوئی مگر یہ حقیقت بھی ظاہر ہوئی کہ عوام بے حد نڈر اور بے خوف تھی۔ لوگ پولیس کی گولیوں سے بچنے کے لیے جس طرح پیچھے ہٹ جاتے لیکن پھر اپنی جگہ آڈٹتے اس کی تعریف بنگال کے گورنر کو بھی مجبوراً کرنی پڑی۔ رائل انڈین نیوی (RIN) کی بغاوت آج بھی ایک روایت بنی ہوئی ہے۔ اس نے لوگوں پر بیداری کے ڈرامائی اثرات مرتب کیے تھے۔ اگر چہ حکومت نے اس بغاوت کو جلد ہی کچل دیا تھا مگر اس سے لوگوں کے حوصلہ میں اضافہ ہوا اور وہ کہیں زیادہ بے خوف ہو گئے۔ آر۔ آئی۔ این (RIN) بغاوت برٹش حکومت کے

خاتمہ کی نشان دہی کرتی ہے جس کی تکمیل 1947 کے یوم آزادی کے دن ہوئی۔ حقیقت کی دنیا میں واقعات لوگوں کی سوچ سے اکثر مختلف ثابت ہوئے ہیں۔ یہی سچائی 46-1945 کے ڈرامائی واقعات کے سلسلہ میں صادق آتی ہے۔ اس وقت اور بعد کے مورخین کی نظر میں وہ تاریخی واقعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔12 لوگوں نے غیر معمولی جرأت، بہادری، اور دلیری کا ثبوت دیا تھا۔ اس وقت ایسا معلوم پڑتا تھا کہ ہندوستان زبردست انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ان واقعات کے دوران جو فرقہ وارانہ اتحاد قائم ہوا تھا اگر اس کو اور مضبوط کیا گیا ہوتا تو ملک کے بٹوارے کو روکا جا سکتا تھا۔

بغاوت کے ان واقعات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ان میں حکومت سے سیدھے تیز دتند اور متشدد تصادم ہوئے تھے۔ ان میں کچھ کمیاں بھی تھیں۔ سماج کے جنگجو طبقہ نے ہی ان میں اشتراک کیا تھا۔ رجعت اور ترقی پسند طبقوں کے وہ لوگ ان سے دور رہے جو آزاد ہند فوج کی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں کے وہ لوگ جو پچھلی دہائیوں میں تحریک کی سرمایہ قوت تھے ان سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس کے علاوہ ان بغاوتوں کی مدت بھی بہت تھوڑی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ عوام کا غصہ تیزی سے بھڑکتا اور جلد ہی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی کافی دلچسپ ہے کہ کلکتہ میں 11 سے 13 فروری 1946 تک بڑا جوش و خروش دکھایا گیا مگر ایک ہی ہفتہ بعد آر۔ آئی۔ این (RIN) کی بغاوت کے دوران نسبتاً وہاں خاموشی رہی۔ ایک لاکھ مزدور ایک یوم کی ہڑتال پر چلے گئے اور ملاحوں نے سات روز تک ہڑتال کی اور فوج کے محاصرہ کے بعد ہی ان کی ہڑتال ختم ہوئی، مگر باقی شہر تقریباً غیر متاثر رہا۔ ان بغاوتوں میں لوگوں کی سرگرمی صرف کچھ شہری علاقوں تک محدود تھی۔ اسی وجہ سے افسروں کو وہاں فوج کا اتارنا اور بغاوت کو فرد کرنا آسان ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس آزاد ہند فوج کے تحت چلنے والی تحریک دور دراز گاؤں تک پھیل گئی تھی۔

ان بغاوتوں کے دوران جو فرقہ وارانہ اتحاد دکھائی پڑا اس میں بھی کچھ خامیاں تھیں۔ ان میں تنظیمی اتحاد زیادہ اور عوامی اتحاد کم تھا۔ کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹیوں کی طلبا تنظیمیں صرف راشد علی کے مقدمہ کے سلسلہ میں متحد ہوئی تھیں اور یہ مقدمہ بھی بہت تھوڑی مدت

تک ہی چلا تھا۔ وہی کلکتہ جہاں فروری 1946 میں گوتم چٹوپادھیا13 کے مطابق زبردست انقلابی ماحول بنا ہوا تھا وہیں چھ ماہ بعد 16 راگست 1946 کوفرقہ وارانہ پاگل پن کا ننگا ناچ ہو رہا تھا۔ ملاحوں کی بغاوت کے دوران جو فرقہ وارانہ اتحاد دکھائی پڑا وہ بھی محدود تھا۔ اگرچہ کانگریس، لیگ اور کمیونسٹ پارٹیوں کے جھنڈے جہازوں کے مستول پر لہرائے گئے تھے، لیکن مسلم ملاح مستقبل کی کارروائی کے بارے میں مشورہ لینے کے لیے لیگ کے لیڈروں کے پاس جایا کرتے تھے جب کہ بقیہ دوسرے لوگ کانگریس اور سوشلسٹ لیڈروں سے صلاح مشورہ کرتے تھے۔ جناح نے بھی صرف مسلم ملاحوں کو سپر ڈالنے کے لیے کہا تھا اور سب نے ان کی صلاح پر عمل بھی کیا[14] یہ سوچ بھی بے بنیاد ہے اور تاریخ کی ٹھوس شواہد پر مبنی نہیں ہے کہ 1945-46 کی جدوجہد کے دوران پیدا ہوئے فرقہ وارانہ اتحاد کو اگر مزید مستحکم اور مضبوط کیا گیا ہوتا، تو ہندوستان کے بٹوارے کو ٹالا جا سکتا تھا۔ بہرحال بیریکیڈوں (Barricades) پر دکھائی پڑنے والے اتحاد کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔

کلونیل حکام کے ذریعہ ان بغاوتوں خصوصاً آر۔ آئی۔ این (RIN) بغاوتوں کو کس طرح فرو کیا گیا اس کے بارے میں عام رائے حقیقت سے مختلف ہے۔ یہ مانا جاتا تھا کہ آر۔ آئی۔ این کی بغاوتوں سے برٹش سلطنت کی بنیادیں ہل گئی تھیں، مگر ایسا نہیں تھا۔ ہاں، یہ بات سچ ہے کہ ان بغاوتوں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ اگرچہ برٹش نوکرشاہی کا اخلاقی معیار گر چکا تھا اور اس کی ڈسپلن میں بڑی گراوٹ آگئی تھی پھر بھی بغاوتوں کو کچلنے کے لیے اس کی فوجی قوت اس وقت تک پوری طرح برقرار تھی اور اس کے پاس سارے وسائل موجود تھے۔ فوجی وائسرائے واویل نے آر۔ آئی۔ این کی ہڑتال کے تھوڑے روز بعد فوج کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کل ملا کر فوج نے قابل تعریف استقلال کا ثبوت دیا ہے"[15] لوگوں کا یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ اگر عوام کی طاقت کا استعمال اچھی طرح کیا گیا ہوتا تو حکومت کو جھکنا پڑتا۔ فوج اور عوام کی مخالفت پر حکومت نے آزاد ہند فوج کے جنگی قیدیوں کے مقدموں پر نظرثانی کی تھی۔ یہ الگ معاملہ تھا مگر سیدھے حاکمیت اور نظم و نسق کے خلاف چیلنجوں کا مقابلہ کرنا بالکل دوسری بات تھی۔ حکومت کی منشا ایسے معاملوں میں بالکل صاف تھی۔ اس کا تو اس طرح کے چیلنجوں کو کچلنا ہی مقصود تھا۔

نومبر 1945 کی بغاوت کے دوران فوج مدد کے لیے مستعد کھڑی تھی مگر بنگال کے گورنر نے پولیس فورس کے استعمال کو ترجیح دی اور اس کے ذریعہ حالات پر قابو پالیا۔ بہر حال کلکتہ 12 فروری 1946 کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ فوج کی گولہ باری میں 36 شہری جان بحق ہوئے۔ اسی طرح کراچی میں ہوئی بغاوت کے دوران ملاحوں کو فوج کے ذریعہ سپر ڈالنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کشمکش میں 6 ملاح مارے گئے۔ عام طور سے لوگوں کا گمان تھا کہ بمبئی کی ہندستانی فوجوں نے اپنے ہم وطنوں پر بندوق چلانے سے انکار کر دیا تھا مگر اس کے برعکس بمبئی فوج کی مراٹھا انگڑی نے ہی ملاحوں کو گھیر کر بیرکوں میں ٹھونسا تھا۔ بمبئی میں فوجوں نے نہ صرف ملاحوں کو بلکہ عوام میں ان لوگوں کو ظلم کا نشانہ بنایا تھا جنھوں نے اس سے پہلے ملاحوں کی ہمدردی میں غلہ فراہم کیا تھا اور ان سے مل کر بمبئی کی عام زندگی کو مفلوج کر دیا تھا۔ برٹش وزیر اعظم ایٹلی (Attlee) نے ہاؤس آف کامنس (House of Commons) میں اعلان کیا کہ" شاہی جہازی بیڑے بمبئی کی طرف رواں دواں ہیں" اور ایڈمرل (Admiral) گاڈفرے (Godfrey) نے شہریوں کو سخت الٹی میٹم دینے کے بعد باغی جہازوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور ان پر بم برسانے والے جہاز اڑائے" امرت بازار پترکا" (Amrit Bazaar Patrika) نے اپنی رپورٹ میں ان تیاریوں کو بمبئی کے چاروں طرف ڈالا گیا اسپاتی محاصرہ (Steel ring) بتایا۔ اس پوری فوجی کارروائی میں 228 شہری مارے گئے اور 1046 زخمی ہوئے۔

آر۔ پی۔ دت کے مطابق آر۔ آئی۔ این (RIN) کی بغاوت کے نتیجہ میں ہی کیبنٹ مشن (Cabinet Mission) ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ انھوں نے کئی سال پہلے یہ بات کہی تھی کہ" 18 فروری کو بمبئی بحری فوج نے ہڑتال شروع کی اور 19 فروری کو ایٹلی نے ہاؤس آف کامنس میں کیبنٹ مشن بھیجنے کا اعلان کیا" 16 یہ بات دلائل پر مبنی نہیں ہے کیونکہ کیبنٹ مشن بھیجنے کا فیصلہ 22 جنوری کو لیا جا چکا تھا اور 19 فروری کے اعلان کا فیصلہ بھی ایک ہفتہ پہلے ہو چکا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کے مطابق عوام کی مجاہدانہ شورش کی وجہ سے برٹش حکومت سیاسی اقتدار منتقل کر دینے کے لیے راضی ہوئی تھی۔ 46-1945 کے موسم سرما میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان کے نتیجہ میں ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ سالوں پہلے حکومت کرنے کا برٹش

جواز مکمل طور سے خارج کیا جا چکا تھا۔ ان بغاوتوں، سے کانگریس کا تعلق مخالفت کا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ علاحدگی کا تھا۔ مانا تو یہ جاتا ہے کہ ان شورشوں کے چلانے والے کمیونسٹ، سوشلسٹ اور فارورڈ بلاکسٹ تھے۔ کانگریس تو ان کی انقلابی کیفیت کو سرد کرنا چاہتی تھی۔ چونکہ اس کو جلد ہی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنا تھا اس لیے اس کو خدشہ اس بات کا تھا کہ اگر حالات کنٹرول سے باہر چلے گئے یا فوج میں ایک بار ڈسپلن میں فرق آ گیا تو آزاد ہندوستان میں اس کے لیے ہی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔ کانگریس تو اس وقت اقتدار حاصل کرنے کے لیے حکومت سے بات چیت کرنے میں مصروف تھی۔ اس سلسلہ میں ایک رجحان یہ بھی ہے کہ اگر کانگریس لیڈر اقتدار حاصل کرنے کے لیے سپر نہ ڈال دیتے تو حصول آزادی کا کوئی دوسرا ہی راستہ نکل آتا۔

ہمارے خیال سے ان تینوں شورشوں کا سلسلہ قومی تحریک کی اسی سرگرمی سے جڑتا ہے جس کو کانگریس اپنے وجود کے دن سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ الیکشن پرچار کے دوران آزاد ہند فوج کی موافقت میں اپنی تقریروں کے ذریعہ اور 1942 میں انگریزوں کے ذریعہ کی گئی زیادتیوں کے خلاف کانگریس نے لوگوں کے جذبات کو اچھی طرح ابھارا تھا۔ دراصل نومبر 1945 اور فروری 1946 کی تینوں بغاوتیں انھیں جذبات کا مظہر تھیں۔ وزارت خارجہ کے صوبائی سطح کی تحقیقات کے مطابق یہ شورشیں پچھلے تین مہینوں میں کانگریس لیڈروں کے ذریعہ کی گئی شعلہ انگیز تقریروں کا نتیجہ تھیں۔ 17 وائسرائے کو بھی اس معاملہ میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان کا بھی یہی نظریہ تھا کہ رائل انڈین بحری فوج (RIN) کی بغاوت کانگریس لیڈروں کے ذریعہ کی گئی تقریروں کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ 18 دراصل پنجاب سی۔ آئی۔ ڈی افسروں نے جاسوس محکمہ کے ڈائرکٹر کو ہونے والے خطرہ سے خبردار کیا تھا، جب وہ معاملہ کی صحیح نوعیت نہ سمجھ کر کمیونسٹوں سے نمٹ رہے تھے۔ 19

یہ تینوں شورشیں اپنی ہیئت کے اعتبار سے پہلے کی گئی سرگرمیوں سے مختلف تھیں۔ ان بغاوتوں نے متشدد طریقے اپنا کر حکومت کو اعلانیہ چیلنج کیا تھا جبکہ اس کے پہلے کی سرگرمی قومی یکجہتی کا پرامن مظاہرہ تھا۔ پہلے کی گئی سرگرمی دھیرے دھیرے پھیلنے والا طوفان تو دوسرا اچانک ہونے

والا دھما کہ تھا۔

ان بغاوتوں کے لیے کانگریس نے کوئی گہار نہیں کیا اور نہ کسی دوسری پارٹی نے آواز لگائی بلکہ طلبا اور ملاحوں کے لیے عوام میں ہمدردیاں پیدا ہوئیں اور برٹش ظلم وستم کے خلاف اس کا غصہ خود بخود ابل پڑا۔ کانگریسیوں، کیونسٹوں، اور دوسری پارٹی کے لوگوں نے ذاتی طور سے ان میں شرکت کی۔ 21 رنومبر 1945 کو کلکتہ میں جو جلوس نکالا گیا، اس کی قیادت کانگریس کے طلبا ہمدرد افراد، کانگریس سوشلسٹ پارٹی، فارورڈ بلاک اور کیونسٹ پارٹی نے مل جل کر کیا۔ کانگریس نے یوں تو لوگوں کے حوصلہ کی داد دی اور حکومت کے ذریعہ کیے گئے ظلم وستم کی مذمت کی مگر اس نے ان بغاوتوں کی باضابطہ حمایت نہیں کی کیونکہ اس کے مطابق ان کا طریقہ موقع ومحل دونوں غلط تھے۔ کانگریس وقت کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ برٹش حکومت ان کو کچلنے کی پوری طاقت رکھتی ہے اور یہ کہ وہ ایسا کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہے۔ ولبھ بھائی پٹیل نے جہازی ملاحوں سے میر ڈالنے کو کہا کیونکہ ان کا ذاتی مشاہدہ تھا کہ برٹش حکومت بمبئی میں ہوئی بغاوت کو کچلنے کے لیے کتنی پھرتی سے حرکت میں آئی تھی۔ 22 نومبر 1946 کو انھوں نے نہرو کو خط لکھا کہ ''بے حد زبردست فوج کی بحری اور بری قوتوں کا یہاں اجماع ہے۔ فوج اتنی طاقتور ہے کہ باغیوں کا پوری طرح قلع قمع کر سکتی ہے اور یہ کہ ان کو اس طرح کی دھمکی بھی دی جا چکی ہے'' 20 صرف کانگریس لیڈر اکیلے نہیں تھے جنھوں نے امن قائم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ کیونسٹوں نے بھی ان کے ساتھ نومبر 1945 اور فروری 1946 میں کلکتہ کے لوگوں کو صلاح دی تھی کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ کیونسٹ اور کانگریس گاڑیوں نے شاہی انڈین بحری فوج کی بغاوت کے دوران امن قائم کرنے کے لیے پورے کراچی میں گشت کیا تھا۔

اس بات میں بہت تھوڑا دم ہے کہ عوام پر ہونے والی زیادتی کے ڈر سے کانگریس نے بات چیت اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا تھا اور آخر کار ملک کا بٹوارہ قبول کر کے اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ 21

کانگریس کی حکمت عملی ہی یہی تھی کہ تحریک چلانے کے پہلے بات چیت کے سارے ذرائع استعمال کر لینا چاہیے۔ کانگریس نے اپنی دیرینہ حکمت عملی کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی

ایک قرارداد کے ذریعہ 22 ستمبر 1945 کو دوبارہ پاس کر کے ان لفظوں میں دوہرایا''۔ بات چیت اور مصالحت کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچنا کانگریس کی امن پالیسی کا بنیادی اصول ہے جس کو ہر طرح اکسانے (Provocation) کے باوجود ترک نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اس کو عدم تعاون کی مکمل یا جزوی شکل دی جا سکتی ہے۔ اس لیے کانگریس کی رہنما حکمت عملی برقرار رہنا چاہیے جہاں تک ممکن ہو بات چیت، مصالحت اور عدم تعاون اور بوقت ضرورت سیدھی کارروائی پر عمل کرنا چاہیے[22]

1946 میں تحریک شروع کرنے کے پہلے بات چیت کی جگت تلاش کرنا نہرو کے نزدیک فیصلہ کن طریقہ معلوم پڑتا تھا کیونکہ دو سے پانچ سالوں کے اندر انگلینڈ کا ملک کو چھوڑ کر چلے جانے کے امکانات دکھائی پڑنے لگے تھے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے یکم جنوری 1946 کو جو بیان دیا اور 19 فروری 1946 کو برٹش وزیراعظم نے کیبنٹ مشن بھیجنے کا جو فیصلہ لیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان جلد از جلد آزاد ہونے والا ہے۔ پھر بھی اسی طرح کے نتیجہ پر پہنچنے کے لیے برٹش حکومت پر دباؤ بنائے رکھنا ضروری تھا اور اسی غرض کے تحت تحریک کو 1945 کے دوران ہر طرح سے مضبوط و مستحکم بنا کر برقرار رکھنا تھا۔ عوامی تحریک کو رزرو (Reserved) میں رکھ کر پہلے بات چیت کے کارڈ کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس کے ناکام ہونے پر ہی عوامی تحریک چلانی چاہیے۔ 3 فروری 1946 کو گاندھی جی کے تین بیانات ہریجن میں شائع ہوئے۔ ان میں انھوں نے اس بات پر اشارہ کیا تھا کہ لوگوں نے بغاوت کر کے بہت پرخطر راستہ اپنایا ہے۔ بحری فوج کے ملاحوں نے سردار پٹیل کی صلاح پر اپنے سپر ڈال دیے۔ انھوں نے بڑی عقلمندی کا کام کیا ہے۔ اس سے بڑی راحت ملی ہے۔ ایسا کر کے انھوں نے عزت کا سودا نہیں کیا بلکہ میری نظر میں ان کو بغاوت کی صلاح دینا بری بات ہوتی۔ اگر ان کو کسی قسم کی شکایت اور پریشانی تھی تو ان کو اپنی ہی مرضی کے سیاسی لیڈروں کی رہنمائی میں اور ان کو بیچ میں ڈال کر دور کرانا چاہیے تھا، لیکن اگر انھوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے بغاوت کی تو پھر دوسرا جرم کیا اور اگر انھوں نے اپنی قوت پر یقین کیا کہ وہ اس کے بل بوتے ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرا لیں گے تو یہ ان کی بھول اور ناسمجھی تھی''۔ لوک مانیہ تلک نے ہم کو نصیحت کی ہے کہ ہوم رول (Home

Rule) یا سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے، مگر سوراج اس طرح نہیں مل سکتا جیسے بمبئی، کلکتہ اور کراچی میں حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے"۔ جو لوگ باغیوں کو اکسا رہے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ بالآخر باغیوں کو جھکنا ہی پڑے گا" گاندھی جی نے مزید کہا کہ قوم کو انگلینڈ کے اعلانات پر اعتماد نہ کرنا اور اسی بے اعتمادی پر جھگڑنا زبردست غیر دور اندیشی اور نا سمجھی ہے۔ کیا سرکاری وفد ایک عظیم قوم کو دھوکا دینے آ رہا ہے؟ سرکاری وفد کو بذات خود ثابت کرنے کا موقع دیجیے کہ انگلینڈ کے اعلانات غیر معتبر ہیں۔ اعتماد کرنے پر ہی قوم کا فائدہ ہوگا۔ دھوکا کھانے والے کی طرف سے جب معقول جواب ملتا ہے تب دھوکا دینے والے کا ہی نقصان ہوتا ہے حکمرانوں نے ہندوستانیوں کے حق میں ہندوستان چھوڑ دینے کی منشا کا اعلان کر دیا ہے۔ مگر قوم کو بھی اپنا کام کرنا ہوگا۔ قبل اس کے کہ اعلانات پر عمل ہو، راستے میں حائل ساری رکاوٹوں کو تھوڑی مدت کے لیے ہی سہی، ہٹانا ہوگا"[23]

باب۔ 37

آزادی اور ملک کی تقسیم

15 اگست 1947 کی حقیقت کا متضاد نیچر آج تک مورخین کو حیران کیے ہوئے ہے۔ سرحد کے دونوں طرف لوگ آج بھی مصیبت میں ہیں اور ملک کی تقسیم کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

ایک لمبے عرصہ کی کٹھن جدوجہد کے بعد آزادی حاصل ہوئی تھی۔ مگر تقسیم کی خونی ٹریجڈی نے ابھر رہی آزاد قوم کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس سلسلہ میں دو اہم سوالات اٹھتے ہیں۔ پہلا یہ کہ انگریزوں نے ہندوستان کیوں چھوڑا اور دوسرا یہ کہ کانگریس نے بٹوارہ کیوں تسلیم کیا؟

سرکار کی طرف سے اس کا جواب بہت سیدھا سادہ ہے۔ انگلینڈ کی منشا تھی کہ ہندستانی اپنی حکومت خود چلائیں اور آزادی ان کی اسی خواہش کا نتیجہ تھی۔ تقسیم صدیوں پرانی ہندو مسلم نا اتفاقی کا منحوس پھل تھا کیونکہ دونوں فرقے آپس میں یہی نہیں طے کر پا رہے تھے کہ حکومت کس کو اور کیسے سونپی جائے۔ بائیں بازو کا یہ نظریہ ہے کہ 47-1946 کے دوران عوام کی زبردست جدوجہد کے ذریعہ آزادی حاصل کی گئی جس میں بہت سارے کمیونسٹوں نے تعاون کیا اور اکثر

نے اس کی قیادت بھی کی، لیکن کانگریس کے بورژوا نیتا اس انقلابی لہر سے خوفزدہ ہو گئے اور انھوں نے سرکار سے ساز باز کر کے حکومت ہتھیالی۔ قوم کو اس کی قیمت تقسیم کی شکل میں چکانی پڑی۔

پہلے سے چلی آ رہی مذہبی کشمکش کے ذریعہ ناکام کیا گیا آپسی میل ملاپ یا اقتدار حاصل کرنے کی ہوس میں ضائع کیے گئے انقلابی اصول چاہے جتنے پرکشش لگیں، ناخوشگوار حقیقت کو ظاہر نہیں بلکہ دھندلا کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آزادی اور بٹوارہ کے دونوں ہی واقعات برٹش سلطنت کے خلاف کانگریس کے ذریعہ چلائی گئی تحریک کی کامیابی اور ناکامی دونوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ کانگریس کے ذمہ دو کام تھے۔ پہلا، ملک کے مختلف طبقوں، فرقوں، گروہوں، اور علاقوں کو ملا کر ایک قوم، بنانا اور دوسرا، اسی ابھرتی ہوئی قوم کو انگریز حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانا۔ دوسرے کام میں وہ کامیاب رہی یعنی اسی نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا مگر وہ قوم کی تشکیل کا کام پورا نہ کر سکی خصوصاً مسلمانوں کو قوم کے ساتھ جوڑ نہ سکی۔ قومی تحریک کا یہی تضاد یعنی کامیابی اور ناکامی، آزادی اور تقسیم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ہندوستانی سماج پر غلبہ قائم کرنے کی جدوجہد میں قومی سرگرمیوں کی کامیابی کے آثار دوسری جنگ عظیم کے آخر تک اچھی طرح ظاہر ہونے لگے تھے۔ برٹش حکمران، ہٹلر کے خلاف جنگ جیت گئے تھے لیکن ہندستانی مورچہ پر ان کی ہار ہوئی تھی۔ قومی تحریک کی وسعت ہندوستان میں انگریزی حکومت کی وسعت سے کہیں زیادہ دراز تھی۔ آزاد ہند فوج کے مقدموں کے دوران ملک میں قومی تحریک کی سرگرمی سے ان طبقوں اور علاقوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تھی جو طبقے اور علاقے اب تک قومی ہلچل سے الگ تھلگ تھے۔ فوج اور نوکر شاہی کے لوگوں نے بھی کھلے عام جلسوں میں جانا، کانگریس کو چندہ دینا اور ووٹ دینا شروع کر دیا تھا اور وہ یہ بھی چاہتے تھے ان کی اس طرح کی سرگرمیاں منظر عام پر بھی آئیں۔ سیاسی طور سے بیدار لوگوں کی دلیری 1942 کی جدوجہد کے دوران اجاگر ہو چکی تھی۔ طلبا اور دوسرے لوگوں نے بے خوف ہو کر آزاد ہند فوج اور رائل انڈین نیوی (RIN) کے باغی ملاحوں کے ساتھ اپنی یکجہتی کا ثبوت دیا تھا۔ قومی تحریک کی کامیابی کا اندازہ قومی جذبات کی شدت سے لبریز بھیڑ کے جوش و خروش اور حوصلہ کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

دوسری طرف انگریز افسروں کا حوصلہ اور ہندستانی افسروں اور انگریز پرستوں کی بدلتی ہوئی وفاداری کا گراف بھی بری طرح گر رہا تھا۔ اس سے ہم کو قومی تحریک کی کامیابی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ قومی تحریک ایک ایسی طاقت بن کر ابھری تھی کہ جس نے نہ صرف ملک میں برٹش حکومت کے لیے کوئی گنجائش ہی چھوڑی تھی بلکہ اس نے برٹش تسلط کو ختم، اس کے ڈھانچہ کو مسمار اور اس کی سیاسی حکمت عملی کو تار تار کیا تھا1

یہ بھی غور طلب ہے کہ ہندوستان میں برٹش حکومت کے قائم رہنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ بہت سارے طبقوں اور لوگوں کو اس سے اتفاق تھا۔ ملک میں اس کے قیام پر ان کی خاموش رضا تھی۔ انگریزی حکومت کا بنیادی انحصار زمینداروں، اونچے طبقے کے لوگوں اور سرکار پرستوں پر تھا اور خاص طور سے انھیں لوگوں پر برٹش حکومت کرم فرما تھی۔ سرکاری عہدوں پر انھیں کے لوگ فائز تھے۔ یہی لوگ حکومت چلاتے تھے، سرکاری پالیسیوں کی پاسداری کرتے تھے اور سدھار کے ان کاموں کو عملی جامہ پہناتے تھے جن کا نفاذ حکومت سوچ بچار کے بعد بڑی تاخیر سے کرتی تھی۔ لوگوں کو اس نے بڑی کامیابی سے اعتماد میں لے رکھا تھا۔ ایمانداری اور انصاف سے کام کرنے والے انگریز افسران ان کے ''مائی باپ'' تھے۔ حکومت کی کوشش سے سماج میں قائم امن کی ان کی نگاہ میں بڑی قدر تھی۔ کچھ لوگ امن وانصاف کے کاموں کو ''انگریزی راج کی برکتیں'' مانتے تھے۔ بس حکومت کے لیے اب اتنا کافی تھا کہ لوگ یہ یقین کرلیں کہ انگریزی راج بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔ اس طرح راج کا کام ناموری کے بل بوتے چلتا تھا اور اس ناموری کی مادی شکل ضلع افسر تھا جو انڈین سول سروس زمرہ کا ایک فرد ہوتا تھا۔ ''جنت والی'' اس نوکر شاہی کو بڑے فخر وتکبر سے ''راج کا اسپاتی فریم'' کہا جاتا تھا۔

جہاز مانند حکومت چلانے والے جب سرکاری بندے جہاز سے کودنے لگے، تو آبرو خاک میں ملنے لگی۔ ضلع افسران اور سکریٹریٹ کے لوگ جب پتوار چھوڑنے لگے تو یہ ظاہر ہو گیا کہ جہاز غرق ہو رہا ہے اور تیزی سے غرق ہو رہا ہے۔ حکومت کے ذریعہ کی گئی بیسوں سال کی تباہی کا یہ نتیجہ تھا۔ جہاز نہ صرف اندر سے سڑ رہا تھا بلکہ باہر سے اس پر مستقل چوٹیں کی جارہی تھیں۔

یورپین آئی۔سی۔ایس (ICS) افسروں کی تعداد پہلی جنگ عظیم سے مستقل گھٹ

رہی تھی۔ ہندستانی عوام کے مطالبہ پر ان نوکریوں میں دیسی افسروں کی بھرتی کرنے پر کسی قدر حکومت کو مجبور ہونا پڑا تھا۔ 1939 تک اس باوقار نوکری میں یورپین اور ہندستانی افسروں کی تعداد لگ بھگ برابر ہو چکی تھی۔ اس توازن کو قائم رکھنے کے لیے پہلے تو بھرتی میں کٹوتی کی گئی، اس کے بعد 1943 میں ایک دم بھرتی بند کر دی گئی جس کے تحت 1940 سے 1946 کے دوران آئی سی۔ ایس (ICS) افسروں کی تعداد 1201 (ایک ہزار دو سو ایک) سے گھٹ کر 939 (نو سو انتالیس) ہو گئی جس میں 587 (پانچ سو ستاسی) برٹش افسروں میں 429 (چار سو انتیس) اور 614 (چھ سو چودہ) ہندستانی افسروں میں 510 (پانچ سو دس) افسران ہی رہ گئے۔ 1946 تک بنگال میں 65 (پینسٹھ) آئی۔سی۔ایس۔ عہدوں کے لیے صرف 19 (انیس) انگریز ہی مل پائے تھے۔2 اس کے علاوہ اس نوکری میں اب اونچے خاندانوں کے آکسفورڈ اور کیمبرج کے گریجویٹ نہیں بھرتی ہو رہے تھے جس میں کبھی ان کے باپ اور چچا کام کر چکے تھے اور جن کی یہ سوچ تھی کہ ہندوستان کے بچہ لوگوں (Child People of India) پر حکمرانی کرنا برٹش قوم کا مقدر تھا۔ اب ان کی جگہیں گرامر اسکول اور پولیٹکنک کے طلبا بڑی تیزی سے لیتے جا رہے تھے۔ ان کی نظر میں 'راج' کی نوکری اب مشن نہیں بلکہ روزی روٹی کا ذریعہ تھا۔ جنگ نے اس مسئلہ کو اور نازک بنا دیا تھا۔ 1945 تک انگلستانی جنگ سے تھک چکے تھے۔ وطن سے بہت دور ایک مدت سے رہنے کی وجہ سے وہ عاجز تھے۔ ان کا حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ افراط زر نے ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کیا تھا۔ ان افسروں میں زیادہ تر افسر ریٹائرڈ (Retired) ہونے والے تھے۔ باقی افسران بھی وقت سے پہلے پنشن لے لینا چاہتے تھے۔ اس طرح 1945 تک جو برٹش نوکر شاہی ہندوستان میں موجود تھی، وہ تعداد میں کم، بے حد تھکی ماندی، پست ہمت اور 1942 کی تحریک سے بری طرح پٹی ہوئی تھی۔

بہر حال قومیت کا مقابلہ کرنے کے لیے افراد کی کمی سے زیادہ برٹش حکومت کی متضاد حکمت عملی آڑے آتی تھی جس نے آئی۔سی۔ایس افسروں اور راج شاہی کو بے حد کمزور کر دیا تھا۔ حکومت قومی تحریک کو کچلنے کے لیے مصالحت اور جبر کے دونوں طریقوں پر برسوں سے بھروسہ کرتی آ رہی تھی۔ 1942 کے کرپس مشن کے بعد اب سوائے مکمل آزادی دینے کے اور کوئی

رعایت دینا باقی نہیں بچا تھا۔ لیکن قومی حکمت عملی کے تحت آئینی سدھار کے لیے کی جارہی پرامن عوامی تحریک حکومت پر بھاری پڑ رہی تھی۔ جب اس طرح کی پرامن کوششوں پر حکومت کی طرف سے ظلم وستم ہوتا تو اس کا اصل چہرہ بے نقاب ہو جاتا اور جب حکومت باغی سرگرمیوں پر شکنجہ نہ کس پاتی یا صلح پر آمادہ ہوتی (جیسا 1931 میں گاندھی اروِن معاہدہ میں ہوا تھا) یا پھر 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خودمختاری تسلیم کر لیتی، تب یہ ظاہر ہو جاتا کہ حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ ایسے حالات میں ان سارے کاموں سے حکومت کا وقار گرتا تھا۔ دوسری طرف 1942 میں تحریک پر جس طرح مظالم ڈھائے گئے اس سے حکومت پرست اور حریت پسند دونوں خیموں کے لوگوں کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ فروری مارچ 1943 میں 21 دنوں کے برت کے دوران گاندھی جی موت کی حد تک پہنچ گئے تھے، مگر حکومت نے ان کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا نیز آزاد ہند فوج کے جنگی قیدیوں کو بری کرنے کی اپیل بھی دونوں خیموں کے لوگوں نے کی تھی، مگر حکومت مقدمہ چلانے کے اپنے فیصلہ پر اڑی تھی۔ اس سے ان کے جذبات کو بری طرح دھکا لگا تھا۔ لیکن جب حکومت اپنے کانگریسی دشمنوں سے 1945-46 میں مصالحت کرنے اور سرکار میں شریک ہونے کے لیے اصرار کرنے لگی، تب برٹش راج کے ہندستانی دوست پریشان ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سرکار پرست بے حد حیران اور دہشت زدہ تھے کہ جن کے ہاتھ میں حکومت ہے، وہی لاچار ہیں۔ جب کانگریسی لیڈروں کی اشتعال انگیز تقریریں ہوا میں گونج رہی ہوتی تھیں تب سرکاری افسران مجبور محض بن کر کھڑے دکھائی پڑتے تھے ایسے حالات میں برٹش راج کی قوت پر سرکار پرستوں کا اعتماد بری طرح ہل گیا تھا۔

اگر سرکار پرستوں کے اعتماد کو جھٹکا لگا تھا، تو نوکر شاہی بھی بڑے تذبذب میں تھی۔ حکومت کی ڈھلمل پالیسی میں کام کرنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا۔ وہ کس پالیسی پر عمل کرے؟ سمجھوتہ یا ظلم یا دونوں پر نہیں۔ دو متضاد پالیسیوں پر عمل کرنے سے مسائل ہی پیدا ہوں گے۔ پہلی بار اس طرح کی حیران کن پریشانی اس وقت پیدا ہوئی جب 1930 کی دہائی میں کانگریس کی سرکاریں بننے والی تھیں اس امکان سے افسران بے حد پریشان تھے کہ سول نافرمانی تحریک کے دوران، جن لیڈروں پر انھوں نے ڈنڈے برسائے ہیں، انھیں کے حکم پر ان کو چلنا پڑے گا۔ اور

جلد ہی آٹھ صوبوں میں اس طرح کی حقیقت بھی کھل کر ان کے سامنے آ گئی۔

کانگریس سرکاروں کی آئینی حکومت نے نوکر شاہی کا حوصلہ پہلے ہوئی عوامی تحریک سے زیادہ چکنا چور کیا تھا، حالانکہ لوگوں کو اس کا احساس بہت کم ہے۔ پر امن عوامی تحریک نے لوگوں کے دلوں سے حکومت کا ڈر نکال دیا تھا تو صوبوں میں کانگریس راج کے قیام سے ان میں خود اعتمادی بڑھ رہی تھی۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ مدراس کے برٹش چیف سکریٹری کھادی پہننے لگے تھے۔ اسی طرح بمبئی میں مالیات کے انگریز سکریٹری جب اپنے وزیر مالیات (Revenue Minister) مرارجی ڈیسائی کے ساتھ دورے پر ہوتے تھے تو ٹرین کے رکتے ہی اپنے اول درجہ کے ڈبہ سے نکل کر ڈیسائی کے تیسرے درجہ کے ڈبہ کی طرف دوڑ کر جاتے تاکہ وزیر محترم کو ان کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ ہندستانی افسروں میں انگریزوں کے تئیں بے وفائی تو نہیں تھی مگر پہلے وہ اپنی وفاداری کی نمائش کیا کرتے تھے اور اب انھوں نے اپنی حب الوطنی کا مظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے خاندان کا ہر تیسرا بھائی سول نافرمانی تحریک میں دو بار جیل سے لوٹا ہوا ہوتا تھا۔3

صوبوں میں کانگریس سرکاروں کے بننے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آئندہ ہونے والی سیاسی سرگرمیوں سے نمٹتے وقت افسروں کے ذہن میں یہ خیال آنے لگا کہ کانگریس پھر حکومت میں آ سکتی ہے۔ سرکاری احکام کی خلاف ورزی تو کہیں نہیں ہوئی مگر 1940 میں کہیں کہیں یو پی میں انفرادی سول نافرمانی تحریک کے دوران مشرقی یو پی اور بہار میں ہوئی بغاوتوں کے خلاف افسروں نے بے من سے کارروائی کی تھی۔ عام طور سے 1942 میں سخت کارروائی کی پالیسی اپنائی گئی اور اس کا نتیجہ بھی جنگ کے خاتمہ کے بعد سامنے آیا۔ جب کانگریس لیڈران جیلوں سے رہا ہوئے اور یہ اغلب ہوا کہ وہ صوبائی سرکاریں بنائیں گے، تو صلح و ستم کی پالیسیاں آپس میں الجھ گئیں۔ جب کانگریس نے تحقیقات کا مطالبہ کیا اور بدلہ لینے کی دھمکی دی تو سرکار خاموش رہی۔ اس وقت افسروں کی بڑی کرکری ہوئی اور ان کا حوصلہ بے حد پست ہوا کیونکہ سرکار کہتی تھی کہ چناوی مہم کے دوران جتنا ممکن ہو، آزادی دینا ضروری ہے۔ افسران مشتبہ تھے کہ کانگریس کے دباؤ میں سرکار جھک جائے گی اور سابق وائسرائے لنلتھگو کی یقین دہانی پر عمل نہ ہوگا کہ کسی طرح کی تحقیقات نہ ہونے دی جائے گی۔ لارڈ ویول نے بھی یہ بات تسلیم کی تھی کہ

صوبائی سرکاروں کے قیام سے جو مسائل پیدا ہوئے ان میں سب سے مشکل مسئلہ افسروں کے ذریعہ کی گئی کارروائی کے خلاف تحقیقات کا معاملہ تھا۔

جنگ کے اختتام تک ان افسروں اور پالیسی بنانے والوں کے سامنے جو اقتدار کی بدلتے رہنے والی خصلت سے اچھی طرح واقف تھے، مستقبل قریب میں ہونے والے حالات کی علامتیں بخوبی ظاہر ہوگئی تھیں۔ فوج کے لوگوں کے ذریعہ آزاد ہندفوج کے سپاہیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کا مطالبہ اور بحری فوج کے ایک حصہ میں بغاوت کے واقعات سے دور اندیش افسروں کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اس بار جو طوفان اٹھا ہے وہ بغیر کوئی اتھل پتھل کیے تھمنے والا نہیں ہے۔ اور جن لوگوں کو حکومت کی قوت پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا، ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے تو شاید مکمل بغاوت کی ضرورت تھی۔ حکومت کا ڈھانچہ اب بھی برقرار تھا مگر یہ خدشہ ضرور پیدا ہوگیا تھا کہ اگر الیکشن کے بعد 1942 کی طرح کی تحریک پھر شروع ہوگئی، تو نوکر شاہی اور فوج پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ صوبائی سرکاریں اس کو روکنے کے بجائے اس میں مدد کریں گی۔ وائسرائے کے لفظوں میں ''شاید اب بھی ہم تحریک کو کچل دیں گے مگر دشواری یہی ہے کہ اس میں افسروں کا سہارا لینا ہوگا اور لائق اور معتمد افسران ضروری تعداد میں میسر نہیں ہیں''[4]

ایک بار جب یہ بات مان لی گئی کہ برٹش اقتدار اب پرانے طور طریقوں پر زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا، تو پھر برٹش پالیسی بنانے والوں کا مقصد یہ ہوگیا کہ اقتدار منتقل کرنے کی شکل کیا ہوگی۔ اور آزادی کے بعد ہندوستان اور انگلینڈ کا رشتہ کیا رہے گا، اس بارے میں سمجھوتہ کرکے باعزت طریقے سے ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے[5] برٹش حکومت کے سامنے یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ مستقبل کے اچھے تعلقات کے لیے اور تحریک کے خدشہ کو مٹانے کے لیے سمجھوتہ ناگزیر ہے۔ چونکہ سمجھوتہ کی ناکامی ناقابل برداشت ہوتی، اس لیے رعایتیں ایسی ہونا ضروری ہیں جو کانگریس کے بیشتر مطالبوں کو پورا کرسکیں۔ کانگریس کا اصل مطالبہ 'ہندوستان چھوڑ دو' تھا۔ اس لیے برٹش سرکار نے فیصلہ لیا کہ مارچ 1946 میں کیبنٹ مشن بھیجا جائے جو قومی حکومت کے قیام کے لیے بات چیت کے ساتھ ساتھ اقتدار منتقلی کی کارروائیوں کا باقاعدہ نظم کرے۔ کیبنٹ مشن 1942 کے کرپس مشن کی طرح خالی ہاتھ منہ دکھانے نہیں آیا تھا بلکہ لمبی مدت تک یہاں

رہنے کے لیے تیار تھا۔

برٹش سرکار اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ ہونے کے لیے حالات ہموار تھے کیونکہ حکمران اس کی ضرورت اچھی طرح محسوس کر رہے تھے اور قومی لیڈر بھی سمجھوتہ کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ بہرحال وسط اگست 1947 میں آزادی کے پہلے خون کی ندیاں بہنا مقدر بن چکا تھا، جبکہ شروع 1946 میں ہی آزادی کو خاموش منظوری مل گئی تھی۔ حکومت اور قومیت کے درمیان کی کشمکش جس کا حل اصولاً نکل آیا تھا، 1946 کی ابتدا میں ہی سامنے سے ہٹ گئی۔ اب ایک نئی کشمکش نے اس کی جگہ لے لی کہ برٹش سرکار، کانگریس اور مسلم لیگ کا مستقبل میں رنگ وڈھنگ کیا ہو۔

قابل غور بات یہ تھی کہ برٹش حکومت کے خاتمہ کے بعد نئے ہندوستان کی شکل کیا ہو؟ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ سب سے پہلے ایک مرکز کو اقتدار سونپ دیا جائے۔ اس کے بعد مسلم اقلیت کے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے، چاہے مسلم اکثریت والے صوبوں میں خودمختاری دے کر یا پھر خود ان کی مرضی وفیصلہ سے ہندوستان یونین سے الگ کر کے، لیکن یہ سارے کام تبھی ہوں گے جب انگریزی سرکار اقتدار سے بے دخل ہو جائے گی۔ برٹش سرکار متحدہ ہندوستان کے حق میں تھی تاکہ وہ انگلینڈ کا دوست بنا رہے اور کامن ویلتھ (Common Wealth) کی دفاع میں سرگرمی سے اشتراک کرے کیونکہ اس کے خیال سے منقسم ہندوستان دفائی قوت میں کمزور، مشترکہ دفائی کوششوں میں لاچار اور برٹش فن سفارت (Diplomacy) میں بدنما داغ ہوگا۔ حصول آزادی کے پہلے 1906 سے مسلم لیگ کا حوصلہ بڑھانے کی برٹش پالیسی سے یہی معلوم پڑتا تھا اور موجودہ بین الاقوامی سیاست میں مغربی ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلق کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ انگلینڈ کا دوست ملک بن جائے گا مگر برٹش سرکار اس وقت ایسا نہیں سوچتی تھی۔

پہلے کی برٹش پالیسی کے برعکس 47-1946 میں جو بیانات حکومت کی طرف سے جاری کیے گئے ان سے صاف طور سے واضح ہوتا تھا کہ انگلینڈ اب ہندوستان کو بانٹنے کے حق میں نہیں ہے۔ ویویل نے جناح کو اجازت دی تھی کہ وہ سبھی مسلمان لیڈروں کے نامزد کرنے کی ضد

پرشملہ اجلاس کو ناکام کردیں، لیکن ایٹلی (Attlee) نے 15 مارچ 1946 کو صاف لفظوں میں یہ کہا کہ ''اقلیت کو اکثریت کی ترقی روکنے کی اجازت نہیں دی جائے گی'' کیبنٹ مشن پلان میں لیگ کے مطالبوں کے تحت گنجائش نکالنے کے لیے صوبوں کی خودمختاری اوران کے الگ ہونے کے اختیار کو تسلیم کرلیا گیا تھا مگر اب بھی اس کا تصور ایک متحدہ مرکز کا تھا، جو دفاع، امور خارجہ اور کمیونیکشن شعبوں کی دیکھ بھال کرتا۔ مشن پلان نے ملک کی تین حصوں میں گروپنگ (Grouping) کی تھی۔ پہلے گروپ اے (A) میں مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی۔ پی اور اڑیسہ، دوسرے بی (B) میں پنجاب، اتر مغرب سرحدی صوبہ اور سندھ اور تیسرے سی (C) میں بنگال اور آسام آتے تھے۔ یہ تینوں گروپ الگ الگ مل کر اپنے گروپ کے لیے دستور سازی کرتے۔ پہلے عام انتخابات کے بعد کوئی صوبہ اپنے گروپ سے نکل سکتا تھا۔ دس برسوں کے بعد کوئی صوبہ اپنے گروپ یا یونین کے دستور پر نظر ثانی کر سکتا تھا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ کسی صوبہ کو اپنے گروپ سے نکلنے کے لیے پہلے انتخابات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو اول اول کسی گروپ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کی اجازت ہونی چاہیے۔ کانگریس نے اپنے زیر انتظام صوبوں یعنی آسام اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ذہن میں رکھ کر یہ سوال اٹھایا تھا (یہ صوبے بالترتیب گروپ بی اور سی میں تھے) لیگ یہ چاہتی تھی کہ دس سال انتظار کرنے کے بجائے بھی صوبوں کو بروقت یہ اختیار ہو کہ وہ یونین دستور میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ صوبوں کی گروپنگ کے سلسلے میں مشن پلان کا نظریہ صاف نہیں تھا کہ یہ لازمی ہو یا اختیاری۔ بعد میں اس نے طے کیا کہ وہ گروپنگ اختیاری ہے مگر صوبوں کو الگ الگ سیکشن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح مشن پلان تضاد کا شکار تھا۔ دراصل وہ عمداً ناقابل مصالحت بات سے مصالحت کرنے کی امید میں بیان بازی کررہا تھا۔

کانگریس اور لیگ نے اپنے اپنے طور سے مشن پلان کی تشریح کی اور اس کو اپنے اپنے دعوؤں کی تصدیق کرتا ہوا سمجھا۔ پٹیل نے بھی تسلیم کیا کہ مشن پلان پاکستان کے خلاف تھا۔ لیگ کے ویٹو (Veto) کو ختم کیا جاچکا تھا اور پورے ملک کے لیے ایک ہی دستور ساز اسمبلی ہونے کی بات ذہنوں میں تھی۔ لیگ نے 6/جون کو مشن پلان تسلیم کرنے کا اعلان کیا کہ اس میں پاکستان بننے کی بات شامل ہے۔ نہرو نے 7/جولائی کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں اپنی

تقریر میں پورے دعوے سے کہا کہ دستور ساز اسمبلی کے فیصلہ کے علاوہ ہم کسی دوسری بات کے پابند نہیں ہیں۔ اسمبلی مالکِ کل ہے اور وہی طے کرے گی کہ کارروائی کے طریقے کیا ہوں'' 6 جناح کو نہرو کی تقریر سے اچھا موقع مل گیا اور 29 جولائی 1946 کو انھوں نے مشن پلان نامنظور کر دیا۔

انگریزی سرکار اب تذبذب میں پڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا وہ کانگریس کی ہنگامی سرکار بنانے کے لیے آگے بڑھے، یا لیگ کی منظوری کا انتظار کرے۔ داویل جنھوں نے ایک سال پہلے شملہ کانفرس میں دوسری بات پر عمل کرنے کا فیصلہ لیا تھا، اس بار بھی وہی چاہتے تھے مگر شہنشاہ کی سرکار خصوصاً سکریٹری آف اسٹیٹ نے کانگریس کے کام کو اہم بتایا۔ اسی طرح 2 ستمبر 1946 کو کانگریس کی ہنگامی سرکار نہرو کی امارت میں بن گئی۔ یہ کارروائی لیگ کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ بغیر اس کی مرضی کے کوئی سمجھوتہ نہ ہو۔ اب برٹش سرکار کی پالیسی پوری طرح الٹ گئی۔ آزادی کے پہلے اس نے فرقہ وارانہ طاقتوں کا حوصلہ بڑھانے اور کانگریس کو پوری ہندستانی عوام کا باشندہ نہ ماننے کی پالیسی اپنائی تھی۔ لیکن اب چونکہ ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اس لیے برٹش سرکار کا مفاد ہندوستان کے غیر منقسم رہنے میں ہی محفوظ تھا۔

لیکن جناح نہیں چاہتے تھے کہ برٹش سرکار اپنے پرانے رویہ سے ہٹے۔ انھوں نے اٹلی کو ذرا دبی زبان سے دھمکی دی کہ ''انگلینڈ مسلمانوں کو اپنا خون بہانے کے لیے مجبور نہ کرے'' اس کے بعد ہی انھوں نے سیدھی کارروائی (Direct Action) کا پستول داغ دیا۔ 7 ''لے کر رہیں گے پاکستان لڑ کر لیں گے پاکستان''۔ اپنی اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے لیگ نے 16 اگست 1946 کو کلکتہ میں جس طرح فرقہ وارانہ پاگل پن کا مظاہرہ کیا اور ہندو فرقہ پرستوں نے بھی اسی طرح انتقام لیا کہ پانچ ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ انگریزی حکمراں اپنے ہی کرتوت پر سکتہ میں آگئے کہ ان کی ہی مدد سے پیدا ہوا نفرت کا راکھش (Frankenstein Monster) اب ان کے ہی چنگل سے باہر ہے اور اس کو قبضہ میں رکھنا ناممکن ہے۔ اب جناح کی ذمہ داری صرف ''سڑکوں پر پھیلے ووٹ دہندوں'' تک سمٹ کر رہ گئی۔ خانہ جنگی چھیڑنے کی جناح کی صلاحیت سے وحشت زدہ ہو کر برٹش سرکار نے لیگ کی منہ بھرائی کرنے کے لیے 26

اکتوبر 1946 کو مسلم لیگ کو ہنگامی سرکار میں شامل کر لیا، جبکہ اس نے مشن پلان کی چھوٹی یا بڑی مدت والی کسی دفعہ کو منظور نہیں کیا تھا اور سیدھی کارروائی کرنے کی ضد پر اڑی تھی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے تسلیم کیا کہ اگر لیگ کو سرکار میں شامل نہ کیا جاتا تو خانہ جنگی (Civil War) کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ اب اس طرح جناح برٹش کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گئے۔

کانگریس نے برٹش سرکار سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ لیگ سے اپنے رویہ میں تبدیلی لانے کے لیے اصرار کرے یا پھر ہنگامی گورنمنٹ چھوڑ دے۔ یہ آواز اس وقت ہی اٹھنے لگی تھی جب لیگ کے ممبروں نے وزرا کی حیثیت سے حلف لیا تھا۔ لیاقت علی کے علاوہ سبھی وزرا سکنڈ ریٹ کے تھے۔ اس سے جناح کی منشا صاف طور سے واضح تھی کہ ان کو صرف طاقت درکار ہے اور وہ بھی سرکار توڑنے کے لیے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ملک کو صرف کانگریس کے ذمہ چھوڑ دیا گیا تو یہ خودکشی کرنے جیسا کام ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر پاکستان کے لیے لڑنا ہے تو سرکار میں شرکت ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ہنگامی سرکار کا چلتے رہنا خانہ جنگی کو جاری رکھنے کا ذریعہ تھا۔ لیگ کے وزرا کانگریس کے ذریعہ کی جارہی کارروائی پر انگلی اٹھاتے، اس کے ذریعہ کی گئی تقریروں پر اعتراض کرتے اور اس کی میٹنگوں میں جانے سے کتراتے تھے جو کسی اہم فیصلہ پر پہنچنے کے لیے بغیر واویل سے مشورہ لیے نہرو کے ذریعہ بلائی جاتی تھیں۔ لیگ وزرا کی سرکار توڑ پالیسی کو دیکھ کر کانگریس لیڈروں کے سامنے یہ اجاگر ہو گیا کہ کانگریس لیگ سرکار کا چلتے رہنا فضول ہے مگر 5 فروری تک حکومت کسی طرح چلتی رہی۔ اس کے بعد اینٹرم گورنمنٹ کے نو ممبروں نے وائسرائے سے لیگ کے استعفے کا مطالبہ کیا۔ لیگ نے بھی مطالبہ کیا کہ دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) جس کا پہلا اجلاس 9/ستمبر 1946 کو ہوا تھا، برخاست کر دی جائے۔ اس سے پہلے بھی لیگ نے 6/دسمبر 1946 کو انگلینڈ کی یقین دہانی کے باوجود کہ گروپنگ کے سلسلہ میں اس کی توضیح و تشریح صحیح ہے، دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ مشن پلان کے وسیلہ کے بجائے جناح اب سیدھے پاکستان کا مطالبہ کرنے لگے۔

جناح کے مطالبہ کے نتیجہ میں آنے والی مصیبت تھوڑی مدت کے لیے ٹل گئی۔ کیونکہ 20/فروری 1947 کو اٹیلی نے پارلیمنٹ میں اعلان کر دیا کہ 30 جون 1948 کو انگلینڈ

ہندوستان کو چھوڑ دے گا اور اب نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) ہوں گے۔ اس اعلان سے یہ امید بندھی کہ دونوں کانگریس اور لیگ گھبرا کر کسی سمجھوتہ پر تیار ہو جائیں گی اور اس طرح آئینی بحران دور ہو جائے گا نیز انگریزوں کے اس اخلاص سے ہندستانی مطمئن ہو جائیں گے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ کون سی وجہ تھی جس کے تحت ایٹلی سرکار نے ہندوستان چھوڑنے کی تاریخ کا تعین بھی کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واویل نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے بارے میں جو مطالعہ کیا وہ یہ تھا کہ اس کی چولہیں اب ڈھیلی ہو گئی ہیں اور اب ان کو جکڑا نہیں جا سکتا ہے۔ اس لیے ہندوستان چھوڑ دینے میں ہی انگلینڈ کی خیر ہے۔ واویل کو اسی مایوس کن رجحان کی وجہ سے بڑے ناشائستہ طریقے سے برخاست بھی کر دیا گیا اور اس سے پہلے کہ ان کو برخاستگی کی اطلاع باضابطہ ملے، دہلی کے لوگوں میں ان کو برطرف کرنے کی بات عام ہو گئی۔ بہرحال 20 رفروری کے ایٹلی کے اعلان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مستعفی وائسرائے نے حقیقی صورت حال کے بارے میں جو کچھ کہا تھا بالکل سچ تھا۔

اب برٹش شہنشاہیت سے نجات پانے کی پوری امید بندھی۔ اس سے لوگوں کی مایوسی دور ہوئی۔ کانگریس حلقہ میں ایٹلی کے اعلان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا۔ اس اعلان کی شرط میں ملک کی تقسیم کی بات اشارۃً مضمر تھی کہ اگر دستور ساز اسمبلی میں پوری نمائندگی نہیں ہوتی (یعنی اگر مسلم اکثریت والے صوبے اس میں شامل نہیں ہوتے) تو ملک کا اقتدار ایک سے زیادہ سرکاروں کو سونپا جائے گا۔ کانگریس کو یہاں تک منظور تھا کہ موجودہ اسمبلی ان علاقوں کے لیے دستور سازی کرنے میں پیش قدمی کرے جن کی نمائندگی وہ کر رہی ہے۔ لیگ نے نہ صرف دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے سے انکار کیا بلکہ یہ بھی مطالبہ کیا کہ سرے سے اس کو برخاست ہی کر دیا جائے۔ بہرحال اس دشواری کو دور کرنے کے لیے ایک تجویز پیش کی گئی۔ نہرو نے لیاقت علی خان سے اپیل کی کہ ''چونکہ برٹش ہندوستان چھوڑ رہے ہیں اس لیے ہم لوگوں کے کندھے پر ہی ملک کا بار ہے۔ اچھی بات یہ ہوگی کہ دور بیٹھ کر بات چیت کرنے کے بجائے، قریب آ کر نیک نیتی سے مسئلہ کا حل تلاش کریں'' 8 ایٹلی کو یہی امید تھی کہ ان کے اعلان کے بعد دونوں پارٹیاں مل بیٹھ کر مسئلہ کا حل تلاش کر لیں گی'' 9

مگر یہ امید دھوکہ ثابت ہوئی کیونکہ جناح اب پہلے سے زیادہ پرامید ہو گئے۔ منزل پر پہنچنے کے لیے اب ان کو صرف وقت کا انتظار تھا۔ یہی بات بعینہ کنزرویٹو ممبروں (Conservative Members) نے 20 رفروری کے بیان پر بحث کے دوران کہی تھی اور ہونے والے خطرہ سے آگاہ کیا تھا۔ گاڈفرے نکلسن (Godfray Nicolson) نے بھی کرپس (Cripps) کی تقریر کے بارے میں کہا تھا کہ ''اگر کسی تقریر نے مسلم لیگ کو پاکستان کے معاملہ میں اپنی ٹانگ پھنسانے اور اس پر جمے رہنے کے لیے اکسایا ہے، تو یہی وہ تقریر تھی''۔[10] پنجاب کے گورنر اوان جنکنس (Evan Jankins) نے پرزور لب ولہجہ میں کہا کہ ''یہ بیان فرقہ وارانہ زور آزمائش کا فیصلہ کن افتتاحی نغمہ مانا جائے گا۔ اسی بیان کے ساتھ ہر ایک اپنا اپنا اقتدار جی بھر کر جھپٹ لینے کے لیے تیار ہوگا اور اگر ضرورت پڑے تو طاقت سے''۔[11] اسی بیان سے متاثر ہو کر لیگ نے پنجاب میں سول نافرمانی مہم شروع کر دی اور خضر خان والی یونینسٹ۔ اکالی۔ کانگریس (Unionist-Akali-Congress) کی ساجھا سرکار گرا دی۔ اس طرح جنکنس کی پیشین گوئی فوری طور سے حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ داویل نے 13 مارچ 1947 کو اپنے روز نامچہ میں لکھا کہ ''20 فروری والے بیان نے ہی بڑی حد تک خضر خاں کو استعفےٰ دینے کے لیے آمادہ کیا تھا''۔[12]

انھیں حالات میں ماونٹ بیٹن وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان آئے وہ آخری وائسرائے تھے اور 30 جون 1948 تک برٹش راج کو مضبوط بنائے رکھنے کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی۔ ماونٹ بیٹن نے دعویٰ کیا کہ 20 رفروری کے فیصلہ میں انھوں نے کوشش کر کے تاریخ کا تعین کرایا تھا۔ انھیں کے لفظوں میں ''میں نے تاریخ کے تعین کو بڑی اہمیت دی۔ میں نے اس پر بڑی مغزماری کی اور بڑی مشکل سے اٹلی کو اس کے لیے راضی کیا۔ میرے خیال سے یہ کام نہایت ضروری تھا۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ اگر میعاد طے کیے بغیر میں یہاں آیا ہوتا تو اب تک یہیں رہتا''۔[13] ماونٹ بیٹن کا یہ بیان سراسر جھوٹ ہے۔ اس لیے اس کی تردید میں کچھ بھی لکھنا وقت کا برباد کرنا ہے، لیکن لپیر اور کالنس (Lepierre and Collins) اپنی کتاب ''آدھی رات میں آزادی'' (Freedom At Midnight) میں ماونٹ بیٹن کے دعویٰ کو باطل

قرار دیا ہے کہ انھوں نے اکیلے اکیلے ہسٹری کے رخ کو طے کر ڈالا تھا۔ دراصل تاریخ کا تعین واویل کے دماغ کی اپج تھی۔ انھوں نے 31 مارچ 1948 اقتدار منتقلی کی تاریخ طے کی تھی جبکہ اٹلی نے مِڈ 1948 رکھا تھا جس پر ماؤنٹ بیٹن نے غیر معین تاریخ کے بجائے 30 جون 1948 مخصوص تاریخ کے تعین کرنے پر اصرار کیا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن کا یہ دعویٰ بھی گمراہ کن ہے کہ ان کو لندن سے صلاح مشورہ لیے بغیر اپنی مرضی کے سارے کام کرنے کے اختیارات حاصل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان سے قبل آئے ہوئے سبھی وائسرایوں سے زیادہ اختیارات ان کو ملے تھے۔ لندن کی لیبر (Labour) سرکار نے ان کی باتوں کو واجب اہمیت دے رکھی تھی، لیکن وہ اپنے پلان کی ہر ایک نقل وحرکت کے لیے ہر ایک قدم پر لندن سے اپنے ساتھی اسمے (Ismay) سے رابطہ بنائے رکھتے تھے اور بالآخر تین جون پلان (Third June Plan) کے سلسلہ میں اٹلی اور ان کی کابینہ کو راضی کرنے کے لیے وہ لندن گئے۔

ماؤنٹ بیٹن کو ان کے شہنشاہ کی سرکار کی طرف سے ہر معاملہ کے لیے صاف صاف ہدایتیں دی گئی تھیں اور اپنے دعویٰ کے برعکس وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو حکم ملا تھا کہ وہ 1947 تک اتحاد وانتشار کی ساری باتیں تلاش کر کے شہنشاہ کی سرکار کے حضور اطلاع بھیجیں کہ کس شکل میں اقتدار کی منتقلی عمل میں آئے۔ یہاں بھی ان کو اپنی مرضی سے کام کرنے کی بہت تھوڑی آزادی تھی کیونکہ اس سلسلہ میں بہت پہلے ایک وسیع نقشہ تیار کر لیا گیا تھا۔ ہندوستان پہنچنے کے دو ماہ بعد ہی ماؤنٹ بیٹن کو معلوم ہو گیا کہ مشن پلان مردہ گھوڑا کی طرح ہے جس کو چاہے جتنے کوڑے ماریے، آگے نہیں بڑھ سکتا اور جناح اپنی ضد پر اڑے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے ایسا ملک چاہتے ہیں جس پر فرماں روائی بلا شرکت غیر مسلمانوں کی ہو۔ اس سے کم پر وہ مصالحت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جناح کو ان کے عزم سے ہٹانے میں ماؤنٹ بیٹن نے خود کو مجبور محض پایا۔ انھیں کے لفظوں میں ''انھوں نے (جناح نے) ایسا تاثر دیا کہ وہ ان کی (ماؤنٹ بیٹن کی) کوئی بات سن ہی نہیں رہے ہیں۔ ان سے بحث کرنا ممکن نہیں۔ پاکستان کے بارے میں جو کچھ انھوں نے کہا وہ اس پر قائم ہیں''[14]

انگریز ہندوستان کو سالم اور متحد رکھ سکتے تھے اگر وہ ثالث (Mediators) کا کردار نبھانا چھوڑ دیتے اور کوئی ایسی سبیل تلاش کرتے جس پر سبھی ہندستانی رضا مند ہوجاتے۔ ہندوستان کی سالمیت کے لیے مثبت کوشش درکار تھی۔ اس کے حصول کے لیے فرقہ وارنہ طاقتوں سے سختی سے نمٹنا صروری تھا لیکن ایسا کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ ایٹلی نے بعد میں لکھا تھا "ہم متحد ہندوستان کو ترجیح دیتے تھے مگر ہم ایسا حاصل نہیں کر سکے حالانکہ اس کے لیے ہم نے سخت محنت کی"15 دراصل انھوں نے آسان راستہ اپنایا تھا جبکہ اس کے لیے مسلسل کوشش کی ضرورت تھی اور ان طاقتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ضروری تھا جو ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتی تھیں۔ ایسا کرنے کے بجائے برٹش سرکار نے دونوں ہی پارٹیوں کو دفاعی اور فوجی امور میں انگلینڈ کے ساتھ لانے کی کوشش کی۔ انگلینڈ برصغیر ہندوستان میں دو ڈومینیں (Dominions) بنانا چاہتا تھا جو کامن ویلتھ (Common Wealth) کے دفاعی کام میں اس کی مدد کرتے مگر دشواری یہی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کا قیام کس طرح ممکن ہو؟

ماونٹ بیٹن کے فارمولا کا مقصد ہندوستان کی تقسیم تو تھا مگر اس کو زیادہ سے زیادہ متحد بنائے رکھنا بھی تھا۔ ملک کے بٹوارے کے ساتھ ساتھ پنجاب اور بنگال کا بھی بٹوارہ کیا جائے جس سے جو پاکستان وجود میں آئے وہ کچھ حد تک کانگریس اور لیگ کے دعوؤں کو پورا کرے۔ لیگ کا دعویٰ اس حد تک تسلیم کیا گیا کہ پاکستان بنایا جائے گا اور کانگریس کی منشا کا اس حد تک پاس ولحاظ رکھا گیا کہ جتنا بھی ممکن ہو پاکستان چھوٹا بنایا جائے گا۔ کانگریس سے کہا گیا کہ چونکہ اس کی خاص خاص باتیں یعنی متحدہ ہندوستان بنا رہنا مان لیا گیا ہے، اس لیے اس کی دیگر باتیں خود بخود تسلیم کرلی جائیں گی، چاہے دیسی ریاستوں کی آزادی نامنظور کرنے کی بات ہو یا بنگال یا حیدرآباد کو ہندوستان کے بجائے پاکستان میں شامل کرنے کا مسئلہ ہو۔ ماونٹ بیٹن نے ان معاملوں میں کانگریس کی حمایت کی۔ انھوں نے شہنشاہ کی سرکار کو راضی کرلیا کہ اگر ہندوستان کو کامن ویلتھ میں بنا رہنا ہو، تو کانگریس کی خیر خواہی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

ماونٹ بیٹن پلان جو 3/جون 1947 پلان کے نام سے بھی مشہور ہے اس میں وائسرائے ماونٹ بیٹن نے دو جانشین ریاستوں (Successor States) ہندوستان اور

پاکستان کو ڈومینین کا درجہ دے کر اقتدار کو جلد از جلد منتقل کرنے کی بات رکھی تھی۔کانگریس اس سے متفق تھی مگر تھوڑی مدت کے لیے ہی ایسا کیا جانا اس کو منظور تھا۔وجہ یہ تھی کہ اس کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ فوری طور سے اقتدار میں آگئی اور اس تبدیلی کے نتیجہ میں ملک میں جو اتھل پتھل پیدا ہوگئی،تو اس پر قابو پانا اس کے لیے دشوار ہوگا۔اس وقت ملکی حالات بڑے خراب تھے۔نہرو کے لفظوں میں ''سڑکوں پر قتل کا سایہ منڈلا رہا ہے۔انفرادی اور مجموعی طور سے لوگوں کے ذریعہ ناقابلِ بیان خونریزی کی جاری ہے''۔16 اس کے علاوہ ڈومینین اسٹیٹ بننا ملکی نظام کو ٹھیک درست کرنے کا تھوڑا موقع فراہم کرتا تھا۔اس طرح برٹش افسران اور سول سروس کے حکام تھوڑے عرصہ تک ملک میں بنے رہتے۔اس وقفہ میں ہندستانی افسروں کو نئے حالات میں خود کو ڈھالنے اور ٹھیک کرنے میں بڑی آسانی ہوتی۔اور ایسے حالات انگلینڈ کے لیے بھی تسلی بخش ہوتے۔تھوڑی مدت کے لیے ہی سہی اس طرح ہندوستان کامن ویلتھ کا ممبر بنا رہتا اور یہ ایسا تحفہ تھا جس کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا تھا۔یوں جناح نے بھی پاکستان کو کامن ویلتھ میں رکھنے کی تجویز پیش کی تھی مگر ہندوستان کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دی جا رہی تھی کیونکہ انگلینڈ کی نگاہ میں ہندوستان کی دفاعی اور مالی قوت پاکستان سے زیادہ تھی۔اس کو یہاں تجارت کرنے اور پونجی لگانے کے بہتر مواقع مل سکتے تھے۔

برٹش حکومت کے ذریعہ اقتدار منتقلی کی تاریخ 15 راگست 1947 جلدی اس لیے رکھی گئی تھی کیونکہ اس کی لالچ میں کانگریس کو راضی کیا جا سکتا تھا کہ ہندوستان برٹش ڈومینین بن جائے۔دوسری وجہ یہ تھی کہ ملک میں فرقہ وارانہ حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے جس کی ذمہ داری سے برٹش حکومت بچ بھی سکتی تھی۔کچھ برٹش افسران چاہتے تھے کہ ہندستانی اپنے کیے کا مزہ چکھ لیں۔اس لیے وہ یہاں سے چلے جانے میں جلدی مچائے ہوئے تھے۔وہ بے حد خوشی سے اپنا بوریہ بستر سمیٹ رہے تھے۔پٹیل نے وائسرائے کو لکھا کہ ''حالات اس قدر خراب ہیں کہ نہ تو آپ ٹھیک سے انتظام کر رہے ہیں اور نہ ہم کو کرنے دیتے ہیں''۔17 ماؤنٹ بیٹن نے 15 اگست 1947 کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ کہا کہ جب انھوں نے ہندوستان چھوڑا تھا، اگر اس وقت نہ چھوڑا ہوتا،تو حالات ان کے سامنے ہی دھماکہ خیز ہو گئے ہوتے۔وائسرائے

کے چیف آف اسٹاف اسمے (Ismay) نے یہ محسوس کیا کہ اگست 1947 کا تعین بہت جلد کے بجائے بہت تاخیر سے ہوا تھا۔ انگریزوں کی نگاہ میں ہندوستان چھوڑنے میں جلدی کرنا شاید سب سے زیادہ عقلمندی کا کام تھا۔ اس طرح ہندوستان جلدی چھوڑ دینا وائسرائے اور ان کے چیف آف اسٹاف دونوں کے نزدیک ناگزیر ہوگیا تھا۔ سرکار کی قوت حکمرانی میں مسلسل گراوٹ آرہی تھی۔ اس لیے اس کو خدشہ اس بات کا تھا کہ کہیں ایسے حالات نہ پیدا ہوجائیں جن پر قابو پانے کی ذمہ داری تو ہو اس کی مگر نبھانے کی طاقت اس میں نہ رہے، تب کیا حشر ہوگا؟ تھوڑی مدت کے لیے ہی سہی، حکومت حالات پر قابو پاسکتی تھی مگر کانگریس صدر کرپلانی کے کہنے کے باوجود اس نے کوئی توجہ نہیں دی[18] ذمہ داری سے راہِ فرار اختیار کرنے کے بجائے حکمرانوں کو حالات پر قابو پانا چاہیے تھا۔

ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرنا بے انتہا تکلیف دہ واقعہ ثابت ہوا اور جس تیزی سے یہ سب کیا گیا اس نے حالات کو بد سے بدتر بنادیا۔ 3/جون اور 15/اگست کے درمیان صرف بہتر دنوں کا وقفہ ہوتا ہے اور اسی قلیل وقفہ میں سارے ہی کام کیے گئے اقتدار کی منتقلی ہوئی اور ملک کا بٹوارہ۔ دونوں ہی کام تباہ کن ثابت ہوئے۔ گورنر پنجاب جنکنس (Jenkins) اور کمانڈر ان۔ چیف آکن لیک (Auchinleck) جیسے سینئر حکمراں محسوس کرتے تھے کہ ملک کی پرامن تقسیم کے لیے کم از کم کچھ سال تو درکار ہی تھے۔ بٹوارہ کے وجود میں آتے ہی پارٹیشن کونسل (Partition Council) کو ملک کی تمام تر جائدادیں ٹائپ رائٹر سے لے کر چھاپہ خانوں تک، کچھ ہی ہفتوں میں دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم کرنی تھی۔ بہرحال حکومت منتقلی (Transition Period) کے دوران پیدا ہوئے بے حد پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کے لیے سرے سے کوئی تنظیمی ڈھانچہ نہیں تھا۔ ماونٹ بیٹن نے تو یہ امید کی تھی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ گورنر جنرل ہوجائیں گے اور ان دونوں ملکوں کے درمیان واسطہ کا کام کریں گے۔ مگر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ جناح بذاتِ خود یہی حیثیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشترکہ دفاعی مشینری جو حالات پر قابو پانے کے لیے قائم کی گئی تھی وہ ستمبر 1947 تک ناکام ہوگئی۔ کشمیر کا جھگڑا سلجھنے کے بجائے اور الجھ گیا۔ اب تو وہ فوجی تصادم کا اکھاڑہ ہی بن گیا تھا۔

ملک کے بٹوارہ کے بعد پنجاب میں ہوئی خونریزی ماونٹ بیٹن پر بدنما داغ ہے۔ اس

کے لیے وہی پوری طرح قصور وار تھا۔ اس کے وفا شعار معاون اسمے (Ismay) نے 16/ ستمبر 1947 کو بذریعہ خط اپنی بیوی کو مطلع کیا کہ ''ہم اپنے مشن میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے مگر افسوس یہی ہے کہ اس کا خاتمہ مکمل ناکامی اور دہشت سے ہوا''[19] ماؤنٹ بیٹن کے دونوں کام 15/ اگست 1947 کا قبل از وقت تعین اور باؤنڈری کمیشن اوارڈ (Boundary Commission Award) کے اعلان کرنے میں ہوئی دیر نے ملک پر قتل عام کرائی۔ بر گیڈیر برسٹو (Brigadier Bristow) جو پنجاب کا ایک سینئر فوجی افسر تھا کے مطابق اگر ہندوستان کا بٹوارہ ایک آدھ سال کے لیے ٹال دیا جاتا تو پنجاب میں المناک واقعات نہ ہوتے۔ 15/ اگست سے 31/ دسمبر 1947 تک ہندوستان میں تعینات فوج کے کمانڈر۔ان۔ چیف، لوک ہارٹ (Lockhart) نے اسی بات کی یوں تصدیق کی ''اگر سول سروس کے ہر ایک درجہ کا افسر اور فوج کا سارا عملہ یوم آزادی کے پہلے اپنی جگہ نئے ملکوں میں بنا رہتا تو وہاں پر پھیلی عام بدنظمی کو بہتر طریقہ سے روکا جا سکتا تھا''[20] باؤنڈری کمیشن اوارڈ 12/ اگست تک تیار کر لیا گیا تھا مگر اس کی مشتہری یوم آزادی کے بعد صرف اس لیے کی گئی تا کہ انگریزوں کو اس کے لیے ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ یوم آزادی پر بنگال اور پنجاب میں بہت تعجب خیز نظارے دکھائی پڑے۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان گاؤں میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے جھنڈے لہرائے گئے۔ وہاں کے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ وہ صحیح سرحد پر ہیں مگر آزادی کی اگلی صبح انھوں نے اپنے ہی گھروں میں خود کو انتظامیہ کی مہربانی سے بدیسی اور بیگانہ پایا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر کانگریس نے کیوں اور کیسے بٹوارہ تسلیم کر لیا؟ مسلم لیگ اپنا حق پانے کے لیے اپنے دعویٰ پر قائم رہی اور شائی لاکی (Shylockian) حق یعنی ایک پونڈ انسانی گوشت پا بھی گئی اور برٹش سرکار اپنے ذریعہ بنے جال میں اس طرح پھنس گئی کہ اس کو مطالبہ منظور کرنا پڑا۔ یہ معاملے تو سمجھ میں آتے ہیں مگر وہ کانگریس جو ایک قومی عقیدہ کی علمبردار تھی، کیسے تقسیم ملک کے لیے راضی ہو گئی؟ بہت کٹھن سوال ہے۔ آخر کیا بات تھی کہ نہرو اور پٹیل نے 3/ جون پلان (Third June Plan) کی پرزور وکالت کی تھی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس کے حق میں قرارداد (Resolution) بھی پاس کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ گاندھی جی نے چپ چاپ بٹوارہ کیوں مان لیا؟ عام

طور سے لوگ یہی مانتے ہیں کہ نہرو اور پٹیل نے بٹوارہ اس لیے منظور کرلیا کیونکہ جلدی اور آسانی سے اقتدار حاصل کرنے کی لالچ ان کو ستائے ہوئے تھی۔ اسی لالچ کے تحت انھوں نے قوم کے ساتھ بے وفائی کی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے گاندھی جی کی صلاح کو بھی نظر انداز کردیا تھا۔ گاندھی جی اپنے چیلوں کی بے وفائی سے اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ مرنے کی تمنا کرنے لگے۔ پھر بھی بڑی دلیری سے اپنے دم پر انھوں نے فرقہ وارانہ پاگل پن کا مقابلہ کیا۔ اسی لیے ماؤنٹ بیٹن نے ان کو ''اون مین باونڈری فورس'' (A One Man Boundary Force) (واحد شخص کی باونڈری فوج) کہتا تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی بھلا دی جاتی ہے کہ نہرو، پٹیل اور گاندھی جی کے سامنے بٹوارہ کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا۔ چونکہ کانگریس، مسلم عوام کو تحریک میں نہیں کھینچ سکی اور مسلم فرقہ واریت کے سیلاب کو خصوصاً 1937 کے بعد روک پانے میں ناکام رہی، اس لیے اب اس کے پاس چارہ ہی کیا تھا؟ کانگریس کی ناکامی 1946 کے انتخابات میں بالکل عیاں ہوگئی تھی۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو نوے فیصد مسلم سیٹیں ملی تھیں۔ یوں تو جناح کے خلاف کانگریس اپنی جنگ 1946 میں ہی ہار چکی تھی لیکن اب جب کلکتہ اور راولپنڈی کی سڑکوں پر اور نوا کھائی اور بہار کے گاؤں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بری طرح بھڑک اٹھی تو اس نے اپنی ہار تسلیم بھی کرلی۔ جون 1947 تک کانگریس لیڈران محسوس کرنے لگے کہ اقتدار کی فوری منتقلی سے ہی فرقہ وارانہ پاگل پن کو روکا جا سکتا ہے۔ عبوری سرکار (Intrim Government.) کی ناکامی نے بھی پاکستان کو اٹل حقیقت بنادیا۔ 14/جون 1947 کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں پٹیل نے کہا کہ ہم کو یہ سچائی ماننی پڑے گی کہ عبوری سرکار میں پنجاب اور بنگال میں پاکستان کا قیام ہو چکا ہے اور اس نے کام کرنا شروع کردیا ہے'' نہرو یہ دیکھ کر حیران تھے کہ انٹرم گورنمنٹ جنگ کا اکھاڑہ ہے۔ وزرا آپس میں تو تو میں میں کرتے ہیں۔ کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لیے الگ الگ بیٹھکیں کرتے ہیں اور لیاقت علی خان جن کے پاس وزارت مالیہ (Finance) کا محکمہ ہے، دوسرے محکموں کے کام کاج میں روکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ گورنر لیگ کا ساتھ دے رہے تھے اور اینٹرم سرکار اتنی مفلوج تھی کہ وہ گورنر کو ایسا کرنے سے روک نہیں پارہی تھی۔ بنگال میں صوبائی سرکار دور کی تماشائی تھی بلکہ کہیں کہیں وہ خود فساد میں ملوث تھی۔ نہرو

سوچتے تھے کہ جب اس طرح لوگوں کا قتل ہو رہا ہے اور انٹرم سرکار فسادات پر قابو نہیں پا رہی ہے تو پھر حکومت میں وہ بنی رہے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اقتدار کی منتقلی سے کم سے کم اتنا تو ہوگا ہی کہ ایک ایسی سرکار وجود میں آئے گی جو حالات پر قابو پا سکے۔

دو ڈومینین ریاستوں کو فوری طور سے اقتدار منتقل کرنے کے منصوبہ کو تسلیم کرنے کی ایک اور وجہ تھی۔ ایسا کرنے سے ہندوستان کے اور ٹکڑے ہونے کا خطرہ ختم ہو جاتا کیونکہ اس کے تحت ریاستوں کو الگ الگ آزادی دینے کی بات نہیں تھی۔ بعد میں یہی ہوا بھی۔ آزاد بنے رہنے کی تمام تر منشا کے باوجود دیسی ریاستوں کو اس یا اس ملک میں خوشامد یا جبر سے شامل ہونا پڑا۔ یہ کانگریس کا معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ یہ ریاستیں اگر اپنا آزاد وجود برقرار رکھتیں، تو ہندوستان کی سالمیت کے لیے وہ پاکستان سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتیں۔

مسلم لیگ متواتر ایک مختار کل (Sovereign) مسلم ملک کا مطالبہ کرتی آ رہی تھی۔ اس طرح 1947 میں کانگریس کے ذریعہ بٹوارہ کو تسلیم کرنا مسلم لیگ کی انتہا پسند کوششوں کی بتدریج مرحلوں کا آخری دور تھا۔ 1942 کے کرپس مشن کے وقت سے ہی مسلم اکثریتی صوبوں کی خودمختاری تسلیم کرلی گئی تھی۔ گاندھی جی ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ جناح سے ہوئی اپنی بات چیت میں انھوں نے مسلم اکثریتی صوبوں کو خود سے فیصلہ کرنے کا اختیار بھی منظور کرلیا۔ مسلم اکثریتی صوبوں (جن کو کیبنٹ مشن میں گروپ بی (B) اور سی (C) میں رکھا گیا تھا) اپنا الگ دستور ساز اسمبلی بنا سکتے تھے حالانکہ اس میں لازمی گروپنگ کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ شمال مغرب سرحدی صوبہ (NWFP) کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ چاہے تو اپنے گروپ میں شامل نہ ہو، لیکن سال گذرتے گذرتے نہرو نے یہ کہا کہ گروپنگ کے لازمی یا اختیاری ہونے کا فیصلہ فیڈرل کورٹ (Federal Court) کرے گی۔ پھر جب دسمبر 1946 میں برٹش کابینہ نے خلاصہ کیا کہ گروپنگ لازمی ہے، تو کانگریس نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ باضابطہ طور پر کانگریس نے بٹوارہ کی بات مارچ 1947 میں مان لی جب کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ذریعہ یہ قرارداد پاس کیا گیا کہ اگر ملک کا بٹوارہ ہوتا ہے تو پنجاب (اور اسی میں بنگال بھی مراد تھا) کا بٹوارہ ہونا چاہیے۔ لیگ کا مطالبہ جون 1947 میں ہی تسلیم کرلیا گیا تھا جب کانگریس نے 3 رجون پلان کے تحت ملک کا بٹوارہ مان لیا تھا۔

کانگریس لیڈر بہادری کی بڑی بڑی باتیں کرتے تھے مگر المیہ یہ تھا کہ ڈھیرے

دھیرے دھیرے وہ اپنے اصول سے ہٹتے بھی جا رہے تھے۔ کانگریس دستور ساز اسمبلی کے کلی اختیار (Sovereignty) پر زور دے رہی تھی مگر اس نے خاموشی سے لازمی گروپنگ کو تسلیم کر لیا تھا۔ مشرق مغرب سرحدی صوبہ (NWFP) کو پاکستان کا حصہ مان لیا تھا۔ کانگریس کے زیادہ تر لیڈر بٹوارے کے لیے صرف اس لیے تیار ہو گئے تھے کیونکہ ملک میں ہو رہے فرقہ وارانہ فسادات پر وہ قابو نہیں پا رہے تھے۔ پھر تشدد کے سامنے نہ جھکنے کی بات بھی دوہرائی جا رہی تھی۔ 22 اگست 1946 کو نہرو نے واویل کو لکھا کہ ''ہم کو خونریزی مطلق نہیں پسند ہے اور نہ اس کو ملک کی پالیسی طے کرنے کی اجازت ہی دیں گے''[21]

دراصل کانگریس لیڈروں کی ان باتوں سے حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ شاید کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ حالات اس قدر اور اتنی تیزی سے بگڑ جائیں گے۔ کوئی یہ بات بھی ماننے کے لیے نہیں تیار تھا کہ ان المناک حالات کو موڑا نہیں جا سکتا تھا۔ بٹوارے کا اعلان ہونے کے بعد بھی دونوں ملکوں کی سرحدوں پر بسے لاکھوں لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ آبادی کی ادلا بدلی میں اتنی افراتفری ہونے کی یہی وجہ ہے۔ کانگریس خواب غفلت میں ڈوبی تھی خصوصاً نہرو کو فرقہ وارانہ پاگل پن کی شدت کا صحیح اندازہ لگانے میں چوک ہو گئی تھی۔ الگ ہونے کے حق کو کانگریس نے خوش فہمی میں مان لیا تھا کہ ''مسلمان اس پر عمل نہیں کریں گے بلکہ اپنے غم کو دور کرنے کے لیے اس حق کا استعمال کریں گے''[22] کانگریس لیڈران یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ 1940 کی دہائی میں جو فرقہ واریت رونما ہوئی ہے وہ 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں ہوئی فرقہ واریت سے بالکل مختلف ہے۔ 1940 کی دہائی میں مسلمانوں کے ذرکو جم کر بری طرح ہوا دی جا رہی تھی جبکہ اسی دوران ان کا ایک ضدی لیڈران کے لیے الگ سے ایک مسلم ملک کو کسی بھی طرح وجود میں لانے کے لیے بڑی مضبوطی سے اٹل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس رعایتیں دیتی گئی اور فرقہ وارانہ طاقتیں کمزور پڑنے کے بجائے مضبوط ہوتی گئیں۔ مسلم لیگ کی کامیابی سے متاثر ہو کر زیادہ سے زیادہ مسلمان اس کی سایہ عافیت میں آنے لگے۔ جناح نے جب دیکھا کہ کانگریس جھک رہی ہے تو انھوں نے اپنا مطالبہ اور تیز کیا۔ ایسے حالات میں دوسری طرف ہندو فرقہ واریت بھی خوب پروان چڑھی۔ بہت بڑھ چڑھ کر اس نے دعویٰ کیا کہ وہ ہندو مفاد کی محافظ ہے جس کو کانگریس مسلسل قومی اتحاد کے

نام پر قربان کرتی آ رہی ہے۔ ہندو فرقہ واریت کو پھولنے پھلنے میں اس سے بڑی تقویت ملی۔

کانگریس کو ایک اور جھوٹی امید تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد آزاد ہندوستان کی تعمیر ہوگی۔ اسی خیال کے تحت فرقہ واریت کی شدت کا اندازہ بہت کم کر کے لگایا گیا تھا۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اب فرقہ واریت انگریزوں کے سہارے نہیں ہے۔ وہ اب ان کی بیسا کھی چھوڑ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔ اب تو وہ اپنے سابق برٹش کرم فرماؤں کو بھی خاطر میں نہیں لا رہی ہے۔ اس کے علاوہ بٹوارے کو عارضی بھی تصور کیا جا رہا تھا اور سوچا جا رہا تھا کہ ہندو مسلم دونوں کی گندی ذہنیت کی وجہ سے بروقت بٹوارہ ہوا ہے، مگر فرقہ واریت کا جنون اترتے ہی اور سمجھداری واپس ہوتے ہی ہندوستان اور پاکستان پھر ایک ہو جائیں گے۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ اگر لوگوں نے بٹوارے کو دل سے نہیں قبول کیا ہے تو پاکستان بہت دنوں تک نہیں بنا رہے گا۔ نہرو نے کری اپا (Cariappa) کو لکھا کہ ''مجھے پورا یقین ہے کہ ایک دن بالآخر ہندوستان متحد اور مضبوط بنے گا۔ سورج کی روشنی میں جگمگاتی ہوئی پہاڑ کی چوٹیوں پر پہنچنے کے لیے ہم کو اکثر تاریک گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے''۔23

جو بھی ہوا اگر اس کے تناظر میں دیکھا جائے تو سب سے زیادہ غیر حقیقی امید یہی تھی کہ بٹوارہ پرامن ماحول میں ہوگا۔ نہ تو فسادات کا تصور کیا گیا اور نہ کثیر تعداد میں لوگوں کی منتقلی کا باقاعدہ منصوبہ اور نظم بنایا گیا تھا۔ بس یہی خیال تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد آپس میں لڑنے کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔ نہرو کو ہمیشہ کی طرح ہندوستانیوں کی نیک طینت اور اچھائی پر بھروسہ تھا۔ اگرچہ اگست 1946 سے مسلسل فسادات ہو رہے تھے مگر امید یہی کی جا رہی تھی کہ بٹوارے کا آپریشن ہوتے ہی سارا پاگل پن دور ہو جائے گا، مگر بیمار جسم اتنا لاغر ہو گیا تھا اور آپریشن کے اوزار اتنے جراثیم آلود تھے کہ جراحی کا کام بے حد خراب اور تکلیف دہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ بٹوارے کے پہلے حالات جتنے بھیانک تھے، بٹوارے کے بعد اس سے زیادہ بھیانک ہو گئے۔

گاندھی جی پر ان سب کا کیا اثر پڑا؟ ان کی کیا کیفیت ہوئی؟ ان کی مایوسی اور بے بسی کا ذکر اکثر کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے وہ عدم حرکت کا شکار ہو گئے تھے۔ کانگریس کی فیصلہ لینے والی کونسلوں میں ان کی کوئی آواز نہیں رہ گئی تھی۔ اب ان میں اپنے چیلوں نہرو اور پٹیل کی اس بنا پر تنقید کرنے کی جرأت نہیں بچی تھی کہ اقتدار کی ہوس میں ان لوگوں نے سپر ڈال دیے تھے۔ یہ وہی

لوگ تھے جو برسوں سے ان کے ہر ایک فعل اور قول کی بڑی سعادت مندی سے تقلید کرتے آ رہے تھے اور ملک کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دی تھیں 24

ہمارے خیال سے گاندھی جی کی مایوسی نہ تو جناح کی ضد کی وجہ سے تھی اور نہ اپنے چیلوں کے اقتدار کی ہوس سے۔ دراصل وہ اپنے ہی لوگوں کے فرقہ پرست ہوجانے سے لاچار ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی 4/جون 1947 کی پراتھنا سبھا میں کہا تھا ''کانگریس نے بٹوارہ اس لیے تسلیم کرلیا کیونکہ لوگ یہی چاہتے تھے۔ یہ مطالبہ اس لیے منظور کرلیا گیا کیونکہ آپ کی یہی خواہش تھی۔ کانگریس نے اس کا مطالبہ کبھی نہیں کیا۔ اس میں عوام کی منشا جاننے کی صلاحیت تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہندوؤں اور خالصہ کی یہی چاہت و آرزو ہے 25 بٹوارے کے بارے میں ہندوؤں اور سکھوں کی خواہش نے ان کو نکمہ، اندھا اور معذور بنادیا۔ مسلمانوں نے پہلے ہی ان کو اپنا دشمن مان لیا تھا۔ اور عوامی لیڈر کی اس وقت کیا اہمیت رہ جاتی ہے جب عوام ہی اس کی باتیں ماننے سے انکار کردے؟ مگر فرقہ پرستوں کے خلاف جہاد وہ فرقہ پرستوں کی مدد سے چھیڑتے، تو ان کی بات کون سنتا؟ اس سے پہلے گاندھی جی کانگریس لیڈروں کی صلاح ٹھکرا سکتے تھے۔ 1942 میں انھوں نے یہی کہا تھا۔ اس وقت وہ یہی کہتے تھے کہ جدوجہد کا مناسب وقت یہی ہے، لیکن اب وہ مجبور تھے۔ موافق حالات پیدا کرنا اب ان کے بس میں نہیں تھا۔ این۔کے۔بوس (N.K.Bose) نے بڑی ایمانداری سے ان سے اس کے لیے گذارش کی تھی مگر انھوں نے اپنی لاچاری ظاہر کی۔ انھوں نے ان کو بتایا کہ ان دنوں لوگوں کے دلوں میں ہورہی ہلچل فطری طور سے ان کے علم میں آجاتی تھی۔ پھر وہ اسی جذبہ کو ترتیب دے کر کام شروع کردیتے تھے۔ مگر 1947 میں ساری کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ نیک قوتیں ناپید ہوگئیں تھیں۔ اس لیے اب وہ مفید پروگرام بنانے میں مجبور تھے۔ انھیں کے لفظوں میں ''آج مجھے نیک جذبات کے آثار کہیں نظر نہیں آتے۔ اس لیے ایسا کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے'' 26 لیکن قبل اس کے کہ کوئی اندھا آدمی بالکل اکیلے تاریکی میں ٹٹولتے ہوئے روشنی تک پہنچے، سیاسی حالات اس کا انتظار نہیں کرتے۔ ماؤنٹ بیٹن پلان ان کا پیچھا کررہا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ فسادوں کے ذریعہ کیے گئے گہرے زخموں اور ہنگامی سرکار کی نااہلی کی وجہ سے بٹوارہ ضروری ہوگیا ہے۔ اس لیے 14/جون 1947 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک میں وہ بڑی دلیری سے گئے اور انھوں نے کانگریسیوں کو بٹوارہ بروقت تسلیم کرنے کے لیے کہا نیز انھوں نے ان کو

یہ بھی صلاح دی کہ وہ اس کو صدق دل سے نہ قبول کریں اور اس کو منسوخ کرنے کے لیے برابر جدوجہد کرتے رہیں۔ گاندھی جی نے بذاتِ خود بٹوارہ کو دل سے قبول نہیں کیا۔ نہرو کی طرح وہ بھی ہندوستانیوں کی بھلمنساہت پر بھروسہ کرتے رہے۔ انھوں نے اکیلا اکیلے چلنے کا فیصلہ کیا۔ نواکھائی کے گاؤں میں اکیلے ننگے پیر گھومتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کا ڈھارس بندھایا۔ خوشامد کر کے اور برت کی دھمکی دے کر انھوں نے فسادات کو روکنے کی کوشش کی۔ ان کا محبوب گیت یہی تھا ''اگر تمھارے ساتھ کوئی نہیں آتا تو اکیلے چلو' اور انھوں نے یہی کر کے دکھایا۔

15 راگست 1947 کی حسین صبح آزادی اور بٹوارہ کو اپنی شعاعوں میں لے کر نمودار ہوئی۔ پہلے ہی کی طرح گاندھی اور نہرو ہندستانی عوام کے جذبات کی عکاسی کر رہے تھے۔ کلکتہ میں ہو رہے کشت وخون کے خاتمہ کے لیے گاندھی جی محوِ عبادت تھے۔ ان کی سب سے قریبی پیرو مردلا سارابھائی بمبئی کے ایک کمرہ میں بیٹھی ہوئی ایک پندرہ سالہ بے خانماں مغویہ لڑکی کو تسلی دے رہی تھیں۔ گاندھی جی کی پرارتھنائیں اندھیرے میں ہو رہی خونریزی، عصمت دری اور عوام کی درد بھری کہانی کہہ رہی تھیں جبکہ نہرو کی نگاہیں افق پر ابھر رہی روشنی پر ٹکی تھیں۔ نئے ہندوستان کا جنم ہو رہا تھا' نصف شب میں بارہ کا گھنٹہ بجے گا اور جب ساری دنیا سوئی ہوئی ہوگی، تب ہندوستان جگے گا اور روشنی وآزادی حاصل کرے گا''۔ نہرو کے شاعرانہ لفظوں میں ''برسوں پہلے ہم نے قسمت کے ساتھ ایک عہد کیا تھا۔ لوگوں کو یاد دلایا کہ ان کی غصہ سے بھری گھبراہٹ ہی واحد سچائی نہیں تھی۔ اس سے بھی بڑی سچائی وہ تھی جس کو بڑی مشقت سے لڑ کر جیتا گیا، جس میں متعدد لوگ شہید ہوئے۔ انگنت لوگوں نے اس دن کا تصور کر کے قربانیاں دیں کہ ایک دن ہندوستان آزاد ہوگا۔ وہ دن آج آ گیا۔ 15 راگست کو لوگوں نے اس کو دیکھ لیا''۔ بٹوارہ کی وجہ سے لوگ بے حد افسردہ خاطر تھے پھر بھی سڑکوں پر خوشی سے ناچنے لگے اور مستی میں جھوم اٹھے۔

باب۔38

قومی تحریک کی طویل المیعاد حکمت عملی

قومی تحریک کی لمبی مدت تک چلنے والی جدوجہد کا بنیادی پہلو اس کے ذریعہ اپنائی گئی حکمت عملی تھی جو اس نے کلونیل حکومت کے خلاف جنگ کرنے میں استعمال کی تھی۔ کسی قوم کی جدوجہد کرنے کی صلاحیت اور استعداد کا انحصار صرف اس بات پر نہیں ہوتا کہ اس کو حکمرانوں کے ذریعہ ہو رہے استحصال کی پوری جانکاری ہے بلکہ اس کا انحصار تو اس حکمت عملی اور تدبیر پر ہوتا ہے جن کا استعمال وہ جدوجہد کرنے کے لیے کرتی ہے۔

اس موضوع پر جو بھی تحریری مواد موجود ہے اس میں قومی تحریک کے ذریعہ اپنائی گئی حکمت عملی کا کوئی ذکر اور حوالہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی تحریک مختلف طرح کی کوششوں کا بے جوڑ مجموعہ معلوم پڑتی ہے۔ جہاں تک گاندھیائی دور کی بات ہے اہنسا جیسا اصول اور جدوجہد کے مختلف طریقوں جیسے ستیہ گرہ اور دھرنا وغیرہ کا ذکر تو کیا جاتا ہے، لیکن قومی تحریک کی مکمل حکمت عملی کا ذکر سرے سے خالی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قومی تحریک کی خصلت کے بارے میں قومی

لیڈروں کا باقاعدہ کوئی اصولی نظریہ ویسا نہیں تھا جیسا ہم کو چینی اور روسی انقلابوں میں دکھائی پڑتا ہے۔ ہمارے قومی لیڈروں کا خیال تو باضابطہ طور سے کوئی اصول مرتب کرنے کی طرف گیا اور نہ انھوں نے اپنی سیاسی حکمت عملی کو واضح طریقے سے قلم بند ہی کیا۔ دراصل جدوجہد کے مختلف ادوار مثلاً آئینی سیاست، اصلاحی اور تعمیری کام، سیاسی فیصلے، جدوجہد کے کئی روپ مثلاً اہنسا، ستیہ گرہ وغیرہ کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ان کی تاریخی اہمیت ہی سمجھ میں آسکتی ہے جب تک ان کو بنیادی حکمت عملی کے ضروری اجزا کی حیثیت سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔

قومی حکمت عملی کا ارتقا قومی تحریک کے اعتدال پسند اور شدت پسند رجحانات کی سرگرمیوں کے دوران ہوئی۔ گاندھیائی دور میں اس کا تانا بانا بنا گیا اور اسی دور میں اس پر عمل بھی کیا گیا۔ مورخین اور عمرانیات کے ماہرین نیز اس عہد کے دیگر ناقدین نے بھی گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ بہرحال سچی بات یہ ہے کہ ان کے فلسفۂ زندگی کا لوگوں پر بہت محدود اثر پڑا، البتہ سیاسی لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے لاکھوں لوگوں کو اپنی سیاسی حکمت عملی اور تدبیر سے سیاست میں متحرک اور سرگرم کیا۔

شروع میں ہی اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ قومی حکمت عملی، برٹش حکومت اور کلونیل سلطنت کی اپنی خاص فطرت اور خصلت کے مطابق پروان چڑھی۔ لوگوں کو محکوم بنانے اور ان کا استحصال کرنے کی کلونیل حکومت کی خصلت کو ہمارے قومی لیڈر اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو یہ بھی احساس تھا کہ حکومت کا خاصہ نصف حاکمانہ اور نصف حکمرانہ (Semi-Authoritarian-Hegemonic) ہے۔ انگریزوں کا ہندوستان ہٹلر کے جرمنی، زار کے روس، چیانگ کائی شیک (Chiangkai Shek) کے چین یا بتستا (Batista) کے کیوبا کی طرح نہیں تھا۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے شاید قانونی حکمرانہ (Legal-Authoritarian) کہنا سب سے زیادہ مناسب ہوگا۔

کلونیل حکومت طاقت کے بل پر قائم ہوئی تھی اور اسی پر تادم آخر قائم رہی۔ پرامن تحریک کو دبانے کے لیے اکثر خالص طاقت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے کچھ

سول ادارے بھی قائم کیے تھے مثلاً منتخب اسمبلیاں، لوکل سیلف گورنمنٹ، عدالتیں، اسکول وکالج اور قانون کی حکومت (The Rule of Law) عدم تحریک کے دوران لوگوں کو کچھ سول اختیارات بھی حاصل تھے۔ اس کے علاوہ عوام کی مخالفت کو دبانے کے لیے قانونی کارروائیوں اور ضابطوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس طرح انگریزی حکومت نصف جمہوری اور نصف حاکمانہ تھی۔

کلونیل حکومت نے برسوں کی محنت کے بعد ہندستانی عوام کے دلوں میں دو باتیں اچھی طرح بٹھادی تھیں اور انھیں دونوں باتوں پر اس کا تسلط برقرار تھا۔ پہلی بات یہ تھی کہ انگریزی حکمراں ہندوستانیوں کے خیر خواہ ہیں۔ وہ ان کے ''مائی باپ'' ہیں اور وہ ان کی مالی، معاشرتی اور تمدنی حالت کو سدھار رہے ہیں یا ہندوستان کو موڈرنائز کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق دوسرا تصور یہ تھا کہ وہ غیر مغلوب ہیں۔ اس لیے ان کی مخالفت فضول ہے۔ ہندستانی عوام آپس میں اس قدر بٹی اور کمزور ہے کہ وہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور وہ اس کی ہر کوشش کو جب چاہیں اکارت کردیں گے۔ بس آئینی طریقوں کو اپنا کر ہی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب جب عوام کچھ انگڑائی لیتی تو انگریز حکمراں قدرے آئینی مالی اور دوسری رعایتیں دیتے تھے، وہ صرف جبر ہی نہیں کرتے تھے۔ اس طرح ڈر و لالچ (Carrol and Stick) کے دونوں طریقوں سے وہ کام لیتے تھے۔

برٹش تسلط کے انھیں دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر قومی تحریک کی حکمت عملی کا دھیرے دھیرے ارتقا ہوا۔

قومی تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سیاست پر تسلط قائم کرنے کے لیے ایک لمبی جدوجہد کی جائے یا گرامشی کے لفظوں میں اپنے حالات کو مضبوط کرنے کے لیے مسلسل جنگ چھیڑی جائے۔ سیاسی تسلط قائم کرنے کی جدوجہد سے ہمارا مقصد مردوں اور عورتوں کے دل ودماغ کو متاثر کرنے کے لیے کی جانے والی کاوش ہے جس کے دوران قوم پرستی کے اثرات مختلف ادوار سے گذر کر مختلف ذرائع سے ان پر اچھی طرح مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے حصول کے لیے تحریک باری باری سے قانون پر عمل کر کے اور ان کو توڑ کر کے عوامی جدوجہد کرتی ہے۔ ان دونوں طریقوں کا استعمال اس طرح کیا جاتا ہے کہ عوام میں قومی تحریک کی جڑیں مضبوط

ہوں۔ قومی تحریک کا بنیادی مقصد یہ نہیں تھا کہ عوام کی زندگی میں بتدریج سدھار لایا جائے بلکہ یہ تھا کہ سخت جدو جہد کر کے کالونیائی حکمرانوں سے حکومت چھین لی جائے۔

قومی سیاست تبھی کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی تھی جب تحریک میں عوام کی فعال شرکت ہو۔ اس کے لیے ضروری کام یہ تھا کہ عوام کو سیاسی اعتبار سے بیدار کر کے متحرک کیا جائے۔ انگریزی حکومت کے بنے رہنے کی خاص وجہ عوام کی خصوصاً دیہی عوام کی عدم حرکت اور بے حسی تھی۔ انگریز حکمرانوں نے بڑے شاطرانہ طریقے سے عوام کے ذہنوں کو سیاسی نقطۂ نظر سے بے حس و حرکت بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھیائی دور کا خاص مقصد ہی عام لوگوں کو سیاسی اعتبار سے بیدار اور متحرک کرنا تھا۔ گاندھی جی بار بار یہی کہتے تھے کہ ''جب لوگوں میں سوراج حاصل کرنے کی قوت آجائے گی، تو وہ ان کو مانگتے ہی مل جائے گی''۔2

قومی تحریک کا دوسرا مقصد زندگی کے ہر ایک گوشہ سے انگریزی دبدبہ اور اس کے متعلق بنے باطل نظریہ کو دھیرے دھیرے ہٹانا تھا۔ چونکہ برٹش حکومت کا انحصار صرف طاقت پر نہ رہ کر نظریہ اور عقیدہ پر بھی تھا، اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس عقیدہ کو متزلزل کیا جائے اور اس کی دھجیاں بکھیری جائیں تا کہ اس کی جگہ قومی جذبات لوگوں کے دل و دماغ میں جگہ پاسکیں۔ برٹش حکومت کا خاص مقصد یہی تھا کہ ہندوستانیوں کے اصل دشمن یعنی خود پر پردہ ڈالے رکھا جائے اور یہ سچائی نہ اجاگر ہونے دی جائے کہ حکومت اور ہندوستانیوں کے مفادات میں کوئی تضاد ہے۔ اس کے برعکس یہ ڈھنڈھورا پیٹا جائے کہ دونوں کے مفادات ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ایسے حالات میں قومی تحریک اپنا نظریاتی تسلط تبھی قائم کرسکتی تھی جب اصل حقیقت سے عوام کو واقف کیا جاتا۔ اس طرح نظریاتی۔ سیاسی (Ideological and Political) نہج پر جنگ کرنا قومی حکمت عملی کا سب سے اہم پہلو تھا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم ترین کام یہ تھا کہ لوگوں کے ذہن سے اس خیال کو دور کیا جائے کہ انگریزی سرکار ہندوستانیوں کی خیر خواہ ہے اور یہ کہ وہ غیر مغلوب ہے یعنی اس پر فتح پانا ناممکن ہے۔ خیر خواہ ہونے کے اس تصور کو مٹانے کے لیے دادا بھائی نوروجی،

جسٹس رانا ڈے، آر۔ سی۔ دت اور دوسرے اعتدال پسند لیڈروں نے لوگوں کی ذہنی صفائی کرنے اوران کو بیدار کرنے کا کام بڑی سمجھداری سے شروع کیا۔ یہی کام شدت پسند لیڈروں کے ذریعہ سماج کے نچلے متوسط طبقہ میں کیا گیا۔ انگریزی حکومت کے بارے میں دوسرا تصور کہ وہ غیر مغلوب ہے کو بری طرح چیلنج کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں شائع ہونے والے بیباک اخباروں نے، قانون ساز کونسلوں میں فیروز شاہ مہتا، اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے لیڈروں کی بے لاگ تقریروں نے اور لوک مانیہ تلک، اربندو گھوش اور دوسرے شدت پسند لیڈروں کے جرأت بھرے پروپگنڈوں نے اور انقلابی دہشت پسند لوگوں کے بے خوف کاموں نے انگریزوں کے غیر مغلوب ہونے کے تصور کو زبردست چنوتی دی۔ اور یہی کام ہندستانی عوام میں 1918 کے بعد کے دور میں سول نافرمانی تحریکوں کے زمانے میں کیا گیا۔ ان تحریکوں نے لوگوں کو بے حد غذر اور باہمت بنایا، ان میں جدوجہد کرنے اور قربانی دینے کا حوصلہ پیدا کیا اوران کو یقین دلایا کہ کسی بھی ملک پر وہاں کے لوگوں کی مرضی کے بغیر حکومت نہیں چلائی جاسکتی۔

کانگریس کی حکمت عملی کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ کلونیل حکومت کے انتظامی ڈھانچا کے کل پرزوں یعنی سول نوکریوں پولیس اور فوج کو ان کے انگریز آقاؤں سے بیزار کر کے یا کم از کم ان کی وفاداری کو کمزور کر کے قومی کاز (Cause) کے لیے استعمال کیا جائے۔ قومی تحریک اپنے اس عزم میں کافی حد تک کامیاب رہی۔ دھیرے دھیرے پولیس اور جیل افسروں میں توصیفی (Qualitative) تبدیلی پیدا ہوئی۔ ان سب میں قوم پرستی زبردست طریقے سے گھر کرنے لگی۔ یہاں تک کہ 1942 کی تحریک میں سبھی زمرے کے افسروں نے نجی جوکھم اٹھا کر مجاہدین کی پوری مدد کی۔ برٹش حکومت کو ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ صرف اس لیے لینا پڑا کیونکہ 1945 کے بعد پولیس، فوج اور نوکرشاہی میں برٹش آقا کے تئیں وفاداری تقریباً ختم ہو چکی تھی اور انتظامی ڈھانچہ پوری طرح ڈگمگا گیا تھا۔

قومی تحریک نے اول روز سے ہی اس بات کا خیال رکھا تھا کہ برٹش عوام اور رائے عامہ میں کلونیل نظریہ کے غلبہ کو کمزور کیا جائے۔ اس معاملہ میں آخر تک کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔

1890 کی دہائی کے دوران انڈین نیشنل کانگریس کی برٹش کمیٹی نے ولیم ڈگبی (William Digby) ولیم وڈر برن (William Wedderburn) اور دوسرے لوگوں کی مدد سے جو کام شروع کیا گیا وہ انڈیا لیگ (India League) تک بغیر رکے چلتا رہا۔ انڈیا لیگ میں وی۔ کے۔ کرشنا مینن اور فنر براک دے (Fenner Brock Way) نے بڑی سرگری سے کام کیا۔

قومی تحریک کا چوتھا مقصد نصف جمہوری سیاست کی وسعت کو مسلسل دراز کرتے رہنا اور حاصل شدہ نیم جمہوری رعایتوں کو محدود کرنے سے کلونیل حکومت کو باز رکھنا تھا تا کہ قانون کے دائرہ میں رہ کر پرامن سیاسی سرگرمیاں کی جاسکیں نیز اس مقصد کے حصول کے لیے ملک کے غیر کانگریسی لیڈروں اور عوام کی مدد حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کی گئی اور اس سلسلہ میں یہ کوشش بے حد مددگار ثابت ہوئی۔

قومی تحریک کا دوسرا خاص پہلو برٹش تسلط کو ختم کرنے کی طویل المیعاد جدو جہد تھی۔ اس کے تین ادوار تھے جنگ۔ صلح۔ جنگ (Struggle-Truce-Struggle) (S.T.S.) پہلے دور میں قانون سے باہر رہ کر زوردار عوامی تحریک چلائی جاتی تھی اور حکومت سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جاتا تھا۔ حکومت کی طرف سے کچھ رعایتیں حاصل کرنے کے بعد سیدھا مقابلہ ترک کردیا جاتا تھا مگر ان رعایتوں پر اکتفانہ کر کے ان کو ناکافی بتانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ صلح کے پرامن دور میں قانون کے دائرہ میں رہ کر حاصل شدہ سیاسی رعایتوں کا استعمال کر کے تحریکی قوت کو اور زیادہ مضبوط کیا جاتا تھا اور پھر پہلے سے زیادہ زوردار تحریک چلائی جاتی تھی۔ ایس۔ ٹی۔ ایس کی یہ حکمت عملی ''ہندوستان چھوڑو'' نعرہ کے ساتھ، آزادی کے حصول کے لیے اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ اس طرح قومی تحریک کے ہر ایک دور کا استعمال کلونیل حکومت کے تسلط کو ختم کرنے، قومی رضا کاروں کی بھرتی کر کے ان کو سیاسی نہج پر ٹریننگ دینے اور لوگوں میں مجاہدانہ اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے کیا گیا۔

جنگ۔ صلح۔ جنگ کی پوری سیاسی سرگرمی پر پیچ ادوار سے بتدریج گزرتی اور ترقی کرتی ہوئی چوٹی پر پہنچی تھی۔ ہر دور میں یہ بات مدنظر رہتی تھی کہ اقتدار کی منتقلی کے بغیر قومی آزادی کا کام

ادھورا ہے۔ معدودے چند آئینی اختیارات کے حصول کے بعد بھی یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ آزادی حاصل ہوگئی۔ آزادی کو کل شے کی شکل میں تصور کیا جاتا تھا اور جب تک وہ کل کی کل نہ مل جائے، یہی کہا جاتا تھا کہ وہ ملی ہی نہیں۔ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا نظریہ اپنایا جاتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندستانی اپنی تحریک کے اصلاحی کاموں کے دور میں انگریزی حکومت کے ساجھے دار بن جاتے۔ پھر تو قومی تحریک کو حکومت کا حصہ ماننے کی کارروائی شروع ہوجاتی۔ قوم پرست لیڈر ایسے جال میں پھنسنے سے بچتے رہے۔ اس لیے جب عوامی تحریک کا دور نہیں ہوتا تھا تب بھی وہ حکومت مخالف سرگرمی جاری رکھتے تھے۔ اس طرح ان کی تحریک ایک دور سے دوسرے دور میں جاتے ہوئے کلونیل حکومت کا حصہ نہیں بن پاتی تھی، بلکہ اپنی مخالفت جاری رکھتے ہوئے برسرِ جنگ رہتی تھی۔ البتہ جدوجہد کی شکل بدل جاتی تھی۔ قانون سے باہر رہ کر عوامی تحریک کے دور میں قانون شکنی اور سول نافرمانی کی جاتی تھی۔ دوسرے دور میں ایسا کچھ نہیں کیا جاتا تھا مگر عوام میں سیاسی بیداری اور نظریاتی شعور پیدا کرنے کا کام ہوتا تھا۔ قومی لیڈر لمبے لمبے دورے کرتے تھے۔ عوامی جلسے وجلوسوں کا نظم کیا جاتا تھا۔ مزدور، کسان اور طلبا کو متحد کرنے کی زوردار مہم چلائی جاتی تھی۔ یہ سارے کام 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں خاص طور سے کیے گئے اور ان میں بائیں بازو کے لوگوں نے زیادہ تر حصہ لیا۔ اس طرح کے دونوں ادوار میں حکومت مخالف جدوجہد کے مختلف روپ باری باری سے رونما ہوتے رہے۔ گاندھی جی کے لفظوں میں "سول نافرمانی تحریک کے روکنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جنگ رک گئی ہے۔ جنگ تو تبھی رکے گی جب ہندوستان میں خود کا بنا ہوا دستور نافذ ہوگا"[3]

جنگ۔صلح۔جنگ کی حکمت عملی کے بارے میں بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ قومی تحریک میں اس طرح کے ادوار کی ضرورت کیوں پڑی؟ آخر عوام کی عدم تحریک یا مورچہ بندی کے دور میں، گرامشی کے لفظوں میں، قانون سے باہر رہ کر عوامی تحریک یا تحریکی جنگ ناگزیر کیوں ہوئی؟ آخر قومی تحریک نے آزادی کے حصول کے پہلے تک مسلسل جدوجہد کیوں نہیں کی؟ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو کیا آزادی بہت پہلے نہ مل گئی ہوتی؟ گاندھی جی کی قیادت میں قومی تحریک کا انحصار اس مفروضہ پر تھا کہ عوامی تحریک کی خصلت میں یہ داخل ہے کہ اس کو غیر معینہ مدت تک نہیں چلایا

جا سکتا ہے۔ اس پر جلد یا بدیر جزر اور ٹھہراؤ آنا لازمی ہے اس لیے عوامی تحریک کی مدت تھوڑی ہونی چاہیے۔ درمیان میں سانس لینے اور دم بھرنے کا موقع ملنا چاہیے تا کہ اگلے دور کے لیے تحریک کو تازہ دم ہو کر ضروری قوت حاصل کرنے کا وقت مل سکے۔

ایسی حکمت عملی کے پس پشت بات یہ تھی کہ عوام جس کے اوپر تحریک کا پورا دارومدار تھا اس کی قوت عمل لامحدود نہیں ہوتی ہے۔ ایک مدت تک جدوجہد کرنے کے بعد اس میں تکان کا آنا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے ذریعہ کیے جا رہے مظالم مثلاً لاٹھی چارج قید و بند کی تکلیف بھاری جرمانہ، زمین و جائداد و مکان کی ضبطی وغیرہ مصائب کو برداشت کرنے کی قوت ایک حد تک ہوتی ہے۔ قومی قیادت نے لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کر کے حکومت کے ذریعہ ہو رہے مظالم کو برداشت کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ قیادت کو اچھی طرح معلوم تھا کہ عوام میں قوت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے اس پر حد سے زیادہ بار ڈالنا پسند نہیں کیا۔ اس کے علاوہ قومی قیادت کو یہ بھی علم تھا کہ سرکاری مشینری کم سے کم 1945 تک بالکل مضبوط ہی تھی۔ اس کے سول، پولیس اور فوجی افسران اپنے انگریز آقاؤں کے تئیں بالکل وفادار تھے اور اس طرح ان میں قومی تحریک کو کچلنے کی پوری طاقت تھی۔ اس کے علاوہ حکومت نے 33-1932 اور 1942 میں تحریک کو کچلنے کے لیے جو مظالم ڈھائے تھے وہ لوگوں کے سامنے تھے۔

دوا دوار والی تحریک کا انحصار پورے وقت کام کرنے والے سیاسی رضا کاروں کے ''اسپاتی ڈھانچہ'' یا اس کی مستقل فوج پر تھا، مگر خالص اسی سے کام چلنے والا نہیں تھا۔ قوت کا اصل سرچشمہ تو عوام تھی۔ قومی تحریک نے پورے وقت کام کرنے والے ہزاروں کارکن پیدا کیے جنھوں نے حصول آزادی کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ ان کی عمریں یا تو جیلوں میں گزریں یا آشرموں اور کھادی بھنڈاروں یا پھر مزدور یونینوں اور کسان سبھاؤں کے دفتروں کی نذر ہوئیں۔ اگر چہ ان کارکنوں نے عوام کو متحد اور متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا مگر تحریک کو عوامی تعاون سے ہی چلایا جا سکتا تھا۔ اس لیے عوام پر منحصر سیاسی جدوجہد کی حکمت عملی یہی ہو سکتی تھی کہ حکومت سے ٹکرانے والی عوامی تحریک کے بعد نسبتاً پرامن کوشش کا دور آئے۔ اس طرح گاندھیائی حکمت

عملی میں عوام اور حکومت دونوں کے حدود کو ذہن میں رکھ کر جدو جہد کا پروگرام بنایا گیا تھا۔

جنگ۔ صلح۔ جنگ کی حکمت عملی نے، صرف اصول نہ رہ کر، اب تدبیر کی شکل اختیار کر لی۔ کب تحریک چلانا ہے اور کب روکنا ہے، ایک تدبیری عمل بن گیا۔ موجودہ حالات کو مدنظر رکھ کر ہی ایک دور سے دوسرے دور میں پالا بدلا جاتا تھا۔ گاندھی جی کی سیاسی اصول کی دو نادر مثالیں ہم کو ملتی ہیں جن میں انھوں نے قیادت کے کردار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ 1938 میں انھوں نے لکھا کہ ''ہوشیار سپہ سالار قدم اکھڑنے تک انتظار نہیں کرتا۔ جب وہ سمجھ جاتا ہے کہ کسی خاص مورچہ پر وہ اور زیادہ مدت تک ٹھہر نہیں سکتا، تو بڑے اطمینان سے وہ وہاں سے پیچھے ہٹ جاتا ہے''[4] 1939 میں انھوں نے پھر کہا'' ہوشیار سپہ سالار جنگ کے موقع ومحل کا انتخاب اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ خود ہمیشہ پیش قدمی کرتا ہے۔ اس طرح کا موقع وہ دشمن کو کبھی نہیں دیتا۔ ستیہ گرہ مہم میں جنگ کے طریقے وتدبیر کا استعمال حالات کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے مثلاً آگے بڑھنا ہے یا پیچھے ہٹنا ہے، سول نافرمانی کرنی ہے یا خالص اصلاحی وتعمیری کام کر کے یا بے غرض خدمتِ خلق کے ذریعہ اپنی غیر ضرر رساں طاقت کو مضبوط کرنا ہے''[5]

دوسرے لفظوں میں تحریک شروع کرنے اور ملتوی کرنے کا فیصلہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس سلسلہ میں گاندھی جی اور قومی تحریک کے دوسرے لیڈران کسی فیصلہ پر پہنچنے کے پہلے تحریک کی قوت اور کمزوری کا جائزہ لیتے تھے کہ عوام کتنے دنوں تک ساتھ دے گی نیز سیاسی اور انتظامی سطح پر حکومت کی کیا تیاریاں ہیں وغیرہ باتیں ملحوظ رہتی تھیں۔

اسی طرح یہ سوال نہیں تھا کہ سرکار سے بات چیت کی جائے یا نہ کی جائے۔ سوال یہ تھا کہ نفسیاتی اعتبار سے بات چیت کا وقت مناسب ہے یا نہیں۔ بات چیت کس طرح ہو، اس کا عنوان کیا ہو، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور اس کی کیا شرطیں ہوں گی؟ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 22 ردسمبر 1945 کو کانگریس کی پالیسی پر جو تجویز منظور کیا، اس میں واضح کیا گیا کہ ''حالات چاہے جتنا بھڑکانے والے ہوں اور چاہے مکمل عدم تعاون ہو یا معتدل (Modified)، کانگریس بات چیت اور سمجھوتہ کے طریقے کو جو اس کی پرامن پالیسی کا بنیادی اصول ہے، ترک

نہیں کر سکتی۔ اس لیے کانگریس کا ضابطہ عمل یہی رہے گا کہ جب ممکن ہو تو بات چیت اور سمجھوتہ اور جب ضروری ہو تب عدم تعاون اور سیدھی کارروائی''۔[6]

گاندھیائی دور اور اس کے پہلے کی حکمت عملی میں تعمیری کام کا اہم رول تھا۔ اس کے خاص پہلو یہ تھے کھادی اور گھریلو دھندھوں کی ترقی، قومی تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد کو فروغ، چھوا چھوت کے خلاف جنگ، ہریجنوں کی سماجی حالت میں سدھار اور بدیشی شراب کا بائیکاٹ۔

قومی تحریک میں تعمیری کام کا رول بہت اہم تھا۔ سول نافرمانی تحریک کے التوا کے بعد سیاسی سرگرمی میں جو خلا پیدا ہوتا تھا، اس کو پر کرنے میں تعمیری و اصلاحی کاموں کی بڑی اہمیت تھی۔ ہر ایک عوامی تحریک کے سامنے بنیادی مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ جب جدوجہد میں بہت سرگرمی نہ ہو تو کارکنوں کو کس طرح فعال اور متحرک رکھا جائے؟ ہندوستان کی جنگ آزادی کے زمانے میں یہی کیفیت سامنے آئی تھی۔ اس وقت جب عوامی تحریک ملتوی کی جاتی تو لوگوں میں عدم حرکت ہونے کی وجہ سے سستی آجاتی مگر تعمیری سرگرمی اس طرح لوگوں کی بڑی تعداد کو کام میں مصروف کر دیتی۔ پارلیمانی اور دماغی کام تو کچھ ہی لوگ کر سکتے تھے جبکہ تعمیری کام میں لاکھوں لوگ کھپ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جیل جانا سب کے بس کی بات نہیں تھی۔ تعمیری کام کوئی بھی کر سکتا تھا۔ تعمیری کاموں میں جو لوگ لگے ہوتے تھے وہی آگے چل کر سول نافرمانی تحریک کے سرگرم کارکن بن جاتے تھے۔ اس طرح تعمیری کام کی مہم نے گاندھی جی کو سیاسی کارکنوں کی ایک مستقل فوج فراہم کی جس کو ان کا ''اسٹیل فریم'' (Steel-frame) یا مستقل فوج (Standing Army) کہا جاتا تھا۔

ہندوستانی نیشنلزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزی حکمرانوں نے جو پیچیدہ پالیسی اختیار کی تھی اس کے بنیادی پہلو یہ تھے آئینی سدھار اور قانون ساز کونسلیں۔ اسی پالیسی کو مد نظر رکھ کر ہندوستانی حکمت عملی کو بھی لیجسلیچر کے تئیں اسی طرح کا پیچیدہ نظریہ اپنانا پڑا۔ پیچیدگی یوں پیدا ہوتی تھی کہ ایک طرف آئینی سدھار اور کونسلوں کے ذریعہ انگریزی حکمراں کلونیل تسلط کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرتے تھے اور قومی تحریک کو پٹری سے ہٹانے کا کام کرتے تھے اور دوسری طرف انھیں کو ہندوستانی عوام کی برٹش مخالف کوشش کا نتیجہ بھی باور کراتے تھے۔ ایسے حالات کو ذہن میں

رکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیاسی قوت کا بیلنس کس طرح بدل رہا تھا اور جمہوری دائرہ کس قدر وسیع ہوتا جا رہا تھا جس میں تحریک اپنا کام کرسکتی تھی۔ برٹش حکمرانوں کو یہ امید تھی کہ آئینی کام سے قومی تحریک کا جھکاؤ عوامی سیاست سے ہٹے گا اور اس سے اس کی دلچسپیاں کمزور پڑیں گی، جس کی وجہ سے عوام میں بے اطمینانی پیدا ہوگی اور لوگ آئین پسند بنام غیر آئین پسند اور دایاں بازو بنام بایاں بازو خیموں میں بٹ جائیں گے۔

کلونیل حکمت عملی کی مخالفت کرتے وقت قومی لیڈروں کو آئینی سدھاروں کی دلیل پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خود کی حکمت عملی کی دلیل پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ کلونیل حکومت جب بھی تھوڑی سی سیاسی زمین چھوڑنے کے لیے مجبور ہوتی، قومی تحریک اس پر اپنا قبضہ جمالیتی تاکہ برٹش مخالف نظریاتی جنگ کو تیز تر کیا جاسکے۔ حکومت کے ذریعہ کیے گئے آئینی سدھاروں کو عملی جامہ پہنانا ہی تھا، مگر اس کی شکل کیا ہو؟ سوال یہی تھا۔ لمبی لمبی بحثوں اور کافی تجربوں کے بعد قومی لیڈران اس نتیجہ پر پہنچے کہ سدھاروں کو اس طرح لاگو کیا جائے کہ انگریز حکمرانوں کے منصوبے نہ پورے ہوں اور قومی تحریک کا مقصد پورا ہوسکے۔ سچ تو یہ ہے کہ 1880 کے بعد ہی بڑے بڑے قومی لیڈروں نے قانون ساز کونسلوں کا استعمال اس طرح کیا کہ انگریزی تسلط کمزور پڑے۔ کونسلوں، میونسپل بورڈوں اور 1937 کے بعد عوام کے ذریعہ منتخب سرکاروں کا استعمال اس نظریہ سے کیا گیا کہ پریشانیوں سے گھرے لوگوں کو راحت ملے، ان کی حالت میں سدھار ہو، سیلف گورنمنٹ چلانے کی اہلیت کے بارے میں لوگوں کا اعتماد بحال ہو اور کانگریس اور قومی تحریک کے وقار میں اضافہ ہو۔

ہندوستانیوں کو لمبی مدت سے سیاسی اختیارات سے محروم رکھا گیا تھا۔ کلونیل حکمرانوں نے ان کے ذہنوں میں یہ نظریہ اچھی طرح بٹھا دیا تھا کہ وہ سیاسی اختیارات کے استعمال کے لائق مطلق نہیں ہیں۔ نیز وہ اتنے کمزور ہیں کہ ان کے سامنے کھڑے نہیں ہوسکتے۔ ایسے ماحول میں جب کوئی فیروز شاہ مہتا یا کوئی جی۔ کے۔ گوکھلے یا کوئی آر۔ سی۔ داس یا کوئی موتی لعل نہرو لیجسلیٹیو کونسل میں شعلہ بیانی کرتا تب ان کی آنکھیں کھلتیں اور ان کو اپنی حقیقت کا اندازہ ہوتا۔ 1920 کی دہائی میں کونسلوں میں سرکار کی بار بار ہار ہوئی اور 1930 کی دہائی

میں انگنت شہروں، قصبوں اور ضلعوں کی میونسپل بورڈوں پر نیشنلسٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ ان واقعات سے ہندوستانیوں کی سوچ میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ان میں خود پر بھروسہ جگا اور اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

قانون ساز کونسلوں اور آئینی سدھاروں کے سلسلہ میں قومی حکمت عملی خاصی کامیاب رہی۔ کونسلوں میں ان کے ذریعہ کیے گئے کام اس سیاسی خلا کو پر کرتے تھے جب قومی تحریک تعمیری کام کر کے اپنی طاقت کو مستحکم کر رہی ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو لوگ کونسلوں اور میونسپل بورڈوں کے توسل سے کام کر رہے تھے وہ کلونیل حکومت کا کل و پرزہ مطلق نہیں بنے بلکہ انھوں نے حکومت کے ذریعہ کیے جا رہے سدھاروں کے کھوکھلے پن کو بڑی کامیابی سے اجاگر کیا اور یہ ثابت کیا کہ ان سدھاروں کے باوجود انگلینڈ کے ذریعہ انگلینڈ کے مفاد میں ہندوستان پر حکومت کی جا رہی ہے اور حکمرانوں کو جب بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اپنے بے جا قانونوں (Lawless Laws) کا سہارا لینے سے باز نہیں آتے ہیں۔

1907 میں سورت میں جس طرح کانگریس تقسیم ہوئی تھی اس سے سبق لے کر کانگریس نیتاؤں نے آپسی پھوٹ و نفاق سے خود کو بچائے رکھا۔ یہ سارا کام اس لیے ممکن ہوا کیونکہ 1919 کے بعد کانگریسی آئینی سیاست کے بجائے عوامی سیاست کے پابند رہے۔ جب بھی عوام میں ابھار آتا وہ کونسلوں کو چھوڑ کر عوامی تحریک میں کود پڑتے۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ ان سے کلونیل ڈھانچہ میں بتدریج سدھار پیدا ہوگا بلکہ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ کونسلیں کلونیل حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے اور اس کو اکھاڑ پھینکنے کا ضروری میدان ہیں۔

گاندھی جی اہنسا یعنی عدم تشدد کو اصول مانتے تھے مگر ان کے زیادہ معاصرین مثلاً سی۔ آر۔ داس، موتی لعل نہرو، جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد، سردار پٹیل، نریندر دیو وغیرہ اس کو پالیسی یعنی طرز عمل کے زمرے میں رکھتے تھے۔ پالیسی اور سیاسی طریقہ عمل کی حیثیت سے یہ نیشنل کانگریس کی حکمت عملی کا بہت لازمی جز تھا۔ دراصل وسیع عوامی اجتماعیت پر منحصر سیاسی تسلط قائم کرنے کی جنگ میں اہنسا قومی تحریک کی فطرت سے کافی میل کھاتا تھا۔ چونکہ اس کا تعلق عوامی اجتماعیت اور

سیاسی تسلط کے قیام سے تھا، اس لیے یہ قومی تحریک کا ایک اہم جز بن گیا تھا۔

جدوجہد آزادی میں اہنسا کو اپنانے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس میں وہ لوگ بھی حصہ لے سکے جو متشدد جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ عورتوں کے بارے میں یہ بات خاص طور سے سچ تھی۔ وہ مسلح جدوجہد میں شامل نہیں ہوسکتی تھیں مگر غیر متشدد جدوجہد کے دوران تکلیف برداشت کرنے، لاٹھیوں کی مار کھانے، چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتی ٹھنڈک میں گھنٹوں دھرنا دینے میں اکثر وہ مردوں کو مات کر دیتی تھیں۔ سیاسی سرگرمی اور جدوجہد کی شکل میں اہنسا کا تعلق انگلینڈ کی سیاست کی جمہوری اور کلونیل حکومت کی نصف حاکمانہ (Semi-Authoritarian) اور نصف حکمرانہ، (Semi-Hegemonic) خصلت سے بھی تھا۔

اہنسا کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ وہ جدوجہد آزادی کو اخلاقی قدروں سے آراستہ کرتی تھی۔ غیر متشدد عوامی تحریکوں نے کلونیل حکمرانوں کی ظالمانہ خصلت کا پردہ فاش کیا تھا کیونکہ جب وہ پرامن ستیہ گرہوں پر ہتھیار اٹھاتے تو یہ اجاگر ہو جاتا کہ برٹش حکمراں کا دارومدار جبر و ظلم پر ہے۔ دراصل ایسے حالات میں برٹش حکمران بڑی مشکل میں پڑ جاتے تھے۔ چونکہ وہ پرامن جدوجہد کرتے تھے اس لیے اس کو دبانے کے لیے ان کو تھوڑی ہچک محسوس ہوتی۔ اس سے ان کا حاکمانہ وقار مجروح ہوتا تھا۔ آخر ستیہ گرہی موجودہ قانون کو توڑتے ہی تھے، اس لیے اگر حکمراں بالکل ہی کارروائی نہ کرتے تو عوام میں یہ تاثر جاتا کہ ان کے اندر حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اور اگر وہ طاقت کا استعمال کرتے تو اس سے بھی ان کو نقصان پہنچتا تھا کیونکہ پرامن اور غیر متشدد نافرمانی کرنے والوں پر طاقت کا استعمال اخلاقاً درست نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ اس طرح کلونیل حکومت کے سامنے ایک طرف کھائی تھی تو دوسری طرف خندق تھا۔ اس کے برعکس قومی حکمت عملی مسلسل فتح کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ برٹش سلطنت کے نصف جموری حکومت کے پاس غیر متشدد پرامن عوامی تحریکوں جیسی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ عملاً کلونیل حکمراں انھیں دونوں حالات کے درمیان تذبذب میں پھنسے رہتے تھے۔ بالآخر وہ ظلم وستم کا ہی طریقہ اختیار کرتے۔ اس سے ان کے حاکمانہ تسلط پر آنچ آتی تھی کیونکہ جب بھی طاقت کا استعمال ہوتا برٹش

حکومت کی اخلاقی زمین تھوڑی سی کھسک جاتی۔

اہنسائی طریقہ اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عوام کے پاس اس ہتھیار کے استعمال کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔ برٹش حکومت نے 1858 سے ہی بہت منظم طریقے سے اس کو نہتھا کر دیا تھا۔ وہ ہتھیار حاصل کر سکے یا اس کے استعمال کی ٹریننگ پا سکے، یہ کام مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ شروع سے ہی عوامی تحریک کے لیڈروں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستانیوں کے پاس ضروری مادی وسائل کا اس قدر فقدان ہے کہ وہ زبردست طاقتور برٹش سرکار سے مسلح جنگ کر سکیں۔ پرامن طریقہ سے حکومت کے خلاف عوامی تحریک چلانے میں ان کے اندر بے پناہ اخلاقی قوت پیدا ہوتی تھی۔ پرجوش اور متحرک عوام کی شکل میں وہ بے حد طاقتور بن جاتے تھے۔ نہتھے ہندوستانیوں کا یہی فائدہ مند مثبت پہلو تھا۔ دوسرے لفظوں میں وقار کی اس جنگ نے ہندوستانیوں کو وہ سیاسی طاقت دی کہ وہ جنگی مورچہ بندی میں برٹش حکومت کے بے انتہا طاقتور مسلح فوج سے لوہا لے سکے۔

اہنسائی طریقہ اپنانے کے پیچھے ایک راز یہ بھی تھا کہ اگر حکومت کے خلاف مسلح جنگ چھیڑی گئی ہوتی تو اس کو بری طرح جبر کرنے کا بہانہ مل جاتا اور اس کے مقابلہ کی سکت ہندوستانیوں میں کہاں تھی؟ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ لوگ پست ہمتی کا شکار ہو جاتے اور سیاسی اعتبار سے ان پر جمود طاری ہو جاتا۔ پھر تو وہ کچھ نہ کر پاتے۔

اس سلسلہ میں دو مزید باتوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات جس کو بہت اختصار مگر معنی خیز لفظوں میں جواہر لعل نہرو اور بھگت سنگھ نے کہی تھی کہ کیا عوامی تحریک متشدد شکل اختیار کر سکتی ہے اور کیا عوامی تحریکیں جن میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے ہیں اور جو جمعیت پر قائم (Cadre Based) تحریکوں سے ایک دم مختلف ہوتی ہیں، فیصلتاً غیر متشدد ہوں گی؟ 7 دوسری بات یہ کہ ہندوستان کے معاملہ میں غیر متشدد جدوجہد فیصلتاً اتنی ہی انقلابی تھی جتنی دوسرے تناظر میں مسلح جدوجہد۔ تسلط قائم کرنے کی جدوجہد انقلابی جدوجہد کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ گرامشی کے مطابق یہ جدوجہد حکومت اور سماج کے ڈھانچہ میں تغیرات لانے کی مورچہ بند جنگ کا مصداق ہے۔

جب ایک بار قومی حکمت عملی کی خاص غرض وغایت سمجھ میں آجاتی ہے اور قومی تحریک کے دونوں ادوار کی دوہری منشا کا علم اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ اس نے بیک وقت ہندستانی لوگوں کے دل ودماغ پر کس طرح غلبہ حاصل کیا، ان کو متحرک کر کے کیسے تحریک میں لگایا اور پھر کس طرح انھیں سے اپنی تاریخ سازی کرائی، تب ہم کو تحریک کے دونوں ادوار میں ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی اہمیت کو بالکل نئے انداز سے جانچنا پڑتا ہے۔ قومی حکمت عملی کی کامیابی اور ناکامی کا پیمانہ یہ ہے کہ اس نے کس حد تک کلونیل تسلط کو کم کیا اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کر کے ان کو جدوجہد کے لیے تیار کرنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ اس انداز سے دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ قومی حکمت عملی عوامی تحریکوں کے ادوار جنگ۔ صلح۔ جنگ سے گزرتی ہوئی مسلسل کامیاب ہوتی گئی۔ اگر چہ عوامی تحریکیں 1932 اور 1942 میں دبائی گئیں، 1922 میں واپس لی گئیں 1940-41 میں فرو اور نظر انداز کی گئیں یا پھر 1930-31 میں صلح سمجھوتہ کے ساتھ ختم ہوئیں اور حصول آزادی کے اپنے واضح مقصد میں ناکام رہیں مگر انھوں نے عوامی تسلط کو قائم کرنے اور لوگوں میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنے کے عظیم مقصد میں پوری طرح کامیابی حاصل کی۔

ہندوستان کی قومی تحریک نے جو حکمت عملی اپنائی خصوصاً گاندھی جی کی قیادت میں، اس کا مقابلہ اگر برٹش، فرنچ، روسی، کیوبیائی اور ویت نامی انقلابوں سے کیا جائے تو دنیا کی تاریخ میں اس کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ہندوستان واحد ایسا ملک ہے جہاں نصف جمہوری یا جمہوری طرز کی حکومت کو بڑی کامیابی سے بدلا جاسکا اور اگر گرامشی کی نظر سے دیکھیں تو وقار کی یہ جنگ (War of Position) بڑی کامیابی سے لڑی گئی۔ تاریخ میں ہوئے ایسے واقعات کا مطالعہ کرنے سے ہم کو بڑی قیمتی اور مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ ماضی وحال دونوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا اور ہماری بصیرت بڑھے گی۔ اس سے مورخین ہی نہیں بلکہ سیاسی کارکن بھی کما حقہ، مستفید ہوں گے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی لمبی مدت تک چلنے والی ایسی مستقل جدوجہد ہے جس میں کسی تاریخی انقلاب کے ذریعہ آناً فاناً اقتدار پر قبضہ نہیں کیا گیا بلکہ یہ جنگ عرصہ دراز تک مختلف

ادوار سے گزرتی ہوئی اپنی منزل پر پہنچی۔ اس عوامی تحریک کو اخلاقی، سیاسی، نظریاتی اور سماجی نہج پر چلایا گیا۔ بڑے صبر وسکون کے ساتھ برسوں محنت کر کے عوامی تسلط واقتدار قائم ہوا۔ وقتاً فوقتاً زوردار عوامی تحریکیں چلائی گئیں اور قومی سیاست کو مستقل طور سے زندہ رکھا گیا۔ اگرچہ عوام کے پاس اپنا کوئی مستقل فوجی عملہ نہیں تھا پھر بھی اس کی اپنی جمعیت نے عدم تحریک کے دور میں بھی اپنا سیاسی حوصلہ بلند رکھا۔ قانون کے دائرہ میں رہ کر عوام کو جمہوری بنیادوں پر متحد، منظم اور متحرک کیا گیا۔ ہندستانی قومی تحریک کے ان مختلف پہلوؤں خصوصاً گاندھیائی سیاسی حکمت عملی اور طرز قیادت کا مطالعہ گاندھیائی فلسفہ سے الگ کر کے کرنا چاہیے۔ جن ملکوں میں جمہوری طرز کی محافظ حکومتیں قائم ہیں، ان کی کایا پلٹ کے لیے ہندوستان کی قومی تحریک کے تجربات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

باب ۔ 39

ہندستانی قومی تحریک، اس کی نظریاتی وسعت

ہندستانی

قومی تحریک دراصل برٹش حکومت اور ہندستانی عوام کے مفادات کے درمیان واقع بنیادی تضاد کا نتیجہ تھی۔ تضاد کی خاص وجہ جو تحریک کے قیادت کے علم میں بہت واضح، سائنسی اور محکم طریقہ سے رفتہ رفتہ آئی اور جس کو اس نے اپنی جدوجہد کی اساس بنایا وہ یہ تھی کہ برٹش حکومت ہندوستان پر اپنے اقتدار وتسلط کا استعمال برٹش سماج کی اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کے مالی وسائل کا بری طرح استحصال کررہی ہے۔ قیادت کی سمجھ میں یہ بھی آیا کہ مالی اعتبار سے ملک مستقل پچھڑ رہا ہے۔ اسی تجزیہ کی بنیاد پر ہندوستان کے اصلی حالات اس کے سامنے اجاگر ہوئے اور انھیں کو اچھی طرح سمجھ کر برٹش مخالف نظریہ کی ترقی ہوئی۔ بانیانِ قومی تحریک انیسویں صدی کے آخر تک کلونیل حکومت کے ذریعہ کیے جارہے استحصال کے تینوں طریقے اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ وہ طریقے یہ تھے: (1) ٹیکس کا بار لاد کر اور انگریزوں کو نوکریوں میں لگا کر ہندوستانیوں کو لوٹنا کھسوٹنا۔ (2) غیر مساوی بنیاد پر آزاد تجارت کرنا اور (3) ہندوستان میں برٹش پونجی لگانا (Investment of British

(Capital) ان کے علم میں یہ بھی بات آگئی تھی کہ ہندوستان کا برٹش کالونی بننا تاریخ کا نہ کوئی حادثہ ہے اور نہ برٹش حکومت کی سیاسی پالیسی کا نتیجہ بلکہ یہ تو برٹش سماج کی خصلت اور ہندوستان کی غلامی کا فطری ثمرہ ہے۔ کلونیل حکومت کے بارے میں ان کی تحقیق کا اصل نقطہ یہی تھا کہ ہندوستان کی ساری دولت اور پونجی بے تحاشہ انگلینڈ بھیجی جا رہی ہے۔

سلطنت برطانیہ کے پیچیدہ مالی نظام کے بارے میں ان کی سمجھ میں 1918 کے بعد اور بھی اضافہ ہوا جب اس کے خلاف عوامی تحریکیں ہونے لگیں اور مارکسی نظریات کی اشاعت کا دور چلا۔ اب قومی قیادت کو اچھی طرح واضح ہو گیا کہ برٹش سماج اور ہندستانی سماج کے درمیان پیدا شدہ تضاد کو دور کرنے کے دو ہی راستے ہیں. ملک میں قائم کیے گئے حکومت کے مالی نظام کو یا تو مکمل بدل دیا جائے یا پھر بالکل ختم ہی کر دیا جائے۔ قومی قیادت نے اپنی جدوجہد کے ہر ایک دور میں کلونیل حکومت کی اسی پالیسی کو اپنے تجزیہ میں مرکوز رکھا۔

کلونیل حکومت کے خلاف یہی نظریہ اب قومی تحریک کے نچلے طبقہ کے کارکنوں کے دلوں میں اچھی طرح گھر کر گیا۔ گاندھیائی دور کی عوامی سیاست میں انھوں نے برٹش حکومت کے دونوں خطرناک مقاصد کو گاؤں گاؤں، شہر شہر پھیلا دیا کہ ہندوستان کی دولت لوٹی جا رہی ہے اور ہندوستان انگلینڈ میں بنے ہوئے سامان کا بازار بنتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کی دستکاری چوپٹ ہو رہی ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف اس طرح کی اشاعتی مہموں نے ہندستانی عوام کے دماغ میں حکومت کے بارے میں پیوست خوش فہمیوں کی بنیادیں ہلا دیں کہ برطانیہ ہندوستان کے مفاد میں حکومت کر رہا ہے اور یہ کہ برٹش حکمران اس کے ''مائی باپ'' ہیں۔ اب اس وہم کی قلعی کھلنے لگی۔

اس طرح ایک طرف دونوں کے درمیان پیدہ شدہ ابتدائی تضاد نے قومی تحریک کو مضبوط بنیادی ساخت فراہم کیا، تو دوسری طرف برٹش مخالف سوچ نے تحریک کو ٹھوس نظریاتی اصول بھی دیا جس کی وجہ سے سلطنت مخالف تحریک کو مسلسل چلنے والا مضبوط راستہ مل گیا جس میں خاصی لچیلی حکمت عملی کا استعمال کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ تحریک صحیح اور صاف طور سے برٹش مخالف اصول کی پوری طرح پابند تھی۔

تحریک کی برٹش مخالف بنیاد اس لیے بھی اہمیت کی حامل تھی کیونکہ کسی بھی عوامی تحریک میں اصولی نظریہ فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ عام سیاسی حالات میں کسی حکومت کی موافقت یا مخالفت کرنے یا ووٹ دینے یا نہ دینے کے لیے کسی خاص محرک کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، لیکن عوامی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینے کے لیے بڑی قربانیاں درکار ہیں۔ صرف استحصال کیے جانے اور غریب ومفلس بنائے جانے کے احساس سے عوامی تحریک میں حصہ لینا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایسے اصول پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہوتی جس کا جنم سماج کے موجودہ حالات کے اسباب کی سمجھ سے ہوا ہو۔ اس لیے برٹش مخالف سائنسی نظریہ ہی قومی تحریک کا خاص محرک تھا۔

کلونیل دنیا کے خلاف قومی تحریک کا نظریہ صرف معاشی، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ کچھ نظریاتی پہلو بھی اس میں شامل تھے۔ موٹے طور سے اس کا تعلق بورژوا، سرمایہ دار طبقہ کی آزادانہ ترقی اور جمہوری، سیکولر اور آزاد سیاسی نظام سے بھی تھا یعنی ایسا نظام جس کا قیام سماجی مساوات کے اصول پر ہوا ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی نظریہ ہمیشہ سے مسلم بنا رہا۔ بحث ومباحثہ صرف سرمایہ دارانہ نظام کے مالی پہلو تک محدود تھا جس پر 1920 کے بعد بڑی سنجیدگی سے انگلیاں اٹھیں۔

قومی تحریک پارلیمانی جمہوریت اور شہری آزادی کے اصول کا پوری طرح پابند تھی۔ اس نے ایسی زمین ہموار کی اور ایسا ماحول پیدا کیا جس میں یہ دونوں باتیں اچھی طرح پنپ سکیں، جبکہ انگریز حکمراں لگاتار یہی پرچار کرتے رہے تھے کہ ہندوستان کی آب وہوا، تاریخی روایات، معاشرتی اور مذہبی اداروں کی خصلت جمہوری طرز حکومت کے لیے قطعی موزوں نہیں ہیں۔ ہندوستانیوں پر صرف مطلق العنان حکمرانوں کے ذریعہ حکومت کی جانی چاہیے۔ جذبات کے اظہار اور پریس کی آزادی میں انگریزوں کی دست اندازی مستقل بڑھتی جارہی تھی۔ وہ ان پر مسلسل حملے کررہے تھے۔

ایسے حالات میں قومی تحریک کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ جموریت کے قیام کے لیے جدوجہد کرے اور اس کو دیسی رنگ وروپ دے کر پختہ کرے تاکہ ملک کی سرزمین پر اس کی جڑیں

اچھی طرح جم سکیں۔ شروع سے ہی اس نے اس کے لیے جنگ کیا کہ عام انتخابات کے ذریعہ نمائندہ سرکاریں بنائی جائیں۔ 1920 کے پہلے تک اور دوسرے قومی لیڈروں نے اور اس کے بعد گاندھی جی اور کانگریس نے بالغ رائے دہندگی کا مطالبہ کیا تا کہ سبھی بالغ مرد اور عورتیں ووٹ دے سکیں۔ انڈین نیشنل کانگریس تو اپنے وجود میں آنے کے دن سے ہی جمہوری خطوط پر کام کرتی آرہی تھی۔ اس کی تمام تر تجاویز پر کھلی بحث ہوتی تھی۔ پھر ووٹ پڑتے تھے۔ اگر کسی مسئلہ پر کچھ لوگ مختلف رائے رکھتے، تو ان کو آزادی سے اپنی بات کہنے کی نہ صرف اجازت تھی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے کچھ بے حد اہم فیصلے گرما گرم بحث کے بعد کھلے ووٹ کے ذریعہ کیے گئے مثلاً 1920 میں عدم تعاون تحریک شروع کرنے کے پہلے گاندھی جی کے ذریعہ پیش کی گئی تجویز ووٹ کے بعد ہی منظور رہوئی تھی۔ تجویز کی موافقت میں 1886 اور مخالفت میں 884 ووٹ پڑے تھے۔ اسی طرح 1929 میں لاہور کانگریس میں وائسرائے کی ٹرین پر دہشت پسند انقلابیوں کے ذریعہ پھینکے گئے بم کی مذمت میں جو تجویز گاندھی جی نے رکھی تھی اس کے حق میں کل 942 اور اس کے خلاف 794 ووٹ پڑے۔ 1942 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے 13 کمیونسٹ ممبروں نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے تاریخی قرارداد پر خلاف ووٹنگ کی تھی، مگر ان پر لعنت ملامت کرنے کے بجائے گاندھی جی نے اپنی ''کرو یا مرو'' والی تقریر کی شروعات ہی ان لفظوں سے کی تھی ''میں ان تیرہ دوستوں کو مبارک باد دیتا ہوں جنھوں نے قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دیا تھا۔ ایسا کر کے ان لوگوں نے کوئی وہ کام نہیں کیا جس پر ان کو شرمندہ ہونا چاہیے۔ گذشتہ بیس برسوں سے ہم نے تو یہی سیکھنے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم مایوس کن اور مضحکہ خیز اقلیت میں ہو جائیں، تب بھی ہم ہمت نہ ہاریں۔ ہم پورے یقین اور اعتماد سے اس بات پر قائم رہیں کہ ہم حق پر ہیں، یہی سبق ہم نے سیکھا ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ حق پر قائم رہنے کی ہمت اور اعتماد اپنے دل میں پیدا کریں۔ یہی خوبیاں انسان کو نیک بناتی ہیں اور انھیں سے اس کا اخلاقی قد اونچا ہوتا ہے۔ اس لیے مجھ کو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان دوستوں نے اسی اصول کو صدق دل سے قبول کرلیا ہے جس پر میں نے پچاس برسوں یا اس سے زیادہ مدت سے چلنے کی کوشش کی ہے''[1]

قومی تحریک شروع سے ہی شہری آزادی کے تحفظ کے لیے سرگرمی سے کام کرتی آرہی

تھی۔قومی لیڈروں نے ابتدا سے ہی برٹش حکمرانوں کے ذریعہ پریس، اظہار خیال اور تنظیم بنانے کی آزادی نیز دوسرے حقوق پر کیے جارہے غاصبانہ حملوں کے خلاف آواز بلند کیا۔ بطور مثال تلک نے بارہا یہی دعویٰ کیا کہ ''پریس اور اظہار خیال کی آزادی ہی کسی قوم کو جنم دیتی اور اس کو مضبوط کرتی ہے''[2]

گاندھی جی شہری حقوق کے حصول کے لیے مکمل طور سے پابند عہد تھے۔ سول نافرمانی تحریک جب اپنے عروج پر تھی، تب انھوں نے جنوری 1922 کے ''ینگ انڈیا'' (Young India) میں لکھا'' حکومت نے ملک کے سامنے وہ مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کے مقابلے میں سوراج، خلافت اور پنجاب کے معاملے کمتر ہیں۔ اپنی منزل کی طرف بڑھنے سے پہلے ہم کو اظہار خیال کی آزادی اور تنظیم بنانے کے حق کو حاصل ہی کرنا ہوگا۔ ہم کو ایسے بنیادی حقوق کا تحفظ جان کی بازی لگا کر کرنا چاہیے''۔ تھوڑے روز کے بعد اسی اخبار کے دوسرے شمارہ میں انھوں نے پھر ذکر کیا کہ'' اظہار خیال کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس سے کسی کو چوٹ بھی لگتی ہو تب بھی اس کو سلب نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت میں پریس کی آزادی کا احترام ہو رہا ہے، ایسا تبھی کہا جا سکتا ہے جب پریس کو سخت سے سخت بات کہنے یہاں تک کہ باتوں کو توڑ مروڑ کر کہنے کی پوری آزادی ہو۔ تنظیم بنانے کی آزادی کی قدر واقعی ہو رہی ہے، یہ تبھی کہا جائے گا جب لوگوں کو اپنی مجلسوں میں انقلابی منصوبوں پر چرچہ کرنے کی پوری آزادی ہو''[3] اس سلسلہ میں گاندھی جی کی ایک اور بات برمحل ہے کہ'' شہری آزادی جو اہنسا میں مانع نہ ہو سوراج کے سمت میں پہلا قدم ہے۔ یہی سیاسی زندگی کی روح اور آزادی کی بنیاد ہے۔ اس میں گھال میل یا سمجھوتہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو آب حیات ہے''[4]

جواہر لعل نہرو شہری حقوق کے شاید سب سے بڑے حامی تھے۔ وہ ان کو مالی مساوات اور سوشلزم کی طرح ضروری سمجھتے تھے۔ کراچی کانفرنس نے 1913 میں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) پر جو قرارداد پاس کیا اس کو جواہر لعل نہرو نے تیار کیا تھا۔ اس میں اظہار خیال، پریس اور تنظیم بنانے کی آزادی کی گارنٹی دی گئی تھی۔ 1936 میں ان کی کوشش سے سول لبرٹیز یونین (Civil Liberties Union) بنائی گئی۔ اس میں کسی فرقہ یا پارٹی کے

اصول کی آمیزش نہیں تھی اور اس کا واحد مقصد شہری حقوق پر ہونے والے حملوں کے خلاف لوگوں کو متحد کرنا تھا۔ اس موقع پر جواہر لعل نہرو نے اعلان کیا کہ ''جب لوگوں کے شہری حقوق پامال کیے جاتے ہیں، تب قوم کی قوت فنا ہو جاتی ہے اور اس میں کسی ٹھوس کام کرنے کی قدرت نہیں رہتی ہے''[5] مارچ 1940 میں انھوں نے مزید کہا کہ ''پریس کی آزادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو چیزیں ہم میں چھپی ہوئی دیکھنا چاہتے ہیں، صرف انھیں کو چھپنے کی اجازت دیں۔ اس طرح کی آزادی سے کوئی ظالم ہی متفق ہوگا۔ شہری اور پریس کی آزادی کا مطلب ہے کہ جو چیزیں ہم نہ چاہیں، ان کو بھی چھاپنے کی اجازت ہو۔ اور خود اپنے اوپر کی جانے والی تنقید بھی برداشت کریں''[6]

اس طرح قومی تحریک نے برسوں کی محنت کے بعد بڑی کامیابی سے جمہوریت اور شہری آزادی کے ایک ایسے کلچر اور نظریہ کی ارتقا کی جس کا دار و مدار اختلاف رائے کے احترام، اظہار خیال کی آزادی، اکثریت کی حکومت کے اصول اور اقلیت کے بنے رہنے اور ترقی کرنے کے مواقع پر تھا۔

سیکولرزم قومی نظریہ کا شروع سے ہی بنیادی پہلو تھا اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنا اس کا اہم مقصد تھا۔ اس پر بے حد زور دیا گیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ تحریک فرقہ واریت کو نہ مٹا سکی اور نہ ہی ملک کے بٹوارے کو روک سکی، مگر یہ سب باتیں اس لیے نہیں واقع ہوئیں کہ وہ اپنے سیکولر نظریہ سے ہٹ گئی تھی بلکہ اس لیے کہ فرقہ واریت سے لڑنے کے لیے اس نے جو حکمت عملی اپنائی تھی اس میں کچھ کمیاں تھیں۔ دراصل وہ فرقہ واریت کے سماجی، مالی اور نظریاتی بنیادوں کو نہ سمجھ سکی۔ قومی تحریک کے ذریعہ پست ذاتوں پر ہو رہے مظالم کی مخالفت کی گئی اور 1920 کے بعد چھوا چھوت کا خاتمہ اس کے پروگرام اور اس کی سیاسی سرگرمی کا لازمی جز بن گیا تھا مگر پھر بھی اس ضمن میں کچھ خامیاں تھی خصوصاً ذات برادری کی لعنت کے خلاف نہ کوئی مضبوط محاذ بنایا گیا اور نہ باقاعدہ اشاعت ہی کی گئی۔ البتہ عورتوں کی آزادی کے مسئلہ کو تحریک نے بڑی سنجیدگی سے اپنایا تھا۔

قومی تحریک نے تسلیم کیا کہ ملک میں عوام کی زندگی کے ہر ایک گوشہ میں گونا گوں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس بات کا نہ صرف اعتراف کیا گیا بلکہ اس کو تحریک کی سیاسی اور نظریاتی

کاموں کی بنا بنائی گئی کہ ہندوستان اب تک مکمل قوم نہیں بن پایا ہے مگر قوم بننے کے مرحلہ میں ضرور ہے۔قومی تحریک کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ کلونیل حکومت کے ذریعہ قائم کی گئی عام غلامی نے ہی وہ مادی اور جذباتی وسائل فراہم کیے ہیں جن کے تحت کسی قوم کی تخلیق ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں قومی تحریک کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کلونیل حکومت کے خلاف جدوجہد کرکے قوم کی تخلیق کرے۔ یہ بات بھی ذہن میں اچھی طرح رکھی گئی کہ تحریک کی سیاسی اور نظریاتی سرگرمیاں قوم بنانے کے مرحلہ میں فیصلہ کن کردار ادا کریں گی۔ بہت صاف طور سے اس کا بھی ادراک کیا گیا کہ لوگوں کو متحد کرنے کے لیے ملک کے علاقائی، مذہبی، نسلی، جسی اور لسانی تفاوت پر اچھی طرح غور کرنا پڑے گا۔مختلف لسانی جماعتوں کی تمناؤں کو بھی پوری طرح تسلیم کیا گیا۔ 1921 کے بعد کانگریس اپنی صوبائی اور علاقائی کمیٹیاں برٹش سرکار کے ذریعہ بنائے گئے کئی زبان والے صوبوں کے بجائے لسانی خطوں پر بنانے لگی۔

قومی تحریک کا اول روز سے اور ایک رائے سے یہی مقصد تھا کہ جدید بنیادوں پر زراعت، صنعت وحرفت کو ترقی دے کر ملک کی مالی حالت کو پوری طرح بدل دیا جائے۔جسٹس راناڈے کے وقت سے ہی قومی لیڈروں کی یہی منشا تھی کہ صنعت کاری کے ذریعہ ہی ملک کی غریبی مٹائی جاسکتی ہے۔اس معاملہ میں گاندھی جی کی رائے اس سے تھوڑی مختلف تھی، لیکن قومی قیادت پر وہ اپنی مرضی تھوپنے کے قائل نہیں تھے۔اس کے علاوہ مشینوں اور بڑی صنعتوں کے بارے میں ان کی منشا کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔وہ صرف مشینوں کے مخالف تھے کیونکہ ان کے مطابق ان سے بے روزگاری پھیلتی ہے یا اکثریت میں لوگوں کو مفلس کرکے معدود چند لوگوں کو امیر بنایا جاتا ہے۔انھوں نے بارہا کہا تھا کہ وہ سائنس کی ایسی ہر ایک ایجاد کی قدر کریں گے جس سے سبھی کا بھلا ہوتا ہو۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ بڑے پیمانے کی جدید صنعت کے مخالف نہیں ہیں بشرطیکہ وہ انسانی محنت کی جگہ نہ لے کر صرف اس کے بار کو کم کرے۔اس کے علاوہ ان کی دوسری شرط تھی کہ بڑے پیمانے کی سبھی صنعتیں سیدھے حکومت کے کنٹرول میں رہیں۔سرمایہ داروں کا قبضہ ان پر نہ ہو7

قومی لیڈر پوری طرح پابند عہد تھے کہ ملک کو مالی اعتبار سے خودکفیل بنایا جائے۔وہ

بدیسی پونجی کا سہارا نہ لے۔ مشینیں قومی وسائل سے بنائی جائیں اور سودیسی سائنس اور ٹکنالوجی کا ارتقا کیا جائے۔ 1840 سے ہی برٹش حکمراں ہندوستان کی مالی ترقی کے لیے بدیسی پونجی کے استعمال پر زور دیتے آرہے تھے8 جبکہ قومی لیڈر دادابھائی نوروجی سے تلک تک اور گاندھی جی سے نہرو تک سبھی اس کے مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بدیسی پونجی سے ملک ترقی نہیں کرتا بلکہ اس سے پچھڑاپن آتا ہے کیونکہ یہ دیسی پونجی کو دباتا ہے اور اس کو ابھرنے نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ بدیسی پونجی سیاسی اعتبار سے بھی نقصان دہ ہے کیونکہ جلد یا بدیر یہ حکومت پر حاوی ہونے لگتی ہے۔9

دادابھائی نوروجی اور راناڈے کے زمانے سے ہی قومی لیڈروں نے جدید ہندوستان کی آزادانہ مالی تعمیر میں پبلک سیکٹر کے فیصلہ کن کردار کو تسلیم کیا۔ 1930 کی دہائی میں جواہرلعل نہرو، گاندھی جی اور بائیں بازو کے لیڈروں نے معدودے چند ہاتھوں میں دولت کے جماؤ کو روکنے کے لیے پبلک سیکٹر میں خصوصاً بڑے پیمانے کی خاص صنعتوں میں پونجی لگانے کی پرزور وکالت کی۔ اسی دہائی کے آخر میں مالی منصوبہ بندی (Economic Planning) کو بھی عام طور سے منظور کیا گیا۔ 1938 میں کانگریس نے سبھاش چندر بوس کی صدارت میں نیشنل پلاننگ کمیٹی بنائی۔ جواہرلعل نہرو اس کے صدر بنائے گئے۔ ان کے ذمہ آزاد ہندوستان کے لیے ڈیولپمنٹ پلان (Development Plan) بنانے کا کام دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران دوسرے اور بہت سے منصوبے بنائے گئے۔ ان میں سب سے اہم بمبئی منصوبہ (Bombay Plan) تھا۔ اس پلان کو جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا، جی۔ ڈی۔ برلا، اور شری رام جیسے تین سرمایہ داروں نے تیار کیا تھا۔

قومی تحریک کا آفاقی نظریہ (World Outlook) یہ تھا کہ کلونیل سلطنت اور فسطائیت کی مخالفت کی جائے اور امن اور قومی آزادی کے قیام پر زور دیا جائے۔

قومی تحریک اول روز سے ہی غریبوں کی حامی تھی۔ اعتدال پسندوں کے ذریعہ کلونیل سرکار کی کی گئی تنقید اسی بات پر مرکوز تھی کہ عوام متواتر غریب سے غریب تر ہوتی جارہی ہے۔ 1917 کے روسی انقلاب کے اثرات، گاندھی جی کے سیاسی اسٹیج پر آنے اور 1920 اور 1930

کی دہائیوں میں بائیں بازو کی پارٹیوں اور جماعتوں کے ابھار سے غریبوں کے تئیں اس رجحان کو مزید تقویت ملی۔ قومی تحریک نے اپنے مختلف ادوار میں جو پالیسیاں اور سدھار کے جو پروگرام بنائے وہ اس وقت کے معیار کے حساب سے بہت انقلابی اور ترقی پسند تھے۔

قومی تحریک کے کچھ خاص خاص مطالبے تھے لازمی پرائمری تعلیم کا نظم، غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں پر ٹیکس کے بار میں کمی، نمک ٹیکس، مال گزاری اور لگان میں تخفیف، قرضداری سے راحت دلانا اور سود کی سستی شرح پر قرض دینا، کاشتکاروں کے حقوق کا تحفظ، مزدوروں کے کام کے گھنٹوں میں کمی، اور جینے لائق مزدوری کا بندوبست، کم تنخواہ پانے والے ملازمین جن میں پولیس سپاہی بھی شامل تھے کی تنخواہوں میں اضافہ، مزدروں اور کسانوں کے تنظیم بنانے کے اختیار کا تحفظ، گھریلو دھندھوں کی حفاظت کرنا اور ان کو ترقی دینا، جدید سائنس اور تکنیکی تعلیم کی حوصلہ افزائی، شراب خوری پر روک، عورتوں کی سماجی حیثیت میں سدھار اور ان کو تعلیم اور روزگار پانے کا اختیار اور مردوں کے مساوی سیاسی حقوق دینا، چھوا چھوت کے خاتمہ کے لیے سماجی اور قانونی اقدامات کرنا اور امن وامان مشینری میں سدھار وغیرہ۔

قومی تحریک کو سماج وادی روپ دینے میں اس لیے بھی سہولت ہوئی کیونکہ وہ بنیادی طور سے عوام اور غریب موافق تھی۔ وہ یہ مانتی تھی کہ تحریک کی پالیسی عوام موافق ہونا ہی چاہیے اور لوگوں کو نہ صرف سیاسی اعتبار سے بیدار اور متحرک کیا جانا چاہیے بلکہ ان کو سیاسی سرگرمیوں میں شامل کرنا چاہیے۔

تحریک کی مالی ترقی کا تصور سرمایہ دارانہ ڈھانچہ کی چوحدیوں کے اندر تک ہی محدود تھا۔ 1919 کے بعد جب قومی تحریک نے عوامی شکل اختیار کی تب گاندھی جی نے ایک الگ غیر سرمایہ دارانہ مالی نظریہ کا ارتقا کر کے اس کا پرچار پرسار کیا جس کا مقصد کسانوں اور دستکاروں کی بہبودی اور بھلائی تھا مگر ان کے پروگرام اور نظریہ میں اتنی قدرت نہیں تھی کہ وہ قومی تحریک پر بورژوا غلبہ کو چیلنج کر سکے۔

بلاشبہ قومی تحریک عوامی تحریک تھی جس نے کلونیل حکومت کے خلاف جنگ چھیڑا تھا۔ اس میں ہندستانی سماج کے سبھی طبقے اور درجے کے لوگ شامل تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بات

قابل غور ہے کہ اگر چہ سبھی طبقے کے لوگ حکومت کے خلاف متحد ہو گئے تھے مگر وہ مختلف طبقوں اور گروہوں میں بٹے تھے، جن میں آپسی تضاد تھا۔ اس طرح سلطنت مخالف جدو جہد میں ان کی حصہ داری کی شکل بھی الگ الگ تھی۔ حکومت سے ان کا ٹکراؤ الگ الگ سطح پر اور الگ الگ حد تک ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ ایسی صورت میں حکومت کے خلاف ان کی جدو جہد کے نتیجہ میں جو بھی ہندوستان وجود میں آتا وہ طبقاتی نقطۂ نظر سے دو میں سے کوئی ایک ہوسکتا تھا سرمایہ دارانہ یا سماجوادی نظام۔

1920 کی دہائی شروع ہوتے ہی قومی تحریک میں زوردار سماج وادی رجحان پیدا ہوا۔ جواہرلعل نہرو، سبھاش چندر بوس اور سماج وادی نظریہ کے بہت سے لوگوں اور گروہوں نیز کمیونسٹ جماعتوں نے بورژوا نظریہ کے خلاف آواز اٹھائی۔ 1930 کی دہائی میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی جو کمیونسٹ پارٹی اور رائسٹ (Royists) کے نام سے دوبارہ منظم ہوئی تھی اس نے سماج وادی دھارا میں مل کر قومی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ 1940 کی دہائی میں سرمایہ دار دنیا میں ہوئی زبردست مندی (Great Depression) نے روسی انقلاب اور سوویت روس میں پنج سالہ منصوبہ کی کامیابی اور دنیا بھر میں پھیلی فسطائیت مخالف لہر نے سماج وادی نظریہ کے تیئں لوگوں کی کشش میں بے حد اضافہ کیا۔ 1920 کی دہائی کے آخر تک نوجوان، تحریکوں کے زیادہ تر لیڈر اور متعدد انقلابی دہشت پسند سوشلزم کی طرف مڑ چکے تھے۔ اس طرح 1920 اور 1940 کی دہائیوں کے دوران قومی کیڈر کے نوجوان بڑی تیزی سے سوشلسٹ نظریہ سے متاثر ہو رہے تھے۔

بائیں بازو کے لوگوں نے اس بات کو پھیلانے کی پوری کوشش کی کہ ہندوستان میں کسانوں اور زمینداروں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان طبقاتی جنگ مسلسل چل رہی ہے۔ انھوں نے کسان سبھاؤں اور مزدور یونینوں کے ذریعہ اس جنگ کو منظم کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس طرح وہ لوگ قومی تحریک کو سوشلسٹ اور بائیں بازو کی سمت میں لے جانا چاہتے تھے۔ اور آزادی کے بعد ملک کو سوشلسٹ انڈیا بنانا ان کا مقصد تھا۔

ہندوستان کو سوشلسٹ انڈیا بنانے کے تصور (Vision) کو قومی تحریک کے اندر اور

باہر ملکی سطح پر عام کرنے میں جواہر لعل نہرو نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مالی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔ 1930 دہائی کے دوران اس وقت کی قومی تحریک کے نظریہ میں سوشلسٹ رجحان کے فقدان کو انھوں نے اچھی طرح ظاہر کیا اور اس کے اوپر بورژوا سوچ کے غلبہ کی مسلسل نشان دہی کرتے رہے۔ انھوں اس بات پر پورا زور دیا کہ قومی تحریک میں نئی سماج وادی یا بنیادی اعتبار سے مارکسی نظریہ کو اپنایا جائے تا کہ لوگ اپنی سماجی زندگی کا سائنسی محاسبہ کر کے کانگریس کو سوشلزم کی نئی سمت کی طرف لے جاسکیں۔

1930 کی دہائی کا زمانہ اس سلسلہ میں بہت موافق ثابت ہوا۔ سوشلسٹ نظریات بڑی تیزی سے دور دراز تک پھیل گئے، لیکن اگر چہ بائیں بازو اور سوشلسٹ نظریات نے جومیٹری کے تناسب سے ترقی کیا مگر پھر بھی وہ قومی تحریک میں کوئی موثر قوت نہ بن سکے۔ ان کو اتنی کامیابی ملی کہ وہ قومی تحریک کے لازمی جز بن کر اس کو بائیں بازو رجحان کی طرف لے جانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ قومی تحریک میں انقلابی عنصر مستقل بڑھتا گیا اور بدیسی حکومت سے نجات پانے کو صرف آزادی پر محمول نہیں کیا گیا بلکہ مالی اور سماجی آزادی اس کا مستقل مقصد بنا رہا۔ اس طرح 1930 کی دہائی کے آخر تک ہندستانی قومی تحریک دنیا کی تمام قومی تحریکوں میں سب سے زیادہ انقلابی تحریک بن گئی۔

ایسے انقلابی رجحانات 1931 اور 1936 میں کراچی، لکھنؤ اور فیض پور کے کانگریس قراردادوں، 1936 اور 1945-46 کے الیکشن منشوروں اور 1937-39 کے دوران کانگریس سرکاروں کے ذریعہ کیے گئے سماجی اور مالی سدھاروں میں اچھی طرح ظاہر ہوئے۔ دراصل کانگریس سماجی، مالی اور سیاسی (Socio-Economic-Political) سرگرمیوں میں انقلابی رجحانات مسلسل پیدا کرتی گئی۔ بائیں بازو کے ذریعہ جو بھی مطالبے کیے جاتے، ان کو کچھ عرصہ بعد وہ اپنے پروگرام میں شامل کر لیتی تھی۔ ایسے رجحانات کے ارتقا میں بائیں بازو کی سیاست اور کسان مزدوروں کی جدوجہد نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس کے دائیں بازو والا خیمہ بھی جو سوشلسٹ نظریہ کا مخالف تھا کانگریس میں سیاسی اور مالی اعتبار سے بنیادی تبدیلیاں لانے کا پابند ہو گیا۔ اس کا نظریہ تو بورژوا نواز بنا رہا مگر اس کا

رجحان اب اصلاحی ہو گیا تھا۔

اگر ہم کانگریس کی زراعتی پالیسی کے ارتقا کا جائزہ لیں تو یہ رجحان اچھی طرح واضح ہو جائے گا کیونکہ بہرصورت ہندوستان کا خاص مسئلہ کسانوں کی حالت سے ہی جڑا تھا۔ کانگریس نے کسانوں کے مطالبوں کو لے کر کلونیل حکومت سے ہمیشہ جنگ کیا۔ بائیں بازو اور کسان تحریکوں کے اکسانے پر ہی کانگریس نے 1936 میں اپنے فیض پور کانفرنس میں ایک قرارداد پاس کیا جس میں لگان اور مال گزاری کی شرحوں میں زبردست کمی، جاگیردارانہ وصولی اور بیگار کا خاتمہ، کاشتکاری کی معیاد کا تعین اور کھیتی مزدوروں کو جینے لائق مزدوری پروگرام اپنایا تھا۔ کانگریس سرکاروں نے کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ اور سودخوروں کے ذریعہ کی جارہی لوٹ کھسوٹ روکنے کے لیے قانون بنایا جس کی سختی کی شدت صوبہ صوبہ میں الگ الگ تھی۔ بالآخر 1945 میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے زمینداری کے خاتمہ کی پالیسی کو منظوری دی اور زمین پر اس کے جوتنے والوں کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''زراعتی نظام کے سدھار میں یہ شامل ہے کہ کسان اور حکومت کے درمیان سبھی بچولیوں (Intermediaries) کو ختم کر دیا جائے''10

گاندھی جی اور گاندھی وادی لوگوں کے نظریاتی احاطہ میں پورا سماج آتا تھا۔ گاندھی جی سماج کے طبقاتی تجزیہ (Class-Analysis) اور طبقاتی کشمکش (Class-Struggle) کے قائل نہیں تھے۔ وہ غریبوں کے مفاد کی حفاظت کے لیے بھی تشدد کے استعمال کی مخالفت کرتے تھے، لیکن ان کا بنیادی نظریہ یہی تھا کہ پورے سماج کو بدل دیا جائے۔ وہ موجودہ سماج کی مالی اور سیاسی حالت کو پوری طرح بدل دینا چاہتے تھے۔ 1930 اور 1940 کی دہائیوں کے دوران وہ مستقل طریقے سے انقلابی سمت میں بڑھتے گئے۔ 1933 میں وہ نہرو سے اس بات پر متفق ہو گئے کہ ''لوگوں کی مادی دلچسپیوں میں تبدیلی لائے بغیر عوام کی حالت سدھاری نہیں جا سکتی''۔ 11 اب انھوں نے نجی جائداد کی مخالفت کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے ٹرسٹی شپ (Trusteeship) کے اصول میں انقلاب لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بارہا بڑی صنعتوں کو قومیانے کی وکالت کی۔ وہ سرمایہ داری اور زمینداری نظام میں عوام کے استحصال کرنے کے مضر رویہ کی مذمت کرتے تھے۔ متوسط طبقوں کے ذریعہ ادا کیے جارہے سماجی اور مالی کردار کو انھوں نے

اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔[12]

گاندھی جی نے جسمانی اور دماغی کام کرنے والوں کے درمیان واقع امتیاز اور فرق کو دور کرنے پر بڑا زور دیا نیز ان کا سارا زور معاشرتی اور مالی برابری کے قیام پر تھا۔ وہ عوام کی خود کوشی (Self-Activity) پر بہت زور دیتے تھے۔ ذات برادری کی بنیاد پر نابرابری اور اسی کے نام پر ہو رہے مظالم کے وہ سخت مخالف تھے۔ سماج میں عورتوں کی آزادی کے وہ سرگرم حامی تھے۔ انھوں نے اپنی زبان اور قلم سے دلت شوشت یعنی دبے کچلے سماج کی ہمیشہ وکالت کی۔ اس طرح ان کی تمام تر سرگرمیوں نے قومی تحریک کو انقلابی رنگ دیا تھا۔

زراعت کے بارے میں گاندھی جی کی انقلابی سوچ وفکر اس دور کی سب سے زیادہ قابل ذکر بات ہے۔ 1937 میں ان کے یہ الفاظ تھے "یہ بات بالکل سچ ہے کہ زمین لوگوں کی نہیں ہے مگر زمین اور جائداد تو اس کی ہوتی ہے جو اس پر کام کرتا ہے۔ بس بدنصیبی یہی ہے کہ مزدور اس معمولی سچائی سے واقف نہیں ہیں یا ان کو ناواقف رکھا گیا ہے"۔[13] اسی طرح 1942 میں انھوں نے پھر اعلان کیا "زمینیں تو ان کی ہیں جو ان پر کام کریں گے۔ یہ کسی اور کی نہیں ہیں"۔ جون 1942 میں گاندھی جی کی لوئی فشر (Loius Fischer) سے یوں گفتگو ہوئی!

لوئی فشر: کسانوں کی حالت سدھارنے کے لیے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے؟

گاندھی جی: کسان زمین پر خود قبضہ کر لیں گے۔ اس کے لیے ہم کو ان سے کہنا نہیں پڑے گا۔ وہ خود قابض ہو جائیں گے۔

لوئی فشر: کیا زمین داروں کو اس کا معاوضہ دیا جائے گا؟

گاندھی جی: نہیں، مالی نقطہ نظر سے ایسا ممکن نہیں۔

لوئی فشر: اچھا، یہ بتایئے ہونے والی سول نافرمانی تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

گاندھی جی: گاؤں کے کسان لگان دینا بند کر دیں گے۔ سرکاری ممانعت کے باوجود وہ نمک بنائیں گے۔ ان کا اگلا قدم زمینوں پر قبضہ کرنا ہوگا۔

لوئی فشر: کیا تشدد (ہنسا) کے ذریعہ؟

گاندھی جی: ہنسا ہو سکتی ہے، لیکن اس کے بعد زمیندار تعاون کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ سوچیں کہ

تعاون کرنا ہی مناسب ہوگا۔

لوئی فشر: زمیندار بھی تو تشدد کا سہارا لے سکتے ہیں۔

گاندھی جی: ممکن ہے پندرہ روز بدامنی کا ماحول رہے، مگر ہم جلد ہی اس پر قابو پالیں گے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔

لوئی فشر: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ معاوضہ دیے بغیر زمینیں ضبط کر لی جائیں گی؟

گاندھی جی: بے شک، مالی نقطۂ نظر سے زمینداروں کو معاوضہ دینا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔

اس طرح کلونیل حکومت کی مخالفت کرنا قومی تحریک کا واضح نظریہ تھا اور اس کے تصور میں ایک ایسا انقلابی سماج تھا جس کا قیام سول آزادی، جمہوری اور سیکولر قدروں پر ہو۔ اس کی منشا تھی کہ ملک کے مالی وسائل (Economy) کی ترقی آزاد خطوط پر خود پر بھروسہ کر کے کی جائے۔ کلونیل حکومت مخالف اور غریب عوام موافق قومی تحریک کا سماجی اور مالی انقلاب بپا کرنے والے نظریہ نے ہی اس کو ایسی قوت فراہم کی کہ اس نے سیاسی لحاظ سے بیدار اور سرگرم لوگوں کو اپنا اساس بنا کر عمومی اور عوامی شکل حاصل کر لی۔

حواشی

تعارف

1. Anil Seal, *The Emergence of Indian Nationalism*, Cambridge, 1968, p. 351.
2. *Ibid.*, p. 342.
3. *Ibid.*
4. *Ibid.*
5. S. Gopal, *The Indian Economic and Social Review*, Vol. XIV, No 3, July-September 1977, p. 405.
6. Jawahar Lal Nehru, *Discovery of India, Calcutta*, 1946, second edition, p.311.
7. *The Collected Works of Mahatma Gandhi* (hereafter referred to as Gandhi, CW), New Delhi 1958-1984, Vol. 57, p. 454.

1۔ پہلا بڑا چیلنج — 1857 کی بغاوت

1. R.C Majumdar, editor, *British Paramountcy and Indian Renaissance*, part I, Bombay, 1963, p. 513.
2. S.N. Sen, *Eighteen Fifty-Seven*, Delhi 1957, pp. 5-10.

3. T.R. Holmes, *A History of the Indian Mutiny*, London, 1998, p. 50.

4. Harprasad Chattopadhyaya, *Sepoy Mutiny, 1857 - A Social Study and Analysis*, Calcutta, 1957, p.1.

5. E.I. Brodki, Property Mutations and the Mutiny in Rohilkhand, Journal of Asian Studies, August 1969, p. 66.

6. Talmiz Khaldun, 'The Great Rebellion' in P.C Joshi, editor, *Rebellion, 1857 - A Symposium*, Delhi, 1957, pp. 36-44.

2۔ سول اور قبائلی بغاوتیں

1. L. Natrajan, 'The Santhal Insurrection: 1855-56,' in A.R. Desai, editor, *Peasant Struggles in India*, 1979, p. 137.

2. Ranajit Guha, *Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India*, Delhi 1983, pp, 112.

3. L. Natrajan *op.cit.*, p. 143.

4. Suresh Sing, *The Dust Storm and the Hanging Mist*, Calcutta, 1966, pp. 8

2۔ 1857 کے بعد کسان تحریکیں اور کسان بغاوتیں

1. Blair B. King, *The Blue Mutiny - the Indigo*

Disturbances in Bengal 1859-1862, Philadelphia, 1966, p.145.

2. *Ibid.*, p.73.

3. *Ibid.*, p. 120.

4۔ کانگریس کا قیام ـــــ ایک فرضی داستان

1. Lajpat Rai, *Young India*, Delhi 1965 edition, first published in 1916, pp. 112-6.

2. R. Palme Dutt, *India Today*, Bombay, 1949 edition, pp. 288 ff.

3. M.S. Golwalkar, *We or Our Nationhood Defined*, Nagpur, 1947 edition, first published in 1939.

4. William Wedderburn, *Allan Octavian Hume*, C.B., London 1913, pp. 79 ff.

5. Lajpat Rai, *op.cit.*, p. 114.

6. Gurmukh Nihal Singh, *Landmarks in Indian Constitutional and National Development*, Vol. I 1600-1919, Delhi 1952, third edition, p. 105.

7. C.F. Andrews and Girija Mukerji, *The Rise and Growth of the Congress in India*, London, 1938, p.128.

8. R.Plame Dutt, *op.cit.*, p. 291.

9. Briton Martin, *New India, 1885*, Bombay, 1970, pp. 65 ff.

10 Dufferin to Kimberley, 20 Aug. 1986, *Dufferin Papers* (DP), Vol. 37. Reel no. 525; Hume to Dufferin, 31 July 1886, D P, Vol. 52, Reel no. 532; Hume to A. P. MacDonnell, no date, Letter no. 521, DP, Vol. 54, Reel no. 534. Dufferin to Gratham Geary, 27 Oct. 1888, DP, Vol. 54, Reel no. 534.

11. Hume to Dufferin, 27 November 1886, *DP*, Vol. 50, Reel no. 530.

12. *Ibid.*

13. W.C. Bonnerji, *Introduction to Indian Politics*, Madras,1898, p.VII.

14. Briton Martin, *op.cit.*, pp. 74-5.

15. B.L. Grover, *British Policy towards Indian Nationalism 1885-1909*, Delhi, 1967, pp. 181 ff.

16. Dufferin to Reay, 17 May 1884, *DP*, Vol. 47, Reel no. 528.

17. Dufferin to Colvin, 9 October 1888, *DP*, Vol. 54, Reel no. 534.

18. Dufferin to Reay, 17 May 1885, *DP*, Vol. 47, Reel no 528.

19. Reay to Dufferin, 24 May 1885, and 4 June 1885, *DP*, Vol. 47, Reel no. 528.

20. Dufferin to Secretary of State, 3 February 1884, and

7 August 1884, volume 18, Reel no. 517.

21. Dufferin to Nthbrook, 23 June 1886; and Dufferin to Henry S. Maine, 9 May 1886, *DP*, Vol. 37, Reel no. 525.

5۔ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام — ایک حقیقت

1. *Indian National Congress*, containing full texts of all Presidential Addresses, reprint of all the Congress Resolutions, etc., Madras, no date, Part I, p. 386.

2. *Ibid.*, p. 3.

3. I.P. Minayeff, *Trends in and Diaries of India and Burma*, Calcutta, no date, p. 120.

4. S.R. Mehrotra, *Emergence of the Indian National Congress*, Delhi, 1971, p. 418.

5. Indian National Congress, *op.cit.*, Part III, p. 16.

6. *Ibid.*, Part III, pp. 17-8.

7. *Ibid.*, Part I, pp. 11-2.

8. G.K.Gokhale, *Speecehs of Gopal Krishna Gokhale, Madras, 1916*, second edition, p. 929.

9.R.G. Pradhan, *India's Struggle for Swaraj*, Madras, 1930, p. 20.

10. Indian National Congess, Part I, *op.cit.*, p. 3.

11. R.P. Masani, *Dadabhai Naoroji: The Grand Old*

Man of India, London, 1939, p. 441.

12. Gokhale, *Speeches*, p. 1113.

13. W. Wedderburn, *Allan Octavian Hume*, pp. 63-4.

6۔معاشرتی و مذہبی اصلاح اور قومی بیداری

1. Sophia Dobson Collet, *Life and Letters of Rammohan Roy*, Calcutta, 1913, p. 124.

2. *Life and Work of Brahmananda Keshav*, edited by P.S Basu, Calutta, 1940, p. 63.

3. J.C. Ghose, editor, *English Works of Rammohan Roy*, Allahabad, 1906, p.312.

4. Mahadev Govind Ranade, *The Miscellaneous Writings*, Bombay, 1951, p. 191.

5. P.S. Basu, *op.cit.*, p. 147.

6. *Writing and Speeches of Sir Syed Ahmed Khan*, edited by Shan Mohammad, Meerut, 1972, p. 117.

7. Dayanand Saraswati, *Satyartha Prakash*, English Translation by Druga Prasad, New Delhi, 1972, p. 83.

8. M.K. Sanoo, *Narayana Guru Swami*, in Malayalam, Irininjalakuda, 1976, p. 441.

9. P.J. Thomas, *The Growth of Higher Education in Southern India Madras*, no date, p. 5.

7۔ کلونیل حکومت کی اقتصادی پالیسی

1. For a short treatment of the subject, see Bipin Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India, 1966*, Chapter I. For details, see Dadabhai Naoroji, *Poverty and Un-British Rule in India*, London, 1901, and Speeches and Writings, Madras, no date.

2. R.C. Dutt, *Economic History of India in the Victorian Age*, London, sixth edition, first published in 1903, p. XVI.

3. G.V. Joshi, *Writings and Speeches*, Poona, 1992, p. 616.

4. M.G. Ranade, *Essays on Indian Economics*, Bombay, 1898, p. 96.

5. For a detailed treatment, see Bipin Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism and Colonialism in Modern India*, New Delhi, 1987 reprint.

6. Curzon, Speeches, Vol. I Calcutta, 1900, p. 34

7. Naoroji, *Poverty and Un-British Rule in India*, pp. 34, 568-9, Speeches, p. 169.

8. February 1903, p. 193.

9. *New India*, 12 August 1901.

10. G.V. Joshi, *op. cit.*, pp. 687-8.

11. Ram Gopal, *Lokamanaya Tilak*, Bombay, 1965

reprint, p. 148.

12. For details, see Bipin Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism of India*, Chapter XII.

13. Naoroji, *Poverty and Un-British Rule in India*, p. 216.

14. R.C. Dutt, *Economic History of India Under Early British Rule*, London, 1956, 8th impression, pp. xi and 420.

15. Abstract of the Proceedings of the Council of the Governor-General of India, 1896, Vol. XXXV, p. 85.

16. Naroji, *Speeches*, pp. 328, 329.

17. Naroji, *Poverty and Un-British Rule in India*, pp. 224-5.

18. Naroji, *Speeches*, p. 389.

19. *India*, London, 2 September 1904.

20. Naroji, *Speeches*, p. 671

21. *Ibid.*, p.73.

8۔ پریس کی آزادی کے لیے جدوجہد

1. J. Natrajan, *History of Indian Journalism - Part II of the Report of the Press Commission*, New Delhi, 1955, p.15.

2. Dufferin to Secretary of State, 21 March and 17 May

1886, *Dufferin Papers.*

3. Lord Curzon, *Speeches*, Vol. IV, Calcutta, 1906, p. 75.

4. J. Natrajan, *op.cit.*, p. 135

5. D.V. Tahmankar, *Lokamnya Tilak*, London, 1956, p 73; and Ram Gopal, *Lokmanya Tilak*, p. 133.

6. R.G. Pradhan and A.K. Bhagwat, *Lokamanya Tilak - A Biography*, Bombay, 1958, p. 111.

7. D. Keer, *Lokamanya Tilak*, Bombay, 1969, p. 141.

8. Pradhan and Bhagwat, *op. cit.*, pp. 117-8.

9. *Ibid.*, pp. 219-21.

10. *Ibid.*, p. 222.

11. *Ibid.*, p. 228.

12. V.I. Lenin, *Collected Works*, Moscow, 1963, Vol. 15, p. 184.

13. Gandhi, *CW*, Vol. 23, p. 120.

9۔ قانون ساز کونسلوں میں نشر و اشاعت

1. R.C. Majumdar, editor, *British Paramountcy and Indian Renaissance, Part I*, p. 759.

2. Bipin Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, p. 534 f.n.

3. *Ibid.*, p. 553, f.n.

4. Madan Mohan Malaviya, *Speeches*, Madras, no date, pp. 26-7, 30-1.

5. Pherozeshah M. Mehta, *Speeches and Writings*, edited by C.Y. Chintamani, Allahabad, 1905, pp. 405-6.

6. Homi Mody, Sir Pherozeshah Mehta, *A Political Biography, Bombay*, 1963, edition, pp. 185-6.

7. *Ibid.*, p. 188.

8. Speeches and Writings, *op.cit.*, pp. 334, 348.

9. *Ibid.*, p. 350.

10. *Ibid.*, p. 663.

11. *Ibid.*, p. 564.

12. Gokhale, *Speeches*, pp. 1-29.

13. B.R. Nanda, Gokhale, *The Indian Moderates and the Raj*, Delhi, 1977, p. 138.

14. *Ibid.*

15. Bipin Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, p. 4 f.n.

16. Abstract of the Proceedings of the Council of the Governor-General of India, assembled for the purpose of making Laws and Regulations, 1904, Vol. XLII, p. 542.

17. Nanda, *Gokhale*, pp. 358-9.

18. Pradhan and Bhagwat, Lokamanya Tjlak, p. 259.

10۔ سودیشی تحریک1903-1908

1. B.L. Grover, *A Documentary Study of British Policy Towards Indian Nationalism, 1885-1909*, Delhi, pp. 224-5.

2. S. Gopal, *British Policy of India, 1858-1905*, Cambridge, 1965, p. 270.

3. *Ibid.*, pp. 270-1.

4. *Ibid.*

5. Sumit Sarkar, *The Swadeshi Movement in Bengal, 1903-8*, New Delhi, 1973, p. 20.

6. Haridas and Uma Mukherjee, *India's Fight in Freedom or the Swadeshi Movement, 1905-06*, Calcutta, 1958, p. 162.

7. Sumit Sarkar, *op.cit.*, p. 65.

8. Indian National Congress, containing full texts of all Presidential Addresses, etc., Part I, p. 863.

9. Bipin Chandra, *Modern India*, New Delhi, 1969, p-. 244.

10 Sandhya, 21 November 1906, in Sumit Sarkar, *op. cit.*, p. 69.

11. Haridas and Uma Mukherjee, *op.cit.*, p. 109.

11۔ کانگریس میں تفریق اور انقلابی تخریف پسندی کا ظہور

1. Grover, *British Policy Towards Indian Nationalism*, p. 183.
2. R.C. Majumdar, *History of Freedom Movement in India*, Vol. I, Calcutta, 1962, p. 413.
3. Nanda, *Gokhale*, p. 176.
4. Quoted in R.P. Masani, *Dadabhai Naroji: The Grand Old Man of India*, p. 459.
5. C.H. Philips, editor, *The Evolution of India and Pakistan 1858-1947 Select Documents*, London, 1965 edition, p. 182.
6. Nanda, *Gokhale*, p. 182.
7. *Speeches and Writings of Gopal Krishna Gokahale*, edited by D.G. Karve and D.V. Ambedkar, Bombay, 1966, Vol. Two, p. 243.
8. Nanda, *Gokhale*, p. 282.
9. *Ibid.* p. 293.
10. *Ibid.*
11. *Lajpat Rai: Writings and Speeches*, edited by V.C. Joshi, 2 Vols., Delhi, 1996, Vol. I, p. 108.
12. Nanda, *Gokhale*, p. 288.
13. *Sri Aurobindo Karmayogin*, edited from Sri Aurobindo Ashram, Pondicherry, 1972, p. 1.
14. C.H. Philips, *op.cit.*, p. 85.
15. Haridas and Uma Mukherjee, *India's Fight for*

freedom or the Swadeshi Movement 1905-1906, Calcutta, 1958, p. 166.

16. Hirendranath Mukherjee, *India Struggles for Freedom*, Bombay, 1948, edition, p. 96.

12۔ پہلی جنگ عظیم اور ہندوستانی قوم پرستی: غدر

1. Puri, *Ghadar Movement*, Amritsar, 1983, pp. 31-2.
2. *'Ghadar Conspiracy Report, 1913-16,'* by Isemonger and Salttery, 1922, reproduced in Bhai Nahar Singh and Kirpal Singh, editors, *Struggle for Free Hindustan, (Ghadar Movement)*, Vol. I. *1905-1916*, New Delhi, 1986, pp. 17-21.
3. *Ibid.*, pp 46 -7.
4. Harish K. Puri, *op.cit.*, pp. 69-70
5. Sohan Singh Josh, *Baba Sohan Singh Bhakna: Life of the Founder of the Ghadar Party*, New Delhi, 1970, pp. 30-1.
6. Ghadar di Goonj, No. 1, poem 8, quoted in Harish K. Puri, *op.cit.*, pp. 73-4
7. Sohan Singh Josh, *op.cit.*, p. 45.
8. Harish K. Puri, *op.cit.*, pp. 121-2.
9. *Ibid.*, p. 124.
10. *Ibid.*, p. 113.

11. See, Emily C. Brown, *Har Dayal: Hindu Revolutionary and Rationalist*, Tuscon, 1975, for a full account of Har Dayal's life and ideas.

13۔ ہوم رول لیگ تحریک اور اس کی ناکامی

1. Letter to the Press, August 2, 1914, Bal Gangadhar Tilak, *His Writings and Speeches*, Madras, 1919, p. 392.

2. Bombay Police 1915, par. 568 (b), cited in H.F. Owen, 'Towards Nation-Wide Agitation and Organisation: The Home Rule Leagues, 1915-18,' in D.A. Low, *editor, Soundings in Modern South Asian History*, Berkeley and Los Angeles, 1968, p. 167, n. 42.

3. G.P. Pradhan and A.K Bhagwat, *Lokamanya Tilak: A Biography*, Bombay, 1959, pp. 265-6.

4. *Ibid.*, pp. 266-7, *Tilak's Writings and Speeches*, pp 116-17, has a slightly different translation of the passage.

5. *Ibid.*, p. 269, Tilak's Writings and Speeches, different translation of the passage.

6. Pradhan and Bhagwat, *op.cit.*, p. 271.

7. *Ibid.*, p. 306.

8. Home Rule Speech at Ahmednagar, May 31, 1916,

Tilak's Writings and Speeches, p. 142.

9. Pradhan and Bhagwat, *op. cit.*, p.271.

10. Ibid., p. 273.

11. A.M. Zaidi and S.G. Zaidi, *The Encycopedia of the Indian National Congress, Vol. 7,* 1916-20, p. 48.

12. *Tilak's Writings and Speeches*, pp. 202-03.

13. Pradhan and Bhagwat, *op.cit.*, p. 284.

14. Edwin S. Montagu, *Indian Diary,* London, 1930, p. 157.

15. S.R. Mehrotra, *India and the Commonwealth, 1885-1929,* London, 1965, p. 103.

14- گاندھی جی کی سیاسی زندگی کی ابتدائی سرگرمیاں

1. One of the best accounts of this journey is in Chandran D.S. Devenesan, The Making of the Mahatma, Madras, 1969, pp. 229-45.

2. Gandhi, *CW*, Vol. 1, p .61.

3. B.R. Nanda, *Mahatma Gandhi,* New Delhi, 1958, p. 117.

4. D.G. Karve and D.V. Ambedakar, editors, *Speeches and Writings of Gopal Krishna Gokhale, Volume 2: Political,* p. 444.

5. G.A.Natesan, 'Reminiscences,' in Gandhi, p.215, on

Gandhi's 75th birthday in 1944, cited in B.R.Nanda, *op.cit.*, pp. 154-5

6. Gandhi, *CW*, Vol. XIV, p. 340.

7. *Ibid.*, p. 339.

8. M.K. Gandhi, *An Autobiography or The Story of My Experiment with Truth*, Ahmadabad, 14th Reprint, first published in 1927 and 1929, pp. 365-6.

15۔ عدم تعاون تحریک 1920-22

1. Gandhi, *CW*, Vol. 17, p. 504.

2. Prabhudas Gandhi, 'Recalling Memories of 1921,' in *Government of India, 1921, Movements: Reminiscences*, New Delhi, 1971, p. 85

3. Prabhudas Ghandhi, *op.cit.*, pp. 86-7 and Gandhi, CW, Vol. 21, pp. 180-1.

4. D.G.Tendulakar, Mahatma, *Life of Mohandas Karamchand Gandhi*, 8 Volumes, New Delhi, 1969 reprint, Vol. 2, p. 52.

5. Hitresranjan Sanyal, 'Congress Movements in the villages of Eastern Midnapore, 1921-31,' in *Asie du Sud, Traditions et Changements, Colloques Internationaux du Centre National de la Recherche Scientific*, No. 582, Paris.

6. Atlury Murali, *Social Change and Nature of Social Participation in National Movement in Andhra, 1905-1934*, Unpublished Ph. D Thesis, Centre for Historical Studies, Jawaharlal Nehru Univeristy, New Delhi. 1985, pp. 284-90

7. See Chapter 16 below.

8. See Chapter 16 below.

9. See Chapter 18 below.

10. R.P.Dutt, *India Today*, pp. 324-9

11. Majid H. Siddiqui, *Agrarian Unrest in North India: The United Provinces, 1918-22*, New Delhi, 1978, p 201.

12. Atlury Murali, *op.cit.*, pp. 288-90.

13. B.L. Grover, *British Policy Toward Indian Nationalism 1885-1909*, Delhi, 1967, pp. 181 ff.

14. Gandhi, *CW*, Vol. 22, p. 457.

15. *Ibid.*, p. 458.

16۔ کسان تحریکیں اور 1920 کی دہائی میں نیشنلزم

1. For the Kisan Sabha and Eka Movements in Avadh, see Majid H. Siddiqi, Agrarian Unrest in North India: The United Provinces (1918-22), New Delhi, 1978; Kapil Kumar, Peasants in Revolt: Tenants, Congress

Landlords and the Raj in Oudh, 1886-1922, New Delhi, 1984; S. Gopal, *Jawaharlal Nehru: A Biogrgaphy*, Vol. 1, London, 1975, pp. 42-57; Gyandendra Pandey, 'Peasant Revolt and Indian Nationalism' in Ranjit Guha, editor, *Subaltern Studies 1*, Delhi, 1982.

2. For the Mappila revolt in Malabar, see K.N. Pannikar, 'Peasant Revolts in Malabar in the Nineteenth and Twentieth Centuries,' in Dewey and Moplah Violence in the 19th and 20the Centruies,' in Dewey and Hopkins, editors, *The Imperial Impact: Studies in the Economic History of India and Africa*, London, 1978; Stephen F. Dale, *Islamic Society on the South Asian Frontier: The Mappilas of Malabar, 1498-1922*, New York, 1980, Chapter 7.

3. For the no-tax movement in Bardoli, see Mahadev Desai, *The story of Bardoli*, Ahmedabad, 1957; Shirin Mehta, *The Peasantry and Nationalism in New Delhi, 1984*; Ghanshyam Shah, Traditional Society and Political Mobilisation: The experience of Barodoli Satyagraha (1920-1928),' in *Contributions to Indian Sociology*, New Series, New Delhi, No. 8. 1974, pp. 89-107; and Interviews with Uttamchand Shah Bardoli, 22 and 25 June 1985. Chimanlal Pranlal Bhatt. Vedchi,

26 June 1985, and Kasanbhai Ukabhai Choudhy, Vedchi , 26 june 1985, Khushalbhai Patel, Sankri, 25 June 1985, Vallabhbhai Khushalbhai Patel, Sankari 25 June 1985, Chhotubhai Gopalji Desai, Puni, 25 june 1985.

4. Interview with Kalyanji V. Mehta, cited in Shirin Mehata, The Peasantry and Nationalism, pp. 88-9.

5. *Ibid.*, p. 177.

6. *Ibid.*, pp. 182-3.

7. Gandhi, *CW*, Vol. 36, p. 73.

17۔ ہندوستان کا محنت کش مزدور طبقہ اور قومی تحریک

1. *Indian National Congress*, containing full texts of all Presidential Addresses, etc., Part I, p.12.

2. Quoted in Bipan Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, pp. 360-1.

3. G. Subramaniya Iyer, *Some Economic Aspects of British Rule in India*, Madras, 1903, pp. 175-8, 218-32.

4. Sumit Sarkar, *The Swadeshi Movement in Bengal, 1903-1908*, pp. 183-4.

5. *AITUC - Fifty Years. Documents*, New Delhi, 1973, pp. 30, 35.

6. *Ibid.*, pp.78-9.

7. *Lala Lajpat Rai: Writings and Speeches*, Vol. II, p. 57.

8. *Ibid.*, pp. 60-1.

9. Quoted in Balabushevich and Dyakov, editors, *A Contemporary History of India*, New Delhi. 1964, p. 150.

10. Lajpat Jagga, 'Colonial Railwaymen and British Rule: A Probe into Railway Labour Agitation in India, 1919-1922,' in Bipan Chandra, editor, *The Indian Left: Critical Appraisals*, New Delhi, 1983, pp. 104-06.

11. Ravinder Kumar, 'From Swaraj to Puma Swaraj: Nationalist Politics in the city of Bombay, 1920-32,' in D.A. Low, editor, *Congress and the Raj, Facets of the Indian Struggle 1917-1947*, London, 1977, p. 88.

12. J.B. Kripalani, Gandhi, His 'Life and Thought,' p. 78, quoted in Sukomal Sen, *(Working Class of India, History of Emergence and Movement 1830-1870)*, Calcutta, 1977, pp. 152-3. In Chapter 39 below we see how in another contest Gandhiji went beyond the trusteeship theory to argue that land belonged to the tiller and landlords could 'cooperate by running away.'

13. H. Williamson, India and Communism, *National Archives of India (NAI)*, p. 126. Williamson was the Director, Intelligence Bureau, Government of India.

Also see, Home Political Department, F1. 7/16/34 in Subodh Ray, editor, *Communism in India*, Unpublished Documents, 1935-45, Calcutta, 1976, p. 103.

14. Guidelines of the History of the Communist party of India, issued by Central Party Education Department, New Delhi, 1974, p. 35.

15. Balabushevich and Dyakov, *op.cit.* p.241.

16. *Ibid.*, p.321; and Sukomal Sen, *op.cit.*, p.364.

18۔ گوردوارہ سدھار اور مندر داخلہ تحریک

1. Mohinder Singh, *The Akali Movement*, Delhi, 1978, p. 47.

2. *Ibid.*, Appendix IV.

3. *Ibid.*, pp. 149-50.

4. A.K. Gopalan, *In the Cause of the People*, New Delhi, 1973, p. 38.

5. E.M.S. Namboodiripad, *How I became a Communist*, *Trivandrum*, 1976, p. 123.

19۔ ٹھہراؤ کا زمانہ......سوراج پارٹی، تغیر مخالفین (No-changers) اور گاندھی جی

1. *Indian Annual Register*, 1923, Vol. II, pp.143-4.

2. B.R. *Nanda,The Nehrus: Motilal and Jawaharlal,*

London, 1962, p. 234.

3. *Ibid.*, pp. 239-40.

4. Gandhi, *CW*, Vol. 24, p. 109.

5. *Ibid.*, Vol.25, p. 310.

6. *Ibid.*, Vol. 23, p. 341.

7. *Ibid.*, Vol.24, p. 356.

8. *Ibid.*, Vol.25, p. 275.

9. *Ibid.*, p. 335.

10. *Ibid.*, p. 310.

11. *Indian Annual Register*, 1923, Vol II, p. 217.

12. Manoranjan Jha, *Role of Central Legislature in the Freedom Struggle*, New Delhi, 1972, p. 82.

13. *Ibid.*, p. 87.

14. *Lajpat Rai: Writings and Speeches, Vol. II*, p. 260.

15. *Leonard A. Gordon, Bengal: The Nationalist Movement 1876-1940*, Delhi, 1974, p. 217.

16. Gandhi, *CW*, Vol. 30, p. 371.

17. *Lajpat Rai: Writings and Speeches, Vol. II*, pp. 430, 437.

18. *The Voice of Freedom -Selected Speeches of Pandit Motilal Nehru*, edited by K.M. Pannikar and A. Pershad, Bombay, 1961, pp. 371 ff., 40 ff.

19. Manoranjan Jha, *op.cit* ., p.142.

20. *Ibid.*, p. 143.

21. Gandhi, *CW*, Vol. 40, pp. 201-2.

22. *Ibid.*, Vol. 33, p. 347.

20۔ بھگت سنگھ، سوریہ سین اور انقلابی تشدد پسند

Interviews with the following have been very useful: Shiv Varma, New Delhi, 12 and 14 September 1984; Jaidev Kapur, New Delhi, 10 and.14 September 1984; Kishorilal, Jullundhur (Punjab), 1 April 1985; Bejoy Kumar Sinha, Hyderabad, 17 June 1985; Durga Das Khanna, Chandigarh, 10 and 11 November 1983; Tridip Choudhry, New Delhi, 27 November 1983.

1. Jagmohan Singh and Chamanlal, *Bhagat Singh aur unke Sathiyon ke Dastavez (The Documents of Bhagat Singh and His Comrades)*, New Delhi, 1986, in Hindi, p. 266.

2. Kalpana Joshi (nee Dutt). 'Chittagong Uprising and the Role of Muslims,' in *Challenge - A Saga of India's Struggle for Freedom*, edited by Nitish Ranjan Ray, et. al., New Delhi, 1984, p. 51.

3. Anand Gupta, 'The Immortal Surya Sen,' in *Ibid.*, p. 89.

4. Shiv Varma, editor, *Selected Writings of Shaheed*

Bhagat Singh, New Delhi, 1986, Appendix I.

5. *Proceedings of the HRA Council Meeting*, 1924.

6. Shiv Varma, *op.cit.*, Appendix II.

7. *Ramprasad Bismil, Autobiography*, edited by Banarsi Das Chaturvedi, Delhi, 1966, in Hindi.

8. Shiv Varma, *op.cit.*, p.95.

9. *Ibid.*, p. 130.

10. *Ibid.*, pp. 137 -8.

11. *Ibid.*, p. 137.

12. Jagmohan Singh and Chamanlal, *op.cit.*, p. 267.

13. Shiv Varma, *op.cit.*, pp. 190, 198-9.

14. *Ibid.*, p. 74.

15. Quoted in Gopal Thakur, *Bhagat Singh: The Man and His Ideas*, New Delhi, 1952, p. 39.

16. Vishwanath Vaishampayan, *Amar Shahid Chandrasekhar Azad*, Banaras, 1976, in Hindi, Parts 2-3, Appendix 5.

17. Shiv Varma, *op.cit.*, p. l09.

18. Sohan Singh Josh, *My Meetings with Bhagat Singh and on Other Early Revolutionaries*, New Delhi, 1976, pp. 13-5; and Jagmohan Singh and Chamanlal, *op.cit.*, pp.186-9, 244-5.

19. Jagmohan Singh and Chamanlal, *op.cit.*, pp. 190

-3.

20. *Ibid.*, pp. 248 ff.

21. *Rules and Regulations of the Naujawan Bharat Sabha*, Punjab, 1 May 1928, *Meerut Conspiracy Case, 1929*, Exhibit no. P 205 (T); *Reports on the Naujawan Bharat Sabha, Home (Political) Proceedings*, F.130 & KW (1930).

22. Bhagat Singh, *Why I am an Atheist*, with an introduction by Bipan Chandra, Delhi, 1979. Also in Shiv Varma, *op.cit.*, pp. 139 ff. and pp. 117 ff.

21۔ منزلاتاطوفان

1. Gandhi, *CW*, Vol. 35, pp. 454-5.

2. Sumit Sarkar, *Modern India, 1885-1947*, New Delhi, 1983, p. 266.

3. Gandhi, *CW*, Vol. 38, p. 416.

4. Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 2, p. 176.

5. *Ibid.*, p. 381.

6. Gandhi, *CW*, Vol. 41, p. 499.

7. *Ibid.*, p. 240.

8. *Ibid.*, pp. 240-1.

9. *Ibid.*, pp. 499 -500.

10. *Selected Wroks of Jawaharlal Nehru*, general

editor, S. Gopal, 15 volumes, New Delhi, 1972-1982, Vol. 4, p. 198. Hereafter referred to as Nehru, *SW*.

11. *Ibid.*, p. 192.

12. *Ibid.*, p. 195.

13. Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 3, pp. 8-9.

22۔ سول نافرمانی تحریک 1930-31

This account of the Civil Disobedience Movement owes a lot to our interviews with participants in the movement; in particular, Sita Poviah, Chitra Poviah and Lata Poviah, Bombay, 21 May 1985; Najuben Dastoor, Bomay, 16 June 1985; Pramodaben Gosalia, Bombay, 22 May 1985; Pashabhai Bhailalalbhai Arnin, Anand (Gujarat), 4 July 1985: Tribhuvandas Patel, Anand, 1 and 5 July 1985; Umashankar Joshi, Ahmedabad, 9 July, 1985; Madhavlal Shankarlal Pandya, Piplov, Borsad (Gujrat), 3 July 1985; A.K. Raman Kutty, Palghat (Kerala), 20 May 1984; A.V. Kuttimalu Arnma, Ernakulum, 23 May 1984; Bhaktavaisalam, Madras, 4 June 1984; K. Subramaniam 'Subri'. Madras, 7 June 1984 Sadhu Ram Sharma, Amritsar, 28 March 1985; Tunmala Durgambir Guntur, 23 June 1984; P.c. Sen, Calcutta, 19 January 1985; Atulya Ghosh, Calcutta, 27

July 1986; R.R. Diwakar, New Sethi, 4 May 1986, Madan Mohan Misra, Rae Bareili, 26 April 1986; Rampal Trivedi, Lucknow, 27 April 1986.

1. Gandhi, *CW*, Vol. 42, p. 389.
2. *Ibid.*, p. 499.
3. Gandhi, *CW*, Vol. 43, p. 3.
4. *Ibid.*, p. 7.
5. *Ibid.*, pp. 46-7.
6. *Ibid.*, p. 37.
7. *Ibid.*
8. For an example of the kind of effort that was made at the local level, see Atlury Murali, *Social Change and Nature of Social Participation in National Movement in Andhra, 1905-1934*, pp. 653-60.
9. *Ibid.*, pp .659-60.
10. Gandhi, *CW*, Vol. 43, p. 37.
11. C.F.V. Williams, cited in David Arnold, 'The Politics of Coalescence: The Congress in Tamilnad, 1930-37,' in D.A. Low, editor, *Congress and the Raj*, p. 264.
12. For a discussion of British Policy towards the Civil Disobedience Movement, see D.A. Low, 'Civil Martial Law, 1930-34,' in D.A. Low, editor, *Congress and the Raj*.

13. Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 3, p. 41.

14. Gandhi, *CW*, Vol. 43, p. 219.

15. Nehru, *SW*, Volume 4, p. 183.

16. Interview with Usha Mehta, Bombay, 18 May, 1985.

17. *Ibid.*

18. Jawaharlal Nehru had summed up his immediate reaction to the signing of the Gandhi-Irwin Pact in the famous lines of T.S. Eliot:

'This is the way the world ends
Not with a bang but with a whimper.'

Jawaharlal Nehru, An Autobiography, New Delhi, 1962 reprint, p. 259.

19. Tanika Sarkar, 'The First Phase of Civil Disobedience in Bengal, 1930-1,' in *The Indian Historical Review*, New Delhi, July 1977 , Vol. IV, No. 1, pp. 90-92.

20. *Ibid.*, p. 80.

23۔ کراچی سے واردھا تک

1. Pattabhi Sitaramayya, *The History of Indian National Congress 1885-1935*, no place, 1935, p. 768.

2. *Ibid.*, pp. 779 ff; and *Indian National Congress Resolutions on Economic Policy, Programme and Allied*

matters, New Delhi, 1969, pp. 3 ff.

3. R. J. Moore, *The Crisis of Indian Unity 1917-1940*, Delhi, 1974, p. 314.

4. B.R. Nanda, *Mahatma Gandhi - A Biography*, Delhi, 1981 reprint, p. 314.

5. Gandhi, *CW*, Vol. 47, p. 369.

6. R.J. Moore, *op.cit.*, p. 289.

7. Nehru, *SW*, Vol. 6, p. 372.

8. *Ibid.*, p. 273.

9. Pattabhi Sitaramayya, *op.cit.*, p. 942.

10. Nanda, *Mahatma Gandhi*, p. 339.

11. Bisheshwar Prasad, *Bondage and Freedom*, Vol. II, New Delhi, 1979, p. A23.

12. Nanda, *Mahatma Gandhi*, p. 367.

13. Gandhi, *CW*, Vol. 55, p. 430.

14. *Ibid.*, Vol. 57, pp. 451,454.

15. Citations are too many for Sections V and VI. See *CW*, Vols. 51 to 56; or Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 3, pp. 159-245; and Vol. 4, pp. 14-63.

24۔ بائیں بازو کا ابھار

In writing this chapter, we have extensively used interviews with the following: S.A. Dange: 20 February

1984; S.M. Joshi, New Delhi, 29 February 1984; Achuta Menon, Trichur (Kerala), 21 May 1984; E.P. Gopalan, Pattarnbi (Kerala), 18 May 1984; Achyut Patwardhan, Bangalore, 7 December 1984; K. Lingaraju, Rajahmundry, 1 July 1984; Venkata Subiah, Pondicherry, 10 June 1984; Master Hari Singh, Chandigarh, 8 July 1982; N.C. Shekhar, Cannanore (Kerala), 15 and 16 May 1984; P. Balachandra Menon, Chittoor (Kerala), 20 May 1984; M. Govindan Nair, New Delhi, 24 May, 1984: K.C. George. Trivandrum, 27 May 1984; V.P. Chinthan, Madras, 15 June 1984; Karam Singh Mann, Jullundur (Punjab), 2 April 1985; S.G. Sardesai, Pune, 6 June 1985; M.R, Masani, Bombay, 26 May and 10 June 1985; Rohit Dave, Bombay, 21 May 1985; S.Y. Kolhatkar, Bombay, 23 May 1985; Dinkar Mehta, Bombay, 15 June I.9.85; Karnalashankar Pandya; Baroda, 29 and 30 June 1985; Ganga Saran Sinha, New Delhi, 16 December 1985; A.R. Desai, Bombay, 17 May and 13 June 1985; V.B. Karnik, Bombay, 20 .May, 1985; R.M. Jhambckar, Bombay, 22 May 1985; Batuk Desai, Bombay; 14 June 1985; P.B. Rangnekar, 28 May 1985; L.K. Oak , Bombay, 1985; Ramesh Sinha, Lucknow, 22 April 1986; Z.A. Ahmed,

Lucknow, 29 April 1986; N.G. Gore, 29 December 1986; Prem Bhasin , New Delhi, February 1987.

1. Jnananjan Pal, 'Bipin Chandra Pal,' in Atulchandra Gupta, *Studies in the Bengal Renaissance*, Jadavpur, 1958, p. 573.

2. S. Gopal, *Jawaharlal Nehru - A Biography*, Vol. One, p. 109.

3. Nehru, *SW*, Vol. 4, pp. 192-3.

4. *Ibid.*, Vol. 6, p. 16.

5. *Ibid.*, p. 124.

6. *Ibid.*, Vol. 7, pp. 180-1.

7. *Ibid.*, pp.76-7.

8. Mohit Sen, *The Indian Revolution; Review and Perspectives*, New Delhi, 1970, p. 35.

9. Nehru, *SW*, Vol. 7, pp. 60-1.

10. *Guidelines of the History of the Communist Party of India*, issued by Central Party Education Department, New Delhi, 1974, p. 46.

11. *Ibid.*, p. 54.

12. Sumit Sarkar, *Modern India*, p. 374.

13. Acharya Narendra Dev, *Socialism and the National Revolution*; Bombay, 1946, p. 4.

14. Girja Shankar, *Socialist Trends in Indian National*

Movement, Meerut. 1987, p. 57.

15. *Ibid.*, Appendix V.

16. *Ibid.*, p. 126.

17. Jayaprakash Narayan, *Why Socialism*, Banaras, 1936, p. I,

18. Nehru, *SW*, Vol.7, p. 76.

25۔ حکمت عملی پر بحث 1934-1937

1. Gandhi, *CW*, Vol. 55, p. 429.

2. Nehru, *SW*, Vol. 6, p. 281.

3. *Ibid.*, p. 271.

4. For detailed treatment, See Bipin Chandra, 'Jawaharlal Nehru and the Capitalist Class,' in his *Nationalism and Colonialism in Modern India*, pp. 177 ff.

5. For detailed treatment, See Chapter 38 below and Bipin Chandra, *Indian National Movement: The Long-term Dynamics*, New Delhi, 1988.

6. Gandhi, *CW*, Vol. 57, p. 425.

7. *Ibid.*, Vol.58, p. 11.

8. *Ibid.*, Vol. 61, p. 439.

9. *Ibid.*, Vol. 58, p. 318.

10. *Ibid.*, Vol. 59, pp. 3-12; Vol. 58, pp. 405-06; and Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 3, pp. 318-9.

11. Nehru, *SW*, Vol.7, p. 118.

12. Raj Mohan Gandhi, *A Warrior From the South -The Rajaji Story*, Bombay, 1978, p. 282.

13. D.A. Low, 'Civil Martial Law: The Government of India and the Civil Disobedience Movements, 1930-34,' in D.A. Low, editor, *Congress and the Raj*, p. 190.

14. R.J. Moore, 'The Problem of Freedom with Unity: London's India Policy 1917-47,' in *Ibid.*, p. 379.

15. Erskine to Craik, 20 April 1936, *Home Political Proceedings*, F. No. 4/ 6/36 (National Arc hives of India).

16. John Glendevon, *The Viceroy at Bay -Lord Linlithgow in India, 1936-43*, London, 1971, p. 52.

17. Nehru, *SW*, Vol. 7, pp. 185-7.

18. *Jawaharlal Nehru - A Bunch of Old Letters*, Written mostly to Jawaharlal Nehru, Bombay, 1958, pp. 156 and 157.

19. A.M. Zaidi and S.G. Zaidi, *The Encyclopaedia of Indian National Congress*, Volume 11: 1936-1938, New Delhi, 1980, p. 48.

20. *Ibid.*, p. A2.

21. *Ibid.*, pp. 41-2.

Our understanding of the period of Congress Ministries from 1937 to 1939 was enriched by interviews with large number of freedom fighters, in particular Keralyean, Calicut, 25 February and 12 May 1984; E.P. Gopalan, Pattambi (Kerala), 18 May 1984; B. Gopal Reddy, Nellore (Andhra Pradesh), 16 June 1984; C. Subrarnaniam, Madras, 2 June 1984; Soli Batliwala, Bombay, 26 May 1985; M.R. Masani, Bombay, 26 May and 10 June 1985; Kamalashankar Pandya, Baroda, 29 and 30 June 1985; Shekhar Ganguly, Patna, 27 November 1985; Rameshwar Prasad Misra, Lucknow, 28 April 1986.

1. For detailed discussion of S-T-S', See Chapter 38 below.

2. Gandhi, *CW*, Vol. 66, p. 16.

3. *Ibid.*, Vol. 65, p. 406.

4. Nehru, *Discovery of India*, pp. 321-2.

5. Gandhi, *CW*, Vol. 66, p. 63.

6. Rajmohan Gandhi, *The Rajaji Story 1937-72*, Bombay, 1984, p. 7.

7. S. Gopal, *Jawaharlal Nehru -A Biography*, Vol. 1, p. 230.

8. Quoted in Visalakshi Menon, 'The Indian National

Congress and Mass Mobilization - A Study of U.P. 1937-39,' *Studies in History*, Vol. II, No.2, July -December 1980, New Delhi, p. 115.

9. Quoted in Gyanesh Kudaisya, *Office Acceptance and the Congress I937-1939: Premises and Perceptions*, M.Phil dissertation, Centre for Historical Studies, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, pp. 110 and 93.

10. Nehru, *Discovery of India*, p. 321.

11. *Annual Report of the Federation of Indian Chambers of Commerce and Industry, 1938*, pp. 27, 30, 83-7, 113, 117, 120-2.

12. *AICC*, G-D/1937, Nehru Memorial Museum and Library.

13. Visalakshi Menon, *op.cit.*

14. S. Gopal, *op.cit.*, p. 231.

15. Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 4, p. 276.

16. R. Palme Dutt, *India Today*, pp. 491-2.

17. Gandhi, *CW*, Vol. 68, pp. 112-3. Also see *CW*, Vol. 66, pp. 268-9.

18. See, for example, *Ibid.*, Vol. 66, pp. 300-02.

19. *Ibid.* Vo1. 68, p. 195.

20. Tendulkar, *Mahatma*, Vol.5, p. 94. A different

translation is given in Gandhi, *CW*, Vol. 69, p. 210.

21. Gandhi, *CW*, Vol. 68, p. 125.

22. Nehru, *SW*, Vol. 8, p. 388.

23. Gandhi, *CW*, Vol. 70, p. 291.

24. R. Coupland, *Indian Politics 1936-1942*, Madras, 1944, p. 156.

25. Nehru, *Discovery of India*, p. 326.

26. *Guidelines of the History of the Communist Party of India*, p. 45.

27. Visalakshi Menon, *op.cit.*, p. 140.

28. A.M. Zaidi and S.G . Zaidi, editors, *The Encyclopaedia National Congress*, Vol. Twelve, p. 255.

30 ۔ 1927ء اور 1940 کی دہائیوں میں کسان تحریکیں

1. Gandhi, *CW*, Vol. 46, pp. 200-03.

2. For the text of the Congress Agrarian Programme sec A.M. Zaidi and S.G. Zaidi, *The Encyclopaedia of the Indian National Congress*, Volume II, 1936-38, New Delhi, 1980, pp. 212-3.

3. M.A. Rasul, *A History of the All India Kisan Sabha*, Calcutta, 1974, p. 9.

4. See Chapter 26 above.

5. K. Gopalankutty, 'The Integration of Anti-Landlord Movement with the Movement Against Imperialism -

The Case of Malabar, 1935-39.,' in Bipin Chandra, editor, *The Indian Left: Critical Appraisals*, New Delhi, 1983; A.K. Gopalan, *In the Cause of the People: Reminiscences*, Madras, 1973, Chs.6-12, and interviews with E.P. Gopalan, Pattarnbi, 18 May 1984 , K. Madhavan, Kanhangad, 14 May 1984, K.P.R. Gopalan, Cannanore, 16 May 1984, K. Keralyean, Calicut, 25 February and 17 May 1984. E. Nayanar, Trivandrum, 25 May 1984

6. N.G. Ranga, *Fight for Freedom: Autobiography*, Delhi, 1968; P. Sundarayya, *Telangana Peoples' Struggle and. its Lessons,* Calcutta, 1972, pp.139-147; M.A. Rasul, op.cit., and Interviews With N.G. Ranga, Nidobrulu, 22 June 1984, Uddaraju Ramarnn, Vijayawada, 25 June, 1984, Kolah Venkaiah, Guptur, 5 July 1984 .

7. Walter Hauser, *The Bihar Provincial Kisan Sabha, 1929-1942: A Study of an Indian Peasant Movement,* Unpublished Ph.D. dissertation, University of Chicago, 1962; Microfilm, Nehru Memorial Museum and Library, New Delhi; Gyan Prakash Sharma, *Congress, Peasant Movement and Tenancy Legislation in Bihar, 1937-1939,* Unpublished M.Phil dissertation, CHS,

Jawaharlal Nehru University, New Delhi, 1979; Shajanand Saraswati, *Mera Jeevan Sangharsh*, in Hindi, Delhi, 1985 edition.

8. Master Hari Singh, *Punjab Peasant in Freedom Struggle,* Volume 2, New Delhi. 1984; Bhagwan Josh, *Communist Movement in Punjab*, Delhi, 1979; Mridula Mukherjee, *'Communists and Peasants in Punjab: A Focus on the Muzara Movement in Patiala, 1937-53,'* in Bipan Chandra, editor, *The Indian Left: Critical Appraisals.* Pp. 40-46; Interviews with Jagjit Singh in Lyallpuri, Ludhiana, 29 May 1981 , G.S. Randhawa, New Delhi, 14 September 1981, Master Hari Singh, Chandigarh, 8 July 1982, Bhagat Singh Bilga, Phillaur, 17 November 1983 ,' Chain Singh Chain, Jullundur, 14 November 1983.

9. Mridula Mukherjee, *op.cit.*; Mridula Mukherjee, 'Peasant Movement in a Princely State: Patiala, 1937-48,' in *Studies in History*, New Delhi, Vol. 1 , No.2. 1979; Master Hari Singh, op.cit., Ramesh Walia, *Praja Kandal Movement in East Punjab States*, Patiala, 1972; Interviews with Jagir Singh Joga, Joga, 16 May 1981, Brish Bhan, 18 May 1981 , Bachittar Singh, Patiala, 14 April 1981, G.S . Randhawa, New Delhi, 14 September

1981, Vaid Chajju Mal, New Delhi, 27 February 1981, Giani Bachan Singh, Sunam. 2 May 1981.

10. Sunil Sen, *Agrarian Struggle in Bengal*, New Delhi, 1972; Abani Lahiri, 'Last Battle of Bengal Peasants Under British Rule,' in Nisith Ranjan Ray *et.al.*, editors, *Challenge: A Saga of India's Struggle for Freedom*, New Delhi, 1984, pp. 374-86; Krishna Kant Sarkar, 'Kakdwip Tebhaga Movement,' in A.R. Desai, editor, *Peasant Struggles in India*, pp. A69-85; Ranjit Das Gupta, 'Peasants, Workers and Freedom Struggie, Jalpaiguri, 1945-47', in Ainit Kumar Gupta, editor, *Myth and Reality: The Struggle for Freedom in India, 1945-47*, New Delhi, 1987, pp. 435-49.

28۔ جنگ آزادی اور دیسی ریاستیں

1. Jawaharlal Nehru, *SW*, Vol. 4, pp. 192-3.

2. Gandhi, *CW*, Vol. 68, pp. 326-7.

3. A.M. Zaidi and S.G. Zaidi, *The Encyclopaedia of the Indian National Congress*, Volume 12, 1939-46, New Delhi, 1981, p. 162.

4. John R. Wood, 'Rajkot: Indian Nationalism in the Princely Context: The Rajkot Satyagraha of 1938-9,' in Robin Jeffrey, editor, *People, Princes and Paramount*

Power, New Delhi, 1978, p. 260.

5. *Ibid.*

6. Gandhi, *CW*, Vol. 69, pp. 162-6 and 168-71.

7. Ramanand Tirtha, *Memoirs of Hyderabad Freedom Struggle*, Bombay, 1967, pp. 176-7.

8. For the struggle in Hyderabad, see P. Sundarayya, *Telengana People's Struggle and Its Lessons*, Calcutta, 1972; Ravi Narayan Reddy, *Heroic Telengana: Reminiscences and Experiences*, New Delhi, 1973; Raj Bahadur Gour *et.al.*, *Glorious Telengana Armed Struggle*, New Delhi, 1973; Ramanand Tirtha, *Memoirs of Hyderabad Freedom Struggle*, Bombay, 1967; N. Rarnesan, editor, *The Freedom Struggle in Hyderabad*, Vol. IV (1921-1947), Hyderabad, 1966; and Interviews with Devapalli Venkateswara Rao, Hyderabad, 7 July, 1984, Ravi Narayan Reddy, Hyderabad, 8 July 1984, Arutla Ramachandra Reddy, Hyderabad, 6 and 9 July, 1984, Giri Prasad, Hyderabad, 9 July 1984, C. Thirumal Rao, Nalgonda, 16 July 1984, Mallu Swarajyarn, Hyderabad, 10 July 1984, Bhimareddy Narsimha Reddy, Hyderabad, 12 July 1984.

29۔ ہندستانی سرمایہ دار اور قومی تحریک

1. Purshottamdas Thakurdas, *et.al.*, *A Plan of Economic Development India*, Pts. I & II, Penguin, London, 1945, popularly known as the *Bombay Plan*.

2. Aditya Mukherjee, 'The Indian Capitalist Class: Aspects of its Economic, Political and Ideological Development in the Colonial Period 1927-47,' in S. Bhattacharya and Romila Thapar, editors, *Situating Indian History*, New Delhi, 1986, pp. 246-7.

3. *Ibid.*, pp. 250 -1.

4. See for example, Sumit Sarkar, 'Logic of Gandhian Nationalism: Civil Disobedience and the Gandhi-Irwin Pact (1930-31),' *The Indian Historical Review*, New Delhi, Vol. III, No. 1, July 1976, pp. 120-1, 146.

5. Sri Ram, *Annual Reports of the Federation of Indian Chambers of Commerce and Industry*, (hereafter refered to as FICCI, *A.R.*), 1943, p.150, and Muthiah Chettiar, President, FICCI, *A.R.*, 1944, p. 205.

6. G.D. Birla, FICCI, *A.R.*, 1934, p. 173; S.P. Jain and B.M. Birla in BICCI, *A.R.*, 1943, p.129 and 1946, pp. 104-5 respectively.

7. Purshottamdas Thakurdas, President's Speech, FICCI, *A.R.*, 1928, p. 4.

8. G.D. Birla, PICCI, *A.R.*, 1.930, p. 264.

9. Lalji Naranji to Purshottamdas, 28 March 1930, *Purshottamdas Thakurdas (PT) Papers*, fl. 91, part II, Nehru Memorial Museum and Library.

10. G.D. Birla to Purshouamdas, 16 Feb. 1932, *PT Papers*, fl. 104; Purshottamdas to N.R. Sarkar, 1 August 1942, *PT Papers*, fl.239, pt. II, and N.R. Sarkar, *Free Press Journal*, 24 July 1941.

11. FICCI, *Proceedings of the Executive Committee (Proc, of EC)*, 1934, pp. 33-42.

12. FICCI, *A.R.*, 1935, pp. 72-3.

13. FICCI, *Proc. of EC*, 1930-31, p. 5.

14. Ambalal to Purshottamdas, 5 Nov. 1929, *PT Papers*, fl. 91, pt. 1.

15. G.D. Birla to Mahadev Desai, 8 July 1937 and 22 July 1937 in, *In the Shadow of the Mahatma*, Calcutta, 1953, pp. 219, 224-6.

16. G.D. Bir1a to Purshottamdas, 16 Jan. 1931, *PT Papers*, fl. 42, pt. VII (emphasis mine).

17. *Ibid.*

18. *Ibid.*

19. Irwin to Purshottamdas, 29 Sept. 1930 and Purshottamdas to Irwin, 28 April 1930, *PT Papers*, fl. 99, pt. 2.

20. Purshottamdas to G.D. Birla, 9 Sept. 1940 land G.D. Birla to Purshouamdas. 11 Sept. 1940, *PT Papers*, fl. 239, pt. I.

21. *PT Papers*, fl. 239, pt . 4.

22. A.D.D. Gordon, Business and Politics, *Rising Nationalism and Modemising Economy in Bombay, 1918-1933*, New Delhi , 1978, pp .179 , 185-86, 192, 199. See also, Claude Markovits, *Indian Business and Nationalist Politics from 1931-1939*, unpublished D.Phil dissertation, Cambridge, pp. 96, 121, 172 ff.

23. For example, Sumit Sarkar, *op.cit.*, p. 99; and 'Popular Movements and National Leadership 1945-47,' *Economic and Political Weekly*, Vol. XVII, Nos. 14-16, (annual no.), April 1982.

24. Home Political Department, F. no4/14·A, 1940, National Archives of India.

25. Gandhi, *CW*, Vol. 32, pp. 459-60.

26. J.K. Mehta to Purshottamdas, 3 Feb. 1930, *PT Papers*, fl. 42, pt.8. For an understanding of the relationship of the capitalist class and the national movement, especially leaders like Gandhi, Sardar Patel and Nehru, the following interviews have proved very useful: J.R.D.Tata, Bombay, 23 May, 1985, R.K. Bajaj,

Bombay, 17 June 1985, and Vadilal Lallubhai Mehta, 8 July 1985.

27. G.D. Birla to Purshottamdas, 30 July 1929, *PT Papers*, fl. 42, pt. 5.

28. *Ibid.*

29. G.D. Birla to Walchand Hirachand, 26 May 1936, *PT Papers*, fl.177.

30. FICCI, *A.R.*, 1943, p. 31.

31. John Mathai to Purshottamdas, 8 Dec. 1942 and *PT Papers*, fl. 291, pt.1 and fl.42, pt. 5.

30۔ نیشنلسٹ خارجہ پالیسی کا ارتقا

1. S.N. Banerjea, *Speeches*, Vol. II, Calcutta, 1880, pp. 215-6.

2. R.C. Dutt, *Economic History of India in the Victorian Age*, p. 549,

3. *Indian National Congress*, containing full texts of all Presidentia Addresses, reprint of all the Congress Resolutions, etc., Part I, p. 386.

4. Jawaharlal Nehru, *An Autobiography*, p. 31.

5. Gandhi, *CW*, Vol. 22, p. 246.

6. *Ibid.*, Vol.27, p. A50.

7. A.M. Zaidi and S.G. Zaidi, editors, *The*

Encyclopaedia of the Indian National Congress,
Volume 9: 1980, p. 234.

8. Nehru, *SW*, Vol. 2, p. 281.
9. Gandhi, *CW,* Vol. 55, p. A27.
10. Nehru, *SW,* Vol. 7, pp. 172-3.
11. *Ibid.,* Vol. 9, p. 235.
12. Gandhi, *CW*, Vol. 68, p. 138.
13. Nehru, *SW,* Vol. 7, p. 602.
14. Gandhi, *CW,* Vol. 67, p. 428.
15. Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 4, p. 276.
16. Gandhi, *CW,* Vol. 67, pp. 404, 414.
17. Nehru, *SW,* Vol. 9, p. 144.
18. *Ibid.*, p. 157.
19. Gandhi, *CW*, Vol. 68, pp. 137-40.
20. Nehru, *SW*, Vol. 7. p. 181.
21. *Ibid.,* Vol. 9, p. 508.
22. Gandhi, *CW,* Vol. 37, p. 380.
23. Nehru, *SW,* Vol. 9, p. 292.

31۔ فرقہ واریت کا جنم اور ارتقا

1. Nehru, *SW*, Vol. 7, p. 69
2. C.G. Shah, *Marxism, Gandhism, Stalinism,* Bombay, 1963, p. 185.

3. K.M. Ashraf, *Hindustani Muslim Siyasat Par Ek Nazar,* Bombay, 1959 reprint, in Urdu.

4. Quoted in A.N. Vidyalankar, *National Integration and Teaching of History,* New Delhi, no date, p. 3.

5. James Mill, *The History of British India,* London, 1826. Since then the work has been reprinted several times.

6. K.M. Ashraf, *op.cit.*, p. 73.

32۔فرقہ واریت کا معتدل دور

1. S. Abid Husain, *The Destiny of Indian Muslims,* Bombay, 1965, p. 24.

2. *Ibid.*, pp. 156-7.

3. Syed Ahmed Khan, *Writings and Speeches,* edited by Shan Mohammad, Bombay, 1972, pp. 102 ff., 180 ff., 202 ff., 210 ff., 243.

4. *Ibid.*, pp. 156-7, 184-5.

5. *Ibid.*, pp. 204, 207-10.

6. *Ibid.*, p. 210.

7. *Ibid.*, p. 242.

8. *Ibid.*, p. 243.

9. Quoted in Ram Gopal, *Indian Muslims: A Political History (1858-1947),* Bombay, 1959, p. 101.

10. Lal Chand, *Self-abnegation in Politics*. Lahore 1938 edition.

11. Report in the Statesman, 31 December 1932, quoted in Nehru, *SW*, Vol. 6, p. 163.

12. *Indian Annual Register*, 1933, Vol. II, p. 206.

33۔ جناح گولوا کر اور انتہا پسند فرقہ واریت

1. Stanley Wolpert, *Jinnah of Pakistan*, New York, 1984, p. 26.

2. *Ibid.*, Chapters 4 and 5.

3. *Ibid.*, p. 97.

4. Quoted in Raja of Mahmudabad, 'Some Memories,' in *The Partition of India*, edited by C.H. Philips and M.D. Wainright, London, 1970, p. 385.

5. Quoted in S. Gopal, *Jawaharlal Nehru - A Biography*, Vol. 1, 1889-1947, p. 223, f.n.5.

6. Quoted in Z.H. Zaidi, 'Aspects of the Development of Muslim League Policy, 1937-47, in *The Partition of India*, edited by C.H. Philips and M.D. Wainright, p 250.

7. M.A. Jinnah, *Speeches and Writings*, edited by Jamil-ud-Din, Vol. I, Lahore, 1960 edition, pp. 69-70, 12-3.

8. *Ibid.*, p. 127.

9. *Ibid.*, p. 243.

10. *Ibid.*, p. 248.

11. *Indian Annual Register,* 1946, Vol. II, p. 226.

12. M.A. Jinnah, *Speeches and Writings,* edited by Jamil-ud-Din, Vol.II, Lahore, edition, 1964, pp. 240-1.

13. Z.A. Suleri, *My Leader,* no place, 1946, third edition; F.K. Khan Durrani, *The Meaning of Pakistan,* Lahore, 1944.

14. Quoted in Ram Gopal, *Indian Muslims: A Political History (1858-1947),* Bombay, 1959, p. 258.

15. Quoted in W.C. Smith, *'Modern Islam in India,* Lahore, 1963 reprint, p. 299.

16. M.A. Jinnah, *op.cit.,* Vol. II, p. A89.

17. V.D., Savarkar, *Hindu Rashtra Darshan, A Collection Presidential Speeches,* Bombay, 1949, pp. 21-22.

18. *Ibid.*, p. 77.

19. M.S. Golwalkar, *We or Our Nationhood Defined,* Nagpur, 1947 edition, first published in 1939, p. 58.

20. *Ibid.*, p. 73.

21. *Ibid.*, p. 19.

22. *Ibid.*, pp. 55-6.

23. *Ibid.*, p. 19.

24. *Ibid.*, pp. AO-1.

25. M.S. Golwalkar, *Bunch of Thoughts*, Bangalore, 1966, pp. 150-2.

26. Jinnah, *op.cit.*, Vol. II, pp. 403-4.

27. Rajendra Prasad, *India Divided*, Bombay, 1947, third revised edition, p. 153.

28. S. Gopal, *op.cit.*, p. 227.

34۔ ترپوری کے بحران سے کرپس مشن تک

1. Crossroads, *Being the Works of Subhas Chandra Bose 1938-40*, Bombay, 1962, p. 87.

2. Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 5, pp. 28-9.

3. *Crossroads*, pp. 91-92.

4. Subhas Bose, *The Indian Struggle 1920-42*, Bombay, 1967 reprint, p. 332.

5. Tendulkar, *Mahatma*, Vol. 5, p. 28.

6. Gandhi, *CW*, Vol. 68, p. 359.

7. Nehru, *SW*, Vol. 9, pp. 481-82.

8. *The Indian Struggle*, p. 335.

9. *Crossroads*, pp. 108 ff.

10. Gandhi, *CW*, Vol. 67, p. 198.

11. *Ibid.*, Vol. 69, pp. 209-1O.

12. *Ibid.*, p. 98.

13. Rajendra Prasad, *Autobiography,* Bombay, 1957.

14. Gene D. Overstreet and Marshall Windmiller, *Communism in India,* Berkeley, 1959, p. 168.

15. Sumit Sarkar, *Modern India,* p. 374.

16. S. Gopal, *Jawaharlal Nehru - A Biography,* Vol. 1, p. 263.

17. *Indian Annual Register,* 1939, Vol. II, pp. 389-93.

18. Gandhi, *CW,* Vol. 70, pp. 267-280.

19. *Ibid.*, Vol. 71, Appendix VI.

20. Nehru, *SW,* Vol. II, p. 106.

21. S. Gopal, *op.cit.*, p. 268.

22. Gandhi, *CW,* Vol. 73, p. 72.

23. Tendulkar, *Mahatma,* Vol. 6, p. 43. Gandhi's *Collected Works,* Vol. 75, p. 224 has another version of the speech.

24. S. Gopal, *op .cit.*, p. 278.

25. Nehru, *Discovery of India,* p. 399.

35۔ ہندوستان چھوڑو تحریک اور آزاد ہند فوج

1. S. Gopal, *Jawaharlal Nehru: A Biography,* Vol. 1, p. 294.

2. Gandhi, *CW,* Vol. 76, p. 442. Gandhi is also reported to have told Jawaharlal Nehru, 'If you won't join, I'll do it

without you.' S. Gopal, *op.cit.*, p. 292.

3. For the full text of the speech, see Gandhi, *CW*, Vol. 76, pp. 384 -96; the quotes in my text are to be found on pp. 391, 392, 394 and 395.

4. *Ibid.*, p. 367.

5. Francis Hutchins, *Spontaneous Revolution: The Quit India Movement*, New Delhi, 1971, p. 191.

6. Interview with Achyut Patwardhan, Bangalore, 9 December 1984.

7. Interviews with Usha Mehta, Bombay, 18 May 1985; S.M. Joshi. New Delhi, 29 February 1984; Annadada Narde, Bombay, 25 May 1985; Lalbhai Dayabhai Naik, Navsari (Gujarat), 27 June 1985; Jayanti Thakore, Ahmedabad, 7 and 8 July 1985; Hoshiar Singh, Baraut (U.P.), 14 April 1987.

8. Gandhiji first used the phrase 'leonine violence' in his letter of 29 January 1943 to the Viceroy. Gandhi, *CW*, Vol. 77, p. 56. For Gandhi's declaration of his intention to fast and the Viceroy's response, see Gandhi, *CW*, Vol.77, pp. 49-5l, and Mansergh and Lumby; editors, *Transfer of Power* (hereafter *TP*), 1942-7, Vols. 1-12, London, 1970-1983, Vol.3, pp. 462-3 and 493.

9. The popular reaction to Gandhi's fast is detailed in

Government of India, Home Political Department, file nos. 19/3/43, 19/4/43, 19/5/43 and 19/6/43, National Archives of India, New Delhi.

10. *TP*, Vol. 3, p. 632.

11. Linlithgow in a conversation with Louis Phillips, Special U.S. representative in New Delhi. *Ibid.*, p. 690.

12. *tbid.*, pp. 684-6.

13. Radhika Sinha, *Aspects of the Quit India Movement in Eastern U.P.,* Unpublished M.Phil dissertation; CHS, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, 1986; Chandan Mitra, 'Countours of Popular Protest: The Quit India Movement of 1942,' paper presented at a Seminar on *A History of the Indian National Congress, 1885-1947*, at Nehru Memorial Museum and Library, 22-24 July 1985.

14. Sumit Sarkar, *Modern India,* pp. 400-01.

15. Gail Omvedt, 'The Satara Parallel Government, 1942-47,' in D.N. Panigrahi, editor. *Economy, Society and Politics in Modern India,* New Delhi, 1985; and Interviews with Y.B. Chavan, New Delhi , 2 May 1984, V.S. Page. Bombay, 7 June 1985 and Vasantdada Patil, Bombay, 14 June 1985.

16. Stephen Hennigham, *Peasant Movements in*

Colonial India: North Bihar 1917-1942, Canberra, 1982, pp. 183-5; Interview with Paras Nath Misra, Lucknow, 20 and 21 April 1986.

17. Gandhi, *CW*, Vol. 76, p. 461.

18. Interviews with Paras Nath Misra, Lucknow, 20 and 21 April 1986, and Vishwanath Prasad Mardana, Lucknow, 24 April 1986.

19. Interview with Mrinalini Desai, Bombay. 22 May 1985, and Shirubhau Limaye, Pune, 5 June 1985, G.P. Pradhan, Pune, 6 June 1985.

20. Gandhi, *CW*, Vol. 76, p. 295.

21. Francis Hutchins, *op.cit.*, pp. 247-48,

22. *TP*, Vol. 5, pp. 166, 359, 615 and 754.

23. *Selected Speeches of Subhas Chandra Bose*, New Delhi, 1965, p. 218

24. For accounts of the I.N.A., see K.K. Ghosh, *The India National Army*, Meerut, 1969, and Interviews with P.K. Sehgal, Kanpur, 23 September, 1986, Laxmi Sehgal, 23 September. 1986, Colonel Mahboob Ahmed, Patna, November 1985, Niranjan Singh Gill, Amritsar, 2 and 3 April 1985.

1. *TP*, Vol.6, p.109.

2. K.K. Ghosh, *The Indian National Army*, p. 210.

3. *TP*, Vol.6, p. 507.

4. *Ibid.*, p. 51 2.

5. Nehru, *SW*, Vol. 14, pp. 279-80.

6. F. Tuker, *While Memory Serves*, London, 1950, p. 54.

7. Wavell to Peihick Lawrence, 27 November 1945, *TP*, Vol. 6, p. 552.

8. Cunningham to Wavell, 27 November 1945, *Ibid.*, p. 546.

9. Note on INA Situation by Director, Intelligence Bureau, *TP*, Vol. 6. p. 512.

10. Commander-in-Chief to Viceroy, 24 and 26 November 1945, *TP*, Vol. 6., pp. 533 and 545.

11. *TP*, Vol.6, p. 546.

12. R.P. Dutt, *India Today*. Bombay, 1949, pp. 536-42; Sumit Sarkar, 'Popular Movements and National Leadership 1945-47,' *Economic and Political Weekly*, Vol. XVII., Nos. 14-16 (annual no.) April 1982; Gautam Chattopadhyay, 'The Almost Revolution: A Case Study of India in February 1946,' in *Essays in Honour of Professor S.C. Sarkar*, New Delhi, 1976.

13. Gautam Chattopadhyay, *op.cit.*

14. Subrata Banerjee, *The R.I.N Strike*, New Delhi, 1981, p. vii.

15. Viceroy to Secretary of State, 27 February 1946, *TP*, Vol. 6, p. 1076.

16. R.P. Dun, *op.cit.*, p. 542.

17. Government of India, *Home Political Department*, File No. 5/8/46, National Archives of India.

18. Viceroy to Prime Minister, 24 February 1946, *TP*, Vol. 6, p. 1055.

19. *Home Political Department*, File No. 7/1/46.

20. *Jawaharlal Nehru Correspondence*, Part I, Vol. 81, Nehru Memorial Library.

21. Sumit Sarkar, *op.cit.*, p. 2. Also see G. Chattopadhyay, *op.cit.*, p. 428; and A.R. Desai, 'Introduction,' in A.R. Desai, editor, *Peasant Struggles in India*, p. xx.

22. *Indian National Congress*, March 1940 to September 1946: Being the Resolutions Passed by the Congress, the AICC and the Working Commitee, published by the General Secretary, AICC.

23. Gandhi, *CW*, Vol. 83, pp. 17 1, 175, 183-84.

1. For a fuller discussion of how this erosion took place and .the conclusions drawn from it by the British, see Sucheta Mahajan, 'British Policy, Nationalist Strategy and Popular National Upsurge, 1945-6,' in A.K Gupta, editor, *Myth and Reality, Struggle for Freedom in India, 1945-47*, pp. 57-63.

2. R.J. Moore, *Escape from Empire*, Oxford, 1983, p, 22. Also see David Potter, 'Manpower Shortage and the End of Colonialism: The Case of the Indian Civil Service,' *Modern Asian Studies*, Vol. 7, No. 1, 1973.

3. R.P. Noronha, *Tale Told by an Idiot*, New Delhi, 1976, p. 3.

4. *TP*, Vol. 6, p. 688.

5. The option of changing the nature of British rule to one of strong autocratic authority capable of maintaining British rule for another 1520 years was ruled out by Attlee in late 1946. The considerations were that there were no British troops available, British and the U.S. public opinion would not accept it and a disgraceful exit with a legacy of hostility would be the end result. *TP*, Vol. 9, pp. 68-89. Our understanding of the reasons for British withdraw from India is also

based on Interviews with contemporary officials as well as participants in the national movement, especially R.A. Gopalaswamy, Madras, 5 June 1984, S.R. Kaiwar, Madras, 2 June 1984 , A.K. Das, Lucknow. 20 April 1986, K.K. Das, Lucknow, 26 April 1986, Achyut Patwardhan, Bangalore, 9 December 1984, N.G. Gore, 29 December 1984, Rohit Dave, Bombay 21 May 1985.

6. Bombay Chronicle, 8 July 1946.

7. R.J. Moore, *op.cit.*, pp. 156 and 163.

8. Nehru, *Selected Works,* edited by S. Gopal, Second Series, Vol. 2, New Delhi, 1984, p. 69.

9. Attle's statement in the Cabinet meeting of 18 February 1946, *TP*, Vol. 9, London, 1980, p. 750.

10. House of Commons Debate, 5 March 1947, *Parliamentary Debates* (Hansard).

11. Note by Jenkins, Punjab Governor, 16 February, 1947, *TP*, Vol. 9, p. 729.

12. *Wavell: The Viceroy's Journal*, edited by Penderel Moon, Delhi, 1977, p. 428.

13. Collins and Lapierre, *Mountbatten and the Partition of India*, Sahibabad, 1983, pp. 21 and 53.

14. Report of Viceroy's 13th Staff Meeting, 11 April 1947, *TP*, Vol. 10, p. 190.

15. Francis Williams, *A Prime Minister Remembers*, London, 1961, p. 212.

16. Nehru, *SW*, Second Series, Vol. 1, p. 207.

17. S. Gopal, *Jawaharlal Nehru - A Biography*, Vol. 1, p. 352.

18. Interview with Mountbatten, 17 April 1947, *TP*. Vol. 10, p. 309.

19. Ronald Wingate, *Lord Ismay, A Biography*, London, 1970, p. 167.

20. Brigadier R.C.B. Bristow, *Memories of the British Raj - A Soldier in India*, London, 1974, Lockhart wrote the Foreword.

21. Nehru, *SW*, Vol. 15, pp. 306-07.

22. S. Gopal, *op.cit.*, p. 307.

23. Nehru, *SW*, second series, Vol. 2, p. 377.

24. Bimal Prasad, *Gandhi, Nehru and J .P. Studies in Leadership*, Delhi, 1985; Sandhya Chaudhuri, *Gandhi and the Partition of India*, New Delhi, 1984, Sumit Sarkar, *Modern India*.

25. Gandhi, *CW*, Vol. 88, p. 75.

26. Bimal Prasad, *op.cit.*, p. 31.

38۔ قومی تحریک کی طویل المیعاد حکمت عملی

1. This Chapter is based on Bipinn Chandra, *Indian National Movement: The Long -term Dynamics*, New Delhi, 1988.
2. Gandhi, *CW*, Vol.64, p. 194. Also Vol. 68, p. 319.
3. Gandhi, *CW*, Vol. 67, p. 226.
4. *Ibid.*, p. 420.
5. *Ibid.*, Vo1.69, p. 60.
6. *Indian National Congress, March 1940 to September 1946: Being the Resolutions passed by the Congress, AICC and the Working Committee*, New Delhi, 1946.
7. Nehru, *SW*, Vol. 4, p. 195; Bhagat Singh, *Why I am an Athiest*, p. 12.

39۔ ہندوستانی قومی تحریک...اس کی نظریاتی وسعت

1. Gandhi, *CW*, Vol. 76, p. 384.
2. *Kesari*, 16 June 1908, quoted in Ashis Kumar Dhuliya, *Aspects of Tilak's Political Strategy and His Struggle for Civil Liberties*, M.Phil Dissertation, Centre for Historical Studies, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, 1984, p. 269.
3. Gandhi, *CW*, Vol. 22, pp. 142 and 167-76.
4. *Ibid.*, Vol. 69. p. 3S6.
5. Nehru, *SW*, Vol. 7, p. 414

6. *Ibid.*, Vol. 11, p. 367.

7. See, for example, Gandhi, *CW*, Vol. 68, pp. 258-59

8. Bipan Chandra, 'British and Indian Ideas on Indian Economic Development, 1858-1905,' in Bipin Chandra *Nationalism and Colonialism in Modern India*, pp. 92 ff.

9. *Ibid.*, pp. 109 ff; and Bipan Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, pp. 90 ff.

10. *Indian National Congress: Resolutions on Economic policy, Programme and Allied Matters 1924-1969*, New Delhi 1969, p. 16.

11. Gandhi, *CW*, Vol. 55, p. 427

12. References are too many. The reader may see Gyorgy Kalmar, Gandhism, Budapest, 1977; and Francine R. Frankel, *India's Political Economy 1947-1977: The Gradual Revolution*, Delhi, 1978, Chapters 1 and 2.

13. Gandhi, *CW*, Vol. 64, p. 192.

14. *Ibid.*, Vol. 76, p. 367.

15.Ibid.,pp.437,445-46

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تاریخ تختِ طاؤس

مصنف : مولوی محمد عبداللطیف خان

صفحات: 216

قیمت : -/86روپے

جامع تاریخ ہند

مصنف : محمد حبیب، خلیق احمد نظامی

صفحات: 1000

قیمت : -/222روپے

قدیم ہندوستان کی تاریخ

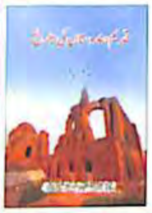

مصنف : رماشنکر ترپاٹھی

مترجم : سید تقی حسن نقوی

صفحات: 581

قیمت : -/138روپے

تحریکِ خلافت

مصنف : محمد عدیل عباسی

صفحات: 282

قیمت : -/72 روپے

آزادی

مصنف : جان اسٹوارٹ مل

صفحات: 184

قیمت : -/60روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

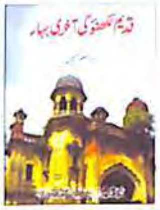

مصنف : مرزا جعفر حسین

صفحات: 560

قیمت : -/134روپے

₹ 234/-

ISBN: 978-93-5160-034-3

9 789351 600343

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025